گمراہ

از

جبار توقیر

1

وہ

جبار توقیر

وہ بڑی خوفناک رات تھی سناٹوں سے لبریز۔ یہاں سے وہاں تک کہر میں لپٹی ہوئی سوگوار، ماتم گسار، گناہ گار کی آنکھ کی طرح جھکی ہوئی شرمسار رات اور میں آہستہ آہستہ اس رات کے کہر کی دبیز تہہ میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔

ماں کے یخ بستہ الفاظ اب تک میرے کانوں میں سیسہ انڈیل رہے تھے۔ اس نے مجھے میرے بے بس ہونے کا طعنہ دیا تھا۔ اس نے اس رات بھی وہی بات کہی تھی جو وہ سالوں سے کہتی آ رہی تھی۔ اس نے کہا تھا "تیرا نا مرد ہی کیا ہے جیلانی تو بھی بے بس ہے اور میں بھی بے بس ہوں۔"

بڑی سڑک میرے گھر سے یہی کوئی دو فرلانگ دور ہو گی اور میں چل رہا تھا اس بڑی سڑک کی طرف جو بدن میں پھیلی ہوئی شریانوں میں خون کی طرح خدا معلوم انسانوں کو کہاں کہاں تک لئے پھرتی تھی۔

میرے قدم کبھی تیز ہو جاتے تھے اور کبھی سست۔ میرے ذہن کے تمام گوشے تاریک تھے اور اگر کوئی شے ان گوشوں میں سرسرا رہی تھی تو وہ تھے نوٹ۔ ایک لاکھ روپے کے سرسر کرتے، کڑکڑاتے، شخ شخ بجتے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے نوٹ۔ یہ نوٹ مجھے اپنے لئے نہیں اپنی بہن آسیہ کے لئے چاہئیں تھے۔ ان کا مطالبہ میرے تایا جان نے کیا تھا۔ وہ میرے سگے تایا تو نہیں تھے۔ ذرا ایک آدھ پیڑھی سے جا ملتی پڑتی تھی ان سے اپنے خون کا رشتہ ملانے کے لئے۔

پھر بھی وہ میرے تایا تھے۔ وہ کسی دور میں ہم پر بہت مہربان تھے مگر یہ جب کی بات ہے جب میرے ابا زندہ تھے اور ہمارے گھر پر دھن برستا تھا اسی دور میں آسیہ کی منگنی میرے تایازاد سے ہوئی تھی۔

مگر پھر ایسا ہوا کہ میرے ابا مر گئے۔ دھن برسنا بند ہو گیا۔ اور ہم پیسے پیسے کے محتاج ہو گئے ہمیں روٹیوں کے لالے پڑ گئے تب مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ مجھے اپنے خوابوں کے شیش محل سے نکلنا ہو گا زندگی مجھ سے اپنا خراج مانگ رہی تھی۔

اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں شاید اس رات میرے سر پر خون سوار تھا۔ میں کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی دھن میں تھا میرے ذہن کے خرابے میں سرخ آندھیاں چل رہی تھیں۔ اور میرے وجود میں کوئی پھنکارتا ہوا زہریلا جذبہ بیکراں ہوتا جا رہا تھا۔

اپنی ماں کا چہرہ بار بار میری آنکھوں میں ابھر رہا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے اس کی باتیں سن کر مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے میرے سر سے باندھ کر بم کے فلیتے کو کھول دیا ہے بم دھماکے سے پھٹا ہے اور میرے پرخچے اڑ گئے ہیں۔ میرے جلتے خواب چکنا چور ہو کر میرے چاروں طرف بکھر گئے تھے۔ ماں کو میری اپنی بھولی ماں کو احساس تک نہ ہوا تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کو کس قدر اذیت پہنچائی ہے۔ میں نے اس کی باتیں سنیں تو مجھے اپنی سماعت پر اعتبار نہیں آیا...... اس کی پلکوں پر لرزتے آنسو میں نے دیکھے تو میرا سارا وجود کانپ گیا۔ میں نے اسے بانہوں میں



سے کر دلاسا دینے کی کوشش کی تو وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ گیا تھا۔

مجھے ڈر تھا کہ اگر وہ کچھ دیر اور روتی رہی تو اس کی آنکھوں سے خون رسنے لگے گا۔ اتنا پانی کہاں تھا اس کے دیدوں میں کہ وہ اسے اتنی فراخ دلی سے لٹا سکتی۔

مگر وہ ایک بیٹی کی ماں تھی جس کا دکھ بے اتھاہ تھا۔

میں نے صرف اتنا کہا تھا "ماں ذرا پھر سے بتا کر تو کیا کہہ رہی ہے مجھے تیری بات پر اعتبار نہیں آتا۔"

اور بس میری یہ بات اس کے دل میں تیر کی طرح چبھ گئی تھی اس کے چھالے بہہ نکلے تھے۔

وہ بلکتی ہوئی بولی ـــ

"میں نے غلط نہیں کہا ہے بیٹے! مجھے آج ہی شکوران بتا گئی ہے۔ اسے تیرے تایا نے ہی بھیجا تھا اس نے کہا ہے کہ ہمیں آسیہ کو جہیز میں ایک لاکھ روپیہ دینا ہو گا ورنہ وہ ڈولی نہیں اٹھائے گا۔"

"وہ ایسا کیوں کہتے ہیں ماں؟ ہم نے ان کا کیا بگاڑا ہے آخر؟ کیا وہ ہمارے تایا نہیں ہیں۔ انہیں کیا نظر آتا ہے ہمارے گھر میں؟"

"ان کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھی ہے بیٹے۔ ان کا لڑکا... ایم بی بی ایس ہو گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں انہوں نے اس کی تعلیم پر لاکھوں روپے خرچ کر دیئے ہیں اور ہماری بیٹی محض بی اے ہے، محض بی اے۔ انہیں لیڈی ڈاکٹروں کے رشتے آ رہے ہیں۔ وہ بھلا ہم سے پانی کے کوڑے پر کیوں بات کرنے لگے؟ آسیہ کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رہی۔"

"مگر ایک لاکھ روپیہ؟ سوچ تو ماں! یہ ہم کہاں سے دے سکیں گے؟"

"دے سکتے ہیں ہم مگر صرف اس صورت میں کہ ہم اٹھ کر سڑک پر جا بیٹھیں اور یہ مکان بیچ ڈالیں۔ یہی چاہتا ہے وہ تیرا تایا۔ وہ جمیل مرزا۔ یہی اس کی مرضی ہے۔" ماں نے چیخ کر کہا۔ "انہیں ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہے بیٹے۔ انہیں بہو نہیں روپیہ چاہئے روپیہ۔ یہ روپیہ۔"

تب مجھے یاد آیا کہ ہم تو ان کی نظر میں بالکل ہی کنگلے ہیں..... فقیروں سے بھی بدتر ـــ بھک منگے ہیں نرے بھک منگے ـــ

مگر میرے گھر میں بہار آتی تو کیونکر آتی۔ میں تو سیدھے سادے راستوں پر چلتا رہا تھا۔ دسویں کرنے کے بعد میں نے دو سال تک ٹیکسی چلائی اور مالک کا گھر بھرتا رہا۔ وہاں سے نکلا تو پولیس میں بھرتی ہو گیا۔ ساٹھ روپلی کا سپاہی ـــ وہاں سے میرا جی اچاٹ ہوا تو ٹائپ سیکھ کر ایک سرکاری دفتر میں جا بیٹھا۔ وہ کام مجھے کچھ اچھا لگا تو میں نے شارٹ ہینڈ [illegible] کر لی

بہت مارا ماری کرنے کے بعد اس وقت میں آٹھ سو روپے تنخواہ لے رہا تھا۔ اور چپڑی وہی تنخواہ میرا اوڑھنا بچھونا تھی۔ اس میں سے بوند بوند کر کے میری ماں نے تیرہ ہزار روپے جمع کئے تھے بہت تنگی ترشی سے گزر اوقات کی تھی ہم نے، تب کہیں جا کر یہ پیسے جمع ہو گئے تھے۔

مگر اب جو پیچ میرے تایا صاحب ڈال رہے تھے وہ میرے لئے ناقابل برداشت تھا۔

ماں کی باتیں سن کر، اس کی سسکیوں اور اس کی آنکھوں سے بندھے آنسوؤں کے تار دیکھ کر میرا دماغ الٹنے لگا اور میرے دل میں اپنے گرد و پیش کے خلاف زبردست نفرت پیدا ہونے لگی۔ اس لمحے میرا جی چاہتا تھا میں اس شہر کو جلا کر بھسم کر دوں جو میری بہن کی میری اور میری ماں کی اتنی سی خوشی کی اتنی بڑی قیمت طلب کر رہا تھا ـــ

میری ماں مکان کو بڑی حسرت سے دیکھنے لگی۔ یوں جیسے وہ وہاں دو گھڑی کی مہمان ہے۔

"مکان۔ یہ مکان۔ میرے باپ دادا کی آخری نشانی۔ نہیں ماں! میرے تایا اس جمیل مرزا بلکہ اس ذلیل مرزا سے کہلا بھیجو کہ اسے ایک لاکھ روپیہ مل جائے گا۔ وہ آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد بارات لے آئے اس سے بائیس تاریخ ہی تو مقرر کی گئی تھی۔ ہم اسے ایک لاکھ روپے دے دیں گے۔" میں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ یوں جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں جیسے کسی نے ایک لاکھ روپے کی رقم سامنے کھلے نوٹوں کی صورت میں دیوار پر پھیلا کر سجا رکھی ہے۔ اور میں اٹھ کر اسے سمیٹ لوں گا۔

"تم..... دیوانے ہو گئے ہو، جیلانی بیٹے! ہم بھلا اتنی بڑی رقم کہاں سے دیں گے؟" ماں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"نہیں اے ماں ضرور دیں گے۔ ہم لڑکی والے ہیں۔ ہمیں ان کی بات ماننی پڑے گی۔ اور اگر ہم ان کے اس حکم کی تعمیل نہ کر سکے تو پھر...... پھر پتہ نہیں کیا ہو جائے ماں۔ انہیں کہلا بھیجو کہ ہم رقم ضرور دیں گے۔" یہ کہہ کر میں ماں کے سامنے سے اٹھ گیا۔

اپنے بازوؤں کی مچھلیوں میں سے مجھے مایوسی کی ایک تیز کٹیلی برچھی گزرتی محسوس ہوئی۔ میں نے اپنی پیٹی کو کمر پر اچھی طرح کس کر باندھا۔ جوتوں پر پڑی گرد کو جھاڑا۔ ایک نظر آئینے میں ڈالی۔ اپنے چاکلیٹی سیاہ گھونگھریالے بالوں میں کنگھی کی، کمبل بدن پر لپیٹا، اور دراز میں سے اپنا چاقو نکال کر جیب میں رکھتے ہوئے میں برآمدے میں جا نکلا اور پھر صحن میں اتر گیا۔

آسیہ دائیں ہاتھ رسوئی خانے میں چولہے سے لڑ جھگڑ رہی تھی یہ جیتی ایسی اونچی لمبی شہتوت [illegible] بہن تھی میری۔ اس نے بی اے کا امتحان تو پاس کر لیا تھا مگر لگتا تھا کہ اس نے اپنے دماغ پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالا۔ اپنی جان کو خوب تر و تازہ رکھتی تھی وہ۔ یہ بڑی بڑی ولائتی مرغی کے انڈے سی ایسی آنکھیں تھیں اس کی۔ بال اس کے اتنے لمبے تھے کہ جتنا کوئی جھوٹ بول لے ـــ یہ گھٹنے تک لمبے اور وہ بھی گھنگھریالے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان کو استری پھیر دی جاتی اور ان کے بل نکال دیئے جاتے تو اس کے بال ایڑی تک اتر جاتے۔

مجھے اپنی بہن کی تعریف نہیں کرنی چاہئے مگر اصل بات یہ ہے کہ اس کے پردے میں میں اپنی ہی تعریف کر رہا ہوں۔ میرا قد چھ فٹ ایک انچ ہے اور وزن ایک سو اسی پونڈ۔ سینہ چوڑا چکلا، کمر پتلی، رانوں اور پنڈلیوں کا دم خم مجھے ہمیشہ یہ احساس دلاتا رہتا ہے کہ میں عام آدمی نہیں ہوں کسی بہت ہی اچھی نسل کا گھوڑا ہوں جس کو صحرا میں دوڑاؤ یا مرغزاروں میں وہ ایک ہی جیسی رفتار سے چلے گا۔ میں شاہکار تھا۔ یہی حال میری ہمشیرہ کا تھا۔ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ فطرت ابھی تک انسان پر مہربان ہے اور کسی نہ کسی پر اپنی بے پناہ فراخدلی کا اظہار وہ ضرور ہی کر دیتی ہے۔

اور میں نے اپنی ایسی خوبصورت بہن کو شکیل مرزا کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ وہ ہمارا عمزاد تھا۔ ہمارا ہم پلہ تھا تعلیم یافتہ تھا، مہذب تھا مگر اب ہمارے اور اس کے درمیان ایک خلیج حائل ہو گئی۔ جو ایک لاکھ گز چوڑی تھی۔ نہیں ایک لاکھ گز نہیں بلکہ ایک لاکھ فرسنگ وسیع تھی اور مجھے یہ خلیج پاٹنا تھی۔ ہر حال میں اس دیوار کو ڈھانا تھا تاکہ میں اپنی بہن کے سامنے سرخرو ہو سکوں وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کے ویر نے اس کا مان توڑ دیا ہے۔

بس یہی ایک برقی رو تھی جو بار بار میرے وجود میں سے گزر رہی تھی۔

میں صحن عبور کر کے گھر سے باہر نکل آیا۔ میں کچھ دیر اور ماں کے سامنے بیٹھا رہتا تو میرا دم گھٹ جاتا۔ میں دھماکے سے ٹوٹ کر بکھر جاتا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ایک کڑی آزمائش میری منتظر تھی۔

میں اس روز اپنی تن سازوں کی مجلس میں بھی نہیں گیا۔ وہ میرا انتظار ہی کرتے رہے ہوں گے۔ یہی دسمبر کے یخ بستہ دن تھے۔ سورج پانچ ہی بجے چھپنے لگتا تھا اس وقت چھ بج رہے تھے اور باہر آہستہ آہستہ سڑکوں پر دھند اترنے لگی تھی۔ یہ ایک دبیز پردہ تھا جو آپ ہی آپ لوگوں کے درمیان تنتا جا رہا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ایک اس سے بھی کہیں زیادہ دبیز پردہ میرے اور تمام دنیا کے اعلیٰ و ارفع اصولوں کے درمیان حائل ہوتا جا رہا ہے۔ ایک دھندلکا میرے اندر بھی پھیلتا جا رہا تھا۔

یارو! چھ ماہ پہلے میری بہن تو ایک جگہ منگنی ہوئی تھی۔ اور میں نے طے کر رکھا تھا کہ کھلا موسم آتے ہی میں شادی کر دوں گا ـــ فروری میں آسیہ کے ہاتھ پیلے کر کے مارچ کے آخر تک اپنی دلہن لے آنے کا ارادہ تھا میرے ذہن میں تو ایک لاکھ روپے کے کسی ڈھیر پر میرے الٹے سیدھے اونٹ نے کروٹ نہیں لی۔ میں تو ہر روز بسوں میں دھکے کھاتے ہوئے چھ میل دور اپنی ملازمت پر جاتا ہوں۔ میرے دماغ میں تو کبھی کسی سکوٹر کا، کار کا، سواری کا، سسرال نچوڑنے کا خناس پیدا نہیں ہوا۔ حالانکہ وہ اچھے کھاتے پیتے قسم کے لوگ تھے تاندلیانوالہ کے گھی فروشوں کی برادری ہے۔ بہرام پوری کو جانتے ہیں وہ۔ بڑا روپیہ ہے ان کے پاس مگر میں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ ان میں سے کسی کو پکڑ کر شکنجے میں پیس لوں اور آگ پر رکھ کر بھون لوں۔ ایک لاکھ روپے کی آگ پر رکھ کر اس کے کباب بنا لوں۔

نہیں یارو میں نے تو ایسی بات کبھی نہیں سوچی۔ میں تو ان کی بیٹی کو ان کا سب سے بڑا انعام اور احسان سمجھ کر گھر لانے کی سوچ رہا تھا پھر یہ کیا بات تھی کہ میری بہن پر انہوں نے ایک لاکھ روپے کی گالی چڑھا دی ہے۔ میں کہاں جاؤں؟ یارو کس سے انصاف طلب کروں؟

بڑی سڑک پر ٹیکسیوں کا، ویگنوں، سائیکلوں اور کتاؤں کا ہجوم دم نہیں لینے دیتا تھا اور میرے ذہن میں گھرے الجھے ہوئے تھے رہ رہ کر چاقو پر میری گرفت مضبوط ہوتی تھی اور میں اندر ہی اندر کسمسا کر رہ جاتا تھا۔ میرے وجود میں کوئی انجانا بھیڑیا [illegible] سر اٹھا رہا تھا۔ ایسا جذبہ جو میرے کاسۂ سر کو توڑ کر باہر نکل جانے کے لئے بے چین تھا۔ ایک لاوے کی طرح کھولتا ابلتا سیل بے پناہ بن جانے کے لئے بے قرار، بے چین، سیماب پا جذبہ اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ میں کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟ میں ماں سے وعدہ تو کر آیا تھا مگر میں اسے پورا کیونکر کر سکتا تھا۔ کہاں سے وہ ایک لاکھ روپے مجھے مل سکتے تھے۔ میرے گھر میں بس مجھے تیرہ ہزار روپیہ موجود تھا۔ میں نے مزید نو ہزار روپے کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ وہ میں دفتر سے قرض لے رہا تھا۔ چھ سات سال کی ملازمت نے وہاں مجھے اتنا حق دلا دیا تھا کہ میں ان سے دس بیس ہزار روپے قرض لے سکتا تھا۔ اور اب کی بار میں نے موٹر سائیکل خریدنے کے لئے قرض مانگا تھا۔ مجھے امید تھی کہ بس چار دن تک مجھے رقم مل جائے گی۔ میں خوش تھا کہ بیس بائیس ہزار روپے میں میں باعزت طریقے سے اپنی بہن کو ڈولی میں بٹھا کر اس کے گھر بھیج سکوں گا۔

مگر ماں نے میرے جاتے پیروں کھینچ کر پتھر مارا تھا کہ میں سارے کا سارا اپنے ہی خون میں ڈوب گیا تھا۔ یارو! دنیا میں کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟ مگر وہاں کون تھا جو میرے اس سوال کا جواب دیتا۔

میری ضرورت منہ کھول کر مجھے نگل جانے کے لئے آگے بڑھ رہی تھی

اچانک ایک ٹیکسی میرے قریب آ کر رکی۔

"جاتا ہے باؤ جی۔"

میں نے ایک لمحے کے لئے توقف کیا اور پھر دروازہ کھول کر خراب سا اندر بیٹھ گیا۔

"کہاں جائیں گے باؤ جی؟"

"کہیں لے چل یار، کہیں بھی لے چل۔" میں نے کہا۔

ڈرائیور نے گردن گھما کر ذرا دلچسپی سے میرے چہرے کا جائزہ لیا اور مسکرایا، بولا —

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی باؤ جی؟" اس نے سگریٹ منہ سے لگا کر تیلی سلگائی تھی۔

"ہاں یار طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے تجھے کوئی شک ہے میری طبیعت پر؟" میں نے بھی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

"میرا مطلب ہے باؤ جی، کوئی نشے پانی کا قصہ تو نہیں ہے آپ کو پتہ ہی نہیں کہ جانا کہاں ہے؟"

"بات یہ ہے کہ جس آدمی کی جوان بہن ہو اور اس کی شادی سے چند دن پہلے اس کا ہونے والا سسر اس کے بھائی سے کہے کہ ایک لاکھ روپیہ دو گے تو تمہاری بہن کی ڈولی اٹھاؤں گا — تو اس آدمی کو تیرے خیال کے مطابق کہاں جانا چاہیے میرے یار؟" میں نے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر پوری طرح پھیلتے ہوئے کہا۔ کمبل میرے ایک بازو پر سے پھسل کر نیچے گر گیا تھا اور ڈرائیور نے میرے بازوؤں کی مچھلیوں کی تڑپ دیکھ لی تھی، بولا۔

"پہلوان جی! ایسے آدمی کو یا تو میانی صاحب جانا چاہیے یا پھر ...... یا پھر کسی کروڑپتی کی تجوری پر۔"

وہ خاصا سمجھدار آدمی تھا۔

"تو پھر کسی تجوری پر لے چل مجھے پیارے —" میں نے اور زیادہ پھیلتے ہوئے کہا۔

"کرایہ تو ہو گا آپ کے پاس؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ اتنا بھی الو کا پٹھا نہیں ہوں۔ جتنا تو سمجھتا ہے پیارے — یہ دیکھ کئی سرخے سبز سے جیب میں دھرے رکھے ہیں۔"

ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔

ذرا دیر کے لئے ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ مکالمہ اس نے غلط پٹڑی پر چڑھا دیا تھا۔ کوئی دو فرلانگ چلنے کے بعد وہ بولا۔

"تو پھر آپ کو مال روڈ پر اتار دوں باؤ جی؟"

"نہیں۔ تو مجھے یہاں سے سیدھا گلبرگ لے چل پیارے! وہاں میں اپنے ایک جگری یار سے مل لوں گا۔"

ڈرائیور مطمئن ہو گیا اور اس نے گاڑی کا رخ گلبرگ کی طرف موڑ دیا۔

میرا ذہن مسلسل پیچ رہا تھا اس لکڑی کی طرح جسے میری تنگی آگ نے جھر جھر جلا ڈالا ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کہاں جاؤں۔ رہ رہ کر اپنی معصوم سی بھولی بھالی اور ننھی منی جیتی ایسی الھڑ بہن کا چہرہ میری آنکھوں میں ابھرتا تھا۔ ایک طرف وہ دلہن بنی بیٹھی تھی دوسری طرف ڈولی دھری تھی مگر درمیان میں ایک تپتی ہوئی لوہے کی چادر تنی تھی — جو لحظہ بہ لحظہ سرخ ہوتی جا رہی تھی — ایک لاکھ روپے کی قربانی مانگتی تھی وہ چادر — ٹھنڈی ہونے کے لئے۔ وہ بلیدان مانگتی تھی۔ میرا یا میری بہن کا۔ اور ہم دونوں تہی دست تھے۔ دونوں بدنصیبی کے ڈسے ہوئے تھے۔

ہمارا باپ بہت عرصہ پہلے ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ کر اس دنیا سے منہ موڑ گیا تھا۔ ہماری ماں نے کڑی مشقتوں اور ..... اذیت ناک محرومیوں کے خاردار جنگل سے گزر کر ہماری جان کا جسم کا رشتہ برقرار رکھا تھا۔ میں وقت سے بہت پہلے بالغ ہو گیا تھا۔ ماں کے درد کو میں اچھی طرح سمجھنے لگا تھا یہی وجہ تھی کہ وقت سے بہت پہلے دکھوں کی کڑی دھوپ میں جا کھڑا ہوا تھا اور اس رات میں نے خود اس سے وعدہ کیا تھا کہ اسے ایک لاکھ روپیہ مل جائے گا تو وہ میری اسی بے پناہ محبت کا مظہر تھا جو مجھے اپنی ماں سے تھی اور اپنی بہن سے تھی۔ ان کے لئے تو مجھے کوئی کہتا کہ اس بستی کو آگ لگا دو تو خدا کی قسم میں ذرا دیر کے لئے بھی توقف نہ کرتا۔ اور اس رات تو میری ماں نے مجھ سے صرف ایک لاکھ روپیہ مانگا تھا۔

میں نے دل میں یہ بات طے کر لی تھی کہ میں یہ روپیہ صبح سے پہلے پہلے پیدا کر لوں گا خواہ مجھے اس کے لئے خون کا دریا ہی کیوں نہ عبور کرنا پڑے۔ میں دریغ نہیں کروں گا۔ میں اپنی یہ کڑیل جوانی اپنی بہن پر نثار کر دوں گا۔ آخر میں کس دن کام آؤں گا... ان کے —

ڈرائیور نے مجھے گورو مانگٹ کے قریب جا اتارا۔ وہ علاقہ ان دنوں کچھ زیادہ آباد نہیں تھا۔

میں نے اسے دس روپے کا نوٹ دیا اور ٹیکسی سے اتر کر سڑک پر جا ٹھہرا۔ ڈرائیور مجھے عجیب سی نظروں سے گھور رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا ٹیکسی موڑ کر اسی طرف واپس چلا گیا۔ اسے یقین تھا کہ میں اپنے حواسوں میں نہیں ہوں۔ اگر پاگل نہیں ہوں تو شراب کے نشے میں نیم پاگل ضرور ہو چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس نے میرے بارے میں قطعی طور پر یہی رائے قائم کی تھی۔

میرے چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دور دور تک مجھے سڑک پر کوئی راہگیر نظر نہیں آیا۔ میں بجری کے ڈھیر سے اترا اور گلبرگ کے دل کی طرف چلنے لگا۔ اس بستی کے اس مقام کی طرف بڑھنے لگا جو شہر کے لئے روشنی کا منبع ہے۔

میں اس وقت بلیک ٹویٹ کی پینٹ پہنے ہوئے تھا۔ ہر شام تن سازوں کے کلب میں جانے سے پہلے میں یہی پینٹ پہن لیتا تھا۔ ایک سوئڈ ملائی جینز تھی میرے پاس۔ وہ میں نے ملاقاتی فقیروں کی پیروی کرتے ہوئے بڑے فخر سے چڑھا رکھی تھی۔ ایک آدھی آستین کی جرسی سی تھی سرمئی رنگ کی — وہ مجھے بہت عزیز تھی۔ وہ میں اکثر پہنے ہوتا تھا۔ عزیز مجھے وہ جرسی یوں تھی کہ وہ سلمیٰ نے بھیجی تھی میرے لئے اپنی چھوٹی بہن کے ہاتھ۔ اور ...... اور۔

...... یار، یہ بھی تو دیکھو کہ وہ کتنی بڑی چیز تھی میرے لئے۔ ایسی ہی تو دو چار خوشیاں ہوتی ہیں زندگی میں۔ ننھی منی سی بے قیمت حقیر سی، بے بضاعت نظر آنے والی باتیں جو پھیل کر بے کراں ہو جاتی ہیں۔ جن کے متوقع پذیر ہو جانے سے ایسے رنگ ذہن میں ابھرتے ہیں کہ آدمی کی ساری سوچ رنگین ہو جاتی ہے۔

ایسی ہی جرسی تھی وہ۔ اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ مجھے سجتی بھی بہت تھی۔ میرا چوڑا چکلا سینہ، یہ بھرے بھرے ورزشی بازو، یار مجھے کہہ لینے دو کہ میں اپنی ہی محبت میں گرفتار تھا۔ کیا حرج ہے اس میں؟ میں خود کو واقعی بہت خوبصورت طرحدار، مضبوط اور بے مثال سمجھتا تھا۔ میں جو مجید مرزا کا بیٹا ہوں۔ بس مجید مرزا کا جس نے میرا نام غلام جیلانی مرزا رکھا اور جس نے میری پیدائش پر اتنی خوشی منائی تھی کہ وہ ایک ہندو بنیئے کا دو ہزار روپے کا مقروض ہو گیا تھا۔ اور یہ جب کا قصہ ہے جب وہ سہارن پور کے قریب بریلی قطعے میں رہتا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ ایک دن اسے اپنے ایمان کو بچانے کے لئے وہ سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑے گی۔

میں چلتا رہا۔ اندھیرے میں۔ اجالے میں۔ کبھی کسی کھمبے کی روشنی مجھے آغوش میں لے لیتی لیکن پھر اندھیرا نگل لیتا۔ یونہی ہوتا چلا گیا میں اس سوچ میں گم تھا کہ پاؤں دائیں طرف بڑھاؤں کہ بائیں طرف — میں کوئی دس بارہ میل چلا ہوں گا۔ اس رات ادھر ادھر کبھی جنوب میں کبھی شمال میں۔ میں دراصل کسی شے کی تلاش میں تھا کسی ایسی شے کی تلاش میں جس پر میں ذرا دباؤ ڈالوں تو وہ..... ایک لاکھ روپے کے کرنسی نوٹوں میں ڈھل جائے۔ بس میں یہی چاہتا تھا کوئی آسان سا حربہ۔ کوئی غیر مرئی سا معجزہ —

رات کے نو بج گئے۔ میری گھڑی نے کبھی مجھے دھوکا نہیں دیا۔ میں بہت تھک گیا تھا۔ گھڑی کے ریڈیم کے ڈائل نے مجھے جب بتایا کہ جیلانی مرزا نو بج گئے ہیں اور...... تو ابھی تک یونہی ڈھیلا ماجا لئے پھرتا ہے تو میرے قدم سینما کی طرف اٹھ گئے۔ میں نے ٹکٹ لیا اور اندر جا بیٹھا۔

وہاں ایک واہیات سی بے مغز لوگوں کی بنائی ہوئی بے تکی سی فلم چل رہی تھی۔ وہ میں نے رات کے ایک بجے تک دیکھی۔ اور آدھی رات کو میں سینما ہال سے نکل کر ایک بار پھر سڑک پر آ گیا۔

بیس سگریٹوں کے پیکٹ میں سے میں آٹھ سگریٹ پی چکا تھا اور ابھی بات خطرے کے نشان سے ادھر ہی تھی۔ ابھی کافی سٹاک تھا میرے پاس۔

ایک کوٹھی کا نقشہ ٹھہر ٹھہر کر میرے ذہن میں ابھرتا تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ گلبرگ کا کون سا بلاک ہے اور اس کوٹھی کا نمبر کیا ہے؟ میں جان بوجھ کر وہاں رک گیا۔ اس کی ساخت اتنی دلفریب تھی اور اس کے چمن زار سے اس لمحے اتنی عطر بیز خوشبوئیں اٹھ اٹھ کر گرد و پیش کو مہکا رہی تھیں کہ میں مدہوش سا ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اس دلآویز کوٹھی کے مالکوں کی خوش نصیبی میں شریک ہو جاؤں۔

ایک تاریک کونے میں رک کر میں احاطے کی دیوار پھاند کر چمن زار میں جا پہنچا۔ یہاں سے وہاں تک لان میں پھل دار اور خوشبودار درخت اور پودے اُگے ہوئے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ میرا دل میرا ساتھ دے رہا ہے۔ میری زندگی کا وہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کسی کی چار دیواری کی یوں بے حرمتی کی تھی مگر محسوس مجھے یوں ہو رہا تھا جیسے میں سرشار ہوا جاتا ہوں۔ میرے رگ و پے میں عجیب سی سرمستی کی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ تب میں نے جانا کہ وہ راستہ جس پر اس رات میں نے پہلا قدم دھرا تھا میرے لئے بڑا ہی لذت انگیز تھا۔ حیرت ہے کہ مجھے زندگی کے چھبیس سال گزار لینے کے باوجود یہ احساس نہ ہوا کہ وہ راستہ میرے لئے سب سے زیادہ دلفریب راستہ ہے۔

میں اونچے اونچے پھیلے ہوئے پودوں اور درختوں کی اوٹ میں سے ہو کر عمارت کے جنوبی حصے میں جا پہنچا۔ وہ بہت بڑی کوٹھی تھی اور جتہ در جتہ کمرے بنے تھے اس میں۔ مدقوق انداز میں —

میں ایک کونے میں دبکا کھڑا تھا کہ اچانک مجھ سے کوئی شے ٹکرائی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ...... تو حیران رہ گیا۔ وہ کتا تو ہرگز نہیں تھا۔ وہ اتنے زور میں آیا تھا اور مجھ سے ٹکرا کر اپنی ہی جھونک میں سیدھا دیوار میں جا لگا تھا۔

وہ چیتا تھا — پالتو چیتا — اف میرے اللہ۔ میں اپنی زندگی کے اس لمحے کو کبھی بھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ وہ وحشی بے آواز آیا تھا میں نے اپنا چھ انچ پھل کا چاقو سیدھے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ درندہ دیوار میں لگتے ہی پلٹا اور پورے قد سے اچھل کر مجھ پر آ گرا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی ایال پکڑ کر اس کے کھلے منہ سے اپنے بدن

کو بچاتے ہوئے چاقو اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ وہ بلاخیز انداز سے گرجا۔ اس کی گھن گرج میں درد سے نڈھال ہوتے ہوئے بدن کی گونج سنائی دیتی تھی۔ اس نے اپنی پوری قوت سے اپنے دونوں اگلے پنجے میرے سینے پر مارے مگر درمیان میں میرا کمبل آگیا۔ مجھ چھیل کر بھی بے چارہ اس کے منہ پر جا پڑا۔ میں نے چاقو کھینچ کر تابڑ توڑ انداز میں تین چار بار اس کے پیٹ اور سینے میں دھنسا دیا۔ اور..... وہ خوفناک انداز سے چیختا ہوا زمین پر جا رہا۔ میرا سارا کمبل اور ہاتھ اس کے خون میں لتھڑ گئے۔

اچانک مجھے دائیں طرف برآمدے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی ایک عورت لپک کر برآمدے میں آگئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں ٹارچ۔ میں بالکل اندھیرے میں کھڑا تھا۔

وہ باہر نکلتے ہی پکاری۔

"موتی۔ موتی—" وہ اس کے چیتے کا نام تھا۔ وہ سرخ رنگ کا گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ ایسا گاؤن جس کی آستینیں نہیں تھیں اس کے دمکتے ہوئے سونے ایسے ننگے بازو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے وجود میں زلزلہ آگیا ہے۔ اس کے سنہری بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے جنہیں وہ عجیب انداز دلربائی سے دائیں بائیں جھٹک رہی تھی—

"موتی! کیا ہوا تمہیں موتی؟"

وہ بلا جھجک آگے بڑھتی چلی آئی۔ ٹارچ کی روشنی اس نے اس سمت پھیری تھی جدھر سے اسے چیتے کی وہ ہولناک آوازیں سنائی دی تھیں۔

میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور دو قدم دور ایک قدِ آدم پودے کی گھنی شاخوں کے پیچھے جا ٹھہرا۔

وہ لپکتی ہوئی آگے بڑھی مگر چیتے کے پاس پہنچ کر وہ کچھ ایسی دہشت زدہ ہوئی کہ چیختی ہوئی پیچھے دوڑی۔

"اوہ نو..... نو۔ موتی نو۔ حیدر، حیدر کہاں ہو تم؟ اوہ مائی گاڈ۔ موتی مارا گیا۔ او حیدر، مائی گاڈ۔"

یہ کہتی ہوئی وہ دوڑتی ہوئی گئی اور دروازہ کھول کر کمرے میں جا گھسی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اندر سے چٹخنی چڑھنے کی آواز صاف سنائی دی۔

برآمدے میں دو بلب روشن تھے۔ اتنے روشن کہ سوئی پھینکو اور پکڑ لو—

میں دبے پاؤں آگے بڑھا۔ اندھیرا وہاں بہت دبیز تھا۔ میں نے چیتے کے پاس پہنچ کر ذرا دیر کے لئے توقف کیا اور پھر چیتے کو دیکھنے کے لئے کمبل کی اوٹ میں لائٹر جلایا۔ چیتا مر چکا تھا اور اوندھا ترچھا میرے سامنے پڑا تھا۔ مگر وہ روشنی میری دشمن بن گئی۔ مجھے اپنے پیچھے شیشے کے تڑاخ سے ٹوٹنے اور گولی چلنے کی آواز سنائی دی میں شیشے کے تڑخنے کے ساتھ ہی نیچے بیٹھ گیا۔ ایک ثانیے کے ہزارویں حصے میں میں نے خود کو نیچے گرا لیا تھا۔ اور وہی میری کوشش مجھے بچا گئی۔ ایک بار پھر شیشہ چھناکے سے ٹوٹا۔ اب کی بار کھڑکی کے دوسرے شیشے کی راہ سے گولی چلائی گئی تھی۔ مگر میں سنبھل چکا تھا۔ زمین پر لیٹے لیٹے میں اس طرح گھاس پر رینگتا ہوا آگے بڑھا کہ اب میں کھڑکی کے پیچھے سے چلتے ہوئے پستول کی زد سے باہر نکل چکا تھا۔

پستول کی تین اور گولیاں یکے بعد دیگرے میری سمت چلائی گئیں مگر میں بچ گیا میرے اور اس گولی کے زاویے بہت مختلف تھے۔

میں صورت حال کا اچھی طرح اندازہ کر چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نتالی کے جاگیرداروں کی کوٹھی میں ہوں جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں نتالی والوں نے اپنی حفاظت کے لئے چیتا پال رکھا ہے جسے وہ رات کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔

وہ کوٹھی بیس کنال رقبے پر پھیلی ہوئی تھی اور وہ چیتا ایسا سدھایا ہوا تھا کہ کسی طرح بھی اس چار دیواری سے باہر نہ..... نکلتا تھا۔

صرف نتالی والوں نے ہی وہاں چیتا نہیں پال رکھا تھا کیونکہ میں نے سن رکھا تھا کہ گلبرگ میں اور بھی کئی خاندان ایسے ہیں جنہوں نے چیتے پال رکھے ہیں۔ ان کو وہ رات کے وقت اپنی اپنی کوٹھیوں میں کھلا چھوڑے رکھتے ہیں اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ وہ ان کوٹھیوں کی طرف نظر بھی اٹھا سکے۔ یہ بھی مشہور تھا کہ بڈھانوں کی کوٹھی میں ایک چیتے نے دو چوروں کو ہلاک کر دیا تھا۔

اور اس رات میں نتالی والوں کی کوٹھی میں ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ چاقو اس روز میرے پاس محفوظ تھا اور میں نے دو چار ہاتھ چاقو پر آزما بھی رکھے تھے۔ ورنہ تو اس رات میں اس چیتے کا نوالہ بن گیا ہوتا۔

میں اب اس سوچ میں گم تھا کہ وہ عورت جو بلا شبہ گھر میں تنہا ہے پولیس کو ٹیلی فون پر اطلاع ضرور دے گی۔

جونہی یہ خیال میرے ذہن میں آیا میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا— ٹیلی فون کا تار شرقی سمت سے کوٹھی میں آرہا تھا اور ایک جگہ چھ فٹ کی بلندی پر کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر چاقو سے اس تار کو کاٹ دیا۔

تار کاٹتے وقت مجھے گھر گھر کی آواز صاف سنائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی تھوڑے ہی فاصلے پر فون کے نمبر گھما رہا ہے۔ ذرا سی تاخیر ہو جاتی تو میرا ستیاناس ہو جاتا۔ وہ عورت پولیس کو اسی وقت خبردار کر چکی ہوتی مگر ایسا نہیں ہو سکا۔

یہ بات اب ثابت ہو چکی تھی کہ گھر میں کوئی اور ذی روح موجود نہیں تھا— عورت تنہا تھی مگر مسلح۔ اور ابھی تک مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اندر کس راستے سے داخل ہو سکتا ہوں؟

جونہی میں نے تار کاٹا وہ عورت جھلا گئی۔

"اوہ مائی گاڈ— یہ حیدر بھی پتہ نہیں کہاں مر گیا ہے؟"

یہ کہہ کر اس نے شاید ریسور زور سے کریڈل پر پٹخ دیا۔ کھڑکیوں کے شیشے اندھے تھے اور ان میں سے اندر کی کوئی شے دیکھی نہیں جا سکتی تھی—

مجھے محسوس ہوا کہ وہ عورت اب اس کمرے سے نکل کر دوسری طرف جا رہی ہے۔ اچانک مجھے سامنے کوٹھی کے بڑے دروازے پر ایک آدمی نظر آیا۔ اس نے بڑی آہستگی سے دروازے کے جنگلے کے اندر ہاتھ ڈال کر تالا کھولا اور پھر کوئی آواز پیدا کئے بغیر وہ دروازہ بند کر کے عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ تاریکی میں تھا اور مجھ سے یہی کوئی دس ہاتھ دور۔ اس کی چال بتاتی تھی کہ وہ لنگڑا ہے۔ میں نے ایک جست لگائی اور ایک دم اس کے پیچھے پہنچ کر چاقو کی نوک اس کی گردن میں چبھو دی۔

"خبردار— منہ بند رکھو حیدر ورنہ جان سے مار دوں گا۔" وہ دُبلے جثّے کا خاصا تنومند آدمی تھا۔ اس کی عمر یہی کوئی چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ مگر میری آواز اور اپنا نام سن کر وہ لرزنے لگا۔ اس کی تو گھگھی بندھ گئی۔

"ت..... ت..... تم کون ہو بھیا؟"

"میں تیری ماں کا یار ہوں بیٹے۔ دیکھ میں جس طرح کہتا ہوں اسی طرح کر— کیا نام ہے تیری مالکن کا؟"

"اس کا نام عالیہ ہے۔"

میں نے چاقو کی نوک پر ذرا اور دباؤ ڈالا۔

"مجھے اس تک لے چل۔ تو سامنے کے دروازے میں سے اندر جاتا ہے یا کسی اور طرف سے؟"

"میرا راستہ دوسری طرف سے ہے۔ میں مالکن کو اس وقت نہیں جگاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھی سامنے کے دروازے سے نہیں جانا چاہتا۔ چل—"

وہ میرے آگے آگے چل دیا۔ میں نے اسے لان کے اندر ہی پختہ روش سے اتار کر تاریکی میں دھکیل دیا۔ وہ چلتا رہا۔ اس نے پورچ کی طرف جانے کے بجائے کوٹھی کی مغربی سمت کا رخ کیا اور درمیان میں پہنچ کر ایک دروازے کے سامنے رک گیا۔ ہم نے یہ سارا فاصلہ اندھیرے میں طے کیا اور اب بھی ہم اندھیرے میں کھڑے تھے۔

"بلا آواز دروازہ کھول— خبردار— کوئی گڑبڑ نہیں چلے گی۔" میں نے اسے خوفناک لہجے میں دھمکی دی۔

میں اس وقت تک کوئی پیشہ ور مجرم نہیں تھا۔ میری تمام تر حیات میں قیامت کا ہنگامہ برپا تھا۔ میں وہ سارے اسباق بھول چکا تھا جو میری ماں نے اور میرے مرحوم باپ نے پڑھائے تھے۔ میں ہر شے کو فراموش کر چکا تھا میں صرف یہ چاہتا تھا کہ اس کوٹھی میں سے مجھے ایک لاکھ روپیہ مل جائے اور میں اپنی بہن کے سامنے سرخرو ہو جاؤں۔

حیدر نے دروازہ کھولا تو میں اس کے ساتھ ہی اندر گھس گیا۔ چاقو کی نوک میں نے اس کی گردن میں پیوست کر رکھی تھی۔ میں اسے ذرا سی بھی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے اس رات اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا دی تھی اور میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر میں کامیاب ہو گیا تو میرا وہ پہلا جرم آخری جرم ہوگا۔ پھر میں اپنی زندگی کی بڑی سے بڑی ضرورت کے لئے بھی کبھی غلط راہ پر قدم نہیں رکھوں گا۔

حیدر نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بتی جلا دی۔ وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس میں اس نے ایک طرف اپنا بستر ڈال رکھا تھا۔ اور دوسری طرف اپنا ٹرنک، میز کرسیاں بھی ایک طرف لگا رکھی تھیں اس نے۔ اور ادھر ادھر الماریوں کے خانوں میں خاصی صاف ستھری چیزیں موجود تھیں جو اس کی خوش حالی کی غماز تھیں۔ اس کمرے کا دروازہ عمارت کے اندر کی طرف کھلتا تھا۔

"چل مجھے اندر لے چل۔" میں نے سرگوشی کی۔

اس کمرے میں اندر کی طرف دروازے کے اوپر کوئی روشن دان نہیں تھا۔ بلب کی روشنی عالیہ نے شاید دروازے کی درز میں سے دیکھ لی تھی۔ وہ اپنے سلیپر سٹر پٹر گھسیٹتی ہوئی اس دروازے تک آ پہنچی۔

"حیدر، تو کہاں مر گیا تھا خبیث! میں تو برباد ہو گئی۔ کسی نے موتی کو ہلاک کر دیا ہے۔"

حیدر کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"کیا کہا بی بی! وہ چیتا مر گیا ہے؟" وہ بڑبڑایا۔

دروازے کی دوسری طرف عالیہ کھڑی تھی۔

"ہاں۔ کوئی ایسا خونخوار چور تھا کہ اس نے چیتے کو مار دیا ہے وہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ میں بچ گئی ورنہ وہ تو اندر ہی آ جاتا۔" عالیہ کی آواز بہت جوان تھی اور اس کے لب و لہجے میں نسوانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بڑی دبنگ عورت معلوم ہوتی تھی۔

"دروازہ تو کھول بدبخت....."

میں نے اس کی یہ بات سنتے ہی حیدر کو ٹہوکا دیا۔ اس نے چٹخنی کھولی تو میں نے دیکھا کہ عالیہ کے دائیں ہاتھ میں پستول ہے مگر اس کا وہ ہاتھ نیچے جھول رہا تھا اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ چور حیدر کے کمرے میں موجود ہے۔ میں نے بجلی کی سی سرعت

سے چاقو اس کے سینے سے لگایا اور ساتھ ہی بائیں ہاتھ میں اس کی کلائی دبوچ کر پیچھے دھکیلی اور کچھ اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

پستول کے زمین پر گرتے ہی میں نے عالیہ کی کلائی مروڑ کر کمر سے لگا دی۔ اب میں حیدر کے کمرے سے نکل کر کوٹھی کے اندر ہی... راہداری میں تھا — میں نے نیچے جھک کر عالیہ کا پستول اٹھا لیا۔

"حیدر اگر تم نے کوئی حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔ اپنے کمرے سے باہر نکل آؤ۔"

حیدر کا رنگ خوف کی وجہ سے ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ لرزتا ہوا راہداری میں آیا تو میں نے کہا۔

"تم دونوں ادھر چلو۔ مجھے بتاؤ میڈم کہ تمہارا مال کہاں رکھا ہے؟"

راہداری کے بلب کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ عالیہ میرے پستول سے، میرے چاقو سے اور میرے لہجے کی ہولناکی سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ وہ بالکل پرسکون نظر آتی تھی۔

"سنا نہیں تم نے؟" میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" اس نے اپنی وہ آئینہ سی بڑی بڑی صاف شفاف آنکھیں پوری طرح کھول کر یوں مجھے دیکھا جیسے وہ میری صورت ذہن نشین کر رہی ہو۔

"مجھے مال چاہیے مال۔" میں نے اسے خوف زدہ کرنے کے لئے بائیں ہاتھ سے ایک بھرپور تھپڑ اس کے بائیں رخسار پر مارتے ہوئے کہا۔ وہ تیورا کر دیوار سے جا لگی۔

حیدر اتنا خوف زدہ ہوا کہ میرے کہے بغیر ہی اس نے ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔ وہ اس وقت مجھے بہت ہی مضحکہ خیز نظر آ رہا تھا۔

عالیہ کے منہ سے خون رسنے لگا۔ اس کے ہونٹ تر ہونے لگے۔ اسے شاید گہری چوٹ آئی تھی۔ اس نے خون کو اپنی انگلیوں سے پونچھنے کی کوشش کی مگر وہ چوٹ کچھ ایسی گہری تھی کہ خون زیادہ بہہ نکلا تھا۔ اس نے اپنے سکرٹ نما گاؤن کا دامن اوپر اٹھا کر منہ صاف کیا۔

مجھے یقین ہے کہ اس نے عمداً ایسا کیا تھا۔ وہ مجھے رشوت پیش کر رہی تھی —

حیدر کا رخ دیوار کی طرف تھا اور ہاتھ اس نے ابھی تک اوپر اٹھا رکھے تھے۔

"چلو جلدی کرو — میرے پاس تمہارے جلوے دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ چلو —" میں نے ایک اور تھپڑ اس کے دائیں رخسار پر جڑ دیا۔

اس کی وہ بلا خیز خود اعتمادی کی دیوار لرزنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ابلے اور ایک تار ہو کر رخساروں سے ہوتے ہوئے نیچے گرنے لگے۔

"چلو —" اب کی بار میں نے جیب سے کھلا چاقو نکالا اور تو بائیں ہاتھ میں لے کر اس کی نوک سے اس کے بازو پر ایک لکیر ڈال دی۔ اس لکیر کے ساتھ ہی خون پھوٹ نکلا۔ یہاں سے وہاں تک۔ چاقو کی نوک بہت تیز تھی اور اس کی جلد مجھ سے زیادہ نرم اور پتلی تھی — وہ ذرا دیر کے لئے اس خون کو دیکھ کر لرزی اور پھر رکتی ہوئی میرے آگے چلنے لگی۔ اس نے راہداری میں دو دروازے عبور کئے۔ حیدر اس کے پیچھے تھا۔ تیسرا دروازہ مجھے جو نظر آیا وہ بیت الخلاء کا دروازہ تھا اور کھلا ہوا تھا۔

"حیدر!" میں نے بلند آواز سے کہا۔

وہ دونوں رک گئے۔

"چلو تم ادھر اس ڈربے میں گھس جاؤ۔ چلو..." میں نے حیدر کو اس کے کوٹ سے پکڑ کر بیت الخلاء میں دھکیل دیا۔ وہ تو شاید یہی چاہتا تھا۔ چپ چاپ اندر جا ٹھہرا۔ وہ بہت صاف ستھرا سفید ٹائلوں سے مزین بیت الخلاء تھا۔ جس کا اندر سے کسی اور کمرے کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ حیدر اندر پہنچا تو میں نے بائیں ہاتھ سے دروازہ بند کر کے باہر سے چٹخنی چڑھا دی۔

عالیہ کے منہ سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اسی بے ہودہ انداز سے گاؤن کا دامن اٹھا کر میرے سامنے اپنے ہونٹ پونچھے۔

"چلو مجھے مال دکھاؤ۔ سیف کہاں ہے تمہارا؟" میں نے اپنے وجود میں امنڈتے ہوئے جذبات کے طوفان سے بے چین ہو کر کہا —

وہ مسکرائی اور رخ پھیر کر میرے آگے آگے چل دی۔ لگتا تھا جیسے وہ مجھے خود میری منزل تک پہنچانے کے لئے بے قرار ہے۔ ڈرتی تھی کہ میں اسے گولی نہ مار دوں ورنہ میرا خیال ہے کہ مال دینے میں اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کا رویہ ایسا ہی تھا۔

میرے بدن میں قیامت کا ہنگامہ بپا ہو چکا تھا۔ اور نسوں میں ایسا تشنج پیدا ہو رہا تھا کہ لگتا تھا اگر یہی کیفیت چند لمحے اور طاری رہی تو میں پھٹ جاؤں گا۔ میرے بدن کی سرحدوں پر میری نبضیں دھڑ دھڑ بج رہی تھیں۔

مجھے اس لشتی عورت نے زبردست آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ اس کی کمر کسی شاعر کا تخیل معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایسی نہ تھی کہ اسے نظر انداز کیا جا سکتا۔ وہ ساری کی ساری کسی خوبصورت سانچے میں ڈھلی لگتی تھی۔ اگرچہ اس کی عمر میرا خیال تھا یہی کوئی پچیس سال ہو گی مگر اسے معلوم تھا کہ بدن کے کس حصے کو کس وقت حرکت میں لانا چاہئے۔

راہداری میں چند قدم آگے چلنے کے بعد وہ دائیں ہاتھ کے کمرے میں جا گھسی۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ پستول کی نال سیدھی میں نے

اس کے شانے سے لگا رکھی تھی۔

وہ اس کی خواب گاہ تھی۔ میرے تصور سے بھی زیادہ خوبصورت۔ اس میں جا بجا بڑے بڑے قدِ آدم آئینے دیواروں میں جڑے تھے۔ کمرے کے عین بیچ میں ایک بہت بڑا پلنگ بچھا تھا جس کی نرمی کی شاید قسم کھائی جا سکتی تھی۔ کمرے کی ہر شے پیلے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بالکل اس کے اپنے بدن کی سونے ایسی پیلاہٹ کی طرح وہاں کی ہر شے اسی کے رنگ میں رنگی نظر آتی تھی۔

ایک کونے میں ایک چھ فٹ اونچا سیف رکھا تھا۔

"کتنا مال چاہئے تمہیں؟"

اس نے کمرے میں پہنچ کر ایک آئینے کے سامنے رکتے ہوئے کہا۔

"مجھے سارے کا سارا مال چاہئے جو اس وقت تمہارے پاس ہے۔"

وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے اب خون نہیں رس رہا تھا۔

"میرے سمیت؟"

"تمہاری ضرورت نہیں ہے مجھے۔ سیف کی چابیاں کہاں ہیں؟"

"وہ رہیں چابیاں۔ وہ ادھر میرے بیڈ کے نچلے حصے میں بنے ہوئے خانے میں پڑی ہیں۔"

"مجھے وہاں سے خود نکال کر دو۔"

"بہتر ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے مہاگنی کے بنے ہوئے پلنگ کے سرہانے کی طرف بڑھی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے کوئی نہ کوئی داؤ ضرور کھیلے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔

میں عین اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اس نے پلنگ کے نچلے خانے کی دراز کھول کر وہاں سے چابیاں نکالیں۔ وہ چھ چابیوں کا گچھا تھا۔ وہ رقص کے سے انداز میں گھوم کر اٹھی اور میری طرف چابیاں بڑھا کر بولی —

"لو — سیف کھول کر جو چاہے لے جاؤ مگر اس ڈرامے کو مختصر کر دو —"

اب کی بار اس کی آواز میں عجیب سی کرختگی جھلک رہی تھی جیسے وہ مجھے حکم دے رہی ہو —

"نہیں۔ تم خود سیف کھولو گی۔"

"اس کی تین چابیاں آگے کی طرف لگتی ہیں اور تیسری چابی کے ساتھ ہی چوتھی چابی لگنی چاہئے۔ یہ چوتھی چابی ہے اور یہ سیف کے دائیں حصے میں لگتی ہے۔ اسے کھولنے کے لئے ہمیشہ بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ یہ سیف خراب ہو سکتا ہے۔ تو تم تین چابیاں لگاؤ۔ یہ تین میں لگاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے گچھے میں سے تین چابیاں نکال کر مجھے دے دیں۔ مجھے اس کی بات تسلیم کر لینے میں کیا تامل ہو سکتا تھا۔

میں نے بائیں ہاتھ سے تین چابیاں پکڑیں اور سیف کے سامنے جا ٹھہرا۔ میرے پستول کا رخ اب اس کے سینے کی طرف تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں اپنے ہاتھ کی صرف ایک انگلی سیدھی کر کے اس کے سینے میں مار دیتا تو وہاں سوراخ ہو جاتا۔ ایسی ہی بے پناہ نرمی نظر آتی تھی مجھے اس کے بدن میں۔

میں نے بائیں ہاتھ سے ایک ایک کر کے دو چابیاں لگا دیں جب تیسری چابی میں نے سیٹ کی تو وہ سرک کر سیف کے دائیں ہاتھ جا ٹھہری — بولی —

"لو اب تیسری اور چوتھی چابی ہم بیک وقت لگائیں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے چوتھی چابی سیف کے دائیں ہاتھ کی دیوار میں بنے سوراخ میں داخل کر دی۔ اور۔ اور..... اس کے ساتھ ہی سیف کے سامنے کے حصے سے تیز دھار دھواں سا خارج ہوا جس کا پہلا ہی جھونکا مجھے نڈھال کر گیا۔ اس دھوئیں کی دھار سیدھی میرے منہ پر پڑی — میری آنکھیں، میری ناک نتھنے، منہ غرضیکہ ہر حصے میں وہ دھواں جا گھسا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ اور میں ایک ثانیے کے سویں حصے میں دھڑام سے زمین پر جا گرا۔ میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔

جب ہوش آیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں لوہے کے ایک ننگے پلنگ پر یوں پڑا تھا کہ میری دونوں رانوں کو چمڑے کی مضبوط پیٹی سے کس کر پلنگ کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ میری دونوں کلائیاں بھی میرے دائیں بائیں پلنگ کے بازوؤں سے سفید موٹی ڈوری میں بندھی تھیں۔ اور ننگے پلنگ میں سرایت کرتی ہوئی شدید سردی میرے بدن میں منتقل ہو رہی تھی۔ وہ حصے جو ننگے تھے پلنگ سے براہ راست مس ہونے کی وجہ سے زیادہ اذیت سہہ رہے تھے۔

وہ کوئی زیادہ بڑا کمرہ نہیں تھا۔ میرا خیال ہے دس فٹ مربع جگہ ہو گی۔ وہاں میرے پلنگ سے ذرا پرے ایک میز رکھی تھی۔ جس پر ایک شیشے کا جگ رکھا تھا۔ وہ پانی سے لبالب بھرا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک گلاس رکھا تھا۔ اور میز کے دوسرے کونے پر چند کتابیں اور رسالے پڑے تھے۔

کمرے میں دو دروازے تھے۔ ایک شاید باتھ روم میں کھلتا تھا اور دوسرا عمارت کے دوسرے حصے سے منسلک تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں وہاں کب سے اس حالت میں پڑا ہوں۔ میرے فلیٹ بوٹ میرے پاؤں میں موجود تھے۔ بلیو جینز کی پتلون اور جرسی بھی جوں کی توں تھیں اور کمبل میرے پیٹ کے اوپر اس طرح ڈالا گیا تھا کہ نہ ٹانگیں اس سے ڈھانپی گئی تھیں اور نہ چھاتی —

جوں جوں میرے حواس بحال ہو رہے تھے، بھوک کا احساس شدید ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس بھوک سے ہی میں اندازہ لگا رہا تھا کہ مجھے وہاں اس حال میں

بے ہوش پڑے کم از کم تین دن گزر چکے ہیں۔ میں نے کئی بار عام دنوں میں یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ میں کتنے گھنٹے کھانا کھائے پئے بغیر زندہ رہ سکتا ہوں کئی کئی وقت فاقے کئے تھے۔ میرا یہ اندازہ تھا کہ میں کم از کم ڈھائی دن بھی کھائے پئے بغیر اطمینان سے وقت گزار سکتا ہوں مگر ڈھائی دن کے بعد جو وقت مجھ پر آتا ہے وہ بہت کڑا اور ناقابلِ برداشت ہوتا ہے اور اس وقت مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے جگر کے ٹکڑے ٹوٹ رہے ہیں۔ مجھے وہ اپنی تمام تر کاوشیں جو میں نے اس کوٹھی کو لوٹنے کے لئے کی تھیں بے وقعت اور کوششیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے ریت کے قلعے کے تمام کے تمام منہدم ہوتے جا رہے تھے اور مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ میں ایک عورت کے ہاتھوں کتے کی موت مارا جاؤں گا۔ مجھے تو وہ پوری طرح ہوشیار نکلی۔ وہ لڑکی جو اپنی دکان کا سارا مال مجھے دکھانے کے بعد یہ توقع رکھتی تھی کہ میں ایک آدھ چیز تو ضرور ہی خرید لوں گا۔ مگر میں نے تو اس کی کسی شے کو دیکھنا تک گوارا نہ کیا تھا۔ اب وہ مجھ سے جو بھی سلوک کرے کم ہوگا۔

میں نے پہنچ کر اچھی طرح زور آزمائی کرنے کے بعد یہ اندازہ لگا لیا کہ میں اپنے جکڑے بندوں کو کسی طرح بھی نہ کھول سکوں گا۔ اس عورت نے مجھے اچھی طرح کس کر بے بس کر دیا تھا اور میں تیزی سے اپنے اندوہناک انجام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جس میں ذلت تھی، رسوائی تھی، بے پناہ اذیت تھی۔ اپنی بہن کی دبلی پتلی زندگی اپنی تمام تر مظلومیت سمیت مجھے اپنے سامنے پا بریدہ سر برہنہ نظر آ رہی تھی۔ میں اس کے دکھ کا مداوا کرنے گھر سے نکلا تھا مگر ہوا یہ تھا کہ اپنے ہی جال میں پھنس کر تباہ ہو گیا تھا۔

ایک خاص بات جو اس حبس میں میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ وہاں چاروں طرف سگریٹ کی بُو پھیلی تھی جس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہاں سے کوئی شخص ابھی اٹھ کر باہر گیا تھا۔

میں کوئی آدھ گھنٹے تک کسی کٹے درخت کی طرح لیٹا چھت کو تکتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس عذاب سے کس طرح نجات حاصل کروں۔ سب سے زیادہ تکلیف مجھے اس احساس سے ہو رہی تھی، کہ میری ماں اور میری بہن میرے یوں گھر سے غائب ہونے پر سخت پریشان ہوں گی۔

سگریٹ کی بُو برابر میرے دماغ کو چڑھ رہی تھی اور اسی حساب سے میری سگریٹ کی طلب بھی بڑھتی جا رہی تھی مگر میرے تو دونوں ہاتھ بندھے تھے اور اپنی جیب کے بوجھ سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ سگریٹ ابھی تک وہاں موجود ہیں۔

اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے میرا مثانہ پھٹ جائے گا۔ پیشاب مجھے اتنے زوروں کا لگ رہا تھا کہ بات برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے اوپر بہت جبر کیا مگر میری کوئی پیش نہ چلی۔

"عالیہ! حیدر! کہاں ہو تم؟ میرے بندھن کھولو، تمہاری......"

میں نے بلند آواز سے ان دونوں کو پکارتے ہوئے گندی گالی ان کی طرف لڑھکائی۔

وہ کمائی عورت تو شاید کہیں قریب ہی کھڑی تھی مجھے ایک دم دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ ادھر جو میں نے دھیان دیا تو دیکھا سامنے عالیہ کھڑی ہے۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ خدا جانے اس نے اپنے لباس کی تراش خراش پر کتنی محنت کی تھی وہ اس وقت مجھے چھتیس کلی کا اودی رنگت کا زردوزی غرارہ، زری بسنت کی قمیص اور اودا ریشمی دوپٹہ اوڑھے ہوئے کوئی مغل شہزادی نظر آتی تھی۔ دوپٹے پر پشت ماہی کا جال بنا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں کرن پھول جھالے۔ گلے میں حیدرآبادی زمرد کا گلوبند۔ ہاتھوں میں جڑاؤ جہانگیریاں۔ انگلیوں میں چھلا چھلے پہنچے اور پاؤں میں گھنگرو والی پازیبیں تھیں۔ اس کی سج دھج پر تو نظر نہیں ٹکتی تھی خدا جانے وہ کس کو قتل کرنے نکلی تھی۔ اور کہاں جا رہی تھی؟

اسے اس رنگ میں دیکھ کر میں حیران ہو گیا۔ وہ ایسی تو نہ تھی۔

رات جس رنگ میں میں نے اسے دیکھا تھا وہ اس سے اس دم بالکل ہی جدا نظر آتی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ عجیب انداز دلربائی سے اس کے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی کلی کھلی۔ بولی۔

"کیسے ہو پہلوان؟" اس کی آنکھوں سے عجیب سی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ جیسے وہ مجھ پر فتح پا لینے پر بے حد خوش ہو۔

وہ میرے گرد گھوم کر پائنتی جا کھڑی ہوئی۔ اچانک اسے اپنے بستر تر ہوتے محسوس ہوئے اس نے جھک کر فرش پر نظر ڈالی تو بولی۔

"یہ...... یہ...... پانی کہاں سے آیا ہے؟"

اس کی آواز خاصی بلند تھی جسے غالباً حیدر نے سن لیا تھا وہ تیزی سے اندر آ گیا۔ بولا۔

"کیا ہوا؟ بی بی جی کیا ہوا؟"

"یہ پانی کیسا ہے یہاں؟"

"یہ میرا پیشاب ہے۔" میں نے کہا۔

میری یہ بات سنتے ہی وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اتنے زور سے ہنسی کہ اس کے کانوں کے جھالے لرز گئے ـــــ پھر وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتی ہوئی میز کے دائیں ہاتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"پیشاب نکل گیا ہے پہلوان۔ حد ہو گئی۔ یہ تیرے اتنے بڑے بڑے مضبوط بازو۔ یہ چوڑا چکلا سینہ۔ یہ تیری موٹی موٹی رانیں۔ اور تیرا موت نکل گیا ہے۔ خوف سے نڈھال ہو گیا ہے تو۔ ابھی سے تیرا یہ حال ہے تو آگے کیا ہوگا؟"

"میں خوف زدہ نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے میں ساٹھ گھنٹے تک بے ہوش رہا ہوں۔ ایسے میں مثانے پر بوجھ نہ پڑتا تو کیا ہوتا؟" میں نے غصے سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے تیری اکڑ فوں ابھی تک موجود ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ دیکھ لوں گی میں۔ اس کا خیال رکھو حیدر۔ اور ہاں اسے کھانا بھی کھلا دو۔ اور یہ پیشاب صاف کر دو۔"

"اگر مجھے اسی حالت میں رکھنا چاہتی ہو تو اس پلنگ پر ایک گدا ڈال دو۔ میں بلاوجہ بے آرام نہیں ہونا چاہتا۔" میں نے اپنی آنکھوں میں سارے جہان کی سنجیدگی بھر کر کہا۔ وہ ہنس دی۔ ایک بار پھر کھلکھلا کر...... ہنس دی ـــــ

"بلاوجہ بے آرام ہونے کی بھی خوب کہی تم نے۔ پتہ ہے تم نے میرے موتی کو مار دیا ہے۔ اس موتی کو جو میرے لئے انمول تھا۔ میں تم پر کتے چھڑوا دوں گی۔ اسے اپنے کتے کی سزا بھگتنے کے لئے تیار کرو حیدر۔ میں ذرا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ہوا کے تیز جھونکے کی طرح باہر نکل گئی ـــــ

حیدر چغدوں کی طرح سامنے کرسی پر بیٹھا میرا منہ تک رہا تھا۔

"سنا نہیں تم نے کتے کے بچے۔ میرے لئے کھانا لاؤ۔ وہ گشتی کہہ نہیں گئی تھی ـــــ"

"گالی تو نہ دو استاد۔ اب تو بندھے پڑے ہو پھر بھی جانے کو خوفزدہ کئے دیتے ہو۔" وہ واقعی لرز گیا تھا میری آواز سن کر۔ "مجھے سگریٹ سلگا کر دو اور پھر جا کر کھانا لے آؤ۔ مجھے سخت بھوک لگی ہے۔" میں نے پیر ڈپٹتے ہوئے کہا۔ "ادھر دیکھو، میری جیب میں پیکٹ دھرا ہے اگر اس حرامزادی نے نکال نہیں لیا تو لائیٹر بھی یہیں ہوگا نکال لو۔"

حیدر ڈرتے ڈرتے اٹھا اس نے بہت احتیاط سے میری پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ اور لائیٹر نکال لیا۔ پھر اس نے ایک سگریٹ سلگا کر مجھے دے دیا۔

"تم بھی بیٹا ـــــ سور کی اولاد۔ کتنی منحوس شکل ہے تمہاری۔ اگر میں رات ہی تم دونوں کو مار دیتا تو اچھا ہوتا۔" میں نے نہایت ہی بیزار لہجے میں کہا۔

وہ مسکرایا۔ بولا ـــــ

"گالی تو نہ دو استاد۔ ایسا نہ ہو ہم تم پر ہاتھ اٹھا لیں۔ غصے کے بہت برے ہیں ہم۔"

"ابے تیرے ہم کی......" میں نے ایک دم گرجتے ہوئے کہا۔ "تو کیا اور تیرا غصہ کیا ـــــ جا دوڑ کر کھانا لا۔ الو کا پٹھا۔" میں نے اس کے خلاف اپنی زبان سے تیزے کا کام لیتے ہوئے کہا۔ وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا اٹھا۔ اور بولا۔

"مالکن کہہ گئی ہے ورنہ میں تمہیں بالکل منہ نہ لگاتا۔"

"اور دیکھو ایک گدا بھی لیتے آنا۔ پتہ نہیں کتنے دن رکھنا ہے وہ گشتی مجھے یہاں؟"

"ٹھیک ہے گدا بھی لا دیتا ہوں استاد۔ اور کوئی حکم؟" اس نے مجھے ایک خاص انداز میں آنکھ ماری۔ جیسے وہ میری بے بسی کا مذاق اڑا رہا ہو۔

"بہت تیری اس آنکھ بازی کی......" میں نے ایک اور موٹی گالی اس کی طرف اچھالی تو وہ توبہ توبہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

"کس رذیل سے واسطہ پڑا ہے اپنا۔" وہ دروازے سے باہر نکل کر بڑبڑایا۔

"میری رذالت تم لوگوں نے دیکھی ہی کہاں ہے بچو۔ ابھی تو پتہ نہیں کیا کچھ ہوگا یہاں؟"

میں نے دل ہی دل میں کہا۔

مجھے خدا جانے کیوں یہ گہرا یقین تھا کہ وہ لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مجھے اپنے آپ کو وہاں بندھا دیکھ کر کوئی ملال یا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اندر سے میرا دل پوری طرح مطمئن تھا اور مجھے کوئی طاقت آپ ہی آپ یہ احساس دلا رہی تھی کہ میں وہاں سے صاف طور پر بچ کر نکل جاؤں گا۔

جانے کیوں عجیب سا احمقانہ احساس تھا یہ۔ جس کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد حیدر ایک ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ وہ کھانے کی چیزوں سے لدی ہوئی تھی۔ ٹرالی لا کر اس نے میرے پلنگ کے ساتھ کھڑی کر دی۔

بولا۔ "لے استاد کھا۔"

"بکواس نہ کر۔ میرے دونوں ہاتھ بندھے ہیں میں خود کیسے کھا سکتا ہوں؟"

"تیرے ہاتھ پیر تو میں نہیں کھول سکتا کیونکہ پٹیوں کو تالے لگے ہیں البتہ میں تجھے اٹھا کر بٹھا دیتا ہوں۔ تیرے منہ میں لقمے میں خود ڈالتا جاؤں گا بچے۔" یہ کہہ کر اس نے پلنگ کی پائنتی میں لگے ہینڈل کو گھمایا جس سے میرا سرہانے والا حصہ اٹھا اور میں پلنگ پر اس طرح بیٹھ گیا کہ تکیہ میرے پیچھے ہی ایسا ڈھاسنا بن گیا۔

حیدر نے بڑی احتیاط اور نفاست سے مجھے کھانا کھلایا۔ وہ مرغ بھون کر لایا تھا۔ وہ بہت عمدہ کھانا تھا یارو! جس میں مرغ بھی تھا اور نان بھی۔ عمدہ قسم کا اچار بھی تھا اور سلاد بھی ـــــ اور تو اور وہ سالا حیدر میرے لئے فرنی بھی لے آیا تھا۔ تب میں سمجھا کہ حیدر کے دل میں میرے خلاف کوئی نفرت نہیں ہے بلکہ وہ میرے لئے اپنے ذہن میں اچھے اور محبت بھرے خیالات رکھتا ہے۔ حالانکہ میں نے اسے بہت ذلیل کیا تھا۔ پھر بھی وہ مجھ سے اچھا سلوک کر رہا تھا۔ بڑو

حیرت کی بات تھی وہ میرے لئے۔

جب میں پیٹ بھر کر کھانا کھا چکا تو اس نے ایک صاف ستھرے تولیئے سے میرے ہاتھ پونچھے — کلّی کروائی اور جب وہ پوری طرح مطمئن ہو گیا تو بولا۔

"لے استاد اب میں تیری یہ پتلون بھی بدلتا ہوں۔ تو نے تو بچوں کی طرح پیشاب کر دیا ہے۔"

"اب زیادہ ٹر ٹر نہ کر۔ تم سالوں نے پتہ نہیں کب سے باندھ رکھا ہے مجھے۔" اب کی بار میرا لہجہ خاصا خوشگوار تھا۔ جسے محسوس کر کے وہ مسکرایا۔ بولا —

"شہر میں تجھے سگریٹ بھی سلگا دوں ورنہ تو پھر گالی دے گا مجھے — ہے تو خاصی ذلیل شے استاد۔ کسی شریف آدمی کا نطفہ نہیں لگتا تو مجھے۔" یہ کہہ کر وہ اور زیادہ کھل کر مسکرایا اور سگریٹ میرے منہ سے لگا کر اس نے آگ دکھا دی۔

"ابے تیری نطفے کی...... تو سمجھتا کیا ہے خود کو سؤر کی اولاد۔" میں نے پھر اسے پوری گھن گرج کے ساتھ گالی دی۔ پھر وہ سہم گیا۔ نظریں جھکا کر ٹرالی کو دھکیلتا ہوا باہر نکل گیا اور بولا۔

"پڑا سڑتا رہ تو یہاں، اب میں ادھر نہیں آؤں گا استاد! تو ہے ہی کمینہ۔"

"تیرا باپ بھی آئے گا تجھے تو کیا سمجھتا ہے۔ میں یوں ہی پھنسا رہوں گا یہاں؟" — میں نے ایک بار پھر بلند آواز اور ننگے لہجے میں کہا مگر میری بات وہ سن نہ سکا آگے نکل چکا تھا۔

سگریٹ اس لمحے بہت مزہ دے رہا تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ بد ہاتھ ہونٹ اور سگریٹ کے درمیان ایک لطیف سا تعلق پیدا ہوتا ہے میں اس لمحے اس لذت سے محروم تھا۔ محض دھواں آدمی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ سگریٹ نوشی کے اس سارے عمل کو جب تک نہیں دہرایا جاتا آدمی کو تسکین نہیں ملتی۔ یہی وجہ تھی کہ میں لمبے لمبے کش لینے کے باوجود کچھ ہی دیر بعد شدید بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔

حیدر اپنی بات کا دھنی نکلا وہ کوئی دو گھنٹے تک واپس نہ آیا۔ میں بھی چپکا پڑا رہا۔ میں انہیں یہ احساس نہیں دلانا چاہتا تھا کہ میں اذیت میں ہوں اور ان کا حربہ کامیاب ہو رہا ہے۔

مگر جب دو گھنٹے گزر گئے اور وہ ادھر نہ آیا اور اس عرصے میں میری گیلی پتلون اس سرد موسم میں میرے لئے اور زیادہ تکلیف دہ ہو گئی تو میں نے اسے بلند آواز سے پکارا۔

"حیدر ابے او کسی گیدڑ کی اولاد ادھر آئے گا کہ نہیں —"

مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے پھر اسے آواز دی۔ دو بار تین بار چار بار — میں مسلسل اسے پکارتا رہا۔ جب سویں بار میں نے اسے ایک نہایت ہی خوفناک قسم کی شاندار گالی دی تو وہ دروازہ کھول کر تیزی سے اندر آ گیا —

وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گدا تھا اور دوسرے میں لپٹی ہوئی چادر —

"استاد تو گالی دینے سے باز نہیں آئے گا؟"

"ابے ہندوستانی چوہے تو ایسا غائب ہوا کہ — ..... لا ادھر یہ پتلون بدل میری۔" میں نے چادر دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے میرے اوپر کمبل اچھی طرح ڈال کر میری پتلون اتاری مگر میری ٹانگیں تو پٹیوں میں جکڑی تھیں۔ پتلون کیسے اتر سکتی تھی؟

"پتلون پھاڑنی پڑے گی۔"

"اس کے پیسے تیری مالکن دے گی وہ کنجری۔" میں نے کہا۔

"شاید وہ دے دے مگر وہ تیرا چاقو کہاں ہے اس سے میں پتلون کاٹ دیتا ہوں۔"

حیدر نے میری جیبیں ٹٹولیں۔

"چاقو تو ادھر تیری جیب میں نہیں ہے استاد۔"

"اس حرامزادی نے نکال لیا ہو گا تو قینچی لے آ کوئی۔" میں نے بیزار ہو کر کہا۔

حیدر نے میرے کہنے پر عمل کیا جب وہ مجھے چادر پہنانے کے بعد میرے نیچے گدا بچھا چکا تو بولا۔

"استاد! یہ چمڑے کی پٹیاں ہیں جن سے تو بندھا ہے۔ میں چاہوں تو ان کو کاٹ سکتا ہوں مگر میں مالکن کو مایوس نہیں کرنا چاہتا۔" وہ مجھ سے خاصے فاصلے پر میز کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

میں چپ رہا۔ سوچ کی گہری دھند میرے دماغ پر اترتی چلی آ رہی تھی۔ اور اپنے گرد و پیش کی صورتِ حال کو میں اور زیادہ سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

حیدر نے بہت پوچھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں؟ کہاں رہتا ہوں؟ کیا کرتا ہوں؟ اس کوٹھی میں کیسے آیا؟ کس نے مجھے وہاں تک ملنے کی امید دلائی تھی؟ مگر اس کے ان تمام سوالوں میں سے میں نے کسی بھی سوال کا جواب نہ دیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ حیدر دراصل وہ نہیں ہے جو باہر سے نظر آتا ہے۔ وہ اپنے ظاہر سے بالکل مختلف ہے اور اس کے باطن کی گہرائی کا اندازہ شاید ہی کوئی کر سکتا ہو گا۔

"کیا یہ نتالی کے جاگیرداروں کی کوٹھی ہے؟"

"ابے نہیں استاد! یہ تو ڈاکٹر دھمن کی کوٹھی ہے۔"

"ڈاکٹر دھمن کون ہے؟ میں نے تو اس کا نام آج ہی..... سنا ہے۔"

"یہ سرجن ڈاکٹر ہے کبھی ادھر بغداد چلا جاتا ہے کبھی قاہرہ اور کبھی یہاں آ جاتا ہے۔"

"اچھا اور یہ عالیہ کون ہے؟"

"یہ اس کی بیوی ہے یہ بھی ڈاکٹر ہے اور انہوں نے علاج اور آپریشن میں اس کی مدد کی ہے۔"

"یہ بھی بغداد میں رہتی ہے؟"

"نہیں۔ یہ تو یہیں رہتی ہے۔ صرف ڈاکٹر دھمن ہی باہر چلا جاتا ہے۔"

"یہ چیتا انہوں نے یہاں کیوں باندھ رکھا تھا؟"

"یہ ڈاکٹر دھمن نے خود پال رکھا تھا۔ اس کے چند دانت بھی نکال دیئے تھے انہوں نے — یہ پالتو ہونے کی وجہ سے نہیں جانتا تھا کہ کسی کو کیسے کاٹا جاتا ہے۔ جب ہی تو رات تم سے وہ یوں مات کھا گیا جیسے وہ چیتا نہیں گدھا تھا۔ اکثر اوقات تو ہم اسے باندھ کر رکھتے تھے۔ اسے کھولنے میں تو بھی نقصان ہوتا تھا۔"

"مگر اس نے مجھ پر حملہ تو زوردار طریقے سے کیا تھا۔"

"وہ محض ٹکرایا ہو گا۔ اپنے پورے وزن سے تم پر گرا ہو گا۔ ورنہ اگر وہ منہ کھول کر تمہاری گردن پکڑ لیتا تو تمہارا وہیں قصہ پاک ہو جاتا۔ اس کے تو پنجوں کے ناخن بھی کاٹ دیئے جاتے تھے باقاعدگی سے۔ وہ بالکل بے ضرر جانور تھا۔"

"اگر یہی بات تھی تو ان لوگوں نے اپنی حفاظت کے لئے کوئی کتا ہی رکھ لیا ہوتا۔"

"کتے تو یہاں تین تھے مگر تین دن پہلے ڈاکٹر دھمن نے ان کو ایک تجربے کے دوران ہلاک کر دیا۔ اس بات پر انہیں بہت دکھ ہوا مگر کیا کہا جا سکتا تھا۔ وہ بڑے قیمتی کتے تھے۔ اور بہت ہی خونخوار بھی۔"

حیدر مجھے آہستہ آہستہ اس گھر کی باتیں بتا رہا تھا مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ باتیں وہ مجھ سے عمداً چھپا رہا تھا۔

"یہ بتا حیدر کہ عالیہ نے مجھے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا ہے ابھی تک۔ مجھے یہاں بندھے ہوئے میرا خیال ہے تین دن گزر گئے ہیں؟"

"تمہیں یہاں پڑے ابھی صرف ڈھائی دن گزرے ہیں۔ اور مجھے نہیں معلوم کہ مالکن نے ابھی تک پولیس کو کیوں خبردار نہیں کیا ہے؟"

"تجھے پتہ ہے۔ گدھے کی اولاد تو سب جانتا ہے۔ مگر جان بوجھ کر مجھ سے چھپاتا ہے۔ وہ میری مومیائی تو نہیں نکالے گی؟"

میری اس بات پر حیدر بے طرح چونکا۔ میری آنکھوں میں چند لمحوں تک بڑی حیرت سے جھانکتا رہا پھر بولا۔

"نہیں استاد۔ مومیائی تیری بھلا کس کام آئے گی۔ اصل بات یہ ہے کہ شاید میری مالکن کا تجھ پر دل آ گیا ہے۔ وہ لٹو ہو گئی ہے تجھ پر —"

"تو بکواس کرتا ہے۔ میں لعنت بھیجتا ہوں تجھ پر اور تیری مالکن پر۔ یہ غلط فہمی دور کر دینا اس کی۔ میں جتی ستی آدمی ہوں لنگوٹ کا پکا۔ پیر استاد کا چھوڑا ہوا۔ مجھ سے وہ ایسی امید رکھے گی تو ماری جائے گی۔ وہ چاہے ہی چھن کر ناچتی بھی آئے تو بھی میرا دل نہیں برما سکتی ہے وہ۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔ جانے اس کے سلسلے میں زندگی کے اس رخ سے مجھے کیوں اتنی وحشت ہو رہی تھی۔ میں تو ایسا تھا کہ ایسی عورتوں کو چور رنگ کا لٹنا کا ڈھب سمجھتا تھا۔ میں بھلا کیوں کر اس کی چور دھیج سے زیر ہو سکتا تھا۔

حیدر نے میری یہ بات سنی تو چپ ہو رہا۔ کچھ دیر بعد ادھر ادھر کی ہانکنے لگا۔ پھر وہ کمبل میرے اوپر اچھی طرح پھیلا کر بولا۔ "لے استاد! اب تو سو جا۔ مالکن آئے گی تو بات ہو گی۔" یہ کہہ کر وہ باہر جانے لگا تو میں نے اسے کہا۔

"حیدر ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو یہ چمڑہ کاٹ دے میں باہر چلا جاتا ہوں۔ میں تیرا یہ احسان زندگی بھر نہ بھول سکوں گا۔" اب کی بار میں نے اس سے بڑی رسان سے بات کی — اس نے گہری نظر سے مجھے دیکھا۔ اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"مجھ سے یہ امید نہ رکھ استاد۔ میں نے مالکن کا بہت نمک کھایا ہے۔ اس کے دشمن کو میں بھلا کس طرح رہا کر سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

مجھے نیند بھلا کہاں آ سکتی تھی — گدے نے البتہ بہت آرام دیا تھا۔ کھانا پیٹ میں اترا تو ذہن میں دور دراز کے اندیشے سر اٹھانے لگے۔ مجھے اب یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ لوگ میرے لئے شاید کوئی بڑی ہی خوفناک سزا تجویز کریں گے۔ ایسی سزا جس کا ذکر ہی آدمی کے رونگٹے کھڑے کر دے۔ ان سے کچھ بھی بعید نہ تھا کیونکہ وہ جو ٹھنڈے دل و دماغ کے آدمی ہوتے ہیں جب اپنے دشمن کو گالی نہیں دیتے، تھپڑ نہیں مارتے، اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں تو وہ شیطان سے بھی زیادہ خطرناک حربے استعمال کرتے ہیں اپنے دشمن کو زیر کرنے کے لئے، اس کا نام و نشان مٹانے کے لئے۔

میں انہی سوچوں میں تا دیر غلطاں رہا پھر آہستہ آہستہ نیند کے گھاٹ اتر گیا۔ مجھے احساس ہی نہ رہا کہ میں ذلت کا اسیر ہوں اور میری زندگی کا چراغ آندھیوں کی زد میں ہے۔

وقت کا تو مجھے صحیح اندازہ نہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے سہ پہر ڈھل چکی ہے۔ کمرے میں روشنی بہت ہی کم کم تھی۔ مجھے اپنا بدن پتھر ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ سارا دن ساری رات میں یوں مردے کی طرح سیدھا اس بستر کے پلنگ پر پڑا رہا تھا۔ میری نسیں کھنچ گئی تھیں میری بانہیں میرے سر کی طرف پلنگ کے جنگلے سے بندھی تھیں۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔

اس عورت نے سیف کے اندر کچھ ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ وہ کسی کو بھی دھوکا دے کر بے بس کر سکتی تھی۔ مجھے اپنی حاضر دماغی اپنی قوت اور اپنے بدن کی بے پناہ پھرتی پر بے حد ناز تھا مگر اس نے ایک ہی جست میں مجھے زیر کر لیا تھا اب میں اس چوہے کی طرح وہاں پڑا تھا جسے روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا چوہے دان میں غڑاپ سے اندر پہنچ جانے کی دعوت دیتا ہے۔ میری نیند کا شیشہ میرے سر میں ٹوٹ گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں زیادہ دیر تک نہیں سو سکا تھا۔

اچانک دروازے کے قفل پر کسی کا ہاتھ پڑا۔ میں نے کمرے کی نیم تاریک فضا میں آنکھیں بند ہی رہنے دیں۔ میں ان میں سے اب کسی کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ پھر قدموں کی چاپ کمرے میں ابھری۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ میں نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں مگر پھر ایسا ہوا کمرہ ایک دم چکا چوند ہو گیا۔ بلب جلا دیا گیا تھا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

میرے سامنے عالیہ کھڑی تھی ــــ اب وہ قمیص شلوار اور سفید کوٹ میں ملبوس تھی اور ایک شال اس نے ایک عجیب ادائے دلبری سے اپنے سینے پر ڈال رکھی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک آدمی کھڑا تھا... ادھیڑ عمر کا چاق و چوبند آدمی ــــ اس کے قریب ہی ایک اور عورت تھی وہ ڈاکٹر کا سامان اٹھائے ہوئے تھی۔ وہ غالباً ان کی نرس تھی۔

"ہم سمجھے یہ سو رہا ہو گا۔ خیر اچھا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے خون کا گروپ کون سا ہے اور اس کے مختلف اعضا کی حالت کیسی ہے؟"

"کیا بکتے ہو تم؟ میں بیمار نہیں ہوں۔ میرے یہ جبڑے بند کھول دو" میں نے اس کی گفتگو پر غضب ناک ہو کر کہا۔

اس کا لہجہ بہت سرد بلکہ یخ بستہ تھا۔ وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے کسی جانور کو ذبح کرنے سے پہلے قصائی اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔

"یہ بہت جلدی بھڑک اٹھتا ہے ڈاکٹر دمن! اس کی فکر نہ کریں اس کا ڈنک تو میں نے نکال دیا ہے۔ اب تو یہ بس [illegible] کی بھیڑ ہے ــــ بے ضرر ــــ بے بس" عالیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کرتے ہو؟" میں نے چیختے ہوئے کہا۔

"وہاں جاؤ گے تو وہ مار مار کر تمہیں چکنی دُنبہ بنا دیں گے اتنے جوتے وہ تمہاری پیٹھ پر ماریں گے کہ یہ چھ چھ انچ ابھر آئے گی۔" عالیہ نے ڈاکٹر کے ہاتھ سے اسٹیتھوسکوپ لے کر میرے سینے پر لگاتے ہوئے کہا۔

"اچھی کنڈیشن ہے جوان کی ڈاکٹر۔ دیکھیں تو اس کی نبضیں دیکھیں، دل کی حالت کا اندازہ کریں۔" اس نے اسٹیتھوسکوپ ڈاکٹر دمن کے حوالے کر دیا۔

ڈاکٹر نے مجھے بڑی تفصیل سے دیکھا۔ اور پھر میرا فشارِ خون دیکھنے کے لئے اس نے پٹی میرے بازو سے باندھ دی۔ میرا فشارِ خون بالکل ٹھیک تھا۔ نبض دیکھ لینے کے بعد وہ بولا۔

"ڈاکٹر عالیہ! میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں اچھی کنڈیشن ہے جوان کی ــــ ہمارے لئے یہ ہر لحاظ سے موزوں ہے۔" ڈاکٹر دمن نے کہا۔

"یہ میرا میڈیکل چیک اپ کس لئے کر رہے ہو، الّو کے پٹھو؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ان پر اور اپنی قسمت پر مجھے سخت طیش آ رہا تھا۔ میرے منہ سے گالی سن کر ڈاکٹر دمن کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ اس نے تڑاخ پڑاخ تین چار تھپڑ میرے دونوں رخساروں پر دے مارے۔ میں تو بلبلا اٹھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں انگوٹھیاں پہنے تھا جن کی نوکیں میرے گالوں کو چیر گئیں ــ اور میرے منہ سے ویسے ہی خون بہنے لگا جیسے اس رات عالیہ کے منہ سے بہا تھا۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھی اور ڈاکٹر دمن کا اٹھا ہوا ہاتھ کھینچ کر بولی۔

"تو .... تو .... ڈاکٹر۔ پلیز ــــ یہ بندھا ہوا کتا ہے جس کے بھونکنے پر زیادہ توجہ نہیں دینی چاہئے۔ پلیز! دفع کریں۔"

"یہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو یہ رذیل ایک تو ڈاکہ زنی کرتا پھرتا ہے اوپر سے گالی بھی دیتا ہے۔ اس نے میری زندگی کی سب سے قیمتی شے میرا موتی مجھ سے چھین لیا اور ..... اور اوپر سے اکڑتا ہے میں تو اس کا خون پی جاؤں گا ــ اس سؤر کا ــ" ڈاکٹر... کف در دہان ہو رہا تھا۔ وہ ناٹا سا تنومند آدمی تھا اور اس کے تھپڑ میں چار سو چالیس وولٹ کی طاقت تھی۔ خبیث نے مجھے سن کر دیا تھا۔

عالیہ نے اپنی جیب سے رومال نکال کر میرے ہونٹوں سے رستا خون صاف کیا پھر میرے رخسار تھپتھپا کر بولی۔

"اپنی زبان قابو میں رکھو ــــ ورنہ خواہ مخواہ پٹتے رہو گے یہ ڈاکٹر دمن ہی عالیہ نہ وارد، رخوشت نہ وہ ہو جائے گی۔ اچھے بچے بنو۔" یہ کہتی ہوئی وہ مسکرا کر پیچھے ہٹی اور ڈاکٹر دمن کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی ــ

وہ میری زندگی کا تاریک ترین دن تھا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ کسی نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہو اور میں نے اسے بچ کر جانے دیا ہو۔ ایسا کبھی ہوا ہی نہ تھا مگر اس وقت تو میں اس حال میں تھا کہ اپنے منہ پر سے مکھی بھی نہ اڑا سکتا تھا۔ میری بے بسی تو دیدنی ہو گئی تھی۔

وہ لوگ اس کمرے سے نکلے تو کوئی دس منٹ بعد حیدر ٹرالی لئے اندر آ گیا۔ وہ میرے لئے چائے لایا تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی بولا۔

"لے میرے یار چائے پی اور یاد کر اس سسّی کی پیاس جس نے

صحرا میں پانی پانی پکارتے جان دے دی تھی۔ پنوں دراصل پانی کا دوسرا نام ہے۔ ورنہ پنوں نام کی کوئی شے دنیا میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ پانی ہی تھا جسے وہ بلوچ چھاگلوں میں بھر کر اونٹوں پر لاد کر لے گئے تھے۔ اور یہی پانی سسّی کو بروقت نہ مل سکا تھا۔ میں نے سنا ہے چائے پیاس مٹاتی ہے اور سردی دُور کرتی ہے۔"

وہ بہت اچھے موڈ میں تھا۔ اسے شاید معلوم ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر دمن نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ میں بہت بپھرا ہوا تھا مگر اپنا سبق میں لے چکا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ میں بندھا ہوا ہوں اور میری کھلی زبان میرے لئے مصیبت کا سبب بن سکتی ہے۔

"لگتا ہے تیری بولتی بند ہو گئی ہے استاد۔ بس ایک ہی چانٹے میں تیرا مانجھا ڈھیلا پڑ گیا۔ ابھی تو .... وہ کیا کہہ گیا ہے ــــ شاعرِ مشرق! ہاں! ــ

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
محلّے میں کچھ لڑکیاں اور بھی ہیں"

وہ بہت ہی اچھی گفتگو کر رہا تھا اس لیے مجھے یقین ہو گیا کہ جتنا باہر سے بدھو کا آدا نظر آتا ہے اتنا ہے نہیں ــ وہ بہت گہرا ہے گمبھیر ہے کئی پرتوں کا حامل ہے اور اس کو سمجھنے میں میں نے غلطی کی ہے۔

وہ مجھے چائے بھی پلا چکا سگریٹ بھی سلگا کر میرے ہونٹوں میں دے چکا مگر میں نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ اس کے کسی طنز کا جواب نہ دیا۔ وہ لوگ مجھ پر حاوی ہوتے جا رہے تھے میرے اعصاب آہستہ آہستہ چٹختے چلے گئے۔

اچانک مجھے اپنے پیٹ میں مروڑ اٹھتا محسوس ہوا۔ مجھے اجابت کی حاجت تھی۔

"حیدر میرے لئے کموڈ لا، یا مجھے باتھ روم میں پہنچا جلدی کر۔ میں بے اختیار ہو رہا ہوں۔"

"دھت تیرے کی۔ مروا دیا نا تو نے۔ لے یہ انسانوں والی لعنت ابھی تک تیرے ساتھ لگی ہے استاد میں تو سمجھتا تھا تو ہیرو ہے کوئی سُپر مین قسم کی چیز ہے جو چیتے کو مار سکتا ہے حیدر کو چت کر سکتا ہے۔ مگر لعنت ہے تجھ پر تو تو بالکل خس چیز ثابت ہوا۔" یہ کہہ کر اس نے زبردست قہقہہ لگایا۔ اور باہر کی طرف لپکا۔

کچھ ہی دیر بعد ایک بوڑھی عورت کمرے میں آئی۔ وہ غالباً ان کی جمعدارنی تھی یا گھر کی صفائی ستھرائی کے لئے رکھی ہوئی کوئی اور ملازمہ۔ وہ ناک پر یہ بڑا سا پھویا لپیٹ کر میرے قریب آئی میرے تہمد کو سرکا کر اس نے کموڈ میرے نیچے رکھ دیا۔

کوئی پانچ منٹ بعد وہ پھر کمرے میں آئی۔ اب کی بار اس کے ہاتھ میں ایک پمپ ایسی چیز تھی اس نے سارے کمرے میں اسپرے کر دیا جس سے کمرے کا تعفن ختم ہو گیا اور سانس لینے میں وہ ہوا خوشگوار محسوس ہونے لگی کمرے میں خوشبو کا چھڑکاؤ کر کے وہ باہر نکل گئی اور پھر تا دیر ویرانی تنہائی اور بے پناہ اذیت میرے وجود کو کنڈیلے سانپوں کی طرح اپنی لپیٹ میں لئے رہی۔ خدا جانے وہ میرے ساتھ کیا کرنے والے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ میں دم بدم بکھرتا جا رہا تھا، ٹوٹتا جا رہا تھا۔ وہ جو مجھے وہاں سے صاف بچ کر نکل جانے کی امید تھی وہ موہوم ہوتی جا رہی تھی۔

اور پھر آہستہ آہستہ کمرہ تاریک ہو گیا۔ باہر سورج غروب ہو چکا تھا۔ اس کرۂ ارض کی بتی بجھ چکی تھی۔ میرے اندر بھی یہی کیفیت تھی وہاں بھی لحظہ لحظہ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ اور اپنی ذات پر اپنے دست و بازو پر اپنی بے پناہ قوت برداشت پر جو مجھے اعتماد تھا، بھروسہ تھا ناز تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔

کمرے میں اندھیرا پھیلے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ حیدر کو آواز دوں تاکہ وہ بتی جلائے مگر نہیں اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔

کمرے کا دروازہ پھر کھلا۔ ڈاکٹر عالیہ اور ڈاکٹر دمن ایک بار پھر اندر آ گئے انہوں نے آتے ہی کمرے کی بتی جلائی تو مجھے ان کے ساتھ اب کی بار ایک اور آدمی نظر آیا وہ بھی شاید ڈاکٹر ہی تھا۔ کیونکہ وہ بھی سفید کوٹ پہنے ہوئے تھا۔

اب کی بار وہ لوگ آپس میں انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے میرا خیال ہے وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ میں کوئی جٹا ان پڑھ آدمی ہوں اور ان کی گفتگو کو سمجھ نہیں سکتا۔

وہ جو تیسرا آدمی تھا اس کا نام عرفان تھا۔ اس کا لب و لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ پاکستانی نہیں عربی ہے۔ وہ میرے ہی بارے میں گفتگو کر رہے تھے مگر ان کی باتیں سن کر میرے دل کی دھڑکن رکنے لگی۔

ڈاکٹر دمن کہہ رہا تھا ــ

"میں نے اس کا اچھی طرح معائنہ کر لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے بہتر دل گُردے کا جوان ہمیں اگلے پانچ سال میں بھی شاید ہی مل سکے۔ قد کاٹھ کے لحاظ سے بھی یہ شیخ سعید کے برابر ہے۔ اس سے زیادہ موزوں آدمی انہیں اور کہاں ملے گا؟ اور ان کی ضرورت فوری اور اشد ہے اور اسی لئے وہ فوراً یہاں آئے بھی ہیں۔"

ڈاکٹر عرفان بولا "تو پھر ٹھیک ہے کل صبح اس کا ایک گردہ نکال لیں گے۔ میں نے شیخ سعید کے آدمی سے بات کر لی ہے۔ وہ پانچ لاکھ ریال دینے کو تیار ہیں۔"

عالیہ پھڑک اٹھی۔

"ویری گڈ۔ ڈاکٹر عرفان کل ہی یہ قصہ ختم کر دو۔ میں اسے آج ہی رات کلینک میں منتقل کر دوں گی۔" وہ بہت خوش تھی۔

۔تو طے یہ رہا کہ چار لاکھ ریال ہمارے اور ایک لاکھ ریال... آپ کے:

"مجھے منظور ہے، ڈاکٹر، بالکل منظور ہے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر عرفان نے ڈاکٹر رحمٰن سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔

"بند کرو یہ بکواس ڈاکٹر رحمٰن میں تمہاری کھال کھنچوا دوں گا۔ تو نہیں جانتا میں کون ہوں؟ اور میرے گروہ کے لوگ کون ہیں؟ وہ تیری ہڈیوں کا سرمہ بنا دیں گے۔ تو میرا یہ آپریشن نہیں کرے گا۔" وہ میری پائنتی کھڑا تھا۔ میں نے پورے زور سے اپنا پاؤں اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ مائی گاڈ! یہ تو پڑھا لکھا حیوان ہے۔ گاڈ ڈیم اٹ۔"

عالیہ کا منہ حیرت سے کھلا۔

"فکر کی کوئی بات نہیں ہے عالیہ۔ ہماری بات کو یہ سمجھتا ہے تو یہ اور بھی اچھا ہے۔ یہ ذہنی طور پر اپنے ایک گردے سے محروم ہونے کے لئے تیار ہو جائے گا۔" "تو چلیں ہم دیکھیں گے مسٹر ڈاکو! کہ وہ تمہارے گروہ کے لوگ کتنے پانی میں ہیں۔" وہ بہت سنجیدہ نظر آتا تھا ڈاکٹر عرفان کے پلے شاید کچھ نہ پڑا تھا۔ وہ اردو نہیں سمجھتا تھا۔

اتنے میں حیدر اندر آ گیا۔ اس کے پیچھے وہ نرس بھی تھی جو پہلے آئی تھی۔

"میرا خیال ہے اسے ٹیکہ لگا دینا چاہئے تاکہ یہ رات کو آرام سے سو سکے۔" عالیہ نے کہا۔

"ہاں یہ اچھی تجویز ہے۔ چندن ذرا ٹیکہ لگا دے اس کتے کے بازو میں۔ کتنی ذلیل صورت ہے اس کی۔" عالیہ نے نہایت ہی نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

چار لاکھ ریال کی خبر نے اس کے دل و دماغ کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ مجھ سے نرم لہجے میں بات کرتی تھی۔

چندن انہی قدموں واپس گئی اور جب وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو ایک ٹیکے سے بھری سرنج اس کے ہاتھ میں تھی اور اسپرٹ میں بھیگا ہوا روئی کا ایک پھنبہ بھی۔

ڈاکٹر عالیہ نے سرنج اپنے ہاتھ میں لے لی۔ رحمٰن نے میری کلائی کو اسپرٹ سے صاف کیا اور عالیہ نے میری نس میں سوئی گھونپ دی۔ بس سیکنڈ بھی نہ گزرے تھے کہ میرا دماغ ماؤف ہونے لگا اور پھر میں ہر احساس سے عاری ہو کر ہر شے سے لاتعلق ہو گیا۔

جب میرے حواس بحال ہوئے تو مجھے یوں لگا جیسے کوئی آہستہ آہستہ میرے شعور و احساس کے بند ڈبے کا ڈھکنا اوپر اٹھا رہا ہے۔ سارا بدن شل ہو رہا تھا۔ نس نس میں درد بھرا تھا۔ مجھے اس حالت میں پڑے پڑے شاید چھیالیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ میری کمر میں شدید درد اٹھ رہا تھا۔

کمرے میں سورج کی روشنی پھیل چکی تھی۔ یہ سب سمجھا ہوا تھا میرا خیال ہے اس وقت دن کے نو بجے ہوں گے۔ میں کتنی ہی دیر یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ میں ہر بات سے مایوس ہو چکا تھا۔ اتنا مایوس کہ زبان ہلانا بھی عبث نظر آتا تھا۔

اچانک دروازہ کھلا اور حیدر دندناتا ہوا اندر آ گیا۔ وہ ٹرالی دھکیل رہا تھا اور میرے لئے ناشتے کا سامان لایا تھا مگر میں تو کچھ اس طرح سن ہو رہا تھا کہ کسی بات کی خواہش ہی نہیں رکھتا تھا۔ مجھے ان لوگوں کے اس خوفناک منصوبے کی تفصیلات نے مفلوج کر رکھا تھا۔ پھر بھی جب حیدر نے چائے کی پیالی میرے ہونٹوں سے لگائی تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ابھی زندہ ہوں اور میرا بدن اپنی بھوک سے محروم نہیں ہوا۔ میری تمام تر حسیات ابھی بیدار ہیں۔

"لے استاد ناشتہ کر لے۔ اور خوش ہو جا کہ آج تیری زندگی کا عظیم ترین دن ہے۔"

"وہ کس طرح حیدر؟" میں نے بہت ہی بجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کھیل رہا ہے، وہ سب لوگ مجھ سے کھیل رہے تھے، چٹکیاں لے رہے تھے، میرا خون قطرہ قطرہ کر کے نچوڑ رہے تھے۔ حیدر نے میرا سوال سنا تو بولا —

"تجھے پتہ تو ہے میرے یار، پھر کیوں پوچھتا ہے؟ آج تیرے ختنے ہونے ہیں استاد، تیری مسلمانی ہوگی آج۔ تو آج دائرہ ایمان میں داخل ہو جائے گا۔"

"تیری...... حیدر اٹھا لے یہ سب کچھ یہاں سے، اور یاد رکھ اگر مجھے اس عذاب سے کسی نے گزارا تو میں اس کوٹھی کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

"تیرا جواب نہیں ہے استاد۔ ولائتی سؤر جتنا بڑا کلیجہ ہے تیرا۔ اور تیرے ایک گردے کی قیمت پانچ لاکھ ریال پڑ رہی ہے۔ کیسی رہی؟ بہت اونچے ریٹ ہیں تیرے استاد۔ ہو سکتا ہے تیری دونوں آنکھیں بیس لاکھ ریال میں بک جائیں۔ ایک گاہک لگ رہا ہے آج کل۔ مسقط سے آیا ہوا ہے وہ۔ کیا خیال ہے تیرا بیچ اس سلسلے کے؟"

حیدر ایسا حرامی تھا کہ اس کے لہجے کی چبھن نے مجھے ذلیل کر دیا تھا۔ اسے میری بے بسی نے اور زیادہ شیر کر دیا تھا اور اب اس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔

"جا حیدر جا، خدا کے لئے دفع ہو جا یہاں سے۔" میں نے منہ بھر کر اس کے منہ پر تھوک دیا۔ سامنے ہی تو کھڑا تھا وہ۔ اس کا سارا چہرہ میری تھوک سے لتھڑ گیا۔ جسے اس نے ٹرالی میں رکھے سفید رومال سے صاف کیا اور مجھے نہایت ہی غلیظ گالی دیتا ہوا باہر نکل گیا۔

اسے وہاں سے گئے کوئی پندرہ منٹ ہوئے تھے کہ ایک آدمی کو ساتھ لے کر وہ دوبارہ اندر آ گیا۔ وہ آدمی بھی ان کے عملے کا ہی فرد معلوم

ہوتا تھا۔ ان دونوں نے مل کر میرے لوہے کے پلنگ کو وہاں سے دھکیل کر باہر نکالا۔ پلنگ کے نیچے پہیے لگے تھے جس سے وہ آپ ہی آپ فرش پر پھسلتا جاتا تھا۔

وہ مجھے کوٹھی کی راہداری میں سے گزار کر بڑے دروازے تک لے گئے۔ اور پھر انہوں نے پلنگ سمیت مجھے سامنے کھڑی ایک بڑی سی گاڑی میں سوار کرا دیا۔ گاڑی کے پردے گرائے گئے۔ اور چند ہی لمحوں کے بعد کسی نے اندر میرے پاس آ کر میرے منہ اور آنکھوں پر کس کر ایک چوڑی پٹی باندھ دی۔ یوں کہ میری آواز میرے کانوں تک نہ پہنچ سکتی تھی اور میری آنکھیں کچھ نہ دیکھ سکتی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد گاڑی کوٹھی سے نکل کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ لوگ شاید مجھے کلینک کی طرف لے جا رہے تھے۔

اوہ میرے خدا! میں اس لمحے کی اذیت کو زندگی بھر نہ بھول سکوں گا۔ مجھے اپنی بے بسی پر اس قدر رونا آ رہا تھا کہ جی چاہتا تھا میں چیخ چیخ کر ایک دنیا اکٹھی کر لوں اور انہیں بتاؤں کہ دیکھو یہ ڈاکٹر لوگ مجھ پر کس قدر ظلم کر رہے ہیں، مگر میں کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ آسیہ کا معصوم سا ملکوتی چہرہ میری آنکھوں میں ابھرا۔ اپنی اندھی ماں کی پلکوں پر لرزتے آنسو میرے تصور میں لہرائے۔ اور میرا وجود کانپ اٹھا۔ یاد میں — میں کس لئے گھر سے نکلا تھا اور کس مصیبت میں پھنس گیا۔

اس گھر میں داخل ہونے کا میرے پاس کوئی جواز نہ تھا مگر میرے پیٹ کو چیر ڈالنے کا جواز ان بھیڑیوں کو کس طرح حاصل ہو گیا تھا؟ خود ہی انصاف کرو کہ میرے ساتھ کتنی بڑی ناانصافی ہو رہی تھی اب میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ وہ لوگ مجھے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کرتے تھے۔ واقعی وہ میری مومیائی نکالنا چاہتے تھے۔

گاڑی کے پردے کچھ اس انداز سے کھینچے تھے اور وہ اتنے دبیز تھے کہ مجھے کسی طور اندازہ ہی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ لوگ کس سمت کس طرف بڑھ رہے ہیں۔ اور پھر گاڑی ایک جگہ رک گئی اس کے پردے تیزی سے اٹھا دیئے گئے۔ دو آدمیوں نے مجھے پلنگ سمیت گاڑی سے اتارا اور پھر پلنگ کے پائے فرش پر رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے پھر پلنگ کسی جگہ پہنچ کر رک گیا۔ وہاں مہیب سناٹا طاری تھا — میں آنے والے لمحوں کے تصور سے لرز کر بری طرح ہاتھ پاؤں مروڑنے لگا۔ اپنے وجود کو ان سنگین پٹیوں کے حلقے سے چھڑانے کے لئے میں نے زبردست جدوجہد شروع کر دی۔

"ہائے ہائے! یہ جانور تو بدک رہا ہے۔ اسے باندھو بھئی۔ یہ کیا کر رہی ہو تم عالیہ! پلیز ادھر توجہ دو۔" یہ ڈاکٹر رحمٰن کی آواز تھی۔

"اسے انجکشن دے دو چندن۔" ڈاکٹر عالیہ نے کہا۔ وہ ذرا فاصلے پر کھڑی تھی — اور پھر میں نے محسوس کیا کہ کسی نے میرے بازو کی نس تلاش کرنے کے لئے اس پر کس کر ربر باندھ دیا ہے۔ جونہی میرے بازو کی نس ابھری، چندن نے ٹیکہ لگا دیا مجھے بے ہوش کرنے کے لئے ان کے پاس سب سے زیادہ موثر حربہ یہی ٹیکہ تھا۔

اور پھر مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ ان لوگوں نے مجھے کس کس مرحلے سے گزارا۔ جب مجھے ہوش آیا تو مجھے اپنے پیٹ کے بائیں حصے میں درد محسوس ہوا۔ میرے پیٹ اور کمر پر چوڑی سی پٹی بندھی ہوئی تھی — اور میری آنکھیں کھلی تھیں۔ میں گردو پیش کو بہت آسانی سے دیکھ سکتا تھا مگر میں آزاد نہیں تھا — میری دونوں ٹانگیں پہلے کی طرح پلنگ سے بندھی تھیں چمڑے کی پیٹی سے۔ اور میرے ہاتھ اب کی بار سر کی طرف پلنگ کے بنگلے پر بندھنے کے بجائے پہلو کی طرف بندھے تھے۔ اس طرح کہ میں کہنیوں سے لے کر انگلیوں کی پوروں تک کا حصہ حرکت میں لا سکتا تھا مگر اپنے بازوؤں کو نہیں ہلا سکتا تھا۔

مجھے ان لوگوں نے سفید براق قمیص اور پاجامہ پہنا دیئے تھے اور میرے قریب ہی پلنگ کے ساتھ لگی ہوئی ایک تپائی رکھی تھی جس پر سگریٹ بھی تھے اور پھل بھی مگر نہ وہاں دیا سلائی تھی نہ چھری۔ تپائی پر میرے ہاتھ کی رسائی کے عین نیچے ایک گھنٹی لگی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہو تو گھنٹی بجا دوں۔

دائیں پہلو میں درد کی ٹیسیں خاصی اٹھ رہی تھیں۔ اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ جب میں کچھ زیادہ ہی نڈھال ہونے لگا تو میں نے گھنٹی بجا دی۔

گھنٹی کی آواز اس چھوٹے سے کمرے میں صور اسرافیل کی طرح گونج گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ آواز بھی میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ میری نقاہت حد سے گزر چکی تھی اور وقت کا احساس میرے دل و دماغ سے ختم ہوتا جا رہا تھا۔ میری بدنصیبی نے مجھے کھیل کھیل کر دیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے میں نے خدا کی دی ہوئی صحت جوانی اور حوصلہ مندی ایسی تمام نعمتیں نالی میں بہا دی ہیں۔ ایک نہایت ہی ادنیٰ سی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے میں نے اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ مجھ سے زیادہ بڑا مورکھ اور کون ہو سکتا تھا۔

گھنٹی کی بھی آواز پر کوئی بھی اندر نہ آیا۔ میں نے پھر پے بہ پے گھنٹی پر دھپ مارے۔ اتنا تو ہاتھ نہیں کھلتا تھا کہ میں زیادہ زور دے سکتا۔ بالآخر گھنٹی کی آواز کام کر گئی۔ ایک نرس جو عمر میں یہی کوئی اٹھارہ انیس سال کی ہوگی تھل تھل کرتی اندر آ گئی۔ وہ دُہرے بدن کی خاصی فربہ جسم کی ترو تازہ لڑکی تھی — وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ لیلیٰ —

"گھنٹی تم نے بجائی ہے؟"

"ہاں۔ مجھے پیٹ میں یہاں درد محسوس ہو رہا ہے مگر یہ تو بتاؤ مجھے یہاں پٹی کیوں بندھی ہے؟"

"پٹی کیوں بندھی ہے عجیب بے وقوف آدمی ہو تم۔ تمہارے گردے میں پتھری تھی۔ جس کو نکالنے کے لئے سات دن پہلے آپریشن کیا گیا ہے اب تو تم بہت بہتر ہو۔ ٹھہرو میں ابھی تمہیں گولی دیتی ہوں۔ درد ابھی ختم

جانے لگا۔" یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف جانے لگی۔ اور میں سوچتا ہی رہ گیا کہ اس کلینک کے لوگوں کو یا تو ڈاکٹر رحمٰن نے بے وقوف بنایا ہے یا وہ مجھے احمق سمجھتے ہیں۔ ورنہ صاف ظاہر تھا کہ وہ لوگ مجھے میرے ایک گردے سے محروم کر چکے تھے۔ درد کی ایک اور لہر میرے پہلو سے اٹھی اور سارے بدن کو دہلاتی چلی گئی۔ میری حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ وہ نرس تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی واپس آئی اور بولی۔ "لو یہ کھا لو اور سو جاؤ۔"

"ابھی تو سو کر اٹھا ہوں چھمک چھلو۔" میں نے نہایت ہی بازاری انداز میں کہا۔

"کیا؟ کیا کہا تم نے مجھے۔ میں چھمک چھلو ہوں؟" وہ چیختی ہوئی بولی ——

"وہ عالیہ حرامزادی کہاں ہے؟ اسے کہنا کہ جیلانی یاد کرتا ہے۔" میں نے اس نرس کو اور زیادہ حیران کرتے ہوئے کہا۔ اور گولی اس کے ہاتھ سے لے کر منہ میں ڈال لی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پانی کا گلاس میرے لبوں سے لگا دیا۔

"لگتا ہے تم پاگل ہو گئے ہو۔ جانتے ہو وہ کتنی بڑی ڈاکٹر ہے —— ایف آر سی ایس ہے۔" وہ مجھے گولی کھلا کر بولی۔

"اس ایف آر سی ایس کی ایسی تیسی۔ اسے میرے پاس بھیجنا۔ تمہیں کیا نام ہے تمہارا؟" وہ گلاس لینے کے لئے ذرا آگے جھکی تھی کہ میں نے اس کے بالوں سے پکڑ کر آگے کھینچا۔

"اوئے کتے دے پتر۔ توں کیہ مصیبت ایں۔" یہ کہتی ہوئی وہ تیزی سے پیچھے ہٹی اور تڑاخ سے اس نے میرے رخسار پر طمانچہ دے مارا۔

"تمہارا ہاتھ خاصا بھاری ہے۔ میرا خیال ہے تمہارا پاؤں بھی بھاری ہو گا۔"

"لعنت ہزار لعنت، تیرے اُتے۔ توں آدمی نئیں سُور ایں سُور۔" اس نے خالص پنجابی لہجے میں مجھے ڈانٹا۔

اس لمحے وہ مجھے کسی ڈیوڈ دھیشاں کی اولاد لگتی تھی۔ وہ پیر پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔

ابھی اسے گئے ہوئے دس منٹ ہی گزرے تھے کہ عالیہ اپنی پوری شانِ بے نیازی سے اٹھلاتی ہوئی اندر آ گئی۔ وہ اس لمحے بھی ڈاکٹر کا لباس پہنے تھی۔

"یہ کیا ہوا ہے کہ تم نے رینا سے کیا بدتمیزی کی ہے؟"

"عالیہ۔ تم سے وہ زیادہ دلکش لگی ہے مجھے۔" میں نے عالیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ میں ان لوگوں کو جس حد تک ہو سکتا تھا ذلیل کر دینا چاہتا تھا۔ میرے ٹوٹ کر بکھر جانے اور ان کے قدموں پر سر رکھ کر التجا کرنے اور اپنی زندگی کی بھیک مانگنے کی ذلت سے مجھے خدا نے بچا لیا تھا۔ ان کا دیا ہوا وہ بے ہوشی کا ٹیکہ میرے لئے رحمت ثابت ہوا تھا ورنہ مجھے گزرنا تو تھا ہی اس اذیت سے۔

اور مجھے یقین تھا کہ وہ اپنا کام کر چکے تھے۔ پانچ لاکھ ریال وہ کما چکے تھے۔ میری وہ بات سن کر عالیہ کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔

"یہ مسخرگی یہاں نہیں چلے گی —— سمجھے۔ کمینے۔ ذلیل انسان۔ میں تمہاری کھال کھنچوا دوں گی۔"

"وہ تو کھنچوا ہی دی ہے تم نے عالیہ۔ پانچ لاکھ ریال تو میرے گردے کا کما بھی چکی ہو تم؟"

اس لمحے رینا نے کچھ اس طرح مجھے دیکھا جیسے وہ حیرت کی زیادتی میں دم توڑ دے گی۔

"یہ تو پاگل ہو گیا ہے رینا۔ اس کی بات کا برا نہ ماننا۔ اسے دور سے راتب ڈال کر باہر نکل جایا کرو۔ آؤ ادھر۔" یہ کہہ کر عالیہ اس نرس کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی۔

پھر وہ مجھے نظر نہیں آئی۔ سارا دن میں اپنے زخم سہلاتا رہا۔ روتا رہا، سوچتا رہا کہ میں کہاں سے کہاں جا پہنچا ہوں۔ یہ کس شکنجے میں کس دیا ہے مجھے تقدیر نے —— مگر میرے رونے سے بھلا کیا ہوتا تھا۔ میرے وجود پر عالیہ کا خنجر کچھ اس طرح چل چکا تھا کہ میں ساری زندگی بھی اگر سر پر ہاتھ رکھ کر روتا تو بھی اس کا اندمال نہ ہو سکتا تھا۔ مجھے وہ سات روز پہلے میرے ایک گردے سے محروم کر چکے تھے اور اب تک وہ مسلسل مجھے بے ہوش رکھتے چلے آ رہے تھے۔ غذا مجھے وہ نالی کے ذریعے دیتے رہے تھے۔ دن کی دوا، دوپہر کا کھانا، سہ پہر کی چائے اور شام کا کھانا اس روز مجھے ایک بڑھیا نے پہنچایا۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولتی تھی۔ شاید وہ کانوں سے بہری تھی۔ میری کسی بھی بات کا وہ جواب نہ دیتی تھی۔ اشاروں سے وہ میری غرض سمجھتی تھی۔ زبان سے اس کا میں کچھ اندازہ نہ کر سکا۔ رات کو اسی نے مجھے آخری بار دوا پلائی اور پھر چپ چاپ باہر نکل گئی۔

اردگرد چاروں طرف دس بجے تک سناٹا چھا گیا۔ دس بجے کا احساس مجھے یوں ہوا کہ جہاں میں قید تھا وہاں سے کچھ ہی دور کسی جگہ کوئی بہت بڑا کلاک لگا تھا جس کی آواز مجھے صاف سنائی دیتی تھی۔

اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ درد کا احساس منجمد ہو چکا تھا وہ کوئی ایسی دوا دے گئے تھے مجھے جس سے بدن درد کے احساس سے عاری ہو جاتا ہے۔ میں سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا۔ زندگی تو نے جو مجھ سے اتنا سنگین مذاق کیا ہے تو اس کا انجام کیا ہو گا۔ وہ بہت طاقت ور لوگ تھے جن کے شکنجے میں میں کس دیا گیا تھا۔ میرے سر ماتھے پر ایک بہت بڑے جرم کی مہر لگی تھی۔ مگر اس کی سزا مجھے کیا ملتی۔ مجھے پولیس پکڑتی عدالت میں پیش کرتی۔ [illegible] ہوتی۔ عدالت مجھے دو چار سال کے لئے جیل بھیج دیتی اور اس دارالامان سے میں ذہنی طور پر پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط اور توانا ہو کر نکلتا مگر اب تو مجھے بیکسی کی موت مارا گیا تھا اور یہی میرا سب سے بڑا المیہ تھا۔

اچانک میرے محبس کا دروازہ کھلا۔ رینا ایک جھپاکے سے اندر

آئی اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں دواؤں کی ٹرے تھی جس میں تھرمامیٹر بھی تھا اور سرنج اور سوئیاں بھی۔

"کیسے آئی ہو میری جان؟" میں نے نہایت ہی شہد سے پگے کہا۔

"پھر تم نے بدتمیزی کی۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم دل سے یہ باتیں کہتے ہو؟"

"کیوں یقین نہیں آتا ہے تمہیں؟ میرا ایک گردہ نکال لیا ہے تم نے اور اب بھی امید رکھتی ہو کہ میں تم سے اچھے لہجے میں بات کروں۔ میں جس دن یہاں سے آزاد ہو گیا وہ دن تم لوگوں کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔" میں نے بہت تپے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کر کے پلٹی اور دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر جھانکنے لگی۔ دو منٹ بعد وہ اپنا کوٹ اتار کر اطمینان سے کرسی آگے کھینچ کر میرے قریب بیٹھ گئی۔

"تمہیں کس نے بتایا ہے کہ تمہارا گردہ نکال لیا گیا ہے؟"

"میں نے اس عالیہ اور خبیث رحمٰن کی باتیں سنی تھیں۔ وہ کسی عرب شیخ کو میرا گردہ دے چکے ہیں پانچ لاکھ ریال میں، مگر تم تو یوں پوچھتی ہو جیسے تمہیں علم ہی نہیں ہے۔"

"یہ تمہارا وہم ہے۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا نام جیلانی ہے مگر تم کیسے کہتی ہو کہ یہ میرا وہم ہے؟"

"اس لئے کہ گردے کی پتھری کے آپریشن میں تو پیٹ پر زخم لگتا ہی ہے اور یہی شکایت تھی تمہیں۔"

"یار تم بہت بھولی ہو رینا یا پھر شیطان کی خالہ کی پھوپھی کی بھانجی کی بھتیجی ہو —— پتہ نہیں یہ لوگ اب تک کس کس کے گردے بیچ کر کھا چکے ہوں گے۔"

وہ ہنس دی۔ بولی۔

"چھ مہینے پہلے مجھے بھی گردے میں پتھری کی شکایت ہو گئی تھی ڈاکٹر عالیہ نے آپریشن کیا تھا اور میں ٹھیک ہو گئی تھی۔ یہ دیکھو میرا ابھی پیٹ اتنا کٹا ہوا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا دامن اٹھا دیا۔

اس کے پیٹ پر ایک لمبا سا گھاؤ تھا۔

"تو بھی بہت بھولی ہے رینا۔ تو کہتی ہے تیرے گردے سے پتھری نکالی تھی ان لوگوں نے۔ نہیں، نہیں۔ تو بھی میری طرح زنِ یک گردہ ہو چکی ہے۔ مگر پھر بھی تو بہت خوب صورت ہے رینا۔ بہت خوبصورت ہے۔"

کچھ دیر کے لئے میں بھول ہی گیا کہ میں کس دکھ میں مبتلا ہوں مگر وہ جلدی ہی مجھے کھینچ کر آگہی کے حلقے میں واپس لے آئی، بولی۔ "میں نے اپنا کئی بار معائنہ کرایا ہے میرے دونوں گردے صحیح سالم ہیں اور یہ درد کا مجھے لگتا ہے میرے ساتھ نہیں کیا گیا ہے مگر یہاں پتہ نہیں کن کن لوگوں پر یہ دونوں ڈاکٹر ہاتھ صاف کر چکے ہیں۔" اسے اب میری باتوں پر یقین آنے لگا تھا۔

"اگر تیرا گردہ سلامت ہے تو بڑی اچھی بات ہے مگر میں اپنے گردے سے محرومی کا —— ان سے بہت خوفناک انتقام لوں گا رینا۔ ایسا انتقام کہ یہ نہ مر سکیں گے نہ جی سکیں گے مگر تم ..... تم یہاں کیوں آئی ہو اس وقت؟"

"دیکھو میرے تمہارے درمیان یہ بات ہمیشہ ایک راز رہے گی۔ میرا خیال ہے میں تمہیں آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد یہاں سے چپکے سے نکال کر آزاد کرا سکوں گی۔ اس سے پہلے تمہارا یہاں سے نکلنا اچھا نہیں۔ تمہارا زخم خراب ہونے کا خطرہ ہے۔" اس نے سرگوشی کی۔

"ٹھیک ہے اگر تم اتنی ہی مہربان ہو مجھ پر تو میں سمجھوں گا کہ یہ میری خوش قسمتی ہے مگر میرا ایک کام تو کر دو۔"

"کیا؟ اگر کوئی باہر کا کام ہے تو وہ میں صبح ہی کر دوں گی۔"

"تم بس یوں کرو کہ ایک کاغذ قلم لا دو۔ میں ایک رقعہ اپنی بہن کے نام تمہیں دوں گا۔ وہ تم لفافے پر میرا پتہ لکھ کر ڈاک میں ڈال دینا۔"

"یہ بھی کوئی کام ہے۔ میں صبح جب آؤں گی دوا دینے تو تمہیں کاغذ پنسل اور لفافہ دے دوں گی ٹھیک؟ اب میں چلتی ہوں تم آرام کرو۔"

"مگر یہ تو بتاؤ یہ جگہ کون سی ہے؟"

"یہ ڈاکٹر رحمٰن کا پرائیویٹ کلینک ہے شفا بار۔ اور ستو نگ روڈ کی کوٹھی نمبر ۱۸ میں قائم ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ امید ہے مجھے تم اپنی توجہ سے محروم نہیں کرو گی۔" میں نے کہا۔

جب وہ باہر نکلی تو اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ بہت خوش جا رہی تھی مجھ سے۔

وہ چلی گئی تو مجھے دنیا پہلے سے زیادہ بہتر جگہ نظر آنے لگی۔ میں اس کے بارے میں جوں جوں سوچتا گیا یہ نتیجہ آپ ہی آپ میرے ذہن پر مرتب ہوتا گیا کہ ابھی زندگی اس قابل ہے کہ اسے ایک آہنی عزم کے ساتھ گزارا جائے۔ ابھی شاخوں پر پھول کھلتے ہیں اور ابھی کلیوں پر شبنم اترتی ہے۔

دوسرے دن میں نے اسے صالحہ کے نام رقعہ لفافے میں بند کر کے دے دیا جس میں میں نے صالحہ سے کہا تھا کہ وہ فکر نہ کرے میں خیریت سے ہوں۔ اس کے سوا میں نے اور کچھ نہ لکھا۔ ورنہ وہ بہت زیادہ فکر مند

ہو جاتی۔

اسی دن ریٹا نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر دھمن اور عرفان بغداد چلے گئے ہیں۔ صبح کی پرواز سے ـــ

مجھے قطعاً کوئی تعجب نہ ہوا۔

اور پھر یوں ہوا کہ اسی شام میرے کمرے میں دو نرسیں آئیں۔ انہوں نے پہلے تو ایک مضبوط چمڑے پر بندھی لوہے کی زنجیر میرے بائیں ٹخنے پر پہنائی اور اسے پلنگ کے پائے سے منسلک کر کے تالا لگا دیا۔ پھر انہوں نے میری باہوں اور رانوں کے جکڑ بند کھول دیئے۔

"یہ مہربانی میری کس نیکی کا ثمر ہے مائی ڈیئر سسٹرز۔" میں نے پوچھا۔

"اب آپ خطرناک مریض نہیں رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اب آپ کا پاگل پن ختم ہو گیا ہے۔" ایک نرس نے کہا۔

اچانک ایک قیم شحیم آدمی اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بید تھا۔ آتے ہی بولا "یہ کیا بکواس ہے؟ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ تم مریضوں سے کوئی بات نہیں کرو گی۔ چلو باہر نکلو۔" وہ دونوں نرسیں خوف زدہ ہو کر باہر بھاگ گئیں۔ اس آدمی نے گہری گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا ـــ

"دیکھ اوئے کتے کی ہڈی! اپنی زبان بند رکھا کر ورنہ میں اسے گدّی سے کھنچوا دوں گا۔ اس رعایت کو کافی سمجھ کہ تیرے چار جکڑ بند کھل گئے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے بید آہستہ آہستہ اپنی ہتھیلی پر مارا۔ اس کی گردن خاصی اکڑی ہوئی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا پہلوان؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

وہ میری تعلّی پر بدک سا گیا۔

"میرا نام سوات خان ہے مگر تو کیوں پوچھتا ہے میرا نام؟" اس نے بڑی تُخ نخ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں یونہی! میں نے سوچا شاید کبھی تم سے کوئی کام پڑ جائے پہلوان! آدمی آدمی کا دارو ہوتا ہے۔" میں نے پانسہ بدلتے ہوئے کہا۔ میں اس قابل کہاں تھا کہ اس سے الجھ سکتا۔ وہ اپنی مونچھ مروڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ بڑی گھیر دار شلوار پہنے ہوئے تھا وہ۔ اور مجھے وہ ہیبت خان کا سالا لگتا تھا۔ بڑا ڈیل ڈول تھا اس کا۔

میرے اگلے دس بارہ دن اس کمرے میں بہت اچھے گزرے۔ ریٹا مجھ پر بہت مہربان رہتی۔ میرا خیال ہے وہ مجھ پر کچھ زیادہ ہی فریفتہ ہو گئی تھی۔ اس عرصے میں نہ میں نے عالیہ کو دیکھا نہ ڈاکٹر دھمن کو۔ میرا زخم اب بڑی حد تک مندمل ہو چکا تھا۔ اور میں آسانی سے پلنگ پر اٹھ بیٹھ سکتا تھا۔ غذا بھی میں اب پوری طرح ہضم کرنے لگا تھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ کسی بھی ڈاکٹر نے اس عرصے میں میرا معائنہ نہیں کیا

مگر میرا یہ خیال غلط نکلا۔ مجھے وہ ہر شب نیند آور دوائیں دیتے تھے۔ اسی نیم بے ہوشی کی حالت میں ڈاکٹر عالیہ آ کر میرے زخم کی پٹی بھی بدلتی تھی اور میری عام حالت دیکھ کر دوا میں بھی مناسب ردوبدل کر دیتی تھی۔ یہ بات بہت دنوں بعد مجھے ریٹا نے بتائی۔

وہ لوگ بہت سی باتیں اپنے عملے سے مخفی رکھتے تھے۔ ریٹا کو میں نے پوری طرح شیشے میں اتار لیا تھا۔ یہی میرے لئے بہتر تھا۔ یہاں سے اپنی رہائی کا یہی راستہ کھلا تھا میرے لئے۔ اور یہی وجہ تھی کہ میں نے ریٹا پر حسن کی تعریفوں کے ہر موقع پر خزانے لٹا دیئے تھے ـــ وہ بہت خوش تھی مجھ سے۔ اس کے انا کے تاروں کو تو جب بھی میں چھیڑتا تھا وہ جھنجھنا کر ایک مدھر موسیقی میں ڈھلنے لگتے تھے۔

وہ اس حد تک آگے بڑھ آئی تھی کہ میرے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ تھی۔

اور پھر وہ رات آ گئی جس کا اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ اس رات وہ پھر ایک بجے کے قریب میرے کمرے میں آئی۔ وہ نرسوں کے عام لباس میں ملبوس تھی۔ رات کی ڈیوٹی پر ہونے کی وجہ سے وہ کسی بھی مریض کے کمرے میں جا سکتی تھی۔ اس نے دواؤں کی ٹرے تپائی پر رکھی اور بولی ـــ

"جیلانی تیرا زخم بالکل ٹھیک ہو چکا ہے۔ تو اب تیار ہو جا۔ میں تیری زنجیر کاٹ رہی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

"تیرا یہ احسان میں عمر بھر کبھی نہ بھول سکوں گا ریٹا!"

"احسان کی بات نہیں ہے اگر تو کچھ دن اور یہاں رہ گیا تو پھر پتہ نہیں یہ لوگ تیرے ساتھ کیا سلوک کریں؟" یہ کہہ کر اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی آری نکالی اور میرے پلنگ کے پائے کے قریب بیٹھ کر میری لوہے کی زنجیر کاٹنے لگی۔

آری کی کھر کھر کی آواز اس سناٹے میں عجیب سی گونج پیدا کر رہی تھی۔ اس کی آواز کو دبانے کے لئے میں زور زور سے کھانسنے لگا۔

ابھی دو منٹ ہی گزرے تھے کہ دروازے پر بڑی زوردار دستک ہوئی۔ ریٹا کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے آری میرے بستر کے گدے کے نیچے رکھی اور لپک کر چٹخنی بڑی آہستگی سے نیچے گرا دی۔ اتنی آہستگی سے کہ ذرا سی بھی آواز پیدا نہ ہوئی۔ ابھی وہ پیچھے ہٹ ہی رہی تھی کہ دروازہ زبردست دھماکے سے کھلا۔ اور وہ اس کی لپیٹ میں آ کر دیوار سے جا لگی۔ سوات خان دندناتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ کھلا چاقو اس کے بائیں ہاتھ میں تھا۔ اس نے جھک کر میری زنجیر دیکھی جس کی ایک کڑی کٹ چکی تھی۔ صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے وہ چیختا ہوا بڑھا اور ریٹا کو اس نے بالوں سے دبوچ کر کچھ اس طرح جھنجھوڑ

کر کے دیوار میں دے مارا کہ وہ بلبلا اٹھی۔

"یار کا رستہ کھولتی ہے حرامزادی! تیری یہ جرأت۔" یہ کہہ کر اس نے تڑاخ پڑاخ اس کے رخساروں پر تھپڑ دے مارے۔ وہ بلند آواز سے چیخی۔

یہ سب کچھ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ مجھے ڈر تھا، تو صرف یہ تھا کہ میرے زخم کے ٹانکے نہ ادھڑ جائیں مگر وہ صورتِ حال ایسی تھی کہ میں خاموش نہ رہ سکتا تھا۔ ریٹا صرف میری وجہ سے اس مصیبت میں پھنسی تھی۔ میں پورے قد سے اپنے پلنگ پر اٹھا اور اپنا کمبل میں نے سوات خان پر ڈال کر اسے ایک جھٹکے سے پلنگ پر گرا دیا۔ زنجیر جگہ نہیں دیتی تھی۔ اس لئے میں نے بیٹھ کر سوات خان کی گردن دونوں ہاتھوں سے دبا دی۔ وہ کمبل میں آدھا لپٹا ہوا تھا اور اس کا سر میری دونوں ٹانگوں میں پھنسا تھا۔

میں نے اس کی گردن کی حساس ترین رگ مل دی۔ یہ تجربہ میں کئی بار کر چکا تھا ـــ ایک ہی سیکنڈ میں سوات خان بے ہوش ہو کر ادھ موئے کتے کی طرح لڑھک کر پلنگ سے نیچے جا گرا۔ مجھے زیادہ قوت صرف نہیں کرنی پڑی تھی۔ اس کا چاقو میرے پلنگ پر گر گیا۔ وہ میں نے اٹھا لیا۔

ریٹا نے اسے گرتے دیکھا تو لپک کر دروازہ بند کرنے چلی ـــ مگر اچانک ایک آدمی دندناتا ہوا اندر آیا۔ اور ریٹا سے ٹکرا گیا۔ وہ گالی بک رہا تھا اور مجھ سے چار ہاتھ دور تھا۔ میں نے سوات خان کا چاقو پوری قوت سے اس کی طرف پھینکا۔ وہ سیدھا اس کے سینے میں جا دھنسا اور وہ ایک دلدوز چیخ مار کر فرش پر لڑھک گیا۔ ریٹا نے فوراً اندر سے دروازہ بند کر لیا اور چٹخنی چڑھا دی۔

"میری یہ زنجیر کاٹ دے ریٹا جلدی کر۔"

میں نے آری اس کی طرف بڑھائی مگر اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ وہ آری کو ٹھیک طرح سے پکڑ نہ سکتی تھی۔

"ادھر میں خود کاٹتا ہوں۔" آری میں نے اس کے لرزیدہ ہاتھ سے واپس لے لی۔ اور تیزی سے خود زنجیر کاٹنے لگا۔ اتنے میں دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ کوئی بہت جلدی میں تھا۔ میں نے ہاتھ اور تیز چلایا ـــ زنجیر چند سیکنڈ میں کٹ گئی۔ وہ خاصی تیز آری تھی میرے خوب کام آئی۔

اب میں بالکل آزاد تھا۔ میں نے پلنگ سے اتر کر اپنے ہاتھ پاؤں سیدھے کئے۔ ان کی سلامتی دیکھی اور پھر سوات خان کا چاقو اس آدمی کے سینے سے نکال لیا۔ وہ بدبخت شاید مر چکا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور پتلیاں ساکن ہو چکی تھیں۔ وہ تیز دھار نو انچ لمبا چاقو کام دکھا گیا تھا۔ اس کے دستے پر سنہرے حرفوں میں سوات خان کندہ تھا ـــ

دروازے پر دستک تیز ہو گئی تھی۔ میں نے کمبل اپنے گرد لپیٹا اور جوتا پہن لیا۔ وہ لوگ دروازے کو شاید توڑنے کا فیصلہ کر چکے تھے ریٹا دیوار سے لگی بری طرح لرز رہی تھی۔ وہ لوگ میرا ایک گردہ نکال چکے تھے پھر بھی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے بدن کی بجلیاں برقرار ہیں۔ اتنے دنوں بستر میں پلنگ سے بندھا رہا تھا پھر بھی میں ابھی تک بازوؤں میں خاصی سکت پا رہا تھا۔

اور پھر کوئی اندھے بھینسے کی طرح دروازے سے ٹکرا گیا مگر وہ بہت مضبوط دروازہ تھا۔ راہ نہیں دیتا تھا۔ میں نے ایک نظر کھڑکی پر ڈالی۔ اس میں خاصے بڑے بڑے شیشے لگے تھے۔

باہر کی طرف ایک جالی تھی۔ لوہے کا جنگلہ نہیں لگا تھا۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے شیشہ توڑ دیا۔ دروازے پر کسی نے ایک اور زوردار ضرب لگائی۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا تو میں نے اوپر اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے جالی پر زور ڈالا۔ وہ کناروں سے کھسک گئی اور تھوڑے سے دباؤ سے ایک طرف ہٹ گئی۔

دوسری طرف ایک چھوٹی سی راہداری تھی۔ میں نے ریٹا کو تیزی سے اس راہداری میں اتارا اور خود بھی اس کے پیچھے لپکا۔ راہداری دائیں طرف سے بند تھی۔ ہم بائیں طرف بڑھے۔ اور نکلتے چلے گئے۔

وہ لوگ برابر دروازے کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ابھی تک انہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ ہم راہداری عبور کر کے عمارت کے پچھلے حصے میں جا نکلے جبکہ برآمدے سے آگے نیم کا ایک کار پورچ بنا تھا۔ وہاں ایک کار کھڑی تھی۔ ریٹا کو لے کر میں اس کی طرف بڑھا۔ اندر کار کا ڈرائیور پچھلی سیٹ پر سویا ہوا تھا۔ جونہی میں نے دروازہ کھولا وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

میں نے اسے کوٹ کے کالر سے پکڑ کر زبردست جھٹکا دیا۔

"نکل جا باہر تیری ماں......" اس لمحے میری آواز اس قدر ڈراؤنی ہو گئی کہ میں خود اسے نہ پہچان سکا۔

وہ بے چارہ شاید کوئی مریض لے کر وہاں آیا تھا خوف زدہ ہو کر کار کے دوسرے دروازے کو کھول کر سرپٹ بھاگا۔ سامنے کھلے ان کی طرف اپنی ٹوپی بھی وہ وہیں بھول گیا تھا۔

میں نے اگلی سیٹ پر اپنے ساتھ ہی ریٹا کو بٹھایا اور کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے چل نکلا۔ وہ بالکل نئی کار تھی چمکتی چلکتی [illegible] کار۔ اشارے سے چلتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ نئے ماڈل کی ٹیوٹا کرولا تھی مگر مجھے کیا لینا تھا اس کے ماڈل سے۔ میں کار کو بھگاتا ہوا عمارت کے بڑے دروازے پر جا پہنچا۔ وہاں ایک سنتری کھڑا تھا۔ اس نے ہم سے کوئی تعرض نہ کیا۔ اس نے چپ چاپ دروازہ کھول دیا۔ اور ہم باہر نکل گئے۔

"ریٹا تمہیں پتہ ہے عالیہ اس وقت کہاں ہو گی؟"

"وہ اپنی کوٹھی پر ہوگی، گلمرگ میں۔"

"مجھے راستہ بتاتی چلو، ہم وہیں جا رہے ہیں۔" میں نے ڈرائیور کی ٹوپی سر پر رکھ لی تھی۔

"کیوں وہاں کیوں جاؤ گے تم، پھر پھنسنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"نہیں بلکہ میں اسے پھانسنا چاہتا ہوں۔ خاصی خوبصورت عورت ہے وہ۔" میں نے ریٹا کو ایک ذہنی جھٹکا دینے کی کوشش کی۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ سوچتی ہوگی پتہ نہیں کس قسم کے آدمی سے پالا پڑا ہے۔ اس کا دماغ کیا ہے؟ جرأت تو وہ دیکھ ہی چکی تھی۔

"مجھے راستہ بتاتی چلو ریٹا۔ پتہ نہیں مجھے کس طرف سے جانا ہے۔" میری یہ بات سن کر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور خالصہ جی کی پریڈ کے انسٹرکٹر کی طرح کھبا، سجا، سیدھا کھبا، بتاتی چلی گئی۔

کوئی پچیس منٹ بعد ہم گلمرگ کی اس کوٹھی کے سامنے کھڑے تھے جہاں سے چند ہی دن پہلے میری زندگی سر کے بل زوال کے غاروں میں گرنا شروع ہوئی تھی۔

میں نے کار کی بتیاں گل کر دیں۔ بڑا گیٹ اندر سے مقفل تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی چار دیواری پھاندنا ہوگی۔ ابھی میں صورتِ حال کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ کوٹھی کی عمارت سے ایک کار تیزی سے باہر کی طرف بڑھتی نظر آئی۔ وہ پلک جھپکتے میں گیٹ پر آ پہنچی۔ عالیہ اسے ڈرائیو کر رہی تھی اور حیدر اس کے ساتھ کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں میرے فرار کی خبر مل چکی تھی۔

حیدر نے اتر کر گیٹ کا قفل کھولا اور پھر اس نے لپک کے بھاری بھرکم گیٹ کے ایک حصے کو پیچھے دھکیلا۔ عین اس وقت میں نے بجلی کی سرعت سے آگے بڑھ کر کار کی کھلی کھڑکی میں سے ہاتھ اندر ڈال کر عالیہ کی گردن دبا دی — وہ خاص گلے کی نس میری انگلی تلے آئی اور مسلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی عالیہ کا سر ڈھلک گیا۔

میں نے جھٹکے سے کار کا دروازہ کھولا۔ اور عالیہ کو دوسری سیٹ پر دھکیل کر اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔

ریٹا لپکتی ہوئی میرے پاس آ ٹھہری۔

"اندر بیٹھو جاری! کیا منہ تک رہی ہو؟" میں نے کار اسٹارٹ کرکے پچھلا دروازہ کھول دیا۔ ریٹا ایک جھپاکے سے اندر بیٹھی اور پیشتر اس کے کہ لنگڑا حیدر صورتِ حال کو سمجھ سکتا یا کوئی کارروائی کر سکتا، میں نے کار سے اتر کر اسے چاقو کی نوک پر دھر لیا۔ میں اسے بھی ساتھ لینا چاہتا تھا۔ مگر وہ پاگلوں کی طرح الٹے پاؤں بھاگا اور دیکھتے ہی دیکھتے نکل چکا گیا۔ اب میرے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ میں اس کا پیچھا کرتا۔ میں نے کار کا اسٹیئرنگ سنبھالا اور عالیہ کو لے کر وہاں سے چل دیا۔

میرے خیال میں مجھے وہی بہت کافی تھی۔ ان لوگوں سے اپنی ہی شکست کا بدلہ لینے کے لئے میں نے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا تھا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے کدھر جانا ہے۔ ایک انتہائی تیز و تند طوفان ایسا بلا خیز جذبۂ انتقام تھا جو اندر ہی اندر مجھے بھسم کئے دیتا تھا اور میرا اس لمحے جی چاہتا تھا کہ میں ان سب لوگوں کو آگ پر رکھ کر بھون ڈالوں جنہوں نے مجھے زندگی بھر کے لئے میرے ایک اہم عضو سے محروم کر دیا تھا۔

عالیہ ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔ وہ رگ جو میں دباتا تھا آدمی کو پہروں دنیا جہان کے غموں سے بے نیاز کر دیتی تھی۔ مجھے وہ گر ایک کانا پہلوان نے بتا دیا تھا۔ وہ لکھنؤ کا پہلوان تھا۔ بہت بڑا بنوٹ باز تھا وہ۔ رومال میں پیسہ باندھ کر دشمن کی گردن پر مار دیتا تھا تو دشمن ڈھائی پہر کے لئے چھٹی کر جاتا تھا۔ ایسا کاری حربہ تھا اس کے پاس۔ کاش میں نے وہ حربہ پہلے ہی دن عالیہ پر آزمایا ہوتا۔ بعد میں ہی کسی لمحے میں اپنے دشمنوں پر وہ حربہ استعمال کر لیتا تو اس ذلت سے بچ جاتا۔ مگر ان لوگوں نے تو مجھے شروع ہی سے خواب آور ٹیکے اور گولیاں کھلا کھلا کر بے بس کر رکھا تھا۔ میں تو ان کی اسیری کے دنوں میں بالکل موم کی ناک بن گیا تھا۔

وہ تو ریٹا کا بھلا ہو کہ اس نے مجھے اتنے دنوں تک الا بلا دواؤں سے بھی بچایا۔ جی جان سے میری اس نے خدمت بھی کی اور بھرپور خوراک بھی وہ مجھے کھلاتی رہی تھی کہ میں اتنے بڑے عذاب سے جلد نجات پا سکا تھا ورنہ وہ تو شاید آہستہ آہستہ مجھے کسی نشے کا عادی بنا دینے پر تلے ہوئے تھے۔

ریٹا نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ مجھے مارفیا کا انجکشن دکھاتی تھی کہ وہ میڈم ڈاکٹر عالیہ نے اسے دیا ہے تاکہ ہر روز وہ تھوڑا تھوڑا مارفیا میرے بدن میں اتارتی رہے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ میں زندگی بھر کے لئے مفلوج ہو کر رہ جاتا۔ بھول ہی جاتا کہ میرا گردہ وہ لوگ نکال چکے ہیں اور میری زندگی نشے کی لہر پر ڈال دی گئی ہے۔ یہی وہ میرا حشر کرنا چاہتے تھے۔ جس سے مجھے ریٹا نے کمال مہربانی سے بچا لیا تھا اور اب میں تندرست و توانا ہو کر وہاں سے بچ نکلا تھا۔

"کدھر کا ارادہ ہے اب جیلانی؟"

"میں اسے کسی جگہ پہنچا کر چھپا دینا چاہتا ہوں۔ تمہارا گھر کیسا رہے گا؟"

"نہیں نہیں۔ وہاں تو بہت سے لوگ ہیں، ایک ڈیڑھ کمرے کا کوارٹر ہے جس کے پاس اور اردگرد کے لوگ ہر وقت ایک دوسرے کے حالات سے واقف رہتے ہیں۔"

"تو پھر کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔ کچھ پیسے کا بندوبست کر سکتی ہو تم؟ یوں کرو تم اس مصیبت کو ادھر کراچی یا کسی اور بڑے شہر لے چلو وہاں ہم ہر قسم کے خطرے سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔"

"مگر نہ تو میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ میں اسے ہوٹل میں رکھوں نہ اتنا پیٹرول گاڑی میں ہے کہ جا کر لمبا سفر کر سکیں۔"

"تو پھر کچھ سوچو نا، کیا کرنا چاہئے؟ تم اسے اپنے گھر کیوں نہیں

لے جاتے ہو؟"

"نہیں بابا میری بہن کیا سوچے گی۔ بیگماں تو بچاری صدمے سے ہی مر جائے گی۔ میں انہیں کیا بتاؤں گا کہ یہ کون ہے؟ ابھی اس سے تو میرے دو دو ہاتھ ہونے ہیں ابھی۔ میں اس سے اپنے سارے زخموں کا حساب لینا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر تم ہی سوچو میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا ہے۔"

اس وقت تک ہم ملتان روڈ پر پہنچ چکے تھے۔

اچانک میں نے دیکھا کہ ایک موٹر سائیکل کے پیچھے ایک کار سرپٹ دوڑ رہی ہے اور کار والا اس کوشش میں ہے کہ کسی نہ کسی طرح موٹر سائیکل سوار کو کچل دے۔ دونوں ایک دوسرے سے بار بار ٹکرا کر نکل رہے تھے۔ موٹر سائیکل سوار ایک جگہ اپنے آپ کو کار سے بچانے کے لئے بائیں ہاتھ مڑا مگر کسی چیز سے ٹکرا گیا اور رفتار کی تیزی میں کچھ اس بری طرح الٹ کر گرا کہ کئی قلابازیاں کھا کر ایک کوٹھی کی دیوار سے جا لگا۔ کار اسی جگہ رک گئی۔ دو آدمی تیزی سے باہر نکلے اور اس کی طرف لپکے۔ یہ تماشا ایسا دلچسپ اور خوفناک تھا کہ میں نے کار روک لی۔ موٹر سائیکل سوار کی زندگی خطرے میں تھی۔

اچانک میرا ہاتھ کار کے اندر عالیہ کے پہلو سے ٹکرایا۔ وہاں اس کا ہینڈ بیگ دھرا تھا اور اس کا منہ کھلا تھا۔ میرا ہاتھ یونہی بے خیالی میں اس کے اندر چلا گیا۔ کوئی سرد شے میری انگلیوں سے چھو گئی۔ وہ عالیہ کا پستول تھا۔ میں نے ایک دم اسے اٹھا لیا — اور اس کا لاک کھول کر میں باہر نکل آیا۔

وہ دونوں آدمی اس وقت موٹر سائیکل سوار کی طرف لپک رہے تھے۔ میں نے باہر نکلتے ہی بغیر سوچے سمجھے ایک آدمی کی پنڈلی کو تاک کر گولی چلا دی۔ وہ ایک قطعاً اضطراری حرکت تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ موٹر سائیکل سوار ان کے ہاتھوں مارا جائے۔

گولی اس آدمی کی پنڈلی میں پیوست ہو گئی تھی اور وہ تیورا کر دائیں طرف جا گرا تھا۔ دوسرا آدمی پناہ لینے کے لئے بائیں ہاتھ بھاگا، مگر میں نے اسے مہلت نہیں دی اور پے بہ پے دو گولیاں اس پر چلا دیں۔ ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی اور وہ زمین پر جا رہا۔

میں لپک کر موٹر سائیکل سوار کے پاس پہنچا تو یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ وہ کوئی پولیس افسر تھا۔ اس کے بازوؤں پر لگے تمغے میں نے دیکھے تو حیران رہ گیا۔ کوئی ڈی ایس پی تھا۔ اور بے ہوش ہو چکا تھا۔

میں نے جلدی جلدی اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ وہاں سے مجھے جو کچھ ملا اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس کا نام ایس کے چیمہ تھا۔ اس کا دفتر چھاؤنی کے علاقے میں تھا۔ اس کی جیب میں ساڑھے سینتالیس روپے موجود تھے۔ اس کے پستول میں اور اس کی پیٹی میں گولیاں نہیں تھیں۔ پستول گرم گرم محسوس ہوتا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنا اسلحہ چلا چکا تھا۔

میں نے اسے فوراً ہی پیٹھ پر لادنا چاہا، مگر پھر میں ڈر گیا۔ مجھے اپنے زخم کے ٹانکوں کو بچانا چاہئے تھا۔ میں نے ریٹا کو پکارا۔ اور پھر ہم دونوں نے اسے پاؤں اور ہاتھوں سے پکڑ کر کار میں ڈالا اور اسی وقت میو ہسپتال کی طرف لے چلے۔

اس سارے جہاں کے ہسپتالوں سے اچھے ہسپتال اور مہربان ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کے سامنے لے جاکے میں نے کار کھڑی کر دی۔ ایک آدمی کے کہنے پر میں نے اسٹریچر منگوایا اور اس پر ڈال کر چیمہ کو اندر لے گیا۔ ڈاکٹر نے میرے زخموں والے سفید کپڑے دیکھے تو قدرے حیران ہوا مگر میں نے اسے بات کرنے کا موقع نہیں دیا کہا "دیکھیں ڈاکٹر صاحب! یہ ڈی ایس پی مسٹر ایس کے چیمہ ہے۔ یہ ادھر ملتان روڈ پر مجھے بے ہوش حالت میں ملا ہے۔ اس کے پیچھے غنڈے لگے ہوئے تھے۔ ان کی کار کا نمبر یہ ہے۔" میں نے اس کے ہاتھ سے قلم لے کر کار کا نمبر کاغذ پر لکھ دیا۔ "وہ دونوں غنڈے وہیں زخمی پڑے ہیں — ملتان روڈ کے چوک سے ذرا ادھر۔ ان کا علاج کر دیں۔ انہیں بھی لے کر آتا ہوں۔ ان کی بھی زندگیاں خطرے میں ہیں۔" یہ کہہ کر میں وارڈ کے اسپرٹ زدہ ماحول سے تیزی سے باہر نکل آیا۔ ڈاکٹر مجھے پکارتا ہی رہا مگر میں نے اس کی کوئی بات نہ سنی۔

ریٹا منہ بند کئے بیٹھی تھی۔ اس نے کار کے سارے شیشے اندر سے بند کر رکھے تھے تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے کہ وہاں عالیہ بھی پڑی ہے۔ بے ہوش آڑی ترچھی۔ بے گناہ لوگوں کی طرح مسیح مصلوب کی طرح۔ حالانکہ...... حالانکہ سارے جہاں کی خباثت اس کے وجود میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

"میرا خیال ہے جیلانی! ہمیں ان دو آدمیوں کا بھی پتہ کرنا چاہئے وہ کہیں مر ہی نہ گئے ہوں۔ انہیں مار دینے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔" وہ خاصی فکر میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو چھمک چھلو! میں ادھر ہی جاتا ہوں۔ باقی باتیں پھر ہوتی رہیں گی۔" یہ کہہ کر میں نے کار کا رخ پھر ملتان روڈ کی طرف موڑ دیا۔ کوئی دس منٹ میں ہم وہاں جا پہنچے۔ رات سنسان تھی اور راستے ویران۔ ایسے میں کار کی رفتار تو آسمان سے باتیں کر سکتی ہے اور وہ بھی عالیہ کی کار سیڈان تھی اور وہ بھی ایسی ویسی سیڈان نہیں کسی عرب شیخ کی مرحمت کردہ خوبصورت مضبوط اور تیز رفتار سیڈان۔

میں نے دیکھا کہ وہ کار ابھی تک وہیں کھڑی ہے جس میں بیٹھ کر وہ غنڈے اس ڈی ایس پی کا پیچھا کر رہے تھے۔ میں نے کار سے اتر کر ادھر دیکھا جہاں وہ دونوں دائیں بائیں گرے تھے۔ وہ اب بھی وہیں پڑے تھے مگر دونوں یکجا ہو گئے تھے۔ میں بڑی احتیاط سے ان کی کار کی طرف بڑھا۔ کار کا دروازہ کھلا تھا میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو وہاں مجھے ایک بڑا سا بریف کیس ملا۔ اس کے ساتھ ہی گولیوں سے اٹا ہوا ایک ہولسٹر بھی تھا۔ مگر اس میں پستول نہیں تھا ــــ

ابھی میں بریف کیس لے کر کار سے نکلا ہی تھا کہ ایک شعلہ سا میرے سامنے روشن ہوا۔ اور ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے سر پر سے گزر گئی۔ میں فوراً ہی کار کے دروازے کی اوٹ میں بیٹھ کر کار کو دھکیلنے لگا۔ وہاں صاف ستھری پختہ سڑک کی ڈھلوان تھی کار اس پر تیزی سے نیچے کی طرف چلی اور اس کے ساتھ ہی میں نے سیدھے ہاتھ میں عالیہ کا پستول سنبھال کر سامنے کی طرف اس نکتے پر گولی چلا دی جہاں سے دوسرا شعلہ بھڑکا تھا۔ میری گولی نشانے پر لگی تھی۔ ایک دلدوز چیخ فضا میں ابھری اور پھر سکوت چھا گیا۔ میں نے کار کو دھکیل کر ان کی طرف لڑھکا دیا۔ وہ بالکل سامنے ہی تو تھا اور جھاڑیوں سے نکل کر پختہ سڑک پر آ چکے تھے۔ کار ان کی طرف لڑھکی اور میں لپک کر اپنی کار میں جا بیٹھا۔ ان کا بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا۔ بریف کیس نہ جانے کیوں مجھے خاصا بھاری محسوس ہوا تھا۔

ریٹا کو بریف کیس تھما کر میں نے کار اسٹارٹ کر دی اور ملتان روڈ کی جنوبی سمت میں بھاگ نکلا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے ان میں سے ایک کو تو ضرور ہی قتل کر دیا ہے۔ اس کی چیخ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔

کار ملتان روڈ پر آگے بڑھتی رہی اور شاہ نور اسٹوڈیوز عبور کر گئی تو میں نے کہا۔

"ریٹا! ذرا دیکھو اس بریف کیس میں کیا ہے؟ یہ کون درویش تھے جو اس گنہگار جیسے ڈی ایس پی کے پیچھے پڑے تھے۔"

"میں کیسے کھولوں؟ اس میں تو تالا لگا ہے۔"

"ارے تو کیسی لڑکی ہے۔ آج کل کی لڑکیاں تو بڑے بڑے دروازے توڑ دیتی ہیں۔ ذرا دیکھ تو شاید اس عالیہ بی بی کے بیگ میں کوئی چیز مل جائے جس سے تو یہ بریف کیس کھول سکے۔" میں نے ہینڈ بیگ اسے دے دیا۔

"یہ کوئی تالے چابیاں تو نہیں بنایا کرتی جیلانی! کیسی باتیں کرتے ہو تم؟"

"دیکھو تو سہی۔ کوئی باریک چاقو، کوئی سرمچو، کوئی اس قسم کی چیز اس گشتی کے بیگ میں ضرور ہو گی۔" یہ کہہ کر میں نے کار کی بتی روشن کر دی ــــ

"ارے جیلانی! اس میں تو یہ ڈھیر سارے نوٹ ہیں۔ یہ دیکھو سو سو روپے کے نوٹوں کا ایک بنڈل اور یہ کھلے دس دس کے کئی نوٹ۔"

ریٹا خوش ہو گئی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے ریٹا۔ ہمیں پیسوں کی تو اشد ضرورت تھی۔ اور بھی دیکھو کیا کچھ ہے اس میں؟"

"اس میں ایک چابیوں کا گچھا بھی تو ہے۔ تمہاری بات سچ نکلی ہے ڈیئر۔"

"یہ انگریزی میں مجھے مت مخاطب کیا کرو ریٹا۔ یہ ڈیئر شیئر سب بکواس ہے۔ اس سے اچھا ہے تم مجھے یار کہہ لیا کرو۔" میں نے نگاہ سڑک پر جمائے ہوئے کہا۔ کار پچاس ساٹھ میل کی رفتار سے جا رہی تھی۔ اور مجھے ایک عرصے بعد تیز اور تازہ ہوا میں سانس لینے کا موقع ملا تھا۔ میرا دل بہت خوش تھا میں بھول ہی گیا تھا کہ مجھے گھر بھی جانا چاہئے تھا۔

"وہ تم نے میرا خط ڈال دیا تھا ڈاک میں میری ماں کے نام تھا وہ۔"

"ڈال دیا تھا یار۔ ایسی بھی الو کی پٹھی نہ سمجھ تو مجھے۔ اور ہاں دیکھ یہ ایک چابی لگ گئی ہے بریف کیس میں۔"

"تو کھول دے نا تو اس مصیبت کو۔ دیکھ تو اس میں کیا ہے؟ مگر ٹھہر۔ پہلے اس عالیہ کو سنبھال یہ سیٹ سے نیچے گر رہی ہے۔" میں نے ریٹا کو بالوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔ اس نے بریف کیس الگ کیا اور عالیہ کو پکڑ کر اس نے سیدھا کر دیا پھر بولی۔

"یہ تو ہوش میں ہی نہیں آ رہی۔ کہیں مر تو نہیں گئی ہے؟"

"اتنی غیرت مند نہیں ہے یہ دیکھتی نہیں ہے تو اس کی سانس کیسے آرے کی طرح چل رہی ہے۔ دیکھ اپنے دوپٹے سے تو اسے سیٹ کے ساتھ باندھ دے، یہ جو تو گلے میں لٹکائے بیٹھی ہے نا کتے کے پٹے کی طرح اسے ادھر باندھ دے، اس کے سینے کے اوپر سے پیچھے تک کے ساتھ یہاں۔ جلدی کر۔" میں نے جھلا کر کہا۔ وہ کچھ بھی نہ سوچ سکتی تھی ریٹا بالکل ٹھس تھی عام عورتوں کی طرح۔

ریٹا نے میرے کہنے پر عمل کیا اور عالیہ کو ٹھیک طریقے سے سیٹ کے ساتھ باندھ دیا۔

"اب کھول اس بریف کیس کو۔ دیکھ اس میں کیا ہے؟"

"اچھا بابا اچھا۔ ناراض کیوں ہوتے ہو۔ تیری طرح میں کوئی مار دھاڑ نہیں کرتی رہی ہوں۔ کوئی بدمعاش نہیں ہوں میں۔ شریف لڑکی ہوں میں سمجھے۔ مجھ سے شرافت سے بات کیا کر۔"

"بہت بہتر میم صاحب۔ آپ کی شرافت کی ایسی تیسی ابھی کوئی اوٹ ملتی ہے تو میں آپ کی شرافت سے ملاقات کرتا ہوں۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ وہ شوخ ہوتی جا رہی تھی۔ اور بے وقت چہک رہی تھی ــــ

"ارے باپ رے باپ! جیلانی ذرا دیکھ تو اس میں تو یہ پیلی پیلی اینٹیں دھری ہیں میرے یار۔ یہ کہیں وہ ــــ وہ چیز تو نہیں ــــ وہ جسے سونا کہتے ہیں۔ ارے دیکھ تو ــــ"

ریٹا کا سانس پھولنے لگا۔ اس نے ایک نوز میرے آگے کر دیا۔ میں نے گاڑی سڑک سے اتار کر ایک طرف کھڑی کر دی اور اس کی اندر کی بتی جلا دی۔

ریٹا نے جو چیز مجھے دکھائی وہ سونے کی، جی ہاں، خالص سونے کی اینٹ تھی۔ اور بریف کیس ان سے بھرا پڑا تھا۔ میرا دل تو اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایسی پیلی دولت تو میں نے زندگی بھر کہیں نہ دیکھی تھی قدرت مجھ پر ایک دم اتنی مہربان ہو گئی تھی۔ وہ دونوں حرامزادے بلاشبہ اسمگلر تھے سونے کے اسمگلر۔ اور کسی طرح ڈی ایس پی جیمہ کو ان کی ٹوہ مل گئی ہو گی جب ہی وہ ان کے پیچھے لگا ہوا تھا مگر تنہا تھا مات کھا گیا۔

سونے کی وہ اتنی ساری اینٹیں دیکھ کر میں تو خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ ایسے بھی مقدر ہوتے ہیں اپنے کہ ہم برستی گولیوں اور چلتی تلواروں میں سے لہولہان ہو کر نکلتے ہیں تو ہماری ملاقات ایسی پیلی مہ لقا دلیوں سے ہو جاتی ہے۔ ایسے میں ہماری خوشیوں کا گلرنگ چہرہ اگر بدنصیبی دیکھ لے تو اپنا منہ نوچ لے۔

میں نے ریٹا سے کہا "دیکھ چھمک چھلو اسے کہتے ہیں عربی میں ــــ لا فانی۔"

وہ تادیر سانس بند رہنے پر ہانپ گئی تھی۔ اپنا دم درست کرتے ہوئے بولی۔

"تیرا ستیاناس۔ لگتا ہے تو مجھے کاٹ ہی کھائے گا جیلانی۔ لعنت ہے تیری شکل پر۔ اب تو مجھے عربی میں گالی بھی سنے گا۔ بک گئی ہو گی تیری کوئی ہوتی سوتی۔"

غصے میں وہ اور زیادہ دلآویز لگتی تھی۔ اور میں جانتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اٹکھیلیاں دکھا رہی ہے۔

"دیکھ ریٹی تو بھی اصل میں کسی ٹڈیڈو جنٹلمین کی اولاد ہے کسی انگریز کی تخم ــــ تو بھلا عربی کیا سمجھے گی۔ اس کے معنی ہیں حسب اطمینان چیز کا مل جانا۔"

وہ میری یہ بات سن کر چڑ گئی بولی "دیکھ رے تو مجھے اس طرح ذلیل نہ کیا کر۔ میرا دادا جو تھا نا وہ بہت بڑا انگریز تھا۔ کلکتہ میل کا فرسٹ کلاس ڈرائیور تھا۔ بڑی تنخواہ پاتا تھا۔ اس نے میری دادی ماں سے محبت کی شادی کی تھی۔ وہ مراثن تھی اور عیسائی ہو گئی تھی۔"

"ارے لعنت بھیج اپنے دادا اور دادی پر۔ سیدھی سیدھی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جا ورنہ ماری جائے گی کسی دین کے ڈنکے والے کے ہاتھوں۔ ہاں بند کر یہ بریف کیس، حفاظتی پیٹی باندھ لو اور اپنے کپڑے اتار دو۔ جلدی ہی ہم ملتان کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بڑا گھٹیا بدمعاش لگتا ہے تو مجھے جیلانی۔ میں تو خواہ مخواہ ہی پھنس گئی تیرے چنگل میں۔" ریٹا نے لگاوٹ سے کہا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں تھی میرے پاس ڈھیروں روپیہ جمع ہو گیا تھا۔

کوئی تیرہ ہزار روپیہ تو مادام عالیہ کے ہینڈ بیگ سے مل گیا تھا پھر اس کی کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں بھی تو تھیں۔ خاصا زیور پہنے ہوئے تھی وہ۔ اور سب سے بڑا تحفہ جو مجھے اس گٹھ جوڑ میں ملا تھا وہ تھا بریف کیس جو سونے سے بالب بھرا تھا۔

میں کہاں سے چلا تھا اور کہاں آ گیا تھا۔ بہن کے سسرال والوں کے مطالبے پر ایک لاکھ روپے کا بندوبست کرنے نکلا تھا اور اپنا ایک گردے سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ میں ان لوگوں کے ہاتھ چڑھ گیا تھا جو اپنے مقصد کے لئے میرا گلا کاٹنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ ریٹا رحمت کا فرشتہ بن کر نمودار نہ ہوتی تو پتہ نہیں میں اس وقت کہاں ہوتا؟ اب میرے سر سے رقم کا بوجھ اتر گیا تھا۔ سونے سے بالب بھرا ہوا بریف کیس میرے پاس تھا۔

عالیہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ اسے اسی حال میں رہنا چاہئے تھا مجھے معلوم تھا کہ ایسے مریض کو ہوش میں کیسے لایا جاتا تھا مگر میں نے تامل کیا۔ کسی منزل پر پہنچ کر ہی کوئی بات ہو سکتی تھی۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ عالیہ میرے ہاتھ آ گئی تھی۔ ورنہ وہ بڑے خطرے والی عورت تھی۔ ایسی عورت جو کالا جادو جانتی تھی —— بڑے بڑوں کا پتا آب کر دیتی تھی وہ۔ ریٹا نے اس کے رعب و دبدبے کی جو داستانیں مجھے سنائی تھیں وہ حیران کن تھیں۔ اور اب وہ فرعون کے جانشین کی بھتیجی ہو کر اسیر بنی تھی میرے سامنے مُشتِ خاک کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

اور ریٹا میرے بہت کام آ رہی تھی میرا حوصلہ بڑھاتی تھی میرا دل ڈوبنے نہیں دیتی تھی۔ قدم قدم پر میرے لئے دلچسپیاں پیدا کرتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ نہ ہوتی تو میں عالیہ کے اس شکنجے سے مر کر بھی نہ نکل سکتا تھا مجھے ریٹا نے بتایا تھا کہ ان لوگوں کا پروگرام یہ تھا کہ اگر کوئی اور موٹی اسامی مل گئی جسے میرے جیسے نوجوان کے تازہ صحت مند اور چربی چڑھے گردے کی ضرورت ہوئی اور وہ منہ مانگے دام دینے پر آمادہ بھی ہوا تو وہ لوگ میرا دوسرا گردہ لے لیں گے۔

میرا مر جانا ان کے لئے ایسا ہی تھا جیسے کوئی کتا اپسٹرک گاڑی سے کچل کر مر جائے۔ مجھے انہوں نے ردی کے مگر کارآمد لوگوں کی فہرست میں ڈال رکھا تھا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ وہ ناطہ جو میں نے ریٹا سے پیدا کر لیا تھا۔ ہر گاڑھی بھری آشنائی سے کہیں بہتر تھی جو میں دنیا سے رکھتا تھا۔

وہ مدھو مالتی ایسی ریٹا میرے لئے بہت مبارک ثابت ہوئی تھی۔ میں چلتا رہا، چلتا ہی رہا۔ میری منزل ملتان تھی۔ مجھے راستے میں اور کہیں نہ ٹھہرنا تھا اور اس وقت سورج طلوع ہو رہا تھا جب میں ملتان شہر میں داخل ہوا۔

نیند نے ہم دونوں کو اس وقت تک بری طرح نڈھال کر دیا تھا۔ مگر اس کے سوا اور کیا چارہ تھا کہ ہم کسی نئی دہلیز پر پہنچ کر ہی دم لیتے۔ ملتان پہنچ کر جلدی ہی ہم کیقباد ہوٹل میں جا بیٹھے۔ گاڑی میں نے احتیاطاً گیراج میں بند کرا دی۔ وہ ایک پرانے وقت کا ہوٹل ہے اس نے آسانی سے ہی اس نے ہمیں دوسری منزل میں دو کمرے دے دیئے —— جب ہم منہ دھو کر ناشتہ کر چکے تو میں نے عالیہ کو دیکھا جو ابھی تک بے ہوش تھی ——

"کیا خیال ہے مادام کو یہیں سے آؤٹ اس دنیا میں۔ بہت ستایا ہے اس نے۔"

"ہاں، ہاں بابا کیوں اس کی جان کے دشمن ہوئے ہو، کہیں پکڑی گئی تو ہم دونوں پھندے پر چڑھ جائیں گے۔ کیا کہتے ہیں اسے فارسی میں تختۂ دار کہتے ہیں نا؟" ریٹا نے کہا۔

بڑی عجیب شے تھی وہ —— تختۂ دار کو تختۂ واڑھ بنا دیا اس نے۔ وہ مسکرا رہی تھی ایسے انداز میں جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا اسے مکمل یقین ہو چکا تھا کہ اس نے جیلانی پر فتح پالی ہے اور اسے پھر اس سے روگردانی کی جرأت نہ ہوگی۔

میں نے عالیہ کی اس جناتی تصور ایسی گردن کے خاص حصے پر دباؤ ڈالا۔ تھوڑی سی تیز تیز مالش کی اور پھر اس کے انگوٹھے کے قریب کی ایک رگ دبائی۔ اس کے بدن میں جگہ جگہ پیغام پہنچا تو وہ کسمسائی اور پھر عجیب انداز سے کراہتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس وقت وہ ہوٹل کے نرم و گداز تکیے کی سمت میں مور کے ایسے طرز پر بچھے ہوئے خوبصورت پلنگ پر لیٹی تھی اور سرخی رنگ کا ریشمی اس پر بہت ہی بھلا لگتا تھا۔ اس کے پاؤں کی سمت بھی ایک قدِ آدم آئینہ لگا تھا اور سر کی طرف بھی۔ اور میں اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔

میں نے اسے ہوش میں لانے سے پہلے صرف اتنی سی زیادتی کی کہ اس کی دائیں کلائی پلنگ کے ساتھ باندھ دیں۔ اور اس کی دونوں بانہیں نے اسی طرح سر کی طرف باندھ دی تھیں جس طرح اس نے مجھے اپنے کلینک میں باندھے رکھا تھا۔ ایک اور احتیاط میں نے یہ کی تھی کہ اس کے خوبصورت لبوں پر ٹیپ چپکا دی تھی تاکہ مادام شور نہ مچا سکیں۔

اس کی آنکھیں کھلیں تو اس کی نظر سب سے پہلے چھت پر پڑی سامنے آئینے پر اور اس میں منعکس میری صورت پر۔ اور پھر وہاں سے ہوتی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ خوف اور حیرت کا سیلاب اس کی آنکھوں میں امڈ آیا۔ پوری قوت سے وہ چیخی مگر اس کے لبوں پر لگے ٹیپ نے اس کی آواز باہر نہ آنے دی۔ اس کی وہ ہولناک چیخ اندر ہی اندر دب کر رہ گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس سے دو ہاتھ دور کھڑا اپنے بدن کو خاص انداز میں حرکت دے رہا ہوں اس میں مسکراہٹ کا ایک خاص مفہوم ہے تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"کہو کیا حال ہے میری جان؟ مجھے امید ہے تمہیں مجھے اس حال میں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی ہوگی —— اس رات تم نے بھی تو اپنے کا سارا مال میرے سامنے رکھ دیا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے سینے میں انگلیاں دھنسا دیں۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ میرا خیال ہے اس کا حد تک کم ہو گیا تھا کیونکہ اس کی آنکھیں پیغام وصول کر رہی تھیں اور بھی رہی تھیں۔ مجھے یوں دیکھ کر اس کی کچھ حسیات بیدار ہو گئی تھیں دب گئی تھیں۔

یہ کچھ ایسا خوبصورت منظر نہیں تھا جلد ہی میں اس صورتحال سے اکتا گیا وہ بے حس اور مجبور تھی۔ بالکل بے زبان ہو گئی تھی۔ اسے اسی حال میں رہنا بھی چاہئے تھا مگر میں کیوں اپنی عزتِ نفس کو برباد کر رہا تھا کس لئے۔ ایک فاحشہ، عیار اور مکار عورت کے لئے تو یہ سب چیزیں روزمرہ کا معمول ہوتی ہیں۔

عالیہ کی نظر ریٹا پر پڑی تو وہ یوں چونکی جیسے اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ شاید وہ کچھ کہتی مگر لبوں پر ٹیپ ستر راہ بنی تھی۔ اپنی بے بسی پر وہ ایسی جھلائی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"دیکھتی ہو عالیہ یہ زخم! میں اسے کبھی نہ بھول سکوں گا —— میرے گردے کے جو دام ملے اس میں سے تم نے کیا وصول کیا تھا؟" میں نے ایک بار پھر اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

"یاد رکھو میں تمہیں ایسی خوفناک سزا دوں گا عالیہ کہ تم ساری زندگی یاد رکھو گی۔ بڑی قیمت دینی پڑے گی تمہیں اس گردے کی۔"

عالیہ نے اپنا تنا ہوا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا اور آنکھیں بند کر کے سسکنے لگی۔

"ادھر آؤ ریٹا، میری بات سنو۔" میں نے دوسرے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ میرے ساتھ ہی چپکتی چلی آئی۔

"دیکھو! میں نہیں چاہتا کہ یہ یوں ہوش میں رہے، ہمیں کوئی چانس اسے نہیں دینا چاہئے۔ تم وہ ٹیکہ لکھو جس سے اسے بے ہوش یا نیم بے ہوش رکھا جا سکتا ہے البتہ اسے دودھ وغیرہ پلا دو۔ میں ٹیکہ سرنج اور دوسرا سامان منگاتا ہوں ٹیکہ خریدنے آؤں گا جا کر —— پھر ہم اسے سُلا دیں گے۔"

"یہ ٹھیک ہے مگر اس کا کرو گے کیا؟ اس کا اچار تو نہیں ڈالنا ہے ہمیں۔ لعنت بھیجو اس پر۔"

"دیکھتی رہو میں کیا کرتا ہوں۔ تم میرے کہنے پر عمل کرتی جاؤ۔"

اس نے اسی وقت مجھے ان غنڈوں کے بریف کیس سے قلم اور کاغذ نکال کر ٹیکے کا نام، سرنج، روئی اور دوسری ضروری چیزوں کی فہرست بنا کر دے دی۔ تب میں نے عالیہ کے ہینڈ بیگ سے نکالے اور ان کمروں کو باہر سے مقفل کر کے بازار چلا گیا۔ وہاں سے میں نے نہ صرف ٹیکے خریدے بلکہ اپنے اور ریٹا کے لئے ریڈی میڈ کئی سوٹ بھی خرید لئے۔ میرے پاس پہننے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا —— کوئی آدھ گھنٹے بعد جب میں واپس آیا تو میری جان میں جان آئی۔ ہوٹل میں ہر طرح خیریت تھی۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ میں نے ریٹا پر پورا اندھا دھند اعتبار کر کے خود کو تباہ نہ کر لیا ہو۔ کچھ بعید بات نہ تھی کہ ریٹا بریف کیس لے کر وہاں سے رفو چکر ہو جاتی۔ اس کی تو ساتوں پشتوں کے لئے وہ سرمایہ بہت کافی تھا۔ عین ممکن تھا وہ عالیہ کو بھی کھول کر اپنے ساتھ ملا لیتی۔ مجھے اپنی حماقت پر سخت افسوس ہو رہا تھا مگر خیر ہوئی کہ ریٹا کا دماغ ابھی اس دور تک کام نہیں کرتا تھا۔

ریٹا نے ٹیکہ تیار کر لیا۔ اس نے سب سے پہلے عالیہ کو اوولٹین ڈال کر گرما گرم دودھ پلایا۔ وہ اس کی ضرورتوں سے شاید واقف تھی جب ہی اس نے دودھ میں ڈالنے کے لئے مجھ سے اوولٹین منگوائی تھی —— اور وہ نیوی عالیہ وہ تین پاؤ دودھ پی گئی —— اور مکھن کے ساتھ چھ توس بھی پیٹ میں اتار گئی بہت بھوک لگی تھی اسے۔ مگر نہیں میرا یہ خیال ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو تکلیف کی حالت میں بے تحاشا کھاتے ہیں۔ غم و اندوہ کی فراوانی ان کی بھوک کو خوب چمکاتی ہے یہی صفت عالیہ میں تھی —— جب اس کا پیٹ بھر چکا تو ریٹا نے اس کی نس میں ٹیکہ گھونپ دیا۔ عالیہ کی چیخ جس نے بتا دیا تھا اسے کہ کس قسم کا ٹیکہ لگایا جا رہا ہے۔ وہ بہت گڑگڑائی۔ بڑا زور مارا اس نے کہ کسی طرح سوئی نس میں نہ اترے۔ مگر ریٹا نے اسے معاف نہیں کیا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چند ثانیوں میں بے سُدھ ہو گئی ——

"بڑی بے رحم ہو تم ریٹا۔ کتنی عاجزی، انکساری اور دلوں کو گرفت میں لینے والی فریاد تھی اس عالیہ کی آنکھوں میں۔" میں نے بہت زیادہ متاثر ہو کر کہا ——

"زیادہ شاعری کی ضرورت نہیں ہے مسٹر جیلانی! اپنے کام سے کام رکھو اور عورتوں کے معاملے میں ٹانگ مت اڑاؤ۔"

"اور کیا اڑاؤں ان کے معاملے میں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا وہ تلملا سی گئی —— لال پیلی آنکھیں کرتی ہوئی بولی "اپنا سر، سمجھے! ایڈیم واہیات آدمی ہو تم! ڈیم فول —— عورتوں سے ایسی باتیں کیا کرتے ہیں؟"

"اور کیسی باتیں کی جاتی ہیں ڈیوڈ چھٹاں کی اولاد! اتاروں تیری چھلکا۔" میں نے اس کو بالوں سے پکڑا۔

"چلو اب ہم بھی سو جائیں، بہت تھک گئے ہیں۔"

"میں کہاں سوؤں گی؟"

"تم یہ سب پردے کھینچ دو، دروازے بند کر دو۔ درمیان کا دروازہ کھلا رکھو اور عالیہ کے ساتھ والے اس پلنگ پر سو جاؤ۔ میں اس کمرے میں سوؤں گا۔"

"مجھے کیوں ادھر نہیں سلاتے ہو؟" وہ حیران ہوئی۔

"ہم نامحرم ہیں ریٹا۔ زبانی زبانی تو ٹھیک ہے سب کچھ مگر اس سے آگے نہیں۔ آئی ایم سوری، ویری سوری۔ اسے اپنی توہین نہ سمجھو یہ اصول کی بات ہے۔" یہ کہہ کر میں دوسرے کمرے میں جا گھسا۔ میں ریٹا کے چہرے پر ابھرتی خجالت کی سرخی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اس کے باپ کا نوکر نہیں تھا۔ نہ میں ان الّو کے پٹھوں ایسا تھا کہ جو ہر موقعے کو اپنا موقع سمجھتے ہیں۔

میں بستر پہ گرا تو بہت سی آگے پیچھے کی باتیں میرے ذہن میں ابھرنے لگیں اور پھر اچانک مجھے اپنی بیوی جبین یاد آ گئی۔ اپنی وہ جرسی یاد آ گئی جو مجھے میری منگیتر نے دی تھی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میرے پاس خاصی رقم موجود تھی۔ میرا بٹوا بھی تھا جس میں میرا شناختی کارڈ بھی رکھا تھا۔ میرا رومال میرا چاقو، میرا کنگھا۔ یاد کرو کوئی ایک چیز تو نہ رہ گئی تھی وہاں، اس گشتی عالم

کے کلینک پر اور اس کی کوٹھی پر۔ یہ تو گھپلا ہو گیا۔ سب سے زیادہ گڑبڑ کی بات یہ ہوئی تھی کہ میرا شناختی کارڈ وہاں رہ گیا تھا۔ عین ممکن ہے وہ اس سے کوئی غلط فائدہ اٹھائیں۔

میں لپک کر ریٹا کے پاس جا پہنچا۔ "ارے یار! میں تو بالکل مارا گیا۔"

"کیوں کیا ہوا؟ خیر تو ہے۔" وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"وہ میرا شناختی کارڈ، میرا بٹوا اس میں رکھی ہوئی رقم، میری پتلون میری جرسی۔ وہ سب کیا ہوئے بھئی؟"

"ڈر تھتے منہ — میں بھی شاید تیرا کوئی دوسرا گردہ بھی لے گیا ہے۔ دیکھ جیلانی! تیرا شناختی کارڈ، تیرے روپے، تیرا بٹوا اور تیرا رومال میرے پاس محفوظ ہیں یہ دیکھ۔" اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر یہ تینوں چیزیں نکالیں اور میرے سامنے رکھ دیں۔ "مجھے ڈاکٹر دھمن کی میز کی دراز سے ملی تھیں یہ چیزیں۔"

"اوہ تھینک یو گریٹ برٹین۔ تھینک ڈیڈ پٹھاں کہ تم نے ایسی عمدہ پوتی اپنے پیچھے چھوڑی ہے۔"

"ہم نامحرم ہیں مسٹر، چلو جاؤ یہاں سے۔" وہ سخت ناراض معلوم ہوتی تھی مجھ سے۔ میں نے دل میں کہا لعنت بھیجو — یہ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔ ہر وقت خوشامد کرانا چاہتی ہیں۔

میں وہ چیزیں سمیٹ کر اپنے بستر پر جا بیٹھا اور یہی سب سے بہتر صورت تھی کہ میں اطمینان سے سو جاتا۔

مگر پھر بھی مجھے اپنے طور پر اطمینان کر لینا چاہئے۔ میں نے عالیہ کا پستول، اس کا ہینڈ بیگ، غنڈوں کا بریف کیس اور دوسری تمام چیزیں اپنے کمرے میں رکھ لی تھیں جس کمرے میں وہ دونوں تھیں وہاں سے باہر نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا درمیانی دروازہ۔ وہ بھی میں نے بند کر لیا اور اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ اب میں بالکل مطمئن تھا مگر وہ اطمینان بالکل کھوکھلا ثابت ہو رہا تھا۔ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔

میرے دل میں یہ خوف ابھر رہا تھا کہ ڈاکٹر دھمن کی دراز سے میرے شناختی کارڈ کے ملنے سے اس بات کا ثبوت فراہم ہوتا تھا کہ وہ لوگ میرے گھر کے پتے سے آشنا ہو چکے تھے۔ ان کے کلینک سے میرے بھاگ نکلنے کے بعد وہ ضرور میرے گھر پر گئے ہوں گے۔ خدا جانے ان لوگوں نے میری ماں سے کیا کہا ہو گا؟ میری بہن سے کیا سلوک کیا ہو گا؟ ان کو اپنے گھر میں دیکھ کر میری ماں کا تو برا حال ہو گیا ہو گا — وہاں سے میرا پتہ پوچھتے ہوں گے۔ ان دونوں ماں بیٹی پر کیا بیتی ہو گی؟ یہ سارے سوال میرے ذہن میں سانپوں کی طرح پھن پھیلا کر پھنکارنے لگے۔ میں اٹھ بیٹھا میرے لئے ان حالات میں سو جانا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔

اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ میں عالیہ کو کیوں پکڑ لایا ہوں۔ اس سے میں کیا فائدہ حاصل کر سکتا ہوں۔ ایک ہی صورت تھی شکست کا بدلہ لینے کی کہ میں انہیں مجبور کر دیتا کہ وہ پانچ لاکھ ریال رقم میرے حوالے کر کے عالیہ کو لے جائیں۔ ورنہ میں اسے قتل کر دوں۔ ویسے بھی اس کا زندہ رہنا میری نظر میں کسی طرح بھی مفید نہ تھا۔ ریٹا نے بتایا تھا کہ وہ گردے کے آپریشن میں بہت ماہر ہے اور اس کی یہی مہارت شیطان کی راہ پر لے گئی تھی۔

میں کتنی ہی دیر تک وسوسوں میں ڈوبا رہا۔ میرا ذہن بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ میں پلنگ پر لیٹا رہا اور سوچتا رہا مگر مجھے اپنے مسئلے کا کوئی حل نظر نہ آیا۔ کوئی صورت ایسی نہیں تھی کہ میرا گردہ مجھے واپس مل سکتا۔ کسی طور اس نعمت کو دوبارہ نہ پا سکتا تھا۔ ان لوگوں نے مجھ پر جو ظلم کیا تھا [illegible] ہی نہ کیا جا سکتا تھا۔

میرا دل لہو رو رہا تھا۔ اس دن میں نے اپنے تکیے پر بہت [illegible] خدا گواہ ہے مجھے اپنی بے بسی پر اس روز بہت رونا آیا۔ میری چھوٹی [illegible] کی ان لوگوں نے مجھے اتنی بڑی سزا دی تھی کہ اس کا تصور بھی نہ کیا [illegible]

میں انہی سوچوں میں تا دیر غلطاں رہا اور پھر آپ ہی آپ [illegible] آگے بڑھ کر میری آنکھیں بند کر دیں اور میری سوچ کے دریچوں پر تا[illegible] گرا دیے۔

میں جب سو کر اٹھا تو دن ڈھل رہا تھا۔ سہ پہر کے تین بج [illegible] میری نیند کا قفل کھلا تو فوراً ہی مجھے عالیہ یاد آئی اور میں بستر سے اٹھ [illegible] سے دوسرے کمرے میں پہنچا۔ عالیہ ہوش میں آ چکی تھی — اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر منہ بند تھا اس پر وہ مضبوط ٹیپ ابھی تک موجود تھی اور اس کے دونوں ہاتھ پیچھے سر کی طرف پلنگ سے بندھے تھیں۔ اس کے بدن پر ریٹا نے [illegible] ڈال دیا تا کہ وہ سردی سے بچ جائے۔

عالیہ کی وہ بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں دیکھ کر ایک خیال [illegible] لمحے بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا اور میں نے فیصلہ [illegible] میں اس پر ہر حال میں عمل کروں گا — ریٹا ابھی تک سوئی ہوئی [illegible] میں نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا — وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی اور [illegible] سے بولی —

"قیامت آ گئی ہے کیا؟" وہ شوخ انداز سے مسکرائی [illegible]

"لوگ ملتان سے بھاگ رہے ہیں کہتے ہیں قیامت ریٹا [illegible] پہنچ چکی ہے۔" میں نے [illegible] اتارتے ہوئے کہا۔

"تم یوں کرو کہ اپنا سامان باندھ لو ہم ابھی یہاں سے [illegible]"

"تم جیسے گناہ گاروں کو فکر ہو گی مجھے کوئی ڈر نہیں [illegible] گا۔۔۔۔" وہ جوتے میں پاؤں پھنساتے ہوئے بولی — [illegible] عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی جن میں غصہ بھی تھا اور نفرت [illegible] رحم کی جھلک بھی تھی اور تحکم بھی — وہ مجھے محض ایک [illegible] نقب زن ایک اوچھا چور سمجھ رہی تھی۔

"جیلانی میرا تو خیال ہے کہ ہمیں اب کھانا کھا لینا چاہئے بھوک تیز ہو گئی ہے۔" ریٹا نے غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی کھانا منگواتا ہوں پہلے اپنی اس مادام کو تو سیدھی کر لوں۔" یہ کہہ کر میں نے عالیہ کے منہ سے ٹیپ اتار دی۔ پھر میں نے اس کی دونوں کلائیاں بھی کھول دیں۔ "اب اٹھ جا۔ ذرا کمر سیدھی کر لے۔"

وہ کچھ نہیں بولی پلنگ پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"اگر تو نے شور مچایا تو یہاں کوئی تیری مدد کو نہیں آئے گا اور اپنی زبان کھول کر تو اپنی موت کو اور زیادہ قریب کرے گی سمجھی! یہ لے پہلے تو یہ دودھ کا گلاس پی۔" میں نے میز پر سے اس کے لئے منگوایا ہوا دودھ کا جگ اٹھایا اور گلاس بھر کر اس کے لبوں سے لگا دیا۔ وہ بہت گاڑھا اور بالائی سے لدا پھندا دودھ تھا جسے عالیہ بڑی رغبت سے پی گئی —

"ہاں تو اب بتا عالیہ کو میرے گردے کی کتنی قیمت ملی ہے تجھے؟"

اس نے بڑی نخوت سے منہ پھیر کر دوسری طرف کر لیا۔

"میری بات کا جواب دو۔ میں تمہاری خوشامد نہیں کر رہا ہوں جو کچھ پوچھتا ہوں، ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔" میں نے بالوں سے پکڑ کر اس کا رُخ اپنی طرف کر لیا۔

"کتنے پیسے ملے تھے تمہیں؟"

"پانچ لاکھ ریال۔" اس کی زبان کھل گئی۔

"آپریشن کس نے کیا تھا؟"

"ڈاکٹر دھمن نے۔"

"تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے؟"

"وہ میرا خاوند ہے —"

"تم نے ڈاکٹری کی سند کہاں سے لی تھی؟"

"میں ڈاکٹر نہیں نرس ہوں۔ کڈنی ڈیزیز کے دو کورس پاس کر رکھے ہیں میں نے۔ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ میں ایف آر سی ایس ڈاکٹر ہوں میرے خاوند نے یہی بات مشہور کر رکھی ہے۔"

"یہ کورس کہاں سے پاس کئے تھے تم نے؟"

"لندن سے۔"

"وہاں تم کتنا عرصہ رہیں؟"

"ڈیڑھ سال۔"

"خرچ کس نے برداشت کیا تھا؟"

"ڈاکٹر دھمن نے۔"

"اس سے شادی تم نے کب کی؟"

"لندن سے واپس آنے کے بعد —"

"میرا گردہ نکالنے سے پہلے تم اور کتنے لوگوں پر ہاتھ چلا چکی ہو؟"

"ستر آدمیوں پر —"

"وہ کون تھے؟"

"وہ بھی تم جیسے چور اچکے تھے۔ دو ٹکے کے آدمی تھے۔"

"انہیں تم کس طرح اس کام پر آمادہ کرتی تھیں؟"

"ان میں سے اکثر لوگوں کو تو سوات خان پھانس کر لایا تھا۔"

"وہ کس طرح؟"

"وہ ایسے گروہ میں اٹھتا بیٹھتا ہے جو چوری چکاری اور ڈاکہ زنی میں بدنام ہے۔ وہاں وہ کسی نہ کسی مجرم کو یہ لالچ دیتا ہے کہ وہ ڈاکٹر دھمن کی کوٹھی پر رات کو ڈاکہ ڈالے۔ سارا نقشہ وہ اسے سمجھا دیتا ہے۔ پھر وہ مجھے اور حیدر کو خبردار کر دیتا تھا۔ چور اس کے بتائے ہوئے نقشے پر چلتا ہوا میری کوٹھی کے اس کمرے میں جا پہنچتا تھا جس کے دروازے از خود چاروں طرف سے بند ہو جاتے ہیں ہم اسے وہاں بے ہوش کر کے پکڑ لیتے تھے جس طرح تمہیں پکڑا تھا۔"

"مگر مجھے تو سوات خان نے نہیں بھیجا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے اور اسی لئے ہم اتنی بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔"

"چوروں کو پکڑ کر تم کیا کرتی تھیں؟"

"ہم چور کو جیل، قید اور پھانسی کی سزا سے اس حد تک ڈراتے تھے کہ وہ خاموش ہو جاتا تھا۔ بسا اوقات ہم اپنے شکار کو ایسی دوا دیتے تھے جو اس کے گردے میں یا مثانے کے قریب شدید درد پیدا کر دیتی تھی۔ ہم اس کو یہی یقین دلاتے تھے کہ اس کا گردہ خراب ہو گیا ہے یہ درد کچھ دن میں ہم اس حد تک بڑھا دیتے تھے کہ وہ آدمی خود بخود گردے کے آپریشن کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ ہم اسے یہی کہتے تھے کہ گردہ ناکارہ ہو چکا ہے اور اس کا نکال لینا ہی بہتر ہے اور اس طرح ہم اس کو ایک گردے سے محروم کر دیتے تھے۔"

"ان گردوں کو تم کہاں بیچتی تھیں؟"

"ان میں سے زیادہ تر ہم عرب ملکوں میں بیچتے رہے ہیں۔"

"وہاں گردوں کی اتنی ضرورت کہاں سے پیدا ہو گئی؟"

"عرب ممالک میں پانی کی آلائشیں ایسی ہوتی ہیں کہ ادھیڑ عمر کے لوگوں میں سے اکثر کے گردے ناکارہ ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں باقاعدگی سے مشین کے ذریعے اپنا خون صاف کرانا پڑتا ہے مگر وہاں ایسے ایسے امیر آدمی ہیں جو اربوں ڈالر کے مالک ہیں ان کے ناکارہ گردے کی جگہ ہم نیا صحت مند گردہ لگا دیتے ہیں تو وہ صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ ان سے ہم نئے گردے کی قیمت کبھی پانچ لاکھ ریال لے لیتے ہیں کبھی دس لاکھ ریال۔ یہ بات آدمی آدمی پر منحصر ہے۔ جتنا بڑا آدمی ہوتا ہے اتنی بڑی قیمت۔" عالیہ بڑی صاف گوئی سے کام لے رہی تھی۔ اس کا چہرہ اس وقت ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ وہ یوں مجھے اپنے اس گھناؤنے جرم کی تفصیل

بتا رہی تھی جیسے کوئی قصائی بکروں کے سری پائیوں کی بات کرتا ہے۔ اسے قطعاً یہ احساس نہیں تھا کہ اس نے کس عیاری، مکاری اور کمینگی سے کام لے کر اپنے وطن کے اتنے سارے لوگوں کو زندگی بھر کے لئے روگی بنا دیا تھا۔ ایک گردے سے انسان کتنے دن زندہ رہ سکتا ہے؟ اس کی عام کارکردگی بھی اس سے ضرور متاثر ہوگی۔ خوف کی ایک تیز لہر میرے بدن میں سرسراتی چلی گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ پتہ نہیں میرا ایک گردہ مجھے کتنے دن تک زندہ رہنے میں مدد دے گا اور کون جانے میں کس مقام پر کس حالت میں ڈھیر ہو جاؤں گا۔

"جن لوگوں کا ایک گردہ تم نے نکال لیا ہے ان کے کتنے عرصے تک زندہ رہنے کے امکانات ہیں میرا مطلب ہے ان کی عمریں تو عام آدمی کی عمروں سے کم ہو جائیں گی؟"

"ہاں میرا خیال ہے کہ ایک گردے والا آدمی عام آدمی سے تین چوتھائی عمر بسر کر سکتا ہے۔"

"تمہیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ تم ان غریب لوگوں پر کس قدر ظلم کر رہی ہو۔ اپنے خاوند کے لئے تم نے ستر جوانوں کو تباہ کر دیا اور میں اکہترواں ہوں۔"

"وہ غریب نہیں تھے۔ وہ بھی ظالم تھے، ہمیں لوٹنے آتے تھے۔"

"مگر انہیں تو سوات خان بھیجتا تھا؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟ انہیں نہ بھی کہا جاتا تو بھی وہ لوگوں کو لوٹنے سے باز تو نہیں رہتے جیسے تم وہاں گھس آئے تھے۔"

بڑا اطمینان پیدا ہو چلا تھا اس کے لہجے میں، جیسے وہ مجھے بہت کمتر، بہت احمق اور گھٹیا سمجھ رہی ہو۔ بات وہ یوں کر رہی تھی مجھ سے، جیسے وہ کسی مریض کو بتا رہی تھی کہ اس کا مرض کتنا شدید ہے۔ میں نے اس کے لب و لہجے سے صرفِ نظر کیا۔ "تم نے رٹیا کا بھی گردہ نکال لیا تھا؟"

"ہاں! ایک عورت کو اس کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ وہ پاکستانی تھی، اس سے ہم نے دو لاکھ روپے لئے تھے۔" اس کی یہ بات سن کر میرا خون کھول گیا مگر میں نے ضبط کیا۔ "اچھا یہ بتاؤ اس کام میں کتنے آدمی شریک ہیں؟"

"ہم سات آدمی ہیں جن میں تین ڈاکٹر ہیں دو نرسیں ایک..... سوات خان اور ایک اس کا ساتھی قاسم۔"

"نرسیں کون کون ہیں؟"

"ایک تو میں ہوں اور ایک عذرا۔ اسے تم نے شاید نہیں دیکھا۔"

"میں نے تو شاید قاسم کو بھی نہیں دیکھا ہے۔ تم نے یہ ساری باتیں مجھے بتا دی ہیں۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں پولیس کو تمہارے خلاف حرکت میں نہیں لا سکتا؟"

"پولیس کے پاس ہمارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔ البتہ ہمارے ہر شکار کے چوری کے جرم کی شہادت ہمارے پاس اس کی تصویروں کی صورت میں محفوظ ہوتی ہے جو ہمارے خفیہ کیمروں سے اتاری جاتی ہیں۔ کوٹھی کے مختلف کمروں میں یہ کیمرے لگے ہیں۔ تمہاری تصویریں بھی ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ تمہارے ہاتھ میں کھلا چاقو، مجھ پر اٹھایا ہوا تمہارا ہاتھ، سیف میں چابی گھماتے ہوئے تمہارے چہرے کی کیفیت۔ سب کچھ ہمارے کیمروں میں محفوظ ہے۔"

"اب تک تم نے کتنا مال جمع کیا ہے؟"

"میرا خیال ہے ہم میں سے ہر ایک کے پاس ستر ستر لاکھ روپے تو ضرور ہی جمع ہو گیا ہوگا جبکہ میرے پاس نوے لاکھ ہے۔"

"کہاں رکھتی ہو تم یہ رقم؟"

"یہ ساری کی ساری رقم ایک غیر ملکی بینک کی شاخ میں جمع ہے۔"

"کس شاخ میں؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتی۔" اس نے اپنے بازو پھیلا کر انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ رٹیا ابھی تک بنا رہی تھی۔

"جانتی ہو میں تمہیں یہاں کس لئے لایا ہوں؟"

"تم انتقام کی بات سوچتے ہو، مگر میری بات یاد رکھو تم کچھ بھی نہ کر سکو گے۔ میں آج نہیں تو کل صبح تمہارے قبضے سے نکل جاؤں گی۔"

"...کس طرح؟"

"وہ اس طرح کہ سوات خان اب تک اپنے آدمیوں کو حرکت میں لا چکا ہوگا جن کی خدمات ڈاکٹر دھمن نے ڈھیروں روپے دے کر خرید رکھی ہیں۔"

"یہ کون لوگ ہیں؟"

"ان کے بارے میں تمہیں میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ وہ اپنا کام شروع کر چکے ہوں گے اور تمہیں کیا پتہ وہ اب تک تمہارے کتنے پتے کاٹ چکے ہیں؟ تمہیں ہوش جب آئے گا جب پانی تمہارے سر پر سے گزر چکا ہوگا۔" اس نے نہایت ہی یخ بستہ لہجے میں کہا۔ ایک آہنی عزم اس کے چہرے پر نمایاں تھا۔ لگتا تھا وہ سارے جہان کو تہ و بالا کر سکتی ہے۔ وہ خوبصورت نازک بدن شعلے جیسے سرخ بالوں والی عالیہ، اس کی وہ ساری باتیں سن کر میں حیران رہ گیا تھا۔ لوگ ایسے بھی خطرناک ہوتے ہیں یارو۔ میں نے تو جرم کی پگڈنڈی پر پہلا ہی قدم رکھا اور تباہ ہو گیا اور یہ..... یہ ایک پورا گروہ ہے جو بے گناہ معصوم لوگوں کی جانوں سے کھیل رہا ہے۔ جانے کب سے مصروفِ عمل ہے مگر کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکا۔

اور اب یہ ناگن میرے سامنے پھن پھیلائے بیٹھی ہے اور کہتی ہے کہ پتہ نہیں ان کے آدمیوں نے اب تک میرے کتنے پتے کاٹ دیے ہوں گے۔

میں نے کھانے کے لئے بہت پہلے گھنٹی بجا دی تھی۔ ابھی عالیہ سے گفتگو جاری تھی کہ بیرہ کھانے سے لدی پھندی دو ٹرے لے کر ہمارے کمرے میں گھس آیا۔

"تو وہ کھانا بھی آ گیا ہے میرا خیال ہے تمہیں بھوک تو ضرور ہی

لگی ہوگی؟"

"کیوں نہیں! کھانا تو میں ضرور کھاؤں گی۔ تم مجھے خوف زدہ نہیں کر سکتے ہو جیلانی! تمہاری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے میرے سامنے۔" بیرے نے چونک کر پہلے اسے اور پھر مجھے بڑے غور سے دیکھا۔

"ابے جا تو۔ میاں بیوی کے معاملے میں کیوں کان کھڑے کرتا ہے؟ چل بھاگ یہاں سے اور دیکھ کچھ کباب بھی لیتا آ۔" میں نے بیرے کو ڈانٹ دیا۔

رٹیا بہت جھینپی ہوئی تھی۔ وہ اپنی مالکن کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھی۔ عالیہ تھی بھی ایسی ہی دبنگ۔ اس نے کلینک کے عملے پر لرزہ طاری کر رکھا تھا۔

"گھبرا مت میری چھمک چھلو۔ بیٹھ جا ادھر، یہ بے بس ہے اگرچہ ناگن ہے مگر اس وقت اسے کیل رکھا ہے میں نے۔ بیٹھ جا ادھر میرے پاس۔"

"اس کی تو میں ٹانگیں چیر دوں گی جیلانی۔ یہ رٹیا سمجھتی کیا ہے خود کو؟ یہ اپنے انجام کو ضرور پہنچے گی۔" عالیہ نے ناک سکوڑتے ہوئے کہا اور مرغ کی ٹانگ پر پل پڑی۔

"مگر تیرے بعد مادام تیرے بعد۔ کیونکہ کل صبح تک تو میں ہی تیرا قصہ پاک کر چکا ہوں گا۔" میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"اب یہ بکواس بند کرو اور کھانا کھا لو۔ نعمت سامنے رکھ کر بھی تمہاری زبان بند نہیں ہوتی۔" عالیہ نے بڑے رعب سے کہا۔ عجب ہے یارو، وہ مجھے ایسا ہی "مٹی کا مادھو" سمجھتی تھی۔ ذرا برابر پروا نہیں لئے وہ سمجھتی تھی میں یوں ہی ڈرامہ کر رہا ہوں اس کے ساتھ جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ بڑے مضبوط اعصاب کی مالک تھی وہ۔ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو قسم اللہ کی صدمے سے مر گئی ہوتی۔ مگر وہ تو آسمان میں تھگلی سی لگاتی تھی—

رٹیا کچھ نہیں بولی۔ آنکھیں جھکائے چپ چاپ کرسی پر بیٹھی کھانا کھاتی رہی جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ عالیہ سے بہت زیادہ مرعوب ہے.....

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے عالیہ کے سامنے وہیں بیٹھے بیٹھے سگریٹ سلگایا تو وہ بولی: "ایک سگریٹ مجھے بھی دو۔"

"واہ! تو گویا تم سگریٹ بھی پیتی ہو۔ او میری جان قسم اللہ کی جی خوش ہو گیا ہے تمہاری یہ بات سن کر..... مگر.....؟" میں نے سگریٹ اسے دے دیا۔ اسے اپنی آزادی کی قطعاً کوئی فکر دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بالکل مطمئن ہے۔

"مگر کیا؟" وہ میری باتوں کو بڑے دھیان سے سنتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی وہ دھمکیاں کھوکھلی دھمکیاں تھیں۔

"مگر..... ہاں میں یہ پوچھ رہا تھا کہ تمہارا کوئی بچہ بھی ہے؟"

"ہاں! ایک بچہ ہے میرا دس سال کا ہے وہ۔ اسے میں نے نیویارک بھیج رکھا ہے۔ وہیں پڑھ رہا ہے وہ۔"

"تمہاری عمر کتنی ہے؟"

"یہی کوئی تیس سال ہوگی۔"

"وہ بچہ ڈاکٹر دھمن سے ہے؟"

"ہاں تو اور کیا تم سے ہے۔"

"مجھ سے بھی ہو سکتا تھا۔ اس رات گاؤن تو تم نے اسی انداز میں اتارا تھا جیسے کوئی پہلوان اکھاڑے میں خم ٹھونک کر اترتا ہے۔"

وہ مسکرائی۔ عجیب سے بھیدوں بھرے گہرے گہرے رنگوں سے مزین خالصتاً ناگنی انداز میں۔

"میں نے کوئی ایسا مرد نہیں دیکھا تھا جو ایسی صورتِ حال میں اپنے حواس پر قابو رکھ سکے۔ میرا خیال تھا تم مرد ہی نہیں ہو، مگر اب میرا خیال ایسا نہیں ہے۔"

"کیوں؟ اب کیوں ایسا نہیں ہے؟"

"رٹیا تمہارے کمرے میں جو کچھ کرتی تھی اس کی مجھے خبر رہتی تھی۔"

میرا دماغ الٹنے لگا۔ کتنے لمبے ہاتھ تھے ان لوگوں کے۔

"پھر بھی تم نے اسے اتنی کھلی چھٹی دے رکھی تھی؟"

"ہم اس رات کے منتظر تھے جس رات وہ تمہاری زنجیر کاٹ دیتی۔"

"اور وہ رات آ گئی۔"

"ہاں آئی تو..... مگر ہمارے لئے پریشانی لائی۔ ہمارے حساب میں کچھ غلطی رہ گئی تھی۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ تم سوات خان کو اتنی آسانی سے زیر کر لو گے۔ میں مکمل ہدایات دے کر کوٹھی پر واپس گئی تھی۔"

میں اس کے سامنے سمٹ کر اپنی ہی نظروں میں بے وقعت ہونے لگا۔ تو اتنی تیز طرار عورت تھی وہ عالیہ۔

رٹیا کا رنگ اڑ رہا تھا۔ عالیہ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہی تھی۔ لگتا تھا اس سارے منظر میں سب سے زیادہ حاوی ہستی وہی ہے اور ہم دونوں میں اور رٹیا محض سائے ہیں۔ بے حقیقت، بے وقعت سائے معنی سے نکلتے.....

"تمہارے لئے بہتر یہی ہے جیلانی کہ میری کار مجھے دے دو اور مجھے یہاں سے جانے دو، ورنہ میرے آدمی تمہیں ایسی چوٹ دیں گے کہ ساری زندگی سر پر ہاتھ رکھ کر روتے رہو گے، تم نہیں جانتے ہو تم۔" اس نے مجھے نیم باز آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹ وہ سرخ ہونٹ ایسے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور سگریٹ پر اس کی گرفت یوں مضبوط ہو رہی تھی جیسے وہ کسی کا گلا دبا رہی ہو—

"ایسا بھی خراسانی گدھا نہ سمجھو مجھے عالیہ۔ ابھی تو تم میری قید میں ہو اور مجھے اپنے گردے کا حساب لینا ہے تم سے۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر تکیے کی طرف دبا دیں۔ پلنگ پہ سجا دہ دیں۔

"ٹھیک لگاتے ہو ریٹا اس حرامزادی کو، اس کی چیخ پکار سے میں تنگ آ گیا ہوں۔ بار بار دھمکیاں دیے جاتی ہے یہ مجھے۔"

میں نے غصے سے جھٹکتے ہوئے کہا اور نیا ٹیپ کاٹ کر عالیہ کا منہ دوبارہ سی دیا۔ اس کی آواز سے وحشت ہونے لگی تھی مجھے۔ ریٹا تو شاید اسی انتظار میں تھی ـــ اس نے کمٹ سے سرنج تیار کی اور ٹیکہ بھر کر عالیہ کی نس میں گھونپ دیا۔ اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے بے ہوش ہو گئی ـــ

"خس کم جہاں پاک۔ ایسی ذلیل کی بچی تھی وہ۔ دماغ سن کر دیا تھا اس نے میرا۔ مرتی مرگئی تھی مگر اس نے کس بل ویسے کے ویسے ہی ہیں ابھی۔"

"ریٹا مجھے ڈر ہے کہ اس کے ساتھی ہمیں چاروں طرف ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ پورے شہر تک سارے حال سے انہیں کچھ نکر رہ رہی ہے... ان کے پاس۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہئے؟ اس کی باتوں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں محفوظ نہیں رہیں۔"

ریٹا بھی پریشان ہو گئی تھی اور اس کے اطمینان کا وہ چھلکا، جو اوپری سطح پر قائم تھا ٹوٹ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں یہ جگہ آج ہی چھوڑ دینی چاہئے۔"

"مگر ہم جائیں گے کہاں؟"

"یہ علاقہ میرا بہت دیکھا بھالا ہے۔ ریٹا یہاں ایک ڈاک بنگلہ ہے اُدھر میلسی کی طرف۔ محکمہ نہر والوں کی ملکیت ہے وہ۔ ہم آج رات وہیں جا سکتے ہیں۔"

"مگر اس مصیبت کو تم کہاں لئے پھرو گے جیلانی؟"

"اسی کے لئے ہی تو میں وہاں جا رہا ہوں۔"

"احمق ہو تم۔ میری مانو تو اسے گولی مار کر اُدھر کسی کھڈے میں دفن کر دو۔ اور اطمینان سے گھر چلے چلو۔ خواہ مخواہ اپنے لئے مصیبت پیدا کر رہے ہو۔"

"مجھے ابھی ڈاکٹر دھمن اور اس کے ساتھیوں کو بھی پکڑنا ہے۔ ایک ایک سے انتقام لینا ہے مجھے۔"

"تو پھر اس کا یہ کون سا طریقہ ہے؟ جس کو پکڑو اسے جان سے مار دو۔ بس اس میں بھی چوڑی سوچنے کی کیا بات ہے؟"

"مگر..... مگر..... نہیں ریٹا۔ یہ اتنی آسانی سے مر گئے تو انہیں سزا کیا ملی؟ کیا سزا ملی انہیں؟ جو مر جاتے ہیں وہ تو ہر غم، ہر دکھ سے نجات پا جاتے ہیں پھر سزا کہاں ملی انہیں؟ نہیں! میں ان سب کو ایسی سزا دوں گا کہ یہ نہ مر سکیں گے اور نہ جی سکیں گے۔" میں نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی ہیں جیلانی! میں شاید زیادہ دور تک اور زیادہ دیر تک تمہارا ساتھ نہ دے سکوں۔"

"بکتی ہو تم! میں کوئی زیادتی تو نہیں کر رہا ہوں تمہارے ساتھ۔" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ بات نہیں ہے جیلانی! یہ اذیت ناک سلسلہ میں زیادہ دن تک برداشت نہیں کر سکتی۔ میں ان کاموں کے لئے نہیں بنی ہوں۔" وہ بلک کر اور نڈھال ہو کر کرسی میں جا دھنسی۔

"اوہ اب سمجھا! ٹھیک ہے بے بی میں..... میں..... میں بس ایک دن میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گا اور ڈھیر سارا روپیہ بھی تمہیں دے دوں گا تاکہ تم اطمینان سے زندگی بسر کر سکو۔"

"مجھے روپیہ نہیں چاہئے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے جیلانی تمہاری۔"

"نہ بابا نہ۔ یہ بہت مشکل کام ہے میرے راستے بڑے کٹھن ہیں۔ پتہ نہیں زندگی مجھے کس راہ پر لئے جاتی ہے۔ نکال دو اپنے دماغ سے ایسا تمام خناس۔ تم کہو گی تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے، میں تمہارے بغیر رہ نہیں سکتی۔ سب بکواس ہے۔ اب تو میں کسی کا بھی نہیں ہو سکتا۔ کسی کا بھی نہیں۔ سات آدمیوں سے انتقام لے کر ہی میں سکھ کی نیند سوؤں گا۔ یہ وعدہ ہے اپنے دل سے، اپنے رب سے، اپنی ماں کی خیالی تصویر سے۔ انہوں نے بہت سے لوگوں کو تباہ کر دیا ہے مگر اب انہیں میں تباہ کر کے چھوڑوں گا۔" میں نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے یوں کہا جیسے اگر وہ الفاظ میرے منہ سے نہ نکلے تو میں دم گھٹ کر مر جاؤں گا۔

ریٹا مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ نہیں بولی۔ رزق ہوئی اٹھی اور دوسرے کمرے میں جا کر سسکنے لگی۔

میں اس کی گریہ زاری پر لعنت بھیجتا ہوا کمرے سے نکلا اور باہر سے دروازے کو مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔ مجھے اسی شام وہ جگہ چھوڑ دینی چاہئے۔ عالیہ ٹھیک کہتی تھی اس کے آدمی میری تلاش میں ہوں گے۔

کاؤنٹر پر جا کر میں نے بل ادا کیا۔ اپنے دوست علی ناصر سے رخصت لی اور اسی شام ان دونوں کو کار میں لاد کر میں ملتان سے باہر نکل گیا۔

عالیہ کے بارے میں میں نے اپنے دوست کو بتایا کہ وہ بیمار ہے اور چلنے پھرنے سے معذور ہے اس لئے اسے اٹھا کر ادھر ادھر لے جانا پڑتا ہے۔ حالت عالیہ کی یہ تھی کہ اسے ریٹا نے ٹیکہ لگا کر بے ہوش کر رکھا تھا اور ہماری عافیت اسی میں تھی کہ ہم وہاں سے چپ چاپ نکل جاتے۔

مجھے میلسی جانے کی زحمت نہ اٹھانا پڑی۔ نہر کی پٹڑی پر میں نے کار ڈالی تو شہر سے کوئی اکیس میل دُور بہرون آباد کی طرف جانے والی سڑک پر مجھے ایک ڈاک بنگلے کی خبر ملی۔ ایک راہگیر نے بتایا کہ وہاں سے کچھ ہی دُور واپڈا کا ایک بنگلہ موجود ہے میں اس میں ٹھہر سکوں گا۔

یہ بڑی خوشی آئند خبر تھی۔ راہگیر کے بتائے ہوئے پتے پر جب میں پہنچا تو یہ دیکھ کر میرا دل خوش ہو گیا کہ ایک نیا تعمیر کردہ، نئی وضع قطع کا بنگلہ ایک پُر بہار جگہ پر راجباہ کے کنارے موجود تھا۔

بنگلے میں صرف ایک چوکیدار تھا۔ اس گھڑی وہ مجھے وہاں دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ میں نے جاتے ہی سو کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ کر اسے اپنا مطیع کر لیا۔ اس نے ہمارے لئے بنگلے کے ایک حصے میں دو کمرے کھول دیئے ـــ وہ دو کمرے ایک مکمل رہائشی حصہ تھے جن میں کچن بھی تھا اور دو باتھ روم بھی ـــ بجلی کے ہیٹر بھی لگے تھے ان کمروں میں۔

فرش پر دریاں بچھی تھیں اور وہاں جو فرنیچر رکھا تھا وہ اتنی سی ایس پی قسم کے افسروں کے شایانِ شان تھا۔ ان لوگوں نے شہروں کی بکواس سے دُور ماہی دو ماہی دوروں کے لئے اپنے لئے نہایت ہی خوبصورت آرام گاہیں مہیا کر رکھی تھیں جہاں نہ صرف تنہائی تھی بلکہ تھا بلکہ دنیا جہان کی آسائشیں بھی مہیا ہو سکتی تھیں۔

کار میں نے وہاں بھی عمداً گیراج میں بند کر کے تالا لگا دیا ـــ چوکیدار جس کا نام شیر د تھا ہمارے بہت کام آیا۔ میں نے عالیہ کو بستر میں لٹا کر لحاف اوڑھا دیا۔ اسے بالکل ہوش نہیں تھا۔ پھر میں نے چوکیدار کو پچاس روپے دیئے کہ وہ ہمارے لئے مرغ روسٹ کروا لے اور جو اچھی چیز وہاں کھانے کو مل سکتی ہے لے آئے۔

رات دس بجے تک ہمیں شیر د نے ہر شے سے بے نیاز کر دیا۔ ہم کھانا بھی کھا چکے تھے۔ گرم پانی سے نہا بھی چکے اور گرم کمروں کے اندر لحافوں میں بیٹھ کر قہوے کا بھی مزہ لے چکے۔ وہ بڑا ہی خدمت گزار قسم کا آدمی تھا صاحب لوگوں کی ضرورت کو تو چہروں سے پہچان لیتا تھا۔ ریٹا قہوے کی پیالی میز پر رکھ کر ذرا دیر کے لئے ادھر غسل خانے میں گئی تو وہ میرے پاس آ گیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"صاحب کوئی اور خدمت؟ میرا مطلب ہے صاحب کہ آپ کی تھکن تو دُور ہونی چاہئے نا؟"

"میں تھکا تو نہیں ہوں شیر د۔"

"صاحب فوٹو تو میرے پاس نہیں ہے پر نرد و ہس سے بڑھ کر ہے وہ لڑکی، اور صرف پچاس روپے ہیں۔"

"نہیں شیر د نہیں۔ اسے نہیں دیکھا تو نے یہ جو ہمارے ساتھ ہے کیا بُری ہے یہ؟" میں نے دل لگی کی۔

"بالکل نہیں صاحب! یہ تو بالکل چمگادڑ کی ہوا نوتی ہے۔ میں آپ کو پڑی لا کر دیتا ہوں۔" وہ اور زیادہ قریب آ گیا۔ عمر اس کی بھی کوئی پچاس کے لگ بھگ ہوگی مگر انسانی نفسیات کا ماہر آدمی تھا وہ مجھے کچھ ایسے انداز میں پھانس رہا تھا کہ میرا دل بھی تینتیس پر تینتیس ہونے لگا پھر میں نے کہا۔ "ہٹا دُو بارہ، یہ تو شیطان کا پرانا حربہ ہے۔" میں نے ذرا غصے کی نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔

"بدبخت یہ میری بیوی ہے سمجھا کہ نہیں۔ چلا جا یہاں سے ورنہ میں تجھے نوکری سے نکلوا دوں گا۔ گیٹ آؤٹ۔" اس کا رنگ پیلا ہو گیا۔ ہاتھ جوڑ کر الٹے پاؤں چلا اور پھر ایکدم بھاگ نکلا۔ اس کا تیر نشانے پر نہیں بیٹھا تھا۔

وہ رات بھی میں نے بہت محتاط انداز سے گزاری۔ اس حال میں کہ ریٹا کو میں نے اپنے ہی کمرے میں سلایا، ساتھ کے پلنگ پر، اور تمام دروازے کھڑکیاں اندر سے اس طرح بند کر رکھیں کہ باہر سے کوئی بھی اندر نہ آ سکتا تھا۔

دو دن اسی طرح گزر گئے۔ میں نے عالیہ سے کوئی بات نہ کی اس کی ساری دیکھ بھال ریٹا کرتی رہی۔

تیسرے دن صبح موذن کی اذان کے ساتھ ہی میں اٹھ بیٹھا۔ مجھے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ عالیہ کو سزا دینے کی جو تجویز میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکی تھی اب اس پر عمل کرنے کا مرحلہ آن پہنچا تھا۔

میں نے ریٹا کو جگا دیا۔

"اب یہ مت پوچھنا کہ قیامت آ گئی ہے کہ نہیں۔" میں نے آئینے میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اس وقت کیوں جگا دیا ہے تم نے مجھے؟ ابھی تو چار ہی بجے ہیں۔" اس نے دیوار پر لگے کلاک کو دیکھ کر کہا۔

"میں ذرا ملتان تک جا رہا ہوں سمجھیں۔ میرا خیال ہے صبح سات آٹھ بجے تک آ جاؤں گا۔"

"وہاں کیا کرو گے جا کر؟"

"بس ایک کام ہے۔ بہت ضروری کام۔ تمہیں یہ کرنا ہوگا کہ اس بدبخت عورت کو جگا کر تم کھانا کھلا دو گی۔ اس کا دل بہلا دو گی مگر اس کا منہ حسب معمول ٹیپ سے بند رکھو گی۔ اس کو میں نے پلنگ سے اچھی طرح باندھ دیا ہے باقی سب خیریت ہے۔"

اسے تمام باتیں سمجھا کر میں نے گیراج سے گاڑی نکالی اور تاروں کی چھاؤں میں ملتان کی طرف چل نکلا۔

مجھے اچھی طرح معلوم تھا مجھے کہاں جانا ہے؟ کیقباد ہوٹل کی..... ٹیلی فون ڈائرکٹری سے میں نے ڈاکٹر اظہر کا پتہ لکھ لیا تھا۔ میں سیدھا اس کی کوٹھی جا پہنچا۔ گلگشت کالونی میں رہتا تھا وہ۔ کوئی ایسا مشہور ڈاکٹر تو نہیں تھا وہ مگر اس کی پریکٹس خوب چلتی تھی۔ آنکھوں کے علاج کے لئے لوگ اس کے پاس دُور دُور سے چلے آتے تھے۔

اس کے ملازم نے مجھے کمرے میں بٹھا یا ہی تھا کہ ڈاکٹر اندر آ گیا۔ وہ دھان پان قسم کا آدمی اپنی عمر کے ڈھلتے سالوں میں تھا میرا خیال ہے پچاس کے پیٹے میں تو تھا ہی وہ۔ مجھے دیکھتے ہی بلا کہئے کیسے آنا ہوا؟ میں سنبھل گیا۔ مجھے بہت سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہئے تھی۔

"میرا نام مظفر ہے صاحب —— شب دادپور سے آیا ہوں۔ میری وہاں تھوڑی سی زمین ہے۔ میری ایک عزیزہ ہیں کینسر کی مریضہ ہیں وہ۔ پتہ نہیں کس گھڑی وہ کہاں دم توڑ دیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی آنکھیں کسی کو دے دی جائیں۔ ایک آنکھ وہ اپنی زندگی میں ہی دینا چاہتی ہیں اور دوسری مرنے کے بعد۔ اور آج ان کی حالت بڑی ہی مایوس کن ہے میرا خیال ہے کہ وہ اب تک مر چکی ہوں گی۔ میں نے سنا ہے کہ مرنے کے ایک گھنٹے کے اندر اندر ہی آنکھ صحیح سالم طور پر الگ کی جا سکتی ہے۔ اس لئے آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ ابھی اپنا سامان لے کر میرے ساتھ چلیں میں آپ کو منہ مانگی فیس دینے کو تیار ہوں۔"

"یہ تو بڑا نیک کام ہے صاحب! وہ خاتون انسانی ہمدردی کے تحت اپنی آنکھیں بطور عطیہ دینا چاہتی ہیں۔ پھر مجھ پر کیا لازم ہے کہ میں فیس لوں مگر میں آج آپ کے ساتھ جا نہیں سکتا۔"

"کیوں؟ صاحب ضرورت تو آج ہے آپ کی۔ اگر آج نہ گئے آپ تو پھر کیا فائدہ؟ آپ......"

"دیکھیں یہ محض ایک ٹیکنیکل کام ہے۔ میں یوں کرتا ہوں کہ سارا سامان دے کر اپنے ایک اسسٹنٹ کو بھیج دیتا ہوں۔ ان کا نام انور ہے ڈاکٹر انور، وہ ابھی پندرہ منٹ میں آپ کے ساتھ چل دیں گے۔" یہ کہہ کر وہ ڈاکٹر دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں ڈاکٹر۔"

وہ مسکرا کر دروازے میں گم ہو گیا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر اظہر نے ضروری سامان دے کر اپنے اسسٹنٹ ڈاکٹر انور کو میرے ساتھ روانہ کر دیا۔ وہ کوئی تیس بتیس سال کا جوان آدمی تھا۔ صورت شکل سے وہ یونہی سا تھا۔ رنگ سیاہی مائل، آنکھیں بے رونق، بال خشک اور بکھرے بکھرے۔ البتہ سوٹ اس نے بہت عمدہ پہن رکھا تھا اور میری گاڑی کو وہ بہت للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لینے دیکھنے سے صاف طور پر بتا رہا تھا کہ وہ حریص ہے۔ بے حد حریص۔ اور اسے خرید لینا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

شہر سے ابھی ہم چھ سات میل ہی دور نکلے تھے کہ میں نے سڑک سے اتار کر گاڑی ایک جگہ درختوں کی اوٹ میں ٹھہرا لی۔

"کیا ہوا صاحب؟ کوئی پرزہ وزہ خراب ہو گیا ہے؟"

"جی نہیں ڈاکٹر صاحب! یہ دیکھیں پستول اگر آپ نے ذرا بھی.... چوں چراں کی تو مغز پھاڑ دوں گا آپ کا۔ آپ کو اپنی آنکھیں بند رکھنی ہوں گی۔ میں جہاں جا رہا ہوں وہ جگہ آپ کو یاد نہیں رہنی چاہئے۔"

"یہ...... یہ کیا بدمعاشی ہے صاحب! میں تو آپ کو بہت معزز آدمی سمجھ رہا تھا صاحب کمال ہے۔ اظہر صاحب نے کہا تھا آپ بڑی فیس دیں گے۔ جاری خدمت خاطر کریں گے مگر آپ تو پستول دکھا رہے ہیں۔" اس نے تھر تھر لرزتے ہوئے کہا۔

"فیس تو میں آپ کو بہت دوں گا ڈاکٹر —— تین ہزار روپے کافی ہوں گے؟"

"تین ہزار۔ ہاں۔ واللہ بہت معقول اور جائز فیس ہے مگر یہ پستول۔ نہیں نہیں میں آپ سے کچھ نہیں لوں گا مجھے اتار دیں یہاں...."

"نہیں ڈاکٹر صاحب! لائیے میں آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دوں منہ ادھر کیجئے ذرا۔"

وہ خوف سے تھر تھر لرز رہا تھا فوراً ہی میری بات مان گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں پر کس کر پٹی باندھی اور پھر ایک ڈوری سے اس کے دونوں ہاتھ کمر پر باندھ دیئے۔

"آپ بولنے کا نہیں ڈاکٹر صاحب! ورنہ گولی نرخرے سے آر پار گزار دوں گا ہاں——"

"نہیں نہیں بھتیا میں بالکل نہیں بولوں گا۔ خدا رسول کی قسم میں دو بچوں والا ہوں بس تم گولی نہ چلانا۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں میرے۔"

میں نے گاڑی سٹارٹ کی اور گاڑی کے تمام پردے گرا دیئے۔

جب میں سڑک پر آ کر گاڑی کو پہلی رفتار پر لے آیا تو میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"کتنے بچے ہیں آپ کے ڈاکٹر صاحب؟"

"سات بچے ہیں بھتیا سات۔ ان پر رحم کھانا۔ اللہ کی قسم آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔"

"شور تو نہیں کریں گے؟"

"نہیں نہیں میرے باپ دادا کی بھی توبہ بڑے بھتیا۔ میں کیوں شور مچاؤں گا بھلا؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"جو میں کہوں گا کریں گے؟"

"میں وہی کروں گا جو آپ کہیں گے۔"

"اگر میں کہوں کہ فلاں آدمی کو قتل کر دیں؟"

"تو میں کر دوں گا صاحب، واللہ کر دوں گا۔ بس آپ مجھے گولی نہ ماریں——"

"میری حکم عدولی تو نہیں کریں گے؟"

"جی نہیں صاحب مجھ سے قرآن پر ہاتھ رکھوا کر قسم لے لیں۔ میں آپ کا ہر حکم مانوں گا۔"

"جھک کر بیٹھیں۔ سر نیچا رکھیں تاکہ کسی کو نظر نہ آئیں۔" میں نے اس کی گھگھیاتی آواز اور سمساتی صورت پر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔ وہ خاصا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ وہ ایک دم نیچے جھک گیا بہت نیچے۔

بنگلے پر پہنچ کر جب میں نے گاڑی گیراج میں بند کی تو وہ بولا۔

"صاحب! میری پٹی تو کھول دیں۔ میں کام کس طرح کر سکوں گا؟"

"ابھی کھول دیتے ہیں ڈاکٹر صاحب! پہلے ذرا دیکھ تو لوں کہ آپ کی مریضہ کس حال میں ہے۔ آپ چپ چاپ بیٹھے رہیں۔" یہ لے کر تو پستول

دھیان رکھو ڈاکٹر صاحب کا۔" میں نے یونہی اسے الجھاتے ہوئے کہا۔ پھر میں آواز بدل کر بولا۔

"لاؤ صاب جی بلاؤ۔ گولی مارنی تو نہیں ہے نا جی؟"

"نا بابا نا۔ گھبرو بابا! گولی نہیں مارنی ہے ہمیں بابا! ہم ڈاکٹر ہیں آئی سپیشلسٹ ہیں۔" ڈاکٹر اور زیادہ نقل گیا اس کی صورت دیدنی تھی۔

بنگلہ بالکل سنسان تھا۔ چوکیدار کا دور دور کہیں پتہ نہیں چلتا تھا میں نے سونے کی اینٹوں سے بھرا بریف کیس کار سے نکالا اور بنگلے کے اس حصے کی طرف بڑھا جہاں ہم ٹھہرے تھے۔

میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی کہ وہاں صورتحال میرے حق میں نہیں رہی ہے۔ ابھی میں گیراج سے نکل کر دس قدم ہی چلا ہوں گا کہ مجھے زمین پر ایک جگہ خون کے قطرے نظر آئے۔ اس سے ذرا آگے مجھے سوکھی لکڑیوں کے ڈھیر کے دوسری طرف شیرو چوکیدار نظر آیا وہ شدید زخمی تھا اور اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

میں نے اسے وہاں سے اٹھایا تو پتہ چلا کہ اس کی ران میں گولی لگی ہے۔

"کیا ہوا شیرو؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟ بتاؤ جلدی بتاؤ۔"

"وہ جی صاب جی چار آدمی سیاہ رنگ کی کار پر آئے تھے۔ وہ.... وہ دان بیبیوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں نے ان کا پیچھا کیا تو وہ مجھ پر گولیاں چلانے لگے۔ میں یہاں چھپ گیا۔ پھر بھی ایک گولی میری ران میں لگ ہی گئی۔"

میں بھاگ کر گیراج میں گیا۔ ڈاکٹر کے منہ سے میں نے پٹی اتاری اور اسے کھینچ کر شیرو کے پاس لے گیا۔

"میں تو محض مذاق کر رہا تھا ڈاکٹر! یہ دیکھو اسے ڈاکوؤں نے گولی ماری ہے اس کی مرہم پٹی کرو۔ لاؤ اپنا سامان جلدی لاؤ۔"

"اور وہ آنکھ کی مریضہ؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔ اسے اپنی فیس برباد ہوتی نظر آ رہی تھی۔

"اس کی فکر نہ کرو، وہ بھی مل جائے گی۔ آپ کو فیس بھی ملے گی پہلے اس کا علاج کریں۔"

وہ گیراج کی طرف بھاگا اور وہاں سے مرہم پٹی کا سامان لے کر فوراً ہی واپس آ گیا۔ شیرو وہیں فرش پر لیٹ گیا تھا اور اس کی ران سے برابر خون بہہ رہا تھا۔

ڈاکٹر اپنے فن میں ماہر تھا۔ اس نے جلدی سے شیرو کو سنبھال لیا۔ جب وہ اس کی مرہم پٹی کر چکا تو ہم دونوں نے مل کر اسے اندر لے جا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں سے میں صبح صبح ملتان کے لئے روانہ ہوا تھا۔ اب وہاں نہ عالیہ تھی نہ ریٹا تھی۔ عالیہ ٹھیک کہتی تھی۔ سرات خان کے آدمی حرکت میں آ چکے تھے۔ وہ رات ہی سے ہمارے پیچھے لگ گئے تھے انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ میں عالیہ کی کار میں سفر کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے میرا پیچھا کسی ایک آدمی نے کیا ہو گا پھر اپنے ساتھیوں کو لینے وہ واپس ملتان گیا تھا وہاں وہ رات بھر اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کرنے میں مصروف رہا۔ اور صبح سویرے وہ اس وقت وہاں حملہ آور ہوئے جب میں وہاں موجود نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے انہیں بعد میں پتہ چلا ہو کہ میں وہاں نہیں ہوں۔

سارے امکانات میرے ذہن میں واضح ہو رہے تھے اور اپنی اس شکست پر میرا خون کھول رہا تھا۔ عالیہ ایک بار پھر مجھے چکمہ دے کر نکل گئی تھی——

بڑی طاقت تھی اس کے بازوؤں میں۔ بڑا کس بل تھا اس کے روپے میں، جو اس نے منشیات سے کمائے تھے۔

مگر—— میں یوں ہار نہیں مانوں گا عالیہ! جب تک تو زندہ ہے اور تیرے گروہ کا یہ جال موجود ہے میں تمہارا پیچھا کرتا رہوں گا۔ ہاں، عالیہ میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔

چوکیدار سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں ان سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک سیاہ رنگ کی کار تھی جس میں چار آدمی بیٹھے تھے۔ وہ سب کے سب لمبے کوٹ پہنے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے سر مفلروں میں لپیٹ رکھے تھے۔

انہوں نے آتے ہی پوچھا تھا کہ یہاں کون ٹھہرا ہوا ہے؟ میں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا چوکیدار کو۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا اس پر ان لوگوں نے اسے خوب زد و کوب کیا۔

وہ بے چارہ بلبلا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ لوگ دندناتے ہوئے آگے بڑھے اور ایک کھڑکی کو زبردستی توڑ کر اس کمرے میں جا گھسے جہاں ریٹا اور عالیہ بیٹھی تھیں۔ پھر نہیں معلوم چوکیدار کو، کہ وہاں کیا شور مچتا رہا۔ اس نے صرف یہی بتایا کہ ایک عورت مسلسل چیختی چلاتی رہی اور وہ لوگ ہنستے رہے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ دروازے کھول کر دونوں عورتوں کو کندھوں پر ڈال کر باہر لے آئے اور پھر کار میں ڈال کر چل نکلے چوکیدار ان کے پیچھے بھاگا تاکہ وہ ان عورتوں کی مدد کر سکے مگر ان میں سے کسی نے گولی چلا دی۔ ایک گولی سامنے دیوار میں لگی اور دوسری چوکیدار کی ران میں۔ وہ بیچارا ان سے بچنے کے لئے پاگلوں کی طرح خشک لکڑیوں کے ڈھیر کے پیچھے جا چھپا اور وہ کار فراٹے بھرتی ہوئی نکل گئی۔

چوکیدار کو ڈاکٹر نے ضروری دوا بھی دے دی تھی اور مرہم پٹی بھی کر دی تھی——

"وہ مریضہ کہاں ہے صاحب؟"

"لعنت بھیجیں اس مریضہ پر ڈاکٹر صاحب! آئیے واپس چلتے ہیں اس عورت نے شاید اپنا ارادہ بدل دیا ہے، وہ لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں آئیے واپس چلتے ہیں۔"

میں نے ڈاکٹر انور کو ساتھ لیا اور انہی قدموں ملتان کو واپس چل دیا——

مجھے ہر حال میں ان کا پیچھا کرنا چاہئے تھا۔ ریٹا بے گناہ ماری گئی

تھی۔ خدا ہی کو معلوم تھا کہ وہ اس سے کیا سلوک کرتے ہیں۔

وہ اس بدنصیب سے پہلے ہی اس کی ملازمت کی قیمت وصول کر چکے ہیں، اس کو بھی میری طرح انہوں نے ایک گوشے سے محروم کر دیا تھا اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ اس کے تمام اعضا صحیح سالم ہیں۔

ڈاکٹر انور سخت خوف زدہ تھا اور اس کی سمجھ میں وہ گورکھ دھندا نہیں آ رہا تھا مجھے یقین تھا کہ وہ عالیہ کو کسی محفوظ مقام پر چھوڑ کر دوبارہ میرے پیچھے آئیں گے ـــــ مجھے وہ کسی قیمت پر کھلا چھوڑنا پسند نہ کریں گے میں ان کے گروہ کے لئے زبردست خطرے کا نشان بن گیا تھا۔

راجباہ کی کچی سڑک پر ان کی موٹر کا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔ اس سے اس روز یا میری کار گزری تھی یا ان کی ـــــ ڈاکٹر انور بالکل خاموش تھا اور کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا تھا اور میرا ذہن عجیب طرح سے قلابازیاں کھا رہا تھا ـــــ

وہ دسمبر کی سات تاریخ تھی جس دن میں گھر سے نکلا تھا اور اس روز جنوری کی چوبیس تاریخ تھی۔ مجھے گھر سے نکلے صدیاں ہی بیت چکی تھیں اور وہاں سے میں کہہ کر آیا تھا کہ میں اسے ایک لاکھ روپے لا دوں گا۔ آسیہ کی شادی دسمبر کی بائیس تاریخ کو تھی جمعہ کا دن تھا وہ۔ اور...... اور...... وہ سب کچھ گڈمڈ ہو گیا تھا۔ ان حادثوں نے مجھے کہاں سے کہاں جا پھینکا تھا۔ میں ان چھ سات ہفتوں میں اتنا بدل گیا تھا کہ اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو چکا تھا۔

میں نے شفا بار میں ایک آدمی کے سینے میں چاقو اتار دیا تھا۔ اس کا خون میری گردن پر تھا۔ میں عالیہ کا گھر لوٹنے کے لئے رات کے اندھیرے میں اس کے چچے کو ہلاک کر کے اس کے سیف تک جا پہنچا تھا اور...... قدرت نے مجھے میرے اس جرم کی یہ سزا دی تھی کہ ان لوگوں کی قید میں پہنچا دیا تھا جنہوں نے مجھے میرے بدن کے ایک اہم عضو سے ہی محروم کر دیا تھا۔ نہ میں اپنی فریاد لے کر تھانے جا سکتا تھا نہ میرے وجود میں اتنی سکت اور وسعت تھی کہ میں اس گروہ کو کچل سکتا۔ مجھے اپنے آپ پر ترس آنے لگا تھا۔ ایک عجیب ہی عجیب و غریب صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی وہاں ـــــ اور اب میں پھر انجانے خطروں کی زد میں تھا۔ مجھے ہر جھاڑی کے پیچھے دشمن کا چہرہ نظر آتا تھا ہر قدم پر میں لرز رہا تھا ـــــ

اور ابھی ہم راجباہ کی سڑک سے اتر کر نہر کی پٹڑی پر نہیں چڑھے تھے کہ درختوں کے ایک جھنڈ سے جس کی لمبی لمبی شاخیں بہت آگے پٹڑی پر جھک آئی تھیں ـــــ ایک دم کئی گولیاں یکے بعد دیگرے ہماری کار سے ٹکرائیں۔ ایک تو ایسی آئی کہ کار کا شیشہ ہی توڑ گئی۔ میں نے رفتار ایک دم تیز کر دی ـــــ ڈاکٹر چیخ مار کر سیٹ کے نیچے دھنس گیا۔

ایک دو تین یکے بعد دیگرے ہم پر پیچھے سے بھی کئی فائر ہوئے نتیجہ یہ نکلا کہ گاڑی کا پچھلا شیشہ بھی ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا۔

کار کی رفتار تیز ہوئی تو ہوا کے دھکے بڑھ گئے ـــــ پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری اور کار کو دوڑاتا ہوا بہت آگے نکل آیا۔ میرا خیال ہے وہ لوگ اپنے پیچھے صرف ایک آدمی چھوڑ کر گئے تھے تاکہ مجھ پر نگاہ رکھے مگر وہ تنہا آدمی سامنے آ کر میرا مقابلہ نہ کر سکا شاید مجھ سے وہ خوف زدہ تھا جب ہی تو اس نے میری کار پر درخت کی ٹہنیوں میں چھپ کر گولیاں چلائی تھیں اگر وہ کوئی بہادر آدمی ہوتا تو زمین پر رہتا اور جتنی گولیاں اس نے صرف کی تھیں ان میں سے کسی نہ کسی گولی سے تو وہ میری کار کا ٹائر پھاڑ ہی سکتا تھا مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔

"اب سیٹ پر بیٹھ جائیں ڈاکٹر صاحب! خطرہ ٹل چکا ہے۔" میں نے اب ذرا اطمینان سے کہا۔ مجھے یقین تھا کہ اب ہم عالیہ کے اس بدمعاش کی گولیوں کی زد سے نکل چکے ہیں۔

"یہ...... یہ گولیاں کس نے چلائی ہیں ہم پر صاحب! اور یہ ہوا تو بہت سرد ہے صاحب۔" ڈاکٹر انور نے سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کرتے ہوئے کہا اس کے لئے سیٹ پر جم کر بیٹھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے پچھلی سیٹ سے اٹھا کر کمبل اسے دے دیا۔ "یہ لیں ڈاکٹر صاحب! کمبل اوڑھ لیں۔ ورنہ سردی سے مر جائیں گے آپ۔" میں نے ہوا کے تیز تھپیڑوں سے بچنے کے لئے آدھا کمبل اپنے سینے پر لپیٹتے ہوئے کہا۔

بڑی مشکلوں سے اس روز میں دوپہر کو ملتان پہنچ سکا۔ ڈاکٹر کو سٹیشن کے قریب اتار کر میں سیدھا ایک ورکشاپ میں گیا جہاں سے میں نے گاڑی کے دونوں شیشے بدلوائے اور پٹرول کی ٹینکی بھروا کر میں لاہور کو چل دیا۔ میرے لئے اور کوئی راستہ کھلا نہیں رہ گیا تھا۔

میرے تصور میں آسیہ کا چہرہ ابھر رہا تھا۔ ماں کی بھیگی ہوئی آنکھیں مجھے ونڈ سکرین پر بھی نظر آتی تھیں۔ انہیں میں نے کتنا دکھی کر دیا تھا۔ میں ایک لاکھ روپے انہیں نہ دے سکا اور میرے تایا نے ڈولی نہیں اٹھائی ہو گی آسیہ کے مہندی لگے ہاتھ یونہی خلا میں جھولتے رہ گئے ہوں گے کسی نے ان پر کوئی زیور نہ پہنایا ہو گا اور بائیس تاریخ کا دن ان کے لئے ماتم کا دن بن گیا ہو گا۔

رہ رہ کر عالیہ کے یہ لفظ میرے ذہن میں گونجتے تھے اس نے کہا تھا کہ خدا جانے اس کے ساتھی سوات خان کے آدمی اب تک میرے کتنے چکے کاٹ چکے ہوں گے۔

اور اس شام جب میں نے آٹھ بجے کے قریب اپنے گھر کے سامنے لے جا کر عالیہ کی کار کھڑی کی تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے گھر کی کوئی بتی روشن نہیں تھی ہر دریچہ تاریک تھا اور...... اور ساری فضا سوگوار تھی۔

سونے کی اینٹوں سے بھرا وہ بریف کیس اور اپنی دوسری چیزیں اٹھا کر جب میں نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی تو یوں لگتا تھا جیسے میں کسی قبر کی پشت پر ہاتھ مار رہا ہوں۔ کتنی ہی دیر مجھے گھر سے کوئی جواب نہ ملا پھر میں مسلسل دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔

اور...... اور...... جب دروازہ کھلا تو میں نے ڈیوڑھی کے گھپ

بلب کی نحیف و نزار روشنی میں ایک سایہ سا لرزتا دیکھا۔ وہ میری ماں تھی اس تھوڑی سی مدت میں اس کی کمر جھک گئی تھی اور وہ لاٹھی کے سہارے کھڑی تھی۔ اس کی شاید بینائی بھی کمزور ہو چکی تھی۔ بولی: "کون ہے؟"

"ماں...... ماں...... یہ کیا ہو گیا ہے تجھے؟" میں نے آگے بڑھ کر اسے باہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

"تو...... تو آ گیا ہے جیلے؟ یہ تو ہے نا بچے، میرا جیلانی بیٹا۔"

"ہاں ماں میں جیلانی ہوں مگر یہ تیرا کیا حال ہو گیا ہے تجھے؟"

"وہ...... وہ بیٹے پہلے تو غائب ہوا تھا۔ پھر تین دن ہوئے وہ آسیہ کو زبردستی اٹھا کر لے گئے وہ۔ رات کو آئے تھے، آدھی رات کو......"

"کون لے گئے ہیں آسیہ کو؟ یہ تو کیا کہتی ہے ماں۔ میں...... میں ان کا خون پی جاؤں گا ماں ایک ایک کی رگیں کاٹ دوں گا وہ کون تھے ماں مجھے بتا۔" میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

ماں نے اپنی آنکھوں کی بچی کھچی روشنی کا سہارا لے کر دروازہ بند کیا اور مجھے ساتھ لے کر بیٹھک میں جا بیٹھی۔ وہ ٹٹول ٹٹول کر راستہ تلاش کرتی تھی ـــــ

"پولیس بھی آئی تھی بیٹا، مگر وہ بھی کچھ نہیں کر سکی۔ ادھر جتنے منہ اتنی باتیں ہو رہی ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہ آسیہ کے یار تھے۔ ہاں ایسی بکواس کرتے ہیں وہ۔ میری آسیہ میں کیا برائی دیکھی جہان والوں نے۔ یار کہاں سے ملنے؟ وہ لوگ جو آئے تھے تیرا پوچھتے تھے کہتے تھے وہ مل گیا تو اس کا ہم قیمہ کر دیں گے۔ وہ آسیہ کو کار میں ڈال کر لے گئے۔ جیلانی پتہ نہیں وہ خدا کا عذاب تھے کہ میرے گناہوں کی شامت، وہ مجھے تباہ کر گئے بیٹا۔ کاش وہ ایک گولی میرے سینے میں اتار دیتے۔ تیرے تایا نے منگنی بھی توڑ دی۔ پتہ نہیں تو کہاں چلا گیا تھا۔ تو تو کہتا تھا ایک لاکھ روپے دے دیں گے ہم ان کو۔ لایا ہی نہیں تو وہ روپیہ۔ اور تیرے تایا نے جاتے منہ پر تھوک دیا۔ اس نے پچھلے مہینے کی سترہ تاریخ کو کہلا بھیجا کہ وہ اپنے لڑکے کی شادی کہیں اور کر رہا ہے۔ اور...... اور...... پھر بچے یوں ہوا کہ اللہ نے آسیہ کی آپ ہی شادی کر دی۔ وہ اسے زبردستی اٹھا کر لے گئے پتہ نہیں کون تھے وہ؟ پتہ نہیں میرا داماد کون بنا ہے؟ اللہ ہی کو معلوم ہو گا ـــــ"

ماں بولتی جا رہی تھی جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہو۔ میرا خیال ہے وہ اپنی سدھ بدھ کھو چکی تھی۔ ورنہ وہ ایسی خوفناک باتیں نہ کہتی اس نے بہت کچھ کہا تھا۔ عجیب عجیب سی گندی باتیں اس نے منہ سے کی تھیں وہی باتیں جو اس روز سوات خان کے آدمیوں نے اس سے کہی تھیں ـــــ

اور پھر جب مدت ہو گئی تو میں نے ماں کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"بس کر ماں بس کر، خدا کے لئے بس کر۔ تیرے دودھ کی قسم ماں تیرے دشمنوں کو تہس نہس کر دوں گا ماں۔ تیری دعاؤں کی قسم میں چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک آسیہ نہیں مل جاتی۔ جب تک اس کے دشمن زمین کے پیٹ میں نہیں چلے جاتے۔"

میں نے ماں کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا اور پانچ ہزار روپے کے نوٹ اس کی جھولی میں ڈال کر باہر نکل آیا۔

بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا اور عالیہ کا پستول میری جیب میں۔

میں کار میں بیٹھا اور گلبرگ کی طرف چل دیا۔ مجھے ان لوگوں سے اب یہ نیا حساب بھی چکانا تھا۔

○

مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرا دماغ پھٹ جائے گا رہ رہ کر مجھے آسیہ کا خیال آتا تھا۔ میں پوچھتا تھا خود سے سوال کرتا تھا پاگلوں کی طرح اپنے بال نوچتا تھا اور اس بات کا جواب چاہتا تھا۔ میں اپنے دل سے اپنے ضمیر سے کہ غلام جیلانی یہ تو نے کیا کر دیا۔ تو نے اپنی حماقت کی وجہ سے ایک بھرے پرے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ دیا۔ تو محسوس کیوں نہیں کرتا کہ آسیہ کے لعل و گہر تو نے اپنی جہالت کی چکی میں ڈال کر پیس ڈالے ہیں تو نے کیا کر دیا ہے غلام جیلانی؟ تیری بہن، تیری مظلوم و بے بس بہن بھی تجھ سے پوچھتی ہے کہ تو کس راہ پر چل نکلا ہے۔ میرے ویر تو تو میرے لئے ایک لاکھ روپے لینے نکلا تھا۔ تو نے یہی تو وعدہ کیا تھا ماں سے۔ تو تو مجھے ایک لاکھ روپے میں تول کر بڑی دھوم دھام سے میری ڈولی والوں سے اٹھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ تجھے کیا ہو گیا۔ تو کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے۔

تجھے کیا معلوم غلام جیلانی، وہ تیری گڑیا، ایسی معصوم سی خوبصورت بہن کن بھیڑیوں میں گھر گئی ہے؟ وہ لوگ اسے کبھی معاف نہیں کریں گے چونکہ وہ تیری بہن ہے اس لئے وہ اسے بدترین اذیتوں سے دوچار کریں گے وہ عورت جو اپنے ذرا سے مالی فائدے کے لئے انسانوں کو ان کے بدن کے اہم حصوں سے محروم کر چکی ہے۔ وہ تیرے حوالے سے تیری بہن پر کیا کیا ستم نہ توڑے گی کہ تو نے عالیہ کو بڑے تکلیف دہ مراحل سے گزار دیا تھا وہ تجھے یا تیری بہن کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔

میرے ذہن کے ایوانوں میں زلزلہ آیا ہوا تھا۔ اپنے ارد گرد کی ہر شے مجھے سرخ نظر آتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ بہت دیر ہو چکی ہے وقت میرا ساتھ چھوڑ چکا ہے۔ میری عزت ان کے پاؤں تلے اب تک بار بار روندی جا چکی ہو گی پھر بھی کوئی قوت تھی جو مسلسل مجھے آگے ہی آگے دھکیل رہی تھی ـــــ

کار کی رفتار دم بدم تیز ہوتی جا رہی تھی ـــــ

مجھے ان بھیڑیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے طاقت کی ضرورت تھی اسلحے کی ضرورت تھی کیونکہ وہ مجھ سے تعداد میں بھی زیادہ تھے اور وہ جدید ترین اور مہلک ترین اسلحے سے لیس تھے ان کے وسائل بے پناہ تھے۔ ان کے مقابلے میں میری جیب میں اس وقت عالیہ کا ایک ننھا سا پستول تھا اور بس میرے ہاتھ تو کچھ

بھی نہیں تھا میرے پاس۔ مگر سوال یہ تھا کہ میں اسلحہ کہاں سے لے سکوں گا یہ بھی نہ جتنا اگر میں ان میں جا گھستا تو وہ تو میری بوٹیاں نوچ لیں گے۔ میں سوچتا رہا سوچتا رہا اور آگے بڑھتا رہا۔

ایک جگہ رک کر میں نے ٹیلی فون بوتھ سے شفا بار کلینک میں فون کیا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر دمتن کلینک میں موجود تھا ـــ دوسرے لوگ بھی وہاں حاضر تھے مگر نہ تو سوات خان کا کسی نے کچھ بتایا نہ عالیہ کے بارے میں کچھ پتہ چلا پھر میں نے عالیہ کی رہائش گاہ پر فون کیا۔ دوسری طرف سے کسی عورت کی باریک سی آواز سنائی دی۔ معلوم ہوا عالیہ وہاں بھی نہیں ہے۔ وہ اس کی ملازمہ تھی۔ اس نے بتایا کہ عالیہ کئی دنوں سے کوٹھی میں نہیں دیکھی گئی ـــ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ ابھی تک آسیہ کو اپنا انتقام کا نشانہ بنانے میں مصروف ہیں اور عالیہ نے جان بوجھ کر خود کو کہیں چھپا رکھا ہے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کسی ہسپتال میں زیر علاج ہو کیونکہ میری وجہ سے اس کی ذہنی حالت بہت ابتر ہو گئی تھی۔

سونے کی اینٹوں سے بھرا اٹیچی کیس میرے ہاتھ میں تھا۔ میں فون بوتھ سے باہر نکلا اور گاڑی کا رُخ صرافہ بازار کی طرف موڑ دیا۔ مجھے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔

کار ایک محفوظ جگہ پر کھڑی کر کے میں اس پیلے بازار کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے نکلتا ہوا ایک بہت بڑی دکان پر جا پہنچا۔ وہ لوگ مجھے دیکھ کر پہلے تو بہت خوش ہوئے مگر جب میں نے انہیں بتایا کہ میں سونا بیچنا چاہتا ہوں تو وہ بدک گئے۔ بڑی مشکلوں سے میں نے انہیں یقین دلایا کہ انہیں ہرگز خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے جو مال میں ان کے پاس لایا ہوں وہ خالص کھرا اور اسی راستے سے آیا ہے جس راستے سے ان کے پاس پہلے مال پہنچتا رہا ہے ـــ کوئی ایک گھنٹے کی سر کھپائی کے بعد میں نے وہ سونا ان لوگوں کے پاس ستر لاکھ پچاس ہزار روپے میں بیچ دیا۔ لیکن اتنے روپے ان کے پاس دکان میں موجود نہیں تھے مگر سودا طے پا چکا تھا۔ ادائیگی کے لئے دکان کا مالک سیٹھ رمضان علی خود میرے ساتھ چل کر بینک گیا اور وہاں سے اس نے میرے نام پر میرے حساب میں اسی وقت رقم منتقل کر دی۔

میں نے محسوس کیا کہ ایک خاص بلندی پر پہنچ کر وہ لوگ بے ایمانی اور دغابازی میں ایک دوسرے سے دل کھول کر تعاون کرتے ہیں ـــ سیٹھ رمضان علی کو جب یقین ہو گیا کہ غلام جیلانی کسی جن بھوت کا یا کسی قصے کہانی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسے سمگلر کا نام ہے جو دھوکے سے خریدتا ہے اور جاندی بیچتا ہے تو وہ میرا دوست بن گیا میرے ساتھ وہ جب بینک میں گیا اور اس نے منیجر سے کہا کہ وہ میرے نام اس کے حساب میں سے پندرہ لاکھ پچاس ہزار روپے فلاں بینک میں منتقل کر دے تو منیجر نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کون ہوں اور کس طرح اتنی بڑی رقم کا حقدار بن گیا ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں پوچھا اس نے۔ بس چپ چاپ میرے نام اس نے روپیہ منتقل کر دیا۔

مگر مجھے یقین نہیں آتا تھا ـــ اپنی تسلی کے لئے میں نے اپنے بینک کے منیجر سے فون پر بات کی تو وہ بولا "فکر نہ کریں جیلانی صاحب! روپیہ یہاں پہنچ گیا ہے اور آپ کے حساب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ مگر حضرت یہ اتنی بڑی رقم کہاں سے مل گئی ہے آپ کو؟" بڑا معنی خیز سوال کیا تھا اس نے۔

"میرے بھائی صاحب نے انتظام کیا ہے اس کا ـــ وہ امریکہ سے اپنا کاروبار یہاں منتقل کر رہے ہیں۔" میں نے بمشکل اپنی جان چھڑائی۔ وہ بھی خاصا پریشان لگ رہا تھا کہ میں اتنی بڑی رقم کا خداوند کس طرح بن گیا ہوں؟

میں نے دو لاکھ روپیہ سیٹھ رمضان سے نقد لیا اور اپنی قدموں ملن کے پاس پہنچا ـــ اسے میں نے ایک لاکھ پچھتر ہزار روپے کے نوٹ دیئے تو وہ حیران رہ گئی "یہ میرا وعدہ تھا ماں مگر آسیہ نے انتظار ہی نہ کیا یہ اس کے لئے رکھ لو ماں۔ میں اسے تلاش کر کے لے آؤں پھر یہ روپیہ ہم تایا جان کو دے دیں گے۔" یہ کہہ کر میں نے باقی پچیس ہزار روپیہ اسی بریف کیس میں رکھا اور وہاں سے رخصت ہو کر سیدھا مال روڈ پر جا پہنچا۔ عالیہ کی کار مجھے دور دور تک لئے پھرتی رہی تھی۔

ایک جگہ سے میں نے اس میں پٹرول بھروایا اور پھر طے شدہ منصوبے کے تحت میں ایک اسلحے کی دکان میں جا گھسا۔ مجھے اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے اپنے دشمن کا سر کچلنے کے لئے بڑے موثر ہتھیاروں کی ضرورت تھی اور مجھے پتہ تھا کہ وہ انگریزوں کے دور کی قائم شدہ دکان میری تمام ضرورتیں پوری کر سکتی ہے۔

دکان کا مالک بہت ہی نرم گفتار، خوش لباس اور انسانوں کے ایمان کامل کی طرح صاف ستھری شخصیت کا حامل تھا۔ وہ دکان کے وسط میں دیوار کے ساتھ ایک بڑی سی خوبصورت میز کے سامنے بیٹھا تھا اپنے تینوں طرف اس نے شیشے کی دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں اس لمحے اس کی دکان میں کوئی گاہک موجود نہیں تھا۔ اور اس کا ملازم ادھر ادھر گھوم پھر کر گرد جھاڑ رہا تھا۔ بندوقوں پر سے اور الماریوں پر سے۔

"میرا نام علی فارانی ہے" میں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔

"جی بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" اس نے اپنا وہ صاف ستھرا گورا گورا سرد ہاتھ مصافحے کے لئے آگے بڑھایا۔

"میں کچھ اسلحہ خریدنا چاہتا ہوں۔ دو پستول، ایک سٹین گن اور گولیاں۔ پستول ایسے ہونے چاہئیں جن پر سائیلنسر لگے ہوں۔"

"جی آپ کو سب کچھ مل جائے گا جناب! بلجیم اور انگلینڈ کا مال ہے میرے پاس۔ لائسنس کس کس چیز کا ہے آپ کے پاس؟" وہ ایکدم خوش ہو گیا، بولا ـــ

"رشید صاحب ذرا فارانی صاحب کے لئے چائے تو لیتے آئیے عمدہ سی۔"

رشید اس کے نوکر کا نام تھا اور وہ اسے بھی بہت زیادہ عزت احترام سے مخاطب کرتا تھا۔

"نہیں، چائے کی ضرورت نہیں ہے جناب! کیا نام ہے آپ کا؟"

"میرا نام؟ خاکسار کو عبدالستار کہتے ہیں جناب!" وہ بولا۔

"ہاں تو جناب عبدالستار صاحب! بات یہ ہے کہ لائسنس میرے پاس نہیں ہے اور وقت بھی نہیں ہے مجھے فوراً یہ مال چاہئے۔ قیمت بتائیں کیا ہو گی؟ مال اپنے ملازم کے ذریعے منگوا کر یہاں رکھ دیں اور پیسے لے لیں ـــ ورنہ یہ دیکھیں..... میرا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا۔" میں نے پستول کی نال ہاتھ میں بڑھا کر اس کے چہرے سے لگا دی۔ میری آنکھوں میں اترے ہوئے خون کی پلکتی ہوئی لہر نے اس صاف ستھرے بے اصول پرست آدمی کو ایکدم دہشت زدہ کر دیا۔ میرا خیال ہے وہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ کسی نے اتنے بھرے پرے رواں دواں بازار میں اسے پستول دکھا کر بے بس کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ اسلحے کا سوداگر تھا مگر اس میں اسلحے کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس کی رنگت ہلدی ہو گئی ایسی زردی اس کے چہرے پر کھنڈ گئی کہ بایدو شاید۔ وہ مجھے ایک طفلک ایسی بے معنی شے معلوم ہوا۔

"نہیں نہیں۔ ہاں ـــ ہاں جناب، یہ پستول تو دور رکھیں۔ رشید صاحب!" وہ لرزتے ہوئے بولا۔ آواز اس کی خاصی بلند ہو گئی تھی۔ "یہ صاحب جو کچھ مانگتے ہیں انہیں دے دیں مگر جلدی کریں۔"

رشید نے اس کی لرزاں آواز سنی تو ٹھٹکا۔ تیزی سے لپکتا ہوا وہ میز کے پاس آ ٹھہرا۔ وہ شیشے کی دیوار سے باہر حیرت کا بت بنا کھڑا تھا کہ میں نے ایکدم پستول اس پر ظاہر کر دیا۔ نال اب کی بار میں نے عبدالستار کے چہرے سے ہٹا کر اس کی گردن پر لگا دی۔ حنظلی سے ذرا اوپر۔ اس کی بھی حالت دگرگوں ہو گئی ـــ وہ بھی اس منظر کی تاب نہ لا سکا۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"خدا کے لئے ساب! مالک کو کچھ نہ کہیں میں آپ کو مال دیتا ہوں۔" وہ ہاتھ جوڑ رہا تھا۔

"تو جلدی کرو۔ دو پستول سائیلنسر والے، ایک سٹین گن اور چار سو گولیاں۔ جلدی کرو ـــ"

وہ آدمی ایک جھٹکے سے پیچھے مڑا۔ اس نے ایک لمبا سا ڈبہ لیا اور اس میں میرے سامنے اس نے ایک خوبصورت سی چمکتی ہوئی..... سٹین گن رکھی پھر پستول اس میں دھرے۔ اس کے بعد مجھے دکھا کر اس نے سائیلنسر بھی اس میں رکھے اور چار سو گولیاں بھی۔ ان تمام چیزوں کو میرے سامنے اس نے ڈبے میں بند کر کے اوپر ڈوری باندھ دی۔ اس عرصے میں میں نے عبدالستار کو پستول کی زد میں رکھا۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس عرصے میں کوئی گاہک بھی اندر نہیں آیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اگر کوئی گاہک وہاں آ جاتا تو میں کیا کرتا؟ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی عقل و خرد کی ساری سرحدیں عبور کر جاتا ہے اور ایسا ہی وہ لمحہ تھا جس میں سے گزر کر جب میں دوبارہ عالیہ کی کار میں بیٹھا تو میں اپنی ضرورت کے تمام اسلحہ سے پوری طرح لیس تھا۔

میرا خیال ہے کہ ان تینوں ہتھیاروں کی قیمت دس ہزار سے زیادہ نہ ہو گی مگر میں نے خوش ہو کر مالک کو پندرہ ہزار روپیہ دے دیا تاکہ اسے افسوس نہ ہو کہ کوئی گاہک اسے نقصان پہنچا گیا ہے۔

جب میں ان ہتھیاروں کو شہر سے باہر لے جا کر ایک ویرانے میں اچھی طرح آزما چکا تو ایک نئے عزم اور ایک نئے ولولے کے ساتھ میں شفا بار کلینک کی طرف چل دیا۔ مجھے اپنے ایک ایک زخم کا حساب لینا تھا۔ عالیہ سے، سوات خان سے، ڈاکٹر دمتن سے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اوہاں طریق کار کیا ہو گا؟ کچھ ایسا جنون طاری تھا میرے دل و دماغ پر کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اس عمارت کو ہی تباہ کر دیتا جس میں بہت سے ہی نہیں بے شمار لوگوں کے دشمن آباد تھے اور اپنے مکروہ کاروبار میں اتنے مگن تھے کہ انہیں کسی اصول کا احساس تک نہیں تھا۔

شفا بار کلینک کی یہ عمارت کچھ اس انداز سے بنی تھی کہ اس کے سامنے کے حصے میں ایک دروازہ تھا داخلے کے لئے۔ یہ دروازہ ایک بہت بڑے کھلے ہال میں کھلتا تھا۔ اس ہال سے آگے مہ جبینے بنے تھے دائیں طرف بھی اور بائیں طرف بھی۔ اور درمیان میں ایک غلام گردش تھی۔ اس میں سے گزرتا ہوا آدمی سیدھا چلا جائے تو عمارت کی دوسری طرف نکل جاتا تھا۔ وہاں بھی ایک بڑا سا دروازہ تھا جس کی دوسری طرف ویسا ہی ایک کار پورچ بنا تھا جیسا عمارت کے سامنے کی طرف تھا۔

عالیہ کی کار اس عمارت سے ذرا دور درختوں کے جھنڈ میں کھڑی کر کے میں نپے تلے قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ میں نے دس ہزار کے نوٹوں سے بھرا بریف کیس کار میں چھوڑ دیا اور پستول اوور کوٹ کی جیبوں میں ڈال لئے۔ گولیاں بھی جیبوں میں ہی تھیں۔ سٹین گن کی گولیاں الگ تھیں اور پستولوں کی الگ۔

سٹین گن میں نے اوور کوٹ کے اندر ڈال کر کندھے پر لٹکا لی تھی اور پھر میں نے کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ سر پہ ایک بڑی سی اونی ٹوپی پہن لی تھی۔ یہ ٹوپی میں نے اسی دن بازار سے خریدی تھی۔

اس تمام انتظام کے باوجود مجھے معلوم تھا کہ اگر کوئی میرا واقف کار مجھے مل جائے تو وہ مجھے فوراً پہچان لے گا لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا؟ اپنی صورت تو میں نہیں بدل سکتا تھا۔ انتقام کی آگ کے جو شعلے میرے دل میں بھڑک رہے تھے وہ مجھے اتنی مہلت ہی نہیں دیتے تھے کہ میں کوئی سوانگ رچا کر یا بھیس بدل کر ان کے دروازے پہ جا سکتا۔

میرے لئے وہ بہت قیمتی وقت تھا۔ مجھے ہر قیمت پر آسیہ کو ان کے چنگل سے چھڑانا تھا۔ میری عزت ان کی ٹھوکر میں تھی اور سوات خان کی بے غیرتی ٹھہر ٹھہر کر میرے ذہن کے پردے پر ابھرتی تھی۔ میں نے قسم کھا رکھی تھی کہ اس کا چلو بھر خون میں ضرور پیئوں گا۔

اور پھر جب میں اس عمارت کے دروازے پر پہنچا تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے دونوں پستول ہاتھ میں تھام لئے مگر اس طرح کہ وہ کمبل کے نیچے چھپے تھے۔ انتظام ان لوگوں نے یہ کر رکھا تھا کہ بظاہر وہ شفا بار کلینک میں گلے، ناک، کان اور آنکھوں کے امراض کا علاج کرتے تھے۔ بڑی شہرت تھی اس کلینک کی مگر وہ اتنا مہنگا سودا تھا کہ صرف بڑے بڑے لوگ ہی وہاں جا سکتے تھے۔

دو ہال انہوں نے ان امراض میں مبتلا مریضوں کے لئے وقف کر رکھے تھے۔ جبکہ عمارت کا پچھلا حصہ وہ اپنے خاص مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے۔ یہی وہ حصہ تھا جہاں وہ لوگوں کو ان کے گردوں سے محروم کرتے تھے۔

ان کے بڑے دروازے پر مسلح پہرے دار موجود رہتے تھے۔ یہ بات مجھے ریشما نے بتائی تھی مگر اس وقت وہاں کوئی پہرے دار مجھے نظر نہ آیا اور دروازے میں داخل ہو کر میں سنبھل سنبھل کر چلتا ہوا اس ہال میں جا گھسا جہاں آنکھوں کے مریض رکھے جاتے تھے۔ اس وقت ہال میں چھ مریض موجود تھے۔ وہ بڑے اطمینان سے بستروں پر لیٹے تھے۔ تین آدمیوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی تھیں اور تین ابھی علاج کے ابتدائی مراحل میں تھے۔ کمرے میں ایک میز رکھی تھی جس کے سامنے ایک نرس بیٹھی کاغذوں پر جھکی ہوئی تھی۔

ابھی میں اس ہال کے جنوبی دروازے سے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ پہلو کے دروازے سے ڈاکٹر دھمن تیزی سے اندر آیا۔ اس کے پیچھے دو آدمی اور بھی تھے۔ ایک نے چھوٹا سا ڈبہ اٹھا رکھا تھا جبکہ دوسرا آدمی ایک ٹرالی دھکیل رہا تھا۔ اس میں مریضوں کے لئے دوائیں رکھی تھیں۔

ڈاکٹر تیزی سے ایک مریض کے بستر کی طرف لپکا تو میں نے پاگلوں کی طرح آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ سے اس کے منہ پر ایک ایسا تھپڑ دیا کہ وہ لڑکھڑا کر دائیں طرف گر گیا۔ ایک آدمی نے اسے فوراً تھام لیا اس کی یہ حرکت دیکھ کر میں نے دونوں پستول اس پر تان لئے۔ اچانک ایک شعلہ سا میرے سامنے جھپٹا۔ جس آدمی نے ڈبہ اٹھا رکھا تھا، اس نے پہلو کی جیب سے پستول نکال کر مجھ پر گولی داغ دی تھی مگر بے آواز۔ اس نے بھی پستول پر سائلنسر لگا رکھا تھا۔ اس نے ایسی افراتفری میں گولی چلائی کہ میرے لپٹے ہوئے کمبل میں سے گزرتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی میں نے اسے تمام تر تیزی، عجلت اور ذہانت کی نعمتوں سے محروم کر دیا۔ دو گولیاں میرے پستول سے یکے بعد دیگرے نکلیں اور اس کے دل میں سے گزر گئیں۔ تیسری گولی میں نے اس کے ساتھی پر چلائی مگر وہ بدبخت پہلو بچا گیا اور گولی اس کے سینے کے بجائے بازو میں جا لگی۔ وہ چیختا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ میری گولیاں بھی بے آواز تھیں۔ عبدالستار نے اچھا مال دیا تھا۔

ڈاکٹر دھمن مجھ سے چار قدم دور تھا۔ اس نے یہ صورت حال دیکھی تو میرے اشارے کے مطابق ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔ نرس اپنی جگہ کھڑی کانپ رہی تھی ـــ اس کی میز پر انٹرکام بھی پڑا تھا اور ٹیلی فون بھی۔

"ڈاکٹر! اس عمارت میں جتنے لوگ موجود ہیں انہیں اس کمرے میں بلا۔ انٹرکام پر انہیں کہو کہ وہ فوراً یہاں آ جائیں۔" میں نے ڈاکٹر دھمن کو دھکا دے کر کرسی پر گراتے ہوئے کہا۔

"مگر کیوں؟ کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟" وہ بہت تپے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مجھے نہیں پہچانا تم نے۔" میں نے اس کے سامنے دیوار کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں! میں نہیں جانتا تم کون ہو؟"

"میرا نام غلام جیلانی ہے ڈاکٹر دھمن۔ وہی جس کا چند ہفتے پہلے تم نے گردہ نکال لیا تھا۔"

"مجھے نہیں معلوم تم کیا کہتے ہیں؟"

"مجھے بتاؤ ڈاکٹر وہ عالیہ کہاں ہے؟ تم اچھی طرح جانتے ہو میں کون ہوں۔ تمہارا وہ غنڈہ سوات خان میری بہن آسیہ کو اغوا کر چکا ہے مجھے بتاؤ میری بہن کہاں ہے؟ ورنہ میں تم سب کو قتل کر دوں گا۔"

"اوہ اب سمجھا۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ ہمارا واسطہ کیسے آدمی سے پڑا ہے۔" گھبراہٹ تھی اس کے لہجے میں۔

"ڈاکو نہیں تم ہو۔ تم بدترین جرم کے مرتکب ہوئے ہو۔ دولت لٹ جائے تو واپس مل سکتی ہے مگر...... کسی کا گردہ کاٹ لیا جائے تو دوبارہ نہیں جڑ سکتا۔ حرامزادے میں تم سے اپنے ایک ایک زخم کا بدلہ لوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے سر کے اوپر سے گولی چلا دی۔ جو اس کے بالوں کو جلاتی ہوئی گزر گئی۔ وہ خوف سے اچھل کر زمین پر جا گرا۔

"اٹھ جاؤ۔ ورنہ گولی سیدھی سینے میں اتار دوں گا۔" میں نے چیخ کر کہا۔

عین اس وقت دائیں طرف سے ایک تکیہ اڑتا ہوا آیا اور میرے ہاتھ سے ٹکرایا۔ وہ مجھے بے بس کر دینا چاہتے تھے۔ تکیہ ایک مریض نے پھینکا تھا مگر میں فوراً سنبھل گیا۔ دوسرا پستول میرے بائیں ہاتھ میں تھا میں نے اس کو سیدھا کر کے اس آدمی پر گولی چلا دی۔ نشانہ ٹھیک لگا۔ وہ آدمی دلدوز چیخ مار کر پلنگ پر گر گیا۔ گولی اس کے کندھے میں اتر گئی تھی۔

"سنا نہیں تم نے بلاؤ ان سب لوگوں کو جو اس عمارت میں موجود ہیں۔ انہیں انٹرکام پر کہو کہ وہ سب یہاں آ جائیں۔" میں نے ڈاکٹر دھمن کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

وہ فوراً انٹرکام پر بولا ـــ

"صبیحہ! فوراً سب کمروں میں موجود لوگوں سے کہو کہ وہ .... وڈ ہال میں آ جائیں فوراً ـــ" ڈاکٹر دھمن نے انٹرکام پر کسی نرس سے کہا۔

"عالیہ اور سوات خان سے بھی کہو کہ وہ ادھر آ جائیں ـــ" میں نے کہا۔

"وہ یہاں نہیں ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں؟" ڈاکٹر دھمن اپنی تمام تر قوتِ ارادی کو مجتمع کر کے بولا حالانکہ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

"جھوٹ مت بول ڈاکٹر! میں اپنی بہن آسیہ کو لینے آیا ہوں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی یہاں اگر تم نے میرا حکم نہ مانا تو اچھی طرح سوچ سمجھ کر بات کرو۔"

"میں قسم کھاتا ہوں کہ ان کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ مجھے تو یہی پتہ ہے کہ عالیہ کو تم نے اغوا کر لیا تھا۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔ مگر مجھ سے بچ نہ سکو گے۔ تم میں سے کوئی بھی مجھ سے بچ نہ سکے گا۔ اس حرامزادی صبیحہ سے پھر کہو کہ سب کو یہاں بلا لائے۔" میں نے پھر اسے حکم دیا۔

ڈاکٹر نے پھر صبیحہ سے انٹرکام پر بات کی تو اس نے بتایا کہ وہ سب سے کہہ چکی ہے۔

ابھی چار منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ وڈ ہال میں چھبیس آدمی اکٹھے ہو گئے۔ ان میں بارہ تو مریض تھے اور باقی ڈاکٹر دھمن کے ملازم۔ میں نے ان لوگوں کی آمد پر پستول کمبل کے نیچے چھپا لئے تھے تاکہ وہ بدک نہ جائیں۔ میں ان کی حرکات و سکنات کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ آخری چار آدمی جو اندر آئے وہ سوات خان کے کینڈے کے تھے۔ بڑے گٹھیلے ورزشی بدن تھے ان کے اور آنکھوں میں ویسی ہی دہشت ناک چمک تھی ان کی۔ جیسی مجھے سوات خان کی آنکھوں میں نظر آئی تھی۔

میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر دھمن کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی وہ صورتحال کو سمجھ گئے تھے۔ وہ ایکدم پلٹے۔ مگر میں نے انہیں مہلت نہیں دی۔ میرے دونوں پستولوں میں سے شعلے نکلے اور ان دونوں آدمیوں کو لڑھکا گئے۔ دروازہ ان کے آگے تڑپتے گرتے سسکتے وجود سے بھر گیا تھا۔

"ان کتوں کو اندر گھسیٹ کر دروازہ بند کر دو۔" میں نے اس لڑکی سے کہا جو ان کے ساتھ ہی اندر داخل ہوئی تھی۔ اسی کا نام صبیحہ تھا۔

ایک آدمی نے لرزتے ہوئے ان دونوں کو بڑی احتیاط سے کھینچ کر کمرے کے اندر ڈالا تو اس لڑکی نے چپ چاپ دروازہ بند کر دیا۔

"تم میں سے کوئی بھی آدمی حرکت نہیں کرے گا یہ میرا حکم ہے۔ ڈاکٹر دھمن کے غنڈوں نے میری بہن کو اغوا کر لیا ہے جب تک وہ واپس نہیں آتی میں تمہیں یہاں بند رکھوں گا۔ اگر کسی نے کوئی گڑبڑ کی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ میرا لہجہ بہت ہی یخ بستہ، خوفناک اور لرزہ خیز تھا ـــ ان لوگوں کی آنکھوں میں ابھرتی ہوئی خوف کی لہر کو میں آج تک فراموش نہیں کر سکا۔ ڈاکٹر دھمن کے دو آدمیوں کی لاشوں کو اپنے سامنے دیکھ کر اور میری وہ گمبھیر آواز سن کر وہ سُن ہو گئے تھے۔

"ڈاکٹر دھمن میری بات کا جواب نہیں دیا تم نے ـــ سوات خان اور عالیہ کو بھی بلاؤ۔" میں نے دھمن کو بالوں سے پکڑ کر پھر جھنجھوڑا۔ اس کا رنگ پھر پیلا پڑ گیا۔ بولا۔

"میں قسم کھاتا ہوں مجھے نہیں معلوم کہ وہ دونوں کہاں ہیں۔ میں نے تو پولیس میں یہ رپورٹ دے رکھی ہے کہ تم عالیہ کو اغوا کر کے لے گئے ہو اور اس کی کار بھی تم نے چرا لی ہے۔"

"بہت خوب: یعنی چوری بھی اور سینہ زوری بھی۔ مگر تمہارے یہ ہتھکنڈے کام نہیں دیں گے دھمن۔ اپنا یہ کوٹ اور یہ قمیص اتار دو۔" میں نے بائیں ہاتھ سے چاقو لہرا کر اسے للکارا۔

اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی۔ پہلے اس نے کوٹ اتارا۔ پھر سویٹر اور اس کے بعد قمیص اور بنیان۔ وہ اندر سے خاصا گورا چٹا آدمی تھا اور بہت صحت مند بھی۔ پتلون کی پیٹی کس کر بند کرتا ہوا وہ میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"تم نہیں بتاؤ گے کہ عالیہ کہاں ہے اور آسیہ کس کے پاس ہے؟" میں نے چاقو کی نوک اس کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔

وہ ایکدم پیچھے ہٹ گیا مگر میں نے اسے پھر جا لیا۔ اب وہ میز کے آخری کونے سے دو قدم پیچھے تھا۔

"بولتے کیوں نہیں ہو۔ بتاؤ آسیہ کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے مُردہ سی آواز میں کہا۔

میں نے چاقو کی نوک اس کے سینے پر دبا کر نیچے تک لکیر ڈال دی۔ ہلکی سی تیز دھار لکیر۔ اور اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر کی چیخ نکل گئی۔ لکیر پر یہاں سے وہاں تک خون ابھر آیا تھا۔ اس کی سفید جلد پر خون کی وہ لکیر بہت بھلی معلوم دیتی تھی ـــ

"بہت درد محسوس کرتے ہو مگر پتہ ہے تمہیں میرا درد کتنا گہرا ہے؟ تم نے مجھے میرے ایک گردے سے محروم کر دیا اب میری بہن بھی تم نے مجھ سے چھین لی ہے لیکن یاد رکھو اگر آسیہ کو کوئی نقصان پہنچا تو یہاں سے کوئی بھی زندہ بچ کر باہر نہیں جائے گا۔"

ڈاکٹر اپنے بدن پر خون کی دھار دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا تھا وہ رونے لگا۔ یہ موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں میں ابھر آئے۔ بولا۔

"میں قرآن کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان لوگوں کا مجھے کوئی علم نہیں ہے۔"

"تو پھر انہیں پیدا کرو۔ انہیں بلاؤ۔ ورنہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا دھمن۔" میں نے چاقو کی نوک سے ایک اور لکیر اس کے بازو پر کھینچ

رگ شاید زیادہ دب گئی تھی۔ وہاں سے خون زیادہ تیزی سے پھوٹ نکلا۔ ڈاکٹر تو چیخ اٹھا۔

"خدا کے لئے مجھ پر ظلم نہ کرو۔ میں بالکل بے گناہ ہوں۔"

"تو گنہگار کون ہے؟ میرا گردہ تم نے کتنے میں بیچا تھا ڈاکٹر؟ بتاؤ کتنے ریال ملے تھیں اس کے بدلے میں؟" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ لوہے کے فریم کی بڑی آرام دہ کرسی تھی جس کی سیٹ پر فوم لگا تھا۔

ڈاکٹر نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ سامنے کرسی پر بیٹھ کر اپنا خون پونچھنے لگا۔ وہ بہت نڈھال ہو گیا تھا۔

ابھی مجھے وہاں بیٹھے دو منٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ باہر غلام گردش میں بھاری بھرکم بوٹوں کی آواز ابھری۔ ان لوگوں نے پولیس کو بلا لیا تھا۔

ہال کا دروازہ اندر سے اس طرح بند تھا ۔۔۔ کہ اس کے دستے کو باہر سے گھمانے پر وہ کھل سکتا تھا اور وہی بات ہوئی۔ کسی نے دستہ گھما کر دروازہ ذرا سا کھولا تو میں نے ایک دم گولی چلا دی۔ دروازہ ایک دم بند ہو گیا۔

"خبردار! اگر کسی نے دروازہ کھولا تو گولی مار دوں گا۔"

"تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

کسی کی بھاری بھرکم آواز مجھے دروازے پر سنائی دی۔ کوئی پولیس افسر مجھ سے مخاطب تھا۔

"میرا نام غلام جیلانی ہے۔ میری بہن آسیہ کو ڈاکٹر رحمن کے غنڈوں نے اغوا کر لیا ہے۔ جب تک یہ میری بہن کو واپس نہیں کرتے میں انہیں اسی طرح باندھ رکھوں گا۔"

"قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر تم نے خود کو مجرم بنا لیا ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ ہمارے سپاہی تمہیں گولی مار دیں گے۔" وہ بڑی دھمکی آمیز آواز تھی۔ پولیس افسر خاصا تجربے کار تھا۔

"اور میری بہن آسیہ؟" میں نے اس کی بات پر زہر خند کیا۔ وہ مجھے کوئی ایسا ہی لاابالی قسم کا گھامڑ سمجھ رہا تھا۔

"ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے ساتھ جن لوگوں نے زیادتی کی ہے انہیں ہم بدترین سزا دلوائیں گے۔" پولیس افسر دروازے کے ساتھ ہٹ کر کھڑا تھا۔ میں نے ہال میں چاروں طرف نگاہ ڈالی ۔۔۔ وہاں تین روشن دان لگے تھے جو دوسرے کمروں میں کھلتے تھے۔ ان کے نیچے تین بڑی بڑی الماریاں تھیں جن میں شیشے لگے تھے۔

"مجھے ابھی اور اسی وقت آسیہ کی آزادی درکار ہے اس سے کم پر کوئی بات نہیں ہو سکتی۔" میں نے اس پولیس افسر سے کہا جس کی صورت میرے لئے ابھی تک پردے میں تھی۔ وہ یونہی باتوں میں اپنا اُلّو سیدھا کر لینا چاہتا تھا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے تم نے تین آدمی ہلاک کر دیئے ہیں؟" اس نے کہا۔

"ہاں اور شاید ان سب کو بھی میں ایک ایک کر کے قتل کر دوں گا۔ مجھے اپنی بہن کی عزت سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں ہے۔ میری اگلی گولی رحمن کے سینے میں اترے گی۔ صرف دو گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں تم لوگوں کو۔ تین بج رہے ہیں۔ پانچ بجے تک آسیہ یہاں ہونی چاہیے۔ ورنہ میں ان سب کو مار دوں گا۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لوگ کھڑکیوں اور روشن دانوں کے پیچھے بندوقیں تان کر کھڑے ہیں اور کسی بھی لمحے وہ مجھے قتل کر سکتے ہیں۔

میرے لئے حالات خاصے تباہ کن ہو چکے تھے۔ میں نے اتنے سارے لوگوں کو اس جگہ باندھ کر عقل مندی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ میری وہ چال میرے لئے بے حد نقصان دہ ثابت ہو چکی تھی مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا؟ وہ لوگ گولی مجھ پر نہیں چلا رہے تھے، صرف اس لئے کہ انہیں ڈر تھا کہ اگر ان کی طرف سے گولی چلی تو پانچ دس آدمیوں کو تو میں پلک جھپکتے میں بھون ڈالوں گا اور میرا پہلا شکار ڈاکٹر رحمن ہو گا۔ جو بالکل میرے سامنے میرے پستول کی زد میں تھا۔

مگر نہیں ۔۔۔ میرے دشمن مجھ سے کہیں زیادہ قوی ثابت ہوئے۔ انہیں گولی چلانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔

٭

وہ لوہے کی کرسی جس پر میں بیٹھا تھا میری تباہی کا سبب بن گئی۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے ذبح کیا جا رہا ہے۔ کرسی میں بجلی کی رَو آ گئی تھی اور وہ اتنی طاقت ور رَو تھی کہ میں ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں اچھل کر دُور جا پڑا۔ میرے ہتھیار میرے ہاتھ سے نکل گئے۔ اور میرا دماغ ماؤف ہو گیا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ بہت سے ہاتھ میرے بدن پر پڑے ہیں اور ۔۔۔۔ پھر مجھے کچھ بھی یاد نہ رہا۔ اگر میں کرسی سے الگ نہ ہو جاتا تو شاید اب یہ سب کچھ بتانے کے لئے زندہ نہ ہوتا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی ہسپتال کے کمرے میں پڑا تھا۔ اس طرح کہ میرے ایک ہاتھ میں ہتھکڑی لگی تھی۔ اور پولیس کے چار افراد میرے اردگرد بیٹھے تھے۔ میرا سارا بدن یوں شل ہو رہا تھا جیسے کسی نے توڑ مروڑ کر مجھے ادھ موا کر رکھا ہے۔

"سنا بھئی شہزادے جاگ پڑا ہے تو۔" ایک سپاہی نے مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر بڑے جوش سے کہا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"میں کہاں ہوں؟"

"بادشاہو تسیں خیر نال ہسپتال وچ او۔ تہاڈا علاج ہو رہیا اے۔ تسیں پاگل ہو گئے سو خیر نال۔" دوسرے سپاہی نے نہایت ہی تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔ وہ مجھ پر جھک آیا تھا۔ اور اب وہ میری نبض دیکھ رہا تھا۔ "نبض تے تہاڈی ٹھیک ٹھاک چل رئی اے۔ میں تے سمجھیا کہ بجلی دے

جھٹکے نال تہاڈا وی جھٹکا ہو گیا ہو سی۔"

"بکواس نہ کر اوئے ۔۔۔ مینوں کسے گنجر دی اولاد نظر آنا ایں ۔۔۔ بک بک کری جا رہیا ایں۔" میں نے اسے پنجابی میں ڈانٹ دیا۔

"زیادہ گرم سرد ہونے کی ضرورت نہیں ہے ہیرو صاحب! یہ ہسپتال ہے میو ہسپتال۔ آپ کا علاج ہو رہا ہے۔ یہاں سے ہم سیدھا آپ کو بڑے گھر لے چلیں گے وہاں سے جب آپ نکلیں گے نا، تو آپ کی گردن دو ہاتھ لمبی ہو چکی ہو گی۔ آپ نے تین آدمیوں کو قتل کر دیا ہے۔" دوسرے سپاہی نے بڑی سنجیدگی مگر دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

میں چپ ہو گیا۔ وہ مجھے پھر شکست دے چکے تھے۔ وہ ڈاکٹر رحمن اور اس کے ساتھی۔ کاش میں نے ڈاکٹر کو بھی قتل کر دیا ہوتا۔ ان سپاہیوں نے مجھے بتایا کہ اس لوہے کی کرسی میں پولیس کے سپاہیوں نے باہر سے بجلی کی رَو دوڑا دی تھی۔ دیوار میں پلاسٹک کی نالی لگی تھی جس میں سے بجلی کے تار گزرتے تھے۔ بس اسی نالی کے راستے انہوں نے مجھے ڈس لیا تھا۔

تین دن تک مسلسل میں زیر علاج رہا پھر چوتھے دن مجھے وہاں سے اٹھا کر انہوں نے جیل پہنچا دیا۔ وہ میرے خلاف قتل کا مقدمہ تیار کر چکے تھے۔ انہوں نے مجھ پر اور بھی کئی سنگین الزامات عائد کر دیئے تھے۔

میں نے کہا۔ ٹھیک ہے زندگی میری اگر ایسی ہی سستی ہے اور میرا مقدر ایسا ہی خراب ہے تو ضرور مقدمہ چلاؤ اور چڑھا دو مجھے پھانسی۔ میں اسی قابل ہوں۔ میں نہ بہن کی عزت بچا سکا تھا نہ اپنی جان۔ میں کچھ بھی تو نہ کر سکا تھا۔ میرا فائدہ ہی کیا ہے۔ میری ماں نے بھی یہی کہا تھا۔

"مجھے مر ہی جانا چاہیے۔"

میری مایوسی اور زندگی سے میرے ٹوٹتے ناتے کی کربناک کیفیت دیدنی تھی۔ میں بہت مہینوں تک جیل کی حوالات میں بند رہا۔ اور پھر خدا خدا کر کے مجھے ایک دن انہوں نے عدالت میں پیش کر دیا۔ مجھ پر جو کچھ بیتی تھی۔ وہ میں نے عدالت میں بے کم و کاست بیان کر دی مگر یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ وہ کسی طرح بھی یہ باور نہیں کرتے تھے کہ ڈاکٹر رحمن اور اس کی بیوی نے میرا گردہ نکال لیا ہے۔

دہائی ہے یارو! وہاں ڈاکٹر رحمن نے ثابت کر دیا کہ میں نے دراصل وہ عرصہ ایک سرکاری ہسپتال میں گزارا تھا گردے کے مریض کی حیثیت سے حالانکہ اس عرصے میں مجھے ان لوگوں نے شفا بار کلینک میں قید کر رکھا تھا۔ سرکاری ہسپتال کے رجسٹروں میں مجھے انہوں نے دو ماہ تک زیر علاج دکھایا تھا اور وہاں یہ بھی لکھا تھا کہ چونکہ مریض کا بایاں گردہ ناکارہ ہو چکا ہے اس لئے اسے نکال دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے یہی وجہ تھی کہ میرا گردہ آپریشن کے ذریعے میرے جسم سے نکال دیا گیا اور بس۔ اور ڈاکٹر رحمن اسی سرکاری ہسپتال کے ایک شعبے کا انچارج تھا۔

میں عدالت میں چیختا ہی رہ گیا۔ مگر میری ایک نہ سنی گئی۔ ڈاکٹر رحمن کے وکیل نے ثابت کر دیا کہ میں نے دہشت گردی پھیلا کر ایک معزز شہری کو ذلیل کیا پھر تین آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد جھوٹ بول کر اپنے گردے سے محرومی کا ناٹک رچا کر میں نے عدالت کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔

دس مہینے کے مختصر عرصے میں مجھے سیشن جج نے تین آدمیوں کے قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا سنا دی۔ میں بہت چیخا بہت چلایا کہ میری بہن آسیہ کو تو بازیاب کروا لے سرات خان اور اس کے ساتھی اغوا کر چکے ہیں اسی کی عزت بچانے کے لئے میں نے ان لوگوں کو شفا بار کلینک میں پکڑا تھا تم میری مدد کرو مگر میری آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

٭

حیرت کی بات یہ ہے کہ پولیس نے میری بہن آسیہ کے اغوا کے سلسلے میں جو کہانی عدالت میں پیش کی اس سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ میری بہن آوارہ و بدچلن تھی۔ اور جن لوگوں نے اسے اغوا کیا ہے وہ دراصل اس کے اپنے یار تھے۔ وہ اسے زبردستی اٹھا کر نہیں لے گئے ہیں بلکہ وہ ان کے ساتھ برضا و رغبت گئی ہے۔ اغوا کا ڈرامہ میری ماں نے لوگوں کے سامنے اپنی مظلومیت ظاہر کرنے کے لئے رچایا تھا۔

میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ ان لوگوں نے مجھے میری ماں کو اور میری بہن کو بدترین قسم کے جرائم پیشہ افراد ثابت کر دیا تھا۔

اور ۔۔۔۔ اور پھر ۔۔۔۔ مجھے پھانسی کی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا ہر شے مجھ سے چھین لی گئی۔ ایک سنگی فرش میرے نیچے تھا۔ ایک آہنی دروازہ میرے سامنے اور اوپر ایک چھت تھی جو نیچے نہیں آ سکتی تھی۔ کاش ایسا ہو سکتا۔ پڑھنے کے لئے انہوں نے مجھے کلام مجید دے دیا تاکہ میں موت کے اس قدر قریب ہو کر تو خدا کو یاد کر لوں۔ اب میرے اور میرے بھیانک انجام کے درمیان فاصلہ بہت ہی کم رہ گیا تھا۔

رہ رہ کر مجھے آسیہ یاد آتی تھی۔ وہ ایسے سنگدل لوگ تھے کہ انہوں نے ایک بار بھی میری درخواست پر غور نہیں کیا انہیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ مجھے اپنی بہن کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ ڈاکٹر رحمن کا وکیل بار بار یہی کہتا تھا کہ آسیہ کا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ اسے میں نے عدالت کو گمراہ کرنے کے لئے کہانی میں شامل کر لیا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ مجھے معلوم ہے کہ آسیہ کہاں ہے ۔۔۔ وہ ایسا ابلیس تھا کہ اس نے سفید جھوٹ کو سچ ثابت کر دکھایا اور میں سر پیٹ کر رہ گیا۔

پھانسی کی کوٹھڑی میں پڑے پڑے میرا دل بہت آزردہ ہوتا تو میں کلام مجید پڑھنے لگتا۔ اس سے بھی اگر سکون نہ ملتا تو میں رونے لگتا بے تحاشا آسیہ کو پکارنے لگتا۔ میری حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا میں پاگل ہو جاؤں گا۔ اذیت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ میرا پاگل ہو جانا بعید از قیاس نہ تھا اور میرا پہرے دار میری اس کیفیت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ بہت ہمدردی دکھاتا تھا وہ میرے غم پر مگر وہ

کیا کرسکتا تھا۔ پھانسی کی کوٹھڑی کی چابیاں تو عدالت کے پاس تھیں اور یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ میں نے تین آدمی قتل کر دیئے ہیں۔ مجھے بھی اس سے کوئی انکار نہیں تھا اس کے باوجود میں نے رحم کی درخواست کر رکھی تھی صدرِ مملکت سے کیونکہ یہی دستور تھا۔ مرتے دم تک آدمی آس نہیں چھوڑتا۔ یہی میرا حال تھا مجھے امید تھی کہ کسی نہ کسی طرح میں بچ جاؤں گا مگر کس طرح۔ اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

یہ نالہ و شیون، یہ فریاد و گریہ کی کیفیت میرے دل و دماغ پر پھانسی کی کوٹھڑی میں پہنچنے کے بعد بہت دن تک قائم رہی پھر نہ جانے کیا ہوا مجھے آپ ہی آپ سکون آنے لگا۔ میری بشاشت لوٹ آئی۔ شاید میں نے موت سے سمجھوتہ کر لیا تھا مگر نہیں مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ میں مر جاؤں گا اتنی جلدی زندگی کی سرحد سے کوئی شے اٹھا کر مجھے باہر پھینک دے گی۔ یہ بات میرا دل قبول ہی نہ کرتا تھا۔ میں نے رحم کی درخواست دے دی تھی اور دن تیزی سے گزرتے جا رہے تھے۔

ہر روز مجھے پیغام ملتا تھا کہ میری ماں مجھے ملنے آئی ہے جب سے میں جیل میں بند ہوا تھا جب سے اس نے اپنا گھر چھوڑ کر جیل کے قریب اپنی ایک دور کی رشتے دار کے پاس رہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر روز کوئی نہ کوئی شے میرے لئے ضرور بھیجتی تھی مگر میں اسے مل نہیں سکتا تھا۔ اسے دیکھ سکتا تھا وہ صبح ہی صبح گھر سے نکل کر جیل کے دروازے کے قریب ملاقاتیوں کی کھڑکی کے سامنے آ بیٹھتی تھی۔ وہ بہت منت سماجت کرتی تھی سپاہیوں کی کہ وہ کسی طرح اسے اس کے جیلانی سے ملوا دیں مگر وہاں اس کی فریاد کون سنتا تھا۔ کس میں اتنی ہمت تھی کہ وہ جیل کے قانون کو بالائے طاق رکھ کر اس اکیلی ماں ممتا کی ماری بوڑھی عورت کو مجھ سے ملوا سکتا۔ وہ بیچاری ہر روز شام تک وہاں بیٹھی رہتی اور پھر تھک ہار کر مایوسی کی سیاہ چادر میں لپٹ کر واپس چلی جاتی۔ رات کی طویل اداس اور تاریک ساعتوں میں وہ پھر اپنی بکھری ہوئی ہمت کو یکجا کرتی۔ امید کے نئے چراغ جلاتی اور دوسری صبح وہ پھر میرے بندی خانے کے دروازے پر آ بیٹھتی۔

یہ اس کا معمول ہو گیا تھا۔ وہ دیواریں اسے عزیز ہو گئی تھیں جن کے پیچھے اس کا بیٹا زندگی کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ مگر مجھے بچا لینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ تو دعا ہی کر سکتی تھی۔ سو وہ دن رات اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک اپنے خالق سے مانگتی رہتی تھی۔ اور پھر ایک رات میرے پروردگار کو مجھ پر رحم آ ہی گیا۔ میری ماں کی دعائیں قبول ہو گئی تھیں۔ وہ فروری کی ایک یخ بستہ رات تھی ——— میری رحم کی اپیل مسترد ہو چکی تھی اور وہ لوگ مجھے کسی بھی دن زندگی کے بوجھ سے آزاد کر سکتے تھے میں اس رات بھی نہیں سو سکا تھا نیند انہیں کہاں آتی ہے جن کے دروازوں پر موت رقص کناں ہو۔ وہ بھلا کہاں سو سکتے ہیں؟ میرے ذہن میں اس گھڑی بھی اپنی مظلوم و بے بس بہن آسیہ کا آنسوؤں سے تر چہرا ابھر رہا تھا۔ اور اپنی بے بسی پر مجھے اس لمحے بھی سخت طیش آ رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنی کوٹھڑی کے قریب ہی آوازوں کا زبردست شور سنائی دیا۔ بہت سے لوگ پھانسی کی کوٹھڑیوں کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ پہرے دار ایک دم چوکنے ہو گئے میرے دروازے پر جو سپاہی تھا اس نے رائفل سنبھالی اور میرے دروازے کے ساتھ لگ کر سامنے کے ہجوم پر گولی چلانے لگا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ باہر آوازوں کا شور بڑھ رہا تھا۔ میں ڈرا کہ یہ بدحواس آدمی کسی بدنصیب کو گولی ہی نہ مار دے۔ میں اس کے تیور دیکھ کر لرز گیا تھا۔

کسی کی زندگی کو اس کی اندھی فرض شناسی سے بچانے کے لئے میں نے آگے بڑھ کر بڑی احتیاط سے اپنا ہاتھ جنگلے سے باہر نکالا اور دونوں ہی اس کی گردن کی رگ احساس مسل ڈالی ———

وہ بے ہوش ہو کر نیچے جھول گیا اور رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ میں نے فوراً ہی رائفل اٹھا کر کوٹھڑی میں رکھی اور پھر اس کے گلے سے گولیوں کی پیٹی بھی اتار لی۔ شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ قیدیوں نے جیل کے عملے پر حملہ کر دیا ہے اور پھر ایک دم کئی گولیاں چلیں۔ زبردست چیخ و پکار پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی تیس چالیس آدمی ہماری کوٹھڑیوں تک آ پہنچے۔

"نکالو! ان بدنصیبوں کو نکالو یہاں سے۔" کوئی چیخا۔

"تالے توڑ دو۔" کسی اور نے کہا اور پھر کئی آدمی پاگلوں کی طرح ان کوٹھڑیوں کے تالوں پر پل پڑے۔ ان کے ہاتھوں میں اینٹیں تھیں لوہے کی سلاخیں تھیں ڈنڈے تھے۔ وہ بہت خونخوار نظر آتے تھے ابھی میں سے دو آدمیوں نے میری کوٹھڑی کا تالا لوہے کی سلاخ ڈال کر توڑ دیا۔

"نکل آ باہر میرے یار۔ بچا اپنی جان ان قصائیوں سے، بھاگ جا۔" ایک آدمی نے کوٹھڑی کا وہ بے رحم جنگلا کھولتے ہوئے کہا۔ میں نے کلام مجید اٹھایا کمبل سنبھالا بندوق ہاتھ میں لی اور ——— تیزی سے باہر نکل گیا۔ بے ہوش سپاہی کی گولیاں بھی میرے پاس تھیں۔

جیل کے کئی حصوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ قیدیوں نے اپنی زنجیریں توڑ ڈالی تھیں۔ یہ بہت بڑا موقع تھا میرے لئے زندگی کو بچانے کا۔ میں مشرقی دیوار کی طرف بڑھا ——— ادھر کچھ قیدیوں نے دیوار میں سوراخ کر دیا تھا اور لوگ دھڑا دھڑ اس میں سے گزر کر باہر جا رہے تھے۔ میں بھی انہی میں جا گھسا اور پھر چند ہی لمحوں بعد میں بدنصیبی کے ان ویران جزیروں سے باہر نکل چکا تھا۔

میرے ارد گرد اس گھڑی پچاس کے قریب قیدی تھے اور ہم سب نو آزاد وحشیوں کی طرح بھاگتے جا رہے تھے۔ کہ اچانک سامنے سے اور پیچھے سے کئی گاڑیاں ہماری طرف لپکیں۔

"رک جاؤ ورنہ گولی مار دی جائے گی۔" ایک خوفناک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ کوئی پولیس افسر بھاگتے قیدیوں کو رک جانے کا حکم دے رہا

تھا مگر ہم نہیں رکے اور اس کے ساتھ ہی کوئی دس سیکنڈ بعد گولیوں کی بوچھاڑ نے ہمیں آ لیا۔ وہ ایک دو نہیں درجنوں گولیاں تھیں میرے ارد گرد کئی آدمی چیختے چلاتے ادھر ادھر لڑھک گئے مگر میں بھاگتا رہا اور میں شرک سے اتر کر مغربی سمت میں اگی سبزی کے کھیت میں جا گھسا اس سے ذرا آگے ایک باغ تھا۔ تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں بہت دور نکل گیا میرے تمام ساتھی پیچھے رہ گئے تھے ——— زندگی مجھے بچا کر اس عقوبت خانے سے نکال لائی تھی اب میں کہیں بھی جا سکتا تھا کسی بھی طرف بڑھ سکتا تھا مگر حالت میری یہ تھی کہ میں ساری عمر کے لئے شہروں سے بستیوں سے اپنوں سے بیگانوں سے زندگی کے ہنگاموں سے دلآویز صبحوں سے اور سرمئی روح پرور شاموں کی لذتوں سے محروم ہو گیا تھا کیونکہ میں ایک مفرور قیدی تھا ایسا قیدی جس کو پھانسی کی سزا سنائی جا چکی تھی۔ اور جس کی گردن سے پھانسی کا پھندا بس دو چار ہاتھ ہی دور رہ گیا تھا میری آزادیاں سلب ہو چکی تھیں اور اب مجھے ایک نئے آدمی کی حیثیت سے زندگی بسر کرنی تھی مگر کس طرح اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

میں چلتا رہا، چلتا ہی رہا۔ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارتا میں کھیت کھلیان عبور کرتا ہوا بہت دور جا نکلا اور...... اور پھر وہ وقت بھی آ پہنچا جب آدمی سفید دھاگے سے کالے دھاگے کو تمیز کر سکتا ہے۔

اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے میں کسی قبرستان میں جا پہنچا ہوں خراب و خستہ قبروں پر میرے پاؤں پڑ رہے تھے۔ میں رک گیا وہ لوگ جو پہلے ہی اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے مجھے اپنے ارد گرد سرگوشیاں کرتے سنائی دیئے۔

ابھی میں گرد و پیش کو سمجھ ہی رہا تھا کہ مجھے ایسا منظر دکھائی دیا، جسے پہلی نظر میں میں اپنی قوت متخیلہ کا کرشمہ سمجھا۔ میں نے بھوتوں کو قبروں میں اترتے تو دیکھا تھا مگر جو منظر میں دیکھ رہا تھا وہ اس سے بالکل مختلف اور لرزہ خیز تھا۔

میرے سامنے کوئی دس قدم دور ایک آدمی کھلی قبر میں سے ایک میت کو اوپر لا رہا تھا۔ میں تو سُن ہو کر رہ گیا سفید کفن میں لپٹی ہوئی میت کو قبر سے نکال کر اس آدمی نے ایک صاف جگہ پر لٹا دیا۔ اور......

"تمہاری جوانمردی پر میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں جوان! مجھے

ہو حوصلے والے آدمی ہو تم۔" میں نے ایک دم اس کے پاس جا کر کہا۔ وہ چونک کر یوں پیچھے ہٹا جیسے اسے گولی لگ گئی ہے۔ اس کے چہرے پر پیلاہٹ پھیل گئی تھی پیشانی، رخساروں اور ہاتھوں پر برص کے داغ تھے۔

اس کا منہ یوں کھلا تھا جیسے اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے رائفل کا رخ میں نے اس کی طرف کر رکھا تھا۔ اس کے بال بری طرح الجھے ہوئے تھے اور لمبے تہمد اور کرتے میں وہ مجھے کوئی اودھ بلاؤ نظر آتا تھا اس کی آنکھیں پاگلوں کی طرح مجھ پر جمی تھیں۔

"تم بولتے کیوں نہیں؟ کون ہے یہ بدنصیب جس کو تم مرنے کے بعد بھی ذلیل کر رہے ہو؟"

وہ پھر بھی چپ رہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"بولتے کیوں نہیں ہو؟ چاہتے ہو کہ میں تمہیں گولی مار دوں۔ کون ہو تم؟"

"جی وہ...... مجھ سے غلطی ہو گئی ہے جناب!" اس نے ایک دم میرے قدموں میں سر رکھ دیا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے بدبخت! تو مجھے یہ بتا کہ آخر قصہ کیا ہے؟" میں نے اسے زمین پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ بال اس کے میرے بائیں ہاتھ کی گرفت میں تھے۔

"مجھے نہیں معلوم جناب۔ کہ مجھے کیا ہو جاتا ہے مجھے کوئی شے اندر کریدتی ہے جب کوئی عورت یہاں دفن ہوتی ہے تو اس رات مجھے نیند نہیں آتی اور...... اور پھر میں جب تک اس کو قبر سے نکال نہ لوں مجھے چین نہیں آتا۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ وہ بہت زیادہ پشیمان نظر آتا تھا۔ اس کا وہ کھدر کا کرتہ اور تہمد مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ قبر کھودنے میں اس نے زبردست محنت کی تھی۔

"اچھا اب اس قبر کو بند تو کر دو۔ اس کی ذلت کو تو ڈھانپ دو پھر میں بات کروں گا تم سے۔" میں نے ایک طرف ایک ڈھیری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ صبح کی روشنی دم بدم پھیلتی جا رہی تھی۔

وہ آدمی تیزی سے آگے بڑھا قبر پر لکڑی کے تختے اس نے بڑی مہارت سے چنے اور پھر بیلچے سے وہ پوری تندہی سے ان پر مٹی ڈالنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے قبر پھر سے بند کر دی اور اس پر عام قبروں ایسی ڈھیری بھی بنا دی لگتا تھا اسے اپنے اس کام میں خاصی مہارت حاصل تھی۔

جب وہ فارغ ہوا تو اس کی پیشانی سے پسینے کی دھار بہہ رہی تھی اتنی سخت مشقت نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

"چلو اب کہیں چل کر منہ ہاتھ دھو لو۔ چلو، مردوں سے بیت کرتے ہو، مر جاؤ گے بدبخت۔ مجھے تمہاری حالت پر ترس آتا ہے۔"

وہ عجیب کھسیانے انداز سے مسکرایا اور بولا۔

"خدا تو کبھی مجھے معاف نہیں کرے گا مگر آپ مجھے معاف کر دیں۔ آپ نے میرا ایسا جرم دیکھا ہے جس پر میں خود بہت شرمندہ ہوں۔"

اس کا لب و لہجہ عام دیہاتیوں ایسا نہیں تھا ــــ "میں تمہیں کیوں معاف کروں؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ وہ میرے پہلو بہ پہلو چل رہا تھا۔ بولا ــــ

"کیونکہ آپ بھی انسان ہیں آپ نے بھی کوئی نہ کوئی ایسی غلطی کی ہوگی جس پر آپ خود شرمندہ ہوں گے۔"

"بہت چالاک معلوم ہوتے ہو۔ یہ بتاؤ یہ قبرستان کس بستی کے مُردوں کا گھر ہے؟"

"آپ نہیں جانتے؟ حیرت ہے۔ یہ کمال پور کا قبرستان ہے۔" روشنی اور زیادہ واضح ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے اب اور زیادہ غور سے دیکھا، تو ٹھٹھر گیا۔ بولا۔

"یہ ..... یہ تو قیدیوں کے کپڑے ہیں جو آپ نے پہن رکھے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں اچانک پُراسرار قسم کی چمک ابھری۔

"ہاں! میں یہی کپڑے پسند کرتا ہوں۔ میں بھی تو قیدی ہوں ــــ زندگی کا قیدی۔ اپنی جان کا اسیر۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ میرا خیال تھا کہ میں اس کا اعتماد جیت چکا ہوں۔ دل میرا اس خوف سے لرز گیا تھا کہ میرا بھید اس پر ظاہر ہو گیا ہے۔

"آپ جیل سے بھاگے ہیں؟ خیر کوئی بات نہیں فکر نہ کریں، میں کم ظرف آدمی نہیں ہوں۔"

"کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

"میں لوگوں کے عیب چھپا لیا کرتا ہوں۔ خدا تو نہیں ہوں مگر خدا کی یہ صفت میرے اندر موجود ہے۔"

"بکواس نہ کرو اُلّو کے ـــــ تو کسی کے عیب پر کیا پردہ ڈال سکتا ہے تیرا تو اپنا وجود ہی زمین کے لئے باعثِ شرم ہے۔ پتہ نہیں میں تیرے ساتھ کیوں نرمی برت رہا ہوں؟" میں نے بندوق کا رُخ پھر اس کی طرف کر دیا۔ اس کی مسکراہٹ پر مجھے طیش آ گیا تھا۔

مجھے وہ شخص مجسّم شیطان نظر آتا تھا اور ..... اب ..... وہ اُلٹا میرے عیب کے حوالے سے مجھ پر حاوی ہونا چاہتا تھا۔

"ناراض نہ ہوں جناب! آدمی آدمی کا دارو ہوتا ہے۔ آپ کو پناہ کی ضرورت ہے اور مجھے پڑے گی! اپنے عیب پر پردہ ڈالنے کے لئے مجھے پردہ چاہئے وہ آپ مجھے فراہم کریں، میں آپ کو پناہ فراہم کر دوں گا۔" وہ اب کی بار اور زیادہ اعتماد سے بولا۔ ہم پانی کے ایک چھوٹے سے ندی نالے پر پہنچ گئے تھے ــــ وہ بڑی بےتابی سے اپنا منہ دھونے لگا۔ صبح کی روشنی اب چاروں طرف پھیل چکی تھی اور اِدھر اُدھر کھیتوں میں دُور دُور تک زندگی حرکت میں آ رہی تھی۔

"تیرا نام کیا ہے جوان؟"

"میرا نام صادق ہے، صادق علی۔ میں اُدھر دھیال کے پرائمری سکول میں پڑھاتا ہوں۔"

اس نے مجھے حیران کر دیا۔

"کیا؟ کیا کہا تم نے؟ تم سکول ماسٹر ہو؟"

"جی ہاں۔ آپ کو حیرت ہوئی؟"

"ایسے حیرت کی بات ہی ہے، تو بچوں کے مستقبل کا امین، ایک سکول ماسٹر اور یہ حرکت؟"

"اگر آپ اسی طرح حیران ہوتے رہے تو مجھے ڈر ہے کہ آپ مجنوں ہو جائیں گے۔ مجھے دیکھیں کیا خیال ہے کتنی عمر ہوگی میری؟" اس کی خود اعتمادی لوٹ آئی تھی اور میرا رُعب اس پر قائم نہیں رہا تھا۔

"تیری عمر؟ میرا خیال ہے تیری عمر یہی کوئی تیس سال ہوگی۔"

وہ ہنسا۔ ایک دم کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"کیوں؟ ہنستے کیوں ہو؟"

"ہنسنے کی بات ہی ہے جناب! میری عمر اس وقت اکسٹھ سال

اس نے مجھے حیران کر دیا۔

"کیا؟ کیا کہا تم نے اکسٹھ سال؟ ایسے ڈرامہ کر رہے ہو میرے ساتھ گاماسٹر کہیں کے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ دل لگی کر رہا ہے۔

"خدا کی قسم یہ ڈرامہ نہیں ہے۔ میری عمر اکسٹھ سال ہے اور ابھی میں اتنے ہی سال اور جیوں گا اور اچھی صحت کے ساتھ۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی قمیص اتار کر جھاڑی پھر اس نے تہبند بھی اتار دیا۔ اس میں بھی خاصی گرد جمع تھی۔ نیچے وہ جانگیہ پہنے ہوئے تھا۔ اب وہ میرے سامنے اپنے پورے گرانڈیل قد سے کھڑا اپنے دونوں کپڑے جھاڑ رہا تھا اور میں حیران تھا کہ اس کا بدن کس طرح اتنا گٹھا ہوا اور متناسب ہے کس طرح اس نے اپنا جسم اتنا توانا اور متناسب کر رکھا ہے اتنی ساری عمر کا ذرا سا بھی تو اثر اس کے جسم پر ظاہر نہیں ہوا تھا۔ اس کا ایک بھی بال سفید نہیں تھا۔

گرد جھاڑ کر اس نے کپڑے دوبارہ پہن لئے۔ اب وہ پہلے سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ وہ جو میری وجہ سے اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا وہ کیفیت اب اس کے وجود سے زائل ہو گئی تھی مگر چیچک کے داغوں نے اسے بہت مکروہ صورت بنا رکھا تھا البتہ باتوں میں وہ بہت تیز تھا بولا ــــ

"یہ کپڑے آپ کے لئے مصیبت بن سکتے ہیں میرے گھر چلیں وہاں کپڑے تبدیل کر کے ان کو جلا دیں۔ کھانا وغیرہ کھائیں اور آرام کریں۔ میں انسان ہوں مجھ پر بھروسہ رکھیں آپ۔ کیا نام ہے آپ کا؟"

"میرا نام غلام جیلانی ہے اور یہ میرا اصلی نام ہے یہ مت سمجھنا کہ جھوٹ بول رہا ہوں۔"

میں اس سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ وہ میرے لئے زندگی کی سب سے بڑی حیرت کا مظہر تھا اس جیسا اچھا اور اس جیسا بُرا آدمی میں نے اس

سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اچانک آسمان پر آخیر سرما کی کلفتوں کی ماری مرغابیوں کی ایک ڈار نمودار ہوئی۔ صادق علی نے وہ ڈار دیکھی تو بولا۔

"آپ کو مرغابی کیوں نہ کھلاؤں آج۔ لائیں ذرا یہ بندوق دیں مجھے۔" یہ کہہ کر اس نے یونہی بے تکلفی میں مجھ سے بندوق لے لی۔

"ابے یہ تو مرغابی کے پرخچے اڑا دے گی یہ گولی۔" میں نے اسے روکتے ہوئے کہا مگر وہ شست باندھ چکا تھا بولا۔

"صرف گردن میں سے گولی گزاروں گا۔"

اور اس کے ساتھ ہی اس نے لبلبی دبا دی۔ ڈار تتر بتر ہو گئی۔ ذرا دیر کے لئے اس کی قطار میں افراتفری مچی اور ایک مرغابی نیچے آ رہی۔ رائفل مجھے دے کر صادق علی تیزی سے مرغابی کی طرف بڑھا اور جب وہ واپس میرے پاس آیا تو میں حیران رہ گیا۔ پرندے کی صرف گردن غائب تھی۔ ایسا بلا کا نشانے باز آدمی تھا وہ صادق علی۔

"لائیں، ایک اور گراتا ہوں۔ وہ دیکھیں ایک اور ڈار آ رہی ہے۔"

اس نے مجھ سے رائفل جھپٹ لی۔ میں نے اسے گولی بھی فراہم کر دی اس نے فوراً ہی بڑے ماہرانہ انداز میں رائفل لوڈ کی اور پھر شست باندھ کر گولی چلا دی۔ ایک اور مرغابی اس نے پھڑکا لی تھی۔ حیرت انگیز آدمی تھا وہ ــــ

"چلیں اب میں آپ کے شایانِ شان کھانا تیار کر سکوں گا۔"

سورج ابھی نہیں نکلا تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کمال پور جا پہنچا۔ اس کا گھر گاؤں سے باہر ہی تھا۔ ایک بڑے سے پیپل کے درخت سے ذرا آگے پرنبی سی ایک دیوار تھی جس کے عین بیچ میں ایک چھوٹی سی چار فٹ اونچی کھڑکی لگی تھی۔ اس کے سامنے پہنچ کر صادق علی نے دو بار دستک دی تو کچھ ہی دیر بعد وہ کھڑکی کھل گئی۔ کنڈی کھول کر کوئی تیزی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ مکان کا بڑا دروازہ دوسری سمت تھا۔

"آیئے۔ بے تکلف آ جایئے۔" صادق علی جھک کر اندر داخل ہوا تو میں بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ سامنے یہ بڑا سا صحن تھا۔ کچا صحن جس کے عین وسط میں پختہ اینٹوں کی ایک روش بنی تھی۔ دائیں ہاتھ گھاس کا ایک چھوٹا سا قطعہ تھا جس کے اردگرد پھولوں کی کیاری تھی اور گھاس کے اس قطعے سے ذرا پرے دیوار کے ساتھ اونچے اونچے سرو کے سات درخت کھڑے تھے اور بڑی بہار دے رہے تھے۔ مجھے وہ جگہ ایک دم بہت پسند آئی۔ بائیں ہاتھ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ تھا۔ جس کی چھوٹی سی کھڑکی میں سے ایک چہرہ دمکتے سورج کی طرح چمکتا نظر آتا تھا۔ وہ کوئی نوخیز لڑکی تھی۔ "صادق علی کی بیٹی ہوگی یہ۔" میں نے سوچا۔

"ارے بھئی ـــ زینو! آج تو عید ہو گئی ہماری، مہمان بھی ہے اور مرغابی بھی بھون دے ذرا اس کو مزیدار کر کے۔"

صادق علی نے اس لڑکی کے قریب جا کر کھڑکی میں سے مرغابیاں اسے تھما دیں۔ وہ لڑکی بجھے بجھے انداز میں مسکرائی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ سارے جہاں سے زیادہ معصوم اور سادہ طبع لڑکی ہے ایسی لڑکی جو گناہ کے تصور سے بھی ناآشنا ہے۔ وہ اداسی کی دبیز تہہ میں دبی نظر آتی تھی لگتا تھا وہ وہاں خوش نہیں ہے۔

صادق علی مجھے کمرے میں لے گیا اور بولا۔

"پتہ نہیں آپ زندگی کے کس معیار کے عادی ہیں۔ قیدیوں کے لباس میں تو کسی کا پتہ نہیں چلتا آدمی بس یونہی سا نظر آتا ہے آپ یہ کپڑے اتار دیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک کرسی میرے آگے کر دی اور خود دوسرے کمرے میں جا گھسا۔ پرانے طرز کی کرسی تھی وہ۔ میں اس پر بیٹھا تو پتہ چلا کہ لکڑی کی نشست پر رُوئی کی گدی رکھی ہے کمرے میں ایک بڑا سا نواڑی پلنگ پڑا تھا جس پر پھولدار چادر بچھی تھی۔ وہ ایک عام سے دیہاتی آدمی کا گھر نظر آتا تھا جس میں آسائش کی کسی جدید شے کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔

کوئی پانچ منٹ بعد صادق علی واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں میرے لئے نیا لباس تھا۔ ایک کُرتہ اور ایک شلوار، دونوں ہی سلیٹی رنگ کے تھے اور میرا خیال ہے کہ وہ خاصے عمدہ لٹھے کے بنے تھے۔

"لیں جناب جیلانی صاحب! یہ پہن لیں بالکل پاک صاف کپڑے ہیں۔ میں نے اپنے لئے سلوائے تھے مگر ابھی پہنے بھی نہیں تھے کہ آپ آ گئے۔"

اس کے لہجے کی کھنک مجھے حیران کرتی تھی۔ تعجب خیز امر یہ تھا کہ وہ شیطان بھول ہی گیا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے میں نے بدترین جرم کا ارتکاب کرتے دیکھا تھا۔ وہ میرے سامنے کھڑا یوں مسکرا رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کی مسکراہٹ کے پیچھے اس کے صاف شفاف ہموار خوبصورت دانت قطعاً یہ نہیں بتاتے تھے کہ وہ اکسٹھ سال کا ہے۔ میں نے اس سے وہ کپڑے لئے تو وہ بولا۔

"پہن لیں میرے سامنے ہی پہن لیں۔ کمبل اپنے گرد لپیٹ کر..... زینو نے ازار بند ڈال دیا ہے شلوار میں۔"

"یہ زینو کون ہے میاں؟" میں نے کمبل اپنے گرد لپیٹ کر شلوار پہنتے ہوئے کہا ــــ

اس نے ذرا دیر کے لئے اپنی ایک آنکھ میچ لی پھر بڑے بھیدوں بھرے لہجے میں بولا۔

"یہ ..... یہ ارے یہ میری بیوی ہے بھئی جیلانی صاحب کمال کرتے ہیں آپ بھی۔"

"اتنی جوان اور کم عمر بیوی ہے تمہاری؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"پھر وہی حیرانی! ارے اس طرح تو آپ بہت جلد بوڑھے ہو جائیں گے صاحب! پتہ ہے اس کی عمر کتنی ہے؟"

"کتنی ہے؟ تم ہی بتا دو۔"

"چلیں دفع کریں۔ عورتوں کی عمر نہ تو پوچھنی چاہئے اور نہ ہی بتانی چاہئے۔ ویسے وہ جوان ہے "سورج کی پہلی کرن سے بھی زیادہ جوان اور تازہ دم اور دلکش بھی" صادق علی نے نہایت فراخ دلی سے کہا — اس پر خدا کی لعنت ہو۔ وہ قدم قدم پر میرے پاؤں تلے سے زمین نکالتا جا رہا تھا۔

میں نے اس کے دیئے ہوئے کپڑے پہن لئے تو وہ بولا: "لاؤ اس مصیبت کو میں یہیں جلا دیتا ہوں تمہارے سامنے۔ زینو کو میں نہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میرے مہمان کہاں سے آئے ہیں" یہ کہہ کر اس نے جیب سے ماچس کی ڈبیہ نکالی اس کے ساتھ ہی سگریٹ کا پیکٹ بھی باہر آ گیا۔ وہ بگلے کے سگریٹ تھے۔

میری آنکھوں میں سگریٹ کی اشتہا کو لپکتے دیکھ کر وہ بولا۔

"ارے تو کہئے نا کہ آپ کو سگریٹ کی طلب ہے۔ یہ لیں پئیں۔۔۔ میں تھوڑی دیر تک آپ کو اچھے سگریٹ لا دوں گا۔ ابھی یہی پی لیں" یہ کہہ کر اس نے ایک سگریٹ میرے منہ سے لگا دیا۔ میں نے کش لیا تو بڑی فرحت محسوس ہوئی لگتا تھا زندگی ابھی اس قابل ہے کہ اس کو شوق سے گزارا جائے۔ اس کی شاخوں پر کھلے سارے پھولوں کی خوشبو بدن میں اتاری جائے اور اس کے دکھائے ہوئے سارے خوابوں کی عملی تعبیریں تلاش کی جائیں۔ کبھی کبھی آدمی کتنی چھوٹی چھوٹی بے ثبات سی چیزوں سے بہل جاتا ہے۔

صادق علی نے ایک ٹوٹی ہوئی ہنڈیا میں رکھ کر میرے ان دونوں کپڑوں کو تیلی دکھا دی۔ کمرے میں دھواں بھرنے لگا تو وہ ہنڈیا اٹھا کر فوراً ہی باہر نکل گیا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو بولا: "پانی گرم ہو چکا ہے میں ذرا نہالوں پھر آپ کی خدمت میں بیٹھتا ہوں اتنے میں زینو آپ کو دودھ دے جائے گی"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ غسل خانہ کہیں انہی کمروں کے پاس تھا مگر دوسری طرف۔

اسے گئے ہوئے ابھی پانچ چھ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک چھوٹی سی تام چینی کی گول ٹرے میں رکھ کر زینو میرے لئے جگ میں بھر کر دودھ لے آئی۔ وہ دروازے میں ایک جھجک کے ساتھ داخل ہوئی۔ اس نے گلابی رنگ کی ساٹن کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اسی رنگ کا دوپٹہ جو گلے میں جھول رہا تھا۔ اس کی رنگت شہابی سی تھی اور ایک عجیب سا بھورنگ احساس شرمگیں انداز سے اس کے چہرے پر لہراتا نظر آتا تھا۔ زلفیں اس کی گندھی تھیں اور اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی طاری تھی کہ اس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔

میرے قریب ہی پلنگ پر ٹرے رکھ کر اس نے جگ میں سے دودھ انڈیل کر گلاس میں بھرا تو ملائی کا یہ بڑا سا گولا گلاس میں اتر گیا — زینو نے بڑی ہی تمیز سے گلاس اپنی ہتھیلی پر رکھ کر مجھے پیش کیا، بولی۔

"لیں ابھی تو یہ پی لیں۔ آپ کو بھوک لگی ہوگی کھانا بھی تھوڑی دیر تک تیار ہو جائے گا" اس کا لب و لہجہ خاصا دیہاتی تھا اور شستہ نہیں تھا ف سے اکھڑا ہوا۔

گاؤں کے ماحول میں صاف ستھرے مہذب لہجے میں بات کرنے والا شاید ہی کوئی ملتا ہے۔ وہ بھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جسے میں دیکھ ہی آیا تھا۔ بہت ہوتے تو اس میں سو گھر ہوں گے اور تھا بھی وہ ایسی جگہ پر کہ بالکل اللہ میاں کے پچھواڑے میں پڑا نظر آتا تھا۔ بڑی سڑک سے ہٹ کر، لاہور ضلع کے مشرقی حصے میں۔ کوٹ لکھپت جیل سے تو دس میل دور۔

میں نے زینو سے گلاس لے کر منہ سے لگا لیا۔ وہ بہت عمدہ دودھ تھا اور بالائی نے اس کی لذت دوبالا کر رکھی تھی۔ زینو میرے اس قدر قریب کھڑی تھی کہ اس کے شعلہ آسا بدن کی بھبک مجھے اپنے وجود پر حاوی ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

"یہ دودھ کہاں سے لیتے ہیں آپ؟" میں نے یونہی ایک بے تکی سی بات پوچھی۔

"یہ ہماری اپنی بھینس کا دودھ ہے پسند آیا آپ کو؟" وہ اپنے مخصوص بجھے بجھے انداز سے مسکرائی۔

اب وہ پوری کی پوری میرے سامنے کھڑی تھی اور اس کے بدن کے تمام نشیب و فراز مجھ پر عیاں تھے۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اتنی خوبصورت کہ میرا خیال ہے ایک دنیا اس کی دیوانی ہو جائے اگر وہ یونہی بغیر برقعے کے سر بازار جا نکلے۔ آنکھیں اس کی ایسی تھیں کہ بولتی سنائی دیتی تھیں۔ یہ بڑی بڑی بادامی رنگ کی پٹ پٹ کھلتی بند ہوتی آنکھیں۔ تب مجھے رشک آیا اس صادق علی پر کہ اس نے گھر میں ایسا چاند بند کر رکھا تھا اور کراہت بھی محسوس ہوئی اس کی گھناؤنی شکل اور عمل پر کہ وہ خود خباثت کی پوٹ بنا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ زینو نہیں جانتی تھی کہ جس شخص کی وہ بیوی ہے وہ کس قدر قابلِ نفرت آدمی ہے۔

"بہت عمدہ دودھ ہے یہ" میں نے اپنی سوچ سے ابھرتے ہوئے یوں کہا جیسے میں بہت دور سے مڑ کر آیا ہوں۔

"اور پئیں"

"جی نہیں شکریہ! پڑا رہنے دیں صادق علی آتا ہے تو اس کے ساتھ پیوں گا"

"آتا ہے؟ آپ بہت بے تکلف ہیں ماسٹر صاحب سے" زینو نے عجیب سے انداز سے میری بات پکڑ لی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اسے میرے اس طرزِ تخاطب پر صدمہ پہنچا ہے۔ "لو! اچھا اچھا۔ وہ۔۔۔۔ دراصل میری اس سے بڑی بے تکلفی سی ہے برا نہ مانیں میری بات کا" میں نے اپنی خجالت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا ہے وہ خود آپ کا نام بڑی عزت سے لیتے ہیں" وہ بولی۔

"یونہی مذاق اڑاتا ہے وہ میرا میرے سامنے بھی اور دوسرے دنا

کے سامنے بھی مگر آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟ یہ بھی کوئی پریشان ہونے کی بات ہے؟" میں نے صادق علی کے دیئے ہوئے پیکٹ میں سے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔ نگاہیں میری یوں جھکی تھیں جیسے میں اس سے بہت شرمندہ ہوں اور فرار کی راہ نہیں پاتا ہوں۔

وہ عجیب سے انداز سے اپنے احمریں ہونٹ سکوڑتی ہوئی باہر نکل گئی صاف ظاہر تھا کہ اسے اپنے شوہر کے سلسلے میں میرے اس لب و لہجے پر سخت صدمہ پہنچا تھا۔

کوئی پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ زینو پھر ہوا کے تیز جھونکے کی طرح کمرے میں آ گھسی۔ اس کے ہاتھوں میں کیپسٹن کے سگریٹ کا پیکٹ تھا۔ "یہ لیں ماسٹر صاحب لائے ہیں کہتے تھے کہ آپ کو اچھے سگریٹ چاہئیں" وہ مسکرا رہی تھی۔

"وہ تو نہانے گئے تھے" اب کی بار میں نے صادق علی کا احترام ملحوظ رکھا۔

"نہانے کے لئے وہ اب گئے ہیں پہلے وہ سگریٹ لینے چلے گئے تھے۔ پاس ہی تو ہے دکان" یہ کہہ کر اس نے خود پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر مجھے دیا پھر تیلی جلا کر میرے آگے کر دی۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا

"آپ بھی نہانا چاہیں تو میں پانی گرم کر دوں؟"

"ہاں میں بھی نہا لوں تو اچھا ہے۔ کر دیں پانی گرم"

وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

کوئی بیس منٹ بعد صادق علی نہا کر واپس آیا تو وہ ایک دم۔۔۔ تر و تازہ نظر آ رہا تھا۔ میں کسی طرح بھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اکسٹھ سال کا پرانا کھوسٹ بڈھا ہے۔ وہ تو مجھ سے بھی زیادہ جوان نظر آتا تھا۔

"سگریٹ مل گئے ہیں آپ کو؟"

"ہاں بڑی مہربانی ہے تمہاری صادق علی۔ مگر میرے لئے زیادہ تکلف میں نہ پڑو"

"میرے گھر میں ایک عظیم انسان آیا ہے تو میں اس کی اتنی سی بھی خاطر مدارات نہ کروں؟ ناشکرا بن جاؤں"

"مجھے کس طرح عظیم سمجھتے ہو تم؟"

"وہ شخص جو خدا کی طرح پردہ پوش، ستار اور عیبوں کو ڈھانپنے والا ہو وہ تو اس دنیا میں مجسم رحمت کہلاتا ہے آپ مجھ سے میری اتنی سی سعادت بھی چھین لینا چاہتے ہیں"

"تمہاری شخصیت کے اس دہرے الجھاؤ کو میں شاید کبھی نہ سمجھ سکوں صادق علی۔ خدا کرے اب تک تمہارے بارے میں مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے غلط ہو یا غلط ہو جائے"

"دفع کریں۔ لعنت بھیجیں وہ کیا کہا ہے کسی شاعر نے سے

پھوڑو بھی اب مان بھی جاؤ جانے بھی دو پچھلی باتیں
کب کب ایسے من آتے ہیں کب کب ایسی راتیں"

یہ کہہ کر وہ بلند آواز سے بولا۔

"بھئی وہ پرندے بھن گئے کہ نہیں؟"

"بھون رہی ہوں یہ بدبخت مرغابیاں ڈھیٹ ہوتی ہیں ذرا"

زینو نے دور سے جواب دیا۔ اس کی آواز میں خاصی بیزاری تھی۔

"ہم خود بہت ڈھیٹ ہیں کیوں جیلانی صاحب! آپ جیل سے بھاگے اور بھول گئے اور میں وہاں سے آیا جہاں سے کوئی نہیں آتا اور بھول گیا"

"مجھے تم پر حیرت ہے صادق علی۔ جتنی دیر میں یہاں بیٹھوں گا مجھے گھن ہوتی رہے گی" میں نے جھلا کر کہا۔ اس آدمی سے بات کرنا مجھے دوبھر ہو رہا تھا۔ ایسا ملعون شخص تھا وہ کہ اس کے جرم کا تصور ہی میرے رونگٹے کھڑے کر دیتا تھا اور وہ تھا کہ بڑی رعنائی و توانائی سے گزار رہا تھا۔

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے آپ کے خیال اقدس میں؟" صادق علی نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ وہ میرے سامنے پلنگ پر بیٹھ گیا تھا اور۔۔۔ سگریٹ سلگانے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت سی سلگ اٹھی تھی۔

"میرا خیال ہے مجھے ابھی یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ یہ کم سے کم سزا ہے جو میں تمہیں دے سکتا ہوں بشرطیکہ اسے تم محسوس کرو"

"جیلانی صاحب! اب اگر ساری دنیا بھی یک زبان ہو کر مجھ پر یہ الزام عائد کرے تو ثابت نہیں ہو سکے گا کیونکہ میں اپنے جرم کے تمام نشان مٹا آیا ہوں — ہاں آپ کے ذہن سے وہ نقوش نہ مٹ سکیں تو اس مشکل کا حل میرے پاس نہیں ہے۔۔۔۔ ماسوائے اس کے کہ میں آپ سے معافی مانگ لوں، سو وہ میں کر کے دیکھ چکا ہوں" اس کی آواز بہت دھیمی تھی اتنی دھیمی کہ میں بھی مشکل سے سن رہا تھا۔ وہ زینو سے ہماری گفتگو کے اس پہلو کو مخفی رکھنا چاہتا تھا مگر اس کے لہجے میں چٹان ایسی سختی تھی۔

تب اچانک مجھے محسوس ہوا کہ اس آدمی سے مجھے بگاڑ نہیں پیدا کرنا چاہئے۔ میرا تو اس بھری دنیا میں کوئی بھی دوست نہیں اور جو ہیں وہ اس کڑے دور میں کسی قیمت پر بھی میرا ساتھ نہ دیں گے — یہ خیال میرے ذہن میں ابھرا تو میں مسکرا دیا۔

"میں سمجھتا ہوں صادق علی۔ آدمی آدمی ہے۔ کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ ٹھیک ہے تم اپنی خو نہ چھوڑو تو ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔ لے آؤ کھانا بھوک چمک رہی ہے اب"

وہ خوش ہو گیا بولا۔

"یہ ہے خداوندوں ایسی بات اور یہی ہمارا پروردگار چاہتا ہے کہ ہم اس کی صفات کو اپنا لیں"

"تمہارا یہ وضاحت سراسر زیادتی اور جہالت پر مبنی ہے۔۔۔ صادق علی۔ خدا تم ایسے لوگوں پر ہزار لعنت بھیجتا ہے" میں نے اسے ڈانٹا مگر دھیمی آواز میں۔ وہ مسکرایا پھر ہنسا پھر کھلکھلا کر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا

"آپ کی پختہ باتیں آپ کے پختہ شعور کی گواہی دیتی ہیں۔ مجھے یقین ہے میرا سابقہ کسی نابالغ سے نہیں پڑا۔ اور یہ بڑے شکر کا مقام ہے۔"

پھر اس کا قہقہہ ایک دم اس کے ہرس زدہ چہرے سے اڑ گیا اس پر اس گھڑی بڑی عجیب کیفیت طاری تھی۔ کبھی تو وہ مجھے خوف زدہ کر دیتا تھا کیونکہ میری گردن اس کے ہاتھ میں تھی اور جیل وہاں سے زیادہ دُور نہیں تھی اور کبھی وہ مجھے خوش کر دیتا تھا، اپنی باتوں سے مجھے پُرامید بنا دیتا تھا اور یہ احساس دلاتا تھا کہ وہ میرا دوست ہے۔

اور پھر وہ مجھے بتائے بغیر چپ چاپ گھر سے باہر نکل گیا مجھے اس وقت بے حد حیرت ہوئی جب کوئی آدھا گھنٹہ گزر جانے کے بعد زینو نے بتایا کہ وہ تو سکول چلا گیا ہے دھمیال کی طرف۔

"کھانا کھائے بغیر؟"

"اس کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ وہ تنکے سے من جاتا ہے اور ناکو پر روٹھ جاتا ہے۔" زینو میرے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنی تنہائی سے خوف زدہ ہے اور بات کرنے کو ترستی رہی ہے۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ وہ ساٹھ اکسٹھ سال کا بوڑھا اتنا سنکی کیوں ہے؟"

"کیا کہا آپ نے؟ ساٹھ اکسٹھ سال کا بوڑھا، یہ کس نے بتایا ہے آپ کو؟"

"اس نے خود کہا تھا مجھ سے کہ اس کی عمر اتنی ہو چکی ہے۔"

"اچھا! مگر مجھے نہیں معلوم تھا۔"

"یہی تو میں نے پوچھا تھا اس سے کہ جب وہ خود اتنا بوڑھا ہے تو اس نے اتنی کم عمر لڑکی سے کیسے شادی کر لی؟"

"کیا مطلب؟"

"کتنی عمر ہوگی آپ کی؟"

"مگر میں اس کی بیوی نہیں ہوں۔"

"کیا، کیا کہتی ہو تم! وہ تو مجھے یہی بتا رہا تھا۔ میں تو خود حیران تھا اس کے اس انکشاف پر۔"

"جی ہاں! میں اس کی بیوی نہیں ہوں۔"

"پھر کیا ہو تم اس کی؟"

"کچھ بھی نہیں! مجھے تو ایک اور آدمی نے اس کے پاس یہاں چھوڑ رکھا ہے۔"

"وہ آدمی کون ہے؟"

"ہے ایک آدمی۔ وہ چھوڑ گیا تھا مجھے یہاں ___ وہ.... وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ بیٹی کی طرح چاہتا ہے وہ مجھے اس لئے۔" زینو نے نہایت ہی سادگی سے یہ بات کہہ دی۔

"مگر اس سے تیرا کیا تعلق ہے بیبی؟ یہ قصہ کیا ہے آخر؟"

میں نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔

"ٹھہریں میں کھانا لے آؤں پہلے آپ کو بھوک لگی ہو گی۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھی اور دوسری طرف نکل گئی مگر مجھے ایسی حیرت دے گئی جس میں میں تا دیر ڈوبا رہا۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بڑا سا تاش تھا جس میں اس نے کھانا لگا رکھا تھا۔ تاش لا کر اس نے میرے سامنے تپائی پر رکھا پھر ایک پیالے میں شوربا ڈال کر اس نے میرے آگے رکھا اور بولی۔

"کھائیں میں بھی آپ کے ساتھ کھاتی ہوں کیونکہ ماسٹر صاحب تو اب شام کو ہی واپس آئیں گے۔"

"بڑی اچھی بات ہے۔ اِدھر کھینچ لو وہ دوسری کرسی۔" میں نے روٹیاں سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ میری بھوک اس مرغابی کو دیکھ کر چمک اٹھی تھی۔ صادق علی نے اچھا انتظام کیا تھا۔ ہم دونوں کھانا کھا چکے تو وہ بڑے اطمینان سے کھیس کی بُکل مار کر میرے سامنے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"ہاں، تو تم نے بتایا نہیں کہ یہ آدمی تیرا محرم کیسے بنا؟" میں نے اس کے حالات میں دلچسپی لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"یہاں آنے سے پہلے میں حوالات میں تھی۔"

"کیا کہا؟ حوالات میں۔ وہاں کیوں تھیں تم؟"

وہ مجھے رہ رہ کر جھٹکے دے رہی تھی۔

"میں نے دراصل تین آدمی قتل کر دیئے تھے ایک میرا دوست تھا اور دو اس کے دوست تھے یعنی میرے دوست کے دوست۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے اب تہیہ کر لیا تھا کہ زیادہ حیرت کا اظہار نہیں کروں گا۔

"میں دراصل سلیم پور کی رہنے والی ہوں شیخوپورہ کے قریب ہے یہ گاؤں۔ وہاں میری دوستی ہو گئی تھی دگّن سے۔ وہ سلیم پور کے زمیندار کا بیٹا تھا ___ مگر وہ میری دوستی کی قدر نہیں کرتا تھا۔" زینو کھلنے لگی۔ وہ مجھ پر اعتماد کر رہی تھی۔

"اچھا پھر؟"

"دراصل وہ دگّن بڑا بدمعاش آدمی تھا، عورتوں کو عیاشی کے لئے پھانستا تھا، مجھے بھی اس نے اسی طرح اپنے چکر میں ڈال لیا۔ بڑے پیسے خرچ کر دیئے اس نے مجھ پر۔ مجھے دس بارہ سوٹ سلوا دیئے اس نے، یہ ڈھیر سارے زیور بھی بنوا دیئے۔ میرا باپ گاؤں کا مصلی ہے میرے لئے چوہدری دگّن کی دوستی بڑے فخر کی بات تھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرے گا۔ اسی لئے میں.... میں نے اس کی کوئی بات نہ ٹالی اور.... اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیا مگر وہ بہت کھوٹا نکلا دو تین مہینوں تک تو اس نے اچھی طرح مجھے خراب کیا جب وہ سمجھا کہ اس نے اپنے پیسے پورے کر لئے ہیں تو ایک رات اس نے مجھے بڑی محبت سے اپنی ڈیرے والی حویلی میں بلایا۔ وہ سلیم پور سے کوئی تین میل پرے ہے، دگّن کی

زمینوں پر۔ وہیں انہوں نے ٹیوب ویل لگا رکھا ہے ___ میں چلی پہنچی وہاں مجھے کیا ڈر تھا کسی کا۔ اس کے لئے تو میں آگ میں بھی کود سکتی تھی۔

مگر جب میں وہاں پہنچی تو میں نے دیکھا کہ اس کی بیٹھک میں چار جوان بیٹھے ہیں میرے دل میں کوئی وہم نہ تھا۔ سو میں بے دھڑک ان کے کمرے میں جا بیٹھی مگر دگّن سے جب میں نے بات کی تو معلوم ہوا کہ وہ نشے میں ہے۔

تب مجھے معلوم ہوا کہ دگّن نے میرے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا ہے۔ نذر نے بھی پی رکھی تھی۔ وہ بہک چکا تھا۔ بلند آواز سے منہ اونچا کر کے بولا۔

کیلے دیاں پھلیاں نیں
عشق مشکنی دا
مصری دیاں ڈلیاں نیں!

اس نے کان پر ہاتھ رکھ کر نشے میں چُور آواز میں یہ بول گائے اچانک دگّن میرے قریب آیا اور میرے کان کے قریب منہ کر کے بولا۔

"یہ سب میرے یار ہیں زینو ان کو بھی خوش کر دے
گُل مل جا ان سے۔"

تب میں نے اپنی زندگی کا آخری فیصلہ کیا.....

جیلانی صاحب آخری اور سب سے خوفناک فیصلہ۔ میں نے دگّن کا پستول کھینچ لیا۔ مجھے معلوم تھا وہ اسے ہمیشہ بھر کر رکھتا ہے۔ کئی بار وہ مجھے جھیل کے گرد پھیلے جھنڈوں میں، روہی میں، اُدھر چھپ کی تنہائی میں اس پستول پر اپنا ہاتھ کھولنے کا موقع دے چکا تھا اور مجھے اس میں خاصی مہارت بھی ہو گئی تھی۔ میں نے پستول ہاتھ میں لیا اور پہلی گولی دگّن کے سینے میں اتار دی۔ وہ ذبح ہوتے بھینسے کی طرح چیخا اور الٹ کر دیوار کے پاس جا گرا۔

پیشتر اس کے کہ مونگلی سمجھ سکتا میں نے دوسری گولی اس کی پسلی میں اتار دی۔ کمرے میں ایک اور خوفناک چیخ ابھری اور میں نے بجلی کی سی تیزی سے پلنگ سے اٹھ کر نذر پر گولی چلا دی مگر وہ پہلو بچا گیا اور دروازہ کھول کر باہر بھاگ گیا۔ ان کا چوتھا دوست کبڑا اب میرے سامنے تھا۔ میں نے اس پر بھی فائر کر دیا۔

اتنے میں مونگلی اچھل کر مجھ پر گرا مگر وہ مجھے بے بس نہ کر سکا۔ میں نے دو گولیاں یکے بعد دیگرے اس پر چلا دیں اور اس کا قصہ پاک ہو گیا۔

میں نے پاگلوں کی طرح جلدی جلدی کپڑے پہنے اور صورتحال پر غور کرنے لگی۔ جب میں نے تین لاشیں اپنے سامنے پڑی دیکھیں اور فرش، بستر پر ادھر اُدھر خون ہی خون مجھے بکھرا نظر آیا تو میں پستول سمیت کمرے سے نکل بھاگی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا طاری تھا مگر مجھے کسی شے سے کوئی خوف محسوس نہ ہوتا تھا۔ میں ایسی سیکڑوں اندھیری راتیں دگّن کے ساتھ جنگل میں گزار چکی تھی۔ میں تیز تیز چلتی اپنے گھر جا پہنچی۔

ماں میری کو قطعاً کوئی خبر نہ ہوئی۔ وہ افیون کھاتی ہے اور رات کو گھوڑے بیچ کر سوتی ہے۔ میں نے دل میں دعا رکھی ہے کہ اگر چہ نذر بچ گیا تھا مگر میں اس کی ایک نہ چلنے دوں گی۔ میں جان کر بچا نہ دوں گی کہ میں دگّن کے پاس گئی تھی ___ پستول جس سے میں نے انہیں مارا تھا میں گاؤں کی مسجد کے کنوئیں میں پھینک آئی تھی۔ بستر پر لیٹتے ہی میں لحاف میں منہ لے کر سو گئی۔

صبح جب میں سو کر اٹھی تو اپنے ارد گرد کی ہر شے مجھے سرخ نظر آئی۔ تین آدمیوں کا خون میری گردن پر تھا اور میں عورت ذات! جس نے ابھی زندگی کا کوئی بھی سُکھ نہیں دیکھا تھا۔ جیلانی بھائی! پڑھو کلمہ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہو کہ جو کچھ میں نے کیا ٹھیک کیا تھا کہ غلط؟ پڑھو کلمہ۔"

وہ اچانک گلوگیر ہو گئی۔ ماضی کی یادوں کے زخم ابھی ہرے تھے اس کے سینے میں اور اس نے خود ہی ناخن مار کر ان پر سے کھرنڈ اتار دیا تھا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو زینو ایسے ذلیل آدمی کا یہی حشر ہونا چاہئے، اس نے تو تمہیں بیچ ڈالا تھا۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو ابھر آئے تھے۔

"مجھے دگّن کی موت کا بہت افسوس ہے بھائی جی! میں اس کے چہرے پر ٹھنڈی زردی کو آج تک نہیں بھول سکی ہوں۔ میں نے جی جان سے محبت کی تھی اس سے مگر مجھے اس نے اس رات ذلیل کر دیا۔ میں اسے کس طرح معاف کر سکتی تھی؟"

"تم بڑی بہادر عورت ہو زینو! بڑی اچھی مثال قائم کی ہے تم نے۔ پھر کوئی عاشق اپنی معشوق کی دلالی نہیں کرے گا۔" میں نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی تھی اور اس کی صورت میں مجھے آسیہ کی صورت نظر آنے لگی تھی۔ میرے دل میں ہلکی ہلکی ٹیس اٹھنے لگی تھی۔ زینو کو کیا خبر تھی کہ میرے دل میں کس کے تیر کی انی کتنی گہری دھنس چکی ہے۔ زینو تو اپنی عصمت کا گوہر بچا لائی تھی، مگر میری وہ سارے جہاں سے زیادہ معصوم بہن آسیہ خدا ہی جانتا تھا کہ اس پر سوات خان نے کیسے کیسے ظلم توڑے ہوں گے؟ مجھے اس سے جدا ہوئے پندرہ ماہ گزر چکے تھے ___ اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے اجڑے گھر کا وہ پھول کس دلدل کی موری میں ڈال دیا گیا ہے کس بستر پر مسل دیا گیا ہے اور کس ہوا میں اس کی پتیاں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی ہیں؟

زینو رونے لگی تھی۔ اپنے آنسو دوپٹے میں جذب کرتے ہوئے وہ بولی۔

"وہ تو میرے سامنے ہی مر گیا تھا میری گولی اس کے دل میں کھب گئی تھی۔ اتنا سوہنا جوان تھا وہ جیلانی بھائی! کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ جب وہ اکڑ کر چلتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کوئی بادشاہ آ رہا ہے۔"

"لعنت بھیجو اس کی یادوں پر زینو! پاگل کتا کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو گولی کے لائق ہوتا ہے، بھول جاؤ اسے۔" میں نے اپنی آنکھوں کی نمی کو پلکوں میں دباتے ہوئے کہا، مگر وہ میرے چہرے کی کیفیت دیکھ چکی تھی، سمجھ گئی کہ میں بھی بڑا دردمند دل رکھتا ہوں، بولی ——

"جیلانی بھائی! پھر پتہ ہے کیا ہوا! اسی شام پولیس نے مجھے میرے گھر سے پکڑ لیا۔ سارا گاؤں میرے ہاتھوں میں ٹوٹی چوڑیاں اور ہتھکڑیاں دیکھنے کے لئے دوڑا چلا آیا۔ اب تو میں شلوار پہنتی ہوں مگر ان دنوں میں "لاچا" باندھتی تھی۔ سیاہ رنگ کا ریشمی لاچا۔ وہ مجھے بہت سجتا تھا اور جب وہ لوگ مجھے پیدل تھانے کی طرف لے چلے تو جو چیز مجھ کو سب سے زیادہ پریشان کرتی تھی وہ میرا لاچا ہی تھا۔

میری ماں میرے ساتھ تھی۔ میرا چاچا شہامت ہمارے ساتھ نہیں آیا۔ بڑی بڑی گالیاں دیں اس نے مجھے اور میری ماں کو۔ بولا "تم دونوں بدمعاش ہو کنجریاں ہو، چوہدریوں کا مال کھاتی رہی ہو اب خود ہی بھگتو، میرا کوئی واسطہ نہیں ہے تم سے۔" میں اپنے باپ کو چاچا کہہ کر پکارا کرتی تھی۔ مگر اب تو وہ رشتہ بھی میرا اس سے باقی نہیں ہے سب کچھ بدل گیا ہے۔"

"کیا تمہارا باپ اب زندہ نہیں ہے؟"

"زندہ ہے مگر مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ..... وہ میرا باپ نہیں ہے۔"

"یہ کیسے پتہ چلا ہے تمہیں؟"

"میں اگر اس رات حوالات نہ پہنچتی تو شاید کبھی بھی نہ جان سکتی کہ میرا باپ شہامت نہیں ہے بلکہ میں کسی اور کی بیٹی ہوں۔"

"اچھا! کمال ہے، ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ قصہ کیا ہے؟ تم نے تو حیران کر دیا ہے مجھے۔" میں نے سنبھل کر کہا۔

"سارا راستہ وہ چار سپاہی مسلسل مجھے گھورتے رہے۔ ہوا میں اڑتے میرے لاچے سے ان کی نگاہیں کھیلتی رہیں۔ ماں نے ساری راہ مجھے سنبھالے رکھا مگر میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ میں تو ان کی قیدی بنی تھی۔ جب ان لوگوں نے جا کر مجھے حوالات میں بند کر دیا تو میری ماں باہر سلاخوں کے قریب ہی بیٹھ گئی اس کی آنکھیں ابل رہی تھیں مگر منہ سے وہ کچھ نہ کہتی تھی۔

میرا خیال ہے کہ رات کے دس بجے ہوں گے کہ اچانک بڑا تھانیدار سکوٹر پر شوں شوں کرتا تھانے کے احاطے میں داخل ہوا۔ وہ کوئی ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ جب سکوٹر گھما کر وہ آگے لے گیا تو میری ماں ایک دم اس کی طرف یوں دوڑی جیسے اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو۔

حوالات کی اس ٹھنڈی یخ کوٹھڑی میں میں بالکل تنہا تھی۔ مردانہ حوالات کہیں دوسری طرف تھی۔ میری ماں تھانیدار کے پیچھے دوڑی تو میں ایک دم ڈھل گئی۔ بے تحاشا رونے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں تمام سہاروں سے محروم ہو گئی ہوں۔ اس وقت تک میں نے بہت ضبط کیا تھا مگر جب ان سلاخوں کے اس طرف بیٹھی میری ماں مجھے نظر نہ آئی تو میں اندر سے بالکل ہی ٹوٹ گئی۔ پہرے پر کھڑا سپاہی حیرت زدہ رہ گیا۔ میں بلند آواز سے رونے لگی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا میں ان سلاخوں سے ٹکریں مار مار کر اپنا سر پھوڑ لوں۔ زندگی نے مجھے دکھوں کے بیلنے میں ڈال دیا تھا اور میں تیزی سے اس کے دندانوں کی طرف دھکیلی جا رہی تھی۔ پہرے دار میرے قریب نہیں آیا، دور سے تسلیاں دیتا رہا۔

کوئی پندرہ منٹ بعد میں نے دیکھا کہ وہ تھانیدار میری ماں کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا میری طرف آ رہا تھا۔ اور..... اور جیلانی بھائی! میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ جانتے ہو میری حیرت کی کیا وجہ تھی؟ وہ تھانیدار جس کا نام وارث علی تھا شکل و صورت سے ہو بہو مجھ سے ملتا جلتا تھا بلکہ مجھے یوں لگا جیسے میری تصویر میرے سامنے ہے اگر وہ مونچھیں اس کے چہرے پر نہ ہوتیں اور وہ عورت ہوتا تو میرے اور اس کے درمیان ذرہ بھر فرق نہ ہوتا۔ میں تو حیران رہ گئی۔ وہ میرے سامنے آ کر سلاخوں کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ لگتا تھا اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ اپنی یہ بڑی بڑی آنکھیں بالکل میری آنکھوں جیسی، اس نے میرے چہرے پر گاڑ دیں اور پھر میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کے قطرے گرنے لگے۔ اس کے ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے اور وہ سسک سسک کر رونے لگا۔

میری حیرت اتنی بے پناہ تھی جیلانی صاحب! کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے رخسار تھپتھپائے یوں جیسے کوئی اپنی ننھی منی بچی کو دلاسا دیتا ہے۔

اچانک پہرے دار کی کھانسی کی آواز احاطے میں گونج گئی۔ وہ بس یہی کوئی بیس قدم دور کھڑا تھا۔ تھانیدار فوراً سنبھل گیا، بڑی دھیمی آواز میں بولا۔

"فکر نہ کر آرسی! میں کوئی نہ کوئی بندوبست ضرور کر لوں گا۔"

آرسی میری ماں کا نام ہے۔

ماں نے ڈبڈبائی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ ان نظروں کی تاب نہ لا کر اسی لمحے واپس چلا گیا۔

ماں اسے دور تک اور دیر تک وہاں کھڑی دیکھتی رہی جب وہ عمارت کے درمیانی حصے میں برآمدہ عبور کر کے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو ماں میری طرف متوجہ ہوئی بولی۔

"اس کا نام وارث علی ہے سب سے بڑا تھانیدار ہے یہاں کا۔"

"تم اسے کیسے جانتی ہو ماں؟" میں ماں کے پاس ہی سلاخوں کے ساتھ لگ کر فرش پر بیٹھ گئی۔

میری ماں کا رنگ اتر رہا تھا ——— وہ مجھ سے نظریں نہیں ملا رہی تھی پہرے دار ہم سے خاصا دور تھا..... اتنی دور کہ ہماری باتیں وہ

سن نہ سکتا تھا۔

"یہ کون ہے ماں؟ تم اسے کب سے جانتی ہو؟"

"میں اسے ستائیس سال سے جانتی ہوں! زینو! مگر آج میں نے اسے پچیس سال بعد دیکھا ہے پورے پچیس سال بعد۔" ماں اپنے ذہن کے تاریک گوشوں سے وقت کا جالا اتار رہی تھی۔

"اتنے عرصے بعد بھی تمہیں یاد رہا کہ اس کا نام وارث علی ہے؟" میں نے پوچھا۔ ماں میرے سامنے بہت خجل ہو رہی تھی۔ بہت پریشان تھی وہ، اس پر عجیب سا سکتہ طاری تھا۔ میں نے اسے سلاخوں کے اندر سے ہاتھ باہر نکال کر جھنجوڑا۔ "بتاتی کیوں نہیں ہو ماں، کون ہے یہ؟"

ماں کی آنکھیں بہہ نکلیں۔

"تم شاید مجھے کبھی معاف نہ کر سکو گی بیٹی مگر میں تمہاری گناہگار ہوں۔ یہی وہ تھانہ ہے جہاں یہ وارث علی آج سے چھبیس سال پہلے سپاہی بن کر آیا تھا۔ یہ اکثر کسی نہ کسی کام سے ہمارے گاؤں جاتا تھا۔ وہیں پر میری اس سے ملاقات ہوئی تھی بہت دنوں تک یہ میرے پیچھے پاگل بنا رہا، بہت ٹالا میں نے اسے مگر یہ اپنی ہٹ کا اتنا پکا تھا کسی طرح بھی میرا خیال نہ چھوڑتا تھا۔ کوئی سال بھر اسی چکر میں گزر گیا۔ پھر یوں ہوا کہ ایک دن تیرا باپ شہامت چوری کے ایک مقدمے میں پھنس گیا مجھے معلوم ہے کہ اس میں شہامت قصوروار تھا۔ ڈنگروں کی اس چوری میں وہ بھی شریک تھا۔ وارث علی نے اسے بھی لے جا کر حوالات میں بند کر دیا۔ مکڑہ وال کا چوہدری خورشید اس چوری میں مدعی تھا۔ اس نے اس کی ضمانتیں بھی نہ ہونے دیں۔ شہامت حوالات میں تھا کہ یہ وارث علی ایک رات میرے پاس آ گیا۔ میں گھر میں اکیلی تھی اس رات۔ اور مجھے یہ لالچ تھا کہ کسی نہ کسی طرح شہامت حوالات سے رہا ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رات وارث علی نے میرے گھر میں گزاری اور..... اور..... تو اسی رات کی نشانی ہے۔ زینو میری بیٹی تو شہامت کی نہیں، اسی وارث کی بیٹی ہے۔ وارث اپنی بات کا دھنی نکلا اس نے تیسرے ہی دن شہامت کو اس مقدمے سے نکلوا دیا۔

آج میں نے اس کو پورے پچیس سال بعد دیکھا ہے زینو! میں نے اسے بتا دیا ہے کہ اس کی بیٹی ادھر حوالات میں بند ہے اور اس پر تین آدمیوں کے قتل کا الزام ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر کانپ اٹھا بولا آہستہ بات کر آرسی میں اس تھانے کا انچارج ہوں، میری عزت کو بٹہ نہ لگا۔" یہ کہہ کر میری ماں عجیب شکست خوردہ انداز میں مسکرائی۔ وہ ایسا انداز تھا جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ میری ماں ہارنے کے باوجود اس روز اپنی جیت کو یقینی سمجھ رہی تھی۔

"ماں! کتنی عجیب بات ہے میری اور اس کی شکل کتنی ملتی جلتی ہے؟"

"ہاں زینو جب تو پیدا ہوئی تو یہ تجھے دیکھنے آیا تھا۔ میں اسے کس طرح بھول سکتی ہوں۔ شہامت کو اس نے اپنا یار بنا لیا تھا مگر وہ بے وقوف آدمی بھلا کیا سمجھ سکتا تھا۔ وارث نے تیرے لئے خوبصورت سے چار جوڑے دیئے تو میں تو خوش ہو گئی۔ اس کی ساری زیادتی کو بھول ہی گئی۔ شہامت بھی بہت خوش تھا، وہ تو بھولا آدمی۔

مگر یہ چیزیں مجھے دینے کے بعد وارث علی دوبارہ میرے گاؤں نہیں آیا، اس نے اگلے ہی ہفتے وہاں سے اپنا تبادلہ کروا لیا اور اب تک پتہ نہیں کہاں کہاں پھرتا رہا ہے مگر یہ تقدیر کا چکر ہے بیٹی! آج وارث کو اپنی اس غلطی کی قیمت ادا کرنی پڑے گی ورنہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بیٹی کو پھانسی چڑھتے دیکھنا ہو گا۔ وہ تمہیں بچا بھی سکتا ہے اور مروا بھی سکتا ہے۔" میری ماں مجھ سے سرگوشی کر رہی تھی۔ رہ رہ کر اس کی نظر پہرے دار پر پڑتی تھی جو دور کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ ماں کو اس رات نہ سردی کا احساس تھا نہ بھوک کا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا ورنہ وہ ساری دنیا کو تہہ و بالا کر دیتی اور مجھے چھڑا لیتی اس سنگین کوٹھڑی سے۔ جہاں اتنی بدبو تھی کہ کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ قیدیوں کو حکم تھا کہ وہ اپنی گندگی وہیں پھینکیں۔ یہ سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تھی جسے میں آج تک نہیں بھول سکی ہوں۔"

"ارے بھئی یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ تم وہاں سے نکلیں کیسے؟ تھانیدار کو یہ اختیار کہاں حاصل تھا کہ وہ تمہیں چھوڑ دیتا۔" میں نے حیرت کے سیلاب کو روکتے ہوئے کہا۔ اس لڑکی نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔

"یہ بات میرے لئے بھی حیرانی کا باعث ہے جیلانی بھائی! میں اس حوالات میں تین دن بند رہی۔ چوتھے دن مجھے عدالت میں پیش کرنے کے لئے دو سپاہی تانگے میں بٹھا کر شیخوپورہ کی طرف لے چلے ——— چودہ میل کا فاصلہ تانگے میں طے کرنا تھا۔ سڑک کچی اور ویران تھی اور تانگے کا گھوڑا بھی یونہی سا تھا مریل مریل ہڈیوں کی مٹھ۔

اس وقت صبح کے چھ بجنے والے تھے، سورج کی ٹکیا ابھی نہیں نکلی تھی ——— دسمبر کے یخ ٹھنڈے دن تھے میری ماں میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ ہم دونوں کو انہوں نے کمبل اوڑھا رکھے تھے۔ سپاہی تانگے کی اگلی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا جیلانی بھائی! مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ لوگ مجھے دفن کرنے جا رہے ہیں کسی قبرستان میں۔ عدالت اور جیل کے چکر کا تصور میرے لئے ناقابل برداشت تھا۔ میں دعا مانگتی جاتی تھی کہ اللہ ان ذلتوں سے مجھے بچا لے۔ اگر موت اس سے سستی ہے تو وہ مجھے دے دے۔ اس زندگی کی روشنی سے قبر کا اندھیرا میرے لئے بہتر ہو گا۔

اور جیلانی بھائی! اس دن مجھے معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی خلوص سے اپنے دل کی گہرائیوں سے کوئی دعا مانگے تو وہ ضرور قبول ہو جاتی ہے۔ ہم اس وقت سڑک کے اس حصے پر سے گزر رہے تھے جس کے دونوں طرف گنے کے قطعے ایسی اونچی دیواروں جیسے اپنے کھیت تھے۔ سڑک کے دونوں طرف شیشم کے درخت لگے تھے، کہیں کہیں آم کے درخت بھی تھے۔

اچانک ٹھڑز کی آواز گونجی اور تانگے کا گھوڑا تڑپ کر نیچے گر گیا۔ تانگہ یوں الٹا کر سپاہی دائیں بائیں لڑھک گئے۔ میری ماں بھی آگے کی طرف کھنچ گئیں۔ میری ہتھکڑی کی زنجیر ایک سپاہی کی پیٹی سے بندھی تھی جھٹکا جو لگا تو وہ پیٹی کھل گئی۔ اور میں نیچے گرنے سے بچ گئی۔ مگر حالت یہ تھی کہ تانگہ اپنے بموں کے بل آگے جھکا ہوا تھا اور میں اپنی ماں سمیت زمین سے کافی اوپر اٹھ گئی تھی۔

سپاہیوں نے فوراً ہی اپنی بندوقیں سنبھالیں اور وہ تانگے کے دائیں بائیں پہیوں کی اوٹ میں بیٹھ کر اپنے دشمن کو تلاش کرنے لگے۔ جو سامنے کے درختوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ ابھی وہ سنبھل نہ سکے تھے کہ ایک گولی دائیں طرف بیٹھے سپاہی کی ران میں لگی وہ پاگل کتے کی طرح چیخا مگر بندوق پر اس کی گرفت ابھی مضبوط تھی۔

"ہتھیار پھینک دو، ورنہ میں تم دونوں کو گولی مار دوں گا۔"

وہ بڑی خوفناک آواز تھی۔ دونوں سپاہیوں نے بے بسی ہو کر اپنی بندوقیں پھینک دیں۔

کوجوان گنے کے کھیت میں جا گھسا تھا۔

"ان دونوں عورتوں کو نیچے اتار کر آگے آنے دو ——" آواز پھر گونجی۔

ایک سپاہی نے اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے تانگے کے پچھلے حصے اوپا کر ہمیں نیچے اتارا۔

"اپنی بندوقیں ان کو دے دو اور انہیں آگے آنے دو۔" وہ آواز پھر ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ بڑا رعب تھا اس کی گھن گرج میں ایک سپاہی نے بندوقیں اٹھا کر ہمیں تھما دیں۔ ہم دونوں تیزی سے اس طرف بڑھے جدھر سے وہ آواز آ رہی تھی —— مگر دُور دُور تک دیکھنے کے باوجود ہمیں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ آدمی درختوں میں اس طرح چھپ کر بیٹھا تھا کہ اسے وہاں سے دیکھنا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا جہاں وہ تانگہ کھڑا تھا۔

ہم تانگے سے ہٹ کر کوئی سو ہاتھ آگے گئے ہوں گے کہ وہ آواز اچانک ہمیں اپنے سر پر گونجتی سنائی دی۔

"دائیں ہاتھ کھیت میں گھوڑے کھڑے ہیں۔ ایک پر تم دونوں سوار ہو جاؤ۔" اب کی بار وہ آواز اتنی بلند نہیں تھی۔

ہم دونوں ماں بیٹی تیزی سے دائیں ہاتھ کھیت میں گھس گئیں وہاں دو گھوڑے بندھے تھے گنّوں کے ساتھ۔ ایک گھوڑا ابھی ہم نے کھولا ہی تھا کہ ایک آدمی سر سے پاؤں تک سیاہ کپڑوں میں ملبوس ہمارے سر پر آ پہنچا۔ اس نے منہ پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا اور اس کی صرف آنکھیں ہی نظر آتی تھیں، جو بتا رہی تھیں کہ وہ کوئی ادھیڑ عمر آدمی ہے۔ ہمارے پاس آ کر اس نے منہ پر سے کپڑا اتار دیا۔

"ارے تم وارث! تم —" میری ماں نے خوشی سے سرشار ہو کر کہا۔

"ہاں! جلدی کرو ابھی وقت بہت کم ہے۔ ہمیں زینو کو بچانا ہے ہر قیمت پر بچانا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ہم دونوں کو ایک گھوڑے پر سوار کرایا اور خود دوسرے گھوڑے پر بیٹھ کر بولا۔

"میرے پیچھے چلی آؤ۔ جلدی کرو۔ مجھے امید ہے تم گھوڑی چلا سکتی ہو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ سپاہیوں کی بندوقیں اس نے ہم سے لے کر اپنی زین کے ساتھ باندھ لی تھیں۔

وہ بہت تیز رفتار گھوڑیاں تھیں۔ پلک جھپکتے میں وہ ہمیں میلوں لے گئیں اس جگہ سے جہاں وہ ٹوٹا ہوا تانگہ کھڑا تھا اور جہاں زخمی سپاہی اپنے ساتھی کے ہمراہ اپنی بے بسی پر دانت پیس رہا تھا۔

ہم کوئی چار گھنٹے بھاگتے رہے۔ راستے میں ہم نے رات کیا۔ تین نہروں کے پلوں پر سے گزرے اور دوپہر کے قریب یہاں —— کمال پور آ پہنچے۔"

وارث علی نے مجھے اسی روز ادھر ماسٹر صاحب کے سپرد کر دیا۔ وہ دونوں بڑی دیر تک علیحدگی میں بیٹھے میرے بارے میں صلاح مشورہ کرتے رہے۔ پتہ نہیں ان کے درمیان کیا طے پایا بہرحال نتیجہ یہ نکلا کہ ماسٹر صاحب نے ہر حال میں میری نگہداشت کا ذمہ لے لیا۔

میری ماں یہاں چار دن رہی اس کے بعد وارث علی نے اسے سندھ بھیج دیا۔ اب میں نے سنا ہے کہ وہ وہاں کسی زمیندار کے ہاں ملازم ہے، زمیندارنی کی خدمت کرتی ہے اور میں یہاں بند ہوں —— وارث علی اس عرصے میں کئی بار یہاں آیا ہے، وہ میرا باپ ہے مگر میں اسے آج تک باپو نہیں کہہ سکی ہوں، کیوں کہوں؟ میں اسے اپنا باپو کس طرح کہوں؟ میری زبان پر یہ لفظ چڑھتا ہی نہیں ہے۔ ان خود بھی مجھ سے باپ ایسا سلوک کر رہا ہے۔ بہت خیال رکھتا ہے وہ میرا۔ اس صادق علی کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کی نوکری بھی چھوٹ چکی ہے مگر اس کے گھر کا سارا خرچ وارث علی چلا رہا ہے۔"

"تو کیا یہ نوکری نہیں کرتا ہے یہ صادق علی؟"

"جی نہیں کئی مہینوں سے بے کار ہے اور ادھر ادھر آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔ ہر مہینے وارث علی آ کر اسے ہزار پانچ سو روپے دے جاتا ہے میرے خرچے کے لئے اور اس کا کام چل رہا ہے۔"

"اس سے تمہارے باپ کا کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا مجھے قطعاً کوئی علم نہیں ہے جیلانی بھائی! لگتا ہے یہ بھی آپ کی طرح کوئی مفرور ہے پرانا مجرم ہے اور بھیس بدل کر اس گاؤں میں بیٹھا ہے میرے باپ وارث علی کو اچھی طرح علم ہے کہ یہ آدمی کون ہے اس کا ماضی کیا ہے مگر وہ اس بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاتا۔ میں نے اس سے کبھی کچھ نہیں پوچھا اور صادق علی تو ہر آدمی سے جھوٹ بولتا ہے اپنے بارے میں، کسی کو کچھ بتاتا ہے کسی کو کچھ۔"

"کمال ہے زینو! تم بھی مفرور ہو اور یہ صادق علی بھی مفرور ——

حیرت کی بات ہے۔"

"آپ بھی تو جیل سے بھاگے ہوئے ہیں۔ صادق علی نے یہی بتایا ہے آپ کے کپڑے اس نے مجھے دکھائے تھے قیدیوں والے۔"

"ہاں! وہ جلانے کے لئے لے گیا تھا۔"

"مگر اس نے جلائے نہیں ہیں وہ کپڑے، سنبھال کر رکھ دیئے ہیں کہیں پر ......"

"اچھا؟ وہ تو یہی کہہ رہا تھا خیر کوئی بات نہیں مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ میں جیل سے بھاگ کر آیا ہوں لیکن زینو تم نے مجھ پر اتنا اعتبار کیسے کر لیا۔ کیوں تم نے اپنے سارے راز مجھ پر ظاہر کر دیئے ہیں؟ ڈر نہیں آیا تمہیں مجھ سے۔ میں تو اجنبی ہوں یہاں، بالکل اجنبی۔"

"پتہ نہیں جیلانی بھائی کیوں میں نے اپنی ساری باتیں آپ کو بتا دی ہیں بس میں اندر سے بھری بیٹھی تھی۔ ترس گئی ہوں میں کسی سے بات کرنے کو۔ صرف ایک سہیلی ہے میری یہاں مگر وہ بھی کبھی کبھی آتی ہے میرے گھر۔ میں خود بھی بہت ڈرتی ہوں کسی سے کچھ نہیں کہتی۔ آپ کے بارے میں جب صادق علی نے بتایا کہ آپ جیل سے بھاگ کر آئے ہیں تو میرے دل میں آپ کے لئے بڑی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ آپ جب تک چاہیں یہاں رہیں کوئی آپ کا بال بیکا نہ کر سکے گا۔ ہم آپ کی ہر طرح حفاظت کریں گے۔" زینو بڑے دل گردے کی مالک تھی اور مجھ پر وہ اندھا دھند اعتبار کرتی چلی گئی تھی۔

صادق علی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کس کام سے کدھر نکل گیا تھا۔

"اوہ مجھے یاد ہی نہیں رہا، آپ کے لئے پانی گرم رکھا تھا میں نے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ میرے پاس واپس آئی تو بولی۔

"چلیں میں نے گرم پانی غسل خانے میں رکھ دیا ہے آپ نہا لیں۔ تولیہ بھی رکھ دیا ہے وہاں۔"

وہ بڑی خدمت گزار لڑکی تھی اور مجھ سے چھوٹی بہنوں ایسا سلوک کرتی تھی۔

جب میں اس کے چھوٹے سے صاف ستھرے غسل خانے سے نہا کر نکلا تو دیکھا کہ صادق علی سامنے صحن میں چارپائی پر بیٹھا دھوپ تاپ رہا تھا اور زینو نے کھانا اس کے سامنے چارپائی پر رکھ دیا تھا۔

"اچھا تو تم آ گئے ہو مگر یہ اچانک تم کدھر غائب ہو گئے تھے؟"

"وہ میں دراصل اپنے یار کے پاس گیا تھا گھوڑے لینے مگر وہ ملا ہی نہیں۔ میں پیغام دے آیا ہوں۔"

"گھوڑی کس لئے؟"

"میں ذرا دیر کے لئے شہر جانا چاہتا تھا۔"

"وہ کیوں؟"

"مجھے آپ کے بارے میں معلوم کرنا تھا میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہاں کیا حالات ہیں؟"

"اچھا؟ یہ تو بہت عمدہ بات ہوگی۔ تم ضرور شہر جاؤ اور ہو سکے تو میرا بھی ایک کام کرتے آؤ۔"

"وہ بھی کر آؤں گا۔ آپ کا تو میں ان کا بندھا غلام ہوں جناب۔ اک ذرا وہ میرا یار غوث محمد آ جائے گھوڑی لے کر۔ پھر دیکھیں میں کیا کرتا ہوں۔" اب وہ بڑے بڑے نوالے اٹھا کر اپنے حرص زدہ ہونٹوں کے غار میں اتارتا جا رہا تھا۔ وہ کھانا کھا چکا تو بولا۔

"آپ بھی رات بھر بے آرام رہے ہیں اور میں بھی۔ میرا خیال ہے ہمیں دو گھڑی سو لینا چاہئے۔"

"تمہاری بے آرامی پر میں ہزار لعنت بھیجتا ہوں مگر تمہاری تجویز عمدہ ہے۔ لگا دو بستر اگر لگا سکتے ہو تو۔" میں نے اس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ زینو اتنے میں کنگھی شیشہ لے آئی۔ میں نے بال سیدھے کئے اور پھر سگریٹ سلگا کر دھوپ تاپنے لگا۔ تھوڑی سی دیر بعد زینو نے کمرے سے باہر آ کر بتایا کہ اس نے بستر لگا دیئے ہیں۔ صادق علی خوش ہو گیا، بولا۔

"چلیں جیلانی صاحب! اب ذرا آرام کریں۔"

سونے کے لئے میں اس کے ساتھ کمرے میں گیا تو دیکھا کہ زینو نے بہت صاف ستھرے لحاف الگ الگ پلنگوں پر ڈال دیئے تھے۔ صادق علی نے دروازہ بند کیا اور ہم دونوں لمبی تان کر سو گئے۔ وہ بھی ذلتوں کا مارا ہوا تھا اور میں بھی اور زینو جو ہمارے لئے پہرہ دے رہی تھی ہم سے کہیں زیادہ آفت رسیدہ اور مردم گزیدہ تھی۔ زندگی نے تینوں

تباہ حال لوگوں کو ایک تنگ، بے برگ و گیاہ، ویران جزیرے میں پھینکا کر دیا تھا ایسے جزیرے میں جس میں قدم قدم پر خطرات کے سانپ پھنکار رہے تھے۔

میں جب سو کر اٹھا تو دن ڈھل چکا تھا۔ صادق علی مجھ سے پہلے ہی بستر چھوڑ گیا تھا۔ میں کمرے سے نکل کر صحن میں گیا تو دیکھا کہ صادق علی ایک سفید رنگ کی گھوڑی کے آگے گھاس ڈال رہا تھا۔ گھوڑی کی کمر پر زین کسی تھی۔

"بس جناب جیلانی صاحب! گھوڑی آ گئی ہے میں ابھی شہر جانا چاہتا ہوں تاکہ آپ کے دشمنوں کا حال دیکھ آؤں۔"

"ہاں ضرور جاؤ مگر میرے بھی ایک دو کام کرتے آؤ۔ پہلا کام تو یہ ہے کہ تم اس پتے پر میری ماں سے ضرور ملو۔ اس کا نام سلیمہ ہے اور یہ پتہ ہے اس کا۔" یہ کہہ کر میں نے اس سے کاغذ قلم لے کر اس مکان کا پتہ لکھ دیا جہاں وہ اپنی سہیلی کے پاس رہ رہی تھی۔

"اب دوسرا کام بھی بتا دیں؟"

"دوسرا کام یہ ہے کہ اس رقعے کے مطابق تم میری ماں سے جو پچاس ہزار روپیہ لاؤ گے تو اس میں سے میرے لئے میرے ناپ کے مطابق دو جوڑے بوٹ دو سلیپر، تین جوڑے ریڈی میڈ ولائتی سوٹ لاؤ گے۔ چار ڈبے کیپسٹن کے سگریٹ اور دوسری تمام چیزیں جو اس فہرست میں لکھی ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے اسے ایک فہرست دے دی جس میں میں نے لکھا تھا کہ وہ اپنے لئے زینو کے لئے اور میرے لئے ڈھیر سارے عام استعمال کے کپڑے اور دوسری چیزیں خرید کر لائے گا۔ کیونکہ جس بے سروسامانی میں میں مبتلا تھا وہ خدا معلوم کب تک مجھے نرغے میں لئے بیٹھی رہے ـــــ

مستقبل کی غیر یقینی صورتِ حال سے بچنے کے لئے میں نے اپنی ضرورت کی تمام چیزیں اس کے ذریعے شہر سے منگوانے کا بندوبست کیا تھا۔ ویسے بھی اپنے اخراجات کے لئے مجھے خاصی رقم کی ضرورت تھی۔ میں کسی پر بھلا کس طرح انحصار کر سکتا تھا۔ پندرہ ہزار تو ادھر عالیہ کی کار میں رہ گئے تھے۔ صادق علی میری ہدایات کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے اسی شام شہر روانہ ہو گیا ـــــ وہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح مجھے اس حد تک اپنا احسان مند کرے کہ میں پھر کبھی اس کے سامنے سر نہ اٹھا سکوں اور کبھی اس کی اس شیطنت پر اسے سرزنش نہ کروں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو پھر میرا خیال ہے وہ کسی طرح بھی میرے کسی کام نہ آتا۔

وہ رات میں نے بڑے وسوسوں میں گزاری مجھے زینو بتا چکی تھی کہ صادق علی کی طبیعت میں بڑا تلوّن ہے۔ وہ تنکے سے من جاتا ہے اور لاکھوں سے روٹھ جاتا ہے اس نے مجھ سے کئی باتوں میں جھوٹ بھی بولا تھا اپنی عمر اس نے خواہ مخواہ اتنی زیادہ بتائی تھی کہ مجھے اس پر طیش آنے لگتا تھا۔ جب وہ کسی جگہ پڑھاتا ہی نہیں تھا تو کیوں اس نے یہ ڈھونگ رچا رکھا تھا کہ وہ سکول ماسٹر ہے۔ کیوں وہ مجھ سے اس طرح کی بے بنیاد باتوں کے بارے میں غلط بیانی کرتا چلا جاتا ہے اور اب یہ حالت تھی کہ میں نے اسے پچاس ہزار روپے کا امین بنا دیا تھا۔ ماں سے بھی میں نے اس کا تعارف نہایت موثر الفاظ میں کرا دیا تھا۔ وہ میرا رقعہ دیکھے گی وہ بدنصیب عورت، تو اسے فرشتۂ رحمت سمجھے گی۔ اس کے دل سے ابھی بیٹے کے غم کی سل نہ ہٹی تھی کہ اسے بیٹے کے پھانسی کی کوٹھڑی تک جا پہنچنے کا لرزہ خیز منظر دیکھنا پڑا۔ اس پر تو قیامت دوبارہ بیت چکی تھی اور اب جب وہ صادق علی کے ہاتھ میں میرا رقعہ دیکھے گی تو اس پر تو شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ وہ صادق علی کو روپے تو دے دے گی مگر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ صادق علی وہ رقم لے کر میرے پاس واپس بھی آ جائے گا۔ وہ معمولی رقم تو نہیں ہے۔ میں دیر تک بستر کی یخ بستگی میں لیٹا اس سارے معاملے پر غور کرتا رہا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

زینو دوسرے کمرے میں تھی اور وہ ایسی سادہ تھی کہ اس نے کمرے کا دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا۔ مجھ پر وہ یوں اعتماد کر بیٹھی تھی جیسے وہ صدیوں سے جانتی ہو۔ صادق علی نے بھی اس کے معاملے میں مجھ پر بہت اعتبار کیا تھا۔ اپنے کسی دوست کی عزیز ترین متاع جو اس کے گھر میں امانت تھی میرے سپرد کر کے وہ شہر چلا گیا تھا۔ ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں تھا پھر بھی ہم نے ایک دوسرے کو اپنا سمجھ لیا تھا۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں اس کے سوا اور کوئی نہ آتی تھی کہ ہم تینوں ہی زخم خوردہ تھے اپنے حلقے میں ہمارے دشمنوں نے ہمیں خوب خوب اذیتیں پہنچائی تھیں اور اپنے دکھ کے مشترک ہونے کا احساس ہی ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا تھا۔

دوسرا دن بھی پہلے دنوں ایسا بے کیف بے آواز گزر گیا۔ زینو نے مجھے ناشتہ دیا، دوپہر کا کھانا دیا پھر شام سر پر آ گئی تو اس نے بہت عمدہ ساگ اور مکئی کی گھی سے تر بتر روٹیاں میرے آگے رکھ دیں۔ میرے لئے وہ خود گاؤں کی دکان سے کیپسٹن کے چار پیکٹ خرید لائی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ میری خدمت خاطر میں صادق علی کی عدم موجودگی میں اور زیادہ توجہ دے رہی تھی یہ اس کا احسان تھا۔ اس کی مہربانی تھی ورنہ مجھ ایسا بے نوا کہاں جگہ پا سکتا تھا۔ ایسی صورت میں جبکہ سارے صوبے کی پولیس میری تلاش میں ہو گی۔

سارا دن گزر گیا مگر صادق علی نہیں آیا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے چیزیں خریدنے میں اسے کچھ وقت لگ گیا ہو۔ اپنی امید اور انتظار کے چراغ کی لو میں نے دوسرے دن کے طلوع تک اونچی کر دی۔

میرا خیال ہے اس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ جب گھر کی چھوٹی کھڑکی پر ہلکی سی دستک ابھری۔ میں اچھل کر بستر سے اترا۔ بھری ہوئی بندوق ہاتھ میں پکڑ لی اور جلتی لالٹین لے کر میں صحن میں نکل گیا۔ زینو گہری نیند میں تھی اس لئے میں نے اسے اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔

"کون ہے؟" میں نے جمی ہوئی محتاط آواز میں پوچھا ـــــ

"میں ہوں ـــــ میرے بیٹے میں ہوں۔ دروازہ کھول میرے بچے" مجھے اپنی ماں کی آواز سنائی دی۔ رات کے دلگیر سناٹے کو چیرتی ہوئی اس کی درد بھری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں پاگلوں کی طرح کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اور کنڈی کھول کر باہر کود گیا۔ لیمپ اور بندوق صحن میں ہی رہ گئے تھے۔ میری ماں دیوار سے ہٹ کر کھڑی تھی اور صادق سامان کے ڈھیر کے پاس کھڑا تھا۔ گھوڑی کی لگام اس کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ماں نے بانہیں پھیلا دیں۔

فرطِ جذبات سے اس کی چیخیں نکل گئیں۔ میں نے اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتی تھی، زندگی نے اسے اپنی تلخیوں کے سبب موت سے ہمکنار کر رکھا تھا۔ وہ سسک رہی تھی میرے سینے سے لگی بلک رہی تھی کتنے دکھ جھیلے تھے اس نے۔ وہ میری زندگی سے مایوس ہو چکی تھی جب ہی تو میری خیر سن کر وہ صادق علی کے ساتھ ہی چلی آئی تھی۔

"اندر چلیں ماں جی یہاں سردی زیادہ ہے۔"

صادق علی نے اپنی موجودگی کا ہمیں احساس دلایا۔

میں ماں کو بانہوں میں بھر کر کمرے میں لے گیا اور اس کے گرد لحاف لپیٹ کر اسے اطمینان سے بٹھا دیا۔ اتنے میں صادق علی یہ بڑا سا گٹھڑ اور دو بڑے بڑے اٹیچی کیس چیزوں سے بھرے ہوئے اٹھا کر اندر لے آیا۔

"لیں جناب! آپ کی والدہ صاحبہ کو تو میں ساتھ ہی لے آیا ہوں آپ کا نام سن کر یہ صبر نہ کر سکیں ساتھ ہی چل دیں۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا ہے صادق علی! اب میں زیادہ جم کر زندگی کا مقابلہ کر سکوں گا۔ تم نے بڑا احسان کیا ہے مجھ پر۔" یہ کہہ کر میں اپنی ماں کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ہماری باتیں سن کر زینو کی آنکھ کھل گئی۔ وہ فوراً ہی ہمارے کمرے میں آ گئی۔

"لے زینو بہن یہ رہی میری ماں مل لے اس سے، یہ زینو ہے ماں جی، بیچاری نے بڑا خیال رکھا ہے میرا۔"

ماں نے خوش ہو کر زینو کے سر پر محبت سے شفقت سے اور ممتا کے جذبے سے لبریز ہاتھ پھیرا اور اسے قریب بٹھا کر بولی۔

"میرا ایک ہی بیٹا ہے مگر لگتا ہے تو نے اسے بھی مجھ سے پیارا کر رکھا ہے۔" بڑی کسک تھی اس کے ان الفاظ میں۔

"فکر نہ کریں ماں جی یہاں ٹھنڈا لاٹ بھی ابھی ان تک نہیں پہنچ سکتے۔" صادق علی نے کہا وہ اٹیچی کیس کھول رہا تھا۔ اس میں سے اس نے ایک خوبصورت سا ڈبہ نکالا جس میں سے ایک سگار کھینچ کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"لیں صاحب یہ پئیں مجھے امید ہے کہ آپ پسند کریں گے۔" میں نے سگار اس سے لے لیا۔

"شہر کی کہو کیا صورتِ حال ہے کتنے قیدی بھاگے اس رات؟"

"کچھ نہ پوچھیں جناب! بڑی افراتفری مچی ہے وہاں اس رات جیل سے ڈھائی سو قیدی فرار ہو گئے۔ میں آج کا اخبار لایا ہوں۔ پولیس نے ڈیڑھ سو قیدی دوبارہ پکڑ لئے ہیں مگر سو آدمی ابھی تک ہاتھ نہیں آئے اور ان میں چودہ ایسے ہیں جنہیں پھانسی کی سزا سنائی جا چکی تھی۔"

"میرے بارے میں تو کوئی خبر نہیں ہے اخبار میں۔"

"جو فہرست اخبار میں چھپی ہے مفرور قیدیوں کی۔ ان میں آپ کا بھی نام ہے ـــ میں... آپ کی والدہ کو تو کل رات ہی ان کے گھر سے نکال لایا تھا مجھے ڈر تھا کہ پولیس وہاں ضرور چھاپہ مارے گی اور ان کو خواہ مخواہ پریشان کرے گی۔ زینو تم جا کر ذرا دودھ گرم کر لاؤ ماں جی کے لئے۔"

صادق علی نے کہا تو زینو فوراً ہی باہر نکل گئی۔

"وہاں سے نکال کر کہاں رکھا تم نے انہیں؟"

"میں انہیں اپنے ایک دوست کے ہاں لے گیا تھا اکبر میاں میر کے قریب۔ کل سارا دن وہاں رہیں۔ آج میں انہیں اپنے ساتھ لے آیا۔"

"ماں جی آپ میرے ساتھ کہاں ماری ماری پھریں گی؟ میرا تو خیال ہے آپ ادھر سرگودھا میں اپنے بھائی کے پاس چلی جائیں، حاکم علی کے گھر۔"

"اب میرا وہاں کون ہے بیٹے؟ حاکم علی کے پاس میں کیسے رہ سکوں گی اگرچہ وہ مجھے کئی بار کہہ چکا ہے کہ میں اس کے پاس چلی آؤں مگر میرا دل نہیں مانتا۔"

"رہ کیوں نہ سکیں گی۔ میں کل ہی صادق علی کو آپ کے ساتھ بھیجتا ہوں وہ آپ کو وہاں ایک مکان خرید دے گا۔ چاہیں تو آپ الگ رہیں چاہیں تو ماموں جان کے مکان میں رہ لیں۔ صادق علی ایک ملازمہ بھی آپ کو لے دے گا آپ اطمینان سے وہاں رہیں۔ میں تو اب ساری زندگی قانون کے ـــــ شکنجے سے بچنے کے لئے بھاگتا رہوں گا ہو سکتا ہے میں کسی دوسرے ملک میں چلا جاؤں اگر ایسا ہوا تو میں آپ کو وہاں بلوا لوں گا۔"

"ابھی تو میں نہیں جاؤں گی بیٹے۔ تیرے پاس رہوں گی۔" ماں نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔

"میں سخت خطرے میں ہوں ماں جی! آپ نہیں سمجھتی ہیں... میں تنہا ہوں گا تو جدھر چاہوں گا بھاگ لوں گا مگر آپ کا کسی محفوظ جگہ پر رہنا ہی بہتر ہے وہ رقم کہاں ہے جو آپ کو دی تھی میں نے؟"

"وہ میرے پاس ہے جناب! حد ہے اتنی بڑی رقم آپ نے ان کے ہاتھ میں دے دی۔ یہ اس کی کیسے حفاظت کر سکتی ہیں جناب؟ آپ نیا مکان خریدنے کا خیال چھوڑ دیں۔ یہ روپیہ میں کل ہی سرگودھا جا کر ان کے نام سے بینک میں جمع کرا دوں گا۔ یہ خود کرائے کے مکان میں رہیں، ایک چھوکری ملازم رکھ لیں جب ذرا مطلع صاف ہو گا تو دیکھا جائے گا۔"

"ہاں یہی بہتر رہے گا۔ تم بس کل ہی انہیں سرگودھا لے جاؤ یہ بہت ضروری ہے۔"

"آسیہ کا کچھ پتہ چلا بیٹے کہ وہ کہاں ہے؟"

"نہیں ماں جی ابھی تو مجھے اپنی جان کے لالے پڑے ہیں بہر حال اُسے اب لے جلدی ہی ڈھونڈ نکالوں گا۔ دیکھوں گا وہ لوگ کب تک اسے میری آنکھوں سے دُور رکھتے ہیں۔"

"میں نے پہلے ہی کہا تھا بیٹے وہ بڑے طاقت ور لوگ ہیں انہیں مت چھیڑ۔ مگر تو باز نہ آیا اور تیرے بدلے میں وہ میری بیٹی اٹھا کر لے گئے۔" ماں نے بلکتے ہوئے کہا وہ دیکھتے دیکھتے بکھرنے لگی تھی۔ میں نے اسے بڑی مشکلوں سے سنبھالا۔ زینو نے اسے لا کر گرم دودھ پلایا تو اسے ذرا سکون محسوس ہوا۔ تھکی ہاری تو تھی ہی وہ۔ تھوڑی ہی دیر بعد سو گئی۔

صادق علی نے لیمپ کی روشنی میں گٹھری کھول کر تمام چیزیں مجھے دکھائیں وہ نہ اپنے لئے کچھ لایا تھا نہ زینو کے لئے۔

"بہت ہی نکما آدمی ہے تو صادق علی! کیوں نہیں لایا وہ چیزیں جو میں نے کہی تھیں زینو کے لئے اور تمہارے لئے۔"

"نہیں جناب! آپ خود شہر سے یہ چیزیں لائیں گے تو ہم لے لیں گے میں خواہ مخواہ آپ کے مال کو آگ لگاتا پھرتا۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا تھا۔"

صادق علی نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ اس کا رویہ مجھے حیران کئے دیتا تھا میرے لئے وہ میری تمام مطلوبہ چیزیں لے آیا تھا اور وہ سب کی سب بہت ہی عمدہ تھیں۔ اس کے حسین انتخاب سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ایسا بھی گاؤدی نہیں تھا۔ اچھے دن دیکھے ہوئے تھا۔ اس کی لائی ہوئی چیزیں اس کے عمدہ ذوق کی گواہی دیتی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ میرے لئے معمہ بنتا جا رہا تھا۔

وہ بھی اس بات پر بہت متفکر تھا کہ میری والدہ اس کے ہاں آ گئی ہیں اس حال میں کہ میرے سر کی پولیس نے ایک قیمت مقرر کر رکھی تھی۔ اخبار جب میں نے کھول کر پڑھا تو معلوم ہوا کہ وہاں میری تصویر چھپی ہے۔ ان دوسرے تیرہ آدمیوں کے ساتھ جو پھانسی کی کوٹھڑیوں سے فرار ہوئے تھے۔ خبر کی تفصیلات نے مجھے اور زیادہ حیران کر دیا۔ میرے چہرے پر داڑھی تھی اور مونچھیں بھی یہ لمبی لمبی نظر آتی تھیں۔

جیل میں دراصل ان دنوں ایک سیاسی پارٹی کے بیس کے قریب سرکردہ رہنما بند تھے۔ ان میں سے ایک ایسا تھا جس پر ایک سیاسی مخالف کے قتل کا الزام تھا۔ اس مقدمے کا فیصلہ چار دن پہلے سنایا گیا تھا جس میں اس رہنما کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔

اسی کے ایما پر سیاسی پارٹی نے جیل میں ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہنگامہ کرایا۔ آگ لگوائی — قتل و غارت کا بازار وہاں گرم کیا اور ایسے آدمی جیل میں داخل کئے جو پھانسی کی کوٹھڑیوں کے تالے توڑ کر تمام مجرموں کو رہا کروا کر لے گئے۔ مطلب یہ تھا کہ اس رہنما کی جان کے صدقے میں ہم سب کی جانیں بچ گئی تھیں۔

اور اب حکومت نے اعلان کر دیا تھا کہ جو کوئی ان مجرموں کو گرفتار کرانے میں مدد دے گا یا ان کے بارے میں پولیس کو معلومات فراہم کرے گا۔ اسے حکومت بیس ہزار روپے انعام دے گی۔ ہر مجرم کی گرفتاری کا یہ انعام تھا مگر اس رہنما کی گرفتاری کا انعام پچاس ہزار روپے تھا۔ جو کوئی بھی اسے پکڑ کر حکومت کے حوالے کرتا پچاس ہزار روپیہ حاصل کر سکتا تھا اور صادق علی کو میرے بدلے میں بیس ہزار روپے مل سکتے تھے لیکن اس نے سوچا تک نہیں تھا اس کو۔ حالانکہ اسے کچھ بھی نہیں کرنا تھا صرف اپنے گھر کا پتہ کسی تھانیدار کو بتا دینے کی ضرورت تھی۔ بڑے اطمینان سے وہ اتنی بڑی رقم لے سکتا تھا مگر وہ لالچ کی اس سنگلاخ زمین پر سے صحیح سالم گزر آیا تھا اور بہت [illegible] ہو کر بیٹھا تھا میرے سامنے۔

بلا شبہ مجھ پر اس کا یہ بہت بڑا احسان تھا۔ جسے میں کسی طرح بھی فراموش نہ کر سکتا تھا۔ اس کا دوسرا رُخ اتنا روشن تھا کہ میں اس رات تصوّر بھی نہ کر سکتا تھا جس رات میں نے اسے اس بے بس مجبور رعیت کی بے حرمتی کرتے دیکھا تھا۔ جب کبھی وہ میری آنکھوں میں رات کے منظر کو منعکس دیکھتا تھا لرز جاتا تھا — وہ مجھ سے بہت زیادہ خوف زدہ ہو چکا تھا اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بڑی سے بڑی تکلیف اٹھانے پر کمر بستہ رہتا تھا۔ اس کی یہی خوبی مجھے اس کے قریب کرتی چلی گئی۔

صبح منہ اندھیرے میری آنکھ کھل گئی تو میں نے دیکھا کہ ماں اپنے بستر میں موجود نہیں تھی۔ میں تو اچھل کر بستر سے اتر گیا اور ننگے پاؤں دوسرے کمرے کی طرف لپکا وہاں زینو بھی موجود نہ تھی۔ میرا تو کلیجہ دہل گیا۔ میں اسی حالت میں باورچی خانے کی طرف بھاگا۔ وہاں لالٹین جل رہی تھی۔ تیرا شکر ہے خدایا، زینو اور میری ماں دونوں قالین کی خوبصورت سی جا نماز پر بیٹھی نماز پڑھ رہی تھیں — ان دونوں کو خدا کے حضور میں سجدہ ریز دیکھ کر میرا دل خوش ہو گیا۔ میں سمجھا کہ ابھی نہ تو انسان ہی خدا کی رحمت سے ناامید ہوا ہے اور نہ ابھی خدا انسان کی فطری نیکی سے مایوس ہوا ہے۔ ابھی دونوں طرف امید و خیر و برکت کے چراغ روشن ہیں۔

میں چپ چاپ وہاں سے ہٹ آیا اور خود بھی وضو کر کے خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ میری بے بسی مجھے یہی احساس دلاتی رہتی ہے کہ بندے کے سامنے اکڑ کر چلنے والے سرکش جیلانی جھک جا خدا کے سامنے جھک جا کہ اس کے آگے تیری کوئی پیش نہیں چل سکتی۔

جب میں نے سلام پھیرا تو دیکھا کہ صادق علی جاگ چکا ہے۔ وہ سر اٹھا اٹھا کر یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا اور حیرت زدہ سا نظر آتا تھا۔ دعا مانگ کر میں پھر بستر میں گھس گیا تو وہ بولا۔

"جناب! آپ کے لئے میں گولڈ لیف کے بھی سگریٹ لایا تھا کہیں تو حاضر کروں؟"

"لا یار جلا دے گولڈ لیف بھی۔ دیکھیں ابھی زندگی کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔"

صادق علی بولا۔ "آپ تو سو گئے تھے مگر میں نہ سو سکا۔۔۔ ماں جی کی بھی کچھ ہی دیر بعد آنکھ کھل گئی تھی۔ ان سے جو میری باتیں ہوئیں تو ان کے مطابق طے یہ پایا ہے کہ میں آج ماں جی کو سرگودھا لے جا کر آپ کے ماموں کے ہاں ٹھہرا دوں گا پھر ہم دونوں آپ کی بہن کو تلاش کریں گے اور جب وہ مل جائے تو پھر ہم پانچوں یہ ملک چھوڑ دیں گے۔"

"ہاں صادق علی۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ یہی تجویز بہتر رہے گی تم ماں جی کو آج ہی لے جاؤ یہاں سے — میں بھی شاید دو چار روز میں یہاں سے ٹل جاؤں گا مجھے ایک جگہ جم کر نہیں بیٹھنا چاہئے۔"

"نہیں۔ ہم یہیں رہیں گے جناب! اور آپ بھی۔ بس باہر نہ نکلیں آپ۔ ہاتھ پیر کھلنے کے لئے آپ صبح و شام ورزش کر لیا کریں۔"

"دیکھیں گے کیا کرنا چاہئے ہمیں۔ ابھی تو تم ماں جی کو لے جاؤ یہاں سے۔" میں نے بات کو مختصر کر دیا۔

اسی دن صادق علی گھوڑی پر بٹھا کر ماں جی کو شہر لے گیا — میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ گھوڑی راستے میں کسی کے پاس چھوڑ دے اور بس یا ٹیکسی میں بیٹھ کر شہر چلا جائے — ڈیڑھ لاکھ روپیہ بھی میں نے ماں جی کے پاس ہی رہنے دیا تھا اور صادق علی کو میں نے سمجھا دیا کہ وہ ان کے نام سے روپیہ بینک میں جمع کرا دے یہی بہتر تھا۔ ان کی طرف سے مجھے پوری طرح مطمئن ہونے کی ضرورت تھی کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ زندگی مجھے کن کن ویرانوں میں لئے پھرے گی۔ میرا تو اب کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ چاہتا تو وہ صادق علی ہی مجھے بیس ہزار روپے میں بیچ سکتا تھا۔ اگر وہ نہ چاہتا تو اور لاکھوں آنکھیں تھیں جو مجھے اس تصویر کے حوالے سے پہچان سکتی تھیں مجھے تو کسی بھی قدم پر موت نرغے میں لے سکتی تھی۔ ایسے میں میں ماں جی کو کیوں خواہ مخواہ اپنے ساتھ بدحال کئے رکھتا۔

صادق علی گھر سے چھ دن باہر رہا — اس عرصے میں مجھ پر ایک اور قیامت گزر گئی۔ زینو بیچاری جی جان سے میری خدمت میں لگی رہتی تھی اور میں بہت خوش تھا کہ اس نے مجھے وہاں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دی تھی — میرا دن ایک ہی کمرے پر میل رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں پہلے ایسا چاق و چوبند نہیں رہا تھا۔ طبیعت میں آلکسی سی بھر گئی تھی۔ میں سارا سارا دن گھر میں پڑا رہتا تھا۔ صادق علی نے کچھ کتابیں ایک الماری میں بھر رکھی تھیں میں ان سے دل بہلاتا تھا۔ وہ اچھی، صاف ستھرے ذوق کی آئینہ دار کتابیں تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ صادق علی خاصا۔۔۔ پڑھا لکھا آدمی ہے مگر وہ اس قعرِ مذلت میں کیونکر گر گیا کس نے اسے ذلت کے اس انتہائی مکروہ گڑھے میں گرا دیا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کی شخصیت کا یہ تاریک پہلو کسی طور بھی روشنی میں نہیں آتا تھا۔

بہت دنوں سے میں اس سوال پر سر کھپا رہا تھا مگر جب اس کا کوئی حل مجھے نہ ملا تو میں چپ رہا۔ اس دوران زینو کی ایک سہیلی نوراں بیمار ہو گئی۔ وہ ساتھ کی گلی میں رہتی تھی۔ صادق علی کو اس روز گھر سے گئے ہوئے دو دن ہو چکے تھے۔ شام کو معلوم ہوا کہ زینو کی سہیلی کچھ زیادہ ہی بیمار ہے — گاؤں کا حکیم جواب دے گیا تھا۔

چوتھے روز ایک ڈاکٹر کو بلایا گیا دالش سے۔ وہ بھی اپنی سی کوشش کر گیا مگر نوراں کو کسی طرح بھی آرام نہیں آیا اور جب صادق علی کو گھر سے گئے پانچ روز ہو گئے تو چھٹے دن کی صبح کو مجھے معلوم ہوا کہ نوراں مر گئی ہے وہ گاؤں کے چوہدری نیاز احمد کی بیٹی تھی۔ مجھے شدید افسوس ہوا کسی کا یوں عین عالمِ شباب میں اس دنیا سے منہ موڑ جانا زندگی کے منہ پر ایک ہولناک طمانچے کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرا دل اور زیادہ بجھ گیا۔ زینو پر اس کی موت کا اتنا گہرا صدمہ ہوا کہ وہ کتنے گھنٹے کمرے میں بیٹھی مسلسل روتی رہی۔ ایک ہی تو سہیلی بنائی تھی اس نے کمال پور میں اور وہ بھی موت نے اس سے چھین لی —

اسی دوپہر صادق علی واپس آ گیا۔ اس وقت میں صحن میں بیٹھا تھا وہ بھی میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا — لگتا تھا وہ بہت تھکا ہوا ہے عجیب سی مُردنی طاری تھی اس کے چہرے پر۔

مجھے اس نے بڑے ہی مختصر لفظوں میں بتایا کہ میری ماں کو وہ میرے ماموں حاکم علی کے گھر پر چھوڑ آیا ہے۔ وہ لوگ اسے وہاں دیکھ کر بے حد خوش ہوئے تھے پھر اس نے بینک کی رسیدیں بھی دکھائیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ اس نے ماں کے نام سے اکاؤنٹ کھول کر سارا روپیہ بینک میں جمع کرا دیا تھا اور اب ماں جی کی طبیعت بڑی حد تک بہل گئی تھی۔ ماموں اس کی بہت ڈھارس بندھاتے تھے ان کی یہ باتیں سن کر میں بے فکر ہو گیا۔

کچھ ہی دیر صادق علی میرے پاس بیٹھا اور پھر وہ اپنے کمرے میں جا گھسا۔ اور کتنی ہی دیر تک وہ وہاں دروازہ بند کر کے اندر بیٹھا رہا۔ میں سمجھا کہ وہ لباس تبدیل کر رہا ہے مگر جب کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی اور وہ باہر نہ آیا تو میں گھبرا کر اس کے کمرے کی طرف لپکا۔ دروازہ اندر سے بند دیکھ کر میں نے دستک دی تو دوسرے کمرے کے دروازے سے زینو تیزی سے باہر آئی۔

"جیلانی بھائی دیکھیں تو ماسٹر صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔" اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ میں بھاگ کر دوسرے دروازے کی راہ سے اس کے کمرے میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ صادق علی کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں منہ سے جھاگ چھوٹ رہے تھے اور دونوں ہاتھ اس کے ٹیڑھے ہو چکے تھے اور اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔

"یہ کیا ہو گیا ہے اسے؟" میں نے اپنی حیرت دباتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں چلتا ہے بھائی صاحب کبھی کبھی ان پر بڑا سخت دورہ پڑتا ہے اور ہر بار ان کی حالت ایسی ہی ہو جاتی ہے۔" وہ بہت خوف زدہ ہو رہی تھی —

"پھر آرام کس طرح آتا ہے کوئی دوا وغیرہ تو دیتے ہو گے تم لوگ؟"

"اوہ ہاں یاد آیا۔ ٹکیے رکھے ہیں گھر میں۔ وہ ...... وہ جو تھا نیند کا۔"

ہیں نا وہ لاکر سے گئے تھے۔ وہ ٹیکہ لگانے سے انہیں نیند آ جاتی ہے اور پھر یہ آپ ہی آپ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے کی طرف جاتی اور ایک الماری کا تالا کھول کر وہاں سے وہ ایک ڈبہ نکال لائی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں چھوٹے چھوٹے تو ٹیکے رکھے تھے۔ ایک پیکٹ میں۔ وہاں سرنج بھی تھی اور سوئیاں بھی۔ ایک شیشی میں سپرٹ بھی دھری تھی۔ گویا اس ٹیکے کا سارا انتظام وہاں موجود تھا اور زینو جانتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے ——— اس نے فوراً ایک برتن میں سرنج اور سوئیاں گرم کیں پھر وہ سب کچھ لا کر اس نے میرے سامنے رکھ دیا۔

"آپ ٹیکہ لگالیں گے؟"

"کوشش کرتا ہوں۔"

"نہیں تھانیدار صاحب نے مجھے سکھا دیا تھا یہ کام — مجھے گھبراہٹ میں یاد ہی نہ رہا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ میں خود ٹیکہ لگالوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے جوں توں کر کے ٹیکہ بھرا اور پھر اس نے مجھے کہا کہ میں صادق علی کی نس ابھاروں۔ یہ کچھ زیادہ مشکل کام نہ تھا۔ جونہی میں نے اس کا بازو دبایا نس ابھر آئی اور اس میں زینو نے اطمینان سے ٹیکہ لگا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صادق علی فوراً ہی پُرسکون ہو گیا۔ وہ جو اس کے گلے سے اس کتے جیسی آواز نکلتی تھی جس کے گلے میں ہڈی پھنسی ہو وہ آواز بند ہو گئی۔ اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہو گئی تھیں۔ میں نے اس کے بوٹ اتارے پھر کوٹ بھی اتار دیا۔ وہ بالکل بے سُدھ پڑا تھا۔ زینو نے اس پر لحاف ڈال دیا یوں جیسے کوئی پرانے مُردے پر مٹی ڈالتا ہے۔

کہنے لگی: "اب انہیں سونے دیں۔ جب اٹھیں گے تو آپ ہی ٹھیک نظر آئیں گے۔ یہی علاج ہے ان کا۔"

میرا پلنگ اس سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا میں نے دل میں کہا "بدبخت! تو اتنے اہم سفر سے واپس آیا ہے لعنتی آدمی تو مجھے ذرا تفصیل سے بتا تو سہی کہ میری ماں کس حال میں ہے؟ وہ وہاں مطمئن بھی ہے کہ نہیں اس کے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ چھ دن بعد تو نے اپنا بُرتھا آن دکھایا ہے برص زدہ منحوس شیطان ملعون کی شبیہ ایسا۔ تو یہ تو مجھے بتا کہ تو کر کے کیا آیا ہے ——" مگر نہیں صاحب وہ تو آتے ہی زہر خوردہ کتے کی طرح منہ کھول کر بے سُدھ ہو گیا تھا ——

وہ تو اچھا ہوا کہ زینو اس کی دوا جانتی تھی ورنہ تو میرا خیال تھا کہ وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوتا۔

اس رات زینو نے جوں توں کر کے مجھے کھانا پکا کر دیا تو سہی —— مگر اس طرح کہ اس کے چولہے کا دھواں گھر کی چھت سے باہر نہ نکلا کیونکہ اس کی سہیلی اس دن دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔

جنازہ شام ڈھلتے ہی اٹھ گیا اور اس کے ساتھ جو وہاں ....

چیخ و پکار اٹھی اس کی کاٹ کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لگتا تھا سارا جہان سوگوار ہے فریاد کناں ہے۔ گاؤں کی فضا میں ایسا اندوہ رچ گیا تھا کہ زندگی سینے پر بوجھ محسوس ہو رہی تھی۔

زینو کا حال اور زیادہ قابلِ رحم تھا۔

مجھے تمام رات نیند نہ آئی۔ میں نوراں کے جنازے میں بھی نہ گیا مجھے جانا بھی نہیں چاہئے تھا۔ اپنا چہرہ تو ان دنوں میں آئینے سے بھی چھپاتا پھرتا تھا۔ اسی لئے میں گھر میں بیٹھا رہا۔

زینو نوراں کے گھر سے رات گیارہ بجے واپس آئی اور چپ چاپ کمرے میں پڑ کر سو رہی اور میں لحاف میں پڑا سگریٹ پھونکتا رہا۔ پھر جب میں سویا تو یہ اندازہ ہی نہ رہا کہ رات کتنی بیت چکی ہے۔

اور پھر اچانک کسی نے مجھے جھنجوڑ ڈالا۔

"بھائی صاحب! بھائی صاحب!" یہ زینو کی آواز تھی۔

"کیا بات ہے زینو! خیر تو ہے کیا ہوا تجھے؟"

"وہ..... وہ..... ماسٹر صاحب باہر چلے گئے ہیں۔ پاگل ہو گئے ہیں وہ۔ میں انہیں بہت روکتی رہی مگر انہوں نے مجھے مار پیٹ کر دھکیل دیا ہے وہ..... وہ..... اپنا بیلچہ بھی ساتھ لے گئے ہیں۔"

"بیلچہ بھی ساتھ لے گیا ہے وہ بدبخت" میرا دماغ چکرانے لگا۔ "میرے اللہ" میں بڑی مشکلوں سے پلنگ پر سے نیچے اترا۔ لگتا تھا کمر ٹوٹ گئی ہے۔

"کتنی دیر ہوئی ہے اسے گئے ہوئے؟"

"کوئی ایک گھنٹہ ہو گیا ہو گا۔"

"ایک گھنٹہ؟ تم نے مجھے فوراً کیوں نہ بتایا؟"

"میں ڈرتی تھی آپ کی نیند خراب ہو گی مگر اب ڈرتی ہوں وہ کہیں نہر میں نہ جا گریں۔ راجباہ بھی بھرا ہوتا ہے آج کل۔"

"اچھا تم آرام سے بیٹھو میں لاتا ہوں اس حرامزادے کو واپس۔ اگر زندہ نہ آیا تو مُردہ تو میں اسے ضرور ہی لاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں نے بندوق بھر کر کندھے سے لٹکائی اور گولیوں سے بھری پیٹی ہاتھ میں پکڑ لی —— صادق علی میرے لئے ایک موٹا سا خوبصورت اوورکوٹ ایک اونی ٹوپی اور مفلر لے کر آیا تھا۔ وہ سب چیزیں میں نے پہن لیں تاکہ سردی سے بچ سکوں —— ان سب چیزوں کے اوپر میں نے کمبل لپیٹ لیا اور تیزی سے اس طرف کو چل دیا جدھر وہ شیطان گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ قبرستان ہی کی طرف گیا ہو گا ——

*

میرے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دوسرے ہاتھ میں بندوق —— گولیوں کی پیٹی میں نے اوورکوٹ کے نیچے کندھے پر ڈال لی تھی۔ لگتا تھا کہ بہت دیر ہو گئی ہے —— کاش زینو نے مجھے فوراً ہی جگا دیا ہوتا۔ ٹارچ کی روشنی میں میرے لئے راستہ تلاش کرنا آسان ہو گیا۔

میری رفتار خاصی تیز تھی پھر بھی مجھے قبرستان پہنچتے پہنچتے آدھا گھنٹہ لگ ہی گیا۔

مجھے واقعی بہت دیر ہو چکی تھی مگر اس حساب سے کہ صادق علی کا سر کچلنے کے لئے اور اس کے اگلے پچھلے تمام گناہوں کا حساب لینے کے لئے خدا نے پہلے ہی وہاں بڑا خوفناک انتظام کر دیا تھا۔

میں جب قبرستان پہنچا تو میری ٹارچ کی روشنی کو دیکھ کر کسی نے دُور سے کہا۔

"کون ہے؟" آواز خاصی تلخ تھی۔

"میں ایک مسافر ہوں بھائیو۔"

"اچھا تو گزر جا۔" یہ جواب سن کر میں چپ چاپ ان لوگوں کی طرف بڑھا۔ ٹارچ میں نے جلا رکھی تھی۔ اب جو سامنے دیکھتا ہوں تو مجھے صادق علی سامنے ایک درخت سے بندھا نظر آیا۔ دو آدمی اس کے سامنے کھڑے تھے —— صادق علی کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا اس کے بدن پر صرف ایک کرتہ تھا —— اس کے بال چہرے پر اس طرح بکھرے تھے کہ وہ بھوت معلوم ہوتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چلایا۔ "خدا کے لئے مجھے بچاؤ میرے بھائی مجھے بچالو۔" اس کے ساتھ ہی اس کا سر نیچے ڈھلک گیا۔ وہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی خوفناک منظر سے ہٹا کر ان آدمیوں کے چہروں پر ڈالی ان میں سے ایک آدمی بالکل جوان تھا یہی کوئی بیس پچیس سال کا اور دوسرا ادھیڑ عمر کا تھا جوان کے ہاتھ میں برچھی تھی۔ وہ دونوں چہروں سے اس قدر خونخوار نظر آ رہے تھے جیسے صادق علی کو ابھی چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے۔

"بند کرو یہ روشنی اور اپنی راہ لو۔ بھاگو یہاں سے ورنہ برچھی میں پرو دوں گا تمہیں" اس جوان نے نہایت ہی لرزہ خیز لہجے میں کہا۔ میں نے ٹارچ کا رخ دوسری طرف کر دیا۔

اُف میرے اللہ —— وہ بہت ہی بھیانک منظر تھا۔ ایک قبر تازہ کھدی نظر آتی تھی اور اس کے ایک طرف ہموار جگہ پر ایک کفن پوش میت پڑی نظر آتی تھی۔ اس میت کا چہرہ کھلا تھا اور بال دُور دُور تک پھیلے تھے۔ کفن جگہ جگہ سے اپنی گرہوں میں سے کھسکا نظر آتا تھا۔ ساری کہانی میری سمجھ میں آ گئی تھی۔

اچانک کسی نے پیچھے سے آ کر میرے دائیں ہاتھ پر کچھ اس طرح زبردست انداز میں لاٹھی ماری کہ بندوق میرے ہاتھ سے گر کر دُور جا پڑی۔ میں دشمن کے دوسرے وار کا اندازہ کر کے ایک دم اچھلا اور دائیں طرف ہٹ گیا۔ حملہ آور کی لاٹھی زمین پر لگی تو اس کے ساتھ ہی میں نے آگے جھک کر وہ لاٹھی ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے چھین لی۔

اس عرصے میں دوسرے آدمی نے بھاگ کر مجھ سے ذرا فاصلے پر پڑی میری بندوق اٹھالی۔ وہ ادھیڑ سا آدمی نظر آیا۔ اس نے بڑی مہارت سے بندوق کھول کر یہ دیکھا کہ اس میں گولی ہے کہ نہیں۔

جب اسے معلوم ہو گیا کہ بندوق بھری ہوئی ہے تو وہ بولا۔

"بہتر یہ ہے کہ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔"

"مگر میرا قصور کیا ہے؟ میری یہ بندوق تو مجھے دے دو۔"

"بندوق کو بھول جاؤ اور یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ —— ورنہ اچھا نہ ہو گا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

اس کی یہ بات سن کر میں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ میں وہاں سے ٹل جاؤں۔ میں سمجھ چکا تھا کہ صادق علی ان پر کیا ستم توڑ چکا تھا۔

میں نے ٹارچ بجھائی اور چپ چاپ وہاں سے ہٹ کر دوسری طرف چل دیا میرے قدم اتنے تیز تھے کہ چند ساعتوں میں میں ان کی آواز کی حد سے باہر نکل گیا مگر میں ابھی تک قبرستان میں تھا۔

میں صادق علی کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر بازی میرے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ بندوق بھی ان کے پاس تھی اور صادق علی بھی ان کی گرفت میں تھا۔ اچانک مجھے گاؤں کی طرف سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں ٹھٹک گیا اور دوسری طرف چل دیا تاکہ میں چکر کاٹ کر اُن لوگوں کے پاس جا پہنچوں جس جگہ وہ دونوں آدمی کھڑے تھے۔ ان سے کوئی دس فٹ دور ایک باڑ سی تھی سرکنڈے کی۔ میں قبرستان کی دوسری طرف سے نکل کر آہستہ آہستہ وہاں جا پہنچا۔ کتوں کی آوازیں اب قریب آتی جا رہی تھیں۔ میں بڑے غور سے ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا مگر وہاں اندھیرا اتنا تھا کہ مجھے صحیح صورتِ حال نظر نہیں آتی تھی۔

"چوہدری جی! اسے گولی مار دیں۔ اس شیطان کا اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں ہے۔"

"نہیں منیرے! گولی سے مرا تو کیا مرا —— دیکھ تو وہ کریم آگیا ہے کہ نہیں۔"

"تو کیا کریں گے آپ؟ کتے چھوڑیں گے اس پر چوہدری جی؟"

"ہاں! میں اسے بار بار موت کے گھاٹ اتاروں تو بھی میرا بدلہ نہیں چکتا ہے منیرے! اس ویرانے میں پڑی میری بیٹی نوراں کو اس حرامزادے نے ذلیل کیا ہے۔ میں اسے تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔" اس کی آواز ایسی تھی جیسے کسی زخم سے مَس ہو کر نکل رہی ہو۔ لہجہ اس کا بہت بھیگا ہوا بہت گلوگیر تھا —— ایک تو جوان بیٹی کی موت نے اسے نڈھال کر رکھا تھا اس پر اس کی یہ ذلت دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ بلاشبہ صادق علی بدترین سزا کا مستحق تھا۔

کتوں کی آواز اب اور زیادہ قریب آ گئی تھی۔ وہ آدمی جو انہیں ساتھ لئے آتا تھا لالٹین اٹھائے ہوئے تھا —— وہ دونوں بہت خونخوار کتے تھے —— اور ان چوہدریوں نے خاص طور پر اپنی بڑی حویلی کے پہرے کے لئے پالے ہوئے تھے۔

صادق علی چیخنے لگا ——

"مجھے معاف کر دو چوہدری جی! خدا رسولؐ کا واسطہ ہے۔ مجھے معاف کر دو۔"

صادق علی کے تمام حواس پوری طرح بیدار ہو گئے تھے۔ اگر اس پر ٹیکے کا اثر تھا۔ یا بیماری کا دورہ تھا تو وہ اب اس سے گزر گیا تھا اب وہ پوری طرح ہوش میں تھا اور اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اس کا انجام کس قدر ہولناک ہو گا۔ وہ درخت سے یوں بندھا تھا کہ اس کا کوئی ہاتھ بھی آزاد نہیں تھا۔

اور ـــ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں ـــ بندوق میرے ہاتھ سے نکل چکی تھی اور صادق علی کے جرائم ایسے تھے کہ اس کی دعا بھی بے اثر ہو چکی تھی۔

کریم ان کے قریب پہنچا تو چوہدری نے انہیں عجیب انداز سے ہشکارا۔ کتے ایک دم خوفناک انداز سے بھونکے ـــ لالٹین کی روشنی میں مجھے صادق علی کا فق ہوتا چہرہ اور زیادہ بے نور ہوتا نظر آیا ـــ میرا سارا بدن پسینے سے بھیگ گیا۔ چوہدری کے چہرے پر ایسا لرزہ خیز عزم ابھر رہا تھا کہ بایدوشاید۔

اور پھر اچانک قبر سے باہر پڑی اپنی بیٹی کی میت پر اس کی نظر جا پڑی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بولا ـــ

"میری نُوراں کو تو پردے میں بٹھا دو پہلے۔ اس ابلیس کی نظر سے اسے بچا لو۔"

اس کی یہ بات سن کر کریم نے کتوں کو کھینچ کر ایک درخت سے باندھا اور پھر ان تینوں نے مل کر نوراں کو قبر میں اتار دیا۔ چند ہی منٹ بعد وہ تختے جوڑ کر قبر کو پہلے کی طرح تیار کر چکے تھے۔

"اب چھوڑ دے گاچی اور ٹیل کو اس بدبخت پر۔" چوہدری نے لالٹین اونچی کر کے صادق علی کے منہ پر تھوک دیا۔

اس کی یہ بات سنتے ہی کریم نے وہ خونخوار کتے کھول دیئے۔ چوہدری نے صادق علی کے بالوں کا ایک گچھا کھینچ کر توڑا۔ ساتھ ہی کچھ جلد بھی کھنچی چلی آئی۔ وہ بال اس نے گاچی اور ٹیل کو سنگھائے۔ پھر چوہدری نے ٹیل اور گاچی کی گردن تھپتھپائی تو وہ دونوں کتے چیتوں کی طرح اچھل کر صادق علی پر پل پڑے۔

پہلے ہی ہلے میں گاچی نے بڑی پھرتی سے صادق علی کی گردن پر منہ مار کر اس کا نرخرہ توڑ دیا۔ دوسرے نے اس کے پیٹ پر اپنے دانت گاڑ دیئے اور صادق علی کی آنتیں اس کے پاؤں میں ڈھیر ہو گئیں۔ وہ بہت ہی کریہہ اور لرزہ خیز منظر تھا۔ کتے مسلسل اسے بھنبھوڑ رہے تھے۔ ان دونوں نے اس کی بوٹیاں نوچ لیں اور یہ سب کچھ دس منٹ میں ختم ہو گیا۔ وہاں.... صادق علی کے بجائے ایک ٹوٹا پھوٹا ڈھانچہ ہی باقی رہ گیا تھا ـــ اور میں وہاں باڑھ کے ساتھ لگا بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک لفظ نہ کہہ سکا ایک انگلی نہ اٹھا سکا۔ بلاشبہ وہ آدمیوں کی بدترین قسم کی نمائندگی کرتا تھا وہ صادق علی ـــ

اسفل السافلین کی بات خدا نے شاید ایسے ہی لوگوں کے لئے کہی تھی جو یوں کتوں کے منہ کا نوالہ بن جانا بھی تو بڑا عبرتناک ہوتا ہے۔ صادق علی کے لئے خدا نے بدترین سزا تجویز کر دی تھی ـــ ایسی سزا جس کا اب بھی مجھے خیال آ جاتا ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

صادق علی کی روح تو اس کے قفسِ عنصری سے کتوں کے پہلے حملے میں پرواز کر گئی تھی۔ باقی سارا تماشا تو اس کی لاش سے ... ان کی وہ ترنگ میں ڈوبی ہوئی بنخ بنخ میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ قبرستان میں ادھر ادھر چاروں طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔

لالٹین کی اس روشنی کے دائرے میں وہ وحشیانہ کھیل جاری رہا۔ اس کے بعد کریم نے کتوں کو للکارا۔ وہ فوراً پلٹ گئے ... نے انہیں زنجیروں میں باندھ لیا تو منیر نے صادق علی کے ڈھانچے کے جسم کے گرد بندھا رسا کھول دیا۔ اس کی وہ کٹی پھٹی، ٹوٹی پھوٹی ... دھڑام سے نیچے جا گری۔ چوہدری کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو جاری تھے۔ گلے میں پڑی پگڑی سے اس نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور پھر نوراں کی قبر پر جھک کر اس نے ڈھیری کو بوسہ دیا۔ جس کے نیچے اس کی مظلوم و بے بس بیٹی ہمیشہ کے لئے دب گئی تھی۔

پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ منیر نے اسے سنبھالا دیا اور وہ وہاں سے چپ چاپ چل دیئے۔ مجھے یقین ہے صادق علی کی اس اذیت ناک موت کا انہیں بھی گہرا دکھ تھا۔ ڈھارس ان کی اگر بندھی تھی تو شاید یہ سوچ کر کہ انہوں نے دنیا کے بدترین آدمی سے تھوڑا سا انصاف کر دیا تھا۔

میں بھی ان سے کچھ فاصلہ رکھ کر گاؤں کی طرف چل دیا۔ وہ بالکل خاموش تھے۔ کوئی بات نہ کرتے تھے مگر کچھ ہی دیر بعد اس سناٹے سے گھبرا کر کریم بولا۔ "چوہدری جی! آپ یہاں دوبارہ کس لئے آئے تھے؟"

"مجھے تو نوراں کے بغیر گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا کریم ... سو جا میں یہ رات اپنی بیٹی کے پاس گزار دیتا ہوں اسی بربادیوں کے ... میں میری بیٹی کی یہ پہلی رات ہے۔ وہ تنہا ہے گھبراتی ہوگی۔ اسی لئے منیر پُتر کو لے کر یہاں آ گیا مگر نوراں کی قبر کے قریب پہنچ کر میں سُن ہو کر رہ گیا.....

ہم سے بھی زیادہ مظلوم کوئی ہو گا کریم پُتر! مگر یاد رکھو کہ اس واقعے کا زندگی بھر تم دونوں ذکر نہیں کرو گے ورنہ ہم تباہ ہو جائیں گے۔" اس نے اپنے دونوں نوکروں کو اپنے دبدبے کے تمام تر تحکم سے خبردار کیا۔

"نہیں چوہدری جی ہم آپ کے حکم کے غلام ہیں۔ نوراں ہماری بہن سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ صادق علی کے تو منہ میں موتنا چاہئے تھا۔ ایسا ذلیل آدمی تھا وہ۔"

اس وقت وہ لوگ قبرستان سے ڈیڑھ میل دور جا چکے تھے۔ گاؤں کے ایک کھیت کے قریب پہنچ کر چوہدری بولا۔

"تم چلتے جاؤ۔ میں ادھر کھیت میں بیٹھوں ذرا دیر کے لئے۔ میرے پیٹ میں گڑبڑ ہے کچھ۔"

"اچھا چوہدری جی ہم آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔"

دونوں آدمی آگے نکل گئے تو چوہدری بندوق کی ٹیک لگا کر کھیت کے کنارے بیٹھ گیا۔ وہ گندم کے ڈیڑھ دو ہاتھ اونچے پودوں کی اوٹ میں تھا۔ میں کھیت میں دبے پاؤں چلتا اس کے پیچھے جا پہنچا اور پھر جونہی میں نے اس کی گردن کی رگ مل دی۔ وہ بیچارا وہیں لڑھک گیا۔ میں بندوق اس کے ہاتھ سے چھین کر تیزی سے پیچھے ہٹا۔ اور قبرستان کی طرف بھاگا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ صبح ہونے تک جنگلی جانور صادق علی کی لاش کے بچے کھچے حصے بھی چٹ کر جائیں گے۔ وہ قبرستان میں پڑا تھا جہاں ایسے جانوروں کی بہتات ہوتی ہے۔

میں جب اس کے قریب پہنچا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس کی لاش کو اپنی جگہ سے گھسیٹا گیا ہے۔ زمین پر اس کے گھسیٹنے کے نشان موجود تھے اس کا مطلب یہ تھا جانور اپنا کام شروع کر چکے تھے۔

میں نے چاروں طرف گھما کر ٹارچ کی روشنی پھینکی تو مجھے ایک ایسی قبر نظر آئی جو نیچے بیٹھ چکی تھی۔ گو خاصا گہرا دکھائی دیتا تھا میں نے صادق علی کی لاش گھسیٹ کر اس گڑھے میں پھینک دی۔ دھڑام جیسی آواز پیدا ہوئی۔ کچھ کڑ کڑ کو بھی مجھے سنائی دی۔ صادق علی پورا اندر دھنس چکا تھا ـــ نوراں کی قبر سے ذرا دور صادق علی کا بیلچہ پڑا تھا۔ میں نے وہ اٹھایا اور تیزی سے اس گڑھے میں مٹی ڈالنے لگا۔ جس میں صادق علی کو میں نے پھینکا تھا۔ قبرستان کی مٹی ویسے ہی خاک دھول ایسی نرم بن چکی ہوتی ہے۔ جلدی ہی میں نے وہ گڑھا مٹی سے بھر دیا۔ اب صادق علی کی لاش محفوظ ہو گئی تھی جنگلی جانور اب اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں تیز تیز قدم اٹھاتا گاؤں کی طرف چل دیا میرے ذہن میں عجیب سی اذیت کا احساس ابھر رہا تھا۔ صادق علی اپنی جگہ جو کچھ بھی تھا قابلِ نفرت تھا مگر میرے لئے وہ بہت اچھا تھا۔ مجھے اس نے اس کوٹھڑی اپنے گھر میں پناہ دی تھی جب آسمان بھی میری پرسش نہیں کرتا تھا اور موت ہر طرف میرے تعاقب میں پھر رہی تھی اگرچہ میں اس وقت بھی قانون کے لمبے ہاتھ سے دور نہیں تھا اور مجھے یہی دھڑکا لگا تھا کہ مجھے کسی بھی لمحے وہ لوگ پکڑ لیں گے۔ پھر بھی صادق علی کی وجہ سے میں ذہنی طور پر بہت پرسکون تھا اس نے بالکل بھائیوں ایسا سلوک کیا تھا مجھ سے اور میرا یہ حال تھا کہ میں نے اپنے سامنے اسے بدترین موت سے ہمکنار ہونے دیا۔ اس کو بچانے کے لئے میں ایک انگلی بھی نہ اٹھا سکا تھا۔

نیزے کی انی ایسا تیز دھار پچھتاوا میرے دل کو کاٹتا چلا جا رہا تھا آدمی کتنے ناقابلِ فہم تضادات کی پوٹ ہے اس بات کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ شاید میں یہی چاہتا تھا کہ کوئی مضبوط مگر بے رحم ہاتھ اسے ایسی سزا دے کہ تمام مظلوم و بے بس عورتوں کا بدلہ اُتر سکے۔

لاشعور میں یہ خواہش موجود ہو گی جب ہی تو میں نے اسے چپ چاپ مرنے دیا۔ یا پھر عین ممکن ہے کہ مجھے اپنی ہی جان اتنی عزیز ہو کہ میں صادق علی کے لئے اسے کسی خطرے میں ڈالنے پر آمادہ نہیں تھا۔

حالات جو کچھ بھی تھے وہ بالکل میرے سامنے تھے۔ پھر بھی میں صادق علی کے لئے کچھ نہ کر سکنے پر بہت شرمندہ تھا۔ میرا دل مجھے برابر ملامت کئے جاتا تھا اور میں سوچ سوچ کر پاگل ہوا جاتا تھا کہ زینو کو صادق علی کے بارے میں میں کیا جواب دوں گا۔

میں نے گاؤں میں کسی قسم کی سنسنی خیزی کو روکنے کے لئے..... صادق علی کی لاش قبر میں دفن کر دی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے حوالے سے پولیس کا کوئی آدمی زینو کے گھر میں قدم رکھے اگر ایسا ہوتا تو پھر میرا بچنا کسی طور بھی ممکن نہ ہوتا۔ اس کی لاش کو مٹی تلے دبا کر میں نے چوہدری کو بھی قتل کے الزام سے بچا لیا تھا۔ صادق علی کی لاش وہاں سے غائب کر کے میں نے بہت سے مسائل کو حل کر لیا تھا مگر میں زینو کو کیا جواب دوں گا ـــ یہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اور جب میں گھر پہنچا تو زینو شاید پچھلے احاطے میں کھلنے والی کھڑکی کے پیچھے ہی کھڑی تھی۔ میری چاپ ہی دستک پر اس نے پٹ کھول دیئے۔ وہ ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں لاٹھی لئے کھڑی تھی سردی سے بچنے کے لئے اس نے صادق علی کا لایا ہوا نیا کمبل اوڑھ رکھا تھا ـــ

"کچھ پتہ چلا ماسٹر صاحب کا؟"

"نہیں زینو۔ پتہ نہیں وہ کدھر نکل گیا ہے۔ بہت تلاش کیا ہے میں نے اسے ـــ" میں نے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

زینو نے کھڑکی بند کی اور لپکتی ہوئی میرے پیچھے آ گئی۔

"آپ لحاف اوڑھ کر بیٹھیں میں چائے لاتی ہوں آپ کے لئے۔ سردی بہت بڑھ گئی ہے اس وقت۔" اس کے دانت بج رہے تھے۔ سردی شاید اس کی ہڈیوں میں اترتی جا رہی تھی۔ بھائی کے غم نے اس رات اسے بے حد نڈھال کر رکھا تھا ورنہ وہ ایسی نہیں تھی۔ بڑے آہنی عزم اور مضبوط قد کاٹھ کی لڑکی تھی وہ۔ صادق علی کے بغیر اس کی زندگی کتنی نڈھال ہو جائے گی اس کا تصور ہی میرے لئے سوہانِ روح تھا۔

میں اوور کوٹ اتار کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ بدن تھک کر چور ہو چکا تھا ـــ زینو تھوڑی ہی دیر بعد گرم دودھ کا گلاس لے آئی۔ وہ دودھ پی کر میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ صادق علی کی صورت میرے ذہن میں گردش کر رہی تھی۔ اب وہ کبھی واپس نہیں آ سکتا تھا۔ اب زینو اپنے اس محسن کی صورت کبھی نہ دیکھ سکے گی ـــ اب اس گاؤں میں نہ میرا کوئی دوست باقی رہ گیا تھا نہ زینو کا۔ میں نے طے کر لیا کہ جیسے ہی موقع ملا میں زینو کو ساتھ لے کر کسی اور طرف نکل جاؤں گا۔ وہ جگہ ہم دونوں کے لئے غیر محفوظ ہو چکی تھی ـــ

دوسرے روز زینو نے صبح ہی صبح مجھے ناشتہ کھلا دیا۔ خود بھی جو کچھ
وہ زہر مار کر سکی کر گئی اور پھر ابھی سورج ہاتھ بھر اوپر نہ اٹھا تھا کہ وہ چپکے سے اپنی سوتی
سہیلی کی ماں کے پاس جا بیٹھی تا کہ اسے کچھ تسلی دے سکے۔ مجھے وہ یہی کہہ کر
گئی تھی میں نے دل میں کہا ٹھیک ہے بی بی تیرا وہیں جا ٹھہرنا بہتر ہے کہیں
ایسا نہ ہو میری آنکھوں میں ناچتی صادق علی کی وہ تصویر تو دیکھ لے جس میں
گاچی منہ کھول کر اس کی گردن پر اپنے دانت جما چکا تھا کہیں تو صادق علی
کے تڑپتے ہوئے نرخرے اور ادھڑتے ہوئے پیٹ کا وہ منظر نہ دیکھ لے جو
میری آنکھوں میں منجمد ہو چکا تھا۔ میں اپنے آپ سے خوف زدہ تھا۔
اس روز۔

اور میری بے بسی یوں دیدنی تھی کہ چوہدری صاف طور پر قتل کا مرتکب ہوا تھا۔ وہ وہیں موجود تھا مگر میں اس کے خلاف اُف تک نہ کر سکتا تھا کیونکہ صادق علی کا جرم ناقابلِ معافی تھا مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ بات صرف اتنی سی نہیں تھی۔ آدمی کی حرامزدگی صادق علی کے اس بھیانک جرم سے کہیں آگے بڑھی ہوئی ہے۔ مجھے دراصل اس کی موت کے اخفا میں اپنی زندگی کی سلامتی مضمر نظر آتی تھی۔ میں اپنی ہی جان بچانے کے لئے چپ تھا یہ سوچ کر کہ اگر پولیس آئی، پوچھ گچھ ہوئی۔ صادق علی کے گھر میں وہ لوگ جا نکلے آئے وہاں انہوں نے مجھے دیکھا زینو کو وہاں پایا اور ہم سے پوچھا کہ ہم کون ہیں تو ہم کیا جواب دیں گے۔ کیا بتائیں گے ہم انہیں اپنے بارے میں۔ مجھے تو وہ ضرور ہی پہچان لیں گے اور پھر وہی میں ہوں گا اور وہی خارِ مغیلاں ہوں گے...... اپنا یہ اندوہناک انجام مجھے دُور سے نظر آتا تھا اسی لئے میں نے اپنے دوست کے قتل پر چوہدری سے لاشعوری طور پر سمجھوتہ کر لیا تھا۔ صادق علی مجھ سے کچھ کہتا مجھے طعنہ دیتا مجھے..... ننگِ دوستی قرار دیتا۔ خواب میں یا بیداری میں سامنے آ کر مجھ پر ہنستا تو میں نے دل میں دھار رکھی تھی کہ میں اسے خوب بے نقط سناؤں گا اسے معاف نہیں کروں گا۔۔۔ کہوں گا تو تو خود جہنمی کُتا ہے تو مجھے اپنے قتل پر چوہدری کو معاف کر دینے اور دوست کو بیچ دینے کا طعنہ کس طرح دے سکتا ہے۔ اپنے ضمیر کے گرد میں نے بہت تیز گرم الاؤ دہکا دیا تھا۔ تا کہ اگر کہیں وہ سر اٹھا کر ادھر اُدھر نکلنے کی کوشش کرے تو اس میں جل کر بھسم ہو جائے۔ ایسے ضمیر کا فائدہ ہی کیا ہے جو اس وجود کو ہی کاٹنے لگے جس میں وہ پناہ لئے ہوتا ہے۔

اس وقت دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔۔۔ میں صحن میں بیٹھا صادق علی کا لایا ہوا چھوٹا سا ٹرانسسٹر ریڈیو سُن رہا تھا اس کی خریدی ہوئی خوبصورت سی گھڑی میری کلائی پر بندھی تھی اور اس کی سوئیاں بتا رہی تھیں کہ ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔ زینو ابھی اپنی سہیلی کی ماں کے گھر سے واپس نہیں آئی تھی۔۔۔ دھوپ آنگن میں چاروں طرف پھیل رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ میں آسیہ کو تلاش کرنے کے لئے اب کدھر جاؤں؟ کس طرح نکلوں؟ اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا کہاں سے پکڑوں؟ میرا خیال تھا کہ اپنا حلیہ بدل کر میں ایک بار پھر ڈاکٹر دھنی کے کلینک پر قسمت آزمائی کروں اپنی بہن کا سراغ مجھے اس جگہ کے سوا اور کہیں سے نہ مل سکتا تھا میری سوچ کی بانہیں دُور دُور تک پھیل رہی تھیں کہ اچانک گھر کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی۔

میں کمبل اپنے گرد لپیٹ کر اٹھا۔ بھری ہوئی بندوق میں نے کمبل کے نیچے چھپالی اور دروازے کی جھری میں سے جھانک کر باہر دیکھا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر آدمی کھڑا تھا۔ ایسا آدمی جو غیر معمولی طور پر تندرست و توانا دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں اس نے پستول ڈال رکھا تھا گولیوں سے بھری پیٹی کے ساتھ۔۔۔ وہ سیاہ اچکن اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھا۔ آنکھوں پر اس نے سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ بال اس کے اگرچہ سفید تھے مگر اتنے بھرپور اور گھنگھریالے تھے کہ ان کی خوبصورتی کی مثال دی جا سکتی تھی۔ میں نے ذرا غور سے دیکھا تو اس کا صفاچٹ چہرہ مجھے کسی اور کی تصویر نظر آیا۔ وہ تصویر زینو کی تھی جو اس کی آنکھوں اس کے رخساروں اس کی بھنوؤں اور اس کی ٹھوڑی سے بنی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہی وارث علی ہے۔

کوئی بات پوچھے بغیر میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ بہت اونچا دروازہ تھا۔ وارث علی نے مجھے دیکھا تو ذرا دیر کے لئے ٹھٹکا پھر وہ متکبرانہ انداز میں ایک جھٹکے کے ساتھ گھوڑے پر سے اترا۔۔۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا سبک سا خوبصورت بید تھا، بولا "ماسٹر صاحب کہاں ہیں؟" اس کے لہجے میں خاصا تحکم تھا۔ نظریں اس کی میرے چہرے پر جم سی گئی تھیں

"وہ تو کہیں باہر گئے ہیں جناب! آپ آیئے اندر آ جائیے۔"

"تم کون ہو؟" اس نے دروازے میں داخل ہو کر گھوڑے کو بھی اپنے ساتھ صحن میں اتار دیا۔

"میں مہمان ہوں ماسٹر صاحب کا۔"

"اچھا اچھا مہمان ہو تم ماسٹر صاحب کے" گھوڑے کی لگام چھوڑ کر اس نے دروازے کو اندر سے کُنڈی لگا دی۔ بلا کی خود اعتمادی تھی اس شخص میں۔ کُنڈی لگا کر وہ مڑا اور گھوڑے کی لگام اس نے دائیں ہاتھ زمین میں گڑے کھونٹے کے ساتھ باندھ دی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چرمی تھیلا تھا۔

"آیئے ادھر چارپائی پر بیٹھئے۔"

میں نے بائیں ہاتھ کے اشارے سے اسے صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھنے کے لئے کہا مگر جب میں نے بایاں ہاتھ کھولا تو کمبل ذرا سا اوپر اٹھ گیا جس کے نیچے چھپی بندوق اس نے دیکھ لی۔

ایک عجیب سی طنز بھری مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری اس نے بڑی عیاری سی ایک آنکھ دبائی اور بولا۔

"یہ بندوق ہے تمہارے ہاتھ میں؟" اس کا بایاں ہاتھ تیزی سے پستول پر جا پڑا تھا۔

"جی! جی ہاں۔ بندوق ہی ہے یہ۔"

"یہ کیوں اٹھائے پھرتے ہو اس وقت؟ ڈرتے ہو کسی سے؟"

یہ کہہ کر وہ چارپائی پر جا بیٹھا۔ وہاں گولڈ لیف کے سگریٹوں کا پیکٹ دھرا تھا۔ اس میں سے اس نے سگریٹ نکالا۔ نگاہیں اس کی مجھ پر جمی تھیں۔ اس نے پیکٹ کے ساتھ پڑے "رانسن" کے لائیٹر سے سگریٹ سلگایا اور مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"بتایا نہیں تم نے یہ دن کے وقت بندوق کیوں اٹھائے پھرتے ہو اپنے ساتھ۔ یہ تو پولیس کی پکی رائفل نظر آتی ہے۔ بڑا وزن ہوتا ہے اس کا۔"

"یہ آدمی کی حفاظت کرتی ہے۔ لُٹیروں، چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں سے بچاتی ہے اسی لئے میں اسے ساتھ رکھتا ہوں۔"

"اپنی دولت بچاتے ہو اس سے کہ اپنی جان؟" وہ اور زیادہ گہرا کش لے کر بولا۔ مجھے وہ مسلسل گھورتا چلا جا رہا تھا۔ یوں جیسے میری ہڈیوں میں سوراخ کر دے گا۔ پستول پر اس کا ہاتھ اب بھی مضبوطی سے جما تھا۔

"دونوں چیزیں بچا رہا ہوں اور یہی ہر انسان کا فرض بھی ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے بڑی دولت ہے تمہارے پاس۔ وہ ماسٹر صاحب کی بہن کہاں ہے؟ وہ مجھے نظر نہیں آ رہی ہے۔"

"وہ زینو؟ وہ ابھی آ جائے گی۔ اس کی ایک سہیلی مر گئی تھی کل۔ اس کی ماں کے پاس گئی ہے وہ ساتھ کی گلی میں۔" میں نے کہا اور اس کے پائنتی جا بیٹھا۔

"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں جناب؟"

"میں..... میں تو اُدھر شاہدرے سے آیا ہوں۔"

"آپ کا اسمِ گرامی؟"

"میں ماسٹر صاحب کا دوست ہوں رستم خان۔ معلوم ہوتا ہے تم خاصے پڑھے لکھے نوجوان ہو؟"

"جی بس تھوڑا بہت پڑھا ہوا ہوں۔"

"کیا نام ہے تمہارا.....؟"

"جی میرا نام..... میرا نام صفدر ہے جناب!" میں نے ذرا دیر کے لئے سنبھلتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنا نام غلط بتایا تھا تو میں کیوں اسے اپنا صحیح نام بتاتا۔

"دیکھو جھوٹ نہ بولو برخوردار! تمہارا چہرہ ہی بتا رہا ہے کہ تم اپنا نام صحیح نہیں بتا رہے ہو۔"

"اگر مجھ پر اعتبار نہیں آ رہا ہے آپ کو تو آپ ماسٹر صاحب سے پوچھ لیں۔ اپنی...... میرا مطلب ہے ان کی بہن سے پوچھ لیں۔ مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔" میں نے اس کے رویّے سے عاجز آ کر کہا۔ وہ بہت کائیاں آدمی تھا اور اب تک میں اس کے خیالات پڑھنے سے قاصر رہا تھا۔۔۔

مجھے اس سے سخت خطرہ محسوس ہو رہا تھا اسی لئے میں نے کمبل کے اندر بندوق کی نالی کا رخ اس کی طرف کر رکھا تھا اور اس کی لبلبی میری انگلی سے کچھ زیادہ دُور نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں اس کے خبثِ باطن کی غماز تھیں۔ شک سے ایسی بھی کچھ جھلکتی تھی ان میں۔ کچھ دیر تک وہ گہری سوچ میں گم رہا۔۔۔

"تم ماسٹر صاحب کی بہن کو بلا کیوں نہیں لاتے ہو۔ میں خوامخواہ بور ہو رہا ہوں یہاں۔"

"میں خود یہاں مہمان ہوں۔ کسی کا گھر نہیں جانتا۔ میرا خیال ہے کہ آپ بوٹ اتار کر اطمینان سے بیٹھیں۔ میں آپ کے لئے دودھ گرم کرتا ہوں۔"

"نہیں دودھ کی ضرورت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے چرمی تھیلے کی زپ کھولی اور کچھ کاغذات کو ادھر اُدھر کر کے اس نے ایک کاغذ باہر نکال لیا۔ وہ کوئی سوا انچ چوڑا اور ایک فٹ لمبا کاغذ تھا وہ اس نے میرے سامنے کر دیا۔ اس کاغذ پر بارہ تیرہ آدمیوں کی تصویریں تھیں۔

"بتا سکتے ہو اس میں تمہاری تصویر کون سی ہے؟"

یہ کہہ کر اس نے وہ تصویر میرے سامنے رکھ دی اور پھر بجلی ایسی تیزی سے اس نے پستول نکال کر میری پسلی سے لگا دیا۔ بائیں ہاتھ سے اس نے میری بندوق تھام لی۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا کہ میں حیران رہ گیا مگر پھر بھی وہ کمبل ابھی تک میرا تحفظ کر رہا تھا پیشتر اس کے کہ وہ سمجھ سکتا۔ میں نے کمبل کے اندر سے بایاں ہاتھ ایک جھٹکے سے آگے لا کر اس کے پستول پر جو مارا تو اس کی دائیں کلائی میرے ہاتھ میں آ گئی۔ پستول میرے بدن سے چھو کر آگے نکل گیا تھا۔ اسی لمحے اس نے گولی چلا دی۔ میرا خیال ہے ثانیے کے ہزارویں حصے کا فرق پڑا تھا کہ اس کی گولی بے اثر ہو گئی تھی۔ میں نے بندوق پھینک کر دایاں ہاتھ بھی اس کی دائیں کلائی پر لگا دیا پھر پوری قوت سے میں نے اس کی کلائی کو دیوار کی طرف گھما کر مروڑ دیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے گر کر دُور جا پڑا مگر وہ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے آگے کو جھک کر اپنا وزن سنبھالا اور پوری قوت سے اپنی دائیں ٹانگ گدھے کی دولتی کی طرح میرے پیٹ میں دے ماری۔

میرا سارا وجود سنسنا گیا۔ گردے کے آپریشن نے میرے جسم کا وہ حصہ خاصا حساس بنا دیا تھا۔ میں ذرا دیر کے لئے تو بالکل ہی بجھ چکا سا رہ گیا مگر ابھی میرے حواس بجا تھے۔ میں نے پاگلوں کی طرح آگے بڑھ کر اس کی گردن پکڑ لی اور پھر اپنے پیر استاد کا نام لے کر میں نے اس کی رگِ احساس مَسل دی۔ اس کا سر فوراً ہی ڈھلک گیا۔ اس کی آنکھیں اپنے خانوں میں ساکن ہو گئیں۔ اب وہ میرے ہاتھوں میں جھول رہا تھا۔ میں نے اسے بڑی احتیاط سے اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ وہ بہرحال میرے لئے قابلِ احترام تھا کیونکہ وہ زینو کا باپ تھا اس کا محسن تھا اور اس کی ماں آرسی مُسلن کا عاشق۔ مجھے اس کا احترام ملحوظ رکھنا ہی تھا۔

اسے چارپائی پر لٹا کر میں اندر گیا اور وہاں سے لحاف لا کر اس پر

ڈال دیا۔ اُس کے آرام کا بھی مجھے ہر طرح سے خیال رکھنا چاہئے تھا۔

اس کا پستول اٹھا کر میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ بندوق وہاں سے اٹھا کر میں نے زینو کے کمرے میں اس کی بڑی پیٹی کے پیچھے ڈال دی اور گولیاں بھی چھپا دیں پھر میں صحن میں کرسی ڈال کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

زینو ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وارث علی کوئی ایک گھنٹے تک بے سُدھ پڑا رہا۔ مگر جب وہ ہوش میں آیا تو اس کی حالت دیدنی تھی۔ شدید نقاہت کے مظہر انداز میں اس نے گرد و پیش کو دیکھا مگر جب مجھ پر اس کی نظر پڑی تو وہ یوں اٹھا جیسے بجلی کے ننگے تار سے اس کا جسم مَس ہو گیا ہو۔

"بیٹھے رہو وارث علی اور مت سمجھو کہ میں تم سے ناواقف ہوں۔"

وہ گھور گھور کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم سہم گیا کیونکہ اس کے اپنے پستول کی نالی کا رُخ اب اس کے سینے کی طرف تھا۔

"لیٹ جاؤ اور میری بات غور سے سنو۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں لیکن تم مجھ سے جو دشمنی کر رہے ہو اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہ ہو گا۔" میں نے کرسی کھینچ کر اس کے اور قریب کر لی۔ پستول نے اسے سُست کر دیا تھا۔

"میں نے تمہارا یہ تھیلا بھی دیکھ لیا ہے۔ تمہیں یہ لالچ ہے کہ مجھے گرفتار کرا کے تم بیس ہزار روپیہ اور محکمانہ ترقی حاصل کر لو گے مگر اب تمہارا یہ خواب پورا نہ ہو سکے گا۔ کم از کم میں تو تمہارے ہاتھ نہیں آ سکتا ہوں کیونکہ میں تمہارا راز جانتا ہوں۔ تم خود بھی مجرم ہو۔"

وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لحاف اس نے اپنے ارد گرد یوں تان لیا جیسے اس میں سے گولی نہ گزر سکتی ہو۔ اس کی آنکھوں میں خوف نمایاں تھا بولا۔

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں خود پولیس افسر ہوں۔ میں ایس ایچ او ہوں ایک بہت بڑے تھانے کا انچارج۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔ مجھے اس سے پوری طرح اتفاق ہے مگر پھر بھی تم مجرم ہو۔ تم نے اپنی قاتل بیٹی کو قانون سے چھپا کر یہاں بٹھا رکھا ہے حالانکہ وہ تمہاری ناجائز بیٹی ہے۔ اور اسی ستی سے تمہارے جوانی کے عشق کا ثمر ہے۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔" اس نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی مجھے جھٹلانے کی کوشش کی مگر رنگ اس کا فق ہو چکا تھا۔

"آؤ وارث علی ہم دونوں سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ نہ تم رُستم خان ہو اور نہ میں صفدر ہوں۔ میرا نام غلام جیلانی ہے اور میں کوٹ لکھپت جیل کی پھانسی کی کوٹھڑی نمبر آٹھ سے بھاگا ہوا ہوں اور تم وارث علی ہو جس نے اپنی ناجائز بیٹی کو پھانسی سے بچانے کے لئے یہاں چھپا رکھا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا تمہیں اعتراف کر لینا چاہئے۔"

"تو تم سب کچھ جانتے ہو؟"

"ہاں مجھے یہ سب باتیں ماسٹر نے بتائی تھیں ماسٹر صادق علی نے۔"

"اس نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے میرا راز اسے کسی اور پر ظاہر نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ اب میری بات غور سے سنو۔ صادق علی کو کل رات قتل کر دیا گیا ہے۔"

"کیا؟ کیا کہا تم نے؟ کس نے قتل کیا ہے میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وارث علی نے لحاف ایک دم الگ کر دیا تھا۔

"زیادہ طیش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے ٹھنڈے دل سے میری بات سنو۔"

یہ کہہ کر میں نے پستول اپنی جیب میں ڈالا اور سگریٹ سلگا کر اسے پیش کیا۔

"لو یہ پیو اور میری بات پر دھیان دو۔"

میں اس کے قریب ہی چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میں نے صادق علی پر جو کچھ بیتی تھی اسے بتا دی جسے سن کر وہ حیران رہ گیا بولا۔

"اس لعنتی میں ایسے ایسے عیب بھی موجود تھے میں تو اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا اور میں نے اپنی بیٹی زینو کو اس کے گھر میں ٹھہرا رکھا تھا۔" وارث علی بڑبڑایا۔ وہ میرے انکشاف پر بہت زیادہ سراسیمہ ہو گیا تھا۔

"تمہاری بیٹی یہاں بالکل محفوظ رہی ہے وارث علی! وہ زینو کو اپنی بہن اور بیٹی برابر ہی سمجھتا تھا۔ پیشتر اس کے کہ تم اس کے قاتل کے خلاف کوئی قدم اٹھاؤ مجھے یہ بتاؤ کہ وہ کون تھا۔ تمہارا اس سے کیا تعلق تھا اور اس بدترین قسم کی انتہا پسندی تک اسے کس نے پہنچایا تھا۔ کیونکہ میرے خیال میں وہ بہت ہی اچھا آدمی تھا اتنا اچھا کہ اس کی دیانت اور شرافت کی قسم کھائی جا سکتی تھی مگر وہ بے موت مارا گیا ہے اس کی کٹی پھٹی لاش مجھ سے اپنا حق مانگ رہی ہے جو میں اسے نہ دے سکا میرا دل لہو روتا ہے اور اپنی بزدلی پر میں یہاں بیٹھا صبح سے پچھتا رہا ہوں۔"

"اگر تم ذرا سی بھی ہمت کرتے تو شاید اس کی زندگی بچ جاتی میں نہیں کہتا کہ تم بزدل ہو۔ تم بہادر آدمی معلوم ہوتے ہو مگر تم سے حساب میں غلطی ہو گئی ورنہ وہ یوں کُتوں کا نوالہ نہ بنتا۔ وہ میرا دوست تھا اور ابھی اس کے مرنے کی عمر تو نہ تھی۔ یہی کل چالیس بیالیس سال رہا ہو گا وہ۔ مگر وہ بہت دُکھی تھا۔"

"وہ تو کہتا تھا کہ اس کی عمر اکسٹھ سال ہے۔"

"جھوٹ بولتا تھا وہ۔ اجنبیوں سے وہ یہی کہا کرتا تھا کہ اس کی عمر ساٹھ سال ہے کئی لوگوں سے تو اس نے کہا کہ وہ ستر سال کا ہے۔"

"مگر کیوں جھوٹ بولتا تھا وہ اپنی عمر کے بارے میں؟"

"میں خود نہیں سمجھ سکا ہوں یہ بات۔ بہر حال اس کی زندگی میں محبت نے زہر گھول دیا تھا۔ وہ آج سے بائیس سال پہلے ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ان دنوں وہ اکبر کوٹ کے ایک مڈل سکول میں پڑھاتا

تھا۔ ایف اے تک تعلیم پائی تھی اس نے اور وہاں وہ سکول میں بچوں کو اردو حساب اور فارسی پڑھاتا تھا۔ وہ لڑکی اس کی محبت کا جواب محبت سے دیتی تھی مگر ایک روز ایسا ہوا کہ ان کے تعلق کی خبر اس کے گھر والوں کو ہو گئی۔ دُردانہ تھا اس لڑکی کا نام۔ وہ کوئی بہت ہی کرخت طبیعت کے جاہل لوگوں کا خاندان تھا اب بھی اکبر کوٹ میں موجود ہیں وہ لوگ تندوال کہلاتے ہیں۔ دُردانہ کا ایک بھائی تھا غنی تندوال۔ وہ ایک دن صادق علی کو بہانے سے بلا کر اپنے گھر لے گیا۔ یہ بیچارہ سمجھا کہ شاید وہ لوگ اس کو اپنا داماد بنانے پر راضی ہو گئے ہیں مگر معاملہ ایسا نہیں تھا۔ غنی تندوال دراصل اس روز صادق کی بہن شکیلہ کو سکول سے چھٹی کے بعد زبردستی رکشے میں ڈال کر اپنے گھر لے گیا تھا۔ وہ بہت ہی خرانٹ آدمی تھا اور علاقے بھر کے لوگ اس کے نام سے تھراتے تھے۔ اس نے جب یہ سنا کہ اس کی بہن دُردانہ کو صادق علی نے اپنی محبت کے جال میں پھنسا رکھا ہے تو وہ تاؤ کھا گیا۔

جب صادق علی غنی تندوال کے گھر پہنچا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ غنی نے وہاں اپنے چار غنڈے بُلا رکھے تھے۔ پہلے تو ان لوگوں نے مکان کے پچھلے حصے میں لے جا کر صادق علی کو خوب پیٹا۔ جب یہ ادھ موا ہو گیا تو اسے ان لوگوں نے ایک کرسی پر باندھ کر بٹھا دیا پھر ان پانچوں نے صادق علی کی بہن شکیلہ پر مجرمانہ حملے کئے ——— وہ ایسی اذیت تھی جسے صادق علی کبھی نہ بھول سکا۔ وہ چیختا رہا روتا رہا شکیلہ بھی خدا اور رسول کا واسطہ دے کر ان سے اپنی عزت کی بھیک مانگتی رہی مگر انہیں ترس نہ آیا۔ انہوں نے صادق علی کی لاچار نظروں کے سامنے پھول ایسی بہن کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ ان کے گھر میں اس روز کوئی نہ تھا۔

شکیلہ کو یوں ذلیل و رُسوا کر کے ان لوگوں نے رات کے بارہ بجے دونوں بہن بھائیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ سینہ بہ سینہ کر کے رسیوں سے جکڑا اور ایک ٹیکسی میں ڈال کر اکبر کوٹ قصبے سے بیس میل دور ایک ویرانے میں پھینک آئے۔ وہ ایسی جگہ تھی کہ ادھر سے کوئی آدمی مشکل سے ہی گزرتا تھا۔ دونوں بہن بھائی اسی بدنصیبی کی حالت میں صبح تک پڑے رہے مگر وہ کسی طرح بھی اپنے بند نہ کھول سکے۔

شاید خدا کو ان کی حالت پر رحم آ گیا تھا۔ صبح کے وقت وہاں سے کوئی شکاری گزرا۔ اس نے ان لوگوں کو اس حال میں دیکھا تو وہ لرز گیا۔ بہن نیم بے ہوش ہو چکی تھی اور بھائی بھی ذلت کی بدترین حالتوں سے دوچار تھا۔ اس شکاری نے شکیلہ کی برہنگی کو اپنی چادر سے ڈھانپا اپنی پتلون کے نیچے وہ پاجامہ پہنے تھا وہ بھی اتار کر اس نے شکیلہ کو دے دیا کچھ کپڑے اس نے صادق علی کو دیئے۔

وہ بہت پوچھتا رہا کہ انہیں اس حال کو کس نے پہنچایا ہے مگر وہ اس حد تک ذہنی طور پر مفلوج اور خوف زدہ ہو چکے تھے کہ اسے کچھ بھی نہ بتا سکے۔ شکیلہ بڑی مشکلوں سے چلنے کے قابل ہوئی۔

صادق نے مجھے یہ ساری کہانی خود بتائی تھی۔ میں تمہیں اس کے الفاظ میں بتاتا ہوں سب کچھ ———

اس نے کہا کہ جب وہ شکیلہ کو اپنے ساتھ لے کر اس ویرانے سے اکبر کوٹ کی طرف چلا تو اس نے اپنی ساری تعلیم اپنی ساری شرافت اور ساری تہذیب کو خیرباد کہہ دیا ——— اس نے قسم کھائی کہ جب تک غنی تندوال سے حساب نہ چکا لے گا وہ چین سے نہیں بیٹھے گا۔ وہ بھول ہی گیا کہ غنی تندوال دُردانہ کا بھائی ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ شکیلہ نے اس کی وجہ سے جو ذلت اٹھائی تھی وہ چاہتا تھا کہ اس داغ کو دھو ڈالے مگر نہیں آدمی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ خدا کے منصوبوں کے آگے آدمی کے منصوبے کیا حیثیت رکھتے ہیں ———

اکبر کوٹ میں داخل ہونے سے پہلے ایک نہر کا پل عبور کرنا پڑتا ہے یہ بہت بڑی نہر ہے اس کا پل اکبر کوٹ سے کوئی ایک میل دور ہے۔ وہ اور شکیلہ وہاں سے اس حال میں گزر رہے تھے کہ ان کے بدن پر جو بھی وہ ایک بھی کپڑا ان کا اپنا نہیں تھا۔ شکیلہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اپنا منہ سر اس نے چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ وہ اس کی اکلوتی بہن تھی جس کے لئے اس نے بہت سے خیالی شیش محل بنا رکھے تھے وہ چاہتا تھا کہ اسے اچھی تعلیم دلائے۔ وہ بڑی ذہین لڑکی تھی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی اور اسے معلوم تھا کہ وہ مسلسل سسک رہی ہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی وہ اپنے جسم اور رُوح کے اس گھاؤ کو نہیں بھول سکی تھی جو غنی تندوال اور اس کے ساتھیوں نے لگائے تھے ——— وہ بے پناہ ذلت اس نے صرف صادق علی کی وجہ سے اٹھائی تھی۔

اچانک صادق علی کو کسی کے پانی میں گرنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی بہن غائب تھی۔ وہ دوڑ کر پُل کے جنگلے کے پاس پہنچا وہ بہت بڑی نہر تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پُر شور پانی نے شکیلہ کو نگل لیا۔ صادق علی بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

لڑکی کو نہر میں کُودتے دیکھ کر بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے مگر ان میں سے کوئی بھی نہر میں نہ اُتر سکا کیونکہ شکیلہ کو پُل کے نیچے گزرتا ہوا تیز رَو پانی بہا کر آناً فاناً بہت دُور لے گیا تھا۔

اسی دن صادق علی نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی اور پولیس کو غنی تندوال اور اس کے ساتھیوں کی ساری زیادتی سے آگاہ کیا۔ پولیس کو اس نے یہ بھی بتایا کہ شکیلہ اپنی اسی ذلت کی وجہ سے نہر میں کود گئی ہے، وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی تھی۔

پولیس نے مقدمہ درج کیا مگر ان میں سے کسی بھی آدمی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ غنی تندوال پر ہاتھ ڈال سکے۔ وہ سب اس سے خوف زدہ تھے اور جب آٹھ دن گزر گئے اور پولیس کچھ بھی نہ کر سکی تو پھر ایک دن صادق علی کو بھی غنی تندوال کے دل پر اسی سختی سے ہاتھ ڈالنا پڑا جس طرح اس نے اس کی عزت پر ڈالا تھا۔ دُردانہ سے وہ ان آٹھ دنوں میں ایک بار بھی نہ ملا تھا۔ ایک روز اس نے اسے پیغام بھیجا کہ وہ اسے اس

کے گھر آ گئے تھے۔ وہ بحث کی ماری سادہ لوح لڑکی اگلے روز اس کے کہنے کے مطابق رات کے دس بجے اس کے گھر آ پہنچی۔ ان کا مکان ساتھ والی گلی میں تھا۔

صادق علی نے مولوی کو بھی بُلا رکھا تھا اور اس کے پانچ چھ دوست بھی جمع تھے وہاں۔ دُردانہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ صادق علی کے ساتھ اس کے بھائی نے کس قدر ظلم کیا ہے ——— اور شکیلہ کس وجہ سے نہر میں کود گئی تھی ——— جب اسے معلوم ہوا کہ صادق علی اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو پہلے تو وہ بہت ہچکچائی مگر جب صادق علی نے اسے اپنی قربانیاں یاد دلائیں تو وہ مان گئی۔ اسی رات ان دونوں کی شادی ہو گئی اور صادق علی نے دوستوں کو رخصت کر کے غنی تُندوال کی ہمشیرہ کے ساتھ وہیں شب زفاف منائی۔ وہ اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی فتح قرار دیتا تھا ——— گزشتہ آٹھ دنوں میں اس نے اپنی ساری جمع پونجی یا تو دُردانہ کے لئے تحفے خریدنے پر صرف کی تھی یا اسلحہ خریدنے پر۔ اس نے ایک پستول حاصل کیا اور ایک عمدہ قسم کی ولایتی سٹین گن۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سی گولیاں اور کارتوس بھی جمع کر لئے تھے وہ سب چیزیں اس نے ناجائز طور پر حاصل کی تھیں مگر وہ کہتا تھا کہ وہ ایک بھیڑیئے سے مقابلے کی تیاریاں کر رہا تھا ——— اسی عرصے میں اس نے چھپ چھپا کر نشانہ بازی کی بھی مشق کر لی۔

دُردانہ کے ساتھ رات گزار کر جب وہ صبح اٹھا تو اس نے غنی تُندوال کو پیغام بھیجا کہ وہ آ کر اپنی بہن کو لے جائے اور باقاعدہ جہیز کے ساتھ رخصت کرے۔ نکاح نامے کی ایک نقل بھی اس نے اس بڑھیا کے ہاتھ بھیج دی جو اس کا پیغام لے گئی تھی۔

غنی تُندوال نے وہ پیغام سنا تو خونخوار درندے کی طرح غرّاتا ہوا صادق علی کے مکان کی طرف لپکا۔ دروازہ صادق علی کی ماں نے کھولا۔ غنی تندوال نے دو گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں ——— یہ سب سے بڑی قیمت تھی جو صادق علی کو دُردانہ کے لئے ادا کرنا پڑی۔ غنی تندوال کے ساتھ اس کے دو بھائی اور ایک چچا اور دو دوست بھی تھے۔ وہ دندناتے ہوئے صحن میں داخل ہوئے ——— غنی ہنکارا۔

"باہر نکل اوئے چوہے کی اولاد! دیکھ ہم تیرے لئے کیا لائے ہیں؟"

جونہی یہ لفظ اس کے منہ سے نکلے صادق علی نے سٹین گن کی گولی سے اسے بھون ڈالا ——— وہ سامنے ہی کھڑکی کے پردوں کے پیچھے دیوار کی اوٹ میں بیٹھا تھا اور سارے اسلحے اس کے ہاتھ تلے تھے ——— اس نے صحن میں کھڑے ان سب آدمیوں پر باڑھ ماری۔ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچ سکا ——— غنی تندوال کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ بزدل سا کمپاؤنڈر اسلحے کے اس کے مقابلے میں ڈٹ جائے گا۔ صادق علی کا صحن لاشوں سے اَٹ گیا تھا۔ اپنی ماں کی لاش دروازے پر دیکھ کر اس کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ اسے یوں لگا جیسے اس کا اس دنیا میں کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

دُردانہ اس وقت مکان کے پچھلے حصے میں تھی۔ گولیوں کی تڑتڑ اس نے سنی تو بھاگی ہوئی اس کمرے میں پہنچی جہاں صادق علی سٹین گن دوبارہ لوڈ کر رہا تھا۔ اس کی نظر صحن میں اپنے تین بھائیوں اور چچا کی لاشوں پر پڑی تو وہ چیخنے لگی۔ بال نوچنے لگی۔

صادق علی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے بھائیوں کا ماتم نہیں کر رہی اسے گالی دے رہی ہے۔

"چپ ہو جا۔ یہ ڈرامہ بند کر کُتیا۔ دیکھتی نہیں تیرے اس بدمعاش بھائی نے میری ماں کو قتل کر دیا ہے۔ وہ دیکھ تیری ساس کی لاش پڑی ہے اس پر تجھے کوئی رونا نہیں آتا۔" اس کی یہ بات سن کر اس لڑکی کا دماغ الٹ گیا ——— نفرت کی چنگاریاں اس کی آنکھوں سے پھوٹنے لگیں اس نے صادق علی کے دائیں ہاتھ گولیوں کے ڈھیر کے نزدیک رکھے دو پستولوں میں سے ایک اٹھا لیا۔ وہ بھرا ہوا پستول تھا۔ بھائیوں کے غم نے اسے اس حد تک ذہنی صدمہ پہنچایا تھا کہ اس نے پے بہ پے صادق علی پر تین فائر کر دیئے۔ وہ اس آدمی کو ختم کر دینا چاہتی تھی جس نے اس کی خاطر اپنی زندگی تباہ کر لی تھی ——— مگر صادق علی کی خوش قسمتی تھی کہ ایک بھی گولی اسے نہ لگی۔

اپنی اس ناکامی سے جھنجلا کر دُردانہ نے پستول کی نالی اپنے منہ میں رکھ کر لبلبی دبا دی اور وہیں ڈھیر ہو گئی۔ صادق علی کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ لڑکی جس کے لئے اس کے چاروں طرف خون کا تالاب بن گیا تھا۔ جس کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں اس کی بہن بھی زندگی کی سرحد سے گزر گئی اور اس کی ماں بھی۔ وہ لڑکی اپنے بھائیوں کی محبت میں اس قدر اندھی ہو گئی کہ اس نے صادق علی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا کی ہر خوشی سے محروم کر دیا۔

اس عرصے میں کسی نے تھانے میں اطلاع کر دی کہ غنی تُندوال اور اس کے ساتھی مارے گئے ہیں۔ پولیس والوں کے لئے یہ اس سال کی شاید سب سے بڑی خوش خبری تھی۔

تھانیدار ایک پوری گارد لے کر گلی میں آ دھمکا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اگر صادق علی کو گرفتار کر لیتے تو اسے کبھی نہ چھوڑتے۔ اتنے سارے آدمیوں کا خون تھا اس کی گردن پر۔ صادق علی ان سے بچنے کے لئے اپنے گھر کے پچھواڑے سے دیوار پھاند کر دوسرے مکان میں کودا اور پھر کوٹھے کوٹھے دوڑتا ہوا وہ تیسری گلی میں نکل گیا۔

صادق علی نے مجھے بتایا کہ جب وہ اپنے گھر سے بھاگا تو اس کی جیب میں صرف ستر روپے تھے اور سیاہ کمبل کے نیچے اس نے کوٹ کی تمام جیبیں گولیوں سے بھر رکھی تھیں۔ صرف ایک پستول تھا اس کے پاس۔ باقی سب کچھ وہ وہیں چھوڑ آیا تھا۔ آنکھیں اس کی لہو رنگ تھیں کہ وہ اپنی ماں کو جس نے زندگی بھر اسے ہر مشکل اور مصیبت میں پناہ دی تھی اپنے ہاتھوں سے لحد میں بھی نہ اتار سکا۔ رہ رہ کر اسے اپنی ماں کی بے گور و کفن لاش گھر کے

دروازے میں پڑی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی آنکھیں ایک عرصے تک ماں کی اس نہایت حسرتناک موت سے بھری رہیں۔

وہ اکبر کوٹ سے نکلا تو میانوالی کی بس میں جا بیٹھا ——— وہیں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں اس دن دو ملزموں کو گندیاں سے میانوالی لے جا رہا تھا عدالت میں پیش کرنے کے لئے۔

اس وقت میں ہیڈ کانسٹیبل ہو چکا تھا ——— وہ دونوں ڈنگر چور تھے مگر اپنی مرضی سے یہ کام نہیں کرتے تھے بلکہ مڑ کال گاؤں کے زمیندار افضل جہلا کے کہنے پر وہ آس پاس کے گاؤں میں تباہی مچاتے تھے۔ جس کی چاہتے تھے فصل اجاڑ دیتے تھے، آگ لگا دیتے تھے۔ جہلا جس کا سر اپنے قدموں میں جھکانا چاہتا تھا اسے اپنے ان دونوں خوفناک غنڈوں کے ذریعے ذلیل کرتا تھا اور میں نے بڑی بھاگ دوڑ کے بعد ان دونوں کو گرفتار کیا تھا۔ ایک کا نام جیلا تھا اور دوسرے کا سیلا۔

مجھے یقین تھا کہ ان کی گرفتاری اور عدالت کی طرف سے ان کو سزا دلانے کے بدلے میں میری محکمانہ طور پر حوصلہ افزائی ہوگی۔ اسی لئے میں نے جی جان سے اس کیس پر محنت کی تھی مگر مجھے افضل جہلا کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔

اس وقت بس گندیاں سے دس میل دُور تھی جب دو آدمیوں نے ہاتھ دے کر اسے رکوا لیا۔ وہ دونوں آدمی کھیسوں کی بُکل مارے ہوئے تھے بڑے ہٹے کٹے جوان تھے وہ دونوں ———

وہ بس میں سوار ہوئے تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ کوئی عام سے گنوار دیہاتی ہیں۔ سروں پر ان دونوں نے پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ بس میں سوار ہو کر انہوں نے چاروں طرف بہت غور سے دیکھا اور پھر میرے سامنے والی خالی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ جیلے اور سیلے کو انہوں نے بہت گہری نظر سے دیکھا۔ ایک بولا۔

"ہشکے بھئی یہ سرکاری مہمان بھی بیٹھے ہیں یہاں۔ کیوں بھئی! سیکل چور ہو کہ سکوٹر چور۔ کس لئے باندھا ہے کہاں صاب ان کو آپ نے؟"

"تمہیں کیا تکلیف ہے؟ تم اپنے کام سے کام رکھو۔" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"ہشکے بھئی! گولیاں بھی گرم ہیں اور حکیم بھی گرم ہے۔ کیوں بھئی سوار خان کیا خیال ہے تیرا؟ لگ جائے پراٹھا پھر ابھی ابھی؟"

"ابھی نہیں بھئی۔ پراٹھے تو تیرے پنڈ جا کر لگیں گے۔ لے تو سگرٹ پھونک۔ نشہ تو میرے یار" سوار خان بولا۔ وہ دونوں ترنگ میں تھے۔

"آپ بھی چکھیں سگرٹ کہاں صاب! ولائتی سگرٹ ہے، چکھو" اس نے سگرٹ میری طرف بڑھایا مگر میں نے اس کا ہاتھ پرے جھٹک دیا ———

ان کی باتیں سُن کر مجھے طیش آنے لگا تھا۔ میں تو انہیں عام سے گنوار دیہاتی سمجھا تھا مگر وہ دونوں بہت پہنچے ہوئے بزرگ دکھائی دے رہے تھے ———

میں نے ان سے بیزار ہو کر بڑے غصے سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس پر شرفو بولا۔

"گورنمنٹ تو ناراض معلوم ہوتی ہے۔ مگر یار بندی والو تم ہی پیئو۔ پتہ نہیں تمہاری تقدیر میں آگے کیا لکھا ہے؟ لو چکھو ذرا۔ کیا نام ہے سوار خان اس سگرٹ کا؟"

"اکبرا مجھے اس کا نام بتا رہا تھا کہتا تھا بارڈر سے لایا ہوں تھوبان ال۔ رتھ بان بتا رہا تھا اس کا نام۔"

"چل دفع کر نام کو، تو کش لگا اور ان کو بھی دے۔ دیکھ تو کیسے کُتے کی طرح زبان مار رہا ہے ہونٹوں پر، سگرٹ دیکھ کر۔"

"اوئے یہ بکواس بند کر دو اور آرام سے بیٹھو ورنہ چمڑی ادھیڑ دوں گا میں تمہاری۔" میں نے ان کو پھر ڈانٹا۔ وہ دونوں مسکرا دیئے۔ بڑے ڈھیٹ تھے وہ حرامزادے ———

سوار خان نے میری بات سنی ان سنی کر کے جیلے اور سیلے کو ایک ایک سگرٹ سلگا کر تھما دیا اور وہ دونوں بہت مطمئن انداز میں کش لگانے لگے گویا تھا وہ چاروں آپس میں گھل مل گئے ہیں۔ میرے پاس اس وقت پکّی رائفل تھی تھری ناٹ تھری کی اور وہ میں نے لوڈ کر رکھی تھی۔ دونوں ملزموں نے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سگریٹ ختم کر دیئے۔

"لو اور چکھو یارو! پتہ نہیں پھر تمہیں کچھ مل بھی سکے گا کہ نہیں۔" یہ کہہ کر سوار نے ان دونوں کو ایک ایک سگرٹ اور دے دیا۔

ابھی ہم گندیاں سے آٹھ میل ہی آگے نکلے تھے کہ سوار خان نے یکدم ہاتھ مار کر مجھ سے رائفل چھین لی۔ میں تو ہکا بکا رہ گیا ——— میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی آدمی پولیس کے سپاہی سے بس میں بیٹھ کر ایسی حرکت بھی کر سکتا ہے۔ رائفل لوڈ تھی ——— ابھی میں اپنی حیرت پر قابو بھی نہ پا سکا تھا کہ شرفو نے مجھ پر پستول تان لیا ———

"بس روکو اوئے ——— ! روکو یہاں اپنی ماسی کو۔" سوار خان نے اٹھ کر رائفل کی نالی کا رخ ڈرائیور کی طرف کر دیا ——— ڈرائیور بیچارا خوفزدہ ہو گیا مگر اس کا کنڈکٹر صورت حال کو پوری طرح نہ سمجھ سکا۔ وہ ایک دم سوار خان کی طرف لپکا مگر ابھی وہ اس تک پہنچ نہ سکا تھا کہ کسی نے راستے میں اڑنگا دے کر اسے بس کے فرش پر گرا دیا اس کے ساتھ ہی ٹھُز کی آواز پیدا ہوئی۔ سوار خان نے ڈرائیور پر گولی چلا دی تھی۔ مگر اس کا نشانہ ذرا چوک گیا۔ گولی ڈرائیور کا بازو چھوتی ہوئی نکلی اور بس کا شیشہ توڑ گئی ——— ڈرائیور نے بے بس ہو کر بس روک لی۔

"چل اوئے اٹھ ماں کے کھسم۔ چل نیچے ——— تم دونوں بھی اترو یارو جلدی" سوار خان نے مجھے للکارا۔ اس کے ساتھ ہی جیلا اور سیلا مجھے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے بس کے دروازے کی طرف بڑھے۔ میں ان کے ہاتھوں میں کھلونے کی طرح بے بس ہو کر رہ گیا ——— وہ سب مسلح تھے اور میری جان سخت خطرے میں تھی۔

"خبردار — اگر کسی نے حرکت کی تو گولی مار دوں گا" سوار خان نے خوفناک آواز میں بس کے مسافروں کو دھمکایا اور اس کے ساتھ ہی ان لوگوں نے دھکا دے کر مجھے بس سے باہر پھینک دیا جس وقت کے ساتھ ان دونوں کی ہتھکڑیاں بندھی تھیں، وہ بھی انہوں نے اتاری تھی — تب میں سمجھا کہ افضل جلالی نے جیلے اور سیلے کو چھڑانے کے لئے شرفو اور سوار خان کو میرے پیچھے بھیجا تھا۔ ان کا ایک اور ساتھی پہلے ہی بس میں بیٹھا تھا اور اسی نے کنڈکٹر کو اڑنگا دیا تھا۔

وہ سب بس سے اتر چکے تو سوار خان نے رائفل کا بٹ مار کر بس کی کھڑکی کا ایک شیشہ زبردست دھماکے سے توڑ دیا پھر گرج کر بولا۔

"جا اپنی گنتی کے پھیرے: لے جا اب اس بس کو جلدی سٹارٹ کر

رابے"

ڈرائیور نے اس کی یہ بات سنی تو فوراً ہی پہلے گیئر میں ڈال کر بس کو بھگاتا ہوا دور لے گیا۔ اب وہ پانچوں مجھے گھیرے ہوئے کر کھیتوں کی طرف دھکیل رہے تھے۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے موڑ کاٹ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی سارا منظر بدل گیا تھا۔ اب دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا اور ان پانچوں کے تیور ایسے تھے جن سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

دائیں ہاتھ مکی کے کھیت تھے۔ یہ اونچے اونچے ٹانڈوں والی مکی یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ رویہ سوار خان کا تھا وہ ٹھہر ٹھہر کر میرے منہ پر طمانچے مار رہا تھا۔ کبھی پیچھے سے لات جما دیتا کبھی میری گدی میں دھول مار دیتا۔ وہ اپنے کسی پرانے زخم کا حساب چکار رہا تھا۔ جو اسے کسی پولیس والے کے ہاتھوں لگا تھا مگر اس کی ہر ضرب مجھے رلائے دیتی تھی بہت سخت ہاتھ تھا اس کا اور میں بھلا کہاں عادی تھا اس قسم کی مار کا۔ میں نے تو پولیس میں بھرتی ہونے کے بعد حکومت ہی کی تھی۔ مار ہی تھا لوگوں کو، مار کیا چیز ہوتی ہے اس کا تو مجھے قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا۔

"یار میرا خیال ہے پہلے پہلے! تم دونوں فوراً یہاں سے نکل جاؤ — ہم آجائیں گے بعد میں۔ ابھی تو ہمیں اس کا بھی ٹنٹا ختم کرنا ہے۔ پھر اُدھر اُدھر کے پاس بھی جانا ہے۔ بڑا زوردار پروگرام بنا رکھا ہے اس نے آج رات کے لئے کیوں بھئی شرفو ٹھیک ہے کہ نہیں"

"ہاں بھئی ہمارا یہ کام تو پورا ہو گیا کھول دے اس کی یہ ہتھکڑی اور اس کی وردی اتار کر جیلے کو دے دے کبھی کام ہی آئے گی جاتے" یہ شرفو کی تجویز تھی۔ میں تو سر پیٹ کر رہ گیا۔ میں نے دل میں کہا حرامزادو تمہارے ہاتھوں میری یہ درگت بھی بننا تھی۔ یہ ذلت بھی لکھی تھی میری تقدیر میں مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ میں چپ چاپ ان کی یہ زیادتی بھی سہہ گیا۔

جرسی اور بوٹوں سمیت انہوں نے میرے تمام کپڑے میرے جسم سے الگ کر لئے۔ اب میں ان کے سامنے ایک نیکر میں برہنہ کھڑا تھا اور وہ مجھے وہاں مکی کے کھیت میں اپنے سامنے ننگا دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ ایک دوسرے سے فحش مذاق کر رہے تھے۔ میں اس ذلت کو کبھی نہ بھول سکوں گا جیلانی میاں خدا کی قسم وہ بدترین دن تھا میری زندگی کا۔

پھر یوں ہوا کہ ان لوگوں نے میرے دونوں ہاتھ میری پیٹھ کے پیچھے باندھ دیئے — اس کے بعد انہوں نے میری آنکھوں پر یہ بڑی سی پٹی کس کر باندھی میرے تو پسینے چھوٹ گئے۔ وہ مجھے گولی مار دینے کی تیاری کر رہے تھے۔

"سوار خان: دوسری گولی کی ضرورت نہ پڑنے۔ ہمیں کہاں صاحب کو زیادہ تکلیف نہیں دینی چاہئے صاف ستھرا کام ہونا چاہئیے"

"صاف ستھرا ہی ہو گا پیلے!

کوئی اناڑی سمجھا ہے تو نے مجھے۔

لے ذرا کھڑا کھاں صاب کو سیدھا کر کے" انہوں نے میرے منہ میں ایک موٹا سا گول پتھر ڈال کر اوپر سے کپڑا باندھ دیا تھا۔ حالت میری یہ تھی کہ نہ میں بول سکتا تھا نہ دیکھ سکتا تھا اور پانچوں بدبخت میرے سامنے کھڑے آپس میں میرے بارے میں سخت فحش مذاق کر رہے تھے۔ ان کے لئے میں دل لگی کا سامان بن گیا تھا۔

جہاں ہم کھڑے تھے وہاں سے سڑک چار فرلانگ دور تھی۔ میں اپنی زندگی سے قطعاً مایوس ہو چکا تھا وہ مجھے گولی مار دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

"جلدی کر یار شرفو! اس کی ٹانگیں بھی باندھ دے۔ نشانہ چوک گیا یا یہ خود ہل گیا تو دو گولیاں خرچ کرنی پڑیں گی۔ کس کر باندھ دے اس کی ٹانگیں" شرفو نے میری ٹانگیں پکڑ لیں بولا۔

"بڑا پلا ہوا سور ہے یہ۔ دیکھ تو سہی پائے ایسی ٹانگیں ہیں اس کی۔ ادھر کر اپنے بہن کے بھگیں۔ اپنی دونوں ٹانگیں ساتھ ملا۔ تیرے چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے بچو" یہ کہہ کر اس نے میری ٹانگیں اکٹھی کر کے ان کو کسی پٹکے سے کس کر باندھ دیا۔ مجھ سے اپنا وزن نہ سنبھالا گیا اور میں دھڑام سے نیچے گر گیا۔ مکی کے ٹانڈے ٹوٹتے ہوئے میرے ساتھ گرے اور اس کے ساتھ ہی کچھ لمحے بعد دیگرے تیزی سے پانچ چھ گولیاں چلیں، تڑ تڑ، تڑ تڑ اور میرے ارد گرد چیخیں ہی چیخیں پھیل گئیں۔

"ہائے میں مر گیا شرفو! یہ کون ماں کا یار گولی چلا رہا ہے" یہ سوار خان کی آواز تھی وہ میرے قریب ہی گر گیا تھا۔

"ہائے بیڑہ غرق" ایک اور دلدوز چیخ ذرا فاصلے سے ابھری وہ شرفو کی تھی۔ میری آنکھیں بھی بند تھیں اور منہ بھی مگر کان کھلے تھے۔ کسی نے ان سب کو شاید باڑھ مار دی تھی۔ وہ میرے چاروں طرف کراہ رہے تھے اور پھر اچانک کسی نے میری آنکھوں سے اور منہ پر سے پٹی اتار دی۔

مجھے یوں لگا جیسے ماں کے پیٹ سے نکل کر پہلی بار روشنی دیکھی ہے۔ میرے سامنے وہ آدمی کھڑا تھا جو سیاہ کمبل کی بکل مارے بس میں میرے ساتھ کی سیٹ پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ اور پیر کھول کر مجھے کھڑا کیا تو میں حیران رہ گیا۔ سوار خان، شرفو، جیلا اور سیلا اور ان کا پانچواں ساتھی میرے سامنے اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ وہ سب خاصے زخمی تھے اور ہتھیار ان سے چھن چکے تھے۔

"تم...... تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے جوان! تم وہی ہو نا جو میرے ساتھ بس میں بیٹھے تھے میرے قریب ہی"

"ہاں — وہی ہوں —" وہ آدمی میری پتلون جیلے کے ہاتھ سے کھینچ کر مجھے دیتے ہوئے بولا۔ میں نے جلدی سے اس میں اپنا بدن چھپایا۔ "میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں جوان! یہ تو مجھے گولی مارنے لگے تھے"

"میں دیکھ رہا تھا" اس نے میری قمیص اور سویٹر بھی میری طرف بڑھا دیئے۔

"مگر تم نے کس طرح ہمت کر لی؟"

"میں — بس پاگل آدمی ہوں — اور پاگل پن میں ایسی ہمت کر ہی لیتا ہے آدمی"

"نہیں جوان — تم تو میرے لئے رحمت کا فرشتہ بن گئے ہو مگر یہ سب ہوا کیسے؟"

"ذرا آگے جا کر میں بس سے اتر گیا تھا —" اس نے اب میرے بوٹ میری طرف بڑھا دئے۔ جیلا سیلا اور سوار خان تجھے گالیاں دے رہے تھے —

شرفو بھی کراہ رہا تھا اور ان کا پانچواں ساتھی جس کا نام گل شیر تھا بے ہوش ہو چکا تھا —

میں نے بوٹوں کے تسمے بند کئے تو میری رائفل اس آدمی نے مجھے دے دی۔

"مگر تمہیں مجھے بچانے کا خیال کس طرح آیا۔ تم جانتے تھے کہ یہ کتنے خطرناک لوگ ہیں؟" میں نے اس آدمی سے پوچھا۔

"تم تنہا تھے۔ مجھے تم پر بہت ترس آ رہا تھا۔ میں ایسے بہت سے شہدوں کو جانتا ہوں — بالکل خبطی ہوتے ہیں ایسے لوگ۔ وہ ان جیسے تھے جن سے میں ابھی نمٹ کر آ رہا ہوں"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا نام صادق علی ہے"

"کون لوگ تھے وہ جن سے تم نمٹ کر آئے ہو؟"

"فنی تندوال کا نام سنا ہے تم نے؟"

"ہاں — وہ جو اکبر کوٹ کا بدمعاش ہے؟"

"ہاں — میں نے اسے قتل کر دیا ہے۔ اس کے دو بھائیوں کو اور اس کے بھتیجا کو بھی مار آیا ہوں۔ اس کے دو دوست بھی زخمی ہو گئے تھے اس پر" اس نے مجھے مختصر الفاظ میں اپنی کہانی سنائی۔

"بہت بڑا کارنامہ کیا ہے تم نے — مگر اب کہاں پر جا رہے تھے تم؟"

"میرا اب اکبر کوٹ میں کچھ بھی نہیں رہا۔ میری ماں، میری بہن اور وہ جسے میں زندگی سے زیادہ چاہتا تھا۔ تندوال کی بہن دردانہ، سب ختم ہو گئے۔ میں مجھے اب جینے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر میں پولیس جیل اور پھانسی گھر کے چکر سے بچنا چاہتا ہوں" اس نے بڑے دلگیر لہجے میں کہا۔ وہ بہت دکھی تھا۔

تب جیلانی میاں! میں نے سوچا کہ اس جوان کے احسان کا کچھ نہ کچھ بدلہ تو مجھے چکانا ہی چاہئے۔ میں کہہ سکتا تھا کہ ان پانچوں کو وہاں کھیت میں میں نے مقابلہ کر کے ڈھیر کر دیا ہے کوئی میرا بال بیکا نہ کر سکتا تھا۔ اگر میں صادق علی کو اس قصے سے بالکل نکال دوں تو میرا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ بس یہی بات سوچ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس کی ضرور مدد کروں گا۔ اس نے وہیں بیٹھ کر مجھے تفصیل سے جب اپنی کہانی سنائی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ تو بہت ہی مظلوم ہے۔

ان دنوں میرا ایک دوست ادھر کاموٹکی میں ایک پرائیویٹ سکول میں پڑھاتا تھا۔ میں نے صادق علی کو وہیں کھڑے کھڑے ایک رقعہ لکھ کر دیا کہ وہ اسے لے جا کر میرے دوست کو دے دے۔ وہ اسے نوکری بھی دے گا اور رہنے کے لئے جگہ بھی فراہم کرے گا۔ صادق علی نے میری تجویز پسند کی اور میرا رقعہ لے کر وہیں سے مجھ سے رخصت ہو گیا۔

مگر وہ سیدھا کاموٹکی نہیں پہنچا۔ وہ پہلے لاہور گیا۔ وہاں سے اس نے ایک خاص قسم کا تیزاب لیا اس میں کچھ چیزیں اس نے خاص تناسب سے ملائیں۔ مجھے اس نے بہت بعد میں ایک ملاقات کے دوران بتایا کہ وہ نسخہ اس نے ایک حکمت کی کتاب میں دیکھا تھا۔ اس کے مطابق اس نے ایک خاص قسم کی دوا تیار کی پھر وہ دوا اس نے ایک خاص طریقے سے اپنے چہرے کے کچھ حصوں پر، ہاتھوں پر، پیٹ پر اور ٹانگوں پر اس طرح ملی کہ جہاں جہاں وہ دوا لگی رہی وہیں سے اس کی جلد جل گئی۔ اور نیچے سے جلد کی دوسری پرت یوں ابھر آئی کہ دیکھنے والا یہی سمجھتا تھا کہ ماسٹر صادق علی کو برص کا مرض ہے۔

اس طرح اس نے اپنا حلیہ کچھ یوں تبدیل کر لیا کہ زندگی بھر کے لئے وہ پولیس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اپنا چہرہ بدل کر جب وہ کاموٹکی پہنچا تو میرے دوست نے اسے یہاں کمال پور بھیج دیا۔ یہ مکان میرے دوست کا جدی پشتی مکان ہے۔ وہ اسے غیر آباد نہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ یہاں صادق علی کو آباد کر دے۔ سو یہی ہوا۔ صادق علی یہاں آ کر رہنے لگا۔

ایک روپوش کی حیثیت سے اس نے یہاں اپنی پوری زندگی چپ چاپ گزار دی۔ یہاں تک کہ اس گاؤں کے لوگ اس کی شرافت اور دیانت کی قسم کھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آرسی نے اپنی بیٹی کی بپتا مجھے سنائی تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ زینو کو قانون کی چکی سے نکال کر

صادق علی کی چھت تلے بٹھا دوں گا۔ اسی لئے میں زینو کو یہاں چھوڑ گیا تھا مگر اب جو کچھ تم نے بتایا ہے جیلانی! یہ سب میرے لئے بے حد تکلیف دہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ چوہدری کو پھانسی کے تختے تک پہنچا دوں۔ یہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ آج ہی دونوں گھٹے پکڑے جا سکتے ہیں۔ ان کا فوراً طبی معائنہ ہو سکتا ہے کہ ان پر کس نے ستم توڑا ہے مگر...... مگر صادق علی کا جرم تو اسی قابل تھا۔ اس پر تو گھٹے چھوڑنے ہی چاہیئے تھے۔"

یہ کہہ کر وارث علی خلا میں گھورنے لگا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا اور زینو ابھی تک واپس نہ آئی تھی۔ پھر اچانک وارث علی کو کچھ یاد آیا، بولا۔ "یار میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ وہ اس طرح مُردہ عورتوں کو کیوں ذلیل کرتا تھا۔ شکل تو اس نے اپنی بگاڑ ہی لی تھی ــــ کام بھی اس نے بجوؤں ایسے شروع کر دیئے ــ آخر کیوں؟"

"میرا خیال ہے وارث علی! اسے عورتوں سے نفرت ہو گئی تھی وہ کہتا تھا کہ عورتیں اس قابل نہیں ہوتی ہیں کہ ان سے محبت کی جائے وہ بہت قیمت مانگتی ہیں اپنے بدن کی۔ عورت چاہتی ہے کہ اس کا عاشق اس پر اپنی ماں، باپ، بہن، بھائی سب کچھ قربان کر دے۔ بہت اونچی قیمت لگاتی ہے وہ اپنی محبت کی۔ میں تو دے بھی چکا وہ قیمت عمر بھر بھی محروم ہوں۔ تو...... تو پھر میں لعنت نہ بھیجوں ان عورتوں پر ــــ ان سے زیادہ بڑا خسارے کا سودا اور کون سا ہو گا جیلانی میاں ــــ وہ مجھ سے یہی کہا کرتا تھا اور اس کے تجربے کی روشنی میں دیکھیں تو یہ بات کچھ بھی تعجب انگیز نہیں رہتی۔"

"مجھے حیرت ہے جیلانی میاں ــــ وہ بہت بڑی پناہ گاہ تھا میرے لئے اور میری اس بیٹی کے لئے جسے آرسی نے جنم دیا۔ تم نے زینو کو بھی دیکھا ہے اور مجھے بھی۔ خدا کی قسم کھا کر کہو کوئی فرق دیکھا ہے تم نے ہماری صورتوں میں؟ وہ ہو بہو میری شبیہ نظر آتی ہے۔ اسی لئے میں اسے موت کی تند و تیز آندھیوں سے بچانے کے لئے یہاں لے آیا تھا۔ صادق علی کی زندگی میں مجھے زینو کے بارے میں قطعاً کوئی تشویش نہیں تھی۔ زینو بھی اس کی بے حد عزت کرتی تھی مگر اب اس کے سر سے وہ سایہ بھی اٹھ گیا ہے۔ میں اس چوہدری کو سزا دلوائے بغیر نہیں رہوں گا خدا کی قسم! صادق علی کا مجھ پر بڑا احسان تھا۔ میں اس کی موت رائیگاں نہ جانے دوں گا۔"

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں وارث علی! مگر یہ بھی تو سوچو کہ میں صادق علی کے قتل کا واحد عینی شاہد ہوں۔ ابھی تک چوہدری کو یہ علم نہیں ہے کہ میں اس کے گاؤں میں چھپا ہوا ہوں اور صادق علی کے گھر میں رہتا ہوں اس نے رات پہلی بار میری صورت دیکھی تھی اگر معاملہ صادق علی کے قتل کا عدالت تک پہنچا تو تمہیں میری گواہی کی ضرورت ہو گی جو میں ایک مفرور ہونے کی وجہ سے کبھی نہ دے سکوں گا۔ پھر اگر کسی طرح چوہدری نے مجھے یہاں شناخت کر لیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہی اس کی کوشش ہو گی کہ وہ مجھے ختم کر دے۔" میں نے اپنے اندیشے ہی پر ظاہر کر دیئے۔

"تم فکر نہ کرو جیلانی میاں! میں بچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں ــــ تم آج ہی زینو کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ اپنی والدہ کے پاس چلے جاؤ اور شہر میں الگ مکان لے کر رہنے لگو۔ میں صادق علی کے قتل کی تفتیش شروع کرا دیتا ہوں۔"

"اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ صادق علی کا فعل ساری دنیا کے سامنے اظہر من الشمس ہو جائے گا۔ زینو بھی جان جائے گی کہ جس آدمی پر وہ اپنے باپ کی طرح بھروسہ کرتی تھی کس قدر گھناؤنے کردار کا مالک تھا۔ چوہدری کو اگر قتل کا اعتراف کرنا پڑا تو وہ یہ بات تو عدالت کے سامنے ضرور ہی کہے گا...... کہ صادق علی پر اس نے گھٹے کیوں چھوڑے تھے؟" میں نے وارث علی کو سمجھایا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو جیلانی میاں! کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا ہے مجھے۔" ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ زینو سامنے کی چھت پر نمودار ہوئی اس نے اپنے باپ کو سامنے دیکھا تو تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے آ گئی اور دوڑ کر وارث علی کے سینے سے جا لگی۔ خون اپنا کرشمہ دکھا رہا تھا ــــ

"آپ کب آئے چاچا؟"

"میں...... میں، بس کوئی دو گھنٹے تو ہو ہی گئے ہوں گے سنا ہے تمہاری سہیلی نوراں مر گئی ہے؟"

"ہاں چاچا! کنواری تھی بیچاری۔ پتہ نہیں کیا ہوا بس پیٹ میں درد اٹھا تھا اس کے ــــ چار دن بھی نہ سہہ سکی وہ درد۔"

"بہت افسوس ہے بیٹی ــــ وہی تو سہیلی تھی تمہاری اس گاؤں میں۔"

"زینو! بھی بھوک لگی ہے بشیر۔ کچھ جانے والے میں ابھی تو سوچ ہی رہا تھا میں نے اسے یاد دلایا۔"

"اوہ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا ہے جیلانی بھائی! وہ ماموں جانے پتہ نہیں کہاں چلے گئے ہیں؟ ساتھ کے گاؤں گوگل پور سے وہ گوشت ہی لا دیتے تھے گاؤں میں۔ ابھی ادھر جبھی کی طرف گیا ہو گا۔"

"گوشت تو ضرور پکنا چاہئے زینو! تمہارے چاچا آئے ہیں۔ میں ان کی گھوڑی پر جاتا ہوں ابھی لے آؤں گا۔"

"تو پھر ضرور جائیں۔ دو سیر گوشت لے آئیں وہاں وہ فقیریا قصائی ہو گا۔ بڑا اچھا جانور کاٹتا ہے وہ روزانہ۔"

"اتنی ساری باتیں معلوم ہیں تمہیں اس کے بارے میں حیرت ہے۔ لاؤ میں جاتا ہوں۔"

"کیا لاؤں؟ تھیلا دے دوں آپ کو؟"

"ہاں تھیلا بھی دے دو۔" یہ کہہ کر میں پلنگ سے اٹھ کر کمرے میں جا گھسا۔ میں نے اوور کوٹ پہنا اس کے نیچے پستول لٹکایا۔ جس کی پیٹی پر گولیاں عجیب بہار دکھاتی تھیں مجھے اب اسلحے سے محبت ہو گئی تھی۔ اس سے زیادہ انسان دوست اور انسان دشمن چیز اور کوئی نہ ہو گی۔ یہ بچاتا بھی ہے اور تباہ بھی کرتا ہے مگر اللہ ماللہ اور قسمت قسمت کے فرق کی بات ہے اور یہ اسلحہ اچھی قسمت اور بُری قسمت کے درمیان فیصلہ کن لکیر کھینچ دیتا ہے۔ صادق علی میرے لئے بہت عمدہ قسم کی ٹوپیاں لایا تھا۔ ایک ٹوپی میں نے سر پر جمائی سگریٹ اور ماچس جیب میں رکھے اور اچھی طرح تیار ہو کر میں باہر نکلا اور وارث علی کی گھوڑی پر بیٹھ کر گوگل پور کی طرف چل دیا۔ وہ پہلا دن تھا کہ میں یوں بے فکری سے باہر نکلا تھا۔ احساس مجھے یہ تھا کہ اپنے عمدہ لباس میں اور اپنی لمبی لمبی مونچھوں اور مُشت بھر لمبی ڈاڑھی سے جو میں نے قید کے دوران بڑھالی تھی۔ نجات حاصل کرنے کے بعد میرا حلیہ یکسر تبدیل ہو چکا ہے اس لئے مجھے کوئی ہرگز پہچان نہ سکے گا۔

دُور دُور تک کھیتوں میں ہریالی کی چادریں سی بچھی نظر آتی تھیں وہ بڑا روشن دن تھا ایسے...... روشن دن میں نے زندگی میں بہت کم دیکھے ہیں۔ کچھ میں بھی اس روز عجیب سی ذہنی آزادی محسوس کر رہا تھا...... وارث علی سے مل کر مجھے بڑا اطمینان ہوا تھا ــــ وہ پولیس کا ایک اہم افسر تھا وہ بھی ایک جرم میں ملوث تھا اسی وجہ سے وہ میرے بارے میں چشم پوشی سے کام لے رہا تھا ــــ یہ سوچ کر مجھے طمانیت محسوس ہوتی تھی کہ ابھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو میرے نکتۂ نظر کو سمجھتے ہیں مجھے اتنا بڑا مجرم اور...... خالی ضمیر نہیں سمجھتے جتنا میں اپنے بارے میں سمجھتا ہوں۔

وارث علی کی گھوڑی اشارہ سمجھتی تھی۔ وہ پگڈنڈی پر چڑھتے ہی مجھے گوگل پور کی طرف لے اُڑی سمت مجھے زینو نے سمجھا دی تھی کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

گوگل پور کمال پور سے خاصا بڑا گاؤں ہے ــــ میں نے فقیریا قصائی کی دکان سے دو سیر گوشت خریدا اور انہی قدموں واپس چل دیا ابھی میں نے آدھا راستہ طے کیا تھا کہ اچانک راجباہ کے کنارے کھڑے ایک آدمی نے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے لگام کھینچ کر گھوڑی کو مدھم کیا اور اس آدمی کے قریب جا پہنچا۔ اب جو میں اسے غور سے دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ وہ تو وہی چوہدری ہے۔ صادق علی کا قاتل۔ میرا تو خون کھول اٹھا۔ میرا جی چاہا کہ میں اسے روند ڈالوں۔ اس کی ہڈیاں توڑ دوں وہ میرے سامنے کھڑا عجیب سے گھٹے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس کی عمر بھی کوئی چالیس سال ہو گی مگر صحت اس کی بہت اچھی تھی ــــ وہ لمبی سی اچکن پر گرم چادر لپیٹے ہوئے تھا۔ ہاتھ میں اس نے بڑا نفیس قسم کا بید پکڑ رکھا تھا۔ ریشمی تہمد کے نیچے طلائی کام سے مزین کھُسّا اسے بہت سجتا تھا ــــ میں اس کے قریب پہنچا تو بولا۔

"کہاں سے آئے ہو جوان؟"

"میں گوگل پور سے آیا ہوں۔"

"میرا مطلب ہے ادھر کیسے پھر رہے ہو کسی کے گھر مہمان ٹھہرے ہو یہاں؟"

اس کی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ مجھے پہچان گیا تھا اور محض یہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں بھی اسے پہچان سکتا ہوں کہ نہیں کسی طرح بھی اس کے چہرے سے اندازہ نہ ہوتا تھا کہ رات اس نے ایک آدمی کو اپنے خونخوار کُتوں کا نوالہ بنا دیا تھا۔

"ایک شخص صادق علی رہتا ہے ادھر کمال پور میں۔ میں اس سے ملنے آیا تھا۔ مگر وہ مل ہی نہیں رہا۔"

چوہدری کا رنگ بدلنے لگا۔ اس نے میری نظر کے برسے سے بچنے کے لئے اپنا دھیان گھٹنے پر پڑی گرد کی طرف منتقل کر دیا۔ دو تین مجوتیاں بید کی ضرب سے جھاڑ کر اس نے سر اوپر اٹھایا اور بولا۔

"تم نے اس کے گھر سے معلوم نہیں کیا؟"

"کیا ہے؟ مگر وہاں سے ایک لڑکی نے بتایا ہے کہ صادق علی رات سے غائب ہے۔"

"تمہیں کیا کام ہے اس سے؟"

"میں اس کا پرانا دوست ہوں۔ ہم اکٹھے ہی ایک سکول میں پڑھاتے رہے ہیں۔" میں نے بات بنائی۔

"تم شاید وہی ہو جسے رات ہم نے قبرستان میں دیکھا تھا۔ میں اپنی بیٹی کو دفن کر کے بیٹھا تھا وہاں۔"

"اور پھر تم نے صادق علی پر اپنے کُتے بھی چھوڑے تھے۔ ایسے وقت سے باندھ رکھا تھا تم نے۔"

"اچھا۔ تو یہ بات ہے پھر تو میرا خیال ہے مجھے تمہارا بھی قصہ پاک کر دینا چاہئے۔" یہ کہہ کر اس نے کمبل کے نیچے سے اپنا دایاں ہاتھ اچانک باہر نکالا۔ اس میں اس نے پستول تھام رکھا تھا۔ مگر بیشتر اس کے کہ وہ فائر کرتا میں نے گھوڑی اس پر چڑھا دی گھوڑی کا اگلا دایاں سُم اس کے سینے پر لگا۔ اس نے فائر تو فضا میں کیا مگر سُم اپنا کام دکھا چکا تھا۔

چوہدری گر گیا۔ میں نے گھما کر گھوڑی کو ایک بار پھر اس کے اوپر سے گزار دیا۔ اب کی بار گھوڑی کا پاؤں اس کے پیٹ پر پڑا اور بس۔ چوہدری اپنے ہی خون میں لت پت پڑا تھا۔ دُور دُور تک مجھے کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا سناٹا تھا بے پناہ سناٹا۔ میں نے لگام کھینچی اور گھوڑی کو پانی سے سیراب کھیتوں میں سے دوڑاتا ہوا کمال پور جا پہنچا۔ پانی میں چلنے کی وجہ سے گھوڑی کے کسی بھی سُم پر خون کا کوئی نشان موجود نہیں رہا تھا البتہ کیچڑ اور ریت کے گوندے سے پہن لئے تھے اس نے۔ وہ چوہدری کا سینہ بھی کھول آئی تھی اور پیٹ بھی۔ پھر راستہ میں نے گھوڑی کو گھاس پر بھی لے کر چلایا تھا کہ اس کا کھُرا نہ لیا جا سکے۔

جب میں نے صحن کے کھونٹے جا کر گھوڑی کو باندھ دیا تو ایک اطمینان

میرا سانس میرے سینے سے یوں نکلا جیسے کسی بدنصیب کا کوئی ارمان نکلتا ہے۔ میں اس گھڑی بہت خوش تھا۔ میں نے صادق علی کے دشمن سے اس کا حساب چکا دیا تھا۔

گرنشٹ کا تھیلا میں نے زینو کو دیا تو وارث علی میرے چہرے کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے بہت تھکا ہوا ہے ہو اس وقت۔ معلوم ہوتا ہے کوئی زبردست خوشی دیکھی ہے تم نے؟"

"ہاں۔ معاملہ ہی ایسا ہوا ہے وارث علی۔ بہت بڑی بات ہوئی ہے" میں نے سرگوشی کی۔

"مجھے نہیں بتاؤ گے" وہ دبی آواز میں بولا۔

"بتاؤں گا کیسے نہیں۔ وہ زینو گھینو اُدھر چلی گئی ہے نا؟"

"ہاں وہ گئی اُدھر باورچی خانے میں۔ ہماری آواز نہ سن سکے گی اب وہ۔"

زینو کی طرف سے اچھی طرح تسلی کر لینے کے بعد میں نے وارث علی کو بتا دیا کہ کس طرح میں بڑی بی کو اس کے تمام غموں سے نجات دلا آیا ہوں۔ وارث علی نے میری کہانی سنی تو عش عش کر اٹھا بولا۔

"تم نے کمال کر دیا ہے جیلانی میاں! اب کوئی تمہاری ہوا کو بھی نہیں چھو سکتا۔ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ اب ہمیں ضرورت ہی نہیں رہی کہ ہم خواہ مخواہ تھانے اور پولیس کے چکر میں پڑیں۔"

"صادق علی کی روح مطمئن ہو گئی ہوگی وارث علی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو ساری عمر بیٹھ کر پچھتاتا۔ مجھے اپنی اس بزدلی پر سخت ندامت محسوس ہوتی تھی" میں نے اوور کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔ صحن میں دھوپ نے ڈیرے ڈال رکھے تھے اور ہوا میں سے نمی اور خنکی کا احساس ختم ہوتا جا رہا تھا۔

"لو یہ سگریٹ پیو۔ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم نے ضرورت کی اچھی اچھی چیزیں یہاں جمع کر لی ہیں۔"

"ان کے بغیر مجھے کوفت محسوس ہوتی رہتی تھی مگر یہ تم نے گردن پر پٹی سی کیسی باندھ رکھی ہے؟" میں نے پوچھا

"وہ زینو نے باندھ دی ہے کہتی تھی میری رگیں کچلی ہوئی ہیں۔ یار یہ بتا جیلانی تو نے مجھے بے ہوش کس طرح کر دیا تھا؟ میں تو حیران رہ گیا ہوں۔ میری گردن ابھی تک سیدھی نہیں ہو رہی ہے"

اپنا راز چھپاتے ہوئے میں نے کہا۔

"پتہ نہیں بس یونہی ہاتھ مار دیا تھا میں نے تمہاری گردن پر۔ مگر اب یہ بتاؤ کہ صادق علی کے بعد تم زینو کو کہاں رکھو گے؟"

"تم جو یہاں ہو اس کے پاس" وہ بولا۔

"نہیں۔ میں تو یہاں نہیں رہ سکتا ہمیشہ کے لئے۔ جب تم میری پوری کہانی سنو گے تو خود ہی سمجھ گے کہ مجھے آگے جانا چاہئے"

"ہاں یار! اپنے بارے میں تو تم نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔ آخر تم اس صادق علی تک کیسے پہنچے؟" یہ کہہ کر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ وہ لگاتار پھونکتا جا رہا تھا اور میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کھانے پینے کے معاملے میں بے حد حریص ہے۔

اس نے جب میرے معاملات میں دلچسپی دکھائی اور جب میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ کام کا آدمی ہے اور اس سے شاید میں کوئی اچھا مشورہ لے سکوں۔ تو میں نے الف سے ے کر یے تک اسے اپنی ساری کہانی سنا دی ــــ جوں جوں میں اسے اپنے زخم دکھاتا گیا اس کی حالت بدلتی چلی گئی۔ جب میں اپنی بات ختم کر چکا تو وہ بولا۔ "کیا نام بتایا ہے تم نے اپنی بہن کا؟"

"آسیہ"

"تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟"

"عثمان آفندی"

"عثمان آفندی؟" یہ نام سن کر وارث علی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"کیا حلیہ ہے تمہاری بہن کا؟"

"اس کا حلیہ؟ میں کیا بتاؤں تمہیں وارث علی بس میری ماں سے اس کی شکل خاصی ملتی جلتی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ...... اس کے...... بائیں رخسار پر یہاں...... نتھنے کے قریب یہ ذرا سا سیاہ تل ہے جو...... بہت بھلا لگتا ہے اور اس کے اگلے دو دانتوں کے درمیان ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے جو بہت ہی خوبصورت بناتی ہے اس کے دانتوں کو۔ اور اس کی ٹھوڑی کے نچلے حصے میں...... یہاں کر کے ایک بھورے رنگ کا داغ ہے۔"

"وہ...... دیکھا دی تھی۔ یقیناً وہ وہی تھی۔ کاش۔ میں اسے پہچان لیتا اسے روک سکتا"

میں نے وارث علی کو ایک دم گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"تم بتاتے کیوں نہیں ہو۔ کہاں ہے میری بہن؟ اسے تم نے ضرور دیکھا ہے ورنہ تم اتنی باتیں نہ پوچھتے مجھ سے ــــ بتاؤ کہاں ہے میری بہن آسیہ؟"

میں ایک دم رونے لگا۔ میری آواز شدت جذبات سے لرز رہی تھی وارث علی نے میری بہن کو دیکھا تھا۔ اس نے شاید باتیں بھی کی تھیں۔ مگر وہ چپ تھا۔ کچھ نہیں کہتا تھا ــــ

"بتلاتے کیوں نہیں ہو؟ کہاں ہے میری بہن؟" میں نے اسے پھر جھنجھوڑا۔

"بتاتا ہوں۔ ٹھہرو۔ ذرا دم لینے دو۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ وہ تمہاری بہن نکلی۔ اس آدمی کی بہن جو میری بیٹی کا سگے بھائی کی طرح خیال رکھتا ہے"

"میں تمہاری بیٹی پر اپنی جان وار سکتا ہوں وہ بھی میرے لئے آسیہ ایسی ہے وارث علی مگر مجھے بتاؤ تو سہی میری بہن کہاں ہے؟ کب دیکھا تھا تم نے اسے؟"

"میں...... میں ان دنوں وزیر آباد میں متعین تھا صدر تھانے میں ــــ رات کی گشت پر میں خود بھی نکلتا تھا میرے ساتھ ایک سب انسپکٹر ہوتا تھا اختر۔ وہ ذرا موج میلے کا شوقین آدمی ہے پیتا پلاتا بھی ہے ــــ کبھی کبھار میں بھی اس کے ساتھ دو گھونٹ پی لیا کرتا تھا ــــ میری یہ عادت ابھی تک نہیں گئی۔

مجھے یاد ہے وہ ہفتے کی رات تھی۔ ہم ادھر تحصیل کی عمارت کی طرف نکلے تھے میرا خیال ہے رات کا ایک بج رہا تھا ہم دونوں سکوٹر پر تھے وہ میرا ذاتی سکوٹر تھا اب تو خیر بیچ دیا ہے میں نے ــــ چلتے چلتے ہم مشن سکول کے پیچھے کی ایک گلی میں جا نکلے۔ ابھی ہم اس گلی کے وسط میں پہنچے تھے کہ ایک مکان سے زبردست چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم دونوں تیزی سے اس مکان کی طرف بڑھے۔ ابھی ہم سکوٹر سے اترے ہی تھے کہ مکان کی بیٹھک کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکی تیزی سے باہر نکلی اس کے بال کھلے تھے اور لباس تار تار ہو رہا تھا۔ وہ ایک چادر بدن پر لپیٹتی ہوئی گلی میں آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبے دستے کا کھلا چاقو تھا جس کا پھل صاف طور پر چٹکی چاندنی میں خون آلود نظر آتا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لی مگر وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح مجھ سے الجھ گئی ــــ "چھوڑ دو میرا ہاتھ ورنہ میں تمہیں بھی جان سے مار دوں گی چھوڑ دو میرا ہاتھ ــــ" اس نے میرے ہاتھ پر اپنے دانت گاڑ دیئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر میں نے بائیں ہاتھ سے اس کے لمبے لمبے بال پکڑ کر اسے جھٹکا جو دیا تو اس کے دانت کھل گئے۔ اور وہ پیچھے کی طرف جھک گئی۔

اتنے میں مکان کے اندر سے ایک بڑھی عورت باہر نکلی ــــ وہ دہائی دے رہی تھی۔ اپنے گھر کے سامنے جو اس نے دو پولیس والوں کو دیکھا تو فوراً چپ ہو گئی اور تیزی سے واپس ہونے لگی۔

"ٹھہر مائی! لے چلو چوہدری جی اسے اندر" اختر نے آگے بڑھ کر اس بڑھیا کو روکا۔

میں اس لڑکی کو دھکیلتا ہوا مکان کے اندر لے گیا۔ "کس کو چاقو مارا ہے تم نے؟ کون رہتا ہے یہاں؟" میں نے اس لڑکی کو صحن میں لے جا کر بتی کی روشنی میں کھڑا کر کے کہا ــــ لڑکی کے چہرے پر خراشیں تھیں۔ اس کے دائیں رخسار پر لگتا تھا کسی نے اپنے دانت گہرے گاڑ دیئے تھے۔ وہ رو رہی تھی مگر بے آواز ــــ

"بتاتی کیوں نہیں مائی؟ کس کو مارا ہے اس نے؟"

"وہ...... وہ...... وہ اس نے میری چھوٹی بہن کو مار دیا ہے وہ اندر پڑی ہے"

اچانک مجھے دوسری منزل کے ایک کمرے میں سے دو آدمی تیزی سے ایک کھڑکی میں سے کود کر دوسرے مکان میں جاتے نظر آئے۔

"اسے سنبھالو اختر" میں نے لڑکی اختر کے حوالے کی اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھا مگر وہ بہت تیز نکلے۔ جب تک میں چھت پر پہنچا وہ غائب ہو چکے تھے۔

مایوس ہو کر میں نیچے اترا اور اس لڑکی کو دھکیل کر کمرے میں لے گیا جس نے چادر سے اپنا پورا بدن ڈھانپ رکھا تھا ــــ اور چہرہ اس کا خوف سے زرد ہو رہا تھا۔ کونے میں سے کسی کے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ "کس کو مارا ہے تم نے؟"

"وہ پڑی ہے سامنے وہ چڑیل! اس کا نام صابری ہے۔ یہی مجھے برے کام پر مجبور کرتی تھی۔"

میں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر عورت چارپائی پر پڑی تھی۔ اس کے جسم پر کئی زخم لگے تھے مگر کوئی بھی اتنا گہرا نہیں تھا کہ اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوتا ــــ

"ان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"کوئی تعلق نہیں ہے جناب! یہ ہمارے ایک واقف کار کی بہن ہے وہ آدمی اسے چند دن پہلے ہمارے پاس چھوڑ گیا تھا۔ یہ بدچلن لڑکی ہے آج اپنے یاروں کو لے کر اوپر کے کمرے میں جا گھسی تھی کہ میری بچی گلو نے اس پر اعتراض کیا۔ بس اسی بات پر ان میں جھگڑا ہو گیا اور اس نے اسے چاقو مار دیا۔" مائی نے ہماری اچھی طرح تسلی کر دی۔

"اور وہ جو دو آدمی اوپر کے کمرے سے ساتھ کے مکان میں کود گئے ہیں وہ کون ہیں؟"

"وہ...... وہی تو اس کے یار تھے جی!"

"کہاں سے آئے تھے وہ؟"

"ہمیں کیا پتہ جناب! یہ خود ہی لائی تھی انہیں"

"کیوں جھوٹ بولتی ہو بڑھیا۔ خدا کو جان دو گی کہ نہیں۔ میں بتاتی ہوں جناب کہ وہ کون تھے۔ ان میں سے ایک کا نام انور بیگ اور ایک کا نام طلوس خان ــــ وہ دونوں لاہور کے ایک غنڈے سوات خان کے ملازم ہیں۔ مجھے یہ لوگ چھ روز پہلے لاہور سے اغوا کر کے لائے تھے سوات خان تو پیچھے رہ گیا اور یہ دونوں آدمی مجھے یہاں اس بڑھیا کے پاس لے آئے ــــ آج ان لوگوں نے یہاں کے ایک آدمی ملک ریاض کے ہاتھ مجھے تین ہزار روپے میں ایک رات کے لئے بیچ دیا ــــ وہ آدمی اوپر کمرے میں پڑا ہے میرا خیال ہے وہ مر گیا ہوگا۔ اسے بھی میں نے چاقو مار دیا تھا۔ میں اس سے جان چھڑا کر بھاگی تو راستے میں گلو آ گئی۔ وہ مجھے پکڑنا چاہتی تھی مگر میرے سر پر تو خون سوار تھا میں نے اسے بھی چاقو پر دھر لیا۔ یہ ہے اصل واقعہ ــــ باقی سب باتیں جو یہ بڑھیا گھڑ کر بتا رہی ہے بالکل غلط ہیں۔"

اس لڑکی نے بڑے اعتماد سے ساری بات بتا دی۔ اس کا خوف بڑی حد تک ختم ہو چکا تھا۔ وہ اپنی عصمت کی حفاظت کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس کی گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پڑھی لکھی

لڑکی ہے۔

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"میرا نام آسیہ ہے۔" وارث علی کے منہ سے جونہی یہ الفاظ نکلے میرا دل اچھل کر حلق میں آرہا۔ اپنی نبضیں مجھے اکھڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ ظالم میری ہی ماں جائی ستم رسیدہ بہن کی کہانی سنا رہا تھا ــــ اور میں ایسا بدنصیب تھا کہ اس کے لئے اب تک کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ میری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر وارث علی بولا۔

"مجھے معلوم ہے جیلانی میاں تم کیا محسوس کرتے ہو مگر..... مگر زندگی ایسی ہی ہے میرے دوست! میری بات غور سے سنو۔ تمہاری بہن تم سے بھی زیادہ مضبوط دل و دماغ کی مالک ہے۔ وہ بہت بہادر لڑکی ہے اس کی میں جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ مگر وہ حالات کی چکی کے دو پاٹوں میں پس کر رہ گئی تھی اسے قدم قدم پر زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔" پھر قدرے رک کر بولا، میں نے اس سے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ اوپر دیکھیں تو تمہارا دوسرا شکار کون ہے؟"

یہ کہہ کر میں آسیہ کو لے کر اوپر کی منزل پر جا چڑھا۔ وہ ٹھیک کہتی تھی کمرے میں شہر کے سب سے بڑے رئیس کا بڑا بیٹا شدید زخمی پڑا تھا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ اس کے جسم پر چاقو کے تین گہرے گہرے زخم تھے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا کیا انجام ہو گا؟

آخر کار اسی وقت تھانے بھیج کر میں نے گاڑی منگوائی اور دونوں زخمیوں کو اسی وقت ہم نے ہسپتال منتقل کیا اور اس لڑکی کو بڑھیا کے ساتھ لے جا کر حوالات میں بند کر دیا۔

ہم نے بہت پوچھا آسیہ سے کہ وہ سوات خان کون ہے؟ انور اور ملوس خان کون ہیں؟ مگر وہ کچھ بھی نہ بتا سکی۔ یہی کہتی رہی کہ انہوں نے اسے رات کے وقت اس کے گھر سے اغوا کیا تھا کیونکہ وہ اس کے بھائی کے دشمن تھے۔ بھائی کا نام وہ غلام جیلانی ہی بتاتی تھی ــــ سارے پتے اس نے صحیح دیئے تھے مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے اغوا کنندگان کون ہیں۔ ہم نے بعد میں اس کے دیئے ہوئے پتے پر جب رابطہ قائم کیا تو اس کی ماں وہاں موجود نہ تھی اور کسی ہمسائے کو علم نہ تھا کہ وہ کہاں چلی گئی ہے آسیہ کا بھائی بھی وہاں سے غائب تھا اس لئے ہم اس سلسلے میں کچھ بھی نہ کر سکے۔

یہ بات ثابت تھی کہ اس بڑھیا کو اگر بروقت طبی امداد نہ ملتی تو وہ بھی جانبر نہ ہو سکتی تھی مگر رئیس کو ڈاکٹر سر توڑ کوشش کے باوجود نہ بچا سکے۔ اور وہ تیسرے ہی دن مر گیا جس سے آسیہ کے خلاف مقدمے کی نوعیت ہی بدل گئی۔ آسیہ ایسی بے سہارا تھی کہ اس کے مقدمے میں کسی نے بھی دلچسپی سے اس کی پیروی نہیں کی۔ ہماری بھی یہی کوشش تھی۔ مجھے معاف کر دینا جیلانی میاں۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ ہم بھی اسے ہر حال میں سزا دلوانا چاہتے تھے یہی پولیس والوں کی کوشش ہوتی ہے۔

سو ہم نے ساتویں پیشی پر اسے سیشن کی عدالت سے عمر قید کی سزا دلوا دی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ بڑھیا بھی اس مقدمے میں باعزت بری ہو گئی اور اس کی بہن بھی جسے آسیہ نے زخمی کیا تھا۔"

وارث علی نے بڑے ہی یخ بستہ انداز میں آسیہ کی بدنصیبی کی کہانی مجھے سنائی تو میرا یہ حال تھا کہ میرا سارا بدن پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ وہ ہستی جس کے لئے میں فرشتے سے شیطان کے قالب میں ڈھل گیا، قاتل بن گیا۔ زندگی کی ساری راحتی اور رعنائی سے محروم ہوا۔ وہ بھیڑ بھیڑ جل گئی تھی۔ جس کے لئے میں روم روم سے لہو بن رہا تھا۔ زندگی نے اسے یوں تباہ کیا تھا۔ کہ وہ پھر کبھی زمین پر سر اوپر اٹھا کر نہ چل سکتی تھی۔

"کس جیل میں گئی تھی وہ سزا پا کر؟"

میں نے بہت بجھے ہوئے دل سے پوچھا۔ ایک ایک کر کے سارے تیر میرے ہاتھ سے چھوٹ چکے تھے۔

"وہ لاہور کی زنانہ جیل میں بھیجی گئی تھی۔ اس کا نہ کوئی عزیز نہ رشتے دار۔ ایسی غریب لڑکی کے لئے قانون بھی کوئی نرم گوشہ اپنے دل میں نہیں رکھتا۔"

"تمہیں پتہ چلا کہ وہ آدمی جو کھڑکی سے کود کر دوسرے مکان میں اتر گئے تھے، کون تھے؟"

"آسیہ نے یہی کہا تھا کہ وہ سوات خان کے ساتھی تھے۔ یہ بات ہمیں پہلے دن ہی معلوم ہو گئی تھی مگر ہم انہیں پکڑ نہ سکے۔ ان کی ہمیں کوئی خبر نہ مل سکی نہ کسی ہی بتا سکی کہ وہ کہاں کہاں رہتے تھے اور نہ اس کی بہن ہی جانتی تھی کہ ان کا ٹھکانہ کہاں ہے۔"

"اگر وہ چودہ سال کے لئے جیل میں بند کر دی گئی تھی تو پھر اب بھی وہ وہیں ہو گی۔ تم یوں کرو وارث علی: زینو کو لے کر سرگودھا چلے جاؤ اور اسے میری ماں کے پاس چھوڑ دو۔ وہ اسے جانتی ہے۔ اس کے پاس جا کر یہ بہت محفوظ رہے گی۔ میں کل صبح ہی یہاں سے نکل جاؤں گا۔ مجھے ہر حال میں کل آسیہ سے ملنا ہے۔"

"مگر تم شہر میں کیسے جاؤ گے۔ چاروں طرف وہ لوگ تمہاری تلاش میں پھر رہے ہیں تمہیں بھی وہ پہچان لیں گے۔"

"تو پھر تم میری مدد کرو اور کل صبح وہاں جا کر آسیہ سے ملو اور اسے بتاؤ کہ اس کا بھائی اس سے ملنے کے لئے کتنا بے تاب ہے۔" میں نے بلکتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ بہتر رہے گا ــــ میں کل صبح خود جاؤں گا۔ ہو سکا تو میں اس کی تصویر بھی اتار لاؤں گا۔ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ اگر وہ جیل نہ جاتی تو ہو سکتا ہے ان غنڈوں کے ہاتھوں وہ بہت زیادہ ذلیل ہوتی۔"

"ہاں وارث علی تم ٹھیک کہتے ہو کون کہہ سکتا ہے کہ اگر میں اس رات عالیہ کی کوٹھی میں نہ گھستا تو کیا ہوتا؟ اس ایک غلط قدم نے مجھے کتنا پیچھے دھکیل دیا۔ میں تحت الثریٰ میں جا گرا ہوں۔"

"اپنے آپ کو زیادہ اذیت نہ دو جیلانی میاں۔ اب یہ سوچو کہ اس چوہدری کے قتل کو کس طرح چھپاؤ گے۔ تم تو انصاف کر آئے ہو مگر قانون جب انصاف کرنے نکلے گا تو کیا ہو گا۔ کسی نے دیکھ نہ لیا ہو تمہیں۔ مجھے تو یہی فکر کھائے جاتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو وارث علی۔ ہمارا یہاں سے ہی کیا ــــ میرا تو خیال ہے میں ضروری سامان باندھتا ہوں۔ زینو کو لے کر میں آج ہی نکل جاتا ہوں۔ ماں جی کے پاس جا رہوں گا میں۔ میرا ابھی دل بہت پریشان ہے۔ آسیہ کے مل جانے کی امید نے مجھے زندہ رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"ہاں، یہ بہتر رہے گا۔ تم کھانا کھا کر یہاں سے نکل جاؤ۔ صادق علی بتایا کرتا تھا کہ یہاں سے گھوڑے کرائے پر مل جاتے ہیں۔"

"نہیں۔ میں تمہاری گھوڑی لے جاتا ہوں۔"

"مگر چھوڑو گے کہاں اسے؟"

"تم جہاں کہو۔ میں چھوڑ دوں گا۔"

"تم یوں کرو کوٹ لکھپت پہنچ کر بہار گلی کے خورشید احمد کے پاس گھوڑی کو چھوڑ دینا۔ وہ کوارٹر نمبر پچاسی میں رہتا ہے۔ میں پتہ لکھ دیتا ہوں اس کا۔" یہ کہہ کر وارث علی نے اپنے دوست کے گھر کا پتہ دے دیا۔

زینو کھانا پکا کر ہمارے سامنے لگا رہی تھی کہ گاؤں میں ہاہاکار مچ گئی۔ پچھلے مکانوں سے نالہ و شیون کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

"یہ کون رو رہا ہے زینو؟" میں نے پوچھا۔

"شاید نوراں کی خالہ آئی ہے۔ اسے کل ہی تار دے دیا تھا انہوں نے۔"

یہ کہہ کر وہ سیڑھی کی طرف بڑھی۔

"نہیں کھانا تو کھلا دو پہلے اور یوں کرو بیٹی کہ اپنی تمام ضروری چیزیں باندھ لو۔" وارث علی نے کہا۔

"وہ کیوں چاچا؟"

"ہم آج تمہیں جیلانی میاں کے ساتھ سرگودھا بھیج رہے ہیں۔ اب تم وہاں رہا کرو گی ماں جی کے پاس۔"

"مگر ماسٹر صاحب؟"

"وہ بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔ ابھی وہ ایک ضروری کام سے حافظ آباد گئے ہیں۔"

زینو ایکدم خوش ہو گئی ــــ

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے چاچا کہ اب ہم شہر میں رہیں گے۔ یہاں سے تو میرا دل بہت اچاٹ ہو گیا ہے ــــ اب تو نوراں بھی نہیں رہی یہاں۔"

"بس ٹھیک ہے پھر جلدی جلدی سامان باندھ لو اپنا۔" وارث علی نے کہا۔

کھانا ختم ہوتے ہی ہم دونوں نے جلدی جلدی اپنا سامان دو صندوقوں میں بھرنا شروع کیا۔ اچانک وارث علی کو کچھ خیال آیا بولا۔

"میں واقف ہوں اس گاؤں سے یار۔ وہ گاماں ہے نا گاماں تیلی۔ وہ بھی مجھے جانتا ہے اس سے میں دو گھوڑے لے آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وارث علی تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ اپنی خوبصورت گھوڑی کسی اور کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا ــــ کچھ ہی دیر بعد زینو واپس آ گئی۔ وہ بے حد سراسیمہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے لرزتے لہجے میں مجھے بتایا کہ کسی نے نوراں کے والد کو مار دیا ہے۔ میں نے اس پر ذرا سی حیرت ظاہر کی اور پھر اس گفتگو کو ختم کر دیا۔

کوئی بیس منٹ بعد ہی وارث علی واپس آ گیا ــــ گاماں اس کے ساتھ تھا اور دو گھوڑے بھی۔ دس دس روپے ان کا والٹن تک کا کرایہ طے کیا گیا تھا۔

ہم نے ایک گھوڑے پر سامان لادا۔ ایک گھوڑے پر وہ باپ بیٹی بیٹھے اور تیسرے گھوڑے پر میں سوار ہو گیا اور یوں صادق علی کے بسیرے پر سکر کو تالہ لگا کر ہم کمال پور سے رخصت ہو گئے۔ اس وقت دن کے تین بج رہے تھے۔ زینو، نوراں کی ماں اور چوہدری کی بیوہ سے مل آئی تھی۔ چوہدرائن پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ دو دن میں اس کے گھر سے دو میتیں اٹھ رہی تھیں اس کی تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی مگر یہ تو مکافات عمل کا سلسلہ تھا جو چل رہا تھا اور چلتا رہے گا۔ کچی اینٹوں کی لمبی قطار کو بچے ایک طرف سے ہلکی سی ٹھوکر لگاتے ہیں۔ کھیل ہی کھیل میں تو وہ ایک دوسرے کو اپنے سر کی ضرب سے گراتی ہی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ آخری اینٹ بھی سرنگوں ہو جاتی ہے جب وہ گر رہی ہوتی ہیں تو لگتا ہے بچے کی ہلکی سی ٹھوکر نے ان میں بے پناہ جذبہ انتقام بھر دیا ہے اور پہلی اینٹ جب اس بچے سے اپنا بدلہ نہیں لے سکتی تو وہ غصے میں پاگل ہو کر اپنا سر دوسروں کے سر پر دے مارتی ہے۔ انسانوں کا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا انہیں بھی کسی مقام پر کسی معصوم سی قوت نے یونہی بے خیالی میں ہلکی سی ٹھوکر لگا دی تھی اور اب وہ چل رہے تھے مسلسل آگے ہی آگے، ایک دوسرے کا سر پھوڑتے ہوئے ــــ

زینو سے میں نے بڑی احتیاط سے گاؤں کے حالات پوچھے تھے چوہدری کا نام اجمل تھا۔ زینو نے بتایا تھا کہ نوراں کے باپ کو کسی جانور نے کچل دیا ہے۔ کسی کو یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ جانور کس قسم کا تھا؟ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے ــــ وہ سب یہی سمجھتے تھے کہ چوہدری اتفاقاً کسی بپھرے ہوئے بے قابو جانور کی بھینٹ چڑھ گیا تھا ــــ یہ ساری باتیں میرے فائدے میں تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ تھانے میں اس کی موت کی اطلاع نہیں دیں گے ــــ ہم اگر کمال پور میں ہی بیٹھے رہتے تو بھی مجھے کوئی خطرہ نہ تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے خواہ مخواہ عجلت میں صادق علی کا اتنا آباد اور خوبصورت گھر مقفل

کرکے وقت کے بہتے دریا پر تیرا دیا تھا وہ کہیں بھی ڈوب سکتا تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا ـــــ میں اپنی زندگی کا ایک اہم باب پیچھے چھوڑ آیا تھا.....

جب ہم والٹن کے قریب پہنچے تو دن چھپ رہا تھا۔ وارث علی کو اپنی بیٹی کی فکر کھائے جاتی تھی ـــــ وہ بولا۔

"میرا تو یہ خیال ہے جیلانی میاں کہ یہ رات تم شہر میں گزار لو۔ میں تمہیں اپنے دوست کے گھر لے جاتا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم ایک دو دن وہیں رہو۔ اس عرصے میں میں تمہیں آسیہ کے بارے میں بھی بتا سکوں گا پھر اس کے بعد تم اطمینان سے فیصلہ کر سکو گے کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟"

"یہ اچھی تجویز ہے وارث علی۔ میں ابھی دو چار دن یہیں رہ لیتا ہوں تم معلوم کر لو کہ میری بہن کس حال میں ہے۔" میں نے اس کی بات مان لی۔

وارث علی خوش ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ اسے زینو کے ساتھ دو چار دن اور گزار لینے کا موقع مل گیا تھا۔ اسی دن اس نے مجھے بتایا کہ اس کے اپنے صرف دو لڑکے ہیں جو اب کالج میں پڑھ رہے تھے مگر لڑکی اسے زینو کے سوا اللہ نے اور کوئی نہیں دی اور پھر لڑکی بھی ایسی جو بالکل اس کی ہم شکل ہو۔ زینو کی صورت میں وہ اپنی صورت دیکھتا تھا اور اس کا نام لے کر جیتا تھا۔ اس کے لئے اب کی بار بھی وہ ڈھیر سارے کپڑے اور دوسری چیزیں لے کر آیا تھا ـــــ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی ہر طرح خوش رہے ـــــ اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ زینو بھی اس سے بہت زیادہ مانوس ہو چکی تھی۔ وہ بھول ہی گئی تھی کہ اس کی ماں آسیہ نے اسے کن حالات میں جنم دیا تھا۔ اس "تنگی" کو بھی وہ فراموش کر چکی تھی جہاں اس نے پرورش پائی تھی۔ اس باپ کا نام بھی آہستہ آہستہ اس کے ذہن کی لوح سے مٹتا جا رہا تھا جس نے ہمیشہ زینو کو اپنا ہی صلب سمجھا۔ کیسی کیسی ستم ظریفی ہوتی ہے اس دنیا میں۔ انسان کے پاگل پن کا شاید وہ جب خود پروردگار کرتے ہوں گے تو وہ بھی تبسم فرماتے ہوں گے جبھی تو کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو ان کی ماؤں کی نسبت سے پکارا جائے گا۔ کوئی نہیں پوچھے گا کہ تیرا باپ کون ہے ہر کوئی ماں کے حوالے سے پہچانا جائے گا۔ مردوں کے لئے یہ بڑا کٹھن مرحلہ ہو گا۔

جب ہم وارث علی کے دوست خورشید احمد کے مکان پر پہنچے تو شام گہری ہو چکی تھی۔ وہ کوئی پچاس پچپن سال کی عمر کا سابق فوجی تھا بیٹھا پنشن کھا رہا تھا۔ ایک ہی کا ملازم تھا جو اس کی خدمت پر مامور تھا اس کے دو بیٹے تھے مگر دونوں امریکہ میں ملازمت کر رہے تھے بیوی اس کی فوت ہو چکی تھی اور کوئی بیٹی بھی نہیں تھی کہ مڑ کر باپ کی خبر بھی پوچھ لیتی۔

مکان اس کا بہت خوبصورت تھا اور ہر آسائش سے مزین بھی۔ میں تو حیران رہ گیا اس مکان کی آرائش و زیبائش دیکھ کر۔

ایک عجیب طرح کا رشک محسوس ہوا مجھے اس آدمی کی زندگی پر ــــ بہت صاف ستھرے ذوق کا حامل تھا۔ عمدہ سگریٹ پیتا تھا، بڑھیا لباس پہنتا تھا اور اونچی باتیں سوچتا تھا۔ لگتا تھا خدا اس پر بہت ہی مہربان ہے۔ میں بہت سٹپٹا گیا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وارث علی نے اس سے میرا تعارف کرایا تو بے دھیانی میں اس نے خورشید احمد کو میرا اصلی نام بھی بتا دیا ــــ

اس بچارے نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ ہمارے ٹھہرنے کے لئے اس نے دو کمرے کھلوا دیئے۔ جن میں ہماری ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ ایک کمرہ زینو اور وارث علی نے لے لیا۔ باپ بیٹی ساتھ ساتھ رہنا چاہتے تھے دوسرے کمرے میں میں ٹھہر گیا۔

خورشید احمد رات نو بجے تک ہمارے پاس بیٹھا رہا۔ پھر ڈھیر سارے چلغوزے اور بادام اس نے ہمارے سامنے رکھ دیئے۔ وہ بھی سگریٹ کا رسیا تھا اور مسلسل پیتا رہا۔ ہم نے بھی دل کھول کر اس کام میں اس کا ساتھ دیا۔ اسے اس رات دو آدمیوں کا انتظار تھا جن کے ہاتھ اس نے اپنی موروثی زمینوں کا ایک حصہ ڈھائی لاکھ روپے میں بیچا تھا۔ وہ رقم لے کر آ رہے تھے اس کے پاس۔

خورشید شب بخیر کہہ کر ہم سے رخصت ہو ہی رہا تھا کہ وہ آدمی آگئے مگر وہ دو نہیں تعداد میں تین تھے۔ جن میں سے ایک بیساکھیوں پر چل رہا تھا کیونکہ اس کی دونوں ٹانگوں میں پلستر لگا تھا، پاؤں سے اوپر رانوں تک وہ بچارا بڑی مشکل میں گرفتار نظر آتا تھا۔ جوان آدمی تھا وہ اور بڑے ورزشی جسم کا حامل تھا مگر کسی حادثے کی وجہ سے اس مصیبت میں پھنس گیا تھا ــــ

خورشید احمد نے ان سے ہمارا تعارف کرایا بولا "یہ چوہدری بہادر علی ہیں ہریکا گاؤں کے زمیندار ــــ یہ ان کے بھائی ہیں غلام محمد ــــ ان سے البتہ میں واقف نہیں ہوں۔" انہوں نے تیسرے آدمی کے بارے میں کہا ــــ

"یہ ہمارا نوکر ہے اسلم۔ اسے میں صبح ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔ ایک ہفتہ ہوا یہ ایک حادثے میں زخمی ہو گیا تھا۔ دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں اس کی۔ ڈاکٹروں نے اسی روز یہ پلستر لگا دیا تھا مگر اب یہ دو تین دن سے درد کی شکایت کرتا ہے۔" چوہدری بہادر نے کہا۔

"بہت افسوس ہوا۔ کیسا سوہنا جوان ہے اللہ اسے صحت دے۔" یہ کہہ کر خورشید احمد ان لوگوں کو بڑی عزت سے ہمارے پاس بٹھا کر دوسرے کمرے میں چلا گیا جب واپس آیا تو اس نے ہاتھوں میں کاغذ اور قلم پکڑے ہوئے تھے

چوہدری بہادر علی نے ہمارے سامنے ڈھائی لاکھ روپے کی رقم گن کر اس کے حوالے کر دی۔ رقم وصول کر کے خورشید نے رسید لکھ دی جس پر اس نے گواہ کے طور پر وارث علی سے دستخط کروا لئے۔ رجسٹری پہلے ہو چکی تھی جسے وہ اگلے دن کچہری میں جا کر درج کروانا چاہتے تھے۔

جب خورشید احمد رقم وصول کر کے اندر لے جانے لگا تو میں نے اسلم کی آنکھوں میں عجیب سی پُراسرار چمک ابھر آئی تھی۔ اس نے معنی خیز انداز سے خورشید احمد کی طرف دیکھا۔

میں سمجھا کہ زمین خرید لینے کی خوشی نے ان کے چہروں پر یہ کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ظاہر ہے کسی زمیندار کے لئے اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ کہ کچھ اور زمین اس کے قبضے میں آ جائے۔

خورشید احمد نے رقم لے جا کر دوسرے کمرے میں رکھ دی وہ جب واپس آیا تو اس کا ملازم بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ ان کے لئے کھانا لایا تھا۔ بڑی سی ٹرے اٹھا رکھی تھی اس نے۔

وہ کھانا کھاتے رہے اور زمین کے بارے میں باتیں کرتے رہے مجھے ان کے کسی مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرا ذہن ایک ہی نکتے پر مرکوز تھا۔ اور وہ نکتہ تھا آسیہ ــــ اس سے ملنے کی آرزو دم بدم بڑھتی جا رہی تھی جب سے وارث علی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اسی شہر میں ہے اور جیل میں بند ہے اس وقت سے میری حالت ماہی بے آب ایسی ہو گئی تھی۔ میں کسی جگہ نظر ڈالتا تھا تو بس وہیں دیکھتا چلا جاتا تھا۔ لگتا تھا میری آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ حال میرا اس پرندے ایسا تھا جس کے سامنے ڈھیر سارا دانہ دھرا رہتا ہے مگر اس کی چونچ ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہ دانہ اس کے لئے بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ مجھے ڈھیر سارا روپیہ مل چکا تھا مگر میں اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکتا تھا۔ کتنی ستم ظریفی کی بات تھی یہ کہ کچھ ہی عرصہ پہلے ہمارے پاس ایک لاکھ روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے آسیہ کی تقدیر میں سیاہی گھلتی جا رہی تھی مگر اب ہم اس قابل تھے کہ جو چیز چاہتے خرید لیتے لیکن ہم اپنی منزل سے ہزاروں لاکھوں فرسنگ دور ہو چکے تھے۔ وہ آسیہ ہی ہم سے چھن گئی تھی جس کے لئے میں دنیا جہان کی ساری دولت چھین لینا چاہتا تھا۔

خورشید کے مہمانوں نے کھانا کھایا اور پھر اسی وقت وہاں سے رخصت ہو گئے۔ وہ اپنے کسی عزیز کے ہاں رات گزارنا چاہتے تھے جو ادھر گوالمنڈی میں رہتا تھا۔

وہ گھر سے نکلے تو ہم نے بھی اپنے خوابوں کے جزیروں کی راہ لی۔ زینو اور وارث علی الگ کمرے میں جا سوئے اور میں الگ کمرے میں لیٹ گیا۔ ہمارے میزبان نے ہماری ضرورت کی ہر شے ہمیں مہیا کر دی تھی۔ میرے کمرے میں بھی سوئی گیس کا ہیٹر لگا تھا اور زینو کے کمرے میں بھی۔ جس کی وجہ سے ہمیں سردی کی شدت نے زیادہ ہراساں نہیں کیا۔

مگر میرا ذہن کچھ اس حد تک ویران اور اجڑا ہوا تھا کہ نیند بھی اس پر غالب نہ آ سکی اور میں بستر کی بے رحم تنہائی میں آدھی رات تک پڑا کروٹیں بدلتا رہا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ زندگی ایک طویل لاینحل معمہ بن کر رہ گئی تھی اور اس کی پیچ در پیچ گرہوں میں مجھے آسیہ یوں الجھی نظر آتی تھی کہ ہر لمحے اس کا سانس گھٹتا تھا۔

اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ ہیٹر بجھ رہا تھا بھپ بھپ کی سی آواز ابھری اور پھر ہیٹر کا چہرہ تاریک ہونے لگا۔ اس کی سرخی مدھم پڑی اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد ہیٹر سرد ہو گیا۔ میں نے کوئی دھیان نہ دیا بستر گرم تھا اور کمرے کی فضا بھی تپ رہی تھی میں چپ چاپ بستر میں پڑا رہا۔

مگر ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ مجھے شدید گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ سوئی گیس سارے کمرے میں پھیل چکی تھی۔ یہ بڑی تکلیف دہ صورتحال تھی۔ مجھے یاد ہی نہ رہا کہ ہیٹر بجھ جانے کی وجہ سے سوئی گیس برابر خارج ہو رہی تھی اور اس نے پھیل کر کمرے کی ہوا میں زہر بھر دیا تھا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا تو میں نے ہیٹر بند کیا اور کمبل لپیٹ کر صحن میں جا نکلا۔ صحن ایسا تھا کہ اس کے چاروں طرف چوکور صورت میں عمارت ایستادہ تھی۔

ٹھیک اسی لمحے خورشید احمد کے کمرے میں روشنی ابھری مگر فوراً ہی بجھ گئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے ٹارچ جلائی تھی۔ روشنی بڑی مدھم اور پیلی پیلی سی تھی جس کا چمکارا ٹارچ ایسا تھا۔ میں دبے پاؤں ادھر کو بڑھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ خورشید احمد کو ٹارچ جلانے کی کیا ضرورت ہے وہ خود اٹھتے تو کمرے کا بلب جلاتے۔ یونہی تجسس کا مارا میں ان کے کمرے کی بڑی کھڑکی کے سامنے جا پہنچا۔ اس کھڑکی کے باہر لوہے کی جالی لگی تھی اندر کی طرف آٹھ فٹ اونچے شیشے لگے تھے اور ان شیشوں کے پیچھے بڑے بڑے پردے لٹکے تھے۔ میں نے اس کھڑکی کے سامنے رک کر اندر کی آہٹوں پر کان دھرے تو مجھے محسوس ہوا کہ آہنی الماری کو کوئی شخص کھول رہا تھا۔ آوازیں ایسی آ رہی تھیں جیسے کوئی اس الماری سے زور آزمائی کر رہا ہے۔

میں کمرے کے دائیں ہاتھ کی چھوٹی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اتفاقاً مجھے اس کھڑکی کے اندر لگے شیشے کے ساتھ لٹکے پردے میں پور بھر جگہ ایسی کھلی ملی جس میں سے اندر جھانکا جا سکتا تھا۔

اب جو میں اس جھری میں سے سامنے دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار ہی نہ آیا۔ لگتا تھا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ فرش پر ٹارچ برابر جل رہی تھی اور اس کی مدھم روشنی میں مجھے خورشید احمد کی آہنی الماری کے سامنے چوہدری بہادر علی کا بیمار نوکر اسلم کھڑا نظر آیا۔ اس کی ٹانگوں پر پلستر جوں کا توں قائم تھا مگر وہ بیساکھیوں کے سہارے نہیں بلکہ اپنے پاؤں پر جم کر کھڑا تھا۔ اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے الماری کھول کر اس کے خانوں میں سے تمام نوٹ نکال کر ایک تھیلے میں بھر لئے۔ فرش پر رکھی اس کی روشن ٹارچ پاؤں کے قریب چمک رہی تھی۔ اور اس کی روشنی میں اس نے اپنا کام نہایت صفائی سے مکمل کر لیا۔

اسلم سے ذرا فاصلے پر اپنے لمبے چوڑے خوبصورت سے آبنوسی رنگ کے پلنگ پر خورشید احمد لیٹا تھا مگر وہ بے حس و حرکت تھا۔ منہ اس کا لحاف سے باہر تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہ ابدی نیند سو چکا ہے۔

یہ سب کچھ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ اسلم نے اپنا وہ بھاری بھرکم تھیلا کندھے پر لٹکایا۔ سر پر اپنا ٹھاٹھہ اچھی طرح جما کر اس نے اپنا منہ اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ مگر پھر اس نے ٹاپ کی اٹھائی اور کوٹ کی جیب سے پستول نکال کر سیدھے ہاتھ میں تھام لیا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے لپک کر فوراً ہی وہ دروازہ باہر سے بند کر دیا اور پستول لینے کے لئے اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔ باہر سے کنڈی لگنے کی آواز سے اسلم دہل سا گیا۔ اس نے پوری قوت سے دروازہ اندر کی طرف کھینچا مگر جب اسے دروازے کا یقین ہو گیا کہ وہ نہ کھل سکے گا تو وہ پوری قوت سے اس کے تختے سے ٹکرا گیا۔

زبردست آواز پیدا ہوئی۔ میں اس گھڑی اپنے کمرے میں تھا اور پستول اٹھا کر باہر آنے کو ہی تھا کہ مجھے محسوس یوں ہوا جیسے پلائی وڈ کا بنا دروازے کا تختہ ٹوٹ گیا ہے۔

ابھی میں اپنے کمرے سے نکلا ہی تھا کہ اسلم صحن میں نمودار ہوا وہ بڑی پھرتی سے چل رہا تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ اس نے بیماری کا اور ٹانگوں کے ٹوٹ جانے کا تو محض بہانہ ہی بنا رکھا ہے۔ اصل میں وہ بہادر علی کا کارندہ تھا جو ہر اس جگہ پر ہاتھ مارتا تھا جہاں سے اسے رقم کی بو ملتی تھی۔۔۔ اچانک ٹشک کی سی آواز پیدا ہوئی۔ ایک گولی میرے دائیں ہاتھ سے چھ انچ کے فاصلے پر دروازے کے تختے میں لگی۔ اسلم نے مجھے دیکھتے ہی مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ اس کی آنکھیں بہت تیز تھیں۔ میں حالانکہ گھپ اندھیرے میں کھڑا تھا مگر پھر بھی اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں تیزی سے نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے ایک اور گولی چلائی مگر وہ بھی میرے اوپر سے نکل کر دروازے سے جا ٹکرائی۔ اب کی بار میں فرش پر لیٹ ہی گیا۔

اسلم سمجھا کہ اس کی گولیاں اثر کر گئی ہیں وہ جنون خیز رفتار سے گھر کے بڑے دروازے کی طرف لپکا تو میں نے تاک کر اس کی کمر پہ گولی چلائی۔ نشانہ شاید ٹھیک بیٹھا تھا وہ لڑکھڑا گیا مگر رکا نہیں تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں نے دوسری گولی چلائی مگر وہ بے کار گئی۔ یہ بڑی خوفناک صورتِ حال تھی۔ میں اس کے پیچھے لپکا اور بجلی ایسی تیزی سے باہر جا پہنچا۔

وہ میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ ایک گولی سرسراتی ہوئی میرے کمبل میں سوراخ کرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ وہ زیادہ دُور نہیں تھا۔ ہو گا چھ سات فٹ پرے دیوار کے ساتھ چپٹا کھڑا تھا۔۔۔ میں پیچھے ہٹ کر دروازے میں دبک گیا۔ عین اس وقت مجھے باہر کسی موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ میں نے اپنا آپ بچاتے ہوئے باہر جھانک کر دیکھا تو ایک زبردست تاسف نے میرا کلیجہ دبوچ لیا۔ اسلم ایک سکوٹر کے پیچھے بیٹھ کر میری آنکھوں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ وہ خورشید کو شاید اس کی زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی اثاثے سے محروم کر گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ جس سکوٹر پر وہ بیٹھ کر بھاگا تھا۔ اسے بہادر علی خود چلا رہا تھا۔

مگر میں یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

اس کے پیچھے بھاگنا میرے لئے کسی طرح بھی سُود مند نہ تھا۔ میں کفِ افسوس ملتا واپس آ گیا اور خورشید کے کمرے میں جا گھسا۔ اس کمرے کے دروازے کا ایک تختہ ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے خورشید کو جگانے کے لئے آواز دی مگر اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا۔ فوراً ہی میں نے ادھر اُدھر ٹٹول کر سوئچ ڈھونڈا اور بتی جلا دی۔ اب جو میں نے خورشید کے چہرے۔۔۔ پر نظر ڈالی تو میری حیرت سہ چند ہو گئی۔ اس کا رنگ پیلا ہو رہا تھا اور سانس اکھڑ چکا تھا۔ میں نے نبض دیکھی تو وہ بھی ڈوب رہی تھی۔ کمرے میں سوئی گیس کا کثیف دُھواں پھیلا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کمرے کا بھی ہیٹر بجھا ہوا تھا مگر اس میں سے سوئی گیس برابر خارج ہو رہی تھی۔ میں نے وہ گیس بند تو کر دی مگر سوال یہ تھا۔۔۔ کہ خورشید کو ہوش میں کیسے لاؤں؟

یونہی پاگلوں کی طرح میں نے بلا سوچے سمجھے اس کے کھلے منہ پر منہ رکھ کر اس کے پھیپھڑوں میں اپنی ہوا بھری پوری قوت سے۔ نتیجہ حیرت انگیز تھا وہ کربناک انداز سے کراہا۔ میں سمجھا کہ اسے پانی کی بھی ضرورت ہوگی یہ سوچ کر میں صحن میں نکلا اور نل سے ایک گلاس بھر کر اسی کے لئے اندر لے گیا۔ مگر اب وہ قدرے زیادہ بیدار تھا۔ عجیب انداز سے کروٹیں لے رہا تھا۔ اسے میں نے بڑی مشکلوں سے پانی کے چند گھونٹ پلائے۔ تازہ ہوا کے لئے میں نے ساری کھڑکیاں کھول دیں۔ باہر پچھلی طرف شاید کوئی خوشبو دار پودے لگے تھے۔ بڑی سہانی اور جاں فزا خوشبو کمرے میں پھیلنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خورشید احمد نے کچھ ہی دیر بعد آنکھیں کھول دیں مگر اب بھی وہ اس قابل نہیں تھا کہ بات کر سکے۔ سوئی گیس نے اس پر بہت ہی بُرا اثر ڈالا تھا۔

اچانک خورشید کی نظر کھلی الماری پر پڑی تو وہ یوں اپنے پلنگ سے اچھلا جیسے اسے کسی بچھو نے کاٹ کھایا ہے۔ وہ تیزی سے اپنی الماری تک پہنچا اور اس کے خالی خانے پاگلوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگا اور جب اس نے دیکھا کہ وہاں سے سب کچھ غائب ہے تو اس نے سر پیٹ لیا اور بلند آواز سے یوں چیخا جیسے کوئی اسے ذبح کر رہا ہے۔

"میرا۔۔۔ میرا روپیہ کہاں ہے؟" درد و کرب کی شدت نے اس کی قوتِ گویائی اسے لوٹا دی مجھے یوں لگا جیسے وہ کہیں بہت دُور سے بول رہا ہے۔

"میں پوچھتا ہوں میرا روپیہ کہاں ہے۔ کہاں ہے میرا روپیہ؟" وہ دیوانوں کی طرح منہ کھول کر میری طرف بڑھا۔

"آپ کا روپیہ بہادر علی کا بیمار نوکر اسلم لے گیا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے وہ یہاں تھا۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ اس کی تو ٹانگیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ پلستر چڑھا ہے ان پر۔ میرا اڑھائی لاکھ روپیہ چرا لیا ہے تم نے۔"

"وہ پیشتر۔۔۔ سب جھوٹ ہے خورشید صاحب! وہ بہت بڑے دھوکے باز لوگ ہیں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ کہاں ہے وارث علی؟ میں اس سے اپنا روپیہ لوں گا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا بدمعاش آدمی۔ میرا روپیہ مجھے واپس دے دو۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اس کمرے کی طرف بھاگا جہاں زینو اور وارث علی کو اس نے سلایا تھا۔ اس کمرے کا بھی دروازہ اندر سے بند تھا۔ خورشید احمد نے پوری قوت سے دروازے پر دستک دی۔ بار بار چیخا چلایا۔۔۔ دروازہ اس نے پیٹ ڈالا مگر وارث علی نہیں جاگا۔ اس کی بیٹی زینو بھی بیدار نہ ہوئی۔ اتنی گہری نیند میں تھے وہ لوگ کہ میں حیران رہ گیا مگر اچانک میں نے سوچا کہ کہیں ان پر بھی سوئی گیس کا اثر نہ ہو گیا ہو۔ جونہی یہ بات میرے ذہن میں ابھری میں پوری قوت سے دروازے کے ساتھ ٹکرا گیا۔ اندر کی چٹخنی شاید زیادہ مضبوط نہ تھی فوراً ہی ٹوٹ گئی اور دروازہ دھڑ سے کھل گیا۔ وہاں صورتِ حال واقعی بہت دگرگوں تھی کمرہ سوئی گیس سے لبالب بھرا تھا۔ تمام کھڑکیاں اور روشن دان بند تھے اور سوئی گیس کا ہیٹر بجھا ہوا تھا۔ میں نے وارث علی کو چھو کر دیکھا تو میرا کلیجہ دہل گیا۔۔۔ وہ دم گھٹ کر مر چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے زینو کو دیکھا تو اس کا بدن بھی مجھے زندگی کی حرارت سے محروم نظر آیا۔۔۔ وہ بھی بہت دُور نکل چکی تھی۔

اچانک کمرہ روشنی سے بھر گیا۔ خورشید نے بتی جلا دی تھی۔۔۔

"یہ تو شاید مر چکے ہیں خورشید صاحب! دم گھٹ کر مر گئے ہیں۔" میں نے ہیٹر کی سوئی گیس بند کرتے ہوئے کہا۔۔۔ میری اپنی آواز مجھے اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے وہاں سانس لینا دشوار لگتا تھا۔ میں نے گھبرا کر ساری کھڑکیاں کھول دیں۔ تازہ ہوا نے سکون پہنچایا۔

"انہیں کس نے مارا ہے؟ تم ہی ان کے قاتل ہو۔ تم نے ان کا بھی گلا گھونٹ دیا ہے۔"

"بکواس بند کر بڈھے! میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔ شکر کر تیری جان بچ گئی ہے ورنہ وہ شاید تجھے بھی اپنے حساب میں ختم کر گیا تھا۔"

"مجھے تیری کسی بات پر اعتبار نہیں آتا۔ کہاں ہے وہ گامی۔ میں ابھی اسے جگاتا ہوں۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ میری رقم دے دو پھر جہاں چاہے دفع ہو جاؤ۔ آؤ میرے ساتھ گامی کو جگاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچتا ہوا اپنے کمرے سے ذرا فاصلے پر برآمدے کے آخری حصے میں لے گیا۔ گامی وہیں کوٹھڑی میں سوتا تھا۔ اس نے بھی اندر سے دروازہ بند کر رکھا تھا۔۔۔ میں نے بڑے زور سے دستک دی تو وہ ایک دم جاگ اٹھا۔ نیند سے بوجھل آواز میں بولا۔

"کون ہے؟"

خورشید چیخا۔ "میں ہوں گامی! دروازہ کھول تیرا بیڑہ غرق۔ گھوڑے بیچ کر سو یا رہتا ہے۔ تیری افیون تجھے لے ڈوبی ہے۔"

"ابھی آیا میاں جی۔" دوسری طرف سے سلیپر کی سٹر پٹر سنائی دی اور پھر گامی نے دروازہ کھول دیا۔

"کیا بات ہے میاں جی؟"

"او دفع ہو جا! ابھی پولیس کو بلا کر لا۔۔۔ گھر میں چوری ہو گئی ہے۔ الماری سے ساری رقم غائب ہے۔ ڈھائی لاکھ روپے لے گیا ہے چور۔"

"چوری ہو گئی۔ حد ہو گئی یہ کیسے ہو گیا میاں جی؟" گامی یوں برآمدے میں نکلا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھا ہو۔

"ہونا کیسے تھا۔ یہ جا تو جو کھڑا ہے تمہارے سامنے۔ اسی نے چوری کی ہے اور اب کہتا ہے اسلم مال چرا کر لے گیا ہے۔"

"اسلم کون میاں جی؟"

"ارے وہی جو بہادر علی کے ساتھ آیا تھا۔ وہ جس کی ٹانگوں پر پلستر ہے۔" خورشید نے کہا۔

"ارے میاں جی وہ بیچارا تو بیساکھی پر چلتا ہے۔ وہ کیا چوری کرے گا؟"

"اور وہ ہمارے مہمان مُردہ پڑے ہیں اپنے کمرے میں۔ ان کا بھی اس نے گلا گھونٹ دیا۔ اور یہ رُعب جماتا ہے میں تو اسے جیل میں بند کرا دوں گا۔" خورشید نے مجھے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"پرے مر بڈھے تیرا دماغ چل گیا ہے میری بات غور سے سن۔ میں چور نہیں ہوں۔ چور اسلم ہی ہے مگر مجھے یہ پتہ نہیں چلتا کہ تیرا کمرہ بھی سوئی گیس سے بھرا تھا۔ وارث علی بھی اسی گیس سے مرا تھا اور میرے کمرے میں بھی گیس بھرنے لگی تھی یہ قصہ کیا ہے؟"

"مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کر۔ ذلیل آدمی۔۔۔ پولیس تجھ سے خود اگلوا لے گی کہ تو نے ان دونوں کو کیوں اور کس طرح مارا ہے۔۔۔ جا گامی بھاگ کر جا اور پولیس کو بلا لا۔"

یہ بات سنتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ بڈھا کسی طرح بھی میری بات پر کان نہیں دھرے گا وہ فیصلہ کر چکا ہے۔ کہ مجھے پولیس کے حوالے کر دے۔ چوری کا الزام بھی وہ مجھ پر دھرتا تھا اور زینو اور وارث علی کی موت کا بھی وہ مجھے ہی ذمہ دار ٹھہراتا تھا۔ یہ بڑی خوفناک بات تھی۔ میں پولیس کا کسی طرح بھی سامنا نہ کرنا چاہتا تھا۔ خاص طور پر لاہور شہر کی پولیس کا جس کی جیل کی آخری منزل سے میں فرار ہوا تھا۔ معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے میں نے پستول کی نالی ایک دم بڈھے کے سینے سے لگا دی۔

"اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔ تم بھی چلو اِدھر گامی! اس کے پیچھے کھڑے ہو جاؤ۔"

پستول کی صورت دیکھتے ہی بڈھا گھگھیانے لگا۔ گامی دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر اس کے عین پیچھے آ ٹھہرا۔

میں نے خورشید کو کھینچ کر بائیں ہاتھ کی زد پر لیا اور پھر پوری قوت سے میں نے اس کی گردن کی رگ مسل دی۔ دو ہی ثانیوں

میں وہ جھول کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اپنے مالک کی یہ حالت دیکھ کر گاما بری طرح لرزا اور پیچھے ہٹنے لگا۔

"خبردار!" میں نے اسے للکارا تو وہ فوراً ٹھہر گیا۔

"میرے پاس آؤ۔" میں نے اسے بائیں ہاتھ سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

وہ بہت محتاط طریقے سے آگے بڑھا مگر اتنا بھی نہیں کہ میرا ہاتھ اس تک نہ پہنچ سکتا۔ میں نے دو قدم آگے بڑھ کر اس کی گردن پر ہاتھ رکھا اور انگوٹھے کی زد میں لا کر اس کی بھی رگ دبا دی۔ وہ ذرا دیر کے لئے کانپا اور پھر ایک دم نیچے گر گیا۔

اب میرے لئے وہاں ٹھہرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے صادق علی کا خریدا ہوا ولائتی سوٹ پہنا ٹائی لگائی۔ اپنی تمام چیزیں اٹیچی کیس میں بند کیں اور پھر زینو اور وارث علی کے اجڑے ویران چہرے پر آخری نظر ڈال کر باہر نکل آیا۔ مجھے وہاں سے فوراً ہی نکل جانا چاہئے تھا۔ حیرت مجھے اس بات پر ہے کہاں بیچاروں پر موت وارد بھی ہوئی تو کن حالات میں اور کس بے سر و سامانی کے عالم میں۔ ایسے عالم میں کہ ان پر کوئی رونے والا بھی نہیں تھا اور میں کسی کو یہ بھی نہ بتا سکتا تھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں جا رہے تھے۔ خورشید البتہ وارث علی کو جانتا تھا وہ صبح ہوش میں آئے گا تو بہت اودھم مچائے گا مگر وارث علی کہاں باقی تھا جو اسے بتا سکتا کہ میں کون ہوں۔ خورشید ہمیشہ یہی سمجھے گا کہ میں نے ہی اس کی رقم چرائی ہے۔ یہ بھی خدا کی مرضی تھی کہ جو جرم میں نے نہیں کیا تھا وہ بھی بار و لوگ میری جھولی میں ڈال رہے تھے۔ میں نے مکان کے گیراج میں بند جیپ وارث علی کی گھوڑی کھولی اور اس پر سوار ہو کر سڑک پر جا نکلا۔

باہر اس گھڑی رات کے پچھلے پہر کی یخ بستہ ہوا ٹھٹک ٹھٹک کر چل رہی تھی اس کے رقص میں درد بھری پا سسکی تھی۔ تاروں کی روشنی زیادہ بکھری ہوئی تھی۔ چاند کا کہیں دور دور تک نام و نشان نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرا وجود کرچی کرچی ہو چکا ہے میری کوئی منزل تھی نہ کوئی ٹھکانہ۔۔۔ وارث علی کو تو میں اس لئے ساتھ لے کر چلا تھا کہ شاید وہ مجھے معلوم کر کے بتا سکے کہ آسیہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے ۔۔۔ مگر اس کی بے وقت موت نے سب کچھ گڈمڈ کر دیا تھا۔

میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر ان دونوں کا اسلم نے کیوں اور کس طرح موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ یہ بات اس وقت میرے لئے ناقابل فہم تھی کہ وہ دونوں یونہی کمرے میں پڑے پڑے گیس کے زہریلے اثر۔۔۔ سے مر گئے ہیں۔ اسلم نے تو اس طرح سارے گھر کے لوگ ہی مار ڈالے تھے مگر کس طرح؟ یہ سوال میں کسی طرح بھی حل نہ کر سکا۔

بڑی سڑک پر چلتے ہوئے ابھی میں خورشید احمد کے گھر سے ایک ڈیڑھ میل ہی دور نکلا ہوں گا کہ مجھے اپنے سامنے سڑک کے دائیں ہاتھ ایک آدمی نظر آیا۔ وہ اوندھا پڑا تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر مجھے ایک موٹر سائیکل نظر آئی جس کا انجر پنجر ٹوٹ چکا تھا۔ میں گھوڑی سے اتر کر اس آدمی کے پاس پہنچا۔ وہ بری طرح زخمی تھا میں نے اسے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی اور ایک ہاتھ بھی جھول گیا تھا وہ صحت مند آدمی تھا اور بدن سے ڈھیروں خون بہہ جانے کے باوجود ابھی تک زندگی کی رسی پر سے اس کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی تھی۔ وہ نیم بے ہوش تھا میں نے اسے جوں توں کر کے گھوڑی پر لادا۔ اس طرح جس طرح سامان اپنا دوہرا بوجھ لادتے ہیں ۔۔۔ خود بھی میں اس کو سنبھالنے کے لئے زین پر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور سیدھا جنرل ہسپتال کے ہنگامی وارڈ میں جا پہنچا۔ میرے قیمتی لباس کو دیکھ کر وہاں کے ملازم خاصے متاثر ہوئے۔ انہوں نے اس آدمی کو فوراً علاج معالجے کے مختلف مراحل سے گزار دیا۔ میں نے اپنا بٹوا بڑی فراخ دلی سے ہلکا کیا۔ کسی کو دس روپے دیئے کسی کو بیس۔ میں نے کہا کہ جیسے بھی ہو یہ لوگ اس کی زندگی بچائیں کیونکہ وہ میرا بھائی ہے۔

اس بدنصیب کی جیب سے جو کاغذات برآمد ہوئے ان سے معلوم ہوا کہ اس کے پاس ایک سو ستر روپے موجود تھے۔ نام اس کا سلیم احمد تھا ۔۔۔ وہ ماڈل ٹاؤن کا رہنے والا تھا اور پیشے کے اعتبار سے وہ ریڈیو مکینک تھا اس کے تمام کاغذات میں نے اپنی جیب میں رکھ لئے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ کسی گاڑی سے ٹکرا کر وہ اس حال کو پہنچا تھا۔

میں صبح چھ بجے تک ہسپتال کے ہنگامی وارڈ کے ایک کونے میں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا جن چار ملازموں کو میں نے بخشیش دی تھی۔ وہ مجھے ٹھہر ٹھہر کر اس آدمی کا حال بتاتے رہے۔

ساڑھے چھ بجے ایک ملازم نے مجھے بتایا کہ سلیم احمد کی ٹانگ اور ہاتھ پر پلستر کر دیا گیا ہے اور نیند کا ٹیکہ لگ جانے کے بعد وہ اپنے بستر پر اطمینان سے سو رہا ہو گا۔ میں نے سوچا اسے دیکھ لوں۔ اسے کسی کے سپرد کر دوں تو پھر وہاں سے نکلوں۔ دن کی روشنی میں تو مجھے وہاں ٹھہرنا ہی نہیں تھا۔

اس ملازم کے ساتھ میں تیز تیز چلتا ہوا جنرل وارڈ میں پہنچا۔ اس حال میں کہ میں نے سر پر قراقلی ٹوپی پہنی تھی۔ آنکھوں پر سیاہ عینک لگا رکھی تھی میرے بدن پر سرمئی رنگ کا بہت ہی خوبصورت گرم ولائتی سوٹ تھا اور پاؤں میں خاکستری رنگ کے نئے جوتے تھے۔ میں اس سج دھج میں خاصا بارعب اور دیدہ زیب آدمی معلوم ہوتا تھا میرے ہاتھ میں اٹیچی کیس تھا جس سے لگتا تھا کہ میں سفر میں ہوں۔

سلیم احمد کا بستر نمبر سترہ تھا۔ میں ہال میں دبے پاؤں داخل ہوا اکثر مریض اس وقت سو رہے تھے۔ دو چار ایسے بھی تھے جو اپنے دکھ درد کی شدت سے نڈھال تھے اور کراہ رہے تھے ۔۔۔ وہ ملازم جو مجھے اس وارڈ تک لایا مجھے اندر بھیج کر لوٹ گیا۔ نرس سے اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے سلیم احمد کو دیکھنے دے۔ اس کی سرگوشی بھی میں نے سن لی تھی۔ نرس سے اس نے کہا تھا۔

"یہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ کوئی بہت بڑے زمیندار ہیں ان کا خاص خیال رکھو۔"

"تم فکر نہ کرو ظاہر۔ بالکل فکر نہ کرو۔" نرس نے جواب دیا۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا سلیم کی طرف بڑھا۔ اچانک میری نظریں ایک بستر سے الجھ کر رہ گئیں۔ وہاں ایک ایسا چہرہ خوابیدہ نظر آتا تھا جسے میں کبھی نہ بھول سکوں گا وہ ۔۔۔۔۔ اسلم تھا۔ بہادر علی کا نوکر جس کی ٹانگوں پر پلستر لگا تھا اور جو کچھ دیر ہی پہلے خورشید احمد کو تباہ کر آیا تھا۔ میں نے ایک نظر سلیم احمد پر ڈالی وہ گہری نیند میں تھا سترہ نمبر بستر پر۔ اور اسلم کے بستر کا نمبر تھا چودہ۔ میں اس کے بستر کے قریب جا ٹھہرا۔ اور گہری گہری ۔۔۔ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے میں اس کے قریب ہی بینچ پر بیٹھ گیا۔ اسلم گہری نیند میں کھویا ہوا تھا۔ ظاہر ہے رات کی خوفناک تھکن اس سے تقاضا کر رہی ہو گی کہ وہ سو جائے۔

نرس تیزی سے میری طرف لپکی اور دبی آواز میں بولی۔ "سر! آپ کا مریض وہ ہے سترہ نمبر پر؟"

"اوہ میں سمجھا ۔۔۔۔ مگر سسٹر یہ بھی ہمارے ہی آدمی ہیں۔ میرے ایک دوست کے ملازم ہیں ۔۔۔ ان کو بھی دیکھ لوں۔" میں نے نرس کو ٹہلا دیا وہ سادہ لوح چلی گئی۔ تو میں نے چاہا کہ میں اسلم کو جگا دوں مگر ابھی میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس نے کروٹ لی اور وارڈ کی تیز روشنی سے بچنے کے لئے اپنا منہ اس نے کمبل سے ڈھانپ لیا۔

میں نے اس کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اس کے بازو پر ہلکی سی چٹکی بھری اس نے فوراً ہی منہ کھول دیا۔ آنکھیں اس کی ابھی تک بند تھیں۔

"کیا ہے سسٹر؟"

"میں سسٹر نہیں سسٹرا ہوں۔ تیرا استاد۔ آنکھیں کھول بچے۔" میں نے یخ بستہ انداز میں سرگوشی کی۔ اس لمحے پستول میں نے رومال میں لپیٹ کر اس کے پہلو سے لگا دیا تھا۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں ان آنکھوں کی حیرت اور سراسیمگی دیدنی تھی ۔۔۔ اس کی پتلیاں یوں پھیلنے لگیں جیسے پھٹ جائیں گی۔ لگتا تھا کسی نے چاقو دستے تک اس کی کمر میں دھنسا دیا ہے۔

"کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟" وہ دبی آواز میں بولا۔

"بچے! وہ ڈھائی لاکھ روپیہ کہاں ہے جو تم خورشید احمد کی الماری سے لے آئے ہو؟"

"کیا بکواس ہے یہ؟ مریضوں سے مسخری کرتے ہو؟" وہ بھنا سا گیا مگر پھر اچانک اس نے کمبل کے اندر ہی اندر سے ہاتھ اوپر لا کر کچھ اتنی تیزی سے میرے پستول کی نالی پر ہاتھ رکھ کر اس کا رخ بدل دیا کہ میں حیران ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سفاک ہو گئیں۔

"پستول چھوڑ دو ورنہ گولی چل جائے گی اور تمہارا راز سب پر ظاہر ہو جائے گا۔"

"یہ دیکھو تمہیں پتہ نہیں ہے میرا یہ پستول بے آواز چلتا ہے میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ ہاتھ پیچھے ہٹا لو اور اپنا پستول بند کر لو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا پستول کمبل کے نیچے سے آگے بڑھا کر میرے پہلو سے لگا دیا میں ششدر رہ گیا۔ وہ میری زد میں نہیں رہا تھا۔ وہ بہت ہی منجھا ہوا بدمعاش تھا اور اس کی وہ سخت کرخت نظریں اس بات کی شاہد تھیں کہ وہ اپنے دشمنوں کو معاف کرنا نہیں جانتا ہے۔ اس کی دھمکی کا مجھ پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ میں نے چپ چاپ اپنا پستول رومال میں لپٹا لپٹایا پیچھے کھینچا اور جیب میں ڈال لیا۔

"تم بہت اچھے بچے ہو۔" اس نے میرے الفاظ میرے ہی منہ پر دے مارے۔ میں نے اسے تھوڑی دیر پہلے بچہ ہی تو کہا تھا۔ اب وہ مسکرا رہا تھا۔

"تمہیں پتہ ہے وہاں دو آدمی مر گئے ہیں کمرے میں دم گھٹ کر؟"

"ان کی موت کا مجھے افسوس ہے دوست۔ حالانکہ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔"

"مگر تم نے یہ کیا کیسے؟" میرے اس سوال پر وہ پھر دبی ہوئی آواز میں بولا۔

"دیکھ پیارے! تمہارے چہرے سے ہی میں اندازہ کر چکا تھا کہ تم بھی اپنی ہی برادری کے آدمی ہو۔ تمہارا نام مجھے اچھی طرح یاد ہے ۔۔۔ تم نے مجھے زبردست چکر میں ڈال دیا تھا۔ اب تمہارے اس پستول نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ تم خاصے خطرناک شخص ہو۔ مجھے اب یہ معلوم کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ تم نے کتنے آدمی مارے، کتنے ڈاکے ڈالے۔ کیا کیا چرایا۔ سب بے کار ہے۔ یہی بہت کافی ہے کہ تم بھی داخلی ہو۔ اس لئے تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ میں وہاں کسی کو مارنا نہیں چاہتا تھا پھر بھی وہ مر گئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ صرف بے ہوش ہو جائیں گے۔

میں نے یہ کیا تھا کہ گلی میں سوئی گیس کے میٹر کے نیچے جو ہو پچ بجا ہے اسے بند کر دیا تھا، صرف دس منٹ کے لئے ۔۔۔ جس سے کمروں میں موجود ہیٹر بجھ گئے اس کے بعد میں نے دوبارہ سوئی گیس کھول دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تمام کمروں میں سوئی گیس کا زہر بھر گیا اور سب لوگ بے ہوش ہو گئے۔ تم البتہ جاگ رہے تھے اس لئے اٹھ کر باہر نکل گئے۔ تمہارے دونوں ساتھیوں پر گیس نے گہرا ہی اثر کیا اور وہ بے ہوشی کی حالت میں مر گئے۔ یہ بہت برا ہوا۔ میں نے ڈھائی لاکھ روپیہ جو وہاں سے چرایا ہے اس میں سے ایک لاکھ روپیہ میں تمہیں دے دوں گا ۔۔۔ آج یا کل شام چار بجے میں رقم تمہیں بھیج دوں گا۔"

"مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے بہت روپیہ ہے میرے پاس تم وہ رقم خورشید کو لوٹا دو تم اس کے مہمان تھے اور وہ مجھے ہی مجرم سمجھتا ہے اس کا خیال ہے وہ سب کچھ میں نے کیا ہے۔"

"لعنت بھیجو اس سالے قصے پر یار! مگر یہ بتاؤ تم وہاں سے نکلے کس طرح ہو؟"

میں نے اسے سارا واقعہ سنایا۔ تو وہ بولا۔

"پیر استاد معلوم ہوتے ہو بیلے بہر حال نکل جاؤ یہاں سے اور یقین رکھو کہ اگر تم مجھ پر آج احسان کر دگے تو میں کل اس کا بدلہ تمہیں ضرور دوں گا ـــــ مجھے لگتا ہے تم بہت پریشان ہو۔"

"ہاں میری زندگی پریشانیوں سے بھری ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔

"تمہاری آواز بتاتی ہے کہ تم ہمت ہار چکے ہو مگر تم ایسے مرد ہو جس کی دوستی اور خدمت پر میں فخر محسوس کروں گا ـــــ لکھنا جانتے ہو، تو لکھو میں اپنے دوست کا پتہ دیتا ہوں تمہیں ـــــ وہ ادھر راوی روڈ پر رہتا ہے بادامی باغ سٹیشن کے قریب۔ وہ میرا بھائی بنا ہوا ہے، پگڑی بدل بھائی۔ اپنے ہی کینڈے کا آدمی ہے اس سے جا ملو۔ وہ تمہاری ہر مشکل میں مدد کرے گا مگر اسے مت بتانا کہ میں کہاں ہوں۔" میں نے سگریٹ کے پیکٹ پر اس کا دیا ہوا پتہ لکھ لیا۔ وہ بولا "بڑے دل گردے والا آدمی ہے وہ۔ تمہارے حصے کا لاکھ روپیہ میں اسے بھجوا دوں گا ـــــ میرا نام لینا اس کے سامنے کہنا کہ اسلم آبی نے بھیجا ہے پھر دیکھو کیا کیا خاطریں کرتا ہے وہ تمہاری۔"

"تم بتا سکتے ہو بہادر علی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں کسی زمانے میں اس کا ملازم رہا ہوں اس کے کھیتوں میں کام کرتا تھا میں ـــــ ہم ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔"

"اسے پتہ ہے کہ تمہارے یہ لچھن ہیں؟"

"نہیں پیارے وہ تو میری نیکی کی قسم کھا سکتا ہے۔ وہ مل بھی جائے تو اسے کبھی میرے بارے میں ایسی ویسی کوئی بات نہ بتانا۔"

"اسے پتہ ہے کہ تمہاری ٹانگیں ٹھیک ہیں؟"

"نہیں یہ پلستر تو میں نے بچنے کے لئے لگا رکھا ہے۔ اس نے جب مجھے بتایا کہ وہ خورشید احمد کو ڈھائی لاکھ روپیہ دینے جا رہا ہے تو میں نے کہا مجھے بھی ساتھ لے چلو اپنے ساتھ۔ میری ٹانگوں میں درد رہتا ہے کوشش کر کے ہسپتال میں داخل کروا دینا۔ وہ مان گیا اور میں اس کے ساتھ ہی شہر چلا آیا۔ رات خورشید کے گھر سے نکل کر بہادر علی نے مجھے یہاں لا کر وارڈ میں داخل کرا دیا۔ میں نے ایک سو روپیہ دیا ایک آدمی کو اور کام بن گیا اس نے مجھے باہر جانے دیا۔

رات بارہ بجے میں نے اپنے ایک ساتھی کو یہاں سلایا اور خود چپ چاپ خورشید کے گھر جا پہنچا وہاں سے فارغ ہو کر آیا تو اپنے ساتھی کو رقم دے کر میں نے گھر بھیج دیا اور خود یہاں لیٹ گیا۔ افسوس یہ ہے کہ دو آدمی خواہ مخواہ مر گئے۔"

"اس بات کا افسوس نہیں ہے تمہیں کہ تم نے خورشید احمد کو لوٹ لیا ہے؟"

"نہیں بھائی میرے! اس نے تو کوڑیوں کے مول حاصل کی تھی وہ زمین کسی زمانے میں۔ اب چاندی بنا رہا ہے اس کی۔ یہ دراصل ایک بیوہ کی زمین ہے جسے اس نے کوئی پانچ سال پہلے ہیرا پھیری سے اپنے نام لکھوا لیا تھا۔ اب بھی پانچ مربع زمین باقی ہے اس کے پاس۔ اس آدمی کو لوٹنا تو عین ثواب ہے۔" اس نے بڑی عجیب سی زبان میں اپنی ساری کہانی مجھے سنا دی پھر بولا۔

"اب تم جاؤ ـــــ اور سیدھے دل شیر کے پاس جا پہنچو۔ میں بھی جلد وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"میں ذرا سلیم احمد کو دیکھ لوں۔"

"ہاں دیکھ لو۔ اگر یہ آدمی زخمی نہ ہوتا تو شاید تم قیامت تک بھی نہ پا سکتے مگر خیر مجھے خوشی ہے کہ تم ایسے جوانمرد سے میری ملاقات ہو گئی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھ سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور میرے ہاتھ کو بوسہ بھی دیا۔ بہت چالاک آدمی تھا وہ۔ سلیم احمد ابھی تک سویا ہوا تھا خواب آور ٹیکہ اپنا کام دکھا رہا تھا۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا اور آگے ہی آگے چلتا ہوا دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔

ہسپتال کے لان میں گھوڑی بے چین ہو رہی تھی میں نے اس کی لگام تھامی اور اسے لگام سے چلاتا ہوا باہر نکل آیا۔

●

سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ میں نے گھوڑی سرپٹ دوڑا دی اور ـــــ یونیورسٹی کیمپس کے اوپر سے نکلتا ہوا نہر کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا محمود بوٹی بند پر جا پہنچا۔ میں شہر کے اندر سے بادامی باغ نہیں پہنچنا چاہتا تھا اس میں خطرے تھے۔ لاہور شہر کی ہی نہیں پورے صوبے کی پولیس میری تلاش میں تھی ہر آنکھ مجھے اپنی طرف گھورتی نظر آتی تھی اور مجھے ہر آنکھ سے بچنا تھا۔

شیر دل آہو کا میں نے راوی روڈ کے مشرقی حصے میں پہنچ کر ایک صبح خیز آدمی سے پتہ پوچھا تو اس نے بڑی توجہ سے میری بات سنی۔ اس وقت تک سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ اس آدمی نے مجھے بڑی تفصیل سے آہو صاحب کے گھر کا پتہ بتایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ آہو صاحب کی اس علاقے میں بڑی عزت ہے۔ اس شخص کی باتوں سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس سے زیادہ بڑے قد کا کوئی آدمی وہاں نہیں رہتا۔

میں گھوڑی کو ایڑ لگاتا ہوا آگے بڑھا تو معلوم ہوا کہ جو نشانیاں اس نے بتائی تھیں وہ مجھے ایک بہت بڑے دو منزلہ مکان کے سامنے لے گئی ہیں ـــــ

میں نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی تو ایک ادھیڑ عمر کا آدمی باہر نکلا۔ وہ سر سے گنجا اور پاؤں سے ننگا تھا حالانکہ اتنی شدید سردی تھی مگر اس نے اپنی دونوں سرحدیں غیر محفوظ چھوڑ رکھی تھیں وہ شاید فرش صاف کرتا ہوا ایک دم باہر آیا تھا۔ میں نے اسے اپنا نام بتایا اور کہا کہ مجھے اسلم آبی صاحب نے بھیجا ہے میں آہو صاحب سے ملنا چاہتا ہوں تو وہ سر ہلاتا ہوا الٹے قدموں لوٹ گیا۔

ابھی مجھے وہاں کھڑے تین چار منٹ ہی گزرے تھے کہ دروازے میں ایک لمبا تڑنگا خوبصورت رعنا جوان نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ بہت ہی سجتی تھی۔ آتے ہی اس نے مجھ سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور پھر بڑی معنی خیز نظروں سے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا ـــــ "فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آہو صاحب آپ ہی ہیں؟"

"جی ہاں! میرا ہی نام دل شیر آہو ہے۔"

"دیکھیں جناب مجھے اسلم آبی صاحب نے بھیجا ہے میں آپ کے ہاں چند دن کے لئے ٹھہرنے آیا ہوں ـــــ" میں نے بے دھڑک ہو کر کہا۔

"کیا نام بتایا آپ نے؟"

"غلام جیلانی ـــ"

"پورا نام ـــــ؟"

"جی یہی میرا پورا نام ہے۔" وہ مجھے بہت ہی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا ـــــ

"اوہ سمجھا۔ اندر تشریف لے آئیے۔ غریب خانہ حاضر ہے۔" یہ کہہ کر پیچھے ہٹ گیا۔

"اور یہ گھوڑی؟"

"اسے بھی اندر لے آئیے۔"

اس کے کہنے کے مطابق میں گھوڑی سمیت اس کے مکان میں داخل ہو گیا۔ سامنے ایک صحن تھا۔ کوئی تیس فٹ مربع کی وسعت ہو گی اس کی اس صحن کے چاروں طرف عمارت بنی تھی مگر اس طرح کہ دوسری طرف بھی اس دروازے جتنا بڑا دروازہ لگا تھا جس میں سے میں گزر کر صحن میں پہنچا تھا۔

آہو صاحب نے صحن میں پہنچتے ہی بلند آواز سے کہا "کبری اے او کبری......"

"جی سرکار! حاضر ہوا" ایک بہت ہی چاق و چوبند آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور پھر اس کے ساتھ ہی ایک آدمی سفید براق قمیص شلوار میں ملبوس تیزی سے درمیانی کمرے میں سے باہر نکلا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ جونہی وہ میرے سامنے آیا میرے حافظے کے نہاں خانوں میں ہلچل مچ گئی۔ اس کو میں جانتا تھا وہ شبراتی تھا جسے میں کوٹ لکھپت جیل میں مل چکا تھا۔ میں جب وہاں کچا قیدی تھا تو وہ اس دور میں وہاں ایک سال کی قید بامشقت بھگت رہا تھا۔ وہ سر جھکائے تیزی سے ہمارے سامنے آ ٹھہرا تو آہو صاحب بولے "لے ادھر بھی دیکھے گا کہ نہیں۔ جا اس مال کو لے جا کر ادھر پیچھے لان کے کسی کونے میں باندھ دے پھر اس کے آگے دانہ بھی ڈال دینا۔"

آہو صاحب کا یہ حکم سن کر اس نے پہلی بار نظریں اوپر اٹھائیں اور جونہی میں اس کی بصارت کے چوکھٹے میں آیا وہ ایک دم جیسے پٹ پٹا کر مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے میں کوئی بھوت ہوں مگر میں نے اسے دیکھا ان دیکھا کر دیا۔ یوں ظاہر کیا جیسے میں اسے بالکل نہیں جانتا ہوں۔

اس نے ایک دم میرے سامنے آ کر مجھے پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آہو صاحب مجھے میرے اصلی روپ میں دیکھ سکیں۔ میں اپنی شناخت ان سے بہر حال چھپا لینا چاہتا تھا مگر اس شبراتی سالے نے میرا منصوبہ غارت کر دیا تھا۔ اب وہاں میرے لئے جھوٹ بولنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی پھر بھی میں نے اپنے گرد ایک دیوار کھڑی کر لی اور اس گھٹیا شبراتی جیب کترے کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ میرے چہرے کے خالی خالی تاثر کو دیکھ کر شبراتی کے لبوں پر آئی مسکراہٹ آہستہ آہستہ غائب ہو گئی اور اس نے جلدی ہی اپنی بھیدوں بھری گھبراہٹ پر قابو پا کر کہا۔

"بہت اچھا سرکار! ابھی لیں مگر یہ کہیں کاٹتی بھاگتی تو نہیں ہے نا سرکار۔ گھوڑیوں اور عورتوں کا کیا اعتبار؟"

"اپنے اعتبار کے گھوڑے! چل اسے لے جا ادھر کچھ نہیں کہتی یہ تجھے تیری ماں کے برابر ہے یہ حرامی بچے۔ چل ادھر۔" آہو صاحب نے ایک نئے ہی تکلف سے شبراتی کو اپنی مہربانی سے نواز دیا۔ وہ بھی سالا خوش ہو گیا۔ کھل کر ہنسنے لگا اور دانت نکالتا ہوا گھوڑی کی لگام پکڑ کر دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گیا مگر وہ جاتے جاتے بھی مجھے دہشت میں مبتلا کر گیا۔ دو تین بار اس نے مجھے یوں مڑ مڑ کر دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ حضرت یہ آپ ہیں تو آپ پہ قربان جائیے۔ آپ کی تو مجھے بہت دنوں سے تلاش تھی۔

اندازہ اس کا بالکل ایسا ہی تھا واللہ باللہ میں تو اندر ہی اندر سکڑ کر رہ گیا۔ شبراتی جیسے رذیل آدمی سے کچھ بھی بعید نہ تھا اور میں آہو صاحب کے گھر میں دو گھڑی پناہ لینے کے لئے داخل ہوا تھا۔

شبراتی میری نظروں سے غائب ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ آہو صاحب میرے چہرے کے بدلتے رنگوں کو بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں۔ ہنس کر بولے۔

"یہ ہمارا لاڈلا نوکر ہے۔ کبری نام ہے اس کا۔ بڑا منہ پھٹ ہے ایسی ایسی چھوکریاں بھرتا ہے کہ......"

"آہو بھی پیچھے رہ جاتے ہیں ـــــ" میں نے فقرہ مکمل کیا۔ میرا اعتماد لوٹ آیا تھا۔ آہو صاحب کی مسکراہٹ میں بڑا جادو تھا۔ وہ کھل کر ہنس دیئے۔

"جی ہاں جی ہاں بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ بات کچھ ایسی ہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ مجھے ایک صاف ستھرے سجے سجائے کمرے کے سامنے لے گیا مگر ابھی میں دروازے میں ہی تھا کہ دائیں طرف مکان کی دوسری منزل کی ایک کھڑکی میں مجھے ایک چہرہ نظر آیا۔ جو آنکھوں کے علاوہ سارا ایک سیاہ دوپٹے میں چھپا ہوا تھا۔ ان آنکھوں میں مجھے قیامت کا تحیر نظر آیا۔ ایسا تحیر جو میں نے کسی آنکھ میں اس سے پہلے نہ دیکھا نہ شاید کبھی دیکھ سکوں گا۔ وہ بہت ہی خوبصورت شرمیلی سی قسم کی شاعرانہ آنکھیں تھیں مگر اس گھڑی وہ جس انداز سے مجھ پر جمی تھیں وہ میرے لئے اپنی جگہ ایک بہت حیران کن بات تھی بس ایک لمحے کے لئے ہی میں ان آنکھوں کو دیکھ سکا اور بس۔ آہو صاحب نے

مجھے چونکا دیا تھا ۔۔۔

"تشریف اندر تشریف لے آئیے۔" وہ کمرے میں داخل ہو کر اپنی بھاری بھرکم آواز میں مجھے اندر داخل ہونے کا اذن دے رہے تھے۔ میں نے ان ۔۔۔ آنکھوں کے طلسم کا جال توڑتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں آدمی کی سہولت کی ہر شے موجود تھی۔ ایک طرف بہت آرام دہ قسم کا بڑا سا صوفہ دھرا تھا جس کے سامنے شیشے کی ایک میز دھری تھی۔ اس پر خوبصورت راکھ دان پڑے تھے۔ فرش پر دبیز قالین بچھا تھا۔ دیواریں ہلکے پیلے رنگ میں رنگی تھیں۔ بائیں ہاتھ ایک پلنگ بچھا تھا بہت آرام دہ اور خوبصورت۔

اس

پر فوم کا گدا اتنا نرم اور دبیز تھا کہ میں نے چاہا کہ اس پر جا کر اسی وقت لیٹوں اور سو جاؤں اور پھر ۔۔۔۔ پھر پتہ نہیں میرا جی اس لمحے کیا کیا کچھ چاہنے لگا تھا یہ جو آدمی کے ساتھ اس کا تخیل لگا ہے یہ ایک ہی لمحے میں اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے، جس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ دیوار کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا دروازہ لگا تھا۔ آنجو صاحب بولے ۔۔۔

"بیٹھیں جناب! اس کمرے میں آپ کی ضرورت کی ہر شے پہنچ جائے گی۔ اُدھر کونے میں باتھ روم ہے۔ صابن تیل تولیہ سب آپ کو موجود ملے گا۔ کرایہ صرف آپ کی محبت اور خلوص کی صورت میں وصول کیا جائے گا۔" وہ بہت کھل کر مسکرا رہے تھے۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں آنجو صاحب! کہ آپ نے اتنی توجہ فرمائی ہے۔"

"یہ میرا فرض ہے جناب! آپ کا دوست میرا صاحب ہوتا ہے ابھی کبری آتا ہوگا۔ وہ ہر طرح سے آپ کا خیال رکھے گا۔ میں اسے کہہ دیتا ہوں۔ سگریٹ بھی ادھر رکھے ہیں سامنے ۔۔۔ وہ پیکٹ کھول لیں اور بے فکر ہو کر بیٹھیں۔ جب تک جی چاہے یہاں رہیں یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔" اس نے مجھے پوری طرح زیر کر لیا تھا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ آنجو صاحب! میں اس سب کو اور آپ کو کبھی نہ بھول سکوں گا۔"

"شکریے کی رٹ نہ لگائیے جناب! یہ دکھ دینے والی بات ہے۔ آپ میرے مہمان ہیں معزز مہمان!" یہ کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے اور میں ایک بار پھر اپنی سوچوں کے تاریک غار میں اتر گیا۔ آسیہ پھر میرے سامنے آ ٹھہری تھی۔ سر جھکائے بال بکھرائے۔ اس کے رخساروں کی ساری رونقیں اجڑی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں اور آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ بدن اس کا بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا اور وہ مجھ سے بلک بلک کر پوچھ رہی تھی کہ میرا ۔۔۔۔ میرا کیا قصور ہے میرے بھیا ۔۔۔ میں نے کیا گناہ کیا ہے جس کی مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔ میں کس جرم میں یوں پسی جا رہی ہوں۔ کیونکہ مجھے جیل کی ان تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں چور چور مرنے کے لئے ڈال دیا گیا ہے تو اسی شہر میں ہے غلام جیلانی!

مگر تو کتنا مغرور ہے کہ مجھے ایک بار بھی ملنے نہیں آیا۔ کیسی ستم ظریفی ہے حالات کی کہ ہم ایک ہی شہر میں بستے ہوئے بھی یوں بیٹھے ہیں جیسے ہمارے درمیان سمندر حائل ہے اور میرا دل لہو ہو رہا تھا یہ سوچ کر کہ میں اپنی اس سامنے کھڑی بہن کو جس کا سر جھکا ہے جسے مردوں نے چور چور کر کے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے ۔۔۔ اس کے ان سوالوں کا کیا جواب دوں۔ اسے میں کیا کہوں۔ یہ جو تنہا اس گھر میں ماری گئی ہے تو اس کا کیا گناہ ہے۔ اس کی تباہی بربادی کا سبب میں تھا۔ میں جسے لوگ غلام جیلانی کہتے تھے مگر جو اپنے اعمال کے سبب اب غلام شیطانی کہلانے کا مستحق ہو چکا تھا۔ میں ہی آسیہ کی ستاروں ایسی چمکتی ہوئی جھلمل جھلمل آنکھوں میں لہو رنگ آنسو لانے کا ذمہ دار تھا۔ میں نے ہی اس کی زندگی کے روشن آسمان سے سارے چاند سورج نوچ لئے ہیں میں اسے بھلا کیا جواب دے سکتا تھا۔ اس کا چہرہ میرے تصور میں بار بار ابھر رہا تھا اور میں آنجو صاحب کے آرام دہ صوفے پر بیٹھا یوں محسوس کرتا تھا جیسے میں دہکتے ہوئے گرم توے پر بٹھا دیا گیا ہوں۔

لیکن پھر اچانک ہی مجھے یہ خیال آیا کہ اب جبکہ میں آنجو صاحب کے پاس آ پہنچا ہوں تو مجھے یہ امید رکھنی چاہئے کہ میرے اور آسیہ کے درمیان حائل فاصلوں کی دیوار جلدی مٹ جائے گی میں ضرور اسے آزاد کرا لوں گا۔ اس کی رہائی کے لئے میں اپنی جان بھی داؤ پر لگا دوں گا اور اگر میں اسے آزاد نہ کرا سکا اور اس کی سوچوں امنگوں اور آرزوؤں کے تاج محل کو حقیقت کا روپ نہ دے سکا تو جان سے گزر جاؤں گا۔ پھر زمین کا پیٹ میرے لئے زمین کی پشت سے بہتر ہوگا کہ اس درخت کا فائدہ ہی کیا ہے جس پر نہ پھل لگتا ہو نہ پھول۔ جو آس نہ دے سکے نہ باس۔ اسے تو کٹ ہی جانا چاہئے۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ آنجو کا ملازم شبراتی اندر آ گیا گھر میں اس کا نام کبری تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ اسے کبری کہہ کر پکارا جائے ۔۔۔ وہ اندر آیا تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرا رہی تھی وہ مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھتا ہوا اندر داخل ہوا اور دروازہ اپنے پیچھے بند کر کے بولا۔

"اُو استاد! یہ تم ادھر کیسے آ ٹپکا ۔۔۔ بڑے شان بان میں تیرے یہ ٹھاٹ یہ ٹھاٹ۔ تیرے تو طور ہی بدل گئے۔"

"کیا بکتے ہو کیا کہہ رہے ہو تم۔ اپنی کھال میں رہو۔"

"اُو استاد! اپنی کھال تو میں ادھر سالی کوٹ لکھپت جیل میں ہی چھوڑ آیا۔ ادھر تو ہم نے بکرے کی کھال اوپر اوڑھ لی ہے پر مجھ سے بن کے مت بڑے بھائی۔ میں تمہیں پہچان گیا ہوں برادر محترم جناب غلام جیلانی صاحب السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں اصل میں شبراتی ہوں شبراتی پاکٹ مار! مجھے کو نہیں سمجھے۔" وہ یہ کہتا ہوا ایک دم آلتی پالتی مار کر میرے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ابے گھس بیٹھیے! آواز دبا کے بات کر لیا کر بیٹے! وہ تیری جان کا یار سنے گا تو بڑی بے عزتی ہو گی اپنی۔"

"وہ اوپر جا چڑھا ہے اپنی بیگم کے پاس بیٹھا ہوگا اب۔ تمہارا چارج وہ مجھے دے گیا ہے۔ ہرن صاحب! ہرن ہی کہتے ہیں نا آنجو کو اردو میں۔"

"لعنت ہے تیری شکل پر۔ ابے تو زبان بند بھی رکھے گا کہ نہیں۔"

"او استاد! گھبراہٹ بس تیرا میرا راز ایک رہے گا۔ ادھر میں بھی اس آنجو صاحب کو بڑا اچھا دھاری سادھو بن کر ملا تھا۔ میں نے اپنے اس سسرال سے نکلتے ہی ادھر نوکری کر لی ہے۔ بابا لوگ! ادھر پاکٹ ماری کا دھندا بہت نرم پڑ گیا تھا جس کا بٹوا کھولو اروی، بھنڈی، توری، آلو، دال، چنیا اور ٹماٹر کی "لسٹ" نکلتی ہے اس میں سے۔ تنگ آ کر میں نے ادھر نوکری کر لی۔"

"تو نے بہت اچھا کیا ہے شبراتی۔ راستی بہت اچھی چیز ہے۔"

"راستی کی ایسی تیسی ۔۔۔ یہ بات نہیں ہے او استاد۔ بس ایسے ہی میں ذرا دب گیا ہوں۔ اچھا! میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکلا اور کوئی دس منٹ بعد جب وہ میرے پاس واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں یہ بڑا سا ولایتی ناخن تراش تھا۔

"لے او استاد پہلے میں تیرے ناخن کاٹ دوں۔ اتنے لمبے کر لئے ہیں تو نے۔ اگر یہ ٹوٹ گئے تو زخم ڈال دیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے بڑی محبت سے میرے پاؤں گود میں رکھے اور بڑے سلیقے سے میرے ناخن تراشنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ بولا۔

"دیکھو او استاد تم مجھے ادھر شبراتی نہ کہا کرو۔ میرا نام کبری ہے میرا اصل نام تو غلام کبریا ہے نا۔ بس وہ بگڑتے بگڑتے کبری ہو گیا۔ اب مجھے بھی اچھا لگتا ہے۔ آنجو صاحب مجھے کبھی کبھی "کبرایا" بھی کہہ لیتے ہیں جس کا مطلب ہے گھبرایا ہوا۔ مجھے غصہ تو بہت آتا ہے پر پھر میں اس سالے کو معاف کر دیتا ہوں ورنہ تو میں اس کی پاکٹ ہی کاٹ دوں۔"

"اچھا جا تو پہلے میرے نہانے کا بندوبست کر، پھر ذرا ناشتہ لے آ۔ بڑی بھوک لگی ہے مجھے۔" میری یہ بات سنتے ہی وہ اٹھا اور بولا "ارے میں تو بھول ہی گیا تھا۔ بس ابھی لایا میں سب کچھ۔ پانی بھی گرم کر دوں گا اور ناشتہ بھی۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ مجھے غسل خانے میں سے گزار کر ناشتہ کھلا چکا تھا برتن اٹھا کر باہر نکل گیا۔ بولا "میں ابھی آتا ہوں او استاد! ذرا مالکن سے بھگت لوں۔"

اس کے لب و لہجے میں بڑی محبت تھی بے پناہ خلوص جھلکتا تھا جس کی وجہ سے میں اس کی طرف سے مطمئن ہو کر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر پینے لگا۔ ماضی کے بہت سے تلخ و ترش دنوں کی یادیں میرے حافظے میں کلبلانے لگیں۔ شبراتی کو میں نے پہلی بار جیل میں ہی دیکھا تھا۔ میں تنہا قیدی تھا اور وہ لوگ ابھی مجھ سے کوئی مشقت نہیں لیتے تھے میرے مقدمے کی ابھی کارروائی جاری تھی۔

اس روز میں اپنی بیرک میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ دیوار کے ساتھ ڈھاسنا لگائے بیٹھا تھا کہ اچانک بیرک کے دوسرے حصے سے شور سا اٹھنے لگا۔ میں نے ادھر نظر ڈالی تو دیکھا کہ سیال گوجر اور اس کے تین ساتھی اس شبراتی کو بری طرح پیٹ رہے تھے۔ تمام قیدی یہ شور سن کر ادھر کو لپکے معلوم یہ ہوا کہ سیال گوجر کے گھر سے آئی ہوئی پانچ ہزار کی رقم اس کی جیب سے نکل گئی ہے۔ وہ اس بیرک کا سب سے امیر آدمی تھا اور ایک قتل کے سلسلے میں چودہ سال کے لئے اندر گیا ہوا تھا۔

کوٹ لکھپت جیل کا وہ سارا منظر وہ منظر میری نظروں کے سامنے تھا اور میرے حافظے کے سارے خانے چوپٹ کھل گئے تھے۔ شبراتی نے ان دنوں یہ لمبی سی ڈاڑھی بال رکھی تھی۔ اور سر پر بال بھی اس نے خاصے بڑھا لئے تھے ۔۔۔۔ سیال گوجر اسے بالوں سے پکڑ کر کچھ اس طرح دھن رہا تھا کہ اس کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ وہ کسی زمیندار کا بیٹا تھا اور وہاں بھی بڑے ٹھاٹھ تھے اس کے۔ گاؤں سے اس کے لئے ڈھیر سارے روپے اور سگریٹ چائے چینی، صابن تیل تولئے اور سینکڑوں قسم کی الا بلا چیزیں اندر پہنچتی رہتی تھیں۔ یہ بات وہاں مشہور تھی کہ رنجو سیال کے پاس ہر وقت پانچ دس ہزار روپے موجود رہتے ہیں اور جو چیز وہاں بڑے بڑے پاٹے خانوں کو نہیں ملتی تھی وہ اس کے پاس موجود رہتی تھی۔ اس نے جیل میں اپنا ایک الگ گروہ بنا رکھا تھا جس میں بڑے بڑے نامی گرامی بدمعاش شامل تھے۔ وہ اس کی خدمت بھی کرتے تھے اور لوگوں پر اس کا رعب قائم رکھنے میں اس کی مدد بھی کرتے تھے اپنی ان خدمات کے سلسلے میں انہیں رنجو سیال کے دربار سے ضرورت کی ہر شے مل جاتی تھی اور یوں ان کی زندگی کے دن وہاں بڑے آرام سے گزرتے تھے۔

جیل کے عملے کا منہ بند رکھنے کے لئے رنجو سیال بے دریغ روپیہ خرچ کرتا تھا ۔۔۔ اب جو اس کی جیب کٹ گئی تھی تو اس نے اپنے ساتھیوں کے کہنے پر شبے میں شبراتی کو پکڑ لیا تھا۔ میں اپنے حال میں مست اس بیرک میں گم سا پڑا ہوا ڈول پھرتا رہتا تھا اور میری اسی چپ کی وجہ سے مجھ سے کبھی کوئی نہ پوچھتا تھا کہ بھیا تیرے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ سب لوگوں کو معلوم تھا کہ شبراتی بہت منجھا ہوا پاکٹ مار ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار جیل جا چکا تھا اب سیال اور اس کے ساتھیوں کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ جیب شبراتی نے کاٹی ہے وہ معاملہ ایسا تھا کہ رنجو جیل کے حکام سے شکایت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا ایک ساتھی بھدا تو بڑے زعم سے کہتا تھا کہ جیب شبراتی کے پنجرے لگی ہے یہی لفظ کہے تھے اس نے۔

اور اب وہ سب لوگ اس بچارے پر کتوں کی طرح پل پڑے تھے شبراتی کا یہ حال تھا کہ اسے راہ نہ ملتی تھی۔ وہ مرغی کی طرح پھڑک رہا تھا۔

میں نے اس جھگڑے سے خود کو بالکل دور رکھا اور بے نیاز ہو کر دیوار کے ساتھ اطمینان سے ڈھاسنا لگا کر بیٹھا رہا۔ وہ لوگ اسے مسلسل مار رہے تھے۔ شبراتی نے اچانک ان کے درمیان سے زقند لگائی اور پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا وہ میرے پاؤں پر آ گرا اور گڑگڑا کر بولا ۔۔۔

"خدا کے لئے بچا جی! مجھے بچا لیں۔ میں بالکل بے گناہ ہوں بچا جی!"

میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"
یہ موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں میں اُبل رہے تھے۔
اس کی یہ بات سنتے ہی میں نے اسے اپنی اوٹ میں لے لیا اور پورے قد سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا مجھے یہ سب کچھ بے حد مکروہ اور گھناؤنا نظر آتا تھا۔ وہ زندگی کے دھتکارے ہوئے بے بس جانوروں کی طرح سلاخوں کے پیچھے بند انسان اپنے خبثِ باطن کو دل میں بھی دبا نہ سکتے تھے اور اتنی ساری ذلت کی دلدل میں پھنسنے کے باوجود ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوئے پھرتے ہیں۔ شبراتی کو میری اوٹ میں دیکھ کر وہ چاروں آدمی لپکتے ہوئے میرے سامنے آگئے۔ وہ سب کے سب پلے ہوئے سانڈ تھے اور وہ ایسے شہدے تھے کہ ایک بے بس مجبور اور نہتے آدمی پر اپنے ہاتھ آزما رہے تھے جس انداز سے شبراتی رو رہا تھا اس سے میرے دل میں یہ بات گہری دھنس گئی تھی کہ وہ بیچارا ہرگز قصوروار نہیں ہے۔ میرے تنے ہوئے سینے اور بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر سیال غرایا، بولا ——
"پیچھے ہٹ جا جیلانی! ہم اس کی چمڑی ادھیڑ دیں گے اس کی ...
... یہ جانتا نہیں ہے ہیں میرے پیسے اسی نے چرائے ہیں ——"
"اسے چھوڑ دے سیال یہ تمہارا چور نہیں ہے۔" میں نے نہایت ہی مجھے ہوئے لہجے میں کہا۔
"تو پھر تم نے چرائے ہوں گے ہمارے پیسے تم دے دو۔" وہ نہایت ہی بدتمیزی سے بولا۔
"میں تمہیں دے دوں گا مگر اسے چھوڑ دو۔" اب کی بار بھی میرا لہجہ ٹھنڈا جما ہوا تھا۔
"تو دے دے گا! سن بے ہوا نے پھدی! یہ پھوپھی جیلانی کہتی ہے میں دے دوں گا۔ اپنے ذات کی چھپکلی شہتیروں کو چپکے۔ تو کہاں سے دے دے گا نسرے! اس نقیرنی سے لے کر جو تجھے ملنے آتی ہے۔ دے دوں گا! ہٹ جا پیچھے اسے ادھر میرے حوالے کر اس پدی کے بچے کو۔"
یہ کہہ کر سیال پھنکارتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس کی بات سن کر میں تو پاگل ہی ہو گیا۔ اس نے میری ماں کو گالی دی تھی۔ اسے فقیرنی کہا تھا اس نے —— میری تو بدڑیاں چیخ گئیں۔ غصے کی وجہ سے مجھ پر اس گھڑی ایسا جنون طاری ہوا کہ میں نے اپنے پورے قد سے اچھل کر سیال کے پیٹ میں کچھ اتنی قوت سے لات جمائی کہ وہ لڑھکتا ہوا اپنے ساتھی غوث پر جا گرا۔ چوٹ اسے اتنی شدید لگی کہ وہ اندر سے گُچر مُچر ہو کر رہ گیا۔ غوث نے یہ حال دیکھا تو اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کر دیا۔ وہ سب خوفناک انداز سے میری طرف بڑھے مگر میں ان کا اپنی جگہ جم کر انتظار کرنے کے بجائے تیزی سے ان میں جا گھسا اور جاتے ہی میں نے غوث کی گردن مسل دی۔ وہ آناً فاناً لڑھک گیا۔ راجہ اور تاری مجھ پر پل پڑے۔ تاری میں تو جینے ایسی طاقت تھی مگر وہ فنکار نہیں تھا۔ وہ گھونسے مارتے ہوئے میرے بدن سے آچپٹے۔ یہی میں چاہتا تھا میرے لئے بڑا ہی غنیمت تھا میں نے ہاتھ بڑھا کر تاری پر بھی وہی ہاتھ آزمایا۔ اس نے فوراً ہی دم توڑ دی اور وہیں دھم سے زمین پر ڈھے گیا۔ اب راجہ اور شیدا میرے سامنے تھے۔ شیدا چند قدم پیچھے ہٹا اور اچھل کر مجھ سے ٹکرانے کے لئے دوڑا مگر میں ایک سمٹ کر ایک طرف ہو گیا وہ اپنی جھونک میں سیدھا دیوار میں جا لگا۔ دھپ کی آواز پیدا ہوئی۔ اور وہ سر میں شدید چوٹ لگنے کی وجہ سے وہیں لمبا لیٹ گیا۔ اب میدان میں صرف راجہ رہ گیا تھا۔ اس کے باقی سب ساتھی بے ہوش ہو چکے تھے۔ سیال البتہ آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا۔ تمام قیدی ہمارے گرد جمع تھے اور ظاہر ہے کہ وہ سب اس بات پر بے حد خوش تھے کہ میں نے سیال اور اس کے ساتھیوں کی اچھی طرح ٹھکائی کر دی ہے۔ اچانک میری نظر سیال کے ہاتھ پر پڑی اس نے داہنے ہاتھ میں چھری پکڑ رکھی تھی۔ وہ یقیناً اسے اسی وقت کے لئے چھپائے ہوئے تھا اس کے کسی ہمدرد نے۔ اس کے ہاتھ میں وہ چھری دیکھ کر میرا خون کھول گیا اور میں نے پاگلوں کی طرح اندھا دھند آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ اس نے اپنی ٹانگ میرے پیٹ میں مارنا چاہی مگر میں نے فوراً ہی اس کی کلائی کچھ اس طرح جھٹکا دے کر مروڑ دی کہ وہ بے بس ہو کر دہرا ہو گیا۔ جھٹکے سے چھری اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ میں نے بائیں ہاتھ کی انگلیاں اس کی رگوں پر رکھیں اور پھر اس کی گردن پوری قوت سے دبا دی —— وہ یہ برداشت نہ کر سکا اور بغیر کچھ کہے سنے چپ چاپ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔
اس کی یہ حالت دیکھتے ہی راجہ خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلا اور جیل کے سپاہیوں کے پاس جا پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میں نے اس کے سارے ساتھیوں کو قتل کر دیا تھا۔ جب وہ لوگ بیرک میں داخل ہوئے تو ان کے ہمراہ تھا ایک سپاہی سے —— اس کی رنگت پیلی پڑ رہی تھی۔
"اس نے بھاجی بیڑا غرق کر دیا ہے۔ ان سب کو قتل کر دیا ہے۔ آپ نے دیکھیں۔ سب کے سانس بند ہو گئے ہیں۔" حالت ان سب کی واقعی مُردوں سے بدتر ہو رہی تھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب مر چکے ہیں۔
سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ بیرک میں موجود قیدیوں نے یکزبان ہو کر یہی کہا تھا کہ وہ سب لوگ مجھے مارتے مارتے خود ہی بے ہوش ہو گئے۔ قیدیوں نے بتایا کہ سیال میرے پیٹ میں چھری مارنے لگا تھا۔ سپاہی ہاتھوں میں یہ بڑے بڑے ڈنڈے اٹھائے ہوئے تھے۔ اور جیل کا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ بھی ان کے ساتھ تھا —— وہ سب سے پیچھے تھا۔ وہ بڑے غضب ناک انداز میں بولا۔
"اگر یہ مرے نہیں ہیں تو پھر انہیں ہوا کیا ہے؟"
"یہ مرے نہیں ہیں جناب! بے ہوش ہو گئے ہیں ..." جوش میں یہ اول کر بے ہوش ہو گئے ہیں۔" میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ سپرنٹنڈنٹ بولا۔
"اس نے انہیں قتل کر دیا ہے سرکار۔ ان کے منکے توڑ دیئے ہیں اس نے۔" راجہ نے بڑے جوش میں کہا۔
وہ بہت زیادہ سہما ہوا تھا۔ اس نے ایسا اودھم کبھی نہ دیکھا ہو گا۔

دیکھا ہوتا تو اسے اتنی حیرت نہ ہوتی مگر وہ تو سب کچھ اس کے سامنے اس قدر اچانک اور اتنے سحر انگیز انداز سے ہوا تھا کہ اس کو یقین ہی نہیں آتا تھا میں نے کہا۔ "نہ پے! تیرا بھی علاج ہونا چاہئے تھا۔ بچے بہت ناچتا تھا تو۔"
شبراتی نے راجہ کی یہ بات سنی تو فریاد زدہ لہجے میں بولا۔ "مکار! یہ جھوٹ کہتا ہے یہ سب لوگ ان کو مار رہے تھے۔ ان سب سے پوچھ لیں سرکار! ان کو تو اللہ نے خود بے ہوش کیا ہے۔" اس کی اس بات پر بہت سے قیدی ہنس دیئے۔
"اب اللہ تعالیٰ کیا خود یہاں آیا تھا ... انہیں مارنے۔ ہائیں تو نے دیکھا تھا اسے۔" سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔
"وہ جی ...... وہ ... اللہ کوئی نظر تھوڑی آتا ہے سرکار! بس وہ تو اشارہ ہی کرتا ہے نا سرکار ——"
"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ جا شبیر حسین ڈاکٹر کو ادھر۔ ذرا دیکھے تو سہی ان کو ہوا کیا ہے۔ گگڈوں کی طرح یہ ایک ساتھ نیچے گر گئے ہیں۔"
"انہیں کچھ بھی نہیں ہوا ہے کمال صاحب! ابھی یہ آدھ گھنٹے تک چھٹی پر ہیں پھر یہ آپ ہی اٹھ جائیں گے۔"
"مگر چھٹی پر کیسے چلے گئے یہ ——" اتنا راشن کھا جاتے ہیں یہ چاروں۔ اچھا تم بتاؤ بدر الدین اصل واقعہ کیا ہوا تھا؟" سپرنٹنڈنٹ کو بدرالدین قیدی پر بے پناہ اعتماد تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر نہایت ہی فدویانہ لب و لہجے میں ساری بات کمال صاحب کو بتائی تو وہ حیران رہ گئے۔ بولے "جوان! تیرے پاس ایسی کونسی گیدڑ سنگھی ہے یہ تو بڑے خونخوار لوگ ہیں۔ چھٹے ہوئے البتہ "ب" کے نامی گرامی بدمعاش تو کیسے پورا تُل گیا ان کے ساتھ؟"
"مجھے کچھ پتہ نہیں چلا ہے کمال صاحب! بس یہ مجھے مارتے مارتے خود بے ہوش ہو گئے ہیں۔" کمال مسکرا دیا۔ وہ بہت ہی ٹھنڈے اور سلجھے مزاج کا آدمی تھا اور قیدیوں پر مہربان بھی —— بولا "ٹھیک ہے تم ادھر سے انتقال فرماؤ اور دوسری بیرک میں چلے جاؤ ورنہ ... یہاں پھر دنگا ہو گا۔ ان سے میں خود نمٹ لوں گا۔" پھر وہ شبراتی سے مخاطب ہو کر بولے۔
"اور تو بھی سن لے شبراتی! اگر یہ ثابت ہو گیا کہ یہ سب تیری کارستانی ہے بچے تو یاد رکھ میں تجھے ادھر ٹکٹکی پر لگوا دوں گا سالے اتنا ماروں گا کہ بس ساری عمر تیرے چوتڑ لال ہی رہیں گے۔"
"یہ جھوٹ بولتے ہیں سرکار! سیال صاحب کے ساتھیوں نے خود ہی مجھ کو گھیرا ہے۔ خود پیسے اڑنچھو کر کے یہ مجھے پھنسا رہے ہیں۔ مجھے مار مار کر بھُرتہ بنا دیا ہے انہوں نے۔" شبراتی نے کہا ——
"تیرا بھی میں ان سے پورا پورا حساب لوں گا۔ بے فکر رہ، کوئی لوٹ نہیں مچی ہے یہاں۔" اتنے میں ڈاکٹر بیرک میں آ پہنچا۔ اس نے ان

سب کو ہٹو نمک بجا کر دیکھا اور پھر قدرے حیران ہو کر بولا۔

"ہیں تو یہ سب ٹھیک ٹھاک! بس ذرا بے ہوش ہو گئے ہیں یہ کسی شدید صدمے کی وجہ سے۔ مگر فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ نبضیں ان سب کی برابر چل رہی ہیں۔ ذرا پانی ڈال شبیر حسین ان کے منہ پر۔"

جب شبیر حسین نے ان لوگوں کے سر اور منہ پر ٹھنڈا پانی ڈالا تو میں یہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا کہ وہ سب کے سب جلدی ہوش میں آ گئے اور ان کا..... احساس اور شعور انہیں وہیں واپس مل گیا ورنہ میں تو سمجھتا تھا کہ جو نسخہ میں نے ان پر آزمایا تھا وہ انہیں کم از کم دو گھنٹے تک تو اس دنیا کے ہنگاموں سے دُور رکھ ہی سکتا تھا۔

ابھی وہ سنبھل ہی رہے تھے کہ میں وہاں سے کھسک کر اپنے ایک بی کلاس کے قیدی کے پاس جا بیٹھا۔ میں اس سارے قصے کو بھول جانا چاہتا تھا۔

اس دن کے بعد شبراتی تو میرا ایسا مُرید بنا کہ وہ ہر وقت ہر جگہ میرا ہی کلمہ پڑھتا تھا۔ اس واقعے کے بعد میں جتنی دیر تک جیل میں رہا کسی نے بھی مجھ سے کوئی اونچی نیچی بات نہیں کی اور پھانسی کی کوٹھڑی میں بند ہو جانے تک سب لوگ میری بے حد عزت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سپاہی کے ساتھیوں کا تو یہ حال ہوا کہ وہ جہاں بھی مجھ سے ملتے مجھے جھک کر سلام کرتے اور جب بھی مجھے کسی چیز کی ضرورت پڑتی وہ مجھے فوراً مہیا کر دیتے اور سپاہی کا تو یہ حال تھا کہ میرے آگے بچھا جاتا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ میں اسے وہ خاص گُر بتا دوں جس سے میں نے ان سب کو بے ہوش کر دیا تھا۔ بہت کوشش کی اس نے مگر میں کوئی کچی گولیاں تو نہیں کھیلا تھا۔ میں نے اسے ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اپنے اس تجربے کی روشنی میں اسے خود مشق کرنی چاہیے۔

میرے اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے اسے کئی بار میں نے اپنے ساتھیوں کی گردنیں دباتے دیکھا مگر وہ اس خاص رگ کو دریافت نہ کر سکا جس پر میں ہاتھ رکھا کرتا ہوں۔ میں بھلا اپنا اتنا قیمتی راز اسے کیوں بتاتا۔ وہ حربہ تو میری ساری زندگی کی کمائی کا حاصل تھا۔ وہ میرا سب سے بڑا اثاثہ تھا۔ میں بھلا اس میں کسی اور کو کیوں شریک کر لیتا۔

اب جو شبراتی مجھے آہو صاحب کے گھر میں ملا تھا تو اس نے مجھے میری چوکڑی بھلا دی تھی۔ ڈاڑھی مونچھ رگڑ کر منڈوا رکھی تھی اس نے۔ لباس وہ اتنا اُجلا اور بے داغ پہنے ہوئے تھا کہ اسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ البتہ کندھے پر اس نے تولیے کا جھاڑن جو ڈال رکھا تھا اس پر مجھے بہت ہنسی آئی تھی۔ لگتا تھا وہ کوئی بہت پرانا خاندانی قسم کا گھریلو نوکر ہے۔ وہ بڑے فن جانتا تھا مگر سب سے زیادہ جو بات مجھے اس کی پسند تھی وہ تھی اس کی مُٹھی چاپی۔ اس کام میں وہ ایسا ماہر تھا کہ منٹوں میں نس نس سے پسینہ نکال کر آدمی کو یوں ہلکا پھلکا کر دیتا تھا کہ نیند آنے لگتی تھی۔

ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ کبری واپس آ گیا اور میرے پاس بیٹھ کر بولا۔

"استاد ادھر تو اپنا بیڑا ہو گیا ہے۔ سوڑ بیبہ اور روٹی کپڑا یہی اوقات رہ گئی ہے اپنی۔"

"پھر؟ پھر کیا ارادے ہیں تیرے؟"

"یہ بتا استاد کہ تو جیل سے فرار ہو کر سیدھا ادھر ہی آیا ہے یا راستے میں کوئی ہاتھ شاتھ بھی مارا ہے کہیں؟"

"ابے میں کوئی چور ڈاکو تو نہیں ہوں کنگڑے۔ باتیں کیسی کرتا ہے تو بھی۔" اس نے گہری گہری نظروں سے مجھے دیکھا تو میں ایک پھر دل میں ڈر اگر یہ سالا کہیں مجھے بیچ ہی نہ ڈالے۔ پہچان تو لیا ہی تھا اس نے مجھے۔ اور میرے سر کی قیمت پچاس ہزار مقرر کر رکھی تھی۔

"میں سب جانتا ہوں استاد! تیرا پہنچا ہوا بزرگ ہے تو۔ وہ جو کے اں ڈاکہ کس نے ڈالا تھا۔"

"وہ..... سب بیکار باتیں تھیں کبری۔ یہی کہوں نا میں تجھ کو جو مرضی کہہ پیارے۔ بے شک کُتا کہہ لے مجھے۔ مگر ادھر تو میرا ہاتھ بہت تنگ ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟ میں تو خود در بدر ہو رہا ہوں۔" میں نے اپنا پہلو بچاتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں مانتا پیارے۔ تیرے یہ لاتی نخرے کچھ اور ہی بتا رہے ہیں۔ مجھے مال کی سخت ضرورت ہے ادھر وہ میری بڑھیا ہے نا، ماں بڑی بد دعائیں دیتی ہے مجھے۔"

"تو پھر؟ خدمت کیا کر اس کی۔ دعائیں دے گی۔"

"بڑھے کی ماں کا سر خدمت کروں۔ ادھر زہر کھانے کو پیسہ نہیں ہے اور دیکھو یہ جو میری دو انگلیاں ہیں اس ہاتھ کی یہ ساری کام چکی ہیں۔" اس نے اپنی انگلیاں مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ وہ واقعی شل ہو چکی تھیں اور وہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق حرکت نہیں دے سکتا تھا۔

"کسی کی بد دعا نے ڈوبی ہو گی تجھے۔ کسی ضرورت مند کی پاکٹ ہو گی تو نے۔"

"بات کچھ ایسی ہی نظر آتی ہے استاد۔ مگر پتہ نہیں وہ کون تھا..... تھا۔ ایسی دعا مانگی اس سالے نے کہ بس میرا تو بیڑا ہو گیا۔ یہ نیکی شیکی سب بکواس ہے وہ تو تم کیا کہا کرتا تھا کہ وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیز گار۔ کچھ فارسی بولا کرتا تھا تو، ہے نا۔ بس وہی بات ہو گئی ہے مجھے۔"

مجھے اس کی یہ بات سن کر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ عین اسی وقت مجھے محسوس ہوا کہ دوسرے کمرے میں سے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے ...... تھی، بالکل وہی تھی۔ اس کا چہرہ سیاہ دوپٹے میں چھپا ہوا تھا۔ اور وہ میں ڈوبی ہوئی دو آنکھیں مجھ پر جمی تھیں۔ جونہی میری نگاہ ادھر اٹھی وہ چہرہ ایک دم شیشے پر سے ہٹ گیا۔

میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ یہ احساس مجھے ڈسنے لگا کہ کوئی چھپ چھپ کر مجھے دیکھتا ہے مجھے پہچاننے کی کوشش میں ہے۔ اور عین ممکن ہے وہ مجھے پولیس کے حوالے کروا دے یہ بڑا خوفناک احساس تھا۔ میں نے دوبارہ ادھر دیکھا مگر اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ کبری کو میں نے قطعاً یہ احساس نہ ہونے دیا کہ میں نے روشن دان میں کیا دیکھا ہے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اس پر میرا اعتماد قائم نہیں رہا تھا وہ بھوکا تھا، کنگال ہو چکا تھا۔ پیسے پیسے کو ترس رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ یہ سوچ رہا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ مجھ سے کچھ مال اینٹھ لے اور کسی طرح نہ ہو سکے تو وہ مجھے پولیس کے حوالے کر کے میری آہو صاحب کے گھر میں..... نشاندہی کر کے ہی پچاس ہزار روپیہ بٹور لے۔ یہ شک میرے دل میں گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی باتیں سُن کر اس کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی کی پھٹکار دیکھ کر میرا یہ شک پختہ یقین میں بدلنے لگا تھا کہ وہ مجھے ضرور کسی نہ کسی پنجرے میں پھنسا دے گا۔ اسی لئے میں نے ان جھروکے کا جس کی طرف وہ حیران حیران اور حیران کن آنکھیں ہی آنکھیں تھیں اس سے کوئی ذکر نہیں کیا۔

"ہاں! تو اس بیماری کا کیا علاج ہے تیرے پاس؟"

"کچھ بھی نہیں یار۔ میں خود سخت پریشان ہوں۔" وہ منمنایا۔ اس کے لہجے کی وہ ساری تیزی، شوخی اور بن ٹھن ایک لمحے کے لئے دب گئی تھی۔ دور کہیں بہت دور اس کی پیچیدہ شخصیت کے بہت پیچھے جا چھپی تھی۔ میرا خیال ہے کہ مجھے دیکھ کر وہ اس لئے خوش ہو گیا تھا کہ میں جیل سے بھاگا ہوا ایک روپوش مجرم ہوں۔ اسے مجھے ذرا دھمکا کر مجھ سے جتنا چاہے گا مال ہتھیانے گا مگر لگتا تھا کہ میری باتیں سن کر اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی تھی جس کی وجہ سے اس کا لہجہ بجھنے لگا تھا۔

"اچھا! چھوڑ یار ان باتوں کو، کبری پہلوان یہ بتا تیرے مالک کیسے ہیں یہ آہو صاحب؟ یہ مال پانی کی بات تو ہوتی ہی رہے گی۔"

"آہو صاحب! ایسے وہ بہت اچھے آدمی ہیں پہلوان۔ میں نے سنا ہے کہ ان کی زمینیں بھی ہیں مگر اصل بات ان کا اثر و رسوخ اور رعب و دبدبہ ہے۔" وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"کیا مطلب؟ کوئی سرکاری عہدہ ہے ان کے پاس؟"

"نہیں جی۔ سرکاری عہدہ کیا چیز ہے۔ ان کے آگے؟ ویسے سرکار دربار میں بڑی پہنچ ہے ان کی۔ کئی لیڈر ایسے ہیں جو ان کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں اور ان کو پوجتے رہتے ہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لئے کہ آہو صاحب ان کے کام بھی تو بہت آتے ہیں پچھلے الیکشن میں آہو صاحب نے ان کو اسمبلی کا ممبر بنوا دیا تھا۔"

"اچھا؟ مگر یہ سب کچھ وہ کس طرح کر لیتے ہیں؟"

"وہ جو جگیر اصاحب ہیں نا۔ ان کے لئے تو بہت کام کرتے ہیں۔ اب تو آہو صاحب کا شمار شہر کے رئیسوں میں ہوتا ہے۔ پیرٹ شرٹ پر وہ! بڑی لڑکیں ہیں ان کی۔"

"اچھا؟ کمال ہے یار۔ پھر تو تیرے پو بارہ ہوں گے۔"

"نہیں استاد! میں تو سالا بالکل ہی رگڑا گیا ہوں ادھر۔ وہ کچھ بھی چوا ہوتا ہے نا۔ بس اپنی حالت اس سے بھی گئی گزری ہے۔"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ آہو صاحب ٹھک ٹھک کرتے اندر آ گئے۔ وہ تھانے سے ہو کر آئے تھے۔ آتے ہی بولے۔

"یار جیلانی صاحب معافی چاہتا ہوں۔ بس یہ لوگ مجھے بیٹھنے نہیں دیتے۔ رات یہاں محلے میں ایک جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس کے سلسلے میں مجھے معاملہ رفع دفع کرانے کے لئے تھانے جانا پڑا۔" یہ کہہ کر وہ میرے پاس ہی صوفے پر دھپ کر کے بیٹھ گئے۔ کبری مؤدب کھڑا ہو چکا تھا۔

"ابے مُرغی کے انڈے! انہیں کچھ کھلایا پلایا بھی ہے کہ نہیں؟"

"ناشتہ کرا دیا ہے سرکار اور..... اور..... ان کے ناخن بھی کاٹ دیئے ہیں۔" کبری میرے پاؤں کی طرف دیکھ کر بولا۔

"ابے گدھے..... ان ناخنوں کا کیا ذکر ہے۔ ابے تیری اپنی عقل کے ناخن تو نہیں بڑھ گئے۔" آہو صاحب نے حیران ہو کر پہلے میرے پاؤں کی طرف اور پھر اس کے منہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ میں خجل ہو کر رہ گیا۔ کبری مجھے ذلیل کر رہا تھا۔

"وہ جی..... وہ..... دراصل ان کے پاؤں کے ناخن بہت بڑھے ہوئے تھے نا جی۔ پتہ نہیں جی شاید سال بھر سے نہیں کٹے تھے۔" وہ اوّل درجے کا عیار آدمی تھا۔ مالک کو یہ بات سمجھا رہا تھا کہ میں مشکوک آدمی ہوں مجھ پر زیادہ اعتبار نہ کرے۔ کیونکہ جس آدمی کے ناخن پور پور بڑھ جائیں وہ کسی حالت میں بھی قابل اعتماد نہیں ہوتا۔ میرے جی میں آئی کہ اس بدمعاش کا گلا گھونٹ کر دیں کچومر نکال دوں مگر میں ضبط کر گیا۔

چند لمحے بعد وہ معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ میرے چہرے پر چھائی گمبھیر سنجیدگی دیکھ کر آہو صاحب کہنے لگے

"اس کی بات کا برا نہ منائیں۔ ایسے ہی اوٹ پٹانگ بکتا رہتا ہے۔ آپ سنائیں کیا حال ہے؟"

"بس ٹھیک ہوں آہو صاحب! اس بچارے نے بہت خدمت کی ہے میری....."

"اچھا ہے! میں نے اسی لئے اسے یہاں چھوڑا تھا آپ کے پاس۔ مگر آپ نے اپنے بارے میں تو کچھ بھی نہیں بتایا۔ اور وہ اسلم آپ کہاں ہے آج کل؟"

"وہ دراصل اُدھر ہسپتال میں ہے۔ اس کی ٹانگوں پر پلستر چڑھا ہے۔ شاید وہ چند دن تک یہاں آئے کیونکہ اب وہ بالکل ٹھیک ہو چکا ہے۔"

"اچھا اچھا! بہت خوب! تو بیمار رہتا ہے وہ آج کل۔ یہ اچھی

بات ہے۔ آدمی کو کبھی کبھی بیمار تو ہونا ہی چاہئے۔" میں حیران رہ گیا
میں سمجھا وہ میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہیں۔ میں نے اب کی بار زیادہ
سنجیدگی سے کہا۔
"وہ بہت بیمار رہا ہے آہو صاحب... اس کی ٹانگوں پر پلستر چڑھا
ہے تو ظاہر ہے کہ وہ شدید بیمار رہا ہوگا۔"
"اس پلستر سے اسے بہت فائدہ ہوا ہوگا مگر آپ نے یہ نہیں بتایا
کہ آپ سے اس کی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟"
"ادھر جنرل ہسپتال میں۔ وہاں میرا ایک عزیز زیر علاج
ہے۔ میں ان سے ملنے وہاں جاتا رہا ہوں۔"
"صرف وہاں جاتے رہنے سے تو وہ آپ سے اتنا بے تکلف نہ ہو سکتا
تھا کہ آپ کو میرے گھر کا پتہ دے دیتا۔ ذرا تفصیل سے بتایئے۔"
میں نے آہو صاحب کا چہرہ دیکھا تو مجھے سخت حیرت ہوئی۔
انہیں میری کسی بات پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ایسے
آدمی کے منہ پر تھوک کر میں اٹھ جاتا مگر میں تو پناہ کے لئے ان کے
گھر میں بیٹھا تھا۔ میں سب کچھ چپ چاپ سہہ گیا اور طبیعت پر ضبط کر
کے میں نے ان سے کہا۔
"حضرت! بات یہ ہے کہ ہسپتال میں ایسی دوستیاں ہو ہی جاتی
ہیں۔ آپ کی صاحب بیمار ہیں کافی عرصے سے وہاں پڑے ہیں۔ میں ان کی
بھی خدمت کرتا رہا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں چند
دن لاہور میں گزارنا چاہتا ہوں تو انہوں نے مجھے آپ کا پتہ دے دیا۔
آپ کے ان سے جو تعلقات ہیں ــــ ان کی نوعیت تو آپ ہی سمجھ سکتے
ہیں۔ اگر آپ مجھے بار سمجھیں تو میں آج ہی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ میں
آپ کے لئے زحمت بننا تو کسی طرح بھی گوارا نہ کروں گا۔"
میرے لہجے کی اس سنجیدگی کو وہ اچھی طرح سمجھ گئے بولے۔ "نہیں
نہیں میرے لئے آپ کی آمد باعث رحمت ہے جیلانی صاحب ایسی بات
نہ سوچیں میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔ اب وہ یہاں آئے گا تو پھر اطمینان
سے باتیں ہوں گی۔ مجھے تو یہ حیرت ہے کہ اس نے مجھے اپنی بیماری کی
اطلاع کیوں نہیں دی۔ خیر دیکھا جائے گا۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کہاں کے
رہنے والے ہیں اور آپ کا ماشاءاللہ کیا شغل ہے؟"
"میں دراصل ادھر ملتان کا رہنے والا ہوں۔ ایک بینک میں ملازمت
کرتا تھا مگر وہ ملازمت چھوٹ گئی۔ عارضی آسامی تھی ختم ہو گئی۔ اب
میں یہاں بیٹھ کر قسمت آزماؤں گا۔"
"مگر آپ کا لہجہ تو ملتانی نہیں ہے۔" بڑی تیز کاٹ تھی ــــ ان
آہو صاحب کے لہجے میں۔
"آپ کی ذہانت کی داد دیتا ہوں آہو صاحب! مگر گھر میرا
وہیں ہے۔" ان کی نظریں برمے کی طرح میرے وجود میں اترتی جا رہی
تھیں اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ میں انہیں اپنے بارے میں
کس طرح مطمئن کروں۔ وہ اپنی جگہ پر یہ اندازہ لگا چکے تھے کہ میں
اسلم کی قبیل کی کوئی شے ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ مجھ سے کرید کرید کر میرا بھید
جاننے کی کوشش کر رہے تھے اور میں اس وقت سخت مشکل میں تھا۔
ان کے پاس تو میں اس لئے پہنچا تھا کہ دو گھڑی مجھے ان کے گھر پناہ مل
سکتی تھی۔ وہاں بیٹھ کر میں اپنی بہن آسیہ کو بچانے کے لئے کسی
لائحہ عمل پر غور کر سکتا تھا۔ اب جو کچھ مجھے کبریا نے بتایا تھا اس سے میری
آس بندھی تھی اور میں سمجھتا تھا کہ شاید میں آہو صاحب کی مدد سے
کے لئے کوئی ٹھوس کام کر سکوں۔ اسے جیل سے رہائی دلانے کے لئے میں
دس لاکھ روپیہ بھی صرف کر سکتا تھا۔ اور وہ روپیہ میں نے اسی لئے
رکھا تھا۔ میرے نزدیک آسیہ کی آزادی سے زیادہ کوئی چیز اہم نہ
تھی۔ اس روپے کو تو میں نے اپنے مقدمے کے دوران بھی ہاتھ نہ لگایا
یہ سوچ کر کہ بڑے سے بڑا وکیل بھی مجھے اس چکر سے نہیں نکال سکتا
کیونکہ میرا جرم بہت بڑا تھا اور خود لپٹا تھا میرے خلاف اعلان کر
تھا، للکارتا تھا پکارتا تھا قانون کو، کہ مجھے سخت سے سخت سزا دی
جانی چاہئے۔ میں بھلا اس منہ بولتے جرم پر کیسے پردہ ڈال سکتا تھا وہاں
میں جمع میری وہ پونجی بھلا میرے کس کام آ سکتی تھی۔
"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" آہو صاحب نے مجھے یوں غور سے
دیکھ کر کہا۔
"کچھ نہیں آہو صاحب! میں دراصل یہ سوچ رہا تھا کہ بات
کہاں سے شروع کروں۔ میری ایک بہن ہے آسیہ اس کا نام ہے۔
بیچاری آج کل ادھر جیل میں بند ہے میں اس کے لئے بے حد پریشان ہوں"
"ذرا تفصیل سے بتایئے کہ قصہ کیا ہوا تھا اور جیل کیسے پہنچی"
آہو صاحب کا یہ سوال سن کر اپنے بارے میں ساری باتیں چھپا کر
کی بے گناہی ثابت کرتے ہوئے ایک نئی کہانی گھڑ کر سنائی۔ وہ بڑی
میری باتیں بڑے اطمینان سے سنتے رہے۔ میں جب چپ ہوا تو
تسلی ضروری تھی کہ میں نے اپنے ماضی کو ان سے پوری طرح چھپا لیا تھا
نے انہیں یہی بتایا تھا کہ میری بہن کو ملتان سے اغوا کر لیا گیا تھا۔ جس
کے دوران اس نے ایک آدمی کو قتل کر دیا اور دو شدید زخمی ہو گئے۔ اسی
جرم کی پاداش میں وہ بیچاری جیل جا پہنچی۔ میں نے سوات خان اور
دھمن کا ذکر بھی اس سے نہیں کیا۔
"دیکھیں میں آج ہی زنانہ جیل سے معلوم کرتا ہوں۔ اگر وہ وہاں ہے
تو شاید میں اس کے لئے کچھ کر سکوں۔ ہو سکتا ہے میں آپ کی اس سے
ملاقات بھی کروا دوں۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکا میں ضرور کروں گا۔" وہ بہت
متاثر نظر آتے تھے۔
"میں خود وہاں نہیں جا سکتا ہوں آہو صاحب! جیل والوں سے
دوبار میری آسیہ سے ملاقات کے دوران جھڑپ ہو چکی ہے۔
رہتے تھے تو مجھے تاؤ آ گیا اور میں نے وہاں ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔

لئے میرا وہاں جانا اب مناسب نہیں ہو گا۔" میں نے پھر جھوٹ بولا۔
آہو صاحب عجیب انداز سے مسکرائے۔ بولے: "فکر نہ کریں
میں خود ہی ساری صورت حال سے نمٹ لوں گا اللہ نے چاہا تو سب
ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ اب آرام کریں۔ آپ شاید رات بھر سو نہیں
سکے۔ دروازہ بند کر لیں اور پلنگ پر لیٹ جائیں۔ میں دوپہر کے بعد
آپ سے پھر ملوں گا۔" یہ کہہ کر بڑے اطمینان سے اٹھے اور مجھ سے ہاتھ
ملا کر باہر نکل گئے۔
ان کے جاتے ہی کبریا میرے کمرے میں آ گیا اور بستر کی چادر
درست کر کے صحن اور پچھلی طرف لان میں کھلنے والی دونوں کھڑکیوں
پر پردے گرا کر بولا۔
"استاد! میں نے تمہاری ساری باتیں سن لی ہیں۔"
"اچھا تو پھر کیا ہوا۔ تو کوئی گورنر لگا ہے یہاں کا؟ کیا
کرے گا تو؟"
"ارے تم تو خواہ مخواہ گرم ہو گئے ہو جیلانی صاحب! میں یہ کہتا
ہوں کہ ادھر اس آہو صاحب کو بالکل مت بتانا تھا کہ تم کیا چاہتے ہو۔"
"تمہارا کیا مطلب ہے پاکٹ مار خان! کہنا کیا چاہتے ہو تم؟"
"مطلب یہ ہے کہ ذرا محتاط رہو پہلوان! آہو صاحب اسی طرح اپنا
اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ وہ تمہارا کام تو شاید کر دیں مگر کیا پتہ وہ تمہیں
کس چکر میں ڈال دیں۔"
"دیکھا جائے گا یار! تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"
اس نے کہا: "میں یہ کہہ رہا تھا استاد کہ پری پیکر آہو صاحب سے
اُوٹ پٹانگ سٹوری مت کہو۔ انہوں نے اچھی طرح پہچان لیا ہے استاد۔
اس سے جتنا بچ سکتا ہے بچ۔"
"کیا مطلب؟ ان کی باتوں سے تو کچھ ظاہر نہیں ہوتا ہے۔" میں
ایکدم سنبھل کر بیٹھ گیا۔
"مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اخبار کے ذریعے سے تمہیں پہچانا ہے
وہ صبح سے بار بار اخبار دیکھ رہے تھے۔ مجھے انہوں نے کہا ہے کہ میں
آپ کا خاص خیال رکھوں اور کہیں ادھر ادھر نہ جانے دوں۔"
"وہ اخبار کہاں ہے اب؟"
"وہ تو اُوپر اُن کے کمرے میں ہے۔"
"خیر! اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کبری! مجھے یقین ہے
کہ وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھائیں گے انہیں مجھ سے ہمدردی ہے۔"
"کوئی حسینہ عالم نہیں ہو تم استاد! ہمدردی شمدردی سب
بکار کا منتا ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ تمہاری گرفتاری پر پچاس ہزار روپے کا انعام
رکھا گیا ہے۔"
"اچھا؟ مگر پہلے تو بیس ہزار تھا؟"
"ہاں مگر اس مخالف پارٹی کو ذلیل کرنے کے لئے انہوں نے
انعام کی رقم فی آدمی پچاس ہزار رکھ دی ہے۔"
"تم یہ انعام کیوں نہیں لے لیتے۔ تم بھی تو مجھے پہچان چکے ہو۔"
میں نے اسے یاد دلایا کہ اس کی بہن تو ضرورتیں تڑکی پڑی ہیں۔ اس کی
ماں اسے بددعائیں دیتی ہے۔ وہ پچاس ہزار اس کے بھی بہت کام
آ سکتے ہیں۔ میری یہ بات سنتے ہی وہ بھڑک اٹھا۔ اور تیزی سے
آگے ہو کر بولا: "استاد! میں برا آدمی ضرور ہوں مگر احسان فراموش
نہیں ہوں مجھے اتنا ذلیل نہ کر۔"
"دفع کر یار ان باتوں کو! تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا جو ہو گا
دیکھا جائے گا۔ اگر آہو صاحب نے میری مدد کی تو ٹھیک ہے ورنہ پھر
میں تجھے بورسٹل جیل بھیجوں گا۔ تو بھی تو آسیہ سے مل سکتا ہے۔"
"تم نے پہلے ہی مجھ سے کہا ہوتا تو میں اب تک وہاں پہنچ
بھی گیا ہوتا۔"
"خیر! کوئی بات نہیں۔ دیر آید درست آید۔ میں پہلے آہو صاحب
کو دیکھ لوں پھر کچھ سوچوں گا۔"
"کیا کہا تم نے؟ دیرآؤ درست آؤ۔ یہی کہا ہے نا تم نے؟"
"ابے یوں نہیں! مسٹر طالب علم۔ محاورہ ہے دیر آید درست آید۔"
اچانک اوپر سے کسی عورت کی نغمگی سے لبریز آواز میرے
کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے کبری کو پکارا تھا۔ وہ ایسی سحر خیز اور طلسماتی
سی آواز تھی کہ میں جھوم اٹھا۔ کبری تیزی سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔
شام کو پانچ بجے کے قریب کبری نے مجھے بتایا کہ اسلم آ چکا
ہے اور اب وہ آہو صاحب کے پاس بیٹھا ہے۔
"وہ ادھر میرے پاس کیوں نہیں آیا؟"
"مجھے کیا پتہ! وہ ادھر اوپر کی منزل میں ہیں اور دونوں سر جوڑ
کر آپس میں صلاح مشورہ کر رہے ہیں مگر ان کی کوئی بات میری سمجھ
میں نہیں آئی۔"
"ذرا معلوم تو کرو۔ وہ آخر کیا کہہ رہا ہے آہو صاحب سے؟"
"مجھے تو ان دونوں نے حیران کر دیا ہے کبری! دونوں جگر دار آدمی
لگتے ہیں مجھے۔"
"ایسے ویسے! ایسوں سے تو خدا بچائے۔ استاد! بڑے
بڑوں کے پر کھینچ کرتے ہیں دونوں۔"
"اچھا تو جا ان کی سی آئی ڈی تو کر۔ آخر تو کس دن
کام آئے گا سالے۔ تیرا کوئی گوشت تو نہیں پکانا ہے مجھے۔" میں نے اسے
کمرے سے باہر دھکیلا۔ وہ چلا تو گیا مگر میرے دل میں شکوک و شبہات کے
سیکڑوں بیج بو گیا۔ اس نے آہو صاحب کے بارے میں جن خیالات کا
اظہار کیا تھا۔ ان سے تو مجھے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ حضرت بلاشبہ بہت

ہی پہنچے ہوئے بزرگ تھے اور اسلم آبی سے ان کی یاری اس بات کا پتہ دیتی تھی کہ نامی گرامی بدمعاشوں کے پشت پناہ بنے ہوئے تھے۔

کبری کو میرے کمرے سے باہر نکلے ابھی کوئی دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ وہ دونوں اندر آدھمکے۔ آبی نہایت ہی عمدہ قسم کا ولایتی وضع قطع کا سوٹ پہنے ہوئے تھا اور بہت ہی بارعب دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں پر سے پلستر یوں غائب ہو چکا تھا جیسے وہ کبھی بیمار تھا ہی نہیں۔ کمرے میں آتے ہی اس نے اپنا بریف کیس الگ رکھ کر مجھے باہوں میں بھینچ لیا۔ وہ مجھ سے اتنی محبت سے ملا جیسے میرے بغیر اس کا ایک ایک پل بڑی مشکل سے گزرا ہو۔

"کمال ہے بھئی! اتنی محبت ہے آپ دونوں میں۔ میں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔" آبو صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ ان کی مہربانی ہے جناب، ورنہ میں بھلا کس قابل ہوں۔" میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"میرے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے جیلانی صاحب! بہادر آدمی کا تو میں ماشاءاللہ بندھا غلام ہوں۔" آبی نے کہا۔ وہ خاصی رواں اردو بولتا تھا اور لب و لہجہ اس کا کسی طرح بھی یہ ظاہر نہیں کرتا تھا کہ وہ گاؤں کا اجڈ گنوار مزدور ہے۔ جیسا کہ اس نے بتایا تھا تب مجھے یہ احساس ہوا کہ اس نے اپنے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ سارے کا سارا صحیح نہیں تھا۔ اس میں اس نے خاصی جلد کاری سے کام لیا تھا۔ اس کی باتوں میں گھلی ملی رتی رتی جرأت مجھے نئے نئے نکتے سمجھا رہی تھی......

ادھر ادھر کی گپ شپ کے بعد اس نے اپنا بریف کیس کھولا اور سو سو روپے کی دس گڈیاں نکال کر اس نے میرے سامنے رکھ دیں بولا۔

"یہ لیں جیلانی صاحب! اپنی امانت سنبھالیں۔ گن لیں یہ پورا ایک لاکھ ہے۔"

"نہیں جناب! مجھے اب اس کی ضرورت نہیں ہے یہ آپ ہی کو مبارک ہو۔ آپ ہی رکھ لیں اسے۔" میں نے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ اس لمحے آبو صاحب کے چہرے پر ایسی حیرت اتر آئی تھی کہ.... باید و شاید۔ انہیں اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ آخر وہ رہ نہ سکے بولے۔

"یہ کون سی امانت لوٹا رہے ہیں انہیں؟"

"بہت دنوں سے ان کی یہ رقم میرے پاس پڑی تھی۔ میں نے سوچا آج یہ انہیں واپس کر ہی دوں۔ ان کی بڑی مہربانیاں ہیں مجھ پر آبو صاحب! اسے رکھ لیں جیلانی صاحب! مجھ سے کہیں ادھر ادھر خرچ ہو گئی تو مشکل ہو جائے گی۔"

"اچھا! ٹھیک ہے۔ لائیے ادھر۔" میں نے اچانک اپنا فیصلہ بدل کر اس سے وہ رقم لے کر ایک طرف رکھ دی۔ یہ سوچ کر کہ وہ بدنصیب خورشید احمد اپنا سب کچھ لٹا چکا ہے۔ اسے میں کسی نہ کسی طریقے سے روپیہ بھیج دوں گا تو وہ خوش ہو جائے گا۔ پھر سے جی اٹھے گا۔

آبو صاحب کے چہرے پر پھیلی حیرت مجھے یہ احساس دلا رہی تھی کہ انہیں اس سارے سلسلے کا کوئی علم نہیں ہے۔ میں تو یہ سوچتا تھا کہ آبی نے آبو صاحب کو ساری بات بتا دی ہوگی اور ان سے مشورے کے بعد ہی وہ مجھے یہ رقم دے رہا ہے۔

"آپ نے آبو صاحب کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"ان کو میں نے پچاس ہزار روپیہ دے دیا ہے۔ ان کی خدمت تو ہمارا فرض ہے جیلانی صاحب! ان کے بغیر تو ہمارا دھندا چل ہی نہیں سکتا ہے۔" آبی نے بے حیائی سے یہ بات کہہ تو دی مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کے ان الفاظ نے آبو صاحب پر گھڑوں پانی ڈال دیا۔ وہ بہت بری طرح سٹپٹا گئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ آبی سے ان کا جو ملا ہے اس کا ذکر مجھ سے کیا جائے ۔۔۔ آبی نے ان کے چہرے کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے ایک دم پینترا بدلا اور بولا۔

"بات یہ ہے جیلانی صاحب! کہ میرے کاروبار میں آبو صاحب کا بھی حصہ ہے۔ روپے میں پانچ آنے ان کے ہوتے ہیں۔ وہ میں خود ہی پہنچا دیتا ہوں۔"

"آپ کی ایمانداری کے تو ہم بہت زیادہ قائل ہیں آبی! اب دیکھیں نا اس بے سرو سامانی میں انہیں آپ نے بیٹھے بٹھائے لاکھ روپیہ دے دیا تو یہ آپ کی شرافت ہے۔ ورنہ ایسے حالات جن سے یہ دوچار ہیں کون کسی کو پوچھتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں آبو صاحب! میرے بارے میں اور کیا کچھ جانتے ہیں آپ۔ ایک ذہنی پریشانی ہے مجھے جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ وہ تو اور کوئی چکر نہیں ہے میرے ساتھ۔"

"مجھے معلوم ہے جیلانی صاحب! میں تو آبی صاحب کی بات کر رہا ہوں۔ اچھا خیر آپ آج رات ٹھہریں گے یہاں؟"

آبی بریف کیس ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا۔ "نہیں جی میں تو اب جا رہا ہوں۔ پھر کسی دن حاضر ہوں گا۔ ان کا بہر حال آپ خیال رکھیں۔ انہیں کوئی کام ہو تو میری خاطر ان کی ہر طرح سے مدد کریں گے۔"

"فکر نہ کریں آبی صاحب! مجھے خود احساس ہے۔" یہ کہہ کر آبو صاحب نے آبی سے ہاتھ ملایا تو وہ ان سے ہاتھ چھڑا کر میری طرف بڑھا بولا ۔۔۔

"آپ کو مجھ سے کوئی کام پڑے تو ان سے میرا پتہ پوچھ کر چلے آئیں۔" یہ کہہ کر وہ پھر بڑی محبت سے گلے ملا اور میرے کان میں کہنے لگا۔

"رقم کی حفاظت کرنا۔" یہ بات اس نے اتنے غیر محسوس طریقے

سے کہی کہ آبو صاحب اگرچہ ہمیں بہت گہری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ قطعاً کوئی اندازہ نہ لگا سکے ہوں گے کہ وہ مجھ سے کیا کہہ گیا ہے۔ وہ مجھ سے الگ ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ آبو صاحب اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

ایک لاکھ روپے کے نوٹ میرے سامنے دھرے تھے اور ان کا مصرف مجھے معلوم نہیں تھا۔ ماسوائے اس کے کہ میں کسی نہ کسی طریقے سے وہ روپے خورشید احمد کو لوٹا دوں۔ یہی سوچ کر میں نے وہ روپے اس سے لے لئے تھے مگر وہ میرے اس ارادے سے آگاہ نہیں تھا۔

وہ نوٹ میں نے رومال میں لپیٹے اور پلنگ کی نواڑ کے درمیان اس طرح رکھے کہ ان کے بارے میں کسی کو ہلکا سا شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا۔ آبی ان کی حفاظت کے لئے مجھے خاص طور پر کہہ رہا تھا تو اس کے ذہن میں کوئی شک ضرور ہوگا۔

نوٹوں کی طرف سے مطمئن ہو کر میں لحاف میں لیٹ کر سگریٹ پھونکنے لگا۔ اپنے وہ نوٹ جو میں نے مال سے لئے تھے میرے بریف کیس میں بند تھے اور مجھے یقین تھا کہ یہی رقم بہت دنوں تک میرے لئے بہت کافی ہوگی اور مجھے بینک میں جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ میں بینک میں داخل ہوں۔ وجہ اس کی صرف یہ تھی کہ میرا چہرہ چار..... دانگ عالم میں پولیس نے سر آنکھ سے روشناس کرا دیا تھا اور مجھے یہی خوف لاحق تھا کہ میں جیسے ہی بینک میں گھسا وہ لوگ فوراً ہی مجھے اپنے حلقے میں جکڑ لیں گے اور پھر مجھے اپنی جان بچانی مشکل نظر آئے گی۔

کبری نے اس رات نو بجے تک اپنی شکل مجھے نہیں دکھائی۔ ورنہ وہ بات بے بات اپنی خوشتنی اٹھائے اندر چلا آتا تھا اور اپنی باتوں سے مجھے حواس باختہ کئے رکھتا تھا۔ اس کے ارادے تو مجھے قطعاً نیک نظر نہیں آتے تھے۔ وہ سالا خود اپنے مطلب کے لئے جلتے سے باہر نکلتا دکھائی دیتا تھا۔ بھوں بھوں کر کے مجھے بہلا دیتا تھا۔ شام کا کھانا مجھے آبو صاحب کے دوسرے نوکر بلاتی نے کھلوایا۔ وہ بچارا بہت ہی کم گو قسم کا آدمی تھا۔ ہاں کہنا ہوتا تھا تو سر اوپر نیچے ہلاتا تھا اور نہ کہنا ہوتا تھا تو سر کو دائیں بائیں جنبش دیتا تھا اور سر بھی اس کے کندھوں پر ایسا تھا کہ بال نام کی کوئی شے وہاں موجود نہیں تھی ۔۔۔ آبو صاحب آبی کے ساتھ ایسے نکلے کہ پھر وہ ... مجھے کہیں نظر نہ آئے حالانکہ مجھے ان سے کئی ضروری باتیں کرنا تھیں۔

بلاتی مجھے کھانا کھلا کر میز پر میرے لئے چائے بھی رکھ گیا ۔۔۔ تو اچانک کبری خرکاری کتے کی طرح ادھر ادھر دیکھتا تیزی سے اندر آ گیا اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے وہ سیدھا میرے پاس آ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"تو کدھر چلا گیا تھا پہلوان؟"

"میں سالا ادھر تمہارے ہی ایک کام سے گیا تھا۔ قسم اللہ کی تیری یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی ہے استاد۔"

"کیا مطلب؟ ابے کمین چکڑ میری حالت کو کیا ہوا ہے۔ میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"کیا ٹھیک ہو۔ کچھ موج میلا بھی کیا ہے کبھی۔ جیل میں سڑتے رہے ہو۔ اس طرح سے تو اندر سے گھٹ کے جاؤ گے استاد۔"

"تیرا مطلب کیا ہے بے! تو کسی چکر میں تو نہیں ڈال رہا ہے مجھے۔"

"نہیں! بھئی نہیں۔ میں تیرے لئے..... وہ کیا کہتے ہیں.... ایک دانہ تلاش کرنے گیا تھا۔"

"اچھا پھر؟ وہ چنے کا دانہ تھا تو لے آئے ہوتے۔"

"مذاق نہ سمجھ استاد۔ بس صرف پانچ سو روپیہ لگے گا تیرا۔ صرف پانچ پاپڑ ڈھیلے کر۔ قسم اللہ کی ایسا دانہ ہے کہ بس تو دیکھتا رہ جائے۔ لڑکی نہیں ریشم کا تھان ہے۔ یوں بس کھلتی چلی جاتی ہے ایک دم فسٹ کلاس۔"

"پانچ سو روپے! کتنے دنوں کے؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ اندر سے ایک خواہش اٹھ کر میرے دل پر دستک دینے لگی تھی حالانکہ یہ راستے میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

"کتنے دنوں کے؟ او استاد تیری مت ماری گئی ہے۔ یہ صرف ایک رات کا سودا ہوگا۔ مگر قسم اللہ کی۔ وہ گندم کا دانہ دیکھا ہے جو ابھی ابھی بھٹے سے نکلا ہو۔ بس سمجھ لے کہ وہ ایسی ہی ہے۔"

"ابے جا بیٹے! الٹی پٹی مت کر! میری پاکٹ مار خالی مجھے نہیں چاہئے یہ مال۔ میں سیدھا سادا جنتی ستی آدمی ہوں۔ دوزخ ہو جا یہاں سے۔ شرم نہیں آتی تجھے۔"

"او استاد! خدا کی قسم تیری جوانی پر مجھے ترس آ گیا تھا۔ بس لا ادھر پانچ سرخے ڈھیلے کر ۔۔۔ میں اسے ابھی آدھ گھنٹے میں پچھلے راستے سے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا پھر اسے یہاں پہنچا دوں گا۔"

"معلوم ہوتا ہے تو حرام کھانے کا عادی ہو چکا ہے۔ مجھے یہ سودا منظور نہیں۔"

"نہیں او استاد! میں زبان دے آیا ہوں۔ مجھے پتہ ہے تیرے پاس مال ہے۔ بس ڈھیلا کر دے۔ دیکھ ان کا بھی کام بن جائے گا اور تیری بھی عید ہو جائے گی۔" اس نے یہ بات کچھ ایسے انداز سے کہی کہ میرا دل پسیج گیا۔ میں نے اس بڈھیلے کو اس کے سامنے بریف کیس کھول کر پانچ سو روپے دے دیئے۔ میرے دل میں یہ احساس ابھر آیا تھا کہ وہ کسی مجبور کی مجبوری سے فائدہ اٹھا رہا ہے اگر میں نے وہ سودا نہ خریدا تو وہ اس نجیبہ کو کسی اور کے آگے بیچ کر رات ہی رات میں تاخت و تاراج کروا دے گا۔ اگر وہ کوئی ڈھنگ کی شے ہوئی تو میں اس موقعے سے فائدہ اٹھاؤں گا کہ میں نے آج تک کسی کو اپنے آگے یوں ایسی چیز

پھلکتے نہیں دیکھا۔ اگر وہ میرے راستے میں آ ہی گئی ہے تو دیکھتے ہیں وہ کیسی ہے۔ اس کبری کی خصلت کو تو میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے اس سودے میں سے لمبا ہی ہاتھ مارا ہو گا۔ مجھے یہ تجسس گھیرے بیٹھا تھا کہ اس خبیث کے ہاتھ کی لمبائی مجھے ضرور دیکھنی چاہئے۔ پتہ نہیں اس نے کہاں کہاں سے نقب لگا رکھی تھی۔ نوٹ ہاتھ میں لے کر وہ پھدک کر اٹھ بیٹھا اور بولا۔

"بس میں ابھی آیا، تو ذرا اپنے آپ کو چاق و چوبند رکھنا۔" وہ نعلیں سجاتا ہوا تیر کی طرح سیدھا نکل گیا۔ اس کے جانے کے کوئی پانچ منٹ بعد بلی اندر آیا اور چائے کے برتن اٹھا کر باہر لے گیا۔ وہ جاتے ہوئے مجھے کہہ گیا کہ میں دروازہ اندر سے بند کر لوں ـــــ مجھے وہ سالا کبری ایک نئے ہی چکر میں ڈال گیا تھا۔ میرے بدن میں عجیب عجیب سے جذبے سر ابھارنے لگے۔ میں نے سوچا ٹھیک ہے کبری پہلوان بدصیا مرے تو مرے آگرہ تو دیکھ لیں گے۔ میں اس کے انتظار میں بیٹھا کافی دیر تک ایک رسالے کی ورق گردانی کرتا رہا ـــــ اس کبری کمینے نے مجھے عجیب سی وحشت میں مبتلا کر دیا تھا۔ حرفوں پر میری نظریں نہیں جمتی تھیں۔ وہ آدھا گھنٹہ میرے لئے آدھی صدی بن گیا۔ میں وہاں بادشاہ بنا بیٹھا تھا۔ پانچ سو روپے میں نے اسے یوں نکال کر دیئے تھے جیسے میں کہیں کا بہت بڑا جاگیردار ہوں ـــــ

میرے لئے بالآخر اس دولت کی کوئی وقعت نہیں رہ گئی تھی۔ وہ مجھے ہاتھ بڑھاتے ہی مل تو گئی تھی مگر یوں کہ اس کے عوض میں اپنی اصل شناخت اور شخصیت کو گروی رکھ بیٹھا تھا پھر بھی مجھے اطمینان تھا کہ جو راہ میں نے پکڑی ہے وہ کہیں نہ کہیں تو مجھے پہنچا ہی دے گی۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد میرے کمرے کے اس دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی جو پچھلے لان میں کھلتا تھا۔ میں نے اٹھ کر بتی بجھائی اور دبے پاؤں چلتا ہوا اس دروازے تک جا پہنچا۔ دل میرا دھڑ دھڑ بج رہا تھا۔ اس جل کال نے مجھے واقعی ایک نئے چکر میں ڈال دیا تھا۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں کبری! دروازہ کھولو بھائی جان جلدی کریں۔" میں نے اس کی آواز پہچان کر چٹخنی نیچے گرا دی۔ دروازہ بے آواز کھلا تو کبری برقعے میں لپٹی لپٹائی ایک عورت کو لے کر اندر آ گیا۔

"یہ بتی کیوں بجھا دی ہے جناب آپ نے!" وہ اس لمحے مجھ سے بہت ہی مہذب انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔

"یہی بہتر ہے۔ ادھر بٹھا دے انہیں پلنگ پر۔"

"ٹھہرو میں یہ چھوٹا بلب جلا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے دائیں ہاتھ کی دیوار ٹٹول کر بتی جلا دی۔ کمرہ سبز رنگ کی ہلکی ہلکی روشنی سے لبریز ہو گیا۔ وہ میرے سامنے کھڑی تھی، سکڑی سمٹی اپنے آپ سے خوفزدہ ڈری ہوئی، سہمی ہوئی برقعے میں دہری ہوئی جاتی تھی۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا جیسے میرے سارے ہی جذبے ٹھنڈے پڑ گئے ہیں ـــــ مخصوص قسم کی سستی سی خوشبو اس نے لگا رکھی تھی جو کمرے [illegible] آہستہ آہستہ ناگوار بنا رہی تھی۔

"چل ری ادھر بیٹھ جا پلنگ پر۔ اور دیکھ فیل مت مچا [illegible] ماری جائے گی خواہ مخواہ میں۔ چل۔" یہ کہہ کر کبری نے اس کو دھکیل [illegible] پلنگ پر بٹھا دیا۔ وہ ابھی تک اپنا نقاب سختی سے پکڑے ہوئے [illegible] اس نقاب کے پیچھے اس نے پر غصے رنگ لکھے ہوں جو ذرا سا [illegible] اٹھتے ہی اس کے چہرے کی کایک سے نکل جائیں گے۔

"بس جناب میں تو چلا، اب آپ جانیں اور آپ کا [illegible] اتنی احتیاط رکھیں کہ ـــــ آپ کی آواز بھی باہر نہیں آنی چاہئے۔ یہ میری عزت کا معاملہ ہے۔" یہ کہہ کر کبری تیزی سے مڑا اور ایک جھپاکے سے باہر نکل گیا۔ اب مجھے اس [illegible] تھا۔ اس بندگی سے۔ جس کی تعریف میں اس حرامزادے نے زمین [illegible] کے قلابے ملا دیئے تھے۔

"آپ برقعہ اتار کر آرام سے بیٹھیں، پاؤں اوپر کر لیں۔" اس نے میرے کہنے کے مطابق اپنی جوتی اتاری اور دونوں [illegible] ہو کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ سردی سے ٹھٹھرتی نظر آتی تھی۔ ٹھٹھر [illegible] سی لیتی تھی۔

"لحاف اوڑھ لیں اور پہلے برقعہ تو اتار دیں۔ یوں منہ ہو کر بیٹھنے سے کیا فائدہ۔" وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی۔

"کیا بات ہے آپ میری بات نہیں سنتی ہیں؟"

یہ کہہ کر میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ آلتی پالتی مار کر۔ اس کے برقعے پر لگی وہ واہیات خوشبو اور زیادہ شدت سے میرے نتھنوں میں چڑھنے لگی۔

"برقعہ اتار دیں۔" میں نے ایک بار پھر کہا۔ شاید میرے [illegible] کو اس نے محسوس کر لیا تھا۔ اس نے فوراً ہی نقاب الٹ کر برقعے کے [illegible] دیئے۔ وہ سالا کبری بالکل ٹھیک کہتا تھا۔ لڑکی واقعی حسین تھی [illegible] حسین۔ مگر صرف چہرے کی حد تک۔ اس کا باقی بدن بالکل مرجھایا [illegible] آتا تھا۔ ہڈیوں کی مٹھ دکھائی دیتا تھا۔ وہ شاید فاقوں کی ماری [illegible] تھی۔ بہت ہی نحیف و نزار تھی اتنی کمزور کہ اس کے ہاتھوں پر [illegible] رگیں ابھر آئی تھیں۔ عمر اس کی یہی کوئی سولہ سترہ سال ہو گی [illegible] غذا نہ ملنے کی وجہ سے اس کا برا حال ہو چکا تھا اور وہ اس رات [illegible] پہلی بار روپیہ کمانے نکلی تھی ـــــ اگرچہ وہ بے حد کمزور تھی [illegible] کے چہرے پر ایسی دلفریب غارت تھی، ایسی چمک تھی کہ اس پر نظریں [illegible] تھی۔ اس نے آنکھیں پوری طرح کھول کر پہلی بار مجھے دیکھا [illegible] رہ گیا۔ یہ بڑے بڑے آنسوؤں میں اس کی آنکھیں تیر رہی [illegible] اسی دکھ کی پوٹ کو دیکھا تو معاً مجھے اپنے وجود میں کوئی شے [illegible]

ڈوبتی محسوس ہوئی۔ میرے تصور میں آسیہ کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ وہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا اجڑا اجڑا ویران چہرہ جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہے آسیہ میرے ذہن میں کوندتی بجلی کی طرح نمودار ہوئی اور میرے سارے جذبوں کی رگوں سے خون نچوڑ کر لے گئی۔

میں اس سے دو ہاتھ پیچھے کھسک کر پلنگ کے اس سرے پر جا بیٹھا ـــــ "تمہارا کیا نام ہے؟"

"مجیدن۔" اس کے خشک لبوں سے اپنا نام یوں نکلا جیسے وہ اس سے بے حد متنفر ہو ـــــ وہ ٹھہر ٹھہر کر لرزتی تھی۔

"یہاں کیوں آئی ہو؟ کس نے بھیجا ہے تمہیں؟"

"میری ماں نے۔"

"کیوں؟ ایسی کیا ضرورت پڑ گئی ہے اسے؟"

"وہ بیوہ ہے اور بیمار ہے۔ اسے فالج ہو گیا ہے۔"

"پھر؟ پھر کیا ہوا؟"

"اس کے پانچ بچے ہیں۔ میں بڑی ہوں۔"

"پھر؟ آگے بتاؤ۔ بات کرو۔"

"چار چھوٹے ہیں اور......" اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور ٹھوڑی اس نے اپنے زانو پر رکھ لی تھی۔

"اچھا پھر؟ چار بچے ہیں۔ تم بڑی ہو۔ پھر؟ پھر کیا ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ ماں نے مجھے کبری کے ساتھ بھیج دیا۔"

"مگر کیوں؟ کیوں بھیج دیا تمہیں؟"

"بچے بھوکے سوتے ہیں نا۔ تین دن سے بھوکے ہیں۔"

"اور تم؟"

"مجھے کبری نے آج شام کو دودھ پلایا تھا اور ڈبل روٹی بھی کھلائی تھی۔" وہ بولنے لگی تھی۔

"اور کسی کو کچھ نہیں کھلایا؟"

"نہیں! شام کو تو کچھ نہیں دیا اس نے۔ ابھی میں اس کے ساتھ باہر آنے لگی تو اس نے ماں کو ڈھائی سو روپے دیئے تھے۔"

"اس کبری کے بچے کا میں کچومر نکال دوں گا۔ وہ تو مجھ سے پانچ سو روپے لے کر گیا ہے۔"

"وہ...... وہ کہتا تھا صاحب نے تین سو دیئے ہیں ـــ پچاس میں لوں گا۔"

"تو پہلے بھی کہیں گئی تھی؟"

"نہیں! یہ پہلی رات ہے۔" اس کی ماتم کناں آواز نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔

"تیرا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"میں ادھر کچی آبادی میں رہتی ہوں لائن کے پار۔" اس لمحے آسیہ بالکل میرے سامنے کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی رل ترل مسلسل جاری تھی۔ مجیدن کی آنکھوں سے بھی ساون بھادوں جھانک رہا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر اپنے آنسو دوپٹے میں جذب کر رہی تھی۔

"تمہارا مکان اپنا ہے؟"

"نہیں۔ بارہ روپے مہینہ کرایہ دیتی ہے ماں چوہدری کو۔"

"وہ کتنا بڑا مکان ہے۔ میرا مطلب ہے کتنی قیمت ہو گی اس کی؟"

"چوہدری ستائیس ہزار مانگتا ہے مگر ہم کہاں سے دے سکتے ہیں؟ ہم تو چھ ماہ سے کرایہ بھی نہیں دے سکے تھے۔"

"کیا نام ہے تیری ماں کا؟"

"سہتی! ویسے نام اس کا فتح بی بی ہے مگر سب اسے سہتی ہی کہتے ہیں۔"

"تو پڑھی لکھی ہے؟"

"میں نے آٹھویں میں سکول چھوڑ دیا تھا۔"

"کبری کب سے واقف ہے تم لوگوں سے؟"

"وہ بہت دنوں سے میری ماں کے پیچھے لگا تھا۔ تین چار مہینے سے۔ کہتا تھا سہتی لڑکی کو دھندے پر لگا دے۔ تیرے دن پھر جائیں گے۔"

اس لڑکی کی باتیں سن سن کر میرا کلیجہ کٹنے لگا تھا۔ اس کبری حرامزادے نے پتہ نہیں کتنے گھر تباہ کر دیئے ہوں گے ـــــ اس پر مجھے سخت طیش آنے لگا تھا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔

"برقعہ پہن لے میری بہن، میری اچھی بہن اور اٹھ۔" یہ کہہ کر میں پلنگ سے اتر گیا۔ مجیدن نے مجھے یوں دیکھا جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی تھی اور اب اچانک اس کی آنکھ کھل گئی ہے۔ اس کی آنکھیں یوں کھلی تھیں جیسے اسے میری باتوں پر اور اپنے کانوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو ـــــ

"اٹھ میری بہن میری ننھی منی بہن اچھی سی بہن اٹھ۔" میری آنکھیں بہہ نکلی تھیں۔ میں نے بے اختیار ہو کر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا ـــــ

"اٹھ مجھے اور گناہ گار نہ کر مجیدن میری بہن آ میرے ساتھ آ۔"

وہ اٹھی۔ اور برقعہ پہن کر میرے سامنے یوں کھڑی ہو گئی ـــــ جیسے وہ اجل کا حکم سننے کے لئے خود کو تیار کر رہی ہو۔ اسے میری کسی بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھ بچا کر پستول جیب میں رکھا۔ کمبل اپنے کندھے پر ڈالا اور بریف کیس ہاتھ میں لے کر پچھلے دروازے کی طرف چل دیا۔

مگر جونہی میں نے دروازہ کھولا میرے غصے کے شعلے کو آگ لگ گئی۔ وہ کبری منحوس ادھر دروازے کے پیچھے کھڑا تھا اور حیران پریشان ہو رہا تھا۔ وہ ہزار کوشش کے باوجود ہماری کوئی بات نہ سن سکا تھا کیونکہ ہم نے جتنی بھی باتیں کی تھیں وہ اتنی آہستہ تھیں کہ میرے اپنے

کانوں کو ان کے سُننے کے لئے خاصی کاوشش کرنی پڑی تھی۔

کبری نے خالی خالی نظروں سے ہمیں دیکھا اور بولا "اوستاد! مَیں اُدھر پہرہ دے رہا تھا۔ قسم اللہ کی یہ میری عزت کا سوال تھا۔"

"اچھا کیا تم نے" میں نے جل کر کہا۔

"مگر اتنی جلدی کیوں نکال رہے ہو اسے۔ ابھی تو پندرہ منٹ بھی نہیں ہوئے۔"

"بکو مت! چلو میرے ساتھ چلو۔ میں اس کے گھر میں رات گزاروں گا۔"

"کیوں؟ اُدھر کیا خطرہ ہے! سب لوگ سو چکے ہیں اوستاد۔ قسم اللہ کی بالکل گھامڑ ہے تو۔ بکی کا مادھو بن رہا ہے اس وقت۔" وہ دبی آواز میں بولا۔

"ابے زیادہ بک بک مت کر۔ چل اُدھر باہر نکال ہمیں۔" میں نے اسے آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔ میرے تیور دیکھ کر وہ بدکا اور آگے آگے چلنے لگا۔ اس نے درختوں کے سایوں کے تلے سے گزار کر ہمیں لان کی دوسری طرف پہنچایا اور پھر پیچھے سے لوہے کے دروازے کا ارل کھینچ کر بولا۔

"حد کر دی ہے تم نے اوستاد! رقم حرام گنوا دی تو نے۔"

"بکواس بند کرو کبری ورنہ میں ایک جھانپڑ دوں گا تیرے منہ پر سیدھی طرح آگے لگ جا۔" اس نے میرا جلا کٹا لہجہ دیکھا تو خوفزدہ کتے کی طرح آگے ہو لیا۔ سامنے کھیت تھے۔ ان میں سے گزر کر ہم نے ریلوے لائن عبور کی اور پھر کوئی پندرہ منٹ بعد ہم ایک ایسے مکان کے سامنے کھڑے تھے جو چٹکی چاندنی میں کسی لب جاں مریض ایسا نظر آتا تھا۔ اس کے بوسیدہ سے کواڑ پر جب میں نے پاؤں کی ٹھوکر ماری تو وہ چیخ اٹھا۔ بھتی ابھی تک سوئی نہیں تھی۔ صحن میں چھپر کے نیچے رکھے چولہے کے پاس بیٹھی تھی۔ کواڑ کی تڑی تڑی جھریوں سے اندر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ چار بچے اس کے گرد ایک چیتھڑا سی بوری پر کھیس میں لپٹے بیٹھے تھے۔ وہ بھوکے تھے اور شاید کھانا پکنے کے انتظار میں ماں کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔

دوسری دستک پر بھتی نے دروازہ کھولا تو اس کے کھوکھلا جسم کو دیکھ کر دماغ سُن ہونے لگا۔ اس کا بایاں ہاتھ اور بائیں ٹانگ فالج زدہ تھی اور وہ لکڑی کے سہارے چلتی تھی۔

اس نے دروازہ کھولا تو میں نے مجیدن کو اپنے آگے دھکیل کر صحن میں پہنچا دیا۔ بھتی حیرت زدہ سی ہو کر ہمیں دیکھنے لگی۔ کبھی وہ کبری کو دیکھتی تھی، کبھی مجیدن کو۔ پھر پھر کر اس کی نظر میرے چہرے پر آ ٹکتی تھی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولی ——

"کیا بات ہے باؤ جی! کوئی "غلطی" ہو گئی ہے چھوری سے؟"

"ہاں! غلطی ایسی غلطی۔ ذرا اندر چل پھر میں بتاتا ہوں تجھے"

یہ کہہ کر میں ان سب کو دھکیلتا ہوا کوٹھڑی میں لے گیا۔ بچے بھی سہمے چارپائی کے پاس آ ٹھہرے۔ کوٹھڑی میں ایک جھلنگا سی چارپائی اِدھر بچھی تھی اور ایک اُدھر۔ درمیان میں تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔

"دروازہ بند کر لے اماں! میں تجھ سے کچھ حساب کتاب کرنے آیا ہوں۔ تو بھی اُدھر بیٹھ جا ری۔ کیا نام ہے تیرا مجیدن۔ وہاں بیٹھ جا اُدھر۔" مجیدن کانپتی لرزتی سامنے کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ رنگت اس کی اس گھڑی ہلدی ہو رہی تھی۔

"آخر کیا کیا ہے اس بدبخت نے باؤ جی؟ کوئی "غلطی" کی ہے تو مجھے معاف کر دیں۔"

"میں نے اسے اپنی بہن بنا لیا ہے اماں! میری بھی ایک بہن ہے میں اس کی عزت کے لئے سارے جہان کو تہس نہس کر سکتا ہوں ... تو کیسی ماں ہے کہ اسے تو نے اس شہدے کے حوالے کر دیا۔"

بھتی کا تو میرے یہ الفاظ سن کر اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ کچے فرش پر ڈھے سی گئی —— اور ہاتھ مسلتی ہوئی ...

"میں.... میں بدنصیب کیا کرتی، کالے کرموں والی، بیوہ، فالج کی ماری! میں کیا کرتی؟ تین دنوں کا فاقہ بیت گیا ... کسی ہمسائے نے بھی نہ پوچھا کہ بھتی تیرا کیا حال ہے۔ میں کیا کرتی باؤ جی میں کیا کرتی؟" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کبری کا یہ حال تھا کہ وہ پاگلوں کی طرح کبھی چھت کو گھورتا تھا اور کبھی ہم سب کے چہرے کو۔ اس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

"اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے ماں جی۔ میں نے مجیدن سے ساری باتیں سُن لی ہیں۔ میرا تو کلیجہ کٹتا ہے اس کی باتیں سُن کر اور میں اسی لئے آیا ہوں ماں جی۔ اب روئیں نہیں۔ بالکل نہیں روئیں۔ مجھے اپنا بیٹا سمجھیں، مجیدن کے سگے بھائی ایسا۔"

"اللہ تجھے دنیا کا بادشاہ بنائے باؤ جی! خدا تجھے اتنا دے کہ تو سنبھال نہ سکے۔" اس کی یہ بات سن کر میں نے اوٹ میں رکھ کر بریف کیس کھولا اور اس میں سے دس ہزار کی گڈی نکال کر اس کے سامنے ڈال دی۔

"یہ لیں۔ یہ دس ہزار روپیہ ہے۔ اس چوہدری ستا کو ابھی بلوا لیں اور یہ مکان تین ہزار روپیہ دے کر خرید لیں۔" نوٹ دیکھ کر بھتی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس میں اتنی بھی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اس گڈی کو زمین پر سے اٹھا لیتی۔ آنکھیں اس کی ... بنتی جا رہی تھیں —— میں نے وہ نوٹ خود اٹھا کر اس کی جھولی میں ڈال دیئے ——

"وہ ستا مل سکتا ہے اس وقت؟"

"ہاں باؤ جی وہ اِدھر ہی رہتا ہے۔ میں ابھی بلاتی ہوں اسے" یہ کہہ کر بھتی لاٹھی سنبھالتی ہوئی اٹھی اور باہر نکل گئی۔ نوٹ اس نے دوپٹے میں لپیٹ لئے تھے۔ مجیدن کا یہ حال تھا کہ وہ چارپائی پر

میں سر دیئے بیٹھی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

"جا بہن! اٹھ کر ان کو کھانا تو پکا کر دے دے۔ جا اٹھ میری اچھی بہن۔"

یہ کہہ کر میں نے مجیدن کو اس کی جگہ سے اٹھایا۔ وہ پہلی بار کھل کر مسکرائی۔ آنکھیں اس کی بھیگی ہوئی تھیں اور وہ جو رذیل سی سرخی اس نے ہونٹوں پر لگائی تھی وہ اس نے چپکے چپکے اپنے برقعے سے رگڑ کر پونچھ ڈالی تھی۔ اس نے آنکھوں میں سرمہ بھی ڈالا تھا مگر اب اس کی سیاہی اس کے رخساروں تک بہہ آئی تھی اور اس حال میں اس کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ دلکش نظر آتا تھا۔ اس نے برقعہ اتارا۔ ایک میلی سی چادر اوڑھی اور بچوں کو ساتھ لے کر چولہے کے پاس جا بیٹھی۔ ہانڈی پک چکی تھی اور پرات میں آٹا گندھا رکھا تھا۔ وہ توا چولہے پر رکھ کر روٹیاں پکانے لگی اور...... اور...... ایک بار پھر آسیہ میرے تصور میں اُبھر آئی۔ اب وہ مجھے بہت خوش نظر آرہی تھی جیسے کہہ رہی ہو تم نے بہت اچھا کیا ہے بھائی! تم نے خود کو میرا بھائی ہونے کا اہل ثابت کر دیا ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے میرے بھائی! وہ بہت ہی خوش دکھائی دیتی تھی۔ یوں جیسے کوئی پرندہ صبح صبح گھونسلے سے اڑ کر خوشبو سے لدے پھندے کسی باغ میں چہچہا رہا ہو۔

مجیدن باہر صحن میں نکلی تو کبری سرک کر میرے قریب آگیا اور چارپائی کی پائینتی بیٹھ کر بولا۔

"اوستاد! تم پاگل ہو گئے ہو ایک دم پاگل۔ میں بولتا ہوں اِدھر ان گنتی لوگوں کو اتنا روپیہ دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بک نہیں الو کے کبری! کمینے تیرا تو حساب ... اب میں باہر چل کر دوں گا۔ اس معصوم کو برباد کرتے تجھے شرم نہیں آئی۔"

"شرم کی کیا بات ہے! اِدھر تو بہت سی ایسی ہیں یہی دھندا کرتی ہیں۔ کس کس کو رقمیں دو گے تم۔ اوستاد تم بالکل گھامڑ ہو۔"

"اوروں پر لعنت بھیج۔ مجھے تو یہ اپنی بہن آسیہ لگتی ہے۔ ویسی ہی معصوم اور سادہ لوح ہے کبری! اپنا منہ بند رکھ۔ میں کچھ نہیں سنوں گا۔ تم سالے اتنے کمینے ہو کہ انہیں ڈھائی سو دے کر ڈھائی سو اپنی جیب میں ڈال بیٹھے ہو۔ یہ شرافت ہے تمہاری؟"

"اچھا؟ تو اس نے یہ بھی بتا دیا ہے تجھے مگر اوستاد میرا بھی تو تو نے کوئی خیال نہیں کیا۔ اتنا روپیہ ہے تمہارے پاس۔"

"وہ تیرے جیسے شہدوں کے لئے نہیں ہے کبری! تو پتہ نہیں کیا چاہتا ہے؟ مگر مجھے اتنا پتہ ہے کہ تیری نیت بہت کھوٹی ہے۔"

"نیت کھوٹی ہوتی تو میں اب تک تیرا تیا پانچا کر چکا ہوتا بھلائی! پچاس ہزار مل سکتے ہیں مجھے۔ صرف انگلی اٹھانے کی دیر ہے۔" اس نے بڑے گمبیر لہجے میں مجھے صاف سیدھی دھمکی دی۔ میں نے آنکھیں پوری طرح کھول کر اسے دیکھا۔ وہ ویسا ہی تھا جیسا میرے دل نے اس کے بارے مجھے بتا رکھا تھا۔ وہ کسی بھی وقت کوئی بھی قدم اٹھا سکتا تھا۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھا تھا میرے جی میں آئی کہ میں اس کا دین بیٹھے بیٹھے ٹینٹوا دبا دوں وہ اسی قابل تھا۔ اس پر اعتبار کیا ہی نہ جا سکتا تھا مگر میں جس کام کے لئے اس جھگی میں بیٹھا تھا وہ اس کی بکواس سے کہیں زیادہ اہم تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنا ہاتھ روکا۔ مجھے چپ دیکھ کر کبری شیر ہو گیا بولا۔

"تمہارے پاس اتنا روپیہ ہے لٹانے کے لئے تو مجھے دس بیس ہزار دے جاؤ۔ میری سو ضرورتیں اڑی پڑی ہیں۔ اس ماں کے لئے اِدھر خواہ مخواہ حاتم طائی بن بیٹھے ہو۔" وہ بہت ہی کبیدہ خاطر ہو رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ اگر اس کا بس چلتا تو مجھے وہیں چھیل کر صاف کر دیتا۔

"تمہیں تو میں نوٹوں میں گاڑ دوں گا بچے! فکر نہ کر دیکھتا رہ میں کیا کرتا ہوں تیرے لئے۔ مگر یہ ظلم جو کر رہا ہے بند کر دے۔ مجھے آج اس سلسلے میں آہو صاحب سے بھی بات کرنی پڑے گی۔"

"او نہہ آہو صاحب! اوستاد اُدھر سے بے فکر ہو جا۔ اس دلی کی بات سننے سے۔ یونہی نہیں بیٹھا ہوں میں وہاں۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ اس کی پگڑی کو بھی ایسی معصوم لڑکیوں کے خون کا کلف لگا ہے، بہت خوب!"

ابھی یہ بات میرے منہ ہی میں تھی کہ بھتی تیزی سے صحن میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک چھریرے قد کا دھان پان آدمی تھا جو کھیس کی بکل مارے ہوئے تھا۔ اس کے سر پہ کالی ٹوپی تھی۔ وہ صورت شکل سے ہی مجھے شہدا نظر آرہا تھا۔ عمر اس کی یہی کوئی چالیس سال ہو گی۔ وہ آیا اور... کوٹھڑی کے دروازے میں رک کر مجھے اور کبری کو گہری گہری نظروں سے دیکھنے لگا....

"مجھے بلایا ہے آپ نے باؤ جی؟"

"ہاں! ستا تمہارا ہی نام ہے؟"

"جی ہاں! میرا نام ستا ہے اور یہ آبادی میں نے ہی بنوائی تھی۔"

"یہ زمین کس کی ہے؟"

"یہ تو خدا کی زمین ہے باؤ جی! میں نے اِدھر دس کوٹھے کر دیئے تھے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سرکاری زمین ہے۔"

"یہ متروکہ جائیداد ہے جی! بلا رام ایک ہندو تھا اس کی ملکیت تھی یہ۔ اب تو میں نے یہ اپنے نام کرا لی ہے۔ کلیم خرید کر جمع کرا دیئے تھے۔"

"اچھا! خیر تم اپنا تین ہزار روپیہ لو اور یہ کوٹھا ماں جی کو دے دو۔"

"میں تیار ہوں سرکار! صبح ہی رجسٹری لکھوا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے لاؤ ماں جی! میں لے پیسے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے جیب سے نوٹوں کی گڈی لے کر ستا کو تین ہزار روپے الگ کر کے دے دیئے۔ اور اس سے رسید پر انگوٹھا لگوا لیا۔ گواہ میں نے کبری کو بنایا۔ وہ ایسا گھن چکر تھا کہ اس رسید پر گواہ کے طور پر بھی دستخط کرنے سے گریزاں تھا۔

ستا بہت حیران تھا بولا۔

"آپ کبری کے کیا لگتے ہیں؟"

"یہ میری ماں برابر ہیں چوہدری! اور میرا خیال ہے کہ اب انہیں ادھر کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیئے۔ تم سے میں یہی امید رکھتا ہوں بے آسرا ہیں بیچاری! ان کا اگر تم خیال رکھو تو یہ تمہاری مہربانی ہوگی۔"

"آپ بے فکر رہیں باؤ جی! میں نے چھ ماہ سے کرایہ بھی نہیں مانگا ہے اس سے۔ بیچاری بہت پریشان رہتی ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔ اور دیکھو صبح ان کو ساتھ لے جا کر اسٹامپ لکھ دینا۔"

"بہت بہتر باؤ جی آپ چنتا نہ کریں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

"ماں جی! اس مجیدن کی شادی کیوں نہیں کرتی ہو؟"

"اتنے پیسے کہاں تھے بیٹا میرے پاس۔ ویسے اس کی منگنی میں نے کر دی تھی۔ وہ پچھلے مہینے آئے بھی تھے مجھ سے دن مانگتے تھے مگر میرے گھر میں تو خاک اڑتی ہے۔"

"تم ان کو دن دے دو۔ بس یوں کرو کہ اگلے مہینے کی اکیس تاریخ مقرر کر لو اور اس کی شادی کر دو۔ یہ سات ہزار تو تمہارے پاس آ ہی گئے ہیں۔ اسی میں سارا کام مکمل کر لو اگر ضرورت پڑی تو میں اور دے دوں گا۔ میں اگلے مہینے کی بیس تاریخ کو پھر ادھر آؤں گا۔"

"تمہاری بڑی مہربانی ہے بیٹے۔ اللہ تمہیں تخت پر بٹھائے میری بھی عمر تمہیں لگ جائے۔"

"ارے نہیں ماں جی! اتنی عمر کیا کروں گا میں۔ لو میں اب چلتا ہوں مگر یاد رکھو میری اس بہن کو پھر کبھی تم نے اس راہ پر لگایا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"توبہ توبہ! خدا میرا یہ گناہ معاف کرے بیٹا! میں تو خود زمین میں گڑ گئی تھی بس......" وہ اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکی اور بلکنے لگی۔

"میں اگلے مہینے کی بیس تاریخ کو آؤں گا۔ اس کی شادی کی تیاری کرو۔" یہ کہہ کر میں کبری کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا صحن میں نکل گیا۔ مجیدن چولہے کے سامنے بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی اور بچے اس کے گرد ٹک بیٹھے تھے۔ اس نے اپنی وہ بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر جما دیں ٹکٹکی باندھ کر مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے میرے نقوش حافظے کی سطح پر کندہ کر رہی ہو۔ چہرہ اس کا آگ کی تمازت سے اور زیادہ تمتما اٹھا تھا تھی وہ بالکل ہڈیوں کا پنجر مگر چہرہ اس کا یوں دمکتا تھا کہ مجھے حیرت ہوتی تھی۔ اسے دیکھ کر میں مسکرا دیا اور آگے بڑھ کر اس کے گال تھپتھپا کر میں نے کہا۔

"پھر کبھی تیری ماں نے تیرے ساتھ کوئی گھپلا کیا تو میں سمجھ لوں گا اس سے۔ یہ کبری بھی آئندہ تجھ سے بھائیوں کا سا سلوک کرے گا سمجھیں؟" وہ کچھ نہیں بولی۔ اپنی آنکھوں پر اس نے پلکوں کے پردے گرا لئے اور کچھ اور زیادہ سمٹ سکڑ کر چولہے کے قریب ہو گئی۔ میں نے ایک آخری نظر اس اجڑے ویران صحن کے کونے میں بیٹھے بچوں پر ڈالی اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل آیا۔ میرے دل پر تھوڑی دیر پہلے تک جو بوجھ تھا وہ اتر چکا تھا اور مجھے یہ اطمینان تھا کہ میں نے ایک گھر کو مکمل طور پر تباہ ہونے سے بچا لیا تھا اور ایک لڑکی کو گناہ کی سیڑھی پر چڑھنے سے روک دیا تھا۔

راستے میں کبری بالکل خاموش رہا۔ جب ہم دوبارہ آہو صاحب کے گھر میں داخل ہوئے تو ہر شے مجھے اپنی اپنی جگہ ویسی کی ویسی نظر آئی جیسی میں چھوڑ کر گیا تھا مگر اپنے کمرے میں پہنچ کر مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے وہاں میری تمام چیزیں الٹ پلٹ کر اچھی طرح دیکھی ہیں۔ میرا لحاف بھی اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ بستر کی چادر اور اس کے نیچے بچھے گدے کو بھی اپنی جگہ سے اٹھا کر دیکھا گیا تھا۔ کوئی شخص میری غیر حاضری میں میرے کمرے کی مکمل تلاشی لے چکا تھا۔

"کیوں بے کبری! یہ کیا قصہ ہے؟"

وہ بالکل چپ تھا اور بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"ابے بولتا کیوں نہیں اس کمرے کی تلاشی لی گئی ہے۔ دیکھتا نہیں ہر شے اپنی جگہ سے ہلی ہوئی ہے؟"

"تمہارا وہم ہے اوستاد! ادھر بھلا کون آئے گا تمہارا مال تمہارے اس بریف کیس میں ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر پھر بھی معاملہ گڑبڑ نظر آتا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ......؟"

میں نے کچھ کہتے کہتے اپنی زبان دبا لی۔ میں آہو کا نام لینا چاہتا تھا۔

"بس اب تم آرام کرو۔ میں جا رہا ہوں۔"

"ذرا ٹھہرو اور یوں کرو میرے لئے ایک پیالی چائے بنا دو تو مہربانی ہوگی اور دیکھو فکر مت کرو۔ کچھ نہ کچھ راتب میں تمہارے آگے ڈالوں گا۔"

میری یہ بات سن کر اس کے چہرے پر چھائی سنجیدگی کی چادر کچھ ہلکی ہوئی۔ وہ مسکرا دیا بولا۔

"مجھے ذلیل نہ کیا کرو اوستاد۔ تیری آج کی یہ شاہ خرچی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ دنیا سالی ایسی ہی ہے۔ تم بھلا کیا کر سکتے ہو؟"

"میں سب سمجھتا ہوں کبری مگر دیکھو تم سے میرا صرف ایک

چائے کا سوال ہے اس وقت۔"

وہ میری بات کا کوئی جواب دیئے بغیر باہر نکل گیا۔

میں نے نواڑ کے اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ آہو کا دیا ہوا روپیہ وہاں بالکل محفوظ تھا اور جس آدمی نے ادھر آ کر میرے کمرے کی تلاشی لی تھی اس امید پر کہ وہ وہاں سے لاکھوں روپیہ اڑا لے گا، اپنی اس کمینگی میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ میں نے لحاف اپنے گرد لپیٹ کر سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کے مرغولے بنانے لگا۔

جب سے میں اس کمرے میں آیا تھا مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ کوئی شخص متواتر میری حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا ہے۔ بس یونہی ایک احساس تھا جو ٹھہر ٹھہر کر مجھے یہ بات سمجھاتا تھا کہ دو آنکھیں ہیں وہ تحیر میں ڈوبی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں مسلسل میرا تعاقب کر رہی ہیں وہ آنکھیں وہی تھیں جو میں نے دوسری منزل کی ایک کھڑکی میں دیکھی تھیں کمرے کی صورت یہ تھی کہ ایک کھڑکی اندر صحن میں کھلتی تھی صحن کی طرف جو کھڑکی تھی اس کے اوپر روشن دان لگا تھا۔ دوسرے کمرے میں جانے کے لئے درمیان میں ایک دروازہ تھا اس کے اوپر بھی روشن دان نصب تھا۔ اور اس کے شیشوں کے پیچھے مجھے کئی بار ایک سایہ سا ابھرتا نظر آیا تھا مگر جونہی میرا دھیان ادھر جاتا تھا وہ چہرہ وہاں سے غائب ہو جاتا تھا۔ میں اب تک اس پراسرار ہستی کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم نہ کر سکا تھا۔ جونہی میری نظریں اوپر اٹھتی تھیں وہ ہیولی وہاں سے ہٹ جاتا تھا۔

کبری چائے لے کر واپس آیا تو میں نے اسے بڑی محبت سے اپنے پاس بٹھا لیا وہ اب تک کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ مجھے اس پر ترس آ گیا۔ میں نے پانچ ہزار روپیہ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"ابے گھن چکر! یہ تیرے چہرے پر جو بارہ بجے ہیں نا، تو اس کی وجہ میں سمجھتا ہوں مگر یہ لے یہ تیرا راتب۔ اب تو خوش ہے نا؟" وہ نوٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔ ایک دم بہک گیا۔ گلوگیر لہجے میں بولا۔

"تو بہت اچھا ہے اوستاد، بہت اچھا ہے میرے باپ سے بھی اچھا ہے تو۔" اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"بک بک نہ کر لونڈے! اب تو یہ بتا کہ اس گھر میں کون کون رہتا ہے؟"

"کوئی بھی نہیں۔ ایک آہو صاحب ہیں ایک ان کی بیوی ہیں بچہ ان کا کوئی نہیں ہے اور وہ دونوں اوپر کی منزل میں رہتے ہیں۔ نچلے حصے میں ادھر بابا لٹی رہتا ہے ساتھ کے کمرے میں میرا ٹھکانہ ہے اور بس۔"

"آہو صاحب کی بیگم کا کیا نام ہے؟"

"سروری خانم! اور سچ پوچھو تو میں بس اسی بی بی کی وجہ سے یہاں ٹکا ہوا ہوں۔ وہ بہت خیال رکھتی ہیں میرا۔ اوستاد! اتنی سوہنی ہے وہ کہ بس پوچھو مت ـــ وہ سالا آنے جانے میری اس راہ پر رال ٹپکانے کی کوشش کرتا تھا۔

"اور کون ہے اس گھر میں؟"

"اور تو کوئی نہیں ہے۔ کل آہو صاحب کی سالی یہاں آئی تھیں وہ ابھی تک یہاں ہیں۔" میں نے محسوس کیا کہ وہ کھل کر بات نہیں کر رہا تھا۔ اس کے دماغ میں کوئی ایسا خناس سمایا تھا کہ وہ مجھ سے لحظہ لحظہ دور ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے تنگ آ کر چائے کے برتن اس کے حوالے کئے اور اسے وہاں سے اسی وقت رخصت کر دیا۔

میں نے آلکسی کے مارے اٹھ کر اندر کی چٹخنی بھی نہ لگائی اور لحاف میں منہ ڈال کر لیٹ گیا۔ وہ بستر ایسا نرم گرم اور خوشبوؤں میں بسا تھا کہ مجھے جلدی ہی نیند آ گئی مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت رات کتنی گزر چکی تھی اور چاند کن منزلوں میں تھا۔ میں اس وقت ایک بہت ہی خوبصورت سا سپنا دیکھ رہا تھا۔

چھلا چھلا زلفیں تھیں کہ مجھے چاروں طرف سے اپنی آغوش میں بھینچ رہی تھیں۔ ایک سارے جہان کی سندرتا سمیٹے خوشبوؤں میں ڈوبا ہوا گلاب کے پھولوں ایسا بدن تھا جو میری باہوں میں سمٹتا چلا آ رہا تھا۔ یہ خواب میں پہلے بھی بہت دفعہ دیکھ چکا تھا۔ ایک ہی چہرہ تھا جو سالہا سال سے میرے خوابوں میں آ کر مجھے پریشان کیا کرتا تھا اس رات بھی وہ چہرہ مجھے اپنے اوپر جھکتا نظر آ رہا تھا۔ میرا وہ حسین خواب مجھے اپنی رسیلی منزلوں میں... لے چلا تھا کہ اچانک میرے رخساروں پر تپش کا احساس گہرا ہو گیا۔ میرے رخسار پہلے بھی ان ہونٹوں کی زد میں آتے تھے پہلے بھی میری سیکڑوں راتیں ان چھلا چھلا سی خوبصورت گھنگریالی زلفوں سے کھیلتے گزری تھیں مگر ایسی تپش مجھے کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ اس خواب کو بھی میں نے کبھی کوئی اہمیت نہ دی تھی کیونکہ میں سوچتا تھا کہ ایسے خواب ایسے میٹھے رسیلے خواب تو ہر وہ جوان دیکھتا ہے جس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی ہے۔ ہر کسی نے کوئی نہ کوئی چہرہ تراش رکھا ہے جس کی وہ سوتے میں جاگتے میں پرستش کرتا رہتا ہے۔ ایسا سہارا نہ بھی ملتا ہو تو آدمی ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ جاگتے میں نہیں تو سوتے میں۔ حقیقی زندگی میں نہیں تو خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں ایک نہ ایک بت آدمی کو اپنے من مندر میں بٹھانا ہی پڑتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنے ایسے خوابوں کو پراگندہ طبعی سے زیادہ کبھی کوئی وقعت نہ دی تھی مگر اس روز اپنے رخساروں پر میں نے اپنے اس بت کافر کے ہونٹوں کی آگ ایسی تپش محسوس کی تو میری نیند کا شیشہ کرچی کرچی ہو گیا۔

میں نے بہت آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ اس ڈر سے کہ اگر میں نے ایک دم آنکھوں کے دیدبان کھول دیئے تو یہ سپنا جو میری آنکھوں پر بچھا تھا چھن سے ٹوٹ جائے گا۔ مگر جب میں نے اپنی بصارت کی چادر پھیلائی تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں مسلوب العقل ہو چکا ہوں۔

وہ کوئی خواب نہیں تھا۔ ایک جیتی جاگتی چلتی پھرتی حقیقت میرے

سامنے کھڑی تھی۔ وہ کوئی لڑکی تھی۔ اس کا میں سراپا بیان کروں تو معلوم ہو گا میں وارث شاہ کی ہیر کا ذکر کرتا ہوں، سسی کے حُسن کا پرتو دکھا رہا ہوں، سوہنی کو گھڑے پر تیرتا دیکھ رہا ہوں۔ مگر نہیں، وہ ان سب سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ اور اس کے چہرے کی چاندنی اور بدن کے نازک خطوط کے راز میں میں کسی اور کو شریک نہیں کروں گا۔ وہ..... وہ..... دراصل وہی تھی جسے میں نے خواب میں سینکڑوں بار دیکھا تھا۔ وہ میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی یوں جیسے کلی چٹکنے کے عمل سے گزر رہی ہو۔

وہ سیاہ ساٹن میں ملبوس تھی۔ ولائتی سکرٹ، اتنی گھٹنوں تک لمبی قمیص زیب تن کئے تھی اسی رنگ کا دوپٹہ اس کے سر پہ تھا مگر اس طرح کہ اس دوپٹے میں اس کی زلفوں کو سمیٹ لینے کی سکت ہرگز نہ تھی اسی رنگ کی وہ شلوار پہنے تھی۔ وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ میری آنکھیں کھلی دیکھ کر وہ نہ تو گھبرائی نہ شرمائی نہ لجائی نہ ہنسی۔ بس تن کر کھڑی ہو گئی۔ مگر اسے دیکھ کر خوش ہونے اور اس کی راہ میں بچھ جانے کے بجائے مجھے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ میں اٹھ بیٹھا اور لحاف الگ رکھ کر بولا "آپ... آپ کون ہیں؟ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"میرا نام مسند ہے، مسند آرا" یہ کہہ کر وہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میرے قریب میری شہ رگ کے قریب اپنے وجود کی تمام تر آگ اس نے میرے بدن سے مَس کر دی۔ میں سر سے پاؤں تک دہک اٹھا مگر اس کے باوجود وہ ٹھنڈا پسینہ برابر میرے مساموں سے بہتا رہا۔

"آپ..... آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ کیوں آئی ہیں آپ یہاں؟"

"میں..... میں آپ کو جانتی ہوں۔ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔"

"مگر میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا" میں نے جھوٹ بولا۔ حالانکہ وہ ہو بہو وہی تھی جسے میں بارہا خوابوں میں دیکھ چکا تھا۔ وہی ہونٹ، وہی آنکھیں، وہی پیشانی، وہی رخسار، وہی گھنگھرالی زلفیں، وہی تل، وہی چاہِ زنخ! میں بھلا اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ میں بھی اسے پہچان گیا تھا، مگر میری حیرت بے تحاشہ تھی۔

میری بات سن کر وہ زیادہ کھُل کر مسکرائی اور بڑی بے تکلفی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی: "آپ نے مجھے کبھی نہیں دیکھا۔ میں مسند ہوں مسند آرا۔ میں کئی بار آپ کو اپنا نام بتا چکی ہوں آپ کو یاد کیوں نہیں رہتا؟"

"کیا کہتی ہیں آپ؟ میں تو آپ سے پہلے کبھی نہیں ملا" میرے چہرے پر پھیلی حیرت کو دیکھ کر وہ ہنسی تو مجھے یوں لگا جیسے سارے کمرے میں جل ترنگ ہو رہی ہے۔ ایسا ترنم تھا اس کی ہنسی میں کہ میں سمجھا میں پاگل ہو جاؤں گا پھر بھی میں نے اپنے طوفانی جذبوں کے آگے بند باندھتے ہوئے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"آپ یقین کریں میں نے آپ کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا" حیرت مجھے یہ تھی کہ وہ چہرہ جو میں نے بارہا خواب میں دیکھا تھا، مگر جسے میں نے کبھی کوئی اہمیت نہ دی تھی حقیقت کا روپ اختیار کر چکا تھا۔

"جھوٹ! بالکل جھوٹ! آپ ہر روز مجھے خواب میں ملتے رہے ہیں۔ ہو بہو وہی ہیں آپ۔ میں بھلا آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں؟"

"خواب میں! کمال کرتی ہیں آپ؟ خواب میں تو آدمی بہت کچھ دیکھتا ہے جو اس نے جاگتے میں دیکھا ہو۔ میں تو کبھی آپ کے سامنے نہیں آیا۔"

"مجھے معلوم ہے! اجازت ہو تو لحاف میں بیٹھ جاؤں؟"

"مگر دیکھیں! یہ آبرو صاحب کا ہی گھر ہے نا؟"

"جی ہاں! آپ کو شک ہے کوئی۔ آپ کا خیال ہے آپ کا پلنگ سوتے میں پریاں اٹھا کر لے گئی ہیں" بلا کی شوخی تھی اس کے لہجے میں۔

"اگر یہ آبرو صاحب کا گھر ہے تو یقیناً آپ ان کی عزت ہیں۔ ان کے ناموس کی پاسدار ہیں۔ آپ کو اس وقت یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"میں سروری بیگم کی بہن ہوں۔"

"مگر کبریٰ نے تو مجھے نہیں بتایا کہ آپ بھی یہاں ہیں۔"

"میں گھر کے افراد میں شامل نہیں ہوں۔ پرسوں رات میں یہاں پر آئی تھی۔"

"اچھا اچھا! تو آپ آبرو صاحب کی سالی ہیں؟"

"جی ہاں مگر آدھی گھر والی نہیں۔ آپ سے میں کچھ پوچھنے آئی ہوں۔" وہ زبردستی میرے لحاف میں گھستی ہوئی بولی۔

"سردی زیادہ ہے نا! آپ بھی لحاف اوڑھ لیں۔"

"جی نہیں شکریہ! آپ اپنا سوال پوچھیں۔"

"میں یہ پوچھتی ہوں جناب کہ آپ کوئی جادوگر تو نہیں ہیں؟"

"کیا مطلب؟ یعنی میں آپ کو کوئی ایسا ٹونے ٹوٹکے والا آدمی نظر آتا ہوں۔"

"مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے، آپ اسے جھوٹ سمجھیں گے، مگر ٹھہریے میں قرآن شریف لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور دائیں ہاتھ کی الماری میں رکھا خوبصورت جزدان میں لپٹا کلام پاک اٹھا لائی۔

"اس پر تو آپ کو یقین ہو گا؟"

"کیوں نہیں! یہ دو جہانوں سے افضل کتاب ہے مگر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟" میں سخت گھبرا گیا تھا اور میرا سارا بدن ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔

"میرے سر پر یہ خدا کا کلام ہے میں اسے گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ میں پچھلے کئی سال سے ایک ہی صورت کو خواب میں دیکھتی چلی آئی ہوں اور وہ صورت آپ کی تھی جسے آج میں نے حقیقت کے روپ میں دیکھا ہے۔ میری عمر اکیس سال ہے اور پچھلے پانچ سال سے میں اس عذاب میں مبتلا رہی ہوں کہ بارہا میں نے آپ کو خواب میں دیکھا ہے۔

آپ کو یقین آیا؟"

"قرآن شریف ادھر رکھ دیں۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مجھے آپ پر اعتبار ہے مگر اس سے میں کیا مطلب اخذ کروں؟" اس نے قرآن مجید الماری پر رکھا اور میرے پاس آ کر پلنگ کی پائنتی بیٹھ گئی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ قرآن کی قسم نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

"میں نے آج صبح آپ کو صحن میں سے گزرتے دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ سارا دن میں ادھر روشندان پر ٹنگی رہی میرا جی چاہتا تھا میں آپ کو دیکھتی رہوں" اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور اپنے دل کی بات جو بے ساختہ اس کی زبان پر آ رہی تھی وہ پریشان ہو گئی تھی۔

مجھے پہلی بار اپنے سرد رویئے پر ندامت محسوس ہوئی۔ میں اس کی طرف جھکا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"یہ عجیب اور حیرت انگیز اتفاق ہے مسند! کہ میں بھی پچھلے بہت عرصے سے ایک ہی خواب دیکھتا آ رہا ہوں اور میرے ہر خواب کا عنوان آپ جیسی ہی ایک لڑکی رہی ہے۔ میں نے بھی آپ کو شاید پہچان لیا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ میں ابھی تک خواب میں ہوں۔" اس نے میری یہ بات سنی تو پٹ پٹا کر اپنی آنکھیں ــــ پوری طرح کھول دیں اس کے ہونٹوں پر ایسی رسیلی مسکراہٹ ابھر آئی کہ میں نے چاہا میں اسے دل میں اتار لوں مگر میں یہ سوچ کر لرز اٹھا کہ وہ میری نہیں ہے۔ میرا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔ اگرچہ وہ میرے کمرے میں دردانہ گھس آئی تھی۔ جذبے کی شدت نے اسے مغلوب کر رکھا تھا مگر میں جو ایک قوی تر مرد ہوں اپنی قوت ارادی سے اگر اپنے منہ زور جذبوں کو لگام نہ دے سکا تو مجھ سے زیادہ [illegible] اور کوئی نہ ہو گا کہ روح کا وصال ہی بہت کافی ہے، جسموں کا اتصال آگ کو اور ہوا دے گا اور مجھے جو اب تک اپنے ضبطِ نفس پر بے پناہ فخر ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔

میں پیچھے ہٹا اور پلنگ سے اتر کر صوفے پر جا بیٹھا۔ وہ چپ تھی اور حیرت زدہ تھی کہ اتنی للکارتی ہوئی خلوت میں بھی میرا ہاتھ اس کی طرف کیوں نہیں بڑھتا۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھ رہی تھی میرے ذہن میں برپا شورش شاید اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ لہرا کر اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی میرے سامنے آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

بولی "میں ادھر کالج میں پڑھتی ہوں تھرڈ ائیر میں۔ ہوسٹل میں رہتی ہوں۔ آپ کو دیکھ کر میں نے سارے حجاب ختم کر ڈالے۔ مجھے ڈر ہے میرے بارے میں آپ کوئی بہت ہی غلط رائے قائم کر لیں گے۔ حالانکہ حقیقت وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ ہمیں خدا نے یہاں ملا دیا ہے اور مجھے اس نے آپ کے صرف اور صرف آپ کے لئے پیدا کیا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ایک ان دیکھی صورت کو خواب میں کیونکر دیکھ سکتی تھی۔ میں بازاروں میں گلیوں میں، ہجوم میں، تنہائی میں، ریل میں، بس میں، سڑک پر، گھر میں ہر جگہ آپ کو تلاش کرتی رہی مگر آپ کی صورت کہیں نظر نہ آئی۔ آ ہی نہ سکتی تھی میں سمجھتی تھی یہ میری دیوانگی ہے۔ اس صورت کو خدا نے پیدا ہی نہیں کیا وہ عدم سے اٹھ کر رات کو میرے سامنے آ جاتی ہے مگر آج جب میں نے آپ کو دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ آپ اس کمرے میں آئے تو میں سروری باجی کے گلے لگ کر بے تحاشا رونے لگی اتنا روئی، اتنا روئی کہ آنسوؤں سے میں نے اپنا دوپٹہ بھگو دیا۔ باجی حیران رہ گئیں۔ بہت پوچھا انہوں نے کہ میں کیوں روتی ہوں؟ کیا نظر آیا ہے مجھے؟ مگر میں انہیں کچھ بھی نہ بتا سکی۔ بتاتی بھی تو کیا بتاتی؟ اپنے دل کا غبار اتار کر میں ساتھ والے کمرے میں آ بیٹھی اور سارے دروازے بند کر کے اپنا منہ سر چادر میں لپیٹ کر میں اس روشندان کی راہ سے آپ کو دیکھنے لگی۔ سارا دن دیکھتی رہی میری تسلی ہی نہ ہوتی تھی۔ اب جو رات گہری ہو چلی ہے تو مجھے یہ ہمت خدا نے دے ہی دی کہ میں حجاب کے سارے بند توڑ کر آپ کے پاس آ پہنچی۔ آپ میری اس آمد سے جو چاہیں مطلب اخذ کر لیں۔ مگر خدا جانتا ہے آپ کو قریب سے دیکھنے کی آرزو میں میں مری جاتی تھی۔"

"میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں مسند! میری بات کا بھی آپ یقین کریں۔ آپ بھی شاید میرے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ میں بھی سالہا سال سے آپ کو جانتا ہوں مگر یہ بھید میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ ہوا کیسے؟ کیوں خدا نے ہمارا ملاپ ان جانے حالات میں ایک دوسرے سے اتنی بار کرا دیا ہے کہ آپ کو جیتی جاگتی حالت میں دیکھ کر میں لرز اٹھا تھا۔"

"میں خود حیران ہوں۔ کبریٰ سے میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ پوچھا مگر وہ کچھ بتاتا ہی نہیں تھا۔ اس نے صرف یہی کہا کہ آپ کا نام غلام جیلانی ہے اور آپ آبرو صاحب کے مہمان ہیں اور بس۔ اس کے سوا اس نے کچھ بھی نہیں بتایا۔"

"اس وقت تو میری اتنی ہی شناخت کافی ہے مسند! اور کچھ جاننے کی آپ کو کیا ضرورت ہے؟"

"آپ کب تک یہاں رہیں گے؟"

"پتہ نہیں۔ ہو سکتا ہے میں کل ہی چلا جاؤں۔"

"مگر..... مگر..... میں..... میں پھر کیا کروں گی؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب بھی بتانا پڑے گا مجھے" وہ مسکرائی مگر اس کی مسکراہٹ میں خجالت نمایاں تھی۔

"نہیں مسند آرا جی! یوں نہیں۔ آپ اپنے مقام پر ہی ٹھیک ہیں میں سیلانی آدمی ہوں۔ میرا نہ کوئی ماضی ہے نہ مستقبل کسی کو بھی بگولوں کے تعاقب سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ میرے بارے میں کیوں فکر مند ہوتی ہیں آپ" ہم یوں باتیں کر رہے تھے جیسے صدیوں سے ہم ایک دوسرے سے آشنا ہیں۔ نہ اسے کوئی حجاب محسوس ہوا مجھ سے نہ مجھے اس سے

ایک قدم اور آگے بڑھ جاتا کہ اچانک کمرے کا دروازہ تیزی سے کھلا میری حیرت سر پر پہنچ گئی۔ سامنے ایک عورت کھڑی تھی جس کی صورت ہو بہو مسند سے ملتی جلتی تھی۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں، میں اس حال میں دیکھ کر اس کا چہرہ غصّے سے تمتما اٹھا۔

"مسند!" وہ آواز کو دبا کر بڑے تحکم آمیز لہجے میں چیخی۔

ہم دونوں تڑپ کر الگ ہو گئے۔ مسند نے تینوں تصویریں فوراً سنبھال کر لپیٹ لیں اور کھڑی ہو گئی۔ پورے قد سے تن کر کھڑی ہو گئی۔ بڑے اطمینان سے بولی: "یہ میری بہن سروری خانم ہیں۔" اس کے لہجے کے اعتماد نے مجھے سرشار کر دیا۔

"میں تمہارے اس تعارف پر لعنت بھیجتی ہوں کم بخت ذلیل لڑکی۔ کمینی!" یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھی اور تڑاخ سے اس نے ایک طمانچہ مسند کے منہ پر مار دیا وہ تیورا کر پیچھے ہٹی تو میں نے فوراً اسے اور پیچھے ہٹا کر اپنی اوٹ میں لے لیا۔ سروری خانم ایک دم میری طرف بڑھی اور تیز لہجے میں بولی۔

"آپ کو شرم آنی چاہئے۔ آپ کو اپنے میزبان کی عزت سے کھیلنے سے پہلے ڈوب مرنا چاہئے تھا۔"

"مجھے افسوس ہے خانم مگر...... مگر یہ ہماری پہلی ملاقات نہیں ہے۔"

"کیا؟ کیا مطلب؟ تم پہلے بھی ملتے رہے ہو؟ اُف میرے اللہ! اس بے حیا نے ہمیں پہلے ہی برباد کر رکھا تھا۔ اُف میرے خدا! یہ کیا سن رہی ہوں میں؟" وہ پریشان ہو کر صوفے پر ڈھے سی گئی۔

"آپ ٹھیک سن رہی ہیں مگر ہماری ملاقاتیں خوابوں تک ہی محدود رہتی تھیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کو رُو برو دیکھا ہے۔" میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"خوابوں میں؟ کوئی جنّوں پریوں کی کہانی سنا رہے ہو مجھے؟ بے وقوف سمجھتے ہو مجھے! میں ابھی آہو صاحب کو بلاتی ہوں۔ میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ تیزی سے غصّے سے اٹھی اور پھنکارتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔

"بات بگڑ جائے گی خانم! یہ میرا گھر نہیں آپ کا گھر ہے۔ میں مسند کے کمرے میں نہیں ہوں بلکہ مسند میرے کمرے میں ہے۔ میں خود نہیں گیا بلکہ یہ خود میرے پاس آئی ہیں۔ آپ نے مجھے ان کی باہوں میں دیکھا ہے یہ میری باہوں میں نہیں تھیں۔ پھر بھی آپ مجھے قصور وار ٹھہرائیں گی......"

وہ رک گئی اور ایڑی پر گھوم کر میری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھنے لگی ــــ

"بات بڑھی تو اس میں آپ ہی کی عزت کا جنازہ اٹھے گا۔ میں تو مہمان ہوں ابھی اٹھ کر چلا جاؤں گا اور بس ــــ مجھے آہو صاحب کی گولی تو نہیں ماریں گے ٹھیک ہے نا۔ اس لئے خانم! ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"یہ سب کچھ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ آخر یہ لڑکی یہاں کیسے آئی؟ اسے جرأت کیسے ہوئی؟"

"میں نے کہا ہے نا کہ ہم ایک دوسرے کو سالہا سال سے خوابوں میں ملتے رہے ہیں۔ میں تو پاکستان میں موجود بھی نہیں تھا۔ پانچ سال سے میں بھارت کی ایک جیل میں قید تھا جاسوسی کے الزام میں۔ اس عرصے میں مسند نے مجھے اور میں نے مسند کو بار ہا خواب میں دیکھا۔ ثبوت میں میں یہ تصویریں دکھا سکتا ہوں۔ یہ سب مسند نے بنائی ہیں۔"

یہ کہہ کر میں نے تینوں تصویریں اس کے سامنے کر دیں۔ وہ حیرت زدہ ہو کر ان کو دیکھنے لگی۔ پھر اچانک سر پکڑ کر بیٹھ گئی صوفے کے کنارے پر۔ مسند بڑے دھیمے انداز میں چلتی ہوئی اس کے پاس جا بیٹھی اور سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"باجی یہ وہی ہیں جن کا میں آپ سے ذکر کرتی رہی ہوں۔ اور تصویر میں نے آپ کے سامنے بنائی تھی۔ اس وقت آپ کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کہا تھا نا آپ سے کہ آج میں نے اسے قید لیے کمرے میں دیکھا ہے یاد ہے نا آپ کو؟"

سروری بیگم کا رنگ پیلا ہوتا جا رہا تھا۔ حیرت کے مارے اس کی آنکھیں پھٹی جاتی تھیں۔ وہ دوپٹے کے پلّو کو انگلی پر لپیٹتی جا رہی تھی۔ کبھی وہ مجھے دیکھتی تھی کبھی اُن تصویروں کو۔ اس کے چہرے پر ملال تھا کہ میں سمجھا اگر وہ اس کیفیت سے عہدہ برآ نہ ہوئی تو پاگل ہو جائے گی اور پھر جب اس کی ذہنی اذیت حد سے بڑھ گئی تو وہ رونے لگی ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے اور اس کے گال تر ہونے لگے۔

"آپ کیوں روتی ہیں باجی! میں نے ـــ کوئی گناہ تو نہیں کیا ہے اس آدمی کو میں نے بالآخر ڈھونڈ نکالا ہے جس نے میری نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہئے۔"

"تم...... تم کیا چاہتی ہو اب؟ آہو کو جانتی ہو ان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔"

"میں جانتی ہوں وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ چوہدری ہیں علاقے کے، تین سو مربع زمین کے مالک ہیں۔ دو بیٹیوں کے باپ ہیں، بیٹے کو ترس رہے ہیں، آہو صاحب ان کے بیٹے نور زمان کے ہی نہیں سکے مگر یہ تو ان کے بیٹے کی جگہ لے سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟"

"یہی...... میں ان سے شادی کر رہی ہوں باجی! جو نہی کہ اپنے حالات ٹھیک ہوئے، میں ان سے شادی کر لوں گی۔"

"میرے حالات...... میرے حالات کے بارے میں کیا ...

تم؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ مسند مجھے بھولی نظر آتی تھی، دلوں کے حال جان لیتی تھی۔

"پتہ نہیں کیا بات ہے؟ میرا دل کہتا ہے کہ ابھی کچھ عرصے تک ہم ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے جیلانی صاحب! لیکن یہ دَور جلدی ختم ہو جائے گا۔"

"اپنی یہ بکواس بند کرو اور چلو۔ اپنے کمرے میں چلو۔ پتہ نہیں یہ کون ہیں کیا ہیں؟ اور تم چلی ہو انہیں اپنا شوہر بنانے، چلو۔" یہ کہہ کر سروری خانم مسند کو گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے گئی۔ تینوں تصویریں مسند کے ہاتھ میں جھول رہی تھیں۔

میرا گردوپیش ایک بار پھر سناٹوں سے لبریز ہونے لگا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور صوفے میں دھنس کر بیٹھ گیا ـــ مسند اور سروری کی صورتیں میری آنکھوں میں منجمد ہو گئی تھیں۔ وہ حیرت انگیز حد تک ایک دوسرے سے مشابہ تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ سروری فربہی کی طرف مائل تھی جبکہ مسند آرا اچھوتی کلی کی طرح تھی...... اور سب سے خاص تھی۔ مگر میں پھر یہاں چپ رہوں گا۔ اس کے سراپا کو میں کسی کے سامنے بے نقاب نہیں کرنا چاہتا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ اس کو دیکھ لینے کے بعد میں کہیں کا نہ رہا تھا۔ میں ساری رات اس کے تصور سے کھیلتا رہا، اس امید پر جاگتا رہا کہ شاید وہ کسی وقت پھر اِدھر آ نکلے مگر ـــ وہ نہیں آئی۔ میں سمجھ گیا کہ سروری خانم نے اپنی قوت جبروت سے اس کو تالوں میں بند کر کے بے بس کر دیا ہو گا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو نو بج چکے تھے اور کبری کمرے میں اِدھر اُدھر ناچتا پھر رہا تھا۔ جھاڑو اس کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے بیدار دیکھ کر وہ مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا اور بولا: "اوستاد! وہ...... وہ...... یہ کیا جھرلو پھیر لیا ہے تم نے؟ وہ...... اِدھر سروری خانم کی بہن ہیں نا مسند آرا، انہوں نے تمہارے لئے یہ پھولوں کا گلدستہ بھیجا ہے۔ یہ دیکھو! کمال کر دیا ہے تم نے۔ وہ تو تمہارا کلمہ پڑھ رہی ہیں۔"

"ابے گھامڑ! گھاس تو نہیں کھا گیا۔ میرا اس سے کیا واسطہ؟" میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"مگر وہ تو صبح صبح میرے کمرے میں آ گئی تھیں، بولیں جا کبری! یہ گلدستہ وہاں رکھ آ۔ انہوں نے خود جا کر لان میں سے یہ پھول چنے تھے صاحب جی!"

"آہو صاحب نے میری تعریف کر دی ہو گی اس کے سامنے۔ بات کا بتنگڑ نہ بنا۔ یہ بتا آہو صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ تو باہر چلے گئے ہیں ـــ کہہ گئے تھے کہ وہ تمہارے کسی کام سے جا رہے ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تو ذرا گرم پانی اُدھر رکھ دے ہم نہا لیں گے پھر ذرا تگڑا سا ناشتہ لے آ۔" یہ کہتا ہوا میں غسل خانے میں جا گھسا۔

کبری نے گرم پانی غسل خانے میں پہنچایا تو میں نہانے بیٹھ گیا۔ ایک مدت کے بعد مجھے اپنا گردوپیش حسین نظر آیا تھا۔ اس روز میں بڑی تفصیل سے نہایا۔ جب میں باہر نکلا تو میرا بدن ہوا کی طرح ہلکا پھلکا ہو چکا تھا اور میرے دل و دماغ پر انبساط کی سی کیفیت طاری تھی۔ جی چاہتا تھا میں سارے گھر میں ناچتا پھروں۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ اس گھر کے آنگن میں ایک ایسی ہستی موجود تھی جس کے آسمان پر میں سورج کی طرح چمک اٹھا تھا جس نے میری آن دیکھے میں پوجا کی تھی۔ وہ ہستی ایسی تھی کہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر میری یاد میں سسکتی رہتی تھی اس نے مجھے پھر سے جینے کا حوصلہ بخش دیا تھا۔ اب مجھے دھوپ میں زندگی کی رمق نظر آتی تھی اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اب زمانے کے تھپیڑے مجھے کبھی خوفزدہ نہ کر سکیں گے کہ مسند میرے لئے ہر وقت دست بدعا رہتی ہے۔ میری سلامتی کے لئے خدا سے عہد کرتی رہتی ہے۔ میں اپنی خوش نصیبی پر نازاں تھا بے حد نازاں۔

کبری نے مجھے ناشتے کی میز پر بٹھایا تو میں نے دیکھا کہ اس میں اس روز خاص اہتمام کیا گیا تھا اور کسی نے میری پسندیدہ چیز فرنی سے لبالب پیالہ میرے لئے بھیج دیا تھا جس پر پستے کی تہہ جمی تھی۔ میں تو خوش ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے اسی پر ہاتھ صاف کیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ پیالہ میرے لئے مسند نے بھیجا ہے۔ وہ میری پسند ناپسند کو بھی سمجھتی تھی۔ فرنی مجھے ایک مدت کے بعد اس روز نظر آئی تھی۔ قید کی زندگی میں تو اس کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ زینو کے گھر میں میں اتنے دن رہا مگر اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ کیا چیز مجھے مرغوب ہے اور کیا نہیں۔

ناشتے کی میز سے اٹھ کر میں نے کبری سے کہا کہ وہ میرا ایک کام کرے۔ وہ اس لوہ میں تھا کہ میرے کسی کام آ سکے، بولا: "حکم کرو اوستاد! کہو تو کسی کا سر کاٹ کر حاضر کر دوں۔" وہ اس روز مجھ سے بہت خوش تھا اور وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔



"تو کیا کسی کا سر کاٹنے گا کبری! ایں، یہ پتہ لکھ کر دے رہا ہوں وہاں جاکر معلوم کرو کہ ڈاکٹر رحمٰن اور اس کی بیوی عالیہ ادھر موجود ہیں کہ نہیں۔ تمہیں خود جانا ہوگا۔ کوئی پوچھے کہ ان سے تجھے کیا کام ہے؟ تو کہنا کہ ایک مریض کے نقصان سے تمہیں مشورہ کرنا ہے" اس نے کاغذ میرے ہاتھ سے لیا اور پتہ پڑھ کر بولا "ٹھیک ہے میں ابھی جاتا ہوں کوئی کام ہو تو باقی کو بلا لینا" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا مگر ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ صحن سے الٹے قدموں میرے کمرے میں لوٹ آیا اور دبی زبان سے بولا۔

"استاد..... وہ مسند آرا بیگم ہیں نا وہ ادھر کھڑی ہیں دروازے کے پیچھے۔ وہ آنا چاہتی ہیں یہ چٹخنی میں کھول دیتا ہوں؟"

"یہ کس نے بند کی تھی؟"

"میں نے صبح بے خیالی میں بند کر دی تھی۔ میں معافی چاہتا ہوں"

وہ سالا اس روز بالکل بدلا ہوا نظر آتا تھا۔

"ٹھیک ہے جاؤ اب! پنجرہ خالی کرو" میں نے بدمزہ ہو کر کہا

وہ میری کیفیت سمجھتا تھا مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

اسے کمرے سے غائب ہوئے ابھی پانچ منٹ گزرے تھے کہ پہلو کا دروازہ بے آواز کھلا۔ سامنے مسند آرا کھڑی تھی۔ خوبصورت صبح ایسی نئی امیدوں کی نوید دیتی ہوئی۔ اس کا چہرہ شبنم سے دھلے پھول ایسا پاکیزہ نظر آتا تھا۔ وہ آئی تو مجھے محسوس ہوا کمرہ جگمگا اٹھا ہے۔ وہ مسکرا رہی تھی مجھے دیکھتے ہی سلام کرکے بولی۔

"میں جا رہی ہوں۔ باجی مجھ سے سخت ناراض ہیں۔ حالانکہ انہوں نے خود آہو صاحب سے عشق لڑا کر شادی کی ہے۔ ان کی محبت میں انہوں نے آہو صاحب کی عمر کا خیال کئے بغیر ان کی بیوی بننا منظور کر لیا مگر مجھے وہ ذرا سی بھی رعایت نہیں دیتی ہیں"

"یہ تو ہوتا ہی ہے۔ بڑے چھوٹوں کو رگیدتے آئے ہیں۔ اب کہاں جاؤ گی تم؟"

"میں کالج جا رہی ہوں، ہوسٹل میں رہوں گی میرا پتہ آپ کے پاس موجود ہے۔ فون نمبر بھی میں نے لکھ دیا ہے جیسے ہی فرصت ملے آپ مجھ سے ملیں میرے پاس آنے سے پہلے آپ مجھے فون کر دیں"

"ٹھیک ہے مسند! میں ضرور آؤں گا۔ اگر جلدی نہ آسکا تو مایوس نہ ہو جانا میں تمہیں کبھی نہ بھول سکوں گا تم میرا مقسوم ہو میری تقدیر ہو" یہ کہہ کر میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو اس نے میرا ہاتھ چوم لیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہونے لگیں سسکتی ہوئی بولی "میری یہ تصویر رکھ لیں اور اسے کبھی خود سے جدا نہ کریں کیونکہ اگر آپ بھی مجھے بھول گئے تو پھر اس دنیا میں میرے لئے باقی کیا بچے گا؟ میں آپ کا زندگی کے آخری سانس تک انتظار کروں گی" یہ کہہ کر وہ میرے ہاتھوں کو فرط جذبات سے نم آلود لبوں سے پاگلوں کی طرح چومتی اور آنکھوں سے لگاتی ہوئی پیچھے ہٹی اور تیزی سے ایڑی پر گھوم کر واپس چلی گئی وہ تو اس کمرے کو جو نے لبالب بھرا اور پھر خالی ہو گیا۔ اس کی تصویر میرے سامنے تھی اور اس کی بھیگی ہوئی پلکیں میرے تصور میں جم کر رہ گئی تھیں۔ اسے میری خانم نے پریشان کر دیا تھا۔ میں نے اس کی وہ چھوٹی سی تصویر بڑی احتیاط سے کاغذ میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لی۔ یوں جیسے کوئی انمول ہیرے کو سارے جہاں سے چھپا کر رکھتا ہے۔ بلاشبہ وہ میرے لئے زبردست اہمیت اختیار کر گئی تھی۔

کبری کوئی تین گھنٹے بعد واپس آیا تو بولا۔

"استاد! وہ ڈاکٹر رحمٰن تو یہاں نہیں ہے شفا بار کلینک سے پتہ کیا تھا میں نے۔ اس کے ملازموں نے بتایا ہے کہ وہ آج کل کویت گیا ہوا ہے اپنی بیوی عالیہ کے ساتھ۔ ان کا تو یہ خیال ہے کہ وہ شاید چھ ماہ تک وہاں رہے گا"

"مجھے یہی خدشہ تھا کہ وہ بدبخت یہاں نہ ہوگا" میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔

"ان سے کیا کام ہے تمہیں! کوئی اور ڈاکٹر دیکھ لو"

"نہیں! میرا علاج صرف اسی کے پاس ہے کبری! خیر وہ آئے گا تو سہی۔ میں پھر نپٹ لوں گا"

"نپٹ لوں گا؟ کیا کوئی گڑبڑ کی ہے اس نے تمہارے ساتھ؟"

"ہاں! کچھ ایسی ہی بات ہے مگر خیر چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ کہ وہ مسند آرا چلی گئی ہیں کہ ابھی یہیں ہیں؟"

"مجھے باقی نے بتایا ہے کہ وہ دونوں باہر گئی ہوئی ہیں"

"اور وہ آہو صاحب؟ وہ واپس آگئے ہیں یا نہیں؟"

"وہ بھی ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں۔ میرا خیال ہے آتے ہی ہوں گے۔ اتنے میں تم کھانا کھالو، دو بج رہے ہیں"

"ٹھیک ہے تم کھانا لے آؤ" میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ دو گھڑی کی انبساط جو مجھے مسند آرا نے بہم پہنچائی تھی آہستہ آہستہ زائل ہوتی جا رہی تھی اور ایک بار پھر میرے گرد و پیش تاریک اور ویران ہوتا جا رہا تھا۔

ابھی میں کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ آہو صاحب واپس آگئے وہ جب میرے کمرے میں داخل ہوئے تو ان کے چہرے پر ایسی سنجیدگی طاری تھی جیسے وہ جنازے کو کندھا دے کر لوٹے ہیں۔

"آئیے آئیے آہو صاحب کہئے کیا خبر لائے ہیں؟ آسیہ ملی آپ کو؟"

وہ میرے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔ بولے "ہاں آسیہ وہیں ہے۔ میں اس سے مل تو نہیں سکا البتہ دور سے ضرور دیکھ سکا ہوں۔ اس کی صحت بالکل ٹھیک ٹھاک ہے"

میں ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھ رہا تھا۔ میری محویت کو سمجھتے ہوئے بولے

"وہ چودہ سال کے لئے وہاں بند کی گئی ہے میرا خیال ہے زیادہ سے زیادہ دس سال وہاں کاٹے گی اور پھر رہا ہو جائے گی"

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے آہو صاحب! آپ اس کی رہائی کی کوئی صورت بتائیے میں اتنا عرصہ اسے قید میں دیکھنا اپنی موت تصور کرتا ہوں"

"زیادہ بے صبر نہ بنیں جیلانی صاحب! آپ کے لئے میں دور دور تک ہو آیا ہوں۔ آسیہ رہا ہو سکتی ہے بڑی خاموشی سے اس کا نام جیل کی فہرست سے خارج کیا جا سکتا ہے"

"وہ کس طرح؟"

"جس شخص نے اس کی رہائی کی یہ تدبیر بتائی ہے وہ گورنر کا دست راست ہے اور اس نے ایک شرط رکھی ہے"

"میں وہ شرط پوری کرنے کو تیار ہوں۔ میں ہر قیمت پر آسیہ کی رہائی چاہتا ہوں"

"یہ کوئی ایسی ناممکن بات نہیں ہے"

"تو پھر بتائیں اسے رہائی کس طرح مل سکتی ہے؟"

"وہ یوں کہ اعلیٰ افسروں سے مل کر جیل کے ڈاکٹر اور سپرنٹنڈنٹ سے یہ بات کہلوائی جا سکتی ہے کہ آسیہ مر گئی ہے۔ اسے قیدیوں کی فہرست میں مردہ ظاہر کرکے چپ چاپ جیل سے باہر نکالا جا سکتا ہے"

"ہاں یہ تو بہت اچھی تدبیر ہے آہو صاحب! اس کے لئے میں بڑی سے بڑی قیمت دے سکتا ہوں"

"مثلاً؟" آہو صاحب نے بھویں سکیڑ کر میری طرف دیکھا۔

"مثلاً کیا؟ میں..... میں ایک لاکھ دو لاکھ بلکہ تین لاکھ روپیہ دے سکتا ہوں۔ منہ مانگی رقم میں اس کام کے لئے دے سکتا ہوں"

"اتنا روپیہ ہے آپ کے پاس؟" وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

"جی ہاں! میں اس بہن کی آزادی کے لئے ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہوں" میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"مگر اتنی رقم آپ کہاں سے لیں گے؟"

"یہ بات آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ ایک ہاتھ سے وہ آسیہ بہن کو میرے حوالے کر دیں اور دوسرے ہاتھ سے وہ مجھ سے رقم لے لیں"

"مجھے حیرت ہے، حالانکہ آپ کے حالات سے میں جو کچھ اخذ کر سکا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ اس وقت بالکل قلاش اور مفلس ہیں"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ ذاتی طور پر میں واقعی مفلس ہوں مگر آسیہ کے لئے اللہ نے مجھے بے حساب دولت دے رکھی ہے۔ وہ سب کچھ آسیہ کا ہے"

آہو صاحب مسکرائے ان کے چہرے پر پھیلی حیرت اور بدن پر چھایا تشنج کسی حد تک کم ہو گیا۔ وہ سمجھے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ انہوں نے میری ان باتوں کو مجذوب کی بڑ سمجھا۔ سگریٹ کو بڑے اطمینان سے سلگا کر بولے "جیلانی صاحب! آپ اچھے آدمی ہیں اپنی بہن کے لئے آپ کا جذبہ میرے لئے بے حد حیران کن اور قابل قدر ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے لئے آپ بڑی سے بڑی رقم کا بندوبست بھی کر سکیں مگر ہر کام دولت سے نہیں لیا جا سکتا"

"تو پھر کیا مجھے کوئی اور راہ پکڑنی ہوگی"

"ہاں! دو مہینے بعد انتخابات ہو رہے ہیں۔ بڑے صاحب گجرات سے اسمبلی کی نشست کے لئے امیدوار ہوں گے مگر ان کا مدمقابل چوہدری ہادی علی ان سے کہیں زیادہ طاقتور ثابت ہو رہا ہے اگر بڑے صاحب انتخابات میں ہار گئے تو نہ ان کے پاس عہدہ رہے گا اور نہ عزت"

"اس بات کا آسیہ کی رہائی سے کیا تعلق ہے آہو صاحب! آپ نے مجھے حیران کر دیا ہے"

"حیران نہ ہوں بلکہ میری بات غور سے سنیں۔ چوہدری ہادی علی اپنے علاقے کا بہت بارسوخ آدمی تو ہے مگر وہ ایسا غنڈہ صفت آدمی ہے کہ اس کا اسمبلی کی ممبری کے لئے کھڑا ہونا کسی طرح بھی عام لوگوں کے مفاد میں نہ ہوگا"

"پھر؟ یہ تو بڑی آسان بات ہے اسے انتخاب لڑنے ہی نہ دیا جائے۔ یہ تو بڑے صاحب کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے"

"نہیں! یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہادی علی دوسری پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑا ہو رہا ہے"

"اچھا پھر؟ ہمیں اس سے کیا لینا ہے اس کی جو مرضی میں آئے وہ کرتا پھرے۔ ہمارا تو مسئلہ ہی جدا ہے"

"جدا نہیں ہے بڑے صاحب کے مشورے سے میں بول کر آ رہا ہوں۔ اگر آپ ان کے کہنے کے مطابق عمل کریں تو آپ کو دہرا فائدہ ہوگا۔ آپ کو بھی زندوں کی فہرست سے نکال کر مردہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ کسی پولیس مقابلے میں مرے ہوئے کسی اور آدمی کی لاش کو آپ کی لاش ثابت کرکے یہ مشہور کر دیا جائے گا کہ غلام جیلانی پولیس سے مقابلے میں مارا گیا ہے وہ غلام جیلانی جو پھانسی کی کوٹھڑی سے بھاگ نکلا تھا اور جس کی گرفتاری پر حکومت نے پچاس ہزار روپے کا انعام مقرر کر رکھا ہے" آہو صاحب نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت ہی یخ بستہ لہجے میں کہا۔ ان کی یہ بات سن کر میں تو سُن ہو کر رہ گیا۔ کتنی ہی دیر تک میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں تکتا رہا۔ ان کے لبوں پر طنز بھری مسکراہٹ جمی تھی اور وہ میرے سامنے صوفے میں دھنسے بڑے اطمینان سے سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہے تھے۔

"تو..... تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مجھے پہچان گئے ہیں؟"

"ہاں جیلانی صاحب میں چیزوں کو، چہروں کو، جگنوؤں کو سطحی نظر سے دیکھنے کا قائل نہیں ہوں میں جانتا تھا کہ وہ آدمی جس کا تعارف مجھ سے اسلم آپی کروا رہا ہے ——— واقعی کوئی بہت ہی پیر کار بگڑے قسم کا

آدمی ہو گا۔ اخبار میں بار ہا آپ کی تصویر چھپ چکی ہے۔ داڑھی کے ساتھ بھی اور بغیر داڑھی کے بھی۔ پولیس کے پاس آپ کا مکمل ریکارڈ موجود ہے۔ میں نے آپ کو جلدی پہچان لیا تھا۔ اخبار کو تو آپ نہیں جھٹلا سکتے ہیں نہ آپ اپنے چہرے کے نقوش بدل سکتے ہیں۔ یہ بات کسی کے لئے بھی ممکن نہیں ہے خواہ وہ کتنا ہی بڑا بہروپیا کیوں نہ ہو۔"

"میں نے مان لیا کہ آپ مجھے پہچان گئے ہیں طغرا آہو صاحب! آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے۔ میری بہن کو اگر آپ آزاد کروا دیں تو میں آج آپ کے وسیلے سے خود کو دوبارہ گرفتاری کے لئے پولیس کے سامنے پیش کر سکتا ہوں تاکہ آپ کو پچاس ہزار روپیہ مل جائے۔"

"ایسی اوچھی باتیں نہ مجھے پسند ہیں نہ آپ کو زیب دیتی ہیں۔ بہتر ہے آپ میرے بارے میں ایسے خیالات دل سے نکال دیں۔" وہ برافروختہ ہو کر بولے۔

"تو پھر میں آپ کی اس گفتگو سے کیا نتیجہ اخذ کروں جناب آہو صاحب! میں تو آپ کی زد میں ہوں آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔"

"مجھے آپ سے کچھ نہیں لینا ہے جناب غلام جیلانی صاحب! مجھے معلوم ہے آپ کے پاس ——— اس وقت ایک لاکھ روپیہ موجود ہے مگر میں اس سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ مجھے کوئی لالچ نہیں ہے میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ جس طرح بھی ہو سکے آپ کا کام بن جائے آپ کو بھی آزادی مل جائے اور آپ کی بہن کو بھی۔"

"مگر وہ طریقہ بھی تو بتایئے جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ ابھی تک تو آپ کی اس پیچ دار گفتگو سے میں کچھ بھی اخذ نہیں کر سکا ہوں۔"

"بڑے صاحب آپ کی مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان کے نزدیک یہ کام قطعاً بھی مشکل نہیں ہے مگر اس کے لئے وہ چاہتے ہیں کہ آپ بھی ان کے کام آئیں۔"

"میں ان کی کیا خدمت کر سکتا ہوں آہو صاحب! میں جیل سے بھاگا ہوا مجبور و بے بس آدمی۔"

"آپ کی یہی مجبوری اور گمنامی آپ کے کام آسکتی ہے۔ آپ اتنا کریں کہ نہایت ہی غیر محسوس طریقے سے چوہدری ہادی علی کو قتل کر دیں۔"

میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ مجھ سے میری اور میری بہن کی آزادی کی بہت بڑی قیمت طلب کر رہے تھے وہ... آہو صاحب، وہ رئیس شہر، وہ غنڈوں چوروں اور ڈاکوؤں اور گرہ کٹوں کے پشت پناہ جناب دل شیر آہو صاحب۔ وہ میری حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے اٹھے اور صوفے پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ بولے۔

"کیا خیال ہے یہ سودا مہنگا ہے گا آپ کو کرسکتا؟ آپ دونوں کی جان چھوٹ سکتی ہے اس عذاب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ نہ تو اتنا طویل عرصہ جیل میں گزارے گی نہ آپ یوں دربدر پھرتے رہیں گے آپ کی نئے سرے سے شناخت کرا دی جائے گی سرکاری کاغذوں میں۔ اور آسیہ کو کسی اچھے سے گھرانے میں بیاہ دیں گے ہم باعزت طریقے سے۔"

میں سوچ میں ڈوبا رہا گم صم بیٹھا ان کا منہ تکتا رہا۔ وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔

"بصورت دیگر مجھے مجبوراً آپ کو پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا اور آپ کی بہن پر جیل میں نگرانی اور زیادہ سخت ہو جائے گی کیونکہ یہ راز آپ کے ہاتھ آچکا ہے کہ صاحب کیا چاہتے ہیں؟"

میں پھر بھی چپ رہا۔

"مجھے آپ کا فوری اور قطعی جواب درکار ہے جیلانی صاحب اس بات کا فیصلہ ابھی اور اسی وقت ہو جانا چاہئے کہ ہمارا آئندہ رویہ ایک دوسرے کے لئے کیا ہو گا۔ میں نہ آپ کا دشمن نہ دوست۔ میں تو محض ایک کڑی ایک وسیلہ ہوں آپ کے اور صاحب کے درمیان اور بس اب آپ سوچ لیں کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ ہر سودا طے ہو سکتا ہے آپ کے سر کا بھی اور آپ کی عزت کا بھی۔ آپ کی بہن جیل میں قید ہے مگر اتنی ساری عورتوں کے درمیان رہنے کے باوجود بھی محفوظ نہیں ہے اس پر بھی وہ لوگ بڑی آسانی سے ہاتھ ڈال سکتے ہیں جو آپ سے سودا طے کرنا چاہتے ہیں۔"

"انہوں نے اس کام کے لئے مجھے ہی کیوں منتخب کیا ہے؟" میں نے بڑی مریل سی آواز میں کہا۔ اپنا وہ ٹوٹا پھوٹا لہجہ مجھے بالکل اجنبی محسوس ہو رہا تھا۔ آہو صاحب نے مجھے زبردست آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

"آپ نے اچھا سوال پوچھا ہے میں بتاتا ہوں کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ میں نے صاحب کے مشیر کے سامنے خود ہی آپ کا نام رکھا تھا کیونکہ مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے آپ کی ذہنی کیفیت کو سمجھتے ہوئے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یا تو آپ کے سر سے یہ غم و اندوہ کا بار اتر سکے یا آپ کا سر اتر جائے۔ ان دو راستوں کے سوا اور کوئی راہ آپ کو راس نہیں آسکتی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں آہو صاحب! میں تیار ہوں۔ میں ہادی علی کو ٹھکانے لگا دوں گا۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی میرے لئے ان صاحب نے کوئی راستہ کھلا نہ چھوڑا تھا۔

"شاباش! مجھے آپ سے اسی جواب کی توقع تھی۔ جس دن آپ ہادی علی کو ٹھکانے لگا دیں گے اسی دن شام کو آپ آسیہ کو یہاں پائیں گے۔ یہ میرا آپ کا وعدہ رہا۔ اگر میں اپنا قول نبھا نہ سکا تو میرا سر آپ کے سامنے حاضر ہو گا۔"

"وہ تو میں جانتا ہوں کہ ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟ مگر بہتر یہ ہو گا کہ آپ مجھے اس بات کی کوئی ٹھوس ضمانت..... دیں کہ کام مکمل ہو جانے پر آپ میری بہن کو آزاد کروا کر میرے حوالے کر دیں گے۔"

"آپ جو ضمانت چاہیں میں آپ کو دینے کو تیار ہوں۔" وہ بڑے اعتماد سے بولے۔

میں سوچ میں ڈوب گیا۔ میں ان سے کس طرح کی ضمانت طلب کروں؟ یہ بہت ٹیڑھا اور کٹھن سوال تھا۔ مجھے کوئی ایسی رگ چاہئے تھی جسے میں جب بھی دباؤں آہو صاحب کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہو اور وہ اس بات پر مجبور ہو جائیں کہ میری بہن کو آزاد کرانے کا وعدہ ہر حال میں پورا کریں۔ چند منٹ تک میں اسی سوچ میں ڈوبا رہا۔

"بتایئے نا آپ کس قسم کی ضمانت چاہتے ہیں۔ وہ میں آپ کو دینے کو تیار ہوں۔"

"دیکھیں! آہو صاحب میں آپ کا مہمان ہوں۔ آپ نے میزبانی کے سارے آداب بالائے طاق رکھ کر مجھ سے یہ خوفناک سودا طے کر لیا ہے اب میرے اور آپ کے درمیان مروت نام کی کوئی شے باقی نہیں رہی۔"

"بالکل ٹھیک! صورتحال ایسی ہی ہے۔ میں لگی لپٹی کا قائل نہیں ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکے اور دوسرے کمرے میں کھلنے والے اس دروازے کو کھول کر اچھی طرح دیکھنے بھالنے کے بعد واپس اپنی جگہ پر آبیٹھے۔ ان کو یہ خدشہ تھا کہ کہیں کوئی ان کی باتیں نہ سن رہا ہو۔

"ہاں تو فرمایئے! میں آپ کو کس قسم کی ضمانت فراہم کروں؟"

"آپ مجھے اپنے ہاتھ سے ایک ایسی تحریر دے دیں جس سے یہ ثابت ہو کہ آپ نے مجھ سے آج پانچ لاکھ روپے قرض لئے ہیں اور یہ رقم آپ مجھے آج سے ٹھیک چھ ماہ بعد ایک لاکھ روپے منافع کے ساتھ... لوٹا دیں گے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں یہ تحریر ابھی لکھ دیتا ہوں۔"

"اس کے علاوہ آپ مجھے یہ بھی تحریر لکھ دیں کہ اگر آپ نے میری بہن آسیہ کے سلسلے میں جو وعدہ کیا ہے پورا نہ کیا تو آپ کی بیوی سرور کو طلاق ہو جائے گی۔"

"ارے نہیں بھئی! ایسی کمینی حرکت مت کرو۔ اس سے میری عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے یہ نہ ہو سکے گا۔"

"جی نہیں مجھے اصرار ہے اس بات پر۔ آپ کی عزت جب تک اس سلسلے میں خطرے سے دوچار نہ ہو گی، مجھے اطمینان نہ ہوگا۔ آپ کو ڈرنا نہیں چاہئے کیونکہ آپ تو اپنے وعدے پر کاربند رہیں گے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ ذرا دیر کے لئے غوطے میں گئے اور پھر جب وہ اوپر ابھرے تو بولے۔ "ٹھیک ہے میں یہ بھی لکھ دوں گا۔ کوئی بات نہیں! مجھے یقین ہے کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔"

"تو اٹھئے پھر بسم اللہ کیجئے اور اپنا پیڈ لے آئیے۔ یہ سب کچھ آپ کے پیڈ پر ہی تحریر ہو گا۔"

"ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھے اور صحن میں نکل گئے۔ کچھ ہی دیر بعد جب وہ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں کاغذ قلم موجود تھا۔ انہوں نے نہایت صدق دلی سے مجھے دونوں تحریریں لکھ کر دے دیں اور ان پر اپنے دستخط ثبت کر دیئے۔ دونوں وعدے انہوں نے الگ الگ کاغذوں پر لکھے اور پھر بڑی فراخدلی سے وہ کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ "لیں غلام جیلانی صاحب! ہم نے اپنی سارے جہان سے زیادہ چہیتی بیگم پر گالی چڑھا دی ہے۔ انشاءاللہ آپ ہمیں اپنے وعدوں میں پختہ پائیں گے۔"

"ٹھیک ہے آہو صاحب! اب میں بھی جم کر اطمینان سے کام کر سکوں گا۔ اب آپ مجھے اس آدمی کا حدود اربعہ بتائیں۔"

"اس کا حدود اربعہ مختصر ہے وہ کوٹ اکبر کا رہنے والا ہے۔ یہ گاؤں گجرات سے چالیس میل دور ہے گنجاہ سے آگے، وہاں ہادی علی کی زمین ہے اچھی تگڑی زمینداری ہے اس کی ——— اور مسلح باڈی گارڈ پال رکھے ہیں اس نے۔ اب یہ آپ کی ہمت ہے، دانائی ہے کہ آپ اس کام کو کس طرح سرانجام دیتے ہیں آپ کو ہر حال میں اپنی جان بچانی ہو گی اگر خدانخواستہ اس کام میں آپ پر کوئی آفت آئی تو آپ کو ہم ہر قیمت پر بچا لیں گے۔ آپ کو یہ کام اس طرح کرنا ہوگا کہ آپ کا..... اس سے یا اس کے محافظوں سے براہ راست ٹکراؤ نہ ہو کیونکہ اس عرصے میں آپ تنہا ہوں گے ظاہر یہ ہونا چاہئے کہ ہادی علی کو کسی ڈاکو نے دولت کے لالچ میں قتل کر دیا ہے اور یہ سارا معاملہ راز میں رہنا چاہئے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ میرے آپ کے درمیان کیا طے ہوا ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ میں بہت سوچ سمجھ کر قدم آگے بڑھاؤں گا۔"

"اس کام کے لئے آپ کو روپے پیسے کی زیادہ ضرورت نہ ہو گی پھر بھی یہ لاکھ روپیہ آپ کے پاس ہے۔ اس میں سے اسی ہزار آپ میرے پاس رکھ دیں یہ آپ کی امانت ہو گا۔ بیس ہزار آپ خرچ کے لئے رکھ لیں۔ آپ کو واپس آنے پر میں پورا ایک لاکھ روپیہ دے دوں گا۔"

"میرا تو خیال تھا کہ یہ روپیہ میں خورشید احمد کو لوٹا دوں گا۔"

"وہ بھی ہوتا رہے گا۔ پولیس نے اپنا کام شروع کر دیا ہے آج کے اخبار میں بڑی سنسنی خیز خبریں چھپی ہیں اس ڈاکے کے متعلق۔ اگر اس وقت آپ نے ایسی احمقانہ حرکت کریں گے تو نقصان اٹھائیں گے۔ بہتر ہو گا اس روپے کو اپنے مصرف میں لائیں۔ وہ مر نہیں جائے گا۔ بڑی دولت ہے اس کے پاس....." ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہے تھے کہ مجھے خیال آیا کہ جو کچھ میں نے آہو صاحب سے لکھوایا ہے اس کو اگر وہ تسلیم کریں، اس کے پابند رہیں تو میں ان سے اچھی

تحریروں کی بنا پر آسیہ کی واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہوں مگر کوئی ٹھوس بات تو پھر بھی نہ ہوئی میرے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ آسیہ اس جیل میں موجود بھی ہے کہ نہیں اور کسی کے دستِ راست نے آہو صاحب سے یہ سودا کیا بھی ہے کہ نہیں۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"میں یہ سوچ رہا ہوں آہو صاحب! کہ اس بات کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ آدمی جس کا آپ ذکر کرتے ہیں کام ہو جانے کی صورت میں ہماری مدد بھی کرے گا؟"

"اس بات کا ذمہ تو میں نے پہلے لے لیا ہے۔ اتنی بڑی رقم دینے کا میں نے آپ سے تحریری وعدہ کر لیا ہے اور کیا چاہتے ہیں آپ! اس آدمی کو میں براہِ راست تو آپ سے نہیں ملوا سکتا۔"

آہو صاحب کی دلیل میں خاصا وزن تھا۔ صاف طور پر وہ اپنا پہلو بچا گئے تھے۔ اس کے باوجود میں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ مجھے دور کہیں دل کی گہرائیوں سے یہ صدا سنائی دیتی تھی کہ اگر کسی سے تمہیں آسیہ کے سلسلے میں کوئی مدد مل سکتی ہے تو وہ صرف آہو صاحب ہیں جو شہر کے رئیس ہیں جن کی سرکار دربار میں بڑی عزت ہے اور جن کی بات کو کبھی نہیں ٹال سکتا۔ کبری کی اور اسلم آبی اور پھر باہر گلی کے لوگوں کی باتیں سن کر میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔ پھر بھی میں چاہتا تھا کہ آہو صاحب سے اس بارے میں کوئی ٹھوس بات ضرور کہلوا لوں۔

"کیا جیل کا سپرنٹنڈنٹ آپ کو جانتا ہے؟"

"نہیں بلکہ جیل خانہ جات کے انسپکٹر جنرل سے میری براہِ راست یاد اللہ ہے۔"

"آپ کے گھر میں ٹیلی فون ہے؟"

"ہاں ہے! اوپر کی منزل میں رکھا ہے سیٹ۔" آہو صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا آپ آئی جی صاحب کی وساطت سے جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے کہلوا سکتے ہیں کہ وہ براہِ راست فون پر آسیہ سے میری بات کرا دے مگر میرا نام آپ اسے نہیں بتائیں گے کسی کو بھی نہیں بتائیں گے۔"

آہو صاحب نے میری بات سنی تو سوچ میں ڈوب گئے۔ قدرے توقف کے بعد بولے۔ "ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں میرا خیال ہے یہ بات ناممکن نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھے اور صحن میں نکل گئے۔

میں نے نیا سگریٹ سلگایا اور آسیہ کی یادوں میں کھو گیا۔ اطمینان مجھے یہ تھا کہ اگر آسیہ سے میری بات ٹیلی فون پر ہو گئی تو میں آہو صاحب کے اثر و رسوخ کا قائل ہو جاؤں گا اور جو کام وہ کہہ رہے ہیں بلا چون و چرا سرانجام دے دوں گا بصورت دیگر میں اسی رات وہاں سے نکلوں گا اور پھر کبھی ان کی شکل نہ دیکھوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھ سے جو وہ اسی ہزار روپیہ دے کر اندر رکھ چکے ہیں تو وہ گویا مجھ سے اس بات کی نقد ضمانت دے چکے تھے کہ میں اسی روپے کے لالچ میں ان کے پاس لوٹ کر ضرور آؤں گا۔ میں نے بھی اپنے طور پر ان کو ایسی پہیلی بھجوائی تھی کہ اگر ان کی طرف سے درست جواب نہ ملا تو میں ہمیشہ کے لئے ان پر لعنت بھیج کر وہاں سے نکل سکتا تھا یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ وہ اپنے لالچ میں مبتلا تھے۔ انہیں بیش بہا انعام کی امید تھی اس کام کے عوض جو وہ مجھ سے کرانا چاہتے تھے وہ انعام روپوں کی صورت میں بھی ہو سکتا تھا اور ایک جاگیر کی صورت میں بھی۔ ایسے دھندوں میں شہنشاہوں کے دور میں تو لوگ پشتوں تک کے لئے اپنی قسمتیں سنوار لیتے تھے۔ مگر اس گئے گزرے دور میں بھی ایسے مکار اور سازشی لوگوں کے لئے انعام و اکرام کی گنجائش بڑی وافر تھی۔

اور جہاں تک میں آہو صاحب کے دھندے کو سمجھ سکا تھا وہ یہی تھا کہ وہ اب تک بڑے بڑے نامی گرامی مجرموں کے پشت پناہ بنے ہوئے تھے وہ کوئی واردات کر کے آتے تھے تو خود کو قانون کی گرفت سے بچانے کے لئے وہ سب سے پہلے آہو صاحب کے درِ دولت پر حاضر ہو کر اپنا نذرانہ پیش کرتے تھے اسلم آبی کی مثال میرے سامنے تھی ان کا گزارہ ہی اسی کام پر چلتا تھا اسی کاروبار کی بدولت وہ شہر کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے حالانکہ کبری مجھے بتا چکا تھا کہ آہو صاحب کی کوئی اپنی زمین نہیں ہے نہ کوئی اتنی بڑی جائیداد تھی۔ کوئی کاروبار بھی ان کا سننے میں نہیں آیا تھا۔ میں اپنے طور پر اس شطرنج کی بازی کے سلسلے امکانات پر غور کر چکا تھا اور مجھے اطمینان تھا کہ آہو صاحب مجھے کسی غلط چکر میں نہیں ڈال سکیں گے۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد آہو صاحب میرے کمرے میں واپس آئے تو بہت خوش تھے۔ ٹیلی فون ان کے ہاتھ میں تھا اور اس کے تار باہر صحن تک پھیلے ہوئے تھے۔

"لیں جناب جیلانی صاحب! آپ کا کام بن گیا ہے آئی جی صاحب مجھے دفتر میں ہی مل گئے تھے۔ انہوں نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے کہا اور بات بن گئی۔ آپ ٹھیک دس منٹ بعد اپنی بہن سے بات کر سکیں گے۔ جیل والے خود ہمیں اس نمبر پر فون کریں گے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ٹیلی فون میرے قریب ہی میز پر رکھ دیا اور بولے۔

"آپ کے اندیشے ہائے دور دراز کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں میرے بھائی! میں نے اس شہر میں بھاڑ نہیں جھونکا ہے۔ جائیداد نہیں بنائی۔ دولت جمع نہیں کی صرف انسانوں کو اپنا دوست بنایا ہے ان کی خدمت کر کے اپنے خلوص سے اپنی محبت سے میں نے ان کے دل جیتے ہیں ورنہ وہ میری پھوپی یا چاچی کے رشتے سے میرا لحاظ نہیں کرتے۔"

"میں سب سمجھتا ہوں آہو صاحب! اسی لئے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ داتا دربار پر لوگ یونہی حاضری نہیں دیتے انہیں کوئی فیض حاصل ہوتا ہے تو جاتے ہیں۔ یہاں پر جو اسلم آبی جیسے نیک بزرگ آتے ہیں تو یہ سب آپ کی عظمت کی دلیل ہے مجھے پورا احساس ہے۔" میں نے بڑی تفصیل سے آہو صاحب کو اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کیا۔ وہ طنز بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے اور ہرگز میری بات پر مطمئن نظر نہیں آتے تھے۔ ان سے جو شرطیں میں نے منوائی تھیں اور انہیں اب جس اُدھیڑ بن سے دوچار کر دیا تھا آسیہ کے سلسلے میں تو وہ اس پر بہت زیادہ سٹپٹا گئے تھے مگر میں کرتا بھی کیا کرتا میرے لئے تو کوئی راستہ کھلا نہیں تھا۔ میں یونہی اندھیرے کنوئیں میں آنکھیں بند کر کے تو چھلانگ نہ لگا سکتا تھا۔

میری بات کا انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ کبھی وہ مجھے دیکھتے کبھی ٹیلی فون سیٹ کو اور کبھی راکھ میں بدلتی سگریٹ کو۔ وہ سخت بے چین دکھائی دیتے تھے۔ اور میں اپنی جگہ پریشان تھا کہ اگر آسیہ سے آہو صاحب کے ذریعے بھی بات نہ ہو سکی تو پھر کیا ہوگا۔

ابھی پندرہ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ آہو صاحب نے فون اٹھایا۔

"جی جی۔ میں آہو بول رہا ہوں دل شیر آہو۔ اچھا اچھا! آسیہ آگئی ہیں فون پر۔ بہتر جناب بہت بہت شکریہ۔" یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور کے ایک حصے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"دیکھیں اب آپ آسیہ سے بات کریں گے۔ اسے آپ اپنا نام بتا دیں، بالکل نہ ڈریں کھل کر بات کر لیں۔" یہ کہہ کر وہ بولے۔

"ہیلو! کون؟ آسیہ بہن بول رہی ہیں؟"

"اچھا اچھا لیں آپ اپنے بھائی سے بات کریں میرا یہ خیال تھا کہ میرے بدن کا سارا خون کھنچ کر میرے سر میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے ریسیور کان سے لگایا تو دوسری طرف سے مجھے اپنی ماں جائی بہن کی آواز سنائی دی اس کی آواز میں زندگی کی مہک تھی۔ کن کا اذن تھا۔ اس نے پوچھا۔

"کون بول رہا ہے؟"

"میں جیلانی ہوں غلام جیلانی۔ تم آسیہ ہو نا؟"

"ہاں ہاں میں آسیہ ہوں بھائی جان سلام علیکم۔"

"کیا حال ہیں میری بہن۔ میری اچھی بہن۔ یہ تم ہی ہو نا؟" میں نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔

"ہاں ہاں! میں آسیہ ہی ہوں۔ آپ کہاں چلے گئے تھے بھائی جان! اس وقت کہاں ہیں آپ؟"

"میں یہاں ہی ہوں اسی شہر میں۔ ماں جی بالکل ٹھیک ہیں۔ اپنے ایک بھائی کے ہاں ہیں اُدھر فیصل آباد کے قریب۔ سمجھتی ہو نا؟"

"اچھا اچھا۔" وہ بولی۔ بڑی خوشی اور بے پناہ سرشاری تھی اس کے لہجے میں۔

"مجھے سارے حالات کا علم ہے آسیہ! مجھے پتہ ہے تمہیں کن لوگوں نے اس حال کو پہنچایا ہے مگر فکر نہ کرو میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ میں تمہارے لئے اپیل بھی دائر کروں گا، بہت پیسے ہیں میرے پاس۔ تم جلدی رہا ہو جاؤ گی۔"

"اچھا؟ بہت روپیہ ہے آپ کے پاس؟ ڈھیروں ہے؟"

"ہاں ڈھیروں! اور دیکھو میں کل تمہیں تمہاری ضرورت کی چیزیں بھی بھجوا دوں گا۔ میں تمہارے لئے وہاں کسی آرام کی جگہ کا بھی بندوبست کروں گا گھبرانا نہیں میری بہن! حوصلے سے کام لینا تمہارا بھائی ابھی زندہ ہے۔"

"ہم دونوں ہی بدقسمت ہیں بھائی جان! پتہ نہیں آپ کس کس مصیبت سے گزرے ہیں۔"

"یہ تو ہوتا ہی ہے آسیہ۔ دیکھو یہ اچھا ہوا تم سے بات ہو گئی۔ اب میں تمہیں جلدی ملوں گا۔ سمجھو کوئی پندرہ بیس دن بعد۔"

اچانک آہو صاحب نے میرے کان کے قریب منہ لا کر کہا۔ "بات مختصر کریں جیلانی صاحب!"

"اچھا! اچھا آسیہ خدا حافظ! پھر ملیں گے۔"

"خدا حافظ بھائی جان! مجھے کچھ چیزیں ضرور بھیج دیں۔"

"ختم کرو اب یہ سلسلہ۔" کسی عورت نے آسیہ سے نہایت تحکمانہ لہجے میں کہا۔

اور پھر اس کے ہاتھ سے کسی نے ریسیور چھین کر کریڈل پر پٹخ دیا۔ میرا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ وہ لوگ جیل میں میری بہن سے بہت ہی.... ہتک آمیز سلوک کر رہے تھے۔ میں خالی خالی نظروں سے ریسیور کو دیکھتا رہ گیا جواب مُردہ ہو چکا تھا۔ ہاں البتہ اس کے سینے میں نزع کی کیفیت ایسی شائیں شائیں شوں شوں اب بھی باقی تھی ____ میں نے اسے بڑی بزدلی سے کریڈل پر رکھ دیا۔

"کیوں جیلانی صاحب! اب تو اطمینان ہو گیا ہے نا آپ کو؟ کہ آہو کیا کچھ کر سکتا ہے؟"

"مجھے شرمندہ نہ کریں آہو صاحب! میں نے کبھی آپ کے کسی قول و فعل پر شک نہیں کیا ہے۔ آپ کو میں اپنا محسن سمجھتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے! آپ کو بہرحال میری طرف سے بالکل مطمئن ہو جانا چاہئے میں آپ کا دوست ہوں، مخلص اور بے لوث دوست۔ آپ میرے کام آئیں میں آپ کے کام آؤں گا۔"

"میں حاضر ہوں جناب ہر طرح سے حاضر ہوں۔ جیلانی کو آپ کبھی میدان سے منہ پھیرتے نہ دیکھیں گے۔"

"تو پھر کیا ارادے ہیں؟"

"ارادے بالکل نیک ہیں۔ میں آج ہی چل دیتا ہوں۔"

"تو پھر اپنا سامان تیار کر لیں اور شام کی گاڑی سے روانہ ہو جائیں آپ کے لئے رات کا سفر بہتر رہے گا کیونکہ آپ غائبانہ طور پر خاصے شہرت یافتہ آدمی ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں آہو صاحب! لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں کبری کو ساتھ لے جاؤں، مجھے سہولت رہے گی۔"

"جی نہیں! میں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ بات میرے اور آپ کے درمیان راز رہنی چاہئے آپ کی اور آسیہ کی رہائی کے علاوہ اس کام کے عوض آپ کو میں بہت بڑی رقم بھی دے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ رہا۔"

"مجھے کسی رقم کی ضرورت نہیں ہے جناب شل شیر آہو صاحب! مجھے تو صرف اپنی اور اپنی بہن کی آزادی درکار ہے۔"

"وہ آپ کو مل جائے گی بے فکر رہیں۔ کب روانہ ہوں گے آپ؟"

"میں بس آج ہی چل دیتا ہوں۔"

"بس ٹھیک رہے گا تیاری مکمل کرلیں۔ اپنی چیزیں سنبھال لیں۔ آپ کو اسلحے کی صورت میں کیا کچھ چاہئے ہوگا؟"

"مجھے آپ ایک سائیلنسر والا پستول دے دیں اور ایک چھوٹی اسٹین گن۔"

"وہ میں آپ کو ابھی دے دیتا ہوں آپ بیٹھیں میں ابھی آتا ہوں اس کے لئے ایک اٹیچی کیس بھی میں آپ کو دے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے اور میں اپنی اِدھر اُدھر بکھری چیزیں سمیٹنے لگا۔ مجھے ایک نیا اور نہایت ہی پُرپیچ سفر درپیش تھا۔ ایسا سفر جس کے مرحلوں سے میں قطعاً ناآشنا تھا۔

شام کے سات بجے جب میں آہو صاحب کے گھر سے نکلا تو گبری اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ اسے آہو صاحب نے جان بوجھ کر اِدھر اُدھر کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں اس معاملے کی بھنک بھی اس کے کان میں ڈالوں۔ ان کی احتیاط پسندی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

میں ٹیکسی میں بیٹھ کر اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ میرے پاس ایک بریف کیس تھا جس میں میری ضرورت کی چیزیں رکھی تھیں۔ بیس ہزار روپیہ میری جیب میں تھا۔ اسی ہزار کی رقم میں آہو صاحب کے پاس چھوڑ آیا تھا اس کی بھی انہوں نے کمال دیانتداری سے مجھے رسید لکھ دی تھی جس میں یہ تحریر تھا کہ میری یہ رقم ان کے پاس امانت کے طور پر رکھی گئی ہے میرے اٹیچی کیس میں ایک جرمن ساختہ سٹین گن تھی، ہلکی پھلکی اور چھوٹی سی۔ اس کے لئے آہو صاحب نے دو سو گولیاں بھی مجھے دے دی تھیں اور ایک سائیلنسر لگا ہیجم کا پستول تھا چھ گولیوں والا۔ اس کے لئے بھی انہوں نے مجھے چھ درجن گولیاں دے دی تھیں۔

اور حلیہ میرا یہ تھا کہ میں اپنے لباس میں کوئی بہت ہی معزز آدمی نظر آتا تھا، کوٹ پتلون میں ملبوس۔ خوبصورت ٹائی میرے گلے میں تھی اور میرے سر پر فلیٹ ہیٹ تھی۔ اور میرا سارا لباس عمدہ قسم کی خوشبو سے معطر تھا۔ میرا ذہن بُری طرح الجھا ہوا تھا۔ آسیہ کی قید و بند کی سوچ کا تصور مجھے جلتے جہان سے متنفر کئے دیتا تھا مگر اس کی آزادی کی جو قیمت میں ادا کرنے جا رہا تھا اس کا جواز کوئی کہاں سے لا سکتا تھا۔

مجھے یہ احساس برابر ڈس رہا تھا کہ مجھے آہو صاحب نے جس خوفناک کام پر مامور کیا ہے وہ ایسا ہے کہ اگر میں اس [illegible] آؤں گا۔ مجھے دو امکانات صاف صاف نظر آ رہے تھے [illegible] آسیہ کی محبت ایسی تھی کہ اس کے لئے مجھے سارے جہان سے [illegible] پڑتا تو تنہا لڑ لیتا کہ دنیا کی ہر شے دوبارہ مل سکتی ہے مگر [illegible] ماں باپ کی واپسی ممکن ہے نہ آدمی کو دوبارہ اس کے بہن بھائی مل سکتے ہیں۔۔۔ یہ ایسی نعمتیں ہیں جن کی قدر و قیمت کا مجھے [illegible] احساس تھا اور اسی وجہ سے میں نے اس سنگلاخ راستے پر قدم رکھ دیا تھا۔

گجرات کے لئے گاڑی آٹھ بجے چھوٹتی تھی اور میرے پاس [illegible] وقت صرف بیس منٹ باقی تھے۔ میں ٹکٹ لینے کے لئے کھڑکی کی طرف بڑھا تو میں نے وہاں ایک آدمی کو عجیب سے فرصت کے انداز میں [illegible] دیکھا۔ وہ بڑی بے فکری سے کھڑکی کے ساتھ لگا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ میں نے ٹکٹ خریدنے کے لئے جیب سے روپے نکالے تو سو سو کے نوٹوں کی ایک پوری گڈی باہر نکل آئی۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہ تھا [illegible] چھوٹے نوٹ نہیں تھے۔ سو روپے کا ایک نوٹ الگ کر کے میں نے کھڑکی کے اندر رکھا تو میں نے دیکھا کہ وہ کرنجی آنکھوں والا آدمی پھر کر میرے سر پر کھڑا ہو گیا۔۔۔ میں نے دل میں کہا بیٹے! تیرا تو میں ایسا بندوبست کروں گا کہ تیرے پرکھے بھی نہ مل سکیں گے۔ میری جیب اس کی دسترس سے بہت دور تھی مگر صورت شکل سے وہ مجھے کوئی جرائم کا ماہر نظر آتا تھا جس سے [illegible] بھی بعید نہیں ہوتا۔

"کہاں جائیں گے آپ؟" بکنگ کلرک نے پوچھا۔

"گجرات! ایک سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دے دیں۔"

وہ آدمی جواب تک بڑی بے فکری سے سگریٹ پھونک رہا تھا [illegible] جوش سے بولا۔

"گجرات کے لئے سیکنڈ کلاس کا ایک ٹکٹ مجھے بھی دے دیں [illegible] کرنی گاڑی نکلنے والی ہے۔" میری چھٹی حس نے مجھے یہ احساس دلایا کہ اس آدمی نے اسی وقت اپنی منزل کا تعین کیا ہے ورنہ اس سے پہلے کہیں بھی جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آئی تھی اور میری طرف دیکھ کر وہ یوں مسکرا رہا تھا جیسے [illegible] آشنا ہو۔ مجھے الجھن ہونے لگی اس کی صورت شکل اور مونچھوں [illegible] تراش خراش سے مجھے یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ پولیس کے محکمے [illegible] ہے۔ جونہی یہ خیال میرے ذہن میں ابھرا میں چونک سا گیا۔ [illegible] سکتا ہے یہ آدمی سی آئی ڈی کا فرد ہو۔ یہ بھی ممکن ہے [illegible] لیا ہو۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔

میں نے جلدی سے ٹکٹ اور بقیہ پیسے کھڑکی میں سے [illegible] اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پلیٹ فارم کی طرف لپکا۔ ابھی میں چند [illegible] تھا کہ وہ آدمی بھاگتا ہوا آیا اور میرے ساتھ چلنے لگا: "آپ [illegible]

بے جناب! ابھی تو گاڑی سٹیشن پر لگی بھی نہیں۔"

میں نے اس کی طرف سے بے نیازی اختیار کر کے اپنی رفتار تیز کر دی وہ دو قدم پیچھے رہ گیا تو پھر اچھل کر آگے بڑھا اور میرے ساتھ آ ملا۔

"آپ بھی گجرات جا رہے ہیں؟" اب کی بار اس نے زیادہ پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"جی ہاں میں بھی گجرات ہی جا رہا ہوں۔"

"لائیں یہ اٹیچی کیس مجھے دے دیں میں اٹھا لیتا ہوں۔" اس نے میرے اٹیچی کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"جی نہیں شکریہ! یہ زیادہ وزنی نہیں ہے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"حرج ہی کیا ہے صاحب! ہماری منزل تو ایک ہی ہے مجھے نثار کہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے پھر میرے اٹیچی کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کیوں شرمندہ کرتے ہیں جناب آپ!" میں نے اب کی بار قدرے گرمجوشی سے کہا۔ مگر وہ بضد ہو گیا اور میرا اٹیچی کیس اس نے زبردستی میرے ہاتھ سے لیا اور میرے ساتھ جڑ کر چلنے لگا۔

اب ہم پلیٹ فارم پر پہنچ چکے تھے۔ نظریں اس کی بڑی تیزی سے میرا جائزہ لے رہی تھیں اور میں اس مخمصے میں مبتلا تھا کہ اس سے کس طرح چھٹکارہ حاصل کروں۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے اور مجھے پہچان گیا ہے۔ اگر پہچان نہیں پایا ہے تو بھی وہ مجھے جس انداز سے ٹٹول رہا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ مجھے مشکوک آدمی سمجھ رہا ہے۔ شاید میرے چہرے پر پھیلی سراسیمگی اس کی سمجھ میں آ گئی تھی اس نے پلیٹ فارم پر پہنچ کر میرا اٹیچی کیس فرش پر رکھا اور جیب سے گولڈ لیف سگریٹ کا پیکٹ نکال کر بولا۔

"لیجئے شوق فرمائیے۔ میں اِدھر فیصل آباد میں آفندی ٹیکسٹائل ملز میں منیجر ہوں۔ گجرات اپنے سیل ڈپو کو دیکھنے جا رہا ہوں۔"

"جی شکریہ!" اس سے سگریٹ لے کر میں نے سلگا لیا۔

"آپ کا اسم گرامی؟"

"مجھے آصف کہتے ہیں۔" میں نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

"اچھا اچھا۔ بہت اچھا نام ہے آپ کا۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ کبھی موقع ملے تو فیصل آباد آئیے۔"

"جی۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ پھر گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے میں نے اٹیچی کیس اٹھا لیا۔

"آپ گھبرائیں مت! سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بہت جگہ ہوتی ہے۔" اتنے میں گاڑی سٹیشن کے اندر داخل ہو گئی۔ اور ہم دونوں ایک خالی ڈبے میں جا گھسے نشستوں پر دھول جمی تھی۔ اس آدمی نے اپنا رومال نکال کر گرد جھاڑی اتنی محبت اور مروت سے اس نے یہ کام کیا جیسے وہ میرا ادنیٰ غلام ہے۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ مجھے اپنے دل پر جمی شکوک کی دھول بھی صاف ہوتی نظر آئی وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا، بولا۔۔۔

"صاحب! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کی دو گھڑی کی ملاقات عمر بھر کا بندھن بن جاتی ہے۔ آپ کی شخصیت اتنی نکھری نکھری اور پُرشکوہ ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں زندگی بھر آپ کے ساتھ ساتھ چلتا رہوں۔"

"یہ آپ کی نوازش ہے۔" ابھی میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ ایک صاحب بہت تیزی سے ڈبے میں داخل ہوئے۔ وہ اچکن اور شلوار میں ملبوس تھے۔ عمر ان کی یہی کوئی پینتیس سال ہو گی چہرے مہرے سے بہت ہی مہذب دکھائی دیتے تھے، پاؤں میں ان کے سفید چمڑے کا جوتا ایسا خوبصورت تھا کہ ان کی سفید شلوار اور کالی شیروانی کے ساتھ بڑی بہار دکھا رہا تھا۔ صحت کے لحاظ سے بھی وہ بہت ہی خوش نصیب نظر آتے تھے۔ گورا چٹا رنگ، بڑی بڑی غلافی آنکھیں سر کے بال گھنے اور سیاہ۔

وہ اندر داخل ہوئے تو بلند آواز سے بولے "لاؤ، بھئی لاؤ! یہ ٹرنک اِدھر رکھ دو۔" ان کے سامنے دروازے پر دو قلی کھڑے تھے انہوں نے ایک ایک بھاری بھرکم صندوق سر پر اٹھا رکھا تھا۔ قلیوں نے اندر آ کر بڑے اطمینان سے وہ صندوق ڈبے کے فرش پر رکھ دیئے۔

"بس، انہیں یہاں ہی رہنے دو۔ سیٹوں کے نیچے رکھ لوں گا میں۔۔۔" وہ بہت سنجیدہ نظر آتے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہنسنے مسکرانے سے ان کا زندگی بھر کوئی علاقہ نہیں رہا ہے۔ قلیوں نے ان کے کہنے پر وہ ٹرنک سیٹوں کے نیچے دھکیل دیئے۔ ان صاحب نے گہری گہری نظروں سے ہمیں دیکھا اور قلیوں کو بڑی فراخدلی سے دس دس روپے دے کر بولے "خوش ہو؟"

"مہربانی میاں جی!" ایک قلی نے احسان مندی کے جذبے سے شرابور ہو کر کہا۔ ایک ایک ٹرنک اٹھانے کی مزدوری انہیں دس دس روپے مل گئی تھی اور انہیں کیا چاہئے تھا۔۔۔ وہ ڈبے سے اترے تو وہ صاحب ہم سے مخاطب ہو کر بولے۔

"حضرات! ذرا خیال رکھئے گا میں ابھی واپس آیا۔ مجھے پشاور تک جانا ہے۔"

"بے فکر رہیں جناب! آپ کے صندوق بالکل محفوظ ہیں۔" نثار نے خوشدلی سے کہا۔

وہ صاحب فوراً ہی اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ڈبے سے نکلے اور تیز تیز قدم اٹھاتے آگے نکل گئے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انجن کی طرف جا رہے ہیں۔

گاڑی کچھ ہی دیر بعد حرکت میں آ گئی۔۔۔ مگر وہ صاحب واپس نہ آئے۔ میں اور نثار چاروں طرف نظریں دوڑاتے رہے مگر ان کا

کہیں کوئی پتہ نہ چل سکا۔ گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔ نثار نے فکرمند لہجے میں کہا ——

"آصف صاحب! یہ آدمی کہاں چلا گیا ہے؟ ابھی تک واپس نہیں آیا۔"

"کہیں آگے پیچھے بیٹھ گیا ہوگا —— آجائے گا۔" گاڑی کی رفتار تیز ہو چکی تھی اور اب وہ سٹیشن سے باہر نکل آئی تھی۔ تشویش مجھے بھی ہوئی کہ وہ آدمی اپنے اتنے سارے بھاری بھرکم صندوق وہاں ڈال کر چلا گیا ہے۔ ایسا مغز پھرا تو وہ ہرگز نہ ہوگا کہ بھول گیا ہو۔ یہی توقع تھی کہ وہ جلدی میں کسی اور ڈبے میں جا بیٹھا ہوگا۔

گاڑی شاہدرہ سے آگے نکلی تو نثار نے جیب سے ایک ڈبیا نکالی اس میں اس نے پان بند کر رکھے تھے۔ ایک گلوری اس نے چھالیہ الائچی ڈال کر مجھے دی "لو! لیجئے یہ بہت نایاب پان ہے ادھر تو آج کل مل ہی نہیں رہا ہے۔ میں نے ایک پی آئی اے والے سے چند منگوائے تھے۔"

میں اس کی کسی بات پر اعتبار کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ دل میں میں یہ دھار کر بیٹھا تھا کہ جیسے ہی اس نے اپنی اصلی صورت ظاہر کی میں اس کی گردن مسل دوں گا، جان سے مار دوں گا۔ وہ خنزیر کا بچہ مجھے خدا جانے کس چکر میں ڈالنے کی فکر میں تھا مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا پالا کس بلا سے پڑا ہے۔

میں نے پان اس سے لے تو لیا مگر منہ میں اس طرح ڈالا کہ اس میں رکھا سارا مسالہ میں نے بڑی احتیاط سے اپنی ہتھیلی کی اوٹ میں رکھ کر کوٹ کی آستین میں گرا دیا۔ پان پر جو کتھا چونا لگا تھا، وہ خشک ہو چکا تھا۔ وہ خاصا کرارا اور خستہ پان تھا۔ مجھے یقین تھا اگر اس میں کوئی بھید ہے تو وہ سارے کا سارا اس مسالے میں ہوگا جو اس نے پان میں بھر رکھا تھا۔

نثار خوش ہو گیا کہ میں نے پان کھا لیا ہے۔ اس کی توقع کے عین مطابق میں نے کوئی دس منٹ تک پان کی جگالی کرنے کے بعد آنکھیں یوں موند لیں جیسے میں نیند میں رخصت ہوتا جا رہا ہوں —— آہستہ آہستہ میں نے اپنے چہرے کو یوں ظاہر کیا جیسے میں گہری نیند میں کھو گیا ہوں۔ گاڑی چھوٹے چھوٹے سٹیشن پھلانگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

میں نے نثار کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے کے لئے اپنے بدن کو یوں ڈھیلا چھوڑ دیا جیسے میں دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہو چکا ہوں۔ بریف کیس کو میں گود میں رکھے ہوئے تھا۔ اپنی گہری نیند کا اسے یقین دلانے کے لئے میں نے وہ بھی بڑی ہی فطری قسم کی اداکاری کرتے ہوئے سیٹ پر گرا دیا۔

نثار نے میری یہ حالت دیکھی تو وہ خوش ہو گیا۔ میں پلکوں کی جھری میں سے برابر اس کی حرکات و سکنات کا اندازہ لگا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسرت ناچ رہی تھی۔ میں نے دل میں کہا۔ "نثار بیٹے تیری شامت اعمال تجھے میرے پیچھے لے آئی ہے۔ تو نہیں جانتا کہ تو نے کس سوراخ میں ہاتھ ڈال دیا ہے؟" وہ کھسک کر میرے قریب ہو گیا۔ اس نے پہلے بریف کیس درمیان میں سے ہٹایا اور پھر بڑے ماہرانہ انداز سے اس نے انتہائی غیر محسوس طریقے سے اپنا ہاتھ میرے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال کر ایک گڈی نوٹوں کی اپنی انگلیوں میں پکڑی ابھی اس کا ہاتھ میرے کوٹ کی جیب میں ہی تھا کہ میں جھپٹ کر اٹھ بیٹھا اور اس کی کلائی میں نے اپنی آہنی گرفت میں لے لی۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس کی کلائی کو میں نے دونوں ہاتھوں سے کچھ اس طرح مروڑا کہ وہ دوہرا ہو گیا۔ اس کا سر فرش کی طرف جھکنے لگا۔

"تیری ایسی تیسی ..... لے لمن چھچھڑا! میں تو تجھے ادھر ہی پر ہی پہچان گیا تھا۔ تیری تو میں ہڈیاں توڑ دوں گا بچے!" اس کا دایاں ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ وہ اپنا بایاں ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال رہا ہے۔ میں نے فوراً ہی پوری قوت سے بایاں ہاتھ اس کی گردن پر مارا۔ وہ بلبلا اٹھا اور اپنے بدن کو میری گرفت سے چھڑانے کے لئے مجھ سے زور آزمائی کرنے لگا۔ اس کا بایاں ہاتھ ابھی تک اس کی جیب میں تھا۔ میں نے فوراً اس کا دایاں ہاتھ چھوڑ کر اس کی گردن پر اپنی انگلیاں جما دیں اور دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کے بائیں ہاتھ کو پیچھے کھینچا مگر اس کے ساتھ ہی ٹھز کی آواز پیدا ہوئی۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھے پستول کی لبلبی دبا دی تھی۔ پستول کا رخ اگرچہ میری ہی طرف تھا مگر اس کی نیت کو سمجھتے ہوئے اور اس کے ہاتھ کو جیب سے نکالنے میں ناکام ہونے کی وجہ سے میں نے اس کا رخ ایک جھٹکے سے عین اس وقت دوسری طرف موڑ دیا تھا۔ جب وہ لبلبی دبا رہا تھا۔ گولی اس کے کوٹ کو پھاڑتے ہوئے ڈبے کی دیوار میں جا لگی۔

میں اسے بے ہوش نہیں کرنا چاہتا تھا مگر مجبوراً مجھے اس کی گردن کی رگ پوری قوت سے مسل دینی پڑی۔ نتیجہ ظاہر تھا وہ میرے ہاتھوں میں یوں جھول گیا جیسے اسے مرے ہوئے مدت گزر چکی ہے۔

میں نے اسے بڑی آہستگی سے سیٹ پر لٹا دیا۔ وہ بیہوش ہو چکا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے اس کے کپڑوں کی تلاشی لی تو مجھے اس کے کوٹ سے ایک درہ ساختہ پستول ملا جس میں پانچ گولیاں ابھی تک موجود تھیں۔ دوسری جیب میں ایک بٹوا تھا جس میں سے آج کا خریدا ہوا ٹکٹ اور چار سو ستر روپے برآمد ہوئے۔ میں نے بٹوے کی تہیں کھول کر دیکھیں تو مجھے اس میں سے ایک شناختی کارڈ ملا جو اقبال نامی کسٹم انسپکٹر کا کارڈ تھا۔ اقبال کے نام دو خط بھی اس میں رکھے تھے اور ایک فوٹو تھا جس میں اقبال کسی عورت کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ان چیزوں کی اس کی جیب میں موجودگی صاف ظاہر کرتی تھی کہ وہ بٹوا اس نے کسی کی جیب سے تازہ تازہ نکالا تھا [illegible] میں وہ اتنا بے فکر تھا کہ اس کو پھینک دینا بھی بے کار سمجھتا تھا۔ میرا

خیال ہے کہ وہ بٹوا اس نے اسی رات پلیٹ فارم کی بھیڑ میں چلتے ہوئے میرے ساتھ ڈبے میں سوار ہونے سے پہلے کسی کی جیب سے اڑایا تھا۔ میرا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا وہ واقعی زبردست ٹھگ تھا۔

مگر میرے لئے اس نے اپنا منصوبہ طویل کر دیا تھا کیونکہ میرا مال کسی ایک جیب میں اور کسی ایک بٹوے میں بند نہیں تھا۔ میں نے روپے اپنی تین جیبوں میں ڈال رکھے تھے اور وہ سب کے سب بٹوے کے بغیر کھلے پڑے تھے چونکہ وہ خاصی بڑی رقم تھی اس لئے اس نے میرے ساتھ اسی ڈبے میں سفر کرنے کا فیصلہ کیا جس میں میں سوار ہو رہا تھا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ گجرات پہنچنے سے پہلے پہلے وہ مجھے زیر کرے گا۔

میں نے اس کی تیسری جیب دیکھی تو اس میں سے مجھے تراسی روپے ملے۔ سگریٹ کے دو پیکٹ، ایک رومال، ایک کنگھا، ایک سگریٹ لائیٹر اور ایک تصویر۔ ایک چابیوں کا بھی چھوٹا سا گچھا۔ یہ سب چیزیں اس نے بڑی احتیاط سے اپنی قمیص کی اندرونی جیب میں سنبھال رکھی تھیں جو سویٹر میں چھپی تھی۔ مجھے اس کی پتلون کی پیٹی میں چھپا ایک تیز دھار چاقو ملا۔ جو کھلتا تھا تو بارہ انچ لمبا ہو جاتا تھا مگر بند ہونے پر پانچ انچ رہ جاتا تھا۔ جب میں نے اسے اچھی طرح صاف کر لیا تو میں نے سوچا کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ یہ سالا اگر اسی طرح چھٹی پر رہا تو میں اسے کیا سبق دے سکوں گا۔

میں نے ایک ایک کر کے اس کے تمام کپڑے اتار دیئے۔ کوٹ، پتلون، سویٹر، قمیص، بنیان اور پھر آخری چیز جو میں نے اس کے بدن پر رہنے دی وہ اس کا غلیظ جانگیہ تھا۔ لباس کے نیچے وہ بے حد گندا تھا۔ اس کا جسم سارے کا سارا ولایتی سور کی طرح بالوں میں چھپا ہوا تھا یہاں تک کہ اس کی کمر پر بھی بالوں کا کمبل سا لپٹا نظر آتا تھا۔ اس کو یوں برہنہ کر کے میں غسل خانے میں گیا اور وہاں سے اوک میں پانی لا کر اس کے منہ پر چھڑک دیا۔ اس نے جھرجھری سی لی مگر وہ ہوش کے دائرے میں واپس نہ آیا۔ مجھے تین بار غسل خانے سے پانی لا کر اس کے منہ پر ڈالنا پڑا۔ تب جا کر اسے ہوش آیا۔ اس وقت وہ ڈبے کے ٹھنڈے ننگے فرش پر سیدھا پڑا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے اپنے سامنے ہاتھ میں پستول لئے کھڑے دیکھا تو خوف سے اس کا رنگ پیلا ہو گیا۔ وہ یوں ہڑبڑا کر اٹھا جیسے اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ فرش پر سے اٹھتے ہی اس نے اپنے بدن پر نظر ڈالی تو ایکدم اکڑوں ہو کر نیچے بیٹھ گیا۔

"مجھے ..... مجھے معاف کر دیں آصف صاحب! خدا کے لئے مجھے معاف کر دیں۔" میں نے پاؤں کی پوری قوت سے اس کی پسلی میں ٹھوکر ماری اس کی آواز سن کر میں غصے سے بھڑکنے لگا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر سیٹ کے پیچھے گھسنے لگا اور ایک ٹرنک کے ساتھ جا چپٹ گیا۔ میں نے اسے نیچے جھک کر باہر کھینچنا چاہا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس ٹرنک میں سے عجیب سی سڑاند اٹھ رہی تھی۔ میں سمجھا وہ بدبو اس کے منہ سے آ رہی ہے۔

"باہر نکل آ استاد! ابھی تو تجھ سے بڑی باتیں کرنی ہیں مجھے۔ باہر آ میرے بچے!" یہ کہہ کر میں نے اس کو گردن سے پکڑ کر سیٹ کے نیچے سے باہر گھسیٹا۔ وہ میری گرفت سے نکل کر دوسری نشست کے نیچے جا گھسا۔

اب کی بار اسے باہر نکالنے کے لئے مجھے زیادہ نیچے جھکنا پڑا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس سیٹ کے نیچے جو ٹرنک پڑا تھا اس کے اردگرد بھی ہلکی ہلکی بدبو پھیلی تھی مگر اس کے ساتھ خوشبو بھی تھی۔ مجھے اس خبیث پر سخت طیش آیا وہ اتنا گندہ تھا کہ شاید کلی بھی نہیں کرتا تھا اور منہ کی بدبو کو دور کرنے کے لئے خوشبودار پان کھاتا تھا۔

میں نے پریشان ہو کر نثار کا چاقو کھول لیا اور اس کی نوک اس کی ننگی کمر پر کچھ اس طرح چبھوئی کہ وہ درد سے نڈھال ہو کر ایکدم نشست سے باہر نکلا اور ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ بڑا ہی مضحکہ خیز دکھائی دے رہا تھا۔ اس کو اس حالت میں دیکھ کر کوئی بھی نہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ کوئی جامہ زیب حیوان ناطق ہے۔ لباس کے بغیر وہ سر سے پاؤں تک حیوان نظر آتا تھا۔

"کیوں بے! یہ دھندا کب سے کر رہا ہے تو؟"

"آصف صاحب! خدا کے لئے مجھے معاف کر دیں۔ میرے کپڑے مجھے دے دیں۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی مجھے سیٹ پر دھرے اس کے کپڑے اور دوسری چیزیں یاد آ گئیں۔ بس کو پستول کی زد میں رکھتے ہوئے میں نے چاقو جیب میں ڈال کر بائیں ہاتھ سے کھڑکی کا شیشہ نیچے گرایا اور پھر اس کے تمام کپڑے اٹھا کر گاڑی سے نیچے پھینک دیئے۔

"یہ بڑا ظلم کیا ہے آپ نے مجھ پر۔ میں سردی میں مر جاؤں گا آصف صاحب!"

"ابھی کہاں بچے! ابھی تو میں تیرا پنڈا اچھی طرح تپاؤں گا دیکھتا تو رہ۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ میرے دل میں اس کے لئے شمہ بھر رحم نہیں رہا تھا حالانکہ میں خود بدترین قسم کا مجرم تھا۔ اب بھی میں سوچتا ہوں تو مجھے بے حد افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا۔ حیرت مجھے یہ ہوتی ہے کہ میں نے اس رات اس آدمی کی ایک ذرا سی خطا پر کیوں اسے اس قدر ذلیل کیا۔ میرا دل اس گھڑی پتھر ہو چکا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں لاشعوری طور پر نثار سے وہی سلوک کر رہا تھا جو تھانے میں پولیس نے اور جیل میں وہاں کے مختلف اہلکاروں نے مجھ سے کیا تھا۔ میں اپنے بدن پر سہی ہوئی کڑی اذیتوں اور آزمائشوں کا اس سے انتقام لے رہا تھا۔

وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں ابھی اس کے ٹکڑے کر دوں گا۔ اس کے بندھے جڑے ہاتھ مجھے سکون پہنچا رہے تھے میں نے اسے پوری طرح بے بس کر کے اس کی انا کی ساری طنابیں کاٹ

دی تھیں۔

"تو کب سے یہ دھندا کر رہا ہے؟"

"مجھے دس سال ہو گئے ہیں اس دھندے میں آصف صاحب! میرا گزارہ اسی کام پر ہے۔"

"گھر میں تیرے کون کون ہے؟" میں نے سیٹ پر بیٹھ کر سگریٹ سلگا لیا۔ پستول کا رخ میں نے مسلسل اس کی طرف رکھا تھا۔

"کوئی بھی نہیں! میں تنہا ہوں بالکل تنہا۔ ایک میری جوان بہن تھی وہ بھی سال پہلے کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔"

اس کے منہ سے بہن کا ذکر سنتے ہی میرا کلیجہ دہلنے لگا مجھے آسیہ کی بدنصیبیاں یاد آ گئیں مگر میں نے اپنے درد کو دل میں گہرا دبا دیا۔

"وہ کیوں بھاگی تھی؟"

"بس خرچ پیسے سے تنگ رہتی تھی۔ میرا دھندا تو ایسا ہی ہے اور پھر میں ان دنوں جیل میں تھا ___ اُدھر سپاہی حوالات جیل میں۔ وہ پریشان ہوئی تو کسی کے ساتھ نکل گئی۔" وہ ابھی تک میرے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا اس امید پر کہ میرا دل پسیج جائے گا۔

"کتنی بار جیل جا چکا ہے تو؟" میں تھانیداروں کی طرح اس سے گردن میں رعونت آمیز خم دیئے بیٹھا تھا اور وہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔

"چھ بار ___"

"پڑھے لکھے ہو؟"

"جی ہاں ایف اے تک پڑھا ہوں۔"

"یہ اچھی بات ہے مگر تو مجھے نہیں جانتا بچے! میں تو بالکل ان پڑھ ہوں میں تجھے ہرگز معاف نہیں کروں گا۔" میری یہ بات سنتے ہی وہ دائیں طرف لپکا۔

گاڑی کی زنجیر اس سے ذرا دور رہ گئی تھی۔ اس کا ارادہ بھانپ کر میں نے پوری قوت سے بائیں ہاتھ کا ایک جھانپڑ جو اس کے منہ پر مارا تو وہ تیورا کر سیٹ کے اوپر گر گیا۔ برہنہ حالت میں وہ مجھے بہت ہی عجیب و غریب لگ رہا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ میں چاقو کی نوک سے اس کی پیٹھ پر اپنا نام لکھ دوں۔

"مجھے معاف کر دو آصف صاحب! خدا کے لئے میرا گناہ بخش دیں۔"

میں نے سوچا تھا کہ میں اسے بدترین قسم کی سزا دوں گا تاکہ یہ مجھے ساری عمر یاد رکھے۔ یہ سوچ کر میں نے چاقو ہاتھ میں سنبھال لیا۔ میرے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر وہ رونے اور گڑگڑانے لگا۔ اندر سے وہ اس حد تک ٹوٹ پھوٹ چکا تھا کہ اس کے اندر مزاحمت کی کوئی سکت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

"روتا ہے سالے! یہ کم سے کم سزا ہے تیری اس کمینگی کی۔ تو مجھے دوست بنا کر ٹھگنا چاہتا تھا۔" میری بات سن کر اس کی آنکھوں میں ایسا خوف ابھر آیا جسے میں لفظوں میں سمو ہی نہیں سکتا۔

اس عرصے میں میں نے اپنا بریف کیس کھول کر اس کے لئے کپڑے پاجامہ قمیص بنیان اور سویٹر نکال کر الگ رکھ لئے تھے۔

"ان کو پہن لے اور یاد رکھ کہ یہ دھندا آدمی کو ایسی ہی ذلت تک پہنچاتا ہے۔" اس کے بوٹ میں نے اس کے پاؤں میں ہی رہنے دیئے تھے جو باقی سارے جسم پر لباس نہ ہونے کی وجہ سے اس کے پاؤں میں عجیب سے لگتے تھے۔

اس نے فرمانبردار بچے کی طرح میرے سامنے وہیں کھڑے کھڑے چاروں کپڑے پہنے اور پھر یوں میری طرف دیکھنے لگا جیسے میرے اگلے حکم کا انتظار کر رہا ہو۔ ٹھہر ٹھہر کر اس کا ہاتھ کمر کی طرف جاتا تھا جہاں میں نے اس کی جلد پر ہلکا سا زخم لگا دیا تھا اس میں سے شاید خون اب بھی رس رہا تھا۔

گاڑی کی رفتار آہستہ ہو رہی تھی وہ تھوڑی ہی دیر بعد وہاں رک گئی۔

"یہ کون سا سٹیشن ہے تو تو اکثر اپنے شکار کے پیچھے سفر کرتا ہو گا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ بڑی مرجھائی ہوئی مریل سی آواز میں بولا۔ ہمارے ڈبے میں وہاں سے بھی کوئی آدمی سوار نہ ہوا۔ دراصل گاڑی لاہور سے راولپنڈی تک چلتی تھی اور اس میں کوئی خاص رش نہیں ہوتا تھا۔

گاڑی چند لمحے رکی اور پھر آگے سرکنے لگی مگر اس کے جھٹکوں سے ایک ٹرنک نشست سے نکل کر آگے گر گیا ... میری ٹانگوں سے ٹکرا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے اندر سے عجیب سی بو نتھنوں کو چڑھ رہی ہے۔ وہ کافور ایسی بو تھی۔

"یہ بو کیسی ہے جو اس ٹرنک سے آ رہی ہے کہ تیرے منہ سے؟"

میں نے نہایت ہی اکھڑ لہجے میں کہا۔

وہ آگے جھکا اور ٹرنک کو سونگھ کر بولا۔

"یہ تو اسی میں سے آ رہی ہے۔"

"کمال ہے وہ کتے کا بچہ کیا بند کر کے رکھ گیا ہے ان میں؟ اس ٹرنک کو کھول ذرا۔" میرے ہاتھ میں پکڑے پستول کا رخ اب بھی اس کے سینے کی طرف تھا۔

"نہیں آصف صاحب اب نہیں، میری توبہ۔ میں اگر اپنے باپ کا تخم ہوں تو میں پھر کبھی بھی پرائی چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

"اپنے اس چاچے کو کھول حرامزادے۔ یہ لے یہ رہا تیری چابیوں کا گچھا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا چابیوں سے بھرا چھوٹا سا بٹوا اس کی طرف اچھال دیا۔

اس نے بڑی بددلی سے اٹھ کر ٹرنک کو آگے گھسیٹا اور اس میں لگے تالے پر چابیاں آزمانے لگا۔ ایک چابی کام کر گئی۔ اس نے تیزی سے ٹرنک کا ڈھکنا کھول دیا اور پھر ..... پھر ٹرنک کے اندر جو کچھ ہم دونوں نے

دیکھا وہ مدتوں تک ہمارے ہوش اڑانے کے لئے بہت کافی تھا۔ ٹرنک میں پتلے سے پلاسٹک کے تھیلے میں انسانی جسم کے مختلف اعضا یوں کٹے پڑے تھے جیسے قصائی کے تختے پر جانور کا گوشت صاف ستھرا کاٹ کر رکھا جاتا ہے۔

"اُف میرے اللہ!" وہ ایسا بھیانک منظر تھا کہ نثار اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی نشست پر پیچھے جا گرا۔ اس کے سانس کی آمد و رفت میں بلا کی تیزی آ گئی تھی لگتا تھا جیسے وہ میلوں کی مسافت طے کر کے ابھی یہاں پہنچا ہے۔ میری اپنی کیفیت بھی اس سے قطعاً مختلف نہیں تھی۔

میں اس ٹکڑے ٹکڑے لاش کو ٹک ٹک دیکھ رہا تھا اور مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ لاش کا سر غائب تھا۔ اس میں دو رانیں اور دو ٹانگیں، اور دو بازو ایک دوسرے کے متوازی یوں رکھے تھے جیسے کسی نے احتیاط اور صبر و سکون سے دھڑ سے کاٹ کر الگ کیا اور پلاسٹک کے بڑے لفافے میں سجا کر صندوق میں بند کر دیا [illegible] رانوں پر چاندی کے ورق لگے تھے اور کسی بھی عضو سے خون نہیں رس رہا تھا.....

ابھی میں اپنی حیرت پر قابو نہیں پا سکا تھا کہ اچانک میرے پستول والے ہاتھ پر جو آگے بڑھا ہوا تھا نثار نے اٹھ کر پاؤں سے زبردست ٹھوکر ماری۔ وہ ٹھوکر اتنی اچانک اور اتنی شدید تھی کہ پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا۔ مجھے نہتا دیکھتے ہی وہ مجھ پر گرا اور آتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبوچ لیا۔ یہ وار اتنا غیر متوقع تھا کہ میں ایک لمحے کے لئے تو سمجھ ہی نہ سکا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہئے؟

میرے دونوں ہاتھ کھلے تھے۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر گردن پر سے اس کی گرفت ہٹانے کی کوشش کی مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کے پنجے میں خاصی قوت ہے میں ڈرا کہ کہیں وہ مجھے بے بس ہی نہ کر دے۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور اپنی ٹانگیں اس کے پیٹ میں پھنسا کر پوری قوت سے اسے پیچھے دھکیلا۔ میری یہ کوشش کامیاب رہی اور میری گردن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی مگر وہ ایسا ڈھیٹ قسم کا آدمی تھا کہ اس نے میری گردن چھوڑتے ہی مجھے پاؤں سے پکڑ کر سیٹ سے نیچے گرا لیا اور اس کے ساتھ ہی وہ دائیں ہاتھ فرش پر پڑے پستول کی سمت بڑھا۔ یہ بہت ہی خوفناک لمحہ تھا۔ میں بجلی ایسی سرعت سے فرش پر سے اٹھا اور نثار پر جا گرا۔ پستول پر اس کا ہاتھ نہ پڑ سکا تھا۔ وہ اوندھے منہ گرا مگر پھر الٹ کر سیدھا ہو گیا اور مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا۔ میرے لئے اس کے جسم سے یوں بھڑ جانا بہت غنیمت تھا۔ میں نے جوں توں کر کے بڑی مشکل سے اس کی گردن تک رسائی حاصل کی اور پھر پوری قوت سے میں نے اس کی رگِ احساس مسل دی۔ وہ یوں بے حس و حرکت ہو گیا جیسے زندگی اس کا ساتھ چھوڑ گئی ہے ہمیشہ کے لئے۔

نثار کا قصہ ختم کرتے ہی میں پھر ٹرنک کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے اندر رکھے اعضا کو بغور دیکھنے کے بعد میں نے دوسرا ٹرنک نثار کی اسی چابی سے کھول دیا جس سے اس نے پہلا تالا کھولا تھا۔ اس میں کسی عورت کا پورا دھڑ پڑا تھا۔ وہ دھڑ ٹانگوں سے بڑی صفائی کے ساتھ الگ کیا گیا تھا۔ اس کی گردن بھی یوں کاٹی گئی تھی کہ ذرا سا تسمہ بھی ادھر ادھر لٹکتا نظر نہیں آتا تھا۔

ابھی میں اس ٹرنک کو بند کر ہی رہا تھا کہ گاڑی کی رفتار ایک دم مدھم پڑنے لگی۔ میں نے ٹرنک کو جلدی سے سیٹ کے نیچے دھکیلا اور کھڑکی کی طرف لپکا۔ گاڑی کسی سٹیشن پر رک چکی تھی۔

میرے دل و دماغ پر ایسی لرزہ خیز کیفیت طاری تھی کہ میں اسے کسی طرح بھی بیان نہیں کر سکتا تھا۔ نثار میرے سامنے مُردوں سے زیادہ بدتر حالت میں آڑھا ترچھا پڑا تھا اور ان دو ٹرنکوں میں کسی بدنصیب عورت کی سربریدہ لاش کے ٹکڑے میرا منہ چڑا رہے تھے۔

وہ گوجرانوالہ سٹیشن تھا اور وہاں مسافروں کی ایک بھیڑ تھی جو گاڑی پر ٹوٹ پڑی تھی۔ میں کھڑکی کے پیچھے کھڑا سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ ڈبے کا دروازہ میں نے اندر سے بند کر رکھا تھا اور میرا خیال تھا کہ جب لاہور سے اس میں کوئی نہیں چڑھا تو کسی چھوٹے سٹیشن پر کوئی مسافر اتنی تسلی کا کہاں ہو گا کہ وہ سیکنڈ کلاس کا شوق رکھے۔ مگر نہیں! دروازہ کسی نے ایک دم پیٹ ڈالا۔ باہر پانچ آدمی کھڑے تھے ___ وہ کوئی چوہدری قسم کے لوگ تھے جن کے ساتھ چلم بردار بھی تھے۔ تین آدمی سروں پر طرّے دار پگڑیاں باندھے تھے اور وہ ان کے ملازم تھے۔ انہوں نے دروازہ اندر سے بند دیکھا تو بہت تلملائے۔ عین اسی وقت گاڑی کا گارڈ ان کے قریب سے گزرا تو ایک سرکش نے اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

"ڈبہ تے کھلوا دو بادشاہو! لوکی بند کری بیٹھے او۔"

گارڈ نے مسکرا کر اس چوہدری کی طرف دیکھا اور دروازے کا ہینڈل گھمانے لگا۔ میری نبضیں دھڑ دھڑ بج رہی تھیں۔ خوف کی ایک تیز کٹیلی لہر میرے بدن میں سرسرانے لگی۔

مجھ پر بڑا کڑا وقت آن پڑا تھا۔ ڈر مجھ پر یہ طاری تھا کہ میں تو پہلے ہی اشتہاری مجرم ہوں۔ بھلا انہوں نے اگر ان ٹرنکوں اور نیم مردہ حالت میں پڑے نثار سمیت ڈبے میں دیکھ لیا تو وہ کیا سمجھیں گے؟ صاف ظاہر تھا کہ پہلے تو وہ مجھے سیدھا حوالات پہنچاتے اور پھر پوچھتے: "جنا کتھاں گزاری آئی رات دسے۔"

مجھے کسی فوری نتیجے پر پہنچنے کی ضرورت تھی۔ گارڈ نے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر دوڑتے ہوئے ایک مکینک کو اشارہ کر کے بلایا اور بولا: "دیکھو یہ دروازہ لاک تو نہیں ہے؟ میرا خیال ہے کسی مسافر نے شاید اندر سے بند کر رکھا ہے۔"

"لگتا تو یہی ہے جناب! میں دیکھتا ہوں ادھر کیا گھپلا ہے؟"

یہ کہہ کر وہ کھڑکی کی طرف آیا تو میں نے اپنا بریف کیس اور اٹیچی کیس اٹھا کر تیزی سے پچھلا دروازہ کھولا اور گاڑی کی دوسری طرف اتر گیا۔ ادھر گھپ اندھیرا تھا البتہ جب میں گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف بھاگا تو ہر دروازے کے آگے سے گزرتے وقت میرا سارا وجود روشنی کے نیزوں کی زد میں آ جاتا۔ میں اپنے آپ کو کسی قسم کی پریشانی میں الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ میری رفتار خاصی تیز تھی مگر ابھی میں پچھلی طرف تیسرے ڈبے تک پہنچا ہی تھا کہ مجھے اپنے پیچھے زبردست شور سنائی دیا۔

"پکڑو! اسے پکڑو! یہی ہے جانے نہ پائے۔" میرے پیچھے بہت سے آدمی لپکے چلے آ رہے تھے۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ اب میرا وہاں سے بچ نکلنا ناممکن نظر آتا تھا لیکن پکڑے جانے کی صورت میں میرا جو حال ہوتا وہ بھی میری نظر میں تھا۔ ڈبے کو بند رکھ کے ان لوگوں کی بار بار کی دستک سے غافل کر کے اور ڈبے سے یوں چوروں کی طرح بھاگ نکلنے سے میں نے اپنے لئے خود ہی ایک خوفناک گڑھا کھود لیا تھا جس میں میں دم بدم نیچے لڑھکتا جا رہا تھا۔

وہ لوگ لحظہ بہ لحظہ میرے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ نثار کا پستول میری دائیں جیب میں تھا اور میرا اپنا سائیلنسر لگا پستول میری پیٹی سے بندھا تھا جس پر میں نے سوئٹر چڑھا رکھا تھا۔

گوجرانوالہ کا پلیٹ فارم ایسا ہے کہ ایک طرف اسٹیشن کی عمارت ہے اور دوسری طرف چھوٹی سی دیوار ہے جس کی دوسری طرف مکانات ہیں۔ جو دور کچہری تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔

میں نے اپنی زندگی کا مشکل ترین فیصلہ کرتے ہوئے پہلے اٹیچی کیس کو دیوار کی دوسری طرف پھینکا اور پھر بریف کیس کو — اور پھر میں اپنے بدن کی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اچھل کر دیوار پر جا چڑھا جس کی بلندی آٹھ نو فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔

خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک میرا تعاقب کرنے والے مجھ سے خاصے دور تھے۔ اتنی دور کہ میں ان کی نگاہ میں تو تھا مگر دسترس میں نہیں تھا —

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ ایک گولی سرسراتی ہوئی میرے سر پر سے گزر کر سامنے دیوار میں جا لگی ہے۔ میں نے پاگلوں کی طرح کوئی بات سوچے سمجھے بغیر دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی کئی گولیاں دیوار کے اوپر سے گزر کر سامنے کے مکان میں جا لگیں ——

میں... کسی مکان کے صحن میں اتر گیا تھا جس میں بتی جل رہی تھی۔ میرا بریف کیس اور اٹیچی کیس سامنے پڑے تھے۔ میں نے دونوں چیزیں اٹھائیں اور تیزی سے مکان کے بڑے دروازے کی طرف بڑھا مگر میں یہ دیکھ کر سخت مایوس ہوا کہ دروازے پر باہر سے تالہ ڈال دیا گیا تھا۔ وہاں سے ہو کے میں دائیں ہاتھ مڑا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر جا چڑھا۔ علاوہ سیڑھیاں مکان کی دوسری منزل میں کھلتی تھیں اور وہاں بھی دروازہ بند تھا۔ البتہ کمروں کے گرداگرد ایک راہداری تھی۔ میں اس میں چلتا ہوا آگے نکلا تو معلوم ہوا کہ وہ راہداری آگے گلی تک کا منظر دکھاتی تھی۔ میرا حال اس زخمی بھیڑیے جیسا تھا جس کے پیچھے شکاری کتے لگے ہوں، ایسے شکاری کتے جو دم بدم اپنا حلقہ تنگ کرتے جا رہے تھے۔

مجھے اس لحظہ بہ لحظہ تنگ ہوتے ہوئے نرغے سے ہر طور نکل جانا تھا۔ میں زندہ حالت میں کسی کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ایسی صورت میں تو میرے پلے کچھ بھی باقی نہ رہ سکتا تھا۔ مجھ پر وہ تازہ ترین الزام وہ لگاتے وہ اس عورت کا قتل ہوتا جس کی کٹی ہوئی لاش میں نے ٹرنک میں دیکھی تھی۔ ان کا سب سے بڑا گواہ نثار ہوتا۔ وہ مجھے کسی طرح بھی بخشنے پر آمادہ نہ ہو سکتا تھا کیونکہ میں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اسے وہ زندگی بھر فراموش نہ کر سکتا تھا۔

اچانک مجھے اس مکان کے صحن میں دگڑ دگڑ کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ لوگ میرا پیچھا کرتے ہوئے دیوار پھاند کر میری ہی طرح صحن میں کود آئے تھے۔ ان کی آوازوں نے مکان کو دہلا کر رکھ دیا تھا اور اس کے مکین جاگ اٹھے تھے۔ مجھے اپنے پیچھے راہداری میں کھلنے والے ایک دروازے میں سے نکلتی روشنی نے آ لیا۔

جونہی میں اس روشنی کے حلقے میں آیا میں نے بلا سوچے سمجھے اپنے دونوں صندوق گلی میں پھینکے اور نیچے کود گیا۔ یوں جیسے کوئی سرکس کا سینڈو تماشائیوں کو خوش کرنے کے لیے آگ میں چھلانگ لگاتا ہے۔

چھت یہی کوئی بارہ فٹ بلند تھی۔ راہداری کی منڈیر کی اونچائی اس میں شامل کریں تو وہ اونچائی سولہ فٹ بنتی ہوگی۔ جب میرے پاؤں زمین پر لگے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری ہڈیاں پسلیاں چٹخ گئی ہیں مگر وہ ہڈیوں کا حساب کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے بریف کیس اور اٹیچی کیس اٹھائے اور گلی میں بھاگتا ہوا اندھا دھند آگے نکلتا چلا گیا۔

میں کافی دور جا پہنچا تو ایک لمحے کے لیے رک کر اپنا سانس درست کرنا چاہا مگر جونہی میری نظر ادھر اٹھی جدھر سے میں بھاگ کر آیا تھا تو میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ لالٹینیں اور ٹارچیں ہاتھوں میں لیے میری سمت بھاگ رہے ہیں۔ وہ ابھی تک مایوس نہ ہوئے تھے۔ اور مسلسل میرے تعاقب میں لگے تھے۔ اور پھر اسی لمحے پیچھے گاڑی کی وسل سنائی دی۔ گارڈ نے شاید ہری جھنڈی دکھا دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انجن کی جناتی کھنکار نے اس علاقے کو ہلا کر رکھ دیا۔ گاڑی چل دی تھی مگر وہ لوگ پھر بھی میری طرف دوڑتے چلے آ رہے تھے۔

میں نے فوراً اپنا رخ بدلا اور پہلو کی گلی میں جا گھسا۔ میرا دم بری طرح پھول رہا تھا اور ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ وقت میرا ساتھ دیتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اپنی جان کے لالے پڑے تھے۔ وہ لوگ شاید ہر حال میں ہر قیمت پر مجھے پکڑ لینا چاہتے تھے۔ وہ گلی خاصی طویل تھی۔ میں جب اسے عبور کر کے باہر نکلا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں کچہری روڈ پر جا نکلا ہوں۔

یہ بہت اچھی بات تھی۔ مجھے شہر کی سمت سے ایک ٹیکسی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ اس کے ہارن کی آواز بتاتی تھی کہ ڈرائیور سواری کی تلاش میں ہے۔ میں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے اشارہ کیا تو ڈرائیور نے میرے پاس پہنچ کر بڑے زوردار طریقے سے بریک لگاتے۔ "کہاں جانا ہے بابو جی!" وہ بہت تیزی سے بولا۔ مگر میں جواب دینے کے بجائے دھم سے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ "مجھے چھاؤنی لے چل یار۔ اسی راستے سے مجھے گاڑی پکڑنی ہے۔" وہ راستہ میرا دیکھا بھالا تھا۔

ڈرائیور نے تیزی سے گیئر بدلا اور ہوا کی رفتار سے کچہری کی طرف چل دیا۔ اب میں ان لوگوں کی دسترس سے باہر تھا۔ دم بدم میرے اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جب میں چھاؤنی اسٹیشن پہنچا تو معلوم ہوا کہ گاڑی وہاں سے گزر کر آگے جا چکی ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا تھا مگر میں نے نہایت مایوس لہجے میں کہا۔

"یہ تو بہت ہی برا ہوا یار، مجھے ایک نہایت ضروری کام سے ابھی گجرات پہنچنا ہے اگر تو مجھے لے چلے تو تیری مہربانی ہوگی۔"

"گجرات! پچاس روپے لگیں گے بابو جی!" ڈرائیور نے میری مجبوری بھانپ کر اکڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے منظور ہے بھائی۔ بس مجھے تو سیدھا گجرات لے چل۔"

"ٹھیک ہے بابو جی آپ کے لیے چلتا ہوں رات کا وقت ہے میں ادھر کبھی نہیں جاتا۔ پر آپ کی ضرورت نے مجبور کر دیا ہے۔" وہ مجھ پر اپنا احسان جتانے لگا۔

"بڑی مہربانی ہوگی بھائی۔ اگر دقت ہو تو مجھے بتا دو میں شہر سے دوسری ٹیکسی لے لیتا ہوں میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔"

اس نے ٹیکسی میں لگے آئینے میں میری صورت دیکھی میرے چہرے پر چھائی گمبھیر سنجیدگی پر اس کی نظر پڑی تو اندر سے سکڑنے لگا۔ بولا۔

"نہیں جی! ایسی بھی کیا بات ہے میں ہی آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ٹیکسی کا رخ بڑی سڑک کی طرف موڑا اور رفتار تیز کر دی۔

سردی بہت بڑھ گئی تھی اور ٹیکسی کے شیشے کچھ یوں ہی سے تھے۔ باہر سے ہوا برابر اندر آ رہی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ میرے وجود میں آگ لگی تھی۔ میری چوٹیں آہستہ آہستہ درد کا الاؤ دہکا رہی تھیں۔ وہ چوٹیں جو مسلسل میں سہہ رہا تھا۔ اس [illegible] برداشت کر رہا تھا جس شام میں ماں سے یہ وعدہ کر کے گھر سے [illegible] صبح تک ایک لاکھ روپے ضرور لا دوں گا۔ مجھے اس لمحے [illegible] ہنسی بھی آتی اور رونا بھی۔ میں آوارہ ہواؤں کے تعاقب میں [illegible] کہاں چلا آیا تھا۔ کیا سے کیا بن گیا تھا۔ لگتا تھا وہ قدریں جو [illegible] استادوں نے بڑی محنت سے میرے وجود میں پیدا [illegible] ایک ایک کر کے ٹوٹتی جا رہی تھیں اور اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ

میں کرائے کے قاتل کی حیثیت سے آغو صاحب کے کہنے پر ایک اجنبی کو، ایک ایسے آدمی کو قتل کرنے جا رہا تھا جسے میں نے کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ جس نے میرا کبھی کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ میں ایک بنتے بسنے گھر کو اجاڑنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ جیلانی یہ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ کیوں تو ذلت کی ان گہرائیوں میں دھنستا چلا جا رہا ہے؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

کوئی آواز مجھے مسلسل متنبہ کیے جاتی تھی۔ وہ آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی جا رہی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ میرا ارادہ متزلزل ہونے لگا۔ ٹیکسی بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اور میں اس سوچ میں گم تھا کہ آخر اس ہادی علی کو قتل کر دینے کا وعدہ میں نے کیسے کر لیا۔ پھر اچانک میرے تخیل کے پردوں پر ایک چہرہ ابھرا، ایک اونچی لمبی خوبصورت شہتوت کی شہنی جیسی لچکیلی بانہوں والی الھڑ الھڑ لڑکی کا سراپا میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ اس کے چہرے پر اندھی کالی سوچوں نے ان گنت لکیریں ڈال رکھی تھیں۔ وہ موت سے پہلے مرتی جا رہی تھی۔ پلو پلو کٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔ اس کی آنکھوں کی چمک پر تقدیر کی سیاہی غالب آتی جا رہی تھی۔ وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے لہو روتی تھی۔ وہ میری بہن آسیہ تھی جسے میں نے اپنی ہی بے تدبیریوں کے تیز خنجر سے ذبح کر ڈالا تھا۔ اور اب وہ مایوسی کی چیلوں کوؤں... کی غذا بنتی جا رہی تھی۔

آسیہ کا وہ دھواں دھواں چہرہ میرے تصور میں ابھرا تو میں لرز اٹھا۔ میرا سارا بدن غصے سے پھنکنے لگا۔ میں نے سوچا کہ اگر ایک ہادی علی کا سر اتار لینے سے میری بہن کے سامنے سے سلاخیں کٹ کر نیچے گر سکتی ہیں تو یہ سودا ہرگز مہنگا نہیں ہے۔ مجھے اس کے لیے اگر سارے جہان کو مارنا پڑے تو مار دوں گا کہ اس سے زیادہ اہمیت میں نے آج تک کسی کو نہیں دی۔

میری سوچیں مسلسل میرے تعاقب میں تھیں۔ ڈرائیور بار بار ٹیکسی کے اندر لگے آئینے میں نظر ڈالتا تھا جب بھی کسی کھمبے کی روشنی ٹیکسی میں پڑتی وہ آئینے میں ضرور جھانکتا۔ اس کے چہرے پر میں نے بار بار عجیب سا تحیر ابھرتے دیکھا، تو میں نے محسوس کیا جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی پھر بھی مجھے یہ اطمینان تھا کہ وہ چار پہیوں پر بیٹھا ہے اور میری زد میں ہے۔ بھرا ہوا سائلنسر لگا پستول میری پیٹی سے بندھا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور آئینے کے رخ سے ہٹ کر دوسری طرف جا بیٹھا۔

گاڑی راہوالی سے آگے نکلی تو مجھے محسوس ہوا کہ ڈرائیور کی تردد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس نے بھی سگریٹ سلگا لیا۔ ایک اچٹتی سی نظر اس نے مجھ پر ڈالی اور پھر سیٹ پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسٹیئرنگ پر اس کی گرفت مضبوط نہیں رہی تھی۔ اور مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ وہ کسی اہم

فیصلے کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بجری سے لدے دو تین ٹرک تو ہمارے قریب سے یوں گزرے تھے کہ اگر ڈرائیور فوراً ہی سنبھل نہ جاتا ہم فوراً ہی تتر بتر ہو گئے ہوتے۔

"کیا بات ہے استاد! خیر تو ہے!" میں نے لہجے میں خاصی لٹک لچک پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

"خیر ہی ہے باؤ جی۔ بالکل خیر ہے۔"

"تمہاری نظر چوک رہی ہے استاد! تمہاری نظریں پیچھے ہیں، اور کان آگے ہیں۔"

"نہیں باؤ جی ایسی تو کوئی بات نہیں۔ یہ جو بجری کے ٹرک چلاتے ہیں ان سے تو بس اللہ ہی بچائے آدمی کا منٹوں میں قیمہ بنا دیتے ہیں۔"

"میں بھی بجری کا ٹرک ہوں استاد! نظر سیدھی رکھ اور تیرے دماغ میں جو کیڑا خارش کر رہا ہے نا اسے نیچے لے جا اپنی سیٹ کے نیچے تاکہ تو پھر کہیں جھٹکی نہ کھا جائے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں باؤ جی! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں میں تو سمجھا تھا آپ بڑے پڑھے لکھے تمیز دار آدمی ہیں۔" وہ بدمزہ ہونے لگا۔

"تو اب کیا خیال ہے تیرا میرے بارے میں؟" میں نے ایک بار پھر خالص لفنڈری لہجے میں بات کی۔ وہ شپٹا گیا۔ ایک نظر پیچھے ڈالتا ہوا بولا

"باؤ جی! منا نہیں اپنے سیانوں نے کہا ہے کہ ستھری زبان ستھرا آدمی گندی لتری گندی گدڑی۔"

"اے لفافہ نہ دکھا مجھے بھائی ڈرائیور! یہ بتا، تو بار بار مجھے گھور گھور کیوں دیکھتا چلا آ رہا ہے۔ کیا لکھا ہے میرے منہ پر؟" میں نے اسے تپانے کے لیے چھیڑا۔ میرا خیال تھا وہ بھڑک کر اپنے خدشے اگل دے گا۔ مگر وہ بہت گھنا ثابت ہوا۔ سب کچھ اندر ہی اندر دبا کر مسکرا دیا اور پینترا بدل کر بڑی دھیرج اور مٹھاس سے بولا۔

"میرے بادشاہ! میں... میں دراصل سوچ رہا تھا کہ اللہ نے کیسے کیسے سوہنے جوان پیدا کر رکھے ہیں۔ آپ بہت دیدہ زیب آدمی ہیں سرکار! بس اسی لیے میں آپ کو بار بار دیکھ رہا تھا۔"

میری طبیعت کا سارا تکدر دور ہو گیا۔ اس کے ایک ہی لوچدار فقرے نے ساری فضا خوشگوار بنا دی اور میرے تمام خدشے اس کے بارے میں آپ ہی آپ صاف ہو گئے۔

"اچھا، تو یہ بات ہے۔ کیا نام ہے تیرا؟"

"میرا نام شکیل احمد ہے سرکار! مگر نام کا ہی شکیل ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ٹیکسی کی رفتار ایک دم تیز کر دی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے پچاس پچپن پر لے گیا۔

"کیا کرتے ہو یار! کہیں مروا نہ دینا۔"

"بے فکر رہیں میرے بادشاہ! مجھے کہیں بھی تو آنا ہے۔" وہ ایک دم بہت جوش میں آ گیا۔ میں اسے ابھی تک نہ سمجھ سکا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں اس کو کالر سے پکڑ کر پیچھے کھینچوں اور سمجھاؤں کہ خواہ مخواہ نہ چلا اپنی اس خالہ کو مگر پھر میں نے سوچا کہ ٹھیک ہے جتنی تیز وہ گاڑی چلائے گا اتنی جلدی میں منزل پر پہنچ جاؤں گا۔ اس وقت تک رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اور مجھے اس ڈرائیور سے جو بے تکی کا کھیل کھیلنے ... الجھن ہونے لگی تھی۔ میرے تصور میں وہ دو ٹرنک ابھر آئے تھے جن میں ایک سربریدہ لاش ٹکڑوں میں بٹی رکھی تھی اور میں یہ سوچنے لگا تھا کہ اس پراسی صاف ستھرے دھلے دھلائے خنزیر نے خنجر چلایا ہو گا جو ان ٹرنکوں کو گاڑی میں ڈال کر واپس چلا گیا تھا۔ دیکھنے میں کتنا مہذب اور معزز آدمی نظر آتا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ وہ کوئی نواب زادہ ہے کیونکہ عمدہ بات کرتا تھا وہ۔ اس کا لہجہ اتنا اعلیٰ تھا کہ مجھے اپنی جگہ اپنے ... اور اکھڑ لہجے پر شرمساری محسوس ہوتی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ سفر میں میرے ساتھ ہو گا تو وقت بہت اچھا گزرے گا۔ مگر وہ ٹرنک وہاں دھر کر ایسا غائب ہوا کہ پھر اس خبیث نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ اس نے کس دل سے اس خوبرو عورت کو موت کے گھاٹ اتارا ہو گا۔ اس نے ایسی صفائی سے اس کے ٹکڑے کیے کہ قصائی بھی اتنی مہارت نہ دکھا سکتا ہو گا۔ تصور میں اس حسین عورت کا بدن ابھرا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیسے کیسے شیطان صفت لوگ پڑے ہیں اس دنیا میں۔ میں نے دل میں عہد کیا کہ اگر زندگی کے کسی موڑ پر مجھے مل گیا تو میں اسے ایسے ہی عبرتناک مراحل سے گزاروں گا۔ جن سے اس نے اس بے بس سی اور کمزور مہ جبیں کو گزارا تھا۔ میں یہی سمجھتا تھا کہ وہ مہ جبیں ہو گی۔ کندھوں پر ایسا چہرہ ... ہو گی جو ماحول کو منور کر دیتا ہو گا۔ جس کے بالوں کی تابناک سیاہی ... کی اس رات کو بھی مات کرتی ہو گی جس میں لاکھوں جگنو جابجا چمکتے ہیں مگر اس ناسپاس گنہگار درندہ صفت انسان نے اسے موت کے مراحل سے یوں گزار دیا۔ جیسے وہ بیچاری ہر احساس سے عاری ... مجھے جانوری سی آنے لگی۔ میرا دماغ بری طرح چکرانے لگا تھا۔

گاڑی گھڑے سے نکل کر آگے بڑھ رہی تھی اور اس کی رفتار میں ڈرائیور نے خاصا اضافہ کر دیا تھا۔ ریل گاڑی بھی اس نے دھوئیں کے قریب جا کر پیچھے چھوڑ دی۔

"ابے اتنی بھی کیا جلدی ہے تجھے میرے یار شکیل احمد! ... میں یہیں اتر جاتا ہوں میرے بھائی مگر اتنی تیزی سے تو مجھے موت کے منہ میں مت ڈال۔ کیا خیال ہے بھائی تیرا تو بیمہ ہو چکا ہو گا۔"

"بیمہ تو کمزور دل کرواتے ہیں بادشاہ! مرد کو اور شیر کو ... فکر نہیں ہونی چاہیے۔"

بڑا دبنگ اور جما ہوا لہجہ تھا اس کا۔ مجھے یوں لگا جیسے ... بات نے اسے بے پناہ حوصلہ دے دیا ہے اور وہ نئی سی جوانی ... کو مجلا سا ثابت کر رہی تھی۔ اس وقت جب وہ گوجرانوالہ سے ...

اب غائب ہو چکی تھی۔ وہ کسی قطعی فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

"تو اس کی رفتار کم نہیں کرے گا بھتیجے۔" اب کی بار میں نے بڑے رعب سے کہا۔ وہ اتنے خوفناک انداز سے گاڑی چلا رہا تھا کہ ہر قدم پر مجھے کسی مہیب حادثے کا دھڑکا لگا تھا۔

"گھبرائیں نہیں باؤ جی! کوئی عورتیں تو نہیں بیٹھی ہیں اندر۔"

وہ نہایت سنجیدگی سے بولا۔ نگاہیں اس کی سامنے سڑک پر جمی تھیں اور زبان کو بھی کبھی چابک کی طرح استعمال کرنے کا گر وہ خوب جانتا تھا۔

اب ہم وزیر آباد کے نواح میں پہنچ چکے تھے مگر اس نے رفتار پھر بھی مدھم نہ کی۔ بسوں کے اڈے کے سامنے سے بھی وہ زن سے گزر گیا۔ اس کے چہرے پر عجلت کی آندھی کے سوا مجھے اور کوئی شے نظر نہیں آتی تھی۔ یا تو وہ مجھ سے خوفزدہ ہو گیا تھا اور چاہتا تھا کہ مجھے میری منزل پر گرا کر الٹے قدموں واپس ہو جائے یا پھر وہ وقت کی قدر و قیمت پہچانتا تھا۔ اس کے سوا تو کوئی اور بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

بسوں کے اڈے کے سامنے سے گزر کر اس نے ریلوے لائن کے اوپر بنے پل کو عبور کیا۔ اور پھر کچھ ہی دور جا کر اس نے گاڑی کو بائیں ہاتھ کچھ اتنی تیزی سے موڑا کہ میں حیران رہ گیا۔ میرے سامنے "ریلوے پولیس تھانہ" کا بورڈ تھا۔ وہاں دروازے پر ایک مسلح سپاہی کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میرا دماغ سن ہو کر رہ گیا۔ وہ بدمعاش مجھے گرفتار کرانے کے لیے سیدھا تھانے لے گیا تھا۔ پیشتر اس کے کہ وہ دروازہ کھول سکتا، یا وہ سپاہی کچھ سمجھ سکتا، میں نے اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر تیزی سے اس کی رگ مل دی۔ وہ فوراً ہی بائیں ہاتھ جھول گیا۔ ٹیکسی میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے سپاہی کو فوراً ہی کچھ نظر نہ آ سکا۔

پھر بھی وہ متجسس نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ یہ بڑا خوفناک لمحہ تھا۔ میں پاگلوں کی طرح ٹیکسی سے اترا اور اگلا دروازہ کھولنے لگا۔

"کیا ہوا باؤ جی! خیر تو ہے؟" سپاہی نے میرے پاس آ کر اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

"ڈرائیور کو شاید ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔ ایک دم اس نے گاڑی روکی ہے اور الٹ گیا ہے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا کر ڈرائیور کو سنبھال کر دوسری سیٹ پر اوندھا ڈال دیا۔

"یہاں کوئی ہسپتال ہے جناب! کوئی ڈاکٹر مل سکے گا اس وقت؟ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا۔ نبض تو اس کی چل رہی ہے۔" میں نے ڈرائیور کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

سپاہی میری بات پر اعتبار کر گیا۔ اس نے بھی ڈرائیور کی نبض ... پھر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ادھر سول ہسپتال ہی لے جائیں جناب اسے۔ بدبخت پتہ نہیں کیسے کیسے نشے کرتے ہیں یہ ڈرائیور لوگ۔"

"اسے فوری علاج کی ضرورت ہے خدا کرے ڈاکٹر مل جائے۔" میں نے ٹیکسی میں بیٹھ کر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

"ہسپتال کس طرف ہو گا جناب!"

"وہ ادھر پھاٹک کی طرف سے جائیں اور پل کے نیچے سے گاڑی گزاریں۔ پھر کسی سے پوچھ لیں۔" سپاہی نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے فوراً ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اور وہاں سے اسی وقت آگے نکل گیا۔ سپاہی کا خیال ہو گا کہ میں دائیں ہاتھ شہر کی طرف مڑوں گا مگر وہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ مجھے کسی ہسپتال یا ڈاکٹر کی کیا ضرورت تھی۔ میں پلکھو کے پل پر سے گزرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

میں اس بچھو کے ڈنک سے بال بال بچا تھا ورنہ اس نے تو مجھے سولی پر چڑھوا ہی دیا تھا۔ اس کے تیور تو مجھے بہت پہلے یہ بتا چکے تھے کہ اس کے دل و دماغ میں زبردست جنگ جاری ہے مگر اس نے اشارۃً بھی مجھے یہ نہیں سمجھایا تھا کہ وہ مجھے پہچان گیا ہے۔ بڑی ڈھٹائی سے وہ میرے ساتھ ترکی بہ ترکی مکالمہ بازی کرتا آیا تھا اور اپنی باتوں سے وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے اس سے زیادہ بڑا عقلمند مہذب اور نرم مرد کبھی پیدا ہی نہیں ہوا مگر وہ سالا مجھے سیدھا تھانے کے دروازے پر لے گیا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ اس سپاہی کی عقل گھاس چرنے گئی ہوئی تھی اور اس گرامی قدر نے تو یہ تک دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ کہیں میں نے اس کو گولی تو نہیں مار دی۔ ورنہ تو پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس لمحے میری وہ بلا کی اداکاری میرے کام آ گئی۔ میں جس افراتفری اور سراسیمگی کو چہرے پر سجائے گاڑی سے اترا تھا۔ وہ سپاہی کو فریب دینے میں میرے بہت کام آئی۔ اور اگر وہ دیکھ بھی لیتا۔ اس شکیل کا طبی معائنہ بھی وہ اس گھڑی کروا لیتا تو بھی وہ سب لوگ اسی نتیجے پر پہنچتے کہ ڈرائیور اچانک بے ہوش ہو گیا ہے۔ اور اس کی بے ہوشی اس کے کسی اندرونی پرزے کی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ مگر وہ سالا مجھے گرجا میں گھونسا مارنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بہت بری طرح الجھا دیا تھا۔

میں گاڑی کو پچاس ساٹھ کی اسپیڈ پر دوڑاتا ہوا چناب کے پل پر سے گزر گیا۔ دونوں طرف کے سنتری ذرا دیر کے لیے چونکے مگر میں نے گاڑی کے اندر کی بتیاں روشن کر دیں کہ لو دیکھ لو۔ میں سادھو ہوں چور نہیں ہوں۔ میرا حلیہ اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ ایک نفرت تھی جو میرے انگ انگ سے شعلوں کی طرح باہر کو لپکتی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ جو کوئی بھی ملے اس کے کندھوں سے سر اتار دوں۔ یہ جو گھات میں بیٹھا آدمی آدمی کا شکار کھیلتا ہے اور چہرے پر پارسائی سجائے پھرتا ہے میرے لیے ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس گھامڑ شکیل کا میں نے کیا بگاڑا تھا۔ میں تو اس بدبخت کو کرایہ پورا ہی دے کر اترتا پھر بھی یہ مجھے باندھ کر

پولیس والوں کے پاس لے چلا تھا۔ وہ تو ساری رات مار مار کر میری چمڑی ادھیڑ دیتے اور پھر پوچھتے کہ ہاں میاں جیلانی یہ تمہاری ہی تصویر ہے نا بیٹے جو اخبار میں چھپی ہے اور جس کی نقل ہر تھانے میں پہنچا دی گئی ہے۔

میں گجرات شہر میں ٹھہرنے کے بجائے سیدھا کنجاہ کی طرف چل دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو پرندے کی اڑان پر چلیں تو گجرات سے چھ میل دور ہے مگر سڑک کے راستے وہ قصبہ گجرات سے چودہ میل کے فاصلے پر ہے۔ رات آدھی گزر چکی تھی مجھے صحیح اندازہ نہیں تھا کہ میں ابھی گجرات سے کتنی دور آ چکا ہوں۔ سڑک بالکل سنسان تھی، اتنی سنسان کہ اس جیسا سناٹا میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا تھا۔ سردی اپنے عروج پر تھی۔ اور ادو گرد کھیتوں پر دھند نے چادریں سی تان رکھی تھیں۔ سڑک بھی دھند کی لپیٹ میں سہمی ہوئی نظر آتی تھی اور میں اس سمت بڑھ رہا تھا جدھر سرخی تھی؛ خون تھا، قتل و غارت گری تھی اور میں نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ وہ سب کچھ میرے لیے لوحِ محفوظ پر کندہ ہے یا اب میں اپنے ہاتھوں سے اپنے نامۂ اعمال میں آپ ہی آپ زندگی کو سناٹوں کی زد میں پھینکتا جا رہا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ مجھے قدم قدم پر بدترین حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

میں آغو صاحب کے ہاں سے رات کا کھانا کھا کر نکلا تھا مگر پھر بھی اس وقت مجھے یہی محسوس ہوتا تھا کہ میں بھوکا ہوں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ جب میں بہت زیادہ غم زدہ ہوتا ہوں جب کوئی بات میرے وجود کو لرزا کر رکھ دیتی ہے تو میرا حال اس بچے کا سا ہو جاتا ہے جو نڈھال ہو کر دودھ کی آرزو کرتا ہے یا پھر ٹوٹ پھوٹ کر نیند کی آغوش میں جا گرتا ہے۔ مجھ پر بھی لبا اوقات ایسی ہی کیفیت طاری ہوتی رہی ہے۔ اور اس وقت بھی میرا یہی جی چاہتا تھا کہ میرے سامنے ڈھیر سارا کھانا رکھا ہو اور میں اس پر دونوں ہاتھوں سے پل پڑوں۔ مگر میں سفر میں تھا، ایسے سفر میں جس کی کوئی منزل ہی متعین نہ ہو اور وہ جرکنا ڈرائیور میرے ساتھ والی سیٹ پر آڑا ترچھا یوں پڑا تھا جیسے اس پر موت وارد ہوئے مدتیں گزر چکی ہیں۔

اچانک مجھے اپنے سامنے سڑک پر چار آدمی کھڑے نظر آئے۔ وہ تیزی سے ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ جیپ کی تیز روشنی ان کے چہروں پر پڑی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ خاصے کڑیل جوان تھے۔ انہوں نے سردی سے بچنے کے لیے کھیسوں کی بُکل مار رکھی تھی۔ میں سمجھا وہ راہزن ہیں اور یونہی رات کے وقت اکیلے دکیلے مسافروں کو اڑنگا دے کر لوٹ لینے کا کاروبار کرتے ہیں۔ میں نے چاہا کہ گاڑی کی رفتار تیز کر کے ان کو کچلتا ہوا گزر جاؤں کیونکہ اپنی قسمت کے "یاور" ہونے کا مجھے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔ تقدیر نے میری راہ میں ہمیشہ گوکھرو ہی بچھائے تھے۔ ایسے نوکیلے، سخت اور جان لیوا گوکھرو کہ ان پر چل کر میری ساری زندگی لہولہان ہوئی جاتی تھی میری بھی، اور میری بہن آسیہ کی بھی۔

میں نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی مگر جب میں ان کے قریب سے گزرا اور وہ پریشان ہو کر ایک طرف ہٹ گئے تو میں نے دیکھا سڑک کے کنارے ایک چارپائی رکھی ہے جس پر کوئی آدمی لیٹا کراہ رہا تھا۔ اس کے اوپر انہوں نے لحاف ڈال رکھا تھا۔ وہ آدمی بہت بیمار دکھائی دیتا تھا۔ میں نے وہ چارپائی دیکھی تو ان لوگوں سے [illegible] دور جا کر گاڑی روک لی اور دونوں پستولوں پر جیبوں کے اندر ہاتھ ڈال کر باہر نکل آیا۔ مجھے گاڑی سے اترتا دیکھ کر وہ [illegible] میری طرف بڑھے اور یک زبان ہو کر بولے۔

"باؤ جی خدا کے لیے ہماری مدد کرو۔ ہمارا باپ بہت سخت بیمار ہے۔"

"اوہ" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"کیا تکلیف ہے اسے؟" میں نے سگریٹ سلگا کر [illegible] اطمینان سے پوچھا۔ ان چاروں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔

"پتہ نہیں باؤ جی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اسے دو خون کی الٹیاں آئی ہیں پیٹ میں درد ہے۔ اس کا بہت برا حال ہے باؤ جی [illegible] اسے گجرات ہسپتال پہنچا دو۔"

"مگر میں تو... میں تو واپس نہیں جا سکتا۔"

"باؤ جی آپ فکر نہ کریں۔ میں گاڑی چلا سکتا ہوں۔ آپ کا زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ لگے گا۔ میں آپ کو واپس جہاں [illegible] چھوڑ دوں گا۔ میں خود آپ کی خدمت کروں گا۔" ایک جوان نے [illegible] دلگیر لہجے میں کہا۔ وہ کوئی پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا اور [illegible] بیماری نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ میرے سارے اندیشے آپ ہی آپ ختم ہو گئے۔

"یہاں سے کنجاہ کتنی دور ہے؟"

"بس جی یہی کوئی چھ سات میل ہو گا۔"

"ادھر کوئی ہسپتال نہیں ہے؟"

"ادھر ہی لے چلیں باؤ جی! آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے اپنے مریض کو اندر ڈالو۔ مگر اس کے ساتھ [illegible] بیٹھ سکیں گے۔ چار کے لیے جگہ نہ ہو گی۔"

"ہم پیدل آ جائیں گے باؤ جی! آپ انہیں لے جائیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ڈالو بابا جی کو گاڑی میں۔" میں نے [illegible] سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے پچھلی سیٹ پر جلدی [illegible] کو بٹھایا اور خود بھی اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئے۔

"بشیر تم پیدل آ جاؤ۔ ہم ادھر ہسپتال میں [illegible] کی دکان پر پہنچ جانا۔ صبح میں لے آ بتا دوں گا۔" ایک [illegible] کھڑے دو جوانوں کو ہدایات دیں۔ وہ سب کے سب [illegible]

ہوئے تھے۔ میں نے گاڑی چلا دی۔

"یہ... یہ کون ہیں بابو جی؟" ایک آدمی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ گاڑی کا ڈرائیور ہے۔ یہ بھی بیمار ہے اور بیہوش ہو چکا ہے۔"

"اچھا جی! کمال ہے۔ ہم تو سمجھے کہ..." وہ آدمی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا سمجھے تھے تم؟"

"ہم سمجھے تھے شاید یہ بالکل مر چکا ہے۔" "چلو اس کا بھی ادھر علاج ہو جائیگا۔ ایک سگرٹ دیں گے باؤ جی آپ مجھے؟"

"یار قادر بڑا ہی کمینہ ہے تو!" اس کے ساتھی نے کہا۔

"اوئے یہ بھی تو حقہ ہی ہوتا ہے نا۔ باری لگا لینے میں کیا حرج ہے۔ حقے والوں کی ایک اپنی ہی برادری ہوتی ہے۔ صادق بھائی تو پیتا نہیں ہے اس لیے بک بک کرتا رہتا ہے۔ دیں گے باؤ ایک سگریٹ؟" اس کا نام قادر تھا اور بڑا ہی سادہ لوح قسم کا آدمی نظر آتا تھا۔ میں نے اسے سگریٹ دیا تو وہ خوش ہو گیا۔ گہرے گہرے کش لیتا ہوا بولا۔

"لطف آ گیا ہے باؤ جی! بڑا خوشبودار سگرٹ ہے آپ کا بہت مہنگا ملتا ہو گا جی۔"

"ہاں۔ مگر حقے سے زیادہ مزیدار نہ ہو گا۔"

"ہاں جی حقے کی کیا بات ہے وہ تو اللہ کی رحمت ہوتا ہے۔ میرے میاں جی بھی کہا کرتے ہیں۔ میاں جی اب کیا حال ہے؟" اس نے بوڑھے کی طرف متوجہ ہو کے کہا۔ بوڑھا آنکھیں بند کیے خرخر سانس لے رہا تھا اور ٹھہر ٹھہر کر آہ کرتا تھا۔ وہ خاصا لمبے تڑنگے جسم کا آدمی تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اسے اچانک ہی بیماری نے ڈھا دیا ہے۔

میں انہیں دو میل آگے لے آیا تو صادق بولا۔

"اوئے قادرا! بیڑہ غرق وہ پیسے تو ادھر بشیر کے پاس ہی رہ گئے۔"

"دُر فٹے منہ تیرا۔ پڑھ لکھ کر گنوا دیا تو نے، اوئے میں نہ کہتا تھا کہ روپے تو خود جیب میں رکھ لے۔ اب وہاں جا کر تو ادھر گنگ ہو جائے گا۔ چلا ہے میاں جی کا علاج کرانے۔ دوا کہاں سے خریدے گا تو کیا کرے گا وہاں۔"

"یار وہ آتے ہی ہوں گے پیچھے۔ کوئی بات نہیں ہسپتال کا ڈاکٹر دوا دے دیگا۔" پھر سرگوشی میں بولا "پیسے ہی کتنے ہیں ان کے پاس کل ساٹھ روپے اس سے کیا ہو گا۔"

"ہو گا کیوں نہیں۔ ساٹھ روپے تیرے لیے کوئی چیز ہی نہیں۔ پتہ ہے وہاں کیا ہوتا ہے۔ وہ تو پانی بھی مفت نہیں پلاتے۔ بیڑہ غرق کرا لیا ہے تو نے۔ باؤ جی! گاڑی واپس نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔"

"چلو قصہ ہی ختم ہوا۔ اپنے اس میاں جی کو بھی اسی وقت بیمار ہونا تھا۔ کبھی کوئی ٹیم دیکھو کوئی وقت ویلا، کوئی حالات شلات دیکھو پھر بیمار پڑو۔ پتہ نہیں اس کھسکنی میں کیا مصیبت تھی۔" قادر سخت سٹپٹا گیا تھا۔

"وہ بڑی زہریلی گھنٹی تھی قادر! شکر کرو میاں ابھی تک جی رہا ہے ورنہ وہ تو اندر پھاڑ کر رکھ دیتی ہے آدمی کا۔"

"پر اسے دوا کہاں سے ملے گی اب؟"

"مل جائے گی دوا بھائی مل جائے گی فکر نہ کر۔" میں نے اس کی باتوں سے محظوظ ہو کر کہا۔

"اچھا جی باؤ جی! اگر آپ کہتے ہیں تو پھر ضرور ہی مل جائے گی دوا۔ بھلا آپ کے آگے کیا چیز مشکل ہے؟" پھر وہ اپنے باپ کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

"اوئے میاں بار بار کنوتیاں کیوں ہل رہا ہے۔ ٹھیک سے بیٹھا رہ میرے یار۔" قادر نے ذرا پیچھے سرکتے ہوئے کہا۔ انہوں نے خود سکڑ کر بوڑھے کے لیے جگہ بنائی اور اس کو زیادہ آرام سے بٹھا کر اس کے کندھے دبانے لگے۔

کنجاہ پہنچ کر میں انہیں سیدھا ہسپتال لے گیا اور اس کے سامنے گاڑی کھڑی کر دی۔

"اب ان دونوں کو اتارو۔ پہلے اپنے میاں کو اندر پہنچاؤ پھر اسے بھی اتار دو۔"

وہ دونوں گاڑی سے نکلے اور اپنے میاں جی کو ہاتھوں پر اٹھا کر ہسپتال کے اندر لے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بھاگتے ہوئے واپس آئے۔ "وہ جی ڈاکٹر شاکٹر تو وہاں کوئی نہیں ہے۔ ایک کمپوڈر سا وہاں بیٹھا ہے اور دو نرسیں ہیں وہ بھی اندر سوئی ہوئی ہیں۔"

"چلو اسے بھی اندر لے چلو۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے گاڑی سے اتر کر کہا۔

انہوں نے گاڑی سے ڈرائیور کو کھینچ کر باہر نکالا اور ہاتھوں پر اٹھا کر ہسپتال میں لے گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے تھا۔ ہسپتال ویران پڑا تھا۔ کچھ بھی تو نظر نہیں آتا تھا وہاں۔

میں ادھر زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں نے قادر کو اشارے سے باہر آنے کے لیے کہا۔ وہ تجسس کا مارا تیز تیز قدم اٹھاتا میرے ساتھ برآمدے میں آیا۔

"دیکھ قادر! تو ابھی ادھر جا کر ڈاکٹر کو جگا دے۔ یہ لے دو ہزار روپیہ۔ وہ جتنی فیس مانگے اسے دے دینا۔"

"دو ہزار؟ مگر باؤ جی۔"

"اوئے زیادہ باتیں نہ کر۔ لے یہ پکڑ۔ اس آدمی کا بھی علاج کرا دے۔"

یہ بھی بہت بچا ہے مگر دیکھ اسے بالکل یہ نہ بتانا کہ تو اس کے ساتھ اس ٹیکسی میں یہاں آیا ہے۔"

"کیوں باؤ جی؟"

"وہ آتا نہیں تھا۔ نخرے کرتا تھا۔ میں اسے زبردستی لایا تھا سمجھے؟ بالکل اسے کچھ نہ بتانا۔ وہ خود ہی سالا اٹھ کر گاڑی دے جائیگا سمجھا کہ نہیں۔ میں اب جا رہا ہوں۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے باؤ جی۔ یہ اچھے لوگ نہیں ہوتے ہیں یہ ڈرائیور ٹیکسی کی حیثیت کو سمجھتے ہی نہیں۔ پر آپ فکر نہ کریں۔ میں اس گل بھیڑیے کو کچھ نہیں بتاؤنگا۔ پر جی یہ رقم۔"

"اب تو میرا بھائی ہے سمجھا کہ نہیں۔ تیری باتیں مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ بس اسی لیے یہ تجھے دے رہا ہوں میاں جی میرے بھی بزرگوں کی طرح ہیں۔ بس موج کر اب۔ اچھا خدا حافظ۔"

یہ کہکر میں نے اس کے کندھے تھپتھپائے اور ٹیکسی میں سے بریف کیس اور اٹیچی کیس نکال کر شہر کی طرف چل دیا۔ قادر کی حیرت دیدنی تھی وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی آسمانی مخلوق سمجھ رہا ہو۔

ایسا پاگل اس نے کہاں دیکھا ہوگا جو لاد دے لاد دے اور لادنے والے کا ساتھ دے۔ کنجاہ میں میرا ایک بہت پرانا آشنا رہتا تھا ان دنوں اس کا نام رحیم داد تھا کسی زمانے میں وہ میرے ساتھ لاہور میں پڑھا کرتا تھا۔ اس وقت میں دسویں میں تھا۔ دو سال تک ہمارا ساتھ رہا جس کے دوران اس نے دو بار مجھے اپنا گھر دکھایا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں ادھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے رات کا باقی حصہ اس کے گھر میں گزار لیتا ہوں میرے جیسے پریشان حال آدمی کے لیے ایسے وقت میں اس کے گھر سے زیادہ بہتر پناہ کہاں مل سکتی تھی۔

راستہ مجھے معلوم تھا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیدھا اس گلی میں جا پہنچا جہاں رحیم داد سکونت پذیر تھا۔ اس سے میری ملاقات ہوئے بہت عرصہ گزر چکا تھا پھر بھی میرا خیال تھا کہ اگر گھر میں موجود ہوا تو مجھے دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوگا۔ اس کا باپ بھی مجھے جانتا تھا اور مجھ سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتا تھا۔

گلی میں روشنی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ خاصی چوڑی گلی تھی، اتنی چوڑی کہ اس میں سے ٹرک بھی آسانی سے گزر سکتا تھا۔ میں تاروں کی دم توڑتی اداس ویران اور موہوم روشنی کے سہارے آگے بڑھتا رہا۔ اور پھر میری یادداشت کے چراغ پوری آب و تاب سے جل اٹھے۔ میں ایک دروازے کو پہچان کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ چار سُو لحد ایسی خاموشی طاری تھی۔ حد یہ تھی کہ رات کے اس حصے میں سردی نے زندگی کو اتنا شل کر دیا تھا کہ مجھے راستے میں کوئی کتا بھی نظر نہیں آیا تھا۔ حالانکہ ان کو بستیوں میں رات کو جاگنے اور بھونکنے کا فرض قدرت نے سونپ رکھا ہے۔ مگر اس رات کے اس ہولناک لمحے میں وہ بھی کہیں کہیں شاید اپنی ٹانگوں میں سر دیئے سمٹ سکڑ کر بے خبر لیٹے تھے۔

میں نے دروازے کو اس کی پرانی ہیئت کے کسی خاص نقطے سے پہچانا۔ پھر بھی اپنی تسلی کے لیے میں نے ماچس جلا کر اچھی طرح اپنا اطمینان کرنے کے بعد دستک دی۔

چوتھی دستک پر اندر سے کسی عورت کی خاصے فاصلے پر سے لرزاں آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟" وہ کمرے سے نکل کر شاید صحن میں آ گئی تھی۔ اور اب گھر کے بڑے دروازے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس کی خوف میں لتھڑی ہوئی آواز اور بے بسی سے بھرپور لہجے نے مجھے حیران کر دیا۔ گھروں میں مکین بستی بستی پرسکون عورتوں کو ایک ہلکی سی غیر معمولی دستک پر یوں حواس باختہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

میں دروازے کے ساتھ جڑ کر کھڑا ہو گیا۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ ذرا بلند آواز سے بولی۔ "کون ہے؟"

"میں رحیم داد صاحب سے ملنا چاہتا ہوں بی بی۔ میرا نام غلام جیلانی ہے۔ میں لاہور سے آیا ہوں۔" میں نے اپنی آواز کو دبا کر کہا۔ میں چاہتا تھا کہ میری آواز کسی اور کان تک نہ پہنچے۔ میں وہاں [illegible] تک جاتا تو.... تھا مگر میں اپنے آپ ہی کی وجہ سے خائف تھا۔ ہر جگہ مجھے اپنی شناخت کو بہت احتیاط سے ظاہر کرنے کی ضرورت تھی۔ اخبارات میں چھپی تصویروں نے مجھے زندہ درگور کر رکھا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے کے ساتھ آ ٹھہری۔ اب میرے اور اس کے درمیان لکڑی کے تختے ہی حائل رہ گئے تھے [illegible] تقریباً معدوم ہو چکا تھا۔ وہ پاؤں میں سخت ایڑی کا جوتا پہنے تھی جس کی ٹھک ٹھک اس کے قدموں کی آہٹ کا پتہ دیتی جا رہی تھی۔

"رحیم داد تو یہاں نہیں رہتا۔ آپ ان کے کوئی عزیز ہیں؟" اس کے لہجے کا ارتعاش اب بھی اس کے دل کی بے ترتیب اور نامعلوم دھڑکنوں کا پتہ دیتا تھا۔

"جی ہاں۔ مجھے ان کا عزیز ہی سمجھیں۔ ہم دونوں اصل ایک ہی جگہ پڑھتے رہے ہیں۔ ان کے والد عمر داد بھی مجھے جانتے ہیں۔" میں نے دبے لہجے میں کہا۔ وہ کچھ دیر کے لیے چپ رہی اور پھر بولی۔

"آپ ذرا دیر کے لیے ٹھہریں۔ میں ابھی پتہ کر کے آپ کو بتاتی ہوں کہ وہ آج کل کہاں رہتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے پیچھے ہوئی اور ٹھک ٹھک چلتی ہوئی [illegible] میں دروازے سے ہٹ کر گلی کے وسط میں جا کھڑا ہوا۔ چاند آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا اور اس کی روشنی گرد و پیش کو منور کر رہی تھی یکایک ٹارچ کی تیز روشنی میرے چہرے پر پڑی۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ کوئی شخص اس مکان کی منڈیر پر کھڑا میرے چہرے پر روشنی ڈال رہا تھا۔ میں نے ادھر ذرا غور سے دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ …

کسی عورت کے ہاتھ میں ہے جو سرخ چادر اوڑھے ہوئے چھت کی منڈیر پر کھڑی ہے۔ اس نے مجھے سر سے پیر تک ٹارچ کی روشنی میں سے گزارا پھر دور دور تک ہر شے پر نظر ڈالنے کے بعد اس نے ٹارچ بجھائی اور منڈیر پر سے غائب ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ صرف مجھے دیکھنے اور اچھی طرح جانچنے کے لیے چھت پر چڑھی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ شدید بدگمانی کا شکار تھی اور انجانے خدشوں نے اسے پریشان کر رکھا تھا

ابھی چند ہی ساعتیں گزری تھیں کہ رحیم داد کے گھر کا دروازہ بڑی آہستگی سے کھل گیا۔ وہ سرخ پوش اب کی بار لالٹین لیے کھڑی تھی۔ بولی: "آیئے اندر آ جایئے۔" میں جب دروازے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر عجیب سی زردی کھنڈی ہوئی تھی نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑے پھیکے انداز سے مسکرائی۔ اور دروازہ میرے پیچھے بند کرتی ہوئی بولی "ٹارچ اچانک خراب ہو گئی مجھے لیمپ اٹھانا پڑی۔"

"کوئی بات نہیں۔ یہ بھی تو روشنی دیتی ہے۔ رحیم داد صاحب گھر پر ہیں نا؟"

"جی نہیں وہ لوگ تو عرصہ ہوا کراچی جا چکے ہیں۔ سارا کنبہ ہی وہاں رہتا ہے۔ ہم ان کے کرایہ دار ہیں۔"

"اچھا۔ پھر تو میں نے آپ کو بلاوجہ زحمت دی۔" یہ کہہ کر میں پیچھے مڑا تو وہ میرا راستہ روکنے لگی۔ اس کی سرخ رنگ کی چادر بہت خوبصورت تھی اور اس کے چہرے کی دلکشی میں چار چاند لگا رہی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر یہ احساس اپنے ہی آپ میرے دل میں ابھر آیا تھا کہ گھر آدمی کی جنت ہے۔ وہ بڑی ہی اپنائیت سے بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔

"آپ لاہور سے آئے ہیں؟"

"جی ہاں۔ مجھے یہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ اس زحمت کے لیے میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔"

"جی نہیں، معافی کی کیا بات ہے آپ بھلا اس وقت کہاں جا سکیں گے۔ کوئی اور عزیز ہیں آپ کے یہاں؟"

"نہیں۔ مجھے اب ادھر کوئی اور ٹھکانہ دیکھنا پڑے گا۔" یہ کہہ کر میں پھر پیچھے ہٹا۔ تو پھر اس نے میرا راستہ روک لیا۔ بولی۔

"اسے آپ رحیم داد ہی کا گھر سمجھیں۔ ہم ان کے کرائے دار ہی نہیں، عزیز بھی ہیں۔ رات یہیں ٹھہر جایئے۔"

"نہیں۔ آپ کو بلاوجہ پریشانی ہوگی۔"

"جی نہیں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ آپ اندر تشریف لے چلیں۔" وہ میرے پہلو میں آ کھڑی ہوئی۔ وہ یوں دیکھ رہی تھی جیسے بار بار کہہ رہی ہو "میرے کہنے پر بھی اندر نہیں چلو گے؟"

ایک لمحے کے لیے میں نے صورت حال پر غور کیا اور پھر فیصلہ کن انداز سے پیچھے مڑ کر میں نے قدم آگے بڑھا دیا۔ لالٹین کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کے رخسار تمتمانے لگے تھے مجھے یہی محسوس ہوا کہ میری غیر متوقع آمد پر وہ خوش ہو گئی ہے۔ وہ تیزی سے میرے آگے نکلی اور صحن میں پہنچ کر بولی۔ "ادھر آ جایئے۔ اس کمرے میں۔" اس نے ایک کھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی کمرے میں جا گھسا۔ وہاں دائیں ہاتھ ایک پلنگ پڑا تھا۔ جس پر اس نے سفید چادر بچھا رکھی تھی اور ایک ریشمی لحاف اس پر تہہ کھلا پڑا تھا۔ وہ ابھی اس سے نکل کر باہر گئی تھی۔ کمرے میں اگر بتی سلگ رہی تھی۔ پلنگ کے سامنے دیوار کے ساتھ ساتھ چار کرسیاں دھری تھیں جن کے سامنے ایک چھوٹی سی میز پڑی تھی۔ اپنی توفیق اور اپنے ذوق کے مطابق اس نے کمرے کو بہت عمدہ طریقے سے سجا رکھا تھا پلنگ کے ساتھ کھڑکی تھی۔ جس میں اس نے ایک خوبصورت سا ریڈیو رکھا تھا اور وہ اس لمحے بھی شوں شاں کر رہا تھا۔ مجھے کمرے میں پہنچا کر وہ بولی۔

"بیٹھیں ادھر کرسی پر تشریف رکھیں میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں کھانا لے آؤں۔" اس کا لہجہ خاصا شستہ تھا۔

"آپ کہاں پریشان ہوتی پھریں گی۔"

"نہیں نہیں! پریشانی کی کیا بات ہے جیلانی صاحب آپ کی ــــــ خدمت کر کے مجھے دلی خوشی ہوگی۔" میں نے پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے شرما کر نگاہیں جھکا لیں اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ سرخ چادر کے نیچے وہ سفید رنگ کی ساٹن کی قمیص شلوار پہنے تھی اور اس کے پاؤں میں بڑے خوبصورت سے سفید سینڈل تھے۔ اسے لباس پہننے کا سلیقہ آتا تھا۔ آنکھیں اس کی غیر معمولی طور پر بہت ہی صاف شفاف اور چمکدار تھیں۔ رنگ گورا تھا اور جب وہ شرماتی یا کسی بات پر جوش میں آتی تھی تو اسکے رخسار تمتما کر سرخ انار ایسی رنگت پکڑ لیتے تھے۔ ایک عورت کے وجود میں ــــــ جتنا سلیقہ ہونا چاہیئے وہ سارے کا سارا اس میں موجود تھا۔ وہ مجھے غیر متوقع طور پر بہت ہی اچھی لگی۔ شاید اس لیے بھی کہ اس حرماں نصیب رات کے اس پہر میں ملی تھی اور ایسے شہر میں ملی تھی، جہاں میرا کوئی بھی پرسان حال نہ تھا جہاں اس گھڑی مجھے سر چھپانے کے لیے کسی جگہ کے مل جانے کی کوئی توقع ہی نہ تھی۔

وقت نے تو میری کونپلیں کاٹ ڈالی تھیں۔ بگولوں کی آغوش میں تنکے کی طرح تقدیر مجھے کہاں سے کہاں اچھالتی پھر رہی تھی۔ اس اجنبی گھر میں وہ اجنبی عورت اس لمحے مجھے قدرت کا حسین ترین عطیہ نظر آئی۔ میں نے اٹیچی کیس اور بریف کیس اس کے پلنگ

کے نیچے رکھے اور خود بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا سارا بدن شل ہو رہا تھا۔ تھکن نے چور چور کر رکھا تھا۔ اور میرا جی چاہتا تھا کہ میں دنیا جہان سے بے نیاز ہو کر اس پلنگ پر لیٹوں اور پھیل کر سو جاؤں۔

کوئی دس منٹ کے بعد وہ عورت ایک خوبصورت سے کشمیری طرز کے سماوار میں مہکتی ہوئی چائے بھر کر لے آئی۔ بولی۔ "لیں جناب یہ پئیں۔ اتنے میں میں آپ کے لیے کھانا بناتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک پیالی میں چائے بھر دی اور پھر میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی جیسے وہ مجھے صدیوں سے جانتی ہو۔

"آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"میرا نام ماجدہ ہے۔ ماجدہ وحید۔" وحید تک پہنچتے پہنچتے وہ پریشان ہو گئی۔

"یہ وحید صاحب کون ہیں؟" میں نے پیالی اس کے ہاتھ سے لی تو میری انگلیاں اس کی انگلیوں سے مس ہو گئیں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کی انگلیاں اس چائے سے زیادہ گرم تھیں۔ اس کی شخصیت کا سحر گرد و پیش کو تمازت بخش رہا تھا۔

"میرے شوہر۔"

"کیا مطلب؟ وہ کہاں ہیں اس وقت میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"یہ لمبی کہانی ہے جیلانی صاحب! وہ دو سال سے ادھر ڈنمارک گئے رہ رہے ہیں اور وہاں انہوں نے کسی یورپین سے شادی کر لی ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اکیلی رہتی ہیں یہاں۔" میں نے پہلی بار اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

"جی ہاں میں یہاں بالکل تنہا ہوں۔ ساٹھ روپے اس مکان کا کرایہ دیتی ہوں۔"

"آپ کا بچہ کوئی نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔ وحید صاحب شادی کے کچھ ہی ماہ بعد باہر چلے گئے تھے۔"

"اوہ! میں سمجھا۔ بڑی حیرت کی بات ہے اور اب آپ یہاں تنہا ہیں اور اتنی جرأت سے آپ نے میرے جیسے اجنبی کو گھر میں ٹھہرا لیا۔"

"آپ اجنبی کہاں ہیں۔ رحیم داد کے دوست ہیں تو پھر میرے لیے آپ غیر تھوڑی ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر... مگر... مجھے حیرت ہے۔ بہر حال میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھ پر اعتماد کیا ہے۔"

"آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے کھانا لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی تو یونہی بے خیالی میں اس کا ہاتھ کرسی کے بازو پر دھرے میرے ہاتھ پر جا پڑا۔ اس کی ہتھیلی میں ایسا گداز تھا کہ میں نے چاہا کہ اس کا ہاتھ ابد تک میرے ہاتھ پر دھرا رہے۔ اس نے میرے ہاتھ کو ذرا سا دبایا اور پھر مسکراتی ہوئی صحن میں نکل گئی۔

اس کے اس رویے نے مجھے حیران کر دیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ تنہائی میرے گرد پُراسرار قسم کا جال بن رہی ہے۔ زندگی میں پہلی بار میرے دل میں یہ آرزو ابھری کہ میں خود کو کسی کے وجود میں سمو دوں۔ تحلیل کر دوں۔ اپنی اکائی کو فنا کے گھاٹ اتار کر کسی میں ضم ہو جاؤں۔ ماجدہ مجھے اس سناٹوں سے لبریز گھر میں زندگی کے لق و دق صحرا میں ایسا نخلستان دکھائی دیتی تھی جس میں پہنچ کر آدمی اپنی ساری کلفتیں بھول جاتا ہے۔

جب ماجدہ مجھے کھانا کھلا چکی تو بولی۔

"آپ کپڑے تبدیل کر لیں اور آرام کریں۔"

"کہاں؟"

"یہیں سو جائیں اسی پلنگ پر۔"

"مگر آپ؟ یہ تو آپ کا پلنگ ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ مجھے تو آج ویسے بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔ میں ابھی تک جاگ رہی تھی۔ میں ادھر دوسرے کمرے میں سو جاؤں گی۔"

میں نے بریف کیس کھولا تو مجھے یاد آیا کہ اپنا کرتہ پاجامہ تو میں حبیب تراش نثار کو دے آیا ہوں۔ وہ میری مشکل کو بھانپتے ہوئے بولی۔

"ٹھہریں۔ میں آپ کو چادر لا دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے کی طرف لپکی اور ایک صاف ستھری سفید ریشمی لاچے ایسی چادر لا کر اس نے مجھے دے دی۔ وہ میں اس کے سامنے ہی کمر پر باندھ چکا تو وہ بولی۔ "یہ اچھی لگی ہے آپ کو۔" میں نے اس کے سامنے ہی کوٹ اتارا ٹائی کھولی اور پھر جب سوئٹر بدن سے الگ کیا تو میری کمر پر بندھے پستول کو دیکھ کر وہ ٹھٹکی، مگر پھر کھل اٹھی بولی۔

"یہ پستول کیوں باندھ رکھا ہے آپ نے؟"

"میرے پاس اس کا لائسنس ہے جناب! جو ہر شریف آدمی کو مل سکتا ہے جس کے پاس جائیداد ہو، روپیہ ہو اور جو اپنے علاقے کا باعزت آدمی ہو۔ سمجھتی ہیں نا آپ؟"

"جی معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی اپنے شہر کے رئیس ہیں۔" وہ پستول کو دیکھ کر یکدم بے حد خوش ہو گئی تھی اور اسے بڑے اشتیاق سے چھو رہی تھی۔

"اس میں کیا شک ہے جناب! بینک بھر رکھے ہیں میں نے اپنے پیسے سے۔ اب بھی میری جیب میں خاصے پڑے ہیں۔ یہ دیکھیں" میں نے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر اسے دکھائیں۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اسے اچھی طرح مرعوب کر دوں۔ اس حد تک کہ اگر میں کہوں کہ میری انگلی پر ریشمی دھاگے کی طرح لپٹ جا تو وہ انکار نہ کرے۔ اپنے وجود کو بھلا کر بھی میرے حکم کی تعمیل کرے۔

"نوٹ نہ دکھائیں جناب مجھے۔ میرے دل پر ویسے ہی آپ کا بہت رعب جم چکا ہے۔"

"اچھا! کتنا رعب جم چکا ہے؟"

"جتنا آپ سمجھ لیں۔"

"اتنا رعب کہ اگر میں کہوں... میں کہوں... کہ آپ......"

"ہاں ہاں کہیے رک کیوں گئے آپ۔" اس نے میرے کپڑے ایک ایک کر کے بڑے سلیقے سے بنا سنوار کر ہینگروں میں لٹکاتے ہوئے کہا۔

"چلیں رہنے دیں کہیں آپ ناراض ہی نہ ہو جائیں۔"

"نہیں، میں آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانوں گی۔" وہ ایکدم سنجیدہ ہو گئی۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ٹھہر ٹھہر کر ایک دم خاموش ہو جاتی ہے۔ اس کے کان کسی آواز کے منتظر تھے اور جب وہ اس آواز کی طرف متوجہ ہوتی تھی تو اس کے چہرے کی رنگت بدلنے لگتی تھی۔ مگر پھر وہ اپنی اس حالت پر جلدی ہی قابو پا لیتی تھی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ اچانک باہر دروازے پر ایک بڑی ہی غیر محسوس قسم کی بھیدوں بھری دستک ابھری۔

"ٹھک، ٹھک، ٹھک" تین بار کسی نے دروازے کے تختے پر انگلی بجائی۔ ماجدہ تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوتی۔ اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ اور ماتھے پر میرے دیکھتے ہی دیکھتے پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔

"یہ دستک کیسی ہے؟"

"پتہ نہیں کون ہے۔ میں دیکھتی ہوں۔"

"کوئی تمہارا جاننے والا ہے؟"

"پتہ نہیں کون ہے میں دیکھتی ہوں۔" وہ بڑبڑائی۔ اس کے چہرے پر سوچوں نے جال سا بُن دیا تھا۔ دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی کسی نے ایک بار پھر بڑے تسلسل سے تین بار تختے کو کھٹکھٹایا۔

"ٹھہرو۔ میں دیکھتا ہوں کون ہے۔"

"نہیں جیلانی صاحب! پتہ نہیں وہاں کون کھڑا ہے۔ آپ اپنے بستر میں کیا بتائیں گے اسے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی گرم چادر بدن پر لپیٹتی ہوئی سلیپر پہن کر دروازہ کھولنے چلی۔ لالٹین اس نے یہیں رہنے دی۔

"میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"نہیں، آپ ادھر اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر کے ہی بیٹھے رہیں۔" وہ جھنجلا کر بولی اور کنڈی کھول کر باہر نکل گئی۔ سرد ہوا کا تیز جھونکا اندر آیا تو میں نے پیچھے ہٹ کر قمیص پہن لی۔ خدشے میرے دل میں سر اٹھا رہے تھے۔ میں نے تیزی سے اپنا سائیلنسر لگا پستول پیٹی سے نکالا۔ اس کا چیمبر کھول کر گولیاں گنیں اور پھر اسے ڈب میں رکھ کر میں صحن میں نکل کر دبے پاؤں ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ ڈیوڑھی کے دائیں طرف بالکل نکڑ میں ان کے گھر کا دروازہ تھا۔ ماجدہ اس دروازے کے ساتھ جڑ کر کھڑی تھی اور کسی کو دبی زبان میں کہہ رہی تھی۔

"میرے گھر میں مہمان آئے بیٹھے ہیں۔ چوہدری صاحب خدا کے لیے چلے جائیں۔"

"تم دروازہ تو کھولو میں بس ابھی چلا جاؤں گا۔ اتنی مشکلوں سے یہاں تک آیا ہوں۔" ایک بھاری آواز سرگوشی کر رہی تھی۔

"نہیں میں دروازہ نہیں کھول سکتی۔ چوہدری صاحب بالکل نہیں آپ کا قرض میں جلد چکا دوں گی۔"

"بکواس مت کر۔ دروازہ کھول دے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔" اچانک چوہدری کا لہجہ بدلنے لگا۔ میں بالکل اندھیرے میں کھڑا تھا۔ ماجدہ ٹھہر ٹھہر کر پیچھے دیکھ رہی تھی اس ڈر سے کہ کہیں میں ادھر نہ آ جاؤں۔ وہ سخت خوفزدہ تھی۔ اپنے اس بھید کو وہ مجھ سے ہر حال میں چھپا لینا چاہتی تھی۔

"کیا کہتی ہے یہ گشتی چوہدری صاحب۔" ایک نہایت ہی کھردری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ معلوم یہ ہوا کہ وہاں ایک نہیں دو آدمی کھڑے ہیں۔ انہوں نے بڑے زور سے دروازے کو پیچھے دھکیلا۔ خوفناک قسم کی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ ماجدہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"اندر میرے مہمان آئے ہیں۔ میرے ماموں اور ان کا بیٹا۔ میں آج دروازہ نہیں کھولوں گی۔ چوہدری صاحب!"

"دروازہ کھول، ورنہ ہم چھت پر سے اندر آ جائیں گے۔" اس آدمی نے ایک خوفناک قسم کی بڑی پیچدار گالی ماجدہ کی طرف لڑھکائی۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہ ہو سکتا تھا۔ وہ اس عورت کو ذلیل کر رہے تھے۔ جو تھوڑی دیر پہلے تک میری شہ رگ سے بھی..... زیادہ قریب رہ چکی تھی۔ میں اس کی یہ ذلت برداشت نہ کر سکا۔ میں اندھیرے میں لپکتا ہوا آگے بڑھا اور ماجدہ کو ایک طرف ہٹا کر میں نے دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ جاتے ہی میں نے پوری قوت سے سامنے کھڑے بھاری بھر کم آدمی کو گریبان سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ دوسرا آدمی بھی تیزی سے اندر آ گیا اور ڈب سے خنجر نکال کر میری طرف بڑھا۔ مگر میں نے اس چوہدری کو گھما کر اس کی طرف اچھال دیا۔ ڈیوڑھی میں دروازہ کھلنے کی وجہ سے روشنی سی نظر آتی تھی۔ چاند بھی خاصا اوپر ابھر آیا تھا۔

وہ دونوں ٹکرائے تو ماجدہ نے تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔ روشنی کم ہو گئی مگر اب بھی وہ مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔ میں نے پوری قوت سے ایک گھونسا اس چوہدری کے منہ پر مارا تو وہ بائیں ہاتھ جھک گیا۔ اتنے میں اس کا ساتھی مجھ پر خنجر سے حملہ آور ہوا۔ میں نے

اس کی خنجر بردار کلائی پکڑ کر مروڑی تو خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ماجدہ نے اسے فوراً اٹھا لیا۔ اتنے میں چوہدری اپنی شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈال چکا تھا۔ وہ اپنا ہتھیار نکال رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھی کی کلائی اور زیادہ مروڑ کر اسے منہ کے بل دوسری طرف گرایا اور پھر دونوں ہاتھوں میں چوہدری کی گردن دبوچ لی۔ وہ میری طرف جھکا تو میں نے پوری قوت سے اس کی رگیں مسل دیں۔ نسخہ وہاں بھی کارگر ثابت ہوا اور وہ دھم سے زمین پر گر گیا۔ اس کا ساتھی اب بالکل نہتا تھا۔ وہ اٹھ کر مجھ پر گھونسے برسا رہا تھا۔ میری پسلی پر میری کمر پر۔ میں نے پلٹ کر اس کی ٹانگوں میں ٹانگیں پھنسائیں اور اس کا بازو پکڑ کر ایک بار پھر [illegible] کر وہ درد سے بلبلا اٹھا۔

"چل ادھر اندر چل۔ [illegible] ہوں تم دونوں کتنے پانی میں ہو۔" یہ کہہ کر میں اس کے بازو کو بل دیتا ہوا اسے آگے لے چلا۔ وہ درد سے نڈھال ہو رہا تھا مگر گلے سے نکلتی آواز بلند نہیں کرتا تھا۔ وہ بھی میرا خیال ہے اپنی جگہ خوفزدہ تھا۔ کیونکہ وہ ایک آباد محلے میں ایک تنہا عورت کے گھر رات کے پچھلے پہر دھاوا بولنے کے مجرم تھے اور غالباً جانتے تھے کہ رسوائی اور جگ ہنسائی کتنی ہوگی۔

اس آدمی کو اندر لے جا کر میں نے کمر پر گھٹنے کی ٹھوکر ماری تو وہ منہ کے بل فرش پر گر گیا۔ میں نے اپنی ڈب سے پستول نکال کر ماجدہ کو دیا۔

"اگر یہ کوئی حرکت کرے تو اسے گولی مار دیں۔ اس گولی کی کوئی آواز نہیں نکلے گی۔" ماجدہ نے بڑے اعتماد سے پستول میرے ہاتھ سے لے کر اس آدمی پر تان لیا۔ میں انہی قدموں واپس ڈیوڑھی میں پہنچا۔ اور چوہدری کو گھسیٹتا ہوا ماجدہ کے کمرے میں لے آیا۔ اس کا ملازم خوف سے پیلا ہو چکا تھا۔ اور پھٹی پھٹی نظروں سے چوہدری کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا نام ہے ان کا؟" میں نے پستول ماجدہ کے ہاتھ سے لے کر چوہدری کے ملازم پر تان لیا۔ وہ سہم کر پلنگ کے پائے سے جا لگا۔

"یہ چوہدری کرامت ہے اور یہ اس کا نوکر فیروز۔" ماجدہ نے بڑے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا چاہتے تھے یہ؟" ماجدہ میرا یہ سوال سن کر کرسی پر ڈھے گئی۔ اور بڑے زخم خوردہ لہجے میں بولی۔

"یہ مجھے کئی دنوں سے ذلیل کر رہے تھے۔ اس کرامت سے میرے شوہر نے ڈنمارک جانے کے لیے پندرہ ہزار روپے قرض لیے تھے مگر وہ وہاں جا کر ایسا مست ہو گیا کہ اس نے مجھے ایک پائی نہیں بھیجی۔ یہ کرامت مجھ سے بار بار تقاضا کرتا رہا۔ مگر میں کیا کر سکتی تھی۔ وہ بیچارہ بالکل ہی لاپروا ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے گزارے کے لیے ادھر ایک اسکول میں نوکری کر لی۔ جوں توں کر کے میں وقت تو گزار رہی ہوں مگر میں اس کا قرض کہاں سے چکاتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ شیر ہو گیا۔ اور پھر — کچھ دن پہلے اس نے میرے گھر میں آ کر میری سخت بے عزتی کی۔ مجھے دھمکی دی اگر میں نے اس کا کہا مان لیا تو یہ مجھ سے کبھی قرض کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ ورنہ یہ مجھے گھر سے اٹھائے گا۔ مگر میں اس کی [illegible] پر تھوکتی بھی نہیں۔ کل اس نے مجھے کہا تھا کہ آج یہ میرے گھر آئیگا۔ میں بے بس مجبور عورت اپنی عزت کی خاطر اس روز کی بے عزتی تو سہہ گئی تھی مگر اب سب کچھ میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس کی اپنی تین بیویاں ہیں پھر بھی یہ دوسروں کی بہو بیٹیوں پر نظر رکھتا ہے ان کو ذلیل کرتا رہتا ہے۔ اس نے پندرہ ہزار روپے کی آڑ لے کر مجھے بھی کھلونا بنانا چاہا۔ اس نے میرے شوہر کو اسی لالچ میں قرض دیا ہو گا۔ میں آج رات اسی لیے جاگ رہی تھی کہ اس نے آنے کی دھمکی دی تھی۔ مگر آج میں نے طے کر رکھا تھا کہ میں اپنی جان دے دوں گی مگر اس کی دھمکیوں میں نہیں آؤں گی۔ میں تو سمجھی تھی کہ میں اس کتے کے [illegible] سے بچ گئی مگر یہ پھر بھی آ دھمکا۔ دیکھو تو اس کے منہ سے کیسی بو آ رہی ہے۔ شراب پی کر آیا ہے یہ۔" اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

"ہوں۔ تو یہ بات ہے۔ اس طرح یہ بھیڑیے راتوں کو [illegible] کر اپنے شہر کی بہو بیٹیوں کی عزت سے کھیلتے رہتے ہیں۔ یہ فیروز بھی [illegible] ساتھ ہی ہوتا ہے؟"

"ہاں۔" ماجدہ ایک دم بجھ گئی۔ "اس کتے نے بھی اس دن مجھے بہت ذلیل کیا تھا۔"

"کیوں اوئے! سچ کہتی ہے یہ؟"

"مجھے معاف کر دیں چوہدری جی! خدا واسطے مجھے معاف کر دیں میرا کوئی قصور نہیں ہے چوہدری جی۔ بس بھول ہو گئی مجھ سے۔"

"ہاں بھول تو ہوتی ہی ہے۔ دیکھتا رہ میں تم دونوں کا کیا حشر کرتا ہوں۔ ایک رسی لائیں۔۔۔ ماجدہ! ذرا مضبوط ہونی چاہیے۔"

ماجدہ نے آنسو پونچھے اور دوسرے کمرے سے نائلون کی رسی کا ایک سبز رنگ کا گچھا لے آئی۔ وہ میں نے کھولا اور پستول ماجدہ کے ہاتھ میں دے کر فیروز کی طرف بڑھا۔

"کھڑا ہو جا بے۔" اسے میں نے زبردست قسم کی گندی گالی دے کر ٹھوکر ماری۔ وہ لرزتا لرزتا اٹھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "مجھے معاف کر دیں چوہدری صاحب۔" اس کی یہ بات سنتے ہی میں نے [illegible] کا ایک جھانپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ تیورا کر پلنگ پر گرا تو میں نے فوراً ہی اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر رسی میں جکڑ دیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کی کمر پر میں نے کہنی کی ایسی ضرب لگائی کہ وہ پھر پلنگ پر اوندھے منہ گر گیا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں وہ شور نہ مچا دے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچی اور انگلیوں کی پوری قوت سے اس کی رگ دبا دی۔ وہ اسی وقت بے ہوش ہو گیا۔ اب کام زیادہ آسان ہو گیا تھا۔ میں نے ان دونوں کے ہاتھ پاؤں رسی سے [جکڑ]

طرح جکڑ دیے۔ اس کے بعد اس کے منہ میں کپڑے ٹھونس کر ان پر مضبوط پٹیاں باندھ دیں۔

"کہیں یہ مر تو نہیں گئے؟" ماجدہ نے پریشان ہو کر کہا۔

"نہیں یہ مرے نہیں ہیں ایک دو گھنٹے کے لیے چھٹی پر چلے گئے ہیں۔"

"کیا کیا آپ نے؟" وہ حیران ہو رہی تھی۔

"میں نے انہیں بے ہوش کر دیا ہے اب یہ دو گھنٹے تک ہل نہیں سکتے ہیں۔"

"آپ نے کمال کر دیا ہے جیلانی صاحب۔ اس خبیث سے تو سارا قصبہ عاجز ہے۔ اس نے میرے اسکول کی ایک استانی کو پچھلے سال اغوا کر لیا تھا۔ اس کی ابھی تک کوئی خبر نہیں ملی ہے۔ بہت ہی ذلیل آدمی ہے یہ۔ پانچوں عیب شرعی اس میں موجود ہیں۔ پہلے یہ خود لڑکیوں کی عزت لوٹتا ہے پھر ان کو اپنے نوکروں کے حوالے کر دیتا ہے۔" ماجدہ کرسی پر بیٹھ کر پھر رونے لگی۔ پتہ نہیں اس کے کس زخم پر سے کھرنڈ اترا تھا۔ کس گھاؤ کا ٹانکا ادھڑ گیا تھا۔ وہ بہت ہی ہراساں اور شکست خوردہ نظر آتی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہی تھی۔ بات کو گول کر رہی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ انہوں نے اسے بے عزت کیا تھا مگر حقیقت مجھے یہ نظر آتی تھی کہ وہ دونوں کتے اس کی عزت سے کھیل چکے تھے اور گھر میں بے بس اور مجبور پا کر وہ اس پر چڑھ دوڑے تھے اور اس نے خوفزدہ ہو کر ان کے آگے سپر ڈال دی تھی۔ وہ کسی بھی صورت میں یہ اعتراف کرنے پر آمادہ نہ تھی کہ وہ ان کے ہاتھوں اپنی عصمت کا گوہر لٹا بیٹھی ہے مگر حقیقت یہی تھی۔ اس کی تو بات ہی اور تھی۔ میرا خیال ہے کوئی بھی عورت جب تک اس کے اختیار میں ہو یہ اعتراف نہیں کرتی ہے کہ کوئی اس کو ذلت کے ان مراحل سے گزار گیا ہے۔ میرا خیال ہے ایسی ہزاروں لاکھوں عورتیں ہوں گی جن کے وجود پر ان گنت ہاتھوں کے ان گنت نقوش ثبت ہوتے ہیں مگر وہ ان کا نام نہیں لیتی ہیں لے ہی نہیں سکتی ہیں کہ شرم و حیا اور اخفاء و راز کا دوسرا نام عورت ہے۔ یہی حال ماجدہ کا تھا۔ اس کا چہرہ اس کے اندر برپا قیامت کا پتہ دیتا تھا اور مجھے اس کرامت اور فیروز پر اس قدر طیش آ رہا تھا کہ میرا جی چاہتا تھا میں انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین میں دبا دوں۔

اچانک ایک عجیب سا خیال میرے ذہن میں لہرا گیا۔ میں نے کہا۔

"آپ ان کو سنبھالیں میں ابھی آتا ہوں۔ ماجدہ گھبرائیں بالکل نہیں۔ میں انہیں ایسی سزا دوں گا، جو یہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔"

یہ کہہ کر میں نے پتلون پہنی، گلے میں ٹائی لگائی اور سویٹر چڑھا کر سامنے دائیں ہاتھ کرسی پر رکھے کمبل کو اٹھا کر اوڑھ لیا جب میں جوتے پہن چکا تو وہ بولی۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں اس وقت؟"

"میں بس ابھی واپس آ جاؤنگا، ایک بہت ضروری کام کرنا ہے مجھے۔"

"کہیں آپ تھانے تو نہیں جا رہے ہیں؟"

"نہیں ماجدہ جی! مجھے ان لوگوں سے کیا لینا ہے۔ آپ بس اندر سے دروازہ بند کر لیں۔" یہ کہہ کر میں نے سائلنسر لگا پستول جیب میں ڈال لیا اور تالر کا پستول میں نے ماجدہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ حیران سی ہو کر بولی۔ "یہ دو پستول کیوں رکھے ہیں آپ نے؟"

"یہ میں نے ایک ڈاکو سے چھینا تھا۔ اس میں گولیاں بھری ہیں اگر کوئی گڑبڑ ہو تو اس سے کام لیں۔ میں بس آدھ گھنٹے میں آ جاؤں گا۔"

"آپ اس وقت باہر مت جائیں۔ مجھے سخت خوف محسوس ہو رہا ہے۔"

"بالکل مت ڈریں ماجدہ! حوصلہ رکھیں میں بہت جلد واپس آ جاؤنگا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر لیں۔" یہ کہہ کر میں فیصلہ کن انداز سے صحن میں نکلا اور ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر باہر گلی میں جا پہنچا۔ اپنے حلیے پر ایک نظر ڈال کر مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں خاصا معزز آدمی نظر آتا تھا اور کسی کو بھی مجھ پر شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی۔ آدمی کا لباس اس کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

چاند دھرتی پر مہربان ہو چکا تھا اور گلی اس گھڑی چاندنی سے لبالب بھری تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا بازار کی طرف نکل گیا تھا۔ وہاں میں نے رات کو ماجدہ کے گھر کی طرف آتے ایک دکان کے سامنے دو کاریں کھڑی دیکھی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی کے گھر آئے مہمانوں کی کاریں تھیں۔ کسی ایسے آدمی کے گھر کے مہمانوں کی جنہوں نے اونٹ والوں سے یاری لگا رکھی تھی جنہیں گیراج میسر نہیں تھا مگر جن کے تعلقات ایسے لوگوں سے تھے جو کاروں میں سفر کرتے تھے۔ میں تیز تیز چلتا اس سمت جا نکلا جدھر میں نے وہ کاریں دیکھی تھیں۔

ابھی میں قصبے کے بازار کے عین وسط میں تھا کہ مجھے دو چوکیداروں نے آ لیا۔ وہ کسی دکان کے تھڑے پر سے اٹھ کر اچانک ہی مجھ تک آ پہنچے تھے۔

"کون؟" انہوں نے یک زبان ہو کر پوچھا اور میرے پاس آ کر مجھے ٹارچ کی روشنی میں بڑے غور سے دیکھنے لگے میں مسکرا دیا۔ ان سے ڈرنے کی مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ میری خود اعتمادی اور میرے خوبصورت ولایتی لباس کی تراش خراش دیکھ کر وہ مرعوب ہو گئے۔ ایک بولا۔

"کہاں جا رہے ہیں۔ بابو جی!"

"یار ذرا ہسپتال جا رہا ہوں ڈاکٹر کے پاس۔ میری بیوی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔"

"اچھا اچھا۔ آپ کہیں باہر سے آئے ہیں؟"

"ہاں، میں کل ہی لندن سے آیا ہوں۔ دو مہینے کی چھٹی پر۔ ڈاکٹر مل جائے گا نا اس وقت؟"

"ہاں۔ وہ گھر پر ہوگا۔ مگر لیڈی ڈاکٹر تو ادھر کوئی نہیں ہے بابو جی۔"

"کوئی بات نہیں۔ بیماری ہی ایسی ہے کہ ڈاکٹر بھی اسے دیکھ سکتا

ہے۔ اُف! اس سردی نے تو لندن کو بھی مات کر دیا ہے۔" میں نے کمبل لپیٹتے ہوئے کہا۔ وہ خود بھی بری طرح ٹھٹھر رہے تھے اور سردی سے بچنے کے لیے انہوں نے تھڑے پر انگیٹھی سلگا رکھی تھی۔

"اچھا یار۔ دعا کرو ڈاکٹر میرے ساتھ آجائے۔" یہ کہہ کر میں آگے چل دیا۔ وہ دونوں پوری طرح مطمئن ہو کر واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھے۔ اور میں تیز تیز چلتا ہوا آگے نکل گیا۔ کوئی دس منٹ بعد میں ان کاروں کے پاس پہنچ چکا تھا۔

دونوں کاریں نئی تھیں اور مقفل بھی۔ میں پرانا ٹیکسی ڈرائیور تھا گاڑیوں کی رگ رگ سے واقف۔ میں نے نثار کی جیب سے نکلے چابیوں کے گچھے میں سے ایک مخصوص چابی نکال کر ایک گاڑی پر آزمائی اس کا تالہ فوراً ہی کھل گیا۔ اس بدبخت جیب کترے نے میرا خیال ہے وہ خاص قسم کی چابی شاید ایسی ہی وارداتوں کے لیے بنوا رکھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ میرا یار ہر فن مولا تھا اور ہر کنوئیں میں ڈول ڈال دینے کا عادی — اس کی چابی میرے لیے کرگس ثابت ہوئی تھی۔ میں دل ہی دل میں نثار کا شکریہ ادا کر کے کار کے اندر بیٹھا اور اُسے اسٹارٹ کر کے آگے لے چلا۔

وہ بڑی ہی بے آواز سبک رفتار کار تھی جس کو چلاتے ہوئے ایک مدت بعد میرے دل میں یہ آرزو جاگی کہ میرے پاس بھی ایسی ہی ایک گاڑی ہونی چاہیے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ کم از کم ستر اسی ہزار میں مل سکتی ہوگی۔ بس وقت اور اتنی رقم خرچ کر دینا میرے لیے کچھ بھی مشکل نہ تھا، مگر مصیبت یہ تھی کہ میرا روپیہ بینک میں پڑا تھا اور میں بینک میں جانے سے گھبراتا تھا، سخت خوفزدہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں جب بھی وہاں گیا پکڑا جاؤں گا اسی لیے میں اس وقت تک بینک کے دروازے تک جانے سے گریز کرتا رہا تھا، ورنہ شاید میں بہت پہلے وہاں سے اپنی جمع شدہ رقم ضرورت کے مطابق نکلوا چکا ہوتا۔ مگر اس رات میں نے تہیہ کر لیا کہ جیسے ہی میں لاہور واپس جاؤں گا اپنی اس رقم کو وہاں سے نکلوا لینے کی کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور سوچوں گا۔

وہ پرائی کار لے کر میں تھوڑی ہی دیر بعد ڈاکٹر کے بنگلے پر جا پہنچا۔ اس کی رہائش گاہ کا پتہ مجھے ہسپتال میں موجود ایک چوکیدار نے بتایا تھا۔ وہاں اس ڈرائیور کی ٹیکسی موجود نہیں تھی جس کو میں بے ہوش کر کے وہاں تک لے گیا تھا۔ وہ شاید ہوش میں آنے کے بعد وہاں سے نکل بھاگا تھا، عین ممکن تھا کہ وہ اس وقت تھانے میں بیٹھا ہو، بہرحال صورتحال ایسی تھی کہ میں ہسپتال کے اندر کسی کو اپنی صورت نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ وہ گنوار بھی وہیں کہیں بیٹھا ہوگا جو اپنے باپ کا علاج کرانے نکلا تھا۔ میرے دو ہزار روپے جیب میں محسوس کر کے وہ خوش ہو رہا ہوگا مگر میں نے اس کے خیال پر تین حروف بھیجے اور چوکیدار کے بتائے ہوئے پتے پر جا پہنچا۔

ڈاکٹر کا بنگلہ ہسپتال سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جب میں نے کار سے اُتر کر اس بنگلے کے بڑے دروازے پر لگے ہوئے کنڈے کو کھول کر اندر قدم رکھا تو ایک خاصے قد آور کتے نے میرا استقبال کیا مگر وہ مجھ سے لپٹا نہیں، بس مجھ سے دو قدم دور رک کر بھونکنے لگا۔ اس کا جثہ خاصا بڑا ہوگا کیونکہ اس کی بھوں بھوں نے بنگلہ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں ابھی وہاں کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اس سے جان چھڑانے کے لیے کیا اس کے سینے میں اپنی بے آواز گولی اتار دینی چاہیے کہ اچانک سامنے کے کمرے کا دروازہ کھلا اور برآمدے کی بتی جل اٹھی۔ کوئی آدمی اپنے گاؤن کے تسمے باندھتا تیزی سے برآمدے سے باہر آ رہا تھا۔

"بیٹھو! شٹ اپ بیٹھو!" اس آدمی کی مہین سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ اکہرے بدن اور ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جس کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اس نے آنکھوں پر سنہری فریم کی خوبصورت سی عینک لگا رکھی تھی۔ کتا اس کی آواز سن کر بہت پیچھے جا بیٹھا مگر نظریں اس کی ابھی تک مجھ پر جمی تھیں۔

ڈاکٹر تیز تیز قدم اٹھاتا میری طرف بڑھا۔ وہ میری کھڑی ہوئی چمکتی جگمگاتی کار اور میرے عمدہ ولایتی سوٹ دیکھ کر خاصا مرعوب ہوا۔ یہ بات اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ مگر جب وہ میرے پاس آیا تو بڑے مایوس کن لہجے میں بولا۔

"فرمایئے! آپ کیسے آئے ہیں اس وقت؟"

"مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے۔"

"میں ہی ڈاکٹر ہوں ڈاکٹر عرفان احمد۔ اس ہسپتال کا انچارج۔"

"آپ سرجن بھی ہیں؟"

"جی ہاں سرجن بھی ہوں آپ کو شک ہے کوئی۔ ہر ڈاکٹر سرجن بھی ہوتا ہے۔" وہ جز بز ہو کر بولا۔ اب وہ میرے اور قریب آ گیا تھا اور بڑے غور سے میرے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"دیکھیں میں چوہدری ہادی علی کے گاؤں اکبر کوٹ سے آیا ہوں۔" میں نے جھوٹ بولا۔

ہادی علی کا نام سنتے ہی وہ بدک گیا بولا "صاحب میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں ان کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ پارٹی بازی کی لپیٹ میں لا کر وہ مجھے بہت ذلیل کر چکے ہیں۔ اُن جیسا چھوٹے باز آدمی میں نے کوئی نہیں دیکھا آپ تشریف لے جائیں میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔" وہ سخت طیش میں آ گیا تھا۔

"آپ میری بات تو سنیں جناب! وہ کمشنر صاحب ہیں نا وہ اکبر کوٹ کے نہری بنگلے میں کل سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کی ٹانگ میں ایک پھنسی سی تھی وہ اچانک پھوڑا بن گئی ہے اور اتنی اوپر ابھر آئی ہے کہ وہ سخت پریشان ہو گئے ہیں۔"

"کون، آغا ناصر علی؟ کمال کرتے ہیں صاحب آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اُن کا تو میں خادم ہوں۔ میں ابھی آپ کے ساتھ چلتا

ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے پیچھے ہٹا تو میں نے کہا۔

"شاید ہلکا سا آپریشن کرنا پڑے آپ اپنے اوزار ساتھ لے لیں تاکہ ٹانکے وغیرہ بھی لگا سکیں۔"

"آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

"آپ کے پاس گاڑی ہے؟"

"جی ہاں، مگر آپ بھی تو گاڑی لائے ہیں۔"

"اس میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے بہت پریشان کرتی آئی ہے مجھے۔ اگر آپ اپنی گاڑی لے چلیں تو ہم آپ کے ممنون ہوں گے۔"

"اس میں ممنون ہونے کی کیا بات ہے جناب میری گاڑی گیرج میں کھڑی ہے آپ ٹھہریں میں ضروری سامان لے لوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے برآمدے کی طرف لپکا اور کمرے میں جا گھسا۔

میرا کام اس نے آپ ہی آسان کر دیا تھا وہ مجھ سے کمشنر صاحب کا نام پوچھتا تو شاید میرا جھوٹ اس کے دل میں بدگمانی پیدا کر دیتا کیونکہ مجھے قطعاً یہ علم نہیں تھا کہ کمشنر کا نام آغا ناصر علی ہے مگر اپنی حماقت سے اس نے میری یہ مشکل آپ ہی آسان کر دی۔ چوہدری ہادی علی اور اکبر کوٹ کے سوا کوئی اور نام مجھے معلوم ہی نہیں تھا مگر اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ ہادی علی سے وہ سخت متنفر ہے اور اس آدمی کی شہرت اِدھر خاصی خراب اور نامسعود تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شیر دل آہو صاحب کی رائے اس شخص کے بارے میں بالکل درست تھی مجھے اطمینان ہو گیا کہ جب میں ہادی کو قتل کروں گا تو مجھے کوئی ندامت نہ ہوگی کیونکہ اُس کا کردار ایسا ہی ہوگا جس کی وجہ سے آہو صاحب نے اس کو گردن زدنی قرار دیا ہے۔ اس کو جہنم رسید کرنا عین کارِ ثواب ہے۔ میں نے اس لمحے یہی سمجھا اور اپنے جی میں خوش ہو گیا کہ میں کسی بُرے کام کے لیے اِدھر نہیں آیا ہوں۔

ڈاکٹر عرفان ٹھیک پندرہ منٹ بعد مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر بڑی سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ وہ اسی راستے سے نکلا اور اس نے اسی گلی کی سمت سے ہو کر دوسری جانب بڑھنے کا ارادہ کیا جدھر میں اسے لے جانا چاہتا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ میرا جی بہت ہی مسرور تھا کہ وہ ایک اندھے معمول کی طرح میرے ذہن کے اشاروں پر کام کر رہا تھا۔

ابھی وہ بازار میں سے گزرتا ہوا اس گلی کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ میں نے اس کی گردن دبوچ کر اس کی احساس کی رگ مسل دی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے بائیں ہاتھ جھول گیا۔ میں نے بریک پر پاؤں پہلے ہی رکھ لیا تھا۔ اسے دوسری سیٹ پر ڈال کر میں نے گاڑی سنبھالی اور اُسے آہستہ آہستہ چلاتا ہوا ماجدہ کے دروازے تک لے گیا۔ اس کی رفتار میں نے اس لیے کم رکھی تھی تاکہ گلی میں کسی قسم کا شور نہ ہو اور کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ رات کے اس حصے میں ماجدہ کے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کی والہانہ خود سپردگی نے مجھے اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی عزت پر کوئی حرف آئے، یا گلی میں اس کے بارے میں کسی کو کوئی اَنٹ شنٹ بات کرنے کا موقع ملے۔ میں ڈاکٹر کے کمر کوٹ کو ڈھا کر اس تک صرف اس لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر جا پہنچا تھا کہ مجھے ماجدہ کی مظلومیت کا اس کرامت اور اس کے ملازم سے انتقام لینا تھا۔

گاڑی ماجدہ کے دروازے کے سامنے کھڑی کر کے جب میں نے دستک دی تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے انتظار میں وہ سخت بے چین تھی۔ اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ مجھے گاڑی سمیت سامنے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

بولی "یہ۔ یہ گاڑی کیوں لائے ہیں آپ؟"

"آپ اندر چلیے ماجدہ پریشان نہ ہوں۔ بس چلیں اندر۔" میں نے اسے مرعوب کُن لہجے میں کہا۔ وہ فوراً ہی لوٹ گئی۔ دروازہ البتہ وہ کھلا چھوڑ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایسا تحیر ابھر آیا تھا کہ باید و شاید، مگر اس کی شخصیت کا سحر ایسا تھا کہ میں اس کے لیے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجانے کو تیار ہو سکتا تھا۔ وہ کرامت اور فیروز تو چیز ہی کچھ نہ تھے۔ اُن ذلیلوں کو تو میں ایسا سبق دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنی آیندہ نسلوں کو بھی کسی نہتی کمزور اور بے بس عورت پر ہاتھ اٹھانے سے منع کر جاتے۔ میں جو کچھ کرنے والا تھا، وہ جب اجاگر ہوگا تو ان کے خاندان میں جو کوئی سُنے گا، جو کوئی انہیں دیکھے گا سالہا سال تک کلی بچھا کر بیٹھے گا اور اس کی آنکھوں سے آنسو کبھی خشک نہ ہوں گے۔

وہ جو اندھیری رات کا کحل سلیمانی آنکھ میں ڈال کر دوسروں کے گھروں کو تباہ کرتے پھرتے ہیں، اُن کی عزتوں سے انہیں محروم کر دیتے ہیں کسی رعایت کے مستحق نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر عالیہ اور ڈاکٹر دشمن نے بھی میرے ایک چھوٹے سے جرم سے شہ پا کر مجھے اس اذیت ناک مرحلے سے گزار دیا تھا۔

میں نے ڈاکٹر عرفان کو گاڑی میں سے نکالا اور کمر پر لاد کر اُسے ماجدہ کے کمرے میں پہنچا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ اس کے بعد میں پھر باہر نکلا اور اس کا اوزاروں اور دواؤں سے بھرا صندوقچہ اٹھا کر اندر لے گیا۔ گاڑی میں نے مقفل کر دی اور مکان کا دروازہ بند کر کے ماجدہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ حیرت زدہ سی ہو کر کرسی پر بیٹھی تھی۔ اور کبھی مجھے دیکھتی تھی اور کبھی ڈاکٹر عرفان کو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کیوں رات کے اس جانگسل حصے میں ڈاکٹر عرفان کو اغوا کر کے لے آیا ہوں، اس کی ان بڑی بڑی صاف اور شفاف آنکھوں میں آہستہ آہستہ دہشت ابھرتی آ رہی تھی۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ اُس نے جس آدمی کو گھر میں پناہ دی ہے وہ ایسا صاحب

کرامت اور حیران کن شخصیت کا مالک ہے۔

"آپ کیا کر رہے ہیں جیلانی صاحب! کچھ مجھے بھی بتائیں یہ سب کچھ دیکھ کر تو مجھے وحشت ہو رہی ہے۔"

"گھبرائیں نہیں ماجدہ، میں وہی کچھ کر رہا ہوں جو مجھے کرنا چاہیے اُن سے میں نے اگر انصاف نہ کیا تو پھر آپ اپنی فریاد لے کر کہاں جائیں گی۔ کون آپ کی داد رسی کریگا۔ آپ پانی کا ایک جگ بھر کر یہاں رکھ دیں۔ اور ایک گلاس بھی، مگر جلدی کریں۔"

وہ میری اس بات سے کچھ بھی اخذ نہ کر سکی۔ بڑی ہی حیرت زدہ سی سحر زدہ شکستہ کیفیت میں وہ یوں کمرے سے باہر نکلی جیسے خواب میں چل رہی ہو۔ جب واپس آئی تو اس وقت تک میں کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگا چکا تھا اور کمرے میں دھوئیں کے مرغولے اِدھر اُدھر تیر رہے تھے۔

"اب آپ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جائیں اور اس وقت تک ادھر نہ آئیں جب تک میں آپ کو خود نہ بلاؤں ٹھیک!"

"ٹھیک ہے جناب جیلانی صاحب بہادر، میں کیا کہہ سکتی ہوں مجھے ڈر ہے کہ آپ اپنے لیے کوئی زبردست مصیبت کھڑی کر لیں گے۔"

"جی نہیں، آپ بے فکر رہیں میں خود ایک بڑی مصیبت ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا بس آپ پریشان بالکل نہ ہوں۔ آپ کو میری قسم، ان خوبصورت آنکھوں کی قسم بالکل فکر نہ کریں۔ آپ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی مگر آپ کی بے بسی کا انتقام میں ان سوؤروں سے ضرور لوں گا۔" وہ وہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے ارادے کو بھانپ کر میں نے اسے زبردستی باہر دھکیلا۔

"اپنے کمرے میں جا کر اطمینان سے بیٹھ جائیں، یہ میرا حکم ہے۔" میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹی اور دوسرے کمرے میں جا گھسی اسے وہاں سے نکال کر میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔ لیمپ کی روشنی خاصی تیز تھی۔ میں نے پانی کا گلاس بھر کر ڈاکٹر کے چہرے پر انڈیل دیا۔ یخ ٹھنڈا پانی آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھانے لگا۔ اس دوران میں میں نے اس کی گھڑی ایک گھنٹہ آگے کر دی۔ کوئی پانچ منٹ بعد ڈاکٹر پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا۔ اس کی عارضی غنودگی کی کیفیت برخاست ہو گئی تھی۔ اب وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے کبھی مجھے دیکھتا تھا اور کبھی سامنے فرش پر پڑے بے ہوش آدمیوں کو۔ میں سامنے کرسی پر بیٹھا تھا اور میرے پستول کی نال اس کے سینے کی طرف اٹھی تھی۔

"میں کہاں ہوں؟" پھر ٹھہر کر بولا۔ "مجھے کیا ہو گیا تھا، تم کون ہو کیا چاہتے ہو؟" ــــ ایک ساتھ کتنی سوال ٹھہر ٹھہر کر اس کے لبوں سے باہر آ گئے۔ وہ خود کو اس کمرے میں اور اتنے عجیب و غریب حالات میں گھرا دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ وہ غالباً اس کی زندگی کا سب سے زیادہ حیران کن لمحہ تھا۔ وہ پلنگ سے اٹھنے لگا تو میں نے پستول کی نالی لہرائی۔

"اوں ہوں، ڈاکٹر عرفان، تم اس وقت کنجاہ سے بہت دور، ادھر وزیر آباد میں بیٹھے ہو۔ تمہیں بے ہوش ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے۔ تمہاری گاڑی باہر کھڑی ہے میرا نام آصف ہے اور میں تمہیں ایک خاص مقصد سے یہاں لایا ہوں۔"

"یہ کیا بکواس ہے کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟"

"ہو سکتا ہے تمہارے لیے یہ بڑا ناخوشگوار کام ہو مگر تمہیں یہ کام کرنا ہوگا۔ ورنہ تم یہاں سے زندہ واپس نہ جا سکو گے۔ یہ پستول بے آواز چلتا ہے اور ہم ایسے مکان میں ہیں جو آبادی سے بہت دور ہے۔"

اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی تھیں اور اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ وہ اپنی گھڑی کو بار بار دیکھتا تھا۔ میں چپ ہوا تو وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔

"بولتے جاؤ، میں سن رہا ہوں۔" اس نے اچانک مجھے حیران کر دیا اس کا لہجہ بہت جما ہوا ... اور حوصلے سے لبریز تھا، یوں لگتا تھا جیسے اس نے اپنے دل میں کوئی اہم فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کی آواز جتنی مہین تھی اتنا وہ اندر سے کمزور اور بودا نہیں تھا۔

"کیا سمجھے ہو ڈاکٹر؟"

"میں سن رہا ہوں اور سمجھ رہا ہوں کہ مجھے ایک بدمعاش اور دھوکے باز گھیر کر لے آیا ہے میں سن رہا ہوں۔"

"میں بدمعاش نہیں ہوں ڈاکٹر، شریف آدمی ہوں، مگر کبھی کبھی شریف آدمی کو کسی ظالم سے انتقام لینے کے لیے یہ راستہ بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات میں نے انگریزی میں کی مگر اپنے دماغ کی ساری لیاقت مجھے اپنا مفہوم ادا کرنے میں صرف کرنی پڑی کیونکہ انگریزی میں... میرا ہاتھ ہمیشہ سے تنگ ہے۔ وہ خاص دفتری قسم کی بابو انگریزی تھی جس میں میں نے اپنا مفہوم سمجھایا صرف اس خیال سے کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کے سامنے کوئی اجڈ جاہل اور وحشی صفت جرائم پیشہ آدمی بیٹھا ہے مگر وہ میری اس بات سے قطعاً متاثر نہ ہوا۔

"کہتے جاؤ میں سن رہا ہوں، ہو سکے تو ایک سگریٹ مجھے دے دو۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال کر باہر نکالتے ہوئے کہا۔ اس کے کرخت لہجے سے میں چڑ گیا تھا۔ وہ مجھ سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہو رہا تھا۔ میرا جی چاہا میں اٹھ کر اس بچھوے کا سر کچل دوں مگر پھر بھی میں نے اسے کچھ نہ کہا ضبط کر کے اسے بائیں ہاتھ سے ایک سگریٹ پیش کیا اور ماچس بھی اسے تھما دی میرے ہاتھ میں تھامے پستول کا رخ مسلسل اس کی طرف تھا۔ اس کا وہ اکہرا بدن کمزور سا نظر آتا تھا۔ مجھے سینہ اس کا فراخ تھا مگر گردن اس سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ سنہری عینک بار بار اس کی ناک کی پھننگ پر سے پھسل جاتی تھی آنکھیں موٹی مگر پیشانی تنگ تھی۔ اس کے کان بڑے بڑے تھے مگر سر چھوٹا نظر آتا تھا۔ کچھ عجیب سی ہیئت تھی اس کی پھر بھی

اندر سے خاصا مضبوط تھا۔ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے کر وہ بولا۔ "ہاں کیا کہہ رہے تھے تم، میں سن رہا ہوں۔"

"ماں کا سر سن رہا ہے تو! گدھے تیری سمجھ میں ابھی تک بات نہیں آئی ہے کہ تو کہاں آ پہنچا ہے میں کوئی گنگر نہیں ہوں، ہڈیاں توڑ دیا کرتا ہوں۔ سمجھا کہ نہیں؟"

"میں سمجھ رہا ہوں بھئی سمجھ رہا ہوں۔ کام بتاؤ کیا ہے اور اس ڈرامے کو مختصر کرو۔ میں حالات سے سمجھوتہ کر لیا کرتا ہوں۔" وہ پھر بڑے ہی بلکہ حیران کن حد تک مضبوط لہجے میں بولا۔ اب کی بار وہ بڑی طمانیت سے مسکرا رہا تھا۔ میں تو سٹپٹا کر رہ گیا۔ بچے کو کسی بھولے معصوم بچے کو کن چھیدن کے لیے بھی بٹھاتے ہیں تو وہ ایک بار تو لرز ہی اٹھتا ہے۔ وہاں میرے سامنے ایک عاقل بالغ ایم بی بی ایس پاس سرجن ڈاکٹر بیٹھا تھا جسے معلوم تھا کہ گولی چلے تو بدن میں آر پار گول سوراخ ڈال دیتی ہے اور آدمی کو چند ساعتوں میں ٹھنڈا اور سرد کر دیتی ہے۔ بھرا ہوا پستول وہ میرے ہاتھ میں دیکھ رہا تھا مگر پھر بھی یہ ظاہر نہیں کر رہا تھا کہ وہ خوفزدہ ہے۔ پہلے چند منٹوں میں ہوش میں آنے کے بعد اس پر جو کیفیت طاری تھی وہ اس پر مکمل طور پر قابو پا چکا تھا۔ اس کا یہ حوصلہ دیکھ کر پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اس آدمی سے اس کے خانے میں بیٹھ کر بات کرنی چاہیے۔ میں بھی مسکرا دیا اور گلا صاف کر کے میں نے کہا۔

"ڈاکٹر! ان دو آدمیوں نے میری بیوی کی عصمت دری کی ہے۔"

"اوہ سمجھا، تو یہ ... لو یہ، ویری سیڈ سٹوری۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"ان حالات میں تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"مار دو ان سالوں کو، گولی مار دو جسٹ کل دیم۔" وہ ان پر اچٹتی سی نظر ڈال کر بولا۔ پھر حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

"یہ دونوں بے ہوش ہیں؟"

"ہاں۔"

"کیسے بے ہوش کیا ہے تم نے انہیں۔ کلوروفام سنگھایا ہے؟"

"نہیں میرا ایک اپنا ہی نسخہ ہے۔ نسخہ نمبر چار سو تیرہ۔"

وہ مسکرا دیا۔ عینک اتار کر اپنی ٹائی سے شیشے صاف کر کے اس نے اپنی نظریں مجھ پر جما دیں پھر ایک ہاتھ وہ اپنی گردن پر پھیر کر بولا۔

"نسخہ نمبر چار سو تیرہ؟ وہی جو تم نے گاڑی میں مجھ پر آزمایا تھا۔" اب کی بار وہ یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ مجھ سے بہت متاثر ہو چکا ہے۔

"ہاں وہی۔ اب تم یہ کرو ڈاکٹر اپنے چیر پھاڑ کے اوزار نکالو

مائی گاڈ! اتنے ظالم ہو تم۔" وہ اپنی جگہ سے ایک دم اچھل پڑا۔ میں نے پستول کی نال آگے بڑھا کر اس کے قریب کر دی۔

"زیادہ جوش میں مت آؤ ڈاکٹر، یہ بالکل انصاف کی بات ہے میں انہیں قتل بھی کر سکتا ہوں اور کوئی مجھے پکڑ بھی نہیں سکتا مگر یہ بے انصافی ہو گی۔"

"گڈ، ویری گڈ! تمہاری اس جینئس کی داد دیتا ہوں مگر یہ کام میں کیوں کروں۔" بڑے ماہرانہ انداز میں وہ مجھے کچوکے دے رہا تھا۔

لیکن وہ پوری طرح میری ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس کی بات سن کر میں ایک دم بھڑک اٹھا اور پستول کی لبلبی پر انگلی رکھ کر کہا۔ "یہ کام تو تمہیں کرنا پڑے گا ڈاکٹر! نہیں کرو گے تو جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔" میرا روکھا لہجہ محسوس کر کے اور لبلبی پر رکھی انگلی دیکھ کر ڈاکٹر کی ساری طراری ہوا ہو گئی۔ میں نے پہلی بار اس کے چہرے پر خوف کی علامات دیکھیں، زبان سے کچھ کہنے کے بجائے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر شروع کرو ان کی کانٹ چھانٹ میں ابھی دوسرے کمرے سے ہو کر آتا ہوں۔ مگر بزدلی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔" یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہماری تمام باتیں ماجدہ نے سن لی تھیں کیونکہ جب میں کمرے سے نکلا تو وہ اپنے دروازے میں غائب ہو رہی تھی۔ میں نے دروازے کی کنڈی باہر سے چڑھا دی اور سیدھا ماجدہ کے پاس جا پہنچا۔ وہ مضمحل سی ہو کر چارپائی پر ڈھیر ہو گئی تھی۔

"شاید آپ نے ہماری باتیں سن لی ہیں؟"

اس نے کمرے میں جلتے ہوئے تیل کے دیئے کی مدھم روشنی میں بڑے ہی بجھے ہوئے انداز سے سر ہلاتے ہوئے مجھے بتایا کہ اس نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔

"تم پریشان ہو؟"

اس نے سر نیچے جھکا لیا۔ اس کی آنکھیں پرنم ہو گئی تھیں۔

"میرا تو جی چاہتا تھا میں انہیں جان سے مار دوں۔ آپ میری کچھ بھی نہیں لگتی تھیں۔ آج آدھی رات تک بھی آپ سے میرا کوئی ناطہ نہیں تھا مگر اب میں آپ سے ایسے رشتے میں بندھ گیا ہوں جسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا میں اس تعلق کی لاج نبھاؤں گا مگر ان کتوں کو میں سزا دیئے بغیر نہیں رہ سکتا جنہوں نے آپ سے وحشیانہ سلوک کیا ہے۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں انہیں چھوڑ دوں آپ معاف کر سکتی ہیں انہیں۔"

اس نے سر اور نیچے جھکا کر اپنا چہرہ چادر میں چھپا لیا۔ اب اس کا سر اس کے زانوؤں پر تھا۔ اور اس کے پاؤں پلنگ سے نیچے تھے۔

"بولتی نہیں ہیں آپ، جواب دیں مجھے۔"

اس نے آہستہ آہستہ اپنا سر اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا تھا وہ رو رہی تھی بے تحاشہ رو رہی تھی۔

"رو کیوں رہی ہو؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کو اس کرامت سے محبت ہو گئی ہو؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ یہ بات ابھی تک میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ میرا دماغ اچانک الٹنے لگا اور میں اس کی چارپائی سے اٹھ کر اس کے سامنے کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کو سمجھنا مجھے مشکل نظر آ رہا تھا۔ میری بات سنتے ہی اس نے اپنی آنکھیں پونچھ لیں اور بولی۔

"ایسی بات پھر کبھی نہ کہیں، ورنہ میں جان سے دے دوں گی۔ وہ۔۔۔ وہ بھیڑیا ہے، اسے تو پھانسی بھی ہو جائے تو مجھے افسوس نہ ہو۔"

"پھر۔۔۔ پھر آپ رو کیوں رہی ہیں؟"

"آپ تو میرے محسن ہیں جیلانی! پتہ نہیں آج رات وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے۔ بس مجھے ڈر لگتا ہے کہیں آپ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ آپ بہت خطرناک کام کر رہے ہیں۔ وہ آپ کو اچھی طرح دیکھ چکے ہیں۔ وہ آپ کو گرفتار کروا دیں گے پھر۔۔۔ پھر کیا کریں گے آپ۔ مجھے تو وہ باہر نکلتے ہی تباہ کروا دیں گے۔"

"پگلی ہیں آپ! مجھے نہیں جانتی ہیں نا اسی لیے ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ آپ کو اب دنیا کی کوئی طاقت کوئی دکھ نہیں پہنچا سکتی ہے بالکل بے فکر ہو جائیں اور یاد رکھیں جیلانی کی تو کوئی ہوا کو بھی نہیں پہنچ سکتا ہے اس جیسے دس ہزار ہوں تو بھی نہیں۔"

"سچ اتنے بہادر ہیں آپ؟"

"پتہ نہیں بہادر ہوں کہ نہیں مگر آپ تک کوئی میری لاش پر سے گزر کر ہی پہنچ سکے گا۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر عرفان نے اندر سے دوسرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ میں پستول ہاتھ میں لیے تیزی سے باہر نکلا اور دوسرے کمرے کی کنڈی کھول دی۔ ڈاکٹر عرفان سامنے کھڑا تھا۔

"ان کے زخموں پر پٹی باندھنے سے پہلے میں تمہیں دکھانا چاہتا تھا کہ میں نے انہیں مکمل طور پر وہ کیا کہتے تھے تم بالکل فاختہ کر دیا ہے۔" وہ بڑے حوصلے سے مسکرا رہا تھا۔ حالانکہ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو چکا تھا۔

"فاختہ نہیں آختہ کہو ڈاکٹر آختہ۔" میں نے ان دونوں کتوں کے زخموں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کا حال شاہی دور کے خواجہ سراؤں کا ہو چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسی صورتوں میں کیا کیا جاتا ہے۔

"ان کو کوئی ٹیکہ تو نہیں لگایا ہے تم نے۔"

"ہاں ہاں یہ بات تو میں نے تمہیں بتائی ہی نہیں۔"

"میں نے ٹیکہ انہیں لگا دیا ہے، انہیں ذرا سا بھی درد محسوس نہیں ہوا حالانکہ یہ بڑا خطرناک آپریشن تھا۔"

"بکتے ہو تم، اس میں خطرناک کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اگر یہ ہوش میں آ گئے تو مجھے کیا کرنا چاہیے اور اب ان کی مرہم پٹی بھی کر دو۔"

"میں کیا بتا سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور ان دونوں کے زخموں پر روئی لگا کر مرہم پٹی کرنے لگا۔ جب وہ ادھر سے فارغ ہوا تو میں نے کہا۔

"تم ان کے لیے مجھے مارفیا کے انجکشن دے دو اور ہر انجکشن کی مقدار بھی مجھے بتا دو۔ سرنج اور سوئیاں بھی ادھر رکھ دو۔ میں ان کی نس میں خود ٹیکے لگا دیا کروں گا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جب تک یہ صحت یاب نہیں ہوتے میں انہیں ادھر ہی رکھوں گا۔"

"تمہاری مرضی۔ یہ لو یہ رہی سرنج۔ یہ رہیں سوئیاں اور یہ ہیں بے ہوشی کے ٹیکے۔" پھر اس نے مجھے بتایا کہ ٹیکے کی کتنی مقدار کتنی مدت کے لیے کافی ہو گی۔ ان کو کھلانے کے لیے اس نے مجھے دوا بھی لکھ دی۔ پٹیاں بدلنے کے لیے بھی ضروری سامان اس نے میرے سامنے رکھ دیا۔ مجھے ضروری ہدایات دے کر اس نے اپنا صندوقچہ بند کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ بولا "اب مجھے واپس کنجاہ پہنچا دو۔"

صبح کی روشنی چوروں کے تعاقب میں بڑھتی چلی آ رہی تھی، اور مجھے دن نکلنے سے پہلے پہلے اس سلسلے کو ختم کر دینا چاہیے تھا۔

"ذرا دیکھو، اس کی پٹی سے شاید خون بہہ رہا ہے۔" میں نے فیروز کی طرف اشارہ کیا۔ ڈاکٹر تیزی سے اٹھا اور فیروز کی پٹی کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے میں نے اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں لے کر بجلی کی سی سرعت سے اس کی رگیں مسل دیں۔ وہ میرے ہاتھوں میں جھول گیا تو میں نے خود ہی اسے کندھے پر ڈالا اور ماجدہ کو آواز دی۔ وہ ہچکچاتی ہوئی آئی اور سہم کر بولی۔

"مجھے بلایا ہے آپ نے؟"

"ہاں، یہ بکس اٹھا لیجیے ڈاکٹر کا۔" یہ کہہ کر میں ڈاکٹر عرفان کو لے کر ڈیوڑھی میں جا پہنچا۔ ابھی پو نہیں پھٹی تھی۔ میں نے کار کا دروازہ کھول کر ڈاکٹر کو پچھلی سیٹ پر ڈالا۔ ماجدہ نے مجھے اس کا صندوقچہ دیا۔ تو اسے ساتھ کی نشست پر رکھ کر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور بتی جلائے بغیر سیدھا چل دیا۔ وہ گلی باہر بڑی سڑک پر نکلتی تھی۔ قصبہ آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا تھا۔ نمازی مسجدوں کی طرف لپکے جا رہے تھے۔ اور مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں کسی جگہ مجھے کوئی رکاوٹ پیش نہ آ جائے۔ بڑی سڑک پر ایک جگہ رک کر میں نے ایک راہگیر سے ہسپتال کا پتہ پوچھا اور گاڑی کو اس راہ پر لگا دیا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ پولیس کسی جگہ بھی حرکت میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ اس ڈرائیور نے زبردست واویلا مچایا ہو گا۔ کیونکہ اسے میں نے گجرات پہنچنے سے بہت پہلے بے ہوش کر دیا تھا اور پھر اسی حالت میں لا کر کنجاہ کے ہسپتال میں پھینک دیا تھا۔

چاروں طرف بڑے غور سے دیکھتا ہوا میں گاڑی ڈاکٹر کے بنگلے کے پاس لے گیا۔ ادھر بھی زندگی بیدار نہیں ہوئی تھی۔ ہسپتال اور اردگرد کا ماحول بالکل سنسان تھا۔ میں نے ڈاکٹر کی گاڑی اس کے بنگلے سے ایک فرلانگ دور سڑک سے ہٹا کر کھڑی کی اور اس کے دروازے اچھی طرح

بند کر کے دوسری طرف چل دیا۔

جب میں سڑک سے اتر کر ایک گلی میں داخل ہوا تو مجھے پوری طرح اطمینان ہو چکا تھا کہ ساری کارروائی بخیر و خوبی طے پائی ہے۔

ماجدہ کے گھر تک پہنچنے میں مجھے آدھا گھنٹہ لگ گیا کیونکہ میں بار بار غلط ہاتھ کو نکل جاتا تھا۔ راہگیروں سے راستہ بھی میں نے پوچھا تو بہت احتیاط سے تاکہ کسی کو مجھ پر شک نہ پڑ جائے۔

جب میں ماجدہ کے پاس واپس پہنچا تو پونے چھ بج چکے تھے مگر سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا وہ سخت پریشان تھی۔ میں نے کرامت اور فیروز کو بڑی خاموشی سے مکان کے تیسرے کمرے میں ڈالا۔ وہ قدرے کم روشن کمرہ تھا مگر پھر بھی ہوادار تھا۔ وہاں جھلنگا سی دو چارپائیاں پڑی تھیں۔ ان دونوں کو الگ الگ لٹا کر میں نے ان پر چادریں ڈال دیں وہ ابھی تک بے ہوش تھے۔

"اب کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"ابھی تو مجھے بہت سخت نیند آ رہی ہے آپ یوں کریں کہ تھوڑا پانی گرم کریں۔ میں نہا کر تھوڑی دیر سونا چاہتا ہوں۔"

"آپ سو تو جائیں گے مگر ان کا کیا کریں گے۔ اگر یہ کسی اپنے رازدار کو بتا کر آئے ہوتے تو پھر کیا ہو گا؟"

"کوئی آئے تو کہہ دیں کہ کوئی ادھر نہیں آیا تھا اور بس۔"

"مگر ان کو کب تک یہاں ڈال رکھیں گے، کون سنبھالے گا انکو؟"

"فکر نہ کریں جناب! میں آج رات انہیں کہیں پھینک آؤں گا۔"

"کس کنوئیں میں؟"

"کنواں پلید کرنا ہے ان سوروں کے وجود سے۔ میں انہیں ادھر پرلی طرف کسی ویران جگہ پر ڈال آؤں گا۔"

"وہ کس طرح؟ کوئی ٹرک ہے آپ کے پاس؟"

"کوئی گاڑی لے لوں گا میں کرائے پر۔ کرائے پر نہ ملی تو چرا لیں گے۔"

"بہت خطرناک آدمی ہیں آپ۔" وہ مجھے اپنے ساتھ رسوئی خانے میں لے گئی۔ "آپ ادھر بیٹھ جائیں پیڑھی پر۔ میں پانی گرم کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے آگ جلا کر چولہے پر پانی کا ڈبہ رکھ دیا۔

جب ہم دونوں نہا کر ناشتہ کر چکے تو اس وقت پونے آٹھ بج چکے تھے۔ وہ بولی۔

"یہ میرا سکول جانے کا وقت ہے۔"

"لعنت بھیجو اس سکول پر۔ اب تم کبھی نوکری نہیں کرو گی۔"

"جی ہاں آپ کل چلتے بنیں گے اور میں اس کرامت ایسے غنڈوں کے آگے ہاتھ پھیلاتی پھروں گی۔"

"ایسا نہیں ہو گا جناب! میں آپ کو جس شہر میں چاہیں مکان خرید دوں گا۔ جتنے پیسے کہیں گی میں آپ کو دے دوں گا۔"

"اور وہ وحید صاحب جب آئیں گے تو وہ آپ کو شوٹ کرتے پھر رہیں گے۔"

"ایسا نہیں ہو گا جناب! اس سے تو میں آپ کو ایک منٹ میں چھڑا لوں گا۔ مجھے سب نسخے یاد ہیں۔"

"آپ سے تو خدا ہی محفوظ رکھے۔ کرامت اور فیروز تو ہمیشہ کے لیے تباہ ہو گئے اب وحید صاحب کا پتہ نہیں کیا حشر کریں گے آپ۔"

"جو سزا آپ اس کے لیے تجویز کریں گی، اسے وہی دی جائے گی۔"

جب ہم سو کر اٹھے تو دن کے تین بج رہے تھے اور پچھلے کمرے میں سے شور اٹھ رہا تھا۔ ہم سے غلطی ہو گئی، ہمیں چاہیے تھا کہ ان دونوں کو چارپائیوں سے باندھ کر ڈالتے مگر وہ دونوں کھلے پڑے تھے اور شدید زخمی ہونے کے باوجود وہ دونوں اٹھ کر دروازہ پیٹ رہے تھے۔ ان کی چیخ و پکار سن کر میں نے لحاف الگ کیا۔ اور ہاتھ میں پستول تھام کر میں اس کمرے کی طرف لپکا جب میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ وہ دونوں میرے سامنے کھڑے تھے۔ اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی بھوت ہوں۔

چوہدری کرامت بڑی مشکلوں سے چارپائی کی طرف بڑھا اور کراہتا ہوا اس پر بیٹھ گیا۔

"کیا حال ہے چوہدری صاحب طبیعت کیسی ہے اب آپ کی؟"

"اوئے کتے دے پتر یہ کیا کیا ہے تو نے ہمارے ساتھ۔" کرامت بڑے غصے سے بولا مگر آواز اس کی تھرا رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہیں آپ کیا محسوس کرتے ہیں دونوں؟"

"تم نے چوہدری صاحب کو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا ہے۔ تمہیں ذرا ترس نہ آیا؟" یہ فیروز کی آواز تھی وہ بھی لنگڑا کر چلتا ہوا چارپائی پر جا بیٹھا۔

"اس نے مجھے تباہ کر دیا ہے فیروز۔" کرامت نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"کوئی بات نہیں چوہدری صاحب امریکہ جا کر علاج کرا لیں۔ دولت تو آپ کے پاس بڑی ہو گی ہے نا؟"

"اوئے خدا تیرا بیڑہ غرق کرے۔ یہ میری دولت میرے کس کام آئے گی تم نے خود چاقو پھیر لیا ہے ہم دونوں پر۔"

"نہیں بڑے بھائی نہیں، ایک بڑے ماہر ڈاکٹر کو بلا لایا تھا میں، یہ بڑا نازک آپریشن تھا مگر فکر نہ کریں آپ کی جان کو کوئی خطرہ درپیش نہیں۔ کیا کھائیں گے آپ؟" میں نے پستول کی نال بدستور ان کی سمت تان رکھی تھی اور وہ دونوں بے حد خوفزدہ ہو چکے تھے۔ رنگت ان کی ہلدی ہو چکی تھی۔

"خدا کے لیے ہمیں یہاں سے جانے دو، میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں میرے بھائی مجھے معاف کر دو۔" کرامت نے یکدم بلکتے ہوئے کہا۔

"اتنی بھی کیا جلدی ہے چوہدری صاحب! آپ کو ذرا آرام

آجائے پھر میں ماجدہ کو آپ کے پاس بھیجوں گا۔"
"مجھے اور ذلیل نہ کرو میرے بھائی۔ تم پہلے ہی مجھے بہت خوفناک سزا دے چکے ہو۔"
"وہ تو ٹھیک ہے مگر ماجدہ کا قرض تو آپ کو چکانا ہی پڑے گا۔"
ان دونوں نے میری یہ بات سن کر سر جھکا لیے۔
"بولتے کیوں نہیں ہو کتو! ابھی تو میں نے اپنے انتقام کا پہلا مرحلہ مکمل کیا ہے ابھی تو میں تم دونوں کی آنکھیں بھی نکلواؤں گا۔ تم نے سمجھا کیا تھا" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ کرامت یہ بات سنتے ہی ہاتھ جوڑنے لگا۔ فیروز نے ایک دم میرے پاؤں پر سر رکھ دیا، بولا۔
"خدا کے لیے ہمیں معاف کر دو چوہدری صاحب۔ ہمیں آپ نے بڑی سزا دے لی ہے۔"
"ابھی کہاں بچے! ابھی تو کام شروع ہوا ہے۔ یاد رکھو تم نے کوئی شور مچایا تو تمہیں ڈھیر کر دوں گا تمہیں۔"
"ان کے منہ پر پھر پٹی باندھ دیں ورنہ یہ بکواس کرنے لگیں گے" یہ ماجدہ کی آواز تھی۔ وہ باہر اوٹ میں کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ اس نے اچھی تجویز پیش کی تھی۔
"ٹھیک ہے وہ پٹیاں بھی لے آؤ اور رسیاں بھی۔" میں نے وہیں سے ماجدہ کو پکارا۔ اس نے کچھ ہی دیر بعد دونوں چیزیں اندر پھینک دیں۔ وہ دونوں اس حد تک نڈھال ہو چکے تھے کہ درد کی وجہ سے ذرہ بھر بھی مزاحمت نہ کر سکے۔ ان کے تو خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ ہوگی، کہ وہ ماجدہ کے گھر پر دھاوا بولنے کے بعد اس حد تک ذلیل و خوار ہو جائیں گے وہ سدھائے ہوئے کتوں کی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔
میں نے ماجدہ سے کہہ کر ان کے سامنے کھانا رکھ دیا۔ وہ انہوں نے بڑی بددلی سے کھایا۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو ڈاکٹر ان کے لیے جو گولیاں چھوڑ گیا تھا وہ میں نے ان کو کھلا دیں تاکہ ان کے زخم جلدی بھر جائیں۔ پھر میں نے ان کے ہاتھ رسیوں میں جکڑ کر پیر باندھ دیئے۔
"جب تک تمہارا پوری طرح علاج نہیں ہو جاتا تم ادھر ہی رہو گے بچو! چپ چاپ بیٹھے رہو۔" یہ کہہ کر میں نے ان کے گرد چادریں لپیٹ دیں تاکہ وہ سردی سے بچے رہیں۔ اس کے بعد ان کے منہ پر میں نے پٹیاں باندھ دیں۔
ان دونوں کو میں اس اذیت سے گزار تو چکا تھا مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ انہیں کہاں پھینکوں۔ نہیں اب کس شکنجے میں جکڑوں۔ ظاہر ہے کہ انہیں قتل کر دینا میرے لیے بہت آسان تھا مگر اس بات کا میرے پاس کیا جواز تھا۔ میں خواہ مخواہ ان کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ میں انہیں وہاں کب تک بٹھا رکھوں گا؟ میرے سامنے الگ مرحلہ تھا۔ مجھے چوہدری ہادی علی سے نمٹنا تھا۔ اس کے لیے تو میں وہاں پہنچا تھا۔ میری بہن آسیہ ادھر قید و بند کی صعوبتیں سہہ رہی تھی اس کی آزادی مجھے ہر شے سے زیادہ عزیز تھی۔ مگر اب جو مصیبت میں نے خواہ مخواہ کے لیے پیدا کر لی تھی، اس کا ازالہ کرنے سے پہلے میں ماجدہ کے گھر سے نکل نہیں سکتا تھا۔
اگر میں ان دونوں کو کھلا چھوڑ دیتا تو وہ ضرور نکلتے ہی [illegible] پھر تو پولیس ماجدہ کو کبھی نہ چھوڑتی، کیونکہ اس کے لاکھ انکار کے باوجود کوئی بھی یہ بات باور نہ کرتا کہ جو کچھ ان دونوں پر بیتی ہے وہ اس سے بے خبر ہے۔
معاملہ خاصا پیچیدہ نظر آتا تھا اور میں سخت الجھن میں پھنس چکا تھا۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ اگر وہ کسی آدمی کو بتا کر وہاں آئے تھے تو اس بات کا امکان قوی تھا کہ وہ کرامت اور فیروز کی تلاش میں یہاں ضرور آئے گا۔ اسے ٹالا تو جا سکتا ہے مگر زیادہ دیر تک نہیں۔
وہ رات میں نے ماجدہ کے گھر میں گزار دی۔ اس نے مجھے خوش کرنے کے لیے میری بہت ہی خدمت کی۔ ادنیٰ کنیز کی طرح وہ میرے ہر حکم کی تعمیل کرتی رہی۔ اس نے مجھے اتنا آرام پہنچایا کہ پردیس کی اس داستان میں اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔
رات کو جب میں سونے کے لیے لیٹا، اس حال میں کہ دو آدمی شدید زخمی حالت میں مجھ سے بارہ فٹ کے فاصلے پر تیسرے کمرے میں نڈھال پڑے تھے۔ ان پر مجھے کوئی ترس نہ آتا تھا۔ میں نے اپنے جذبات کا اس رات اچھی طرح تجزیہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ ... ان دونوں کو زخمی کر کے در اصل میں نے اپنے ہی کسی پرانے زخم کا ان سے انتقام لیا تھا۔ مجھے بھی تو ڈاکٹر دھمن اور ڈاکٹر عالیہ نے اسی طرح ذلیل کیا تھا۔ پھر جب مجھے میرے جرم کی اتنی بڑی سزا دے سکتے تھے اور اس سزا کو بھی انہوں نے اپنے لیے منافع کا ذریعہ بنا لیا تھا تو میں ان دونوں کو کیوں کر معاف کر دیتا۔ ان کی حالت پر میں جب بھی غور کرتا تھا مجھے دلی سکون محسوس ہوتا تھا۔
مگر جب میں نیند میں کھو گیا اس ارادے سے کہ میں کل صبح ہی [illegible] جا پہنچوں گا۔ اور ہادی علی کو اپنی بہن آسیہ کی آزادی کے لیے موت کی نیند سلا دوں گا تو مجھے نیند میں عجیب و غریب قسم کے ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے رہے۔ میں بار بار ہڑبڑا کر جاگ پڑتا تھا۔ مجھے اپنے ہر خواب میں آسیہ کے جسم سے لپٹے خوفناک پھنکارتے ہوئے سانپ نظر آتے۔ اس حال میں کہ میں بے بسی کی تصویر بنا کھڑا بس اسے تک رہا ہوتا جاتا تھا۔ میں اپنے ہاتھوں میں اتنی سکت نہیں پاتا تھا کہ آگے بڑھ کر آسیہ کو ان سانپوں سے نجات دلا دوں۔ میں ہر بار بت بنا کھڑا رہ جاتا تھا۔
میرا خیال ہے کہ وہ رات کا پچھلا پہر تھا جب میں نے ایک بار مسند آرا کو دیکھا، اس حالت میں دیکھا کہ اس کے بال کھلے ہوئے تھے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ اس کا لباس تار تار تھا اور خون آلود دکھائی دیتا تھا۔ کسی ایسے آدمی سے جس کا چہرہ میں اچھی طرح نہ دیکھ سکتا تھا۔ [illegible] میرے لیے بالکل اجنبی تھا مگر میں خنجر کھوئے اس پر وار کرنے جا رہا تھا اور بے تکان اور وہ آدمی مجھے بانہوں میں پکڑ کر برابر کھینچے لیے جا رہا تھا

زور سے کہ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ جب مجھے سانس لینا بھی دوبھر نظر آیا تو میں نے جھلا کر خنجر پھینک دیا۔ اس آدمی نے مجھے چھوڑ کر فوراً وہ خنجر اٹھا لیا اور خونخوار انداز سے میری طرف بڑھا۔ اچانک مجھے کسی نے پیچھے سے پکڑ لیا۔ میں نے ادھر جب نگاہ ڈالی تو مجھے مسند آرا نظر آئی۔ وہ چیخ رہی تھی۔ "نہیں خدا کے لیے اسے چھوڑ دو۔ اسے چھوڑ دو۔ اسے چھوڑ دو۔" اور اس کی آواز سنتے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں پسینے میں نہا سا گیا تھا۔ مگر مسند آرا مجھے کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ اس کا وہ وحشت زدہ چہرہ ابھی تک میرے تصور میں لرزاں تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ محض ایک خواب تھا۔ وہ عجیب پاگل کر دینے والا خواب تھا۔ میں کتنی ہی دیر تک اس خواب سے الجھتا رہا۔ اس کے بارے میں برابر سوچتا رہا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اس آدمی کا چہرہ بھی مجھے یاد نہیں رہا تھا اور مجھے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہے۔ ایسا تو کبھی بھی نہ ہوا تھا۔ میں نے مسند آرا کو اس سے پہلے کئی بار خواب میں دیکھا تھا مگر ایسی وحشت زدہ تو وہ کبھی بھی نہ تھی۔ اس کی وہ تار تار اوڑھنی مجھے پوٹ کی چادر ایسی نظر آتی تھی۔ اس لڑکی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اب تو میں اسے جیتی جاگتی حالت میں دیکھ چکا تھا۔ وہ میری نادیدہ عاشق تھی۔ اسے القا ہوتا تھا۔ وہ دیواروں کے اس پار چہروں کو دیکھ لیتی تھی۔ ان کی تصویریں بنا لیتی تھی۔ اس جیسی انوکھی پُراسرار ہستی تو میں نے زندگی بھر نہیں دیکھی تھی۔ وہ ہمیشہ مجھے اپنے بے مثال ملکوتی حسن سے مزین، جنتی مسکراتی نظر آتی تھی۔ اس نے بارہا میرے خوابوں میں آکر آنکھ جھپکایا تھا۔ لیکن اس رات کے پچھلے پہر وہ جس حالت میں مجھے نظر آئی تھی، وہ ایسا نہ تھا کہ میں اسے نظر انداز کر سکتا مگر میں اس کے کسی بھی اشارے سے کچھ نہ سمجھ سکا۔ کوئی بھی مطلب اخذ نہ کر سکا۔
صبح جب ہم ناشتہ کر چکے اور ان دونوں کو بھی ناشتہ کھلا چکے تو میں نے کہا "ماجدہ! یہ لیں پانچ ہزار روپے۔ اپنے خرچ کے لیے رکھ لیں۔ میں چند دن کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ اس عرصے میں آپ ان کو ادھر ہی بند رکھیں گی۔ مجھے ہی واپس آکر ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کروں گا۔"
وہ ایک دم بدک گئی اور روپے پیچھے ہٹا کر بولی۔
"یہ مجھ سے نہ ہوگا جیلانی صاحب۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں مرنے دیں ان کتوں کو یہاں۔ میں ان کے ساتھ تو اس گھر میں ایک منٹ نہیں رہ سکتی۔"
"مگر میں ایک ایسے کام سے جا رہا ہوں جہاں میں آپ کو ساتھ نہیں رکھ سکتا میری جان! اچھا آپ یہ بتائیں آپ کے عزیز رشتے دار ہیں ادھر ادھر؟"
"ہاں میری سگی خالہ ہیں مگر وہ تو ادھر ملتان میں رہتی ہیں۔"
"بڑی گڈ۔ آپ ابھی سامان باندھیں اور اس کے پاس چلی جائیں۔ ہوا آپ سے وعدہ رہا کہ میں بیشک پندرہ دن بعد آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"
"مگر میں انہیں کیا بتاؤں گی؟"
"آپ ان سے کہہ دیں کہ آپ کی نوکری چھوٹ گئی ہے کسی کو ادھر پتہ تو نہیں ہے کہ آپ کی خالہ وہاں ہیں؟"
"نہیں! میں تو وحید کے ساتھ یہاں ادھر گوجرانوالہ سے آئی تھی میرے والدین وہیں رہتے تھے مگر وہ دونوں پچھلے سال فوت ہو گئے تھے میرا کوئی نہ بھائی ہے نہ بہن۔"
"وحید کیا کرتا تھا یہاں؟"
"وہ یہاں اسکول ماسٹر تھا۔ بتایا ہے نا، پڑھ کر رکھا ہے اس نے۔ وہ بھی گوجرانوالہ کا رہنے والا ہے۔ وہ یہاں آکر اس کرامت کا دوست بن گیا تھا۔ اسی نے اسے ایک ایجنٹ سے کہہ کر ٹورنٹو بھجوایا۔ اپنے پیسے خرچ کیے۔ اس کی نیت شروع سے میرے بارے میں خراب تھی بہت عرصے سے میرے پیچھے لگا تھا مگر اب تو اس نے بہت ہی ذلیل کرنا شروع کر دیا تھا مجھے۔ اب میں اس کے ہوتے ہوئے یہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔"
"ٹھیک ہے آپ آج ابھی ملتان چلی جائیں اور گھر کو تالا لگا دیں۔"
"مگر ان کا کیا بنے گا؟"
"یہاں سے اپنی تمام ضروری چیزیں نکال لیں اور چابی ہمسایوں کو دے جائیں۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ آپ کہاں ہیں۔ ان کو کوئی نہ کوئی باہر نکال دے گا۔"
"بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں آپ! انہیں ابھی یہاں سے نکال دیں۔ پھر میں بھی ملتان چلی جاتی ہوں۔ اگر یہ یہیں پھنسے رہے تو ہم پر زبردست مصیبت آپڑے گی۔"
"ٹھیک ہے میں آج رات انہیں یہاں سے نکال دوں گا۔"
میں نے فیصلہ کن انداز سے کہا وہ مطمئن ہو گئی اور وہ پورا دن ہم نے یونہی گزار دیا۔
رات جب گہری ہو گئی تو میں ماجدہ کے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ مجھے کسی گاڑی کی تلاش تھی تاکہ اس میں ڈال کر میں دونوں کو وہاں سے نکال دوں۔ مجھ سے سخت حماقت سرزد ہو چکی تھی۔ میرے لیے یہی بہتر تھا کہ میں ڈاکٹر کی کار میں ڈال کر انہیں بھی ہسپتال پھینک آتا۔ ایک فائدہ تو یہ ہوتا کہ وہ لوگ کبھی بھی یہ نہ جان سکتے کہ ان کو اس حال میں کس نے پہنچایا ہے دوسرا فائدہ یہ ہوتا کہ میں اس نئے ٹنٹے سے بچ جاتا۔ بہر حال اب تو یہ مصیبت میرے گلے آپڑی تھی۔ مجھے اس سے عہدہ برآ ہونا ہی تھا مگر راستہ مجھے کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ میں بازار سے نکل کر بڑی سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ ایک کھمبے کی روشنی میں کھڑی مجھے ایک سوزوکی وین نظر آئی۔ میں سیدھا اس کے ڈرائیور کے پاس جا پہنچا۔
"کیوں بھئی خالی ہے؟"
"جی ہاں! میں گجرات جا رہا ہوں۔"
"میرا کچھ سامان ہے وہ ساتھ رکھ لو تو میں تمہیں گجرات تک کا کرایہ دے دوں گا۔"
"میں سامان ہی ڈھوتا ہوں جناب۔ گجرات تک کا کرایہ ساٹھ روپے ہوگا۔"

"مجھے منظور ہے بھائی۔ مگر ذرا جلدی چلو"

یہ کہہ کر میں اس کے ساتھ بیٹھ کر ماجدہ کے مکان پر جا پہنچا۔ سوزوکی وین دروازے پر کھڑی کر کے میں اندر پہنچا اور جلتے ہی میں نے ماجدہ سے کہہ کر اس کے جہیز میں ملی ہوئی جست کی بڑی پیٹی خالی کروالی۔

"یہ کیا کریں گے آپ؟"

"ان دونوں کو کہیں پھینک تو آؤں، ورنہ تو یہ خواہ مخواہ مصیبت بنے رہیں گے ہمارے لیے۔" یہ کہہ کر میں نے کرامت اور فیروز کو بڑی بے رحمی سے بے ہوش کیا اور دونوں کو پیٹی میں ڈال کر میں نے ڈھکنا بند کر کے تالا لگا دیا۔

"میری یہ پیٹی تباہ کر دیں گے آپ۔" ماجدہ نے بڑی حسرت سے کہا۔ "یہ مجھے جہیز میں ملی تھی۔"

"مجھے معلوم ہے مگر ایسی ہزار پیٹیاں میں آپ کو خرید کر دے سکتا ہوں۔ یہ تو چیز ہی کچھ نہیں ہے جناب۔" یہ کہہ کر میں نے پیٹی کی ایک دیوار میں دو دو انچ چوڑا سوراخ کر دیا۔ تاکہ انہیں ہوا ملتی رہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ دونوں بند صندوق میں دم گھٹ کر مر جاتے۔

"میں ان کو ٹھکانے لگا کر رات ہی رات واپس آ جاؤں گا۔ آپ میرا انتظار کریں۔"

یہ کہہ کر میں نے ڈرائیور کو اندر بلایا اور اس کی مدد سے وہ پیٹی وین میں لاد کر اسی وقت کنجاہ سے باہر نکل آیا۔ گجرات پہنچ کر میں وین کو سیدھا ہسپتال کے اندر لے گیا اور پیٹی کو ہسپتال کے برآمدے کے سامنے اتار کر میں نے ڈرائیور کو اس کا کرایہ دے کر فارغ کر دیا۔ وہ ڈرائیور ادھیڑ عمر کا بہت ہی سنجیدہ سا آدمی تھا وہ بھی سارا راستہ خاموش رہا اور میں بھی وہ مجھ سے خوفزدہ تھا اور میں اس سے۔

ہسپتال کے کئی آدمیوں نے اس پیٹی کے بارے میں مجھ سے پوچھا مگر میں نے کہہ دیا کہ اس میں کچھ ضروری سامان ہے۔ چند منٹ تک میں اس پیٹی کے پاس ٹھیرا رہا پھر چپ چاپ وہاں سے کھسک آیا۔ اس کے سلسلے میں میرا کام ختم ہو چکا تھا جب میں رات گیارہ بجے کے قریب ماجدہ کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ اس کے مکان کا بڑا دروازہ تھوڑا سا بھڑا ہوا تھا۔ اس کا ایک پٹ کھول کر میں اس امید میں اندر داخل ہوا کہ ماجدہ میرے انتظار میں سامنے کھڑی ہوگی مگر وہاں وہ موجود نہیں تھی۔ میں بھاگ کر اندر پہنچا تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ماجدہ کے اس کمرے کی تمام چیزیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ جس میں پچھلی رات میں نے ایسی نیند لی تھی کہ اس کا خمار اب بھی مجھے کبھی یاد آتا ہے تو میں سرشار ہو جاتا ہوں۔ میں نے پاگلوں کی طرح گھر کے تمام کمرے دیکھ لیے مگر وہ مجھے کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ میری تو آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ روپیہ جو میرے پاس تھا میں نے گجرات روانہ ہونے سے پہلے جیبوں میں بھر لیا تھا اور محفوظ تھا۔ سائلنسر لگا پستول بھی میری کمر سے بندھا تھا، مگر

وہ لوگ میرا بریف کیس بھی لے گئے تھے اور اٹیچی کیس بھی جس میں [illegible] کی دی ہوئی اسٹین گن بند تھی۔ یہ میرا بہت بڑا نقصان تھا۔ میرا منصوبہ چوپٹ ہوا جاتا تھا مگر سب سے بڑا چرکا جو مجھے زندگی [illegible] لگا یہ تھا کہ وہ عورت وہاں سے زبردستی اغوا کر لی گئی تھی جو میری زندگی بن گئی تھی۔ کمرے کی حالت یہ بتاتی تھی کہ وہاں خاصی دھینگا مشتی ہوئی تھی۔ ماجدہ کی چوڑیاں فرش پر ٹوٹی پڑی تھیں اس کے کان کا ایک [illegible] بھی ٹوٹ کر دروازے میں گرا ہوا تھا اور صحن میں نالی کے قریب [illegible] ایک سینڈل اوندھا پڑا تھا۔ میں نے ڈیوڑھی میں لالٹین لے جا کر ادھر ادھر دیکھا تو وہاں سے مجھے ایک بٹوہ فرش پر پڑا ملا۔ وہ میں نے اٹھا کر کھولا تو اس میں سے مجھے میرے مطلب کی بہت سی چیزیں ملیں۔ وہ غالباً اس آدمی کا بٹوہ تھا جس نے ماجدہ کو وہاں سے زبردستی اغوا کیا تھا۔ اس میں [illegible] کا شناختی کارڈ دھرا تھا معلوم یہ ہوا کہ وہ کوئی فارسٹ گارڈ ہے اور اس کا نام مشتاق احمد ہے۔ بٹوے میں تیرہ روپے بھی موجود تھے اور ایک خط جو اس کے نام کسی علی احمد نے جہلم سے بھیجا تھا۔ وہ سب چیزیں میں نے [illegible] احتیاط سے جیب میں رکھیں اور ایک بار پھر ماجدہ کے گھر کی تباہ حالی پر غور کرنے کے لیے ایک ایک کمرے میں گھوم گیا۔ وہ لوگ میرے بریف کیس اور اٹیچی کیس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں لے گئے ہوں گے کیونکہ ماجدہ کے تمام ٹرنک کھلے پڑے تھے۔ اور مجھے صحیح طور پر علم نہ ہو سکتا تھا کہ وہ اور کیا کیا اٹھا کر لے گئے ہیں۔

یہ بدترین صورت حال تھی اور تقاضا کرتی تھی کہ مجھے جس قدر جلد ہو سکے وہاں سے نکل جانا چاہیے کیونکہ وہ لوگ کرامت کی تلاش میں وہاں آئے تھے۔ انہیں اب تک ماجدہ پر ظلم و ستم توڑنے کے بعد یہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ کرامت اور فیروز پر کیا گزری ہے انہیں ماجدہ نے یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ میں رات کسی بھی وقت واپس آ سکتا ہوں وہ اسے کسی محفوظ جگہ پہنچا کر مجھ سے نپٹنے کے لیے مزید وہاں آئیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ پولیس کو [illegible] حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ان سے کوئی بھی بات بعید نہیں تھی وہ [illegible] لوگ تھے جن کو ان کی بڑی زمینداری نے اس قدر دیدہ دلیر بنا دیا تھا کہ [illegible] جگہ چاہتے تھے آنکھیں مار دیتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ میرا وہ پستول بھی [illegible] تھے جو میں نے مشتاق سے حاصل کیا تھا اور جسے میں ماجدہ کو اپنی حفاظت کے لیے دے گیا تھا کمرے میں کسی بھی طرف کوئی ایسا نشان نظر نہیں آتا تھا جس سے معلوم ہو سکتا کہ ماجدہ نے کوئی گولی چلائی ہوگی۔ اس بے چاری سے [illegible] دب سکی ہوگی۔ وہ شاید ایک دم پکڑ لی گئی تھی۔ اچانک اور غیر متوقع طور پر۔

میں کتنی ہی دیر تک ماجدہ کے بٹے پٹے شکن در شکن بستر پر بیٹھا سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ جگہ فوراً چھوڑ دینی چاہیے کیونکہ وہاں کسی بھی وقت وہ لوگ مجھے [illegible] کے لیے پولیس کو بھیج سکتے تھے۔ مگر سوال یہ تھا کہ میں آدھی رات کو کہاں جاؤں۔ کس طرف نکلوں میرے لیے تو سارے ہی راستے بند تھے۔ [illegible]

کوئی ایسا ہوٹل بھی نہیں جہاں جا کر میں باقی وقت گزار سکتا۔ رات وہاں پہلے ہی بہت زندگی کو سُن کر کے رکھ دیتی تھی اور پھر سردی نے الگ اندھیر مچا رکھا تھا۔

میں ادھر ادھر نگاہ ڈال کر بڑی بے دلی سے ماجدہ کے کمرے سے نکلا اور گھر کو اسی طرح کھلا چھوڑ کر میں نے بڑا دروازہ اپنے پیچھے بند کیا اور باہر گلی میں آ گیا۔ چاروں طرف ہُو کا سا عالم طاری تھا۔ حد یہ تھی کہ کوئی چوکیدار بھی ادھر ادھر پھرتا نظر نہیں آتا تھا۔ سردی نے ہر شے کو اپنی یخ بستہ گرفت میں لے رکھا تھا۔ میں ہونٹوں میں سگریٹ دبائے تیز تیز قدم اٹھاتا گلی سے باہر نکل رہا تھا۔ سامان نام کی کوئی بھی شے میرے پاس نہیں رہی تھی۔ میری ساری چیزیں اٹیچی کیس اور بریف کیس میں بند تھیں مگر وہ دونوں ماجدہ کے ساتھ ہی گھر سے غائب ہو چکے تھے۔

ماجدہ پر اس گھڑی کسی بھی چار دیواری کے اندر ان بدمعاشوں کے ہاتھوں جو کچھ بیت رہی ہوگی اس کے تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ میری وجہ سے خواہ مخواہ ایک ایسی مصیبت میں پھنس گئی تھی جس سے وہ کسی بھی طرح چھٹکارا نہ پا سکتی تھی۔ اس کا تو وہاں کیا ساری دنیا میں کوئی مونس و غمخوار نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی شوہر گزیدہ تھی۔ اب اس کرامت اور اس کے بعد اس کے غنڈوں کے ہاتھوں وہ جس طرح بیر بیر ہو رہی ہوگی اس کا اندازہ ہی نہ کیا جا سکتا تھا۔ رہ رہ کر میری مٹھیاں بھنچ جاتی تھیں میرا بس نہیں چلتا تھا ورنہ میں اس بستی کو ہی آگ لگا دیتا۔ مشتاق کے شناختی کارڈ پر اس کے گھر کا پتہ اکبر کوٹ لکھا ہوا تھا۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کرامت کے وہ کون کون سے حواری ہیں جو ماجدہ کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ اس بیچاری پر تو قیامت بیت چکی ہوگی۔

میں پچھلی رات بھی پوری نیند نہ لے سکا تھا اور اب دوسری رات ایسی آئی تھی کہ دو میرا سکھ چین ہی لوٹ کر لے گئی تھی۔ اور اب میں وہاں مشن میں گویا پال بنا پھر رہا تھا۔ زندگی نے اس تھوڑے سے عرصے میں مجھے کتنے دن دکھا دیے تھے۔ تقدیر نے مجھے بجھا کر رکھ دیا تھا جیسی بھاری جس پر ہر کوئی اپنی برچھی قلم بھالا تیز کرنے چلا آتا تھا۔ میں نے ماجدہ کے لیے اپنے دل میں ہزار طرح کے خوبصورت منصوبے بنا لیے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ دنیا جہان کی خوشیاں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دوں مگر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب کچھ راکھ کا ڈھیر ہو چکا تھا۔ ساری بساط ہی الٹ گئی تھی۔ میں ایسے بگولوں کی زد پر تھا جو پل میں تنکوں کی ہستی بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ میں دو قدم بھی کسی کے ساتھ چلتا تھا تو یہی سمجھتا تھا کہ میں ساری زندگی اس کے ساتھ گزار دوں گا۔ بڑی فراخدلی سے میں ہر ایک کو اپنا بنانے کی سعی کرتا تھا۔ ماجدہ کے سلسلے میں تو میں اور جذباتی ہو گیا تھا مگر اب جب میری آنکھ کھلی تھی تو مجھے معلوم ہوا تھا کہ میں تو محض ایک سپنا دیکھ رہا تھا ——— اور گرد و پیش کی ہر شے کھنڈر میں بدلی نظر آتی تھی۔

مجھے تو اپنے ذمے لیا ایک کام سرانجام دینا تھا۔ آسیہ کی آزادی کے لیے مجھے بادی علی کی زندگی کا چراغ گل کرنا تھا۔ اس بادی علی کا جس کی مجھ سے کوئی دشمنی نہیں تھی جسے میں جانتا تک نہیں تھا پھر بھی میں ارادہ کر کے ادھر آیا تھا کہ اسے ختم کر دوں گا کیونکہ مجھ سے آبو صاحب نے آسیہ کی آزادی کا سودا اسی طرح طے کیا تھا مگر راستے میں ایسا پیچ آ پڑا تھا کہ میرا وہ سارا منصوبہ دم توڑتا نظر آتا تھا۔

ابھی میں ماجدہ کے گھر سے دس قدم ہی دور گیا تھا کہ ایک اینٹ سے میرا پاؤں ٹکرایا اور اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے میں پیچھے قدرے گھوم گیا۔ یونہی بے خیالی میں میری نظر ماجدہ کے گھر کی طرف اٹھی تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی اس کے دروازے میں گھس رہا تھا۔ میں الٹے قدموں واپس لپکا۔ پستول پر میری گرفت مضبوط ہو گئی اور میں سر سے پاؤں تک غصے میں جلنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ میری ہی تلاش میں ہیں۔ اور وہ آدمی یہی دیکھنے آیا تھا کہ میں واپس آ چکا ہوں کہ نہیں۔ مکان کا دروازہ کھلا تھا اور وہ آدمی جو مجھے خاصا گرانڈیل نظر آتا تھا، سامنے صحن میں کھڑا تھا اس نے کمبل اوڑھ رکھا تھا اور سر پر اس نے یہ بڑا سا پگڑ باندھ رکھا تھا۔ وہ ماجدہ کے اس کمرے میں جھانک رہا تھا جس میں میں نے رات گزاری تھی میں دبے پاؤں ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو میرے قدموں کی چاپ اس نے سن لی حالانکہ میں نے بہت احتیاط برتی تھی مگر اس کی سماعت حیرت انگیز تھی وہ تیزی سے اپنے پاؤں پر گھوما تو مجھے دیکھتے ہی وہ پیچھے ہٹ کر ادھر نکل گیا جدھر سیڑھی بنی ہوئی تھی۔ وہ سیڑھی ڈیوڑھی میں سے نظر نہیں آتی تھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مسلح ہے کہ نہیں پھر بھی یہ احساس بالکل فطری تھا کہ مجھے اس کے سامنے اچانک نہیں پہنچ جانا چاہیے اگر پستول اس کے پاس نہیں ہے تو چھرا یا چھری تو اس نے نیفے میں اُڑس ہی رکھی ہوگی۔

"تم جو کوئی بھی ہو سامنے آ جاؤ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔" میں نے نیچے لہجے میں کہا۔

"تم کون ہو؟ ادھر تمہارا کیا کام ہے؟" وہ بڑے گمبھیر لہجے میں بولا معلوم یہ ہوا کہ وہ سیڑھی کی دیوار کے پیچھے کھڑا ہے۔ آواز اس نے بھی دبا لی تھی۔

"بکواس مت کرو، سامنے آ جاؤ۔ اور بتاؤ یہاں تم ماجدہ کے گھر میں کیا لینے آئے ہو؟" میں نے اب کی بار ذرا آگے سرکتے ہوئے کہا۔ وہ شاید اسی انتظار میں تھا اس نے دیوار پر رکھی آدھی اینٹ اٹھا کر میری طرف پھینکی۔ اگر میں فوراً ہی طرح نہ دے جاتا تو وہ اینٹ میرے سر میں لگ چکی تھی۔ وہ آدمی اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا اس کی بصارت بھی اس کی سماعت کی طرح تیز تھی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ اس کے پاس پستول نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھ پر اینٹ پھینکنے کے بجائے گولی چلاتا۔ میں اینٹ سے اپنا سر بچا کر تیزی سے صحن میں جا پہنچا مگر وہ سیڑھیوں میں نہیں تھا۔ بھاگ کر چھت پر چڑھ گیا تھا۔ ابھی میں کوئی فیصلہ ہی نہ کر

بایا تھا کہ ایک اینٹ شگاف سے میری کمر میں لگی۔ میرے بدن پر خاصا موٹا کوٹ تھا اور اس پر میں نے کمبل بھی اوڑھ رکھا تھا۔ اگر یہ دونوں چیزیں نہ ہوتیں تو اس نے جس انداز سے وہ اینٹ ماری تھی وہ میری کمر توڑنے کے لیے بہت کافی تھی۔

اینٹ لگتے ہی میں سیڑھیوں پر جا دبکا۔ اب میں اس کی زد میں نہیں تھا مگر ابھی میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ ایک اور اینٹ اس نے سیڑھی کے عین منہ پر پہنچ کر میری طرف پھینکی مگر اب کی بار اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ میں نے اسے دیکھ لیا تھا وہ ایک اور اینٹ میری طرف لڑھکا ہی رہا تھا کہ میں نے اس پہلے ہی چپ شاہ سے گولی داغ دی۔ میں نے جان بوجھ کر اس کے بدن کے کسی اہم حصے کو نشانہ نہیں بنایا تھا۔ گولی اس کی ران میں لگی اور وہ اپنی چیخ دباتا ہوا پیچھے ہٹا۔ اس کے ساتھ ہی میں دوڑ کر چھت پر جا پہنچا۔ وہ گلی کی طرف بنی منڈیر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ میں نے ایک گولی اور چلا دی۔ وہ بھی نشانے پر بیٹھی اور اس کی دوسری ران میں گھس گئی۔ وہ آدمی ڈگمگایا اور پھر تھوڑا کر منہ کے بل گر گیا۔ اب میں اس کے سر پر جا پہنچا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا خاصے لمبے پھل کا چھرا تھا اور میرا خیال ہے کہ اگر میں گولی اس پر نہ چلاتا تو سیڑھیوں میں اینٹوں سے بیدھا کر کے وہ مجھ پر چھرے سے وار کرتا۔

اس کی قوت برداشت حیرت انگیز تھی۔ وہ زخموں سے نڈھال تو ہوا مگر پھر بھی اس نے اپنی چیخ ابھرنے نہیں دی تھی۔ اس کی شلوار سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ سنبھل کر اٹھا مگر اس کی ٹانگیں اس کا بوجھ سہار نہیں رہی تھیں۔

"میرے ساتھ آؤ۔" میں نے اس کی کلائی پکڑ کر جھٹکا اس کے ہاتھ سے جھٹک دیا۔ اس کی ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ چھرا دور جا پڑا تھا۔ اور وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ بازی ہار چکا ہے۔ میں نے اس کا چھرا اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ بہادر آدمی تھا، جانتا تھا کہ آدمی ہار جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسے سہارا دے کر میں نے بڑی مشکلوں سے صحن میں پہنچایا اور پھر اندر لے جا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ ڈاکٹر عرفان وہاں مرہم پٹی کا جو سامان چھوڑ گیا تھا وہ ماجدہ نے الماری میں ڈال دیا تھا۔

اس لمحے وہ مجھے بہت غنیمت نظر آیا۔ میں نے صحن میں نکل کر گلی کا دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر کمرے میں جا کر میں نے اس کی شلوار پھاڑ کر اس کے زخم دیکھے۔ ایک گولی ران کے اندر تھی مگر زیادہ گہری نہیں تھی۔ دوسری گولی جلد کو آدھ انچ گہرا چھیلتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ میں نے اس کے چھرے سے اس کی ران میں سے گولی نکالی۔ وہ خاصا تکلیف دہ مرحلہ تھا مگر میں اس جوان کی ہمت پر آفرین کہوں گا کہ اس نے سی تک نہیں کی۔ بس آنکھیں بند کر کے لبوں کو بھینچ کر بیٹھا رہا۔ میں نے اس کے دونوں زخموں پر پٹی باندھ دی تو اس کے وجود میں چھپتا ہوا درد کا احساس کم ہونے لگا۔

وہ گندمی رنگ کا بڑا ہی صحت مند جوان تھا۔ عمر اس کی یہی کوئی تیس سال ہو گی۔ قمیص پر اس نے خاکی رنگ کی جرسی پہن رکھی تھی اور بھورے رنگ کی براق شلوار کے نیچے اس کے پاؤں میں کینوس کے سفید بوٹ خاصے بھلے لگتے تھے۔ جرابیں اس نے خاصی موٹی پہن رکھی تھیں۔ میں مرہم پٹی کر کے الگ ہوا تو وہ مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

"تم خاصے بہادر آدمی ہو کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا نام مشتاق ہے۔"

"ادھر کیسے آئے تھے تم؟" میں نے پلنگ پر بیٹھ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ پستول میں نے اپنے دائیں ہاتھ میں رکھ لیا تھا۔

"سگریٹ پیتے ہو تو لو پیو۔" یہ کہہ کر میں نے ایک سگریٹ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ پھر مسکرا دیا اور سگریٹ میرے ہاتھ سے لے کر اس کا برانڈ دیکھنے لگا۔

"پیو یہ اچھا سگریٹ ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا سگریٹ جلا دیا۔ وہ ایک طویل کش لے کر دھواں سینے میں دبا کر اپنی بھیگی نظروں سے مجھ کو دیکھنے لگا۔

"بتایا نہیں تم نے کہ تم ادھر کیسے آئے تھے؟"

وہ کچھ نہیں بولا۔

"تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟ میری بات کا جواب دو۔" میں نے پستول اس کی طرف لہرایا۔

"کون سے ساتھی؟" وہ بہت ہی پرسکون نظر آ رہا تھا۔

"وہی جو ماجدہ کو یہاں سے اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

"کوئی زیادہ آدمی نہیں تھے ہم۔"

"کتنے آدمی تھے؟"

"ایک میں تھا اور ایک نذیر۔"

"ماجدہ کہاں ہے اب؟"

"وہ ادھر چوہدری کرامت کی بیٹھک میں ہے۔"

"کرامت تمہارا کیا لگتا ہے؟"

"وہ ..... وہ میرا باپ ہے کہاں ہے وہ اب؟"

"یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا پہلے مجھے ماجدہ کا پتہ بتاؤ اگر تم نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی کی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا قسم خدا کی میں تمہیں بھون کر رکھ دوں گا۔"

"میں نے اس سے کچھ نہیں کہا ہے وہ بالکل محفوظ ہے۔"

"تم ادھر کیوں آئے تھے؟"

"میں اپنا بٹوہ لینے آیا ہوں وہ ادھر گر گیا تھا۔"

"اچھا؟ ماجدہ کو کیوں اٹھایا ہے تم نے؟"

"وہ چوہدری کرامت کے بارے میں کچھ نہیں بتا رہی تھی اس لیے اسے یہاں سے ہم نے اٹھا لیا ہے۔"

"کیا بتایا ہے اس نے؟"

"اس نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا ہے۔ ادھر ہم اس پر ہاتھ اٹھاتے تو وہ شور مچاتی، محلے کو جگا دیتی۔ اب ہم اسی لیے اسکو وہاں لے گئے ہیں۔"

"تمہیں یہ پتہ تھا کہ میں بھی یہاں ہوں گا؟"

"نہیں! مگر ہمیں شک ضرور تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ کوئی تم ایسا سور یہاں بیٹھا ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ پھر مسکرایا۔

"بٹوے کی کیوں اتنی فکر تھی تمہیں؟"

"اس میں میرا شناختی کارڈ تو تھا۔ میں ادھر محکمہ جنگلات میں کام کرتا ہوں۔"

"یہاں سے تم کچھ چیزیں بھی اٹھا کر لے گئے ہو؟"

"ہاں ایک نیا سا اٹیچی کیس ہے کالے رنگ کا، وہ ابھی ہم سے کھل نہیں سکا، ایک اور اٹیچی کیس ہے اس میں ماجدہ کے کپڑے اور زیور ہیں۔"

"اس ماجدہ کا کرامت سے کیا تعلق ہے؟"

"اس کا شوہر کرامت صاحب کا دوست تھا۔ وہ باہر جاتے وقت کرامت صاحب سے پندرہ ہزار روپے لے کر گیا تھا۔ کرامت صاحب ماجدہ سے وہ رقم وصول کرتے ہیں قسطوں میں، مہینے میں چار قسطیں بندھی تھی مگر کل رات وہ قسط وصول کرنے آئے تو پتہ نہیں کہاں چلے گئے — ہمیں وہ یہی کہہ کر آئے تھے۔ جب وہ آج شام تک بھی کہیں نظر نہ آئے تو میں اور نذیر ان کا پتہ کرنے ادھر آ گئے۔ یہاں ہمیں اس کمرے میں فرش پر خون جما ہوا نظر آیا۔

مگر ماجدہ
کچھ بتاتی ہی نہیں۔ یہ چکر ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔" یہ کہہ کر وہ ذرا دیر کے لیے کسمسایا۔ اس کے زخم شاید ٹیسیں دینے لگے تھے۔

"تمہیں درد محسوس ہو رہا ہے؟"

"ہاں تم نے تو بیڑہ ہی غرق کر دیا ہے میرا۔ بڑے ہیر کاریگر آدمی لگتے ہو مجھے، یہ تمہارا پستول بے آواز چلتا ہے؟"

"ہاں اور میرا نشانہ بھی کبھی خطا نہیں جاتا۔"

"یہ لو یہ گولی کھا لو۔ درد رک جائے گا۔" یہ کہہ کر میں نے الماری میں سے نکال کر اسے دو گولیاں دیں۔ وہ بھی ڈاکٹر عرفان وہاں چھوڑ گیا تھا۔

گولیاں اسے تھما کر میں صحن میں نکلا اور گلاس میں پانی بھر کر اندر لے گیا، تاکہ وہ گولیاں نگل سکے۔ اس کی آنکھوں میں ایسا اعتماد جھلکتا تھا کہ مجھے حیرت ہوتی تھی۔ وہ میرے پستول کی زد میں تھا۔ میں پلک جھپکتے میں اس کی زندگی کا چراغ گل کر سکتا تھا مگر وہ مجھ سے ذرہ بھر بھی خوفزدہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی یہ دیدہ دلیری دیکھ کر میں سخت طیش کھا رہا تھا مگر اس کے باوجود میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ اس پر کوئی اور وار کروں، اسے کوئی اور گزند پہنچاؤں۔ ایسے بہادر اور جرأت مند لوگ میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ وہ سخت زخمی تھا، اتنا زخمی کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ٹھہر ٹھہر کر مسکراتا تھا۔ بے پناہ اعتماد تھا اس کی مسکراہٹ میں اور اسے قطعاً یہ احساس نہیں تھا کہ وہ کتنے زبردست خطرات میں گھرا ہوا ہے۔

"مجھے اس جگہ کا پتہ بتاؤ جہاں ماجدہ کو تم نے بند کر رکھا ہے۔"

"وہ کرامت کی حویلی میں بند ہے مگر تم وہاں نہ پہنچ سکو گے یہ بڑے بڑے کتے پال رکھے ہیں کرامت نے۔"

"کتے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مجھے بتاؤ کون سا راستہ ادھر جاتا ہے اور وہ حویلی کے اندر بند ہے یا کسی آس پاس کے مکان میں؟"

"ادھر وہ نذیر کی کوٹھڑی میں پڑی ہے میرے ایک طمانچے سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی اب شاید اسے ہوش آ گیا ہو۔ میں تو اپنے بٹوے کے لیے ادھر آ گیا تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ صبح اس شناختی کارڈ کو دیکھ کر پولیس مجھے آ پکڑے۔"

"اس کے پاس میرا پستول بھی تھا۔"

"وہ نذیر کے پاس ہے مگر وہ چلتا ہی نہیں۔ اس میں شاید گولیاں پھنس گئی ہیں بالکل جام ہو چکا ہے وہ۔ ورنہ میں اسے ساتھ لے کر آتا اور تمہارا ادھر قصہ ہی پاک کر دیتا۔"

ابھی اس نے یہ بات کہی ہی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی میں پلنگ سے اترا اور کمرے کے دروازے پر باہر سے کنڈی چڑھا کر ڈیوڑھی میں جا پہنچا۔

"کون ہے؟" میں نے دبی زبان میں پوچھا

"دروازہ کھولیں جیلانی صاحب جلدی کریں۔" یہ ماجدہ کی آواز تھی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ میں نے پاگلوں کی طرح آگے بڑھ کر کنڈی کھولی تو ماجدہ تیزی سے اندر داخل ہوئی اس حال میں کہ اس کے سر پر ایک میلا کچیلا کمبل تھا اور ہاتھ میں دو اٹیچی کیس تھے۔ میں نے اس کے پیچھے دروازہ بند کیا اور اسے بانہوں میں بھر لیا۔

"آپ؟ آپ کیسے نکل آئی ہیں اس نذیر بدمعاش کے چنگل سے آپ نے تو کمال کر دیا ہے ماجدہ۔"

"آپ کو کس نے بتایا ہے کہ اس کا نام نذیر ہے؟ آپ کیسے جانتے ہیں اسے؟" وہ ہانپ رہی تھی۔

"چلیں اندر چل کر بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے دونوں اٹیچی کیس اٹھائے اور اسے اپنے ساتھ لے کر کمرے میں جا پہنچا۔

مشتاق اسے دیکھ کر یوں کرسی پر سے اچھلا جیسے اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ ماجدہ اسے دیکھتے ہی گالیاں دینے لگی۔ وہ غصے میں اس قدر بپھر گئی کہ پستول میرے ہاتھ سے چھیننے لگی۔

"یہ مجھے دے دیں میں اس کو یہیں ختم کر دوں گی۔ مجھے اس کی صورت سے نفرت ہے یہ مجھے دیں ادھر۔" وہ مجھ سے زور آزمائی کر رہی تھی۔

"نہیں ماجدہ! اتنا غصہ نہ کریں اسے اس کا سبق مل چکا ہے اس کی دونوں ٹانگیں زخمی ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے ماجدہ کو بڑی ہی مشکلوں سے پلنگ پر بٹھایا۔ وہ ایکدم بکھر گئی۔ رونے لگی بے تحاشا آنسو اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔

"ان دونوں نے مجھے ذلیل کیا ہے جیلانی صاحب! یہ۔۔۔۔ یہ دونوں میری عزت لوٹنا چاہتے تھے۔ ادھر نذیر بھی میرے ساتھ یہی حرکت کرنے لگا تھا میں جھوٹ موٹ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کی کوٹھڑی میں پہنچ کر بھی بے ہوش پڑی رہی۔ میں نے یہی ظاہر کیا۔ یہ جب بوڑھے کی تلاش میں ادھر بھاگا تو نذیر کے ہاتھ بے قابو ہو کر گستاخی پر اتر آئے میں نے اچانک پوری قوت سے لات اس کے پیٹ میں دے ماری۔ وہ دُہرا ہو کر پرے گرا تو میں نے اس کا چھرا اٹھا کر اس کی پسلی میں دے مارا۔ وہ اتنا سارا اندر دھنس گیا تھا میرا خیال ہے وہ کتا مر چکا ہو گا۔ وہ زخمی ہو کر زمین پر گرا تو میں نے اس کا کمبل اوڑھا اور وہ دونوں اٹیچی کیس اٹھا کر میں گلیوں میں اندر ہی اندر بھاگتی ہوئی یہاں آ گئی۔ آپ مجھے یہ پستول دے دیں میں اسے ابھی ختم کر دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر میرے پستول کی طرف جھپٹی مگر میں نے ہاتھ پرے ہٹا لیا۔

"نہیں ماجدہ! یوں نہیں، یہ بتائیں وہ میرا پستول کہاں ہے؟"

"وہ کیسا پستول رکھا ہے آپ نے؟ وہ چلتا ہی نہیں، میں نے بہت کوشش کی۔ اگر وہ کام دیتا تو آج مجھ پر یہ مصیبت نہ آتی۔"

"اب کہاں ہے وہ؟"

"وہ ادھر نذیر ہی کے پاس ہے اس نے کہیں رکھ دیا تھا مجھے ملا ہی نہیں ورنہ میں وہ بھی لے آتی۔"

"یہ میرا اٹیچی کیس کہیں کھولا تو نہیں انہوں نے؟"

"نہیں؛ یہ ان سے کھل ہی نہیں سکا اور پھر یہ بدبخت وہاں زیادہ دیر ٹھہرا بھی تو نہیں۔ اسے اپنے بوڑھے کی فکر لگ گئی تھی ورنہ یہ اٹیچی کیس ضرور کھول لیتے۔"

"کیا کہتے تھے یہ تم سے؟"

"یہ مجھ سے اس کرامت سوئر کا پوچھتے تھے اور فیروز کا بھی — میں نے جب کہا کہ مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہیں تو ان دونوں نے مجھے جکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ مجھے پتہ ہوتا تو میں بتاتی کہ وہ کس قبرستان کی کس قبر میں ہیں۔" ماجدہ بہت طیش میں تھی اور اس کا غصہ کسی طرح ٹھنڈا ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ سامنے بیٹھے مشتاق کو اتنی قہر آلود نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ اس کا وجود ہی برداشت نہ کر سکتی ہو۔

"تم اسے قتل تو نہیں کرا آئی ہو گشتی عورت! تیری وجہ سے پتہ نہیں کتنے آدمی تباہ ہو جائیں گے۔"

"زبان سنبھال کر بات کر مشتاق! میں ان کے خلاف ایک بات نہیں سن سکتا کسی زعم میں مت پڑنا۔"

"پتہ نہیں تو کیا شے ہے یار! مگر تجھے شاید یہ پتہ نہیں یہ عورت کئی گھروں کو تباہ کر چکی ہے یہ تجھے بھی لے ڈوبے گی۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔ جھوٹ بولتے ہو۔ مجھے تنہا اور مجبور دیکھ کر وہ کرامت مجھے ذلیل کرتا رہا اور اب تم دونوں یہاں آ گئے ہو بے غیرتو۔" ماجدہ رونے لگی۔

"تمہاری وجہ سے وہ شاکر مارا گیا۔ تمہارے پہلے دوست منظور نے اسے تمہاری وجہ سے گولی ماری تھی۔ خود وہ بے چارا عمر قید کے لیے جیل جا پہنچا۔ پھر وہ صدیق عرف تمہاری وجہ سے سر بازار زخمی ہوا۔ اسے بھی تمہاری محبت کی سزا ملی۔ اس کرامت کو بھی تم نے اپنے اوپر چڑھایا اس سے تم نے پندرہ ہزار۔۔۔ وحید کو دلوایا۔ خود بھی تم اس سے بیس پچیس ہزار روپے کھا چکی ہو۔ اب پتہ نہیں کرامت کا کیا کیا ہے تم نے، وہ زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے۔" مشتاق نے بڑی تفصیل سے ماجدہ کے سارے کارنامے اس کے سامنے گنوا دیئے۔ ماجدہ تو سر پیٹ کر رہ گئی چیخنے لگی۔

"یہ جھوٹ بولتا ہے جیلانی صاحب! مجھے مرتے دم کلمہ نصیب نہ ہو جو میں غلط کہوں۔ یہ بہتان باندھ رہا ہے۔ بالکل بکواس کر رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں ماجدہ، کوئی بات نہیں۔ تنہا عورت پر ایسے ہی الزام لگا کرتے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں میں سب سمجھتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے ماجدہ کے آنسو پونچھے اسے تسلی دی کہ وہ میرے بارے میں فکر مند نہ ہو وہ جیسی بھی ہے میرے لیے ہر لحاظ سے قابل عزت ہے۔ مگر وہ کسی طرح چپ ہی نہ ہوتی تھی مشتاق کو مسلسل گالیاں دیئے جاتی تھی۔ آخر تنگ آ کر میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"آپ خاموش بھی ہوں گی کہ نہیں۔ مجھے یہ آنسو شانسو بالکل اچھے نہیں لگتے۔ کوئی کام کی بات کرنے دیں مجھ کو اس سے۔" میرے لہجے کی سختی اس نے محسوس کی تو قدرے مدھم پڑ گئی۔ بولی۔

"خدا میرا انصاف کرے گا مشتاق بندے۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ میں وہیں جا کر پٹہ ڈالوں گی تیری گردن میں۔"

"ہاں بڑی ولی اللہ ہے تو۔ خدا تیرے مشورے ہی سے تو سارے کام کرتا ہے۔ تو نے اس قصبے کو گندا کر دیا ہے کم ذات! تجھے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔" مشتاق بھی فقرے بازی اور لن ترانی میں ماجدہ سے کسی طرح کم نہ تھا اور وہ میرے سامنے بیٹھا اس سے یوں نوک جھونک کر رہا تھا جیسے اس نے مجھے یکسر نظر انداز کر دیا ہو۔

"تم چپ نہیں ہو گے مشتاق! الو کے پٹھے۔ یہ تمہاری ماں کا گھر نہیں ہے۔ میں تیری آنتیں کاٹ کے رکھ دوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے [illegible] ہاتھ کا جھانپڑ اس کے منہ پر دے مارا مگر وہ ایکدم مسکرا کر بولا۔

"مجھے معاف کر دے یار! میں تجھ سے بہت شرمندہ ہوں۔

بہادر آدمی ہے اور عزت دار بھی نظر آتا ہے۔ اس کی باتوں پہ مجھے غصہ آ گیا تھا۔ اب میں کچھ نہیں کہوں گا اسے۔"

"ہاں اب ان کی خوشامد کرتے رہو یہی تجھے بیٹھ ڈالیں گے۔ تمہاری ماں بہن کو اب یہی سیدھا کریں گے۔" یہ کہہ کر ماجدہ پلنگ پر سے اتری اور فرش پر پیر پٹختی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"کیا یہ سب کچھ سچ ہے جو تو کہہ رہا ہے؟" میں نے بہت ہی غصے لہجے میں پوچھا۔ ماجدہ کے بارے میں اس نے جو کچھ مجھے بتایا تھا وہ اتنا تکلیف دہ تھا کہ میرا کلیجہ کٹنے لگا تھا۔

"تو اور کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں بھائی۔ بہت گندی شے ہے یہ۔ اب پتہ نہیں اس نذیر کا کیا حال ہو گا۔ یہ اُسے چاقو مار آئی ہے۔" مشتاق اندر سے لرز رہا تھا۔ نذیر کے بارے میں وہ سخت فکر مند تھا۔

"ہو سکتا ہے وہ مر ہی گیا ہو۔"

"اور ادھر وہ کرامت اور فیروز بھی غائب ہیں پتہ نہیں ان کو کس طرح مروایا ہے اس نے۔ ادھر دیکھو ابھی فرش پر خون جما ہے یہ دیکھو۔" وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ماجدہ نے وہ خون بھی صاف نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اسے اگر عقل ہوتی تو وہ دن کے وقت دو بالٹیاں پانی ڈال کر اس دہشت کے نشان کو دھو سکتی تھی۔

"انہیں کچھ نہیں ہوا ہو گا۔ یہ اکیلی کیا کر سکتی ہے بھلا۔"

"تم نہیں سمجھتے ہو یار، پتہ نہیں اس نے کس کس ذات کے شہدے دوست بنا رکھے ہیں یہ کیا نہیں کر سکتی ہے یہ بدمعاش عورت۔"

"تم پھر اسے میرے سامنے گالی دے رہے ہو مشتاق۔" میں نے اسے ایک بار پھر ڈانٹا۔

وہ قدرے بدک گیا، بولا۔

"مجھے افسوس ہے یار کیا نام ہے تمہارا جیلانی ہاں جیلانی بھائی، مگر اس نے مجھے غصہ دلا دیا ہے۔ نذیر کو پتہ نہیں کیا کر آئی ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے اب تم بتاؤ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟ تھانے پہنچا دوں تمہیں؟"

مشتاق کی حیرت کے مارے آنکھیں پھیلنے لگیں۔ اس نے حالات کے اس رُخ پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ ایک دم اپنے ہاتھ جوڑ کر میرے آگے کر دیئے اور بڑے ہی دردیلے لہجے میں بولا۔

"یہ ظلم نہ کر میرے بھائی میں تباہ ہو جاؤں گا۔ نوکری سے بھی جاؤں گا اور عزت بھی برباد ہو جائے گی۔"

"تو گویا تمہاری کوئی عزت بھی ہے؟"

"عزت تو گلی میں کھڑے کتے کی بھی ہوتی ہے بڑے بھائی! میں بھی ذات کا چیمہ ہوں۔ ادھر اکبر کوٹ میں ہماری زمینیں ہیں۔ زیادہ تو نہیں پھر بھی ہم عزت دار لوگ ہیں میرے دو بچے ہیں۔ ایک بیمار ہے۔ گھر [illegible] ادھر کرامت کی وجہ سے [illegible] آ گیا ہوں۔

"اچھا، تو تم اکبر کوٹ کے رہنے والے ہو۔" میرے ذہن میں اچانک بجلی سی کوند گئی۔

"مگر اکبر کوٹ کی ساری زمینیں تو سنا ہے ہادی علی کی ملکیت ہیں شاید؟"

"وہ ایک پوری وَنڈ کا مالک ہے، بہت بڑا آدمی ہے۔ وہ علاقے کا سب سے بڑا چوہدری ہے ہم تو اس کے آگے کچھ بھی نہیں ہیں۔"

"کیسا آدمی ہے وہ؟ لو سگریٹ پیو۔" یہ کہہ کر میں نے اسے سگریٹ سلگا کر دے دیا، وہ پھر سینے میں دھواں گھونٹ گھونٹ کر سگریٹ پینے لگا بولا۔ "کسی خنزیر کی اولاد ہے وہ۔ سارا علاقہ دہلتا ہے اس کے دبدبے سے۔ ہم بھی اس کا ڈنک سہہ چکے ہیں۔"

"وہ کس طرح؟ مگر ٹھہرو میں تمہارے لیے چائے نہ بنواؤں؟ اندر سے تم مجھے اچھے آدمی نظر آتے ہو۔"

"مہربانی ہے تمہاری جو ایسا سوچتے ہو۔ میرا خیال ہے ہم دوست بن سکتے ہیں جیلانی بھائی۔ بہادر آدمی کا میں ہاتھ بندھا غلام ہوں۔" وہ ایک بار بڑے اعتماد سے مسکرا دیا۔ اس کی کرنجی آنکھوں میں اس سمے ایسی محبت بھری چمک ابھر آئی تھی کہ میرا جی چاہا میں اسے سینے سے لگا لوں۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اسے زخمی کر دیا تھا حالانکہ وہ خاصے گہرے زخم تھے مگر وہ بڑے صبر سے ان کی اذیت سہہ رہا تھا۔

"ماجدہ! ادھر آئیں بھئی ذرا۔" میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ماجدہ کو پکارا مگر اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ شاید مجھ سے بھی ناراض ہو گئی تھی۔ میں نے پستول ہاتھ میں لیا اور پلنگ سے اتر کر اس کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہ لحاف اوڑھ کر بیٹھی تھی اور چلغوزے ٹھونگ رہی تھی۔ "تو یہ ٹھاٹھ ہیں گویا! ہمیں نہیں پوچھیں گی آپ؟"

"جی نہیں، میں سخت ناراض ہوں آپ سے۔ میرے دشمن سے آپ پینگیں بڑھا رہے ہیں۔" وہ بہت سنجیدہ تھی۔

"یہ بات نہیں ہے جناب! بلکہ مجھے تو ابھی اس سے بہت کام لینے ہیں۔ آپ جو نذیر کو مار آئی ہیں تو اس کا بھی تو کوئی بندوبست کرنا ہے۔"

"وہ مرا نہیں ہو گا سوئر۔ اتنا غیرت مند نہیں وہ۔ خیر یہ لیں آپ بھی کھائیں ڈھیر سارے منگوا رکھے ہیں میں نے۔ رات مجھے یاد ہی نہیں آئے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک طشتری میں ڈال کر ڈھیر سارے چلغوزے دے دیئے۔

"یہ چلغوزے تو مل گئے ہیں اب اگر چائے بھی پلا دیں تو آپ کی مہربانی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے جناب میں ابھی بنا دیتی ہوں مگر اس کو ایک قطرہ نہیں دوں گی۔"

"ارے نہیں بھئی! وہ ہمارا مہمان ہے اب۔ پلا دو اسے بھی میں نے اس پر دو گولیاں چلائی تھیں۔"

"پھر بھی نہیں مرا وہ بے غیرت۔"

"میں نے جان بوجھ کر اس کی ٹانگوں کو نشانہ بنایا تھا کس کس کو مارتے پھرتے ہیں گے ہم۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ مگر یہ بات یاد رکھیں کہ میرے بارے میں وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ بالکل غلط ہے جھوٹ بولتا ہے وہ بدمعاش۔ میں ایسی ہوتی تو ایسے غنڈے مجھ پر چڑھ دوڑتے۔"

"میں سب سمجھتا ہوں۔ اس کی بکواس کا مطلب بھی جانتا ہوں — آپ فکر نہ کریں ماجدہ! بس ذرا اچھی سی چائے بنا دیں۔"

وہ سلیپر گھسیٹتی ہوئی رسوئی خانے میں جا گھسی اور میں پھر مشتاق کے پاس جا بیٹھا اور چلغوزے اس کے سامنے تپائی پر رکھ دیئے۔ وہ انہیں بڑی رغبت سے کھانے لگا میری اس تواضع پر وہ خوش ہو گیا تھا۔

"ہاں تو کیا ڈنک مارا تھا اس ہادی علی نے تمہیں؟"

"ڈنک سا ڈنک مارا ہے اس نے میرے یار، ادھر وہ اشتمال اراضی کے وقت اس نے ایسی گڑبڑ کی کہ ہماری تمام اچھی اچھی زمین اس نے اپنے کھاتے میں ڈلوا لی۔ پورا ایک مربع تباہ کر دیا اس نے ہمارا۔ بڑا فساد پڑا وہاں۔ لڑائی بھی ہوئی جس میں میرے ابا جی مارے گئے تھے۔ انہیں ہادی علی کے ایک تلنگے نے بلوے میں گولی مار دی تھی۔"

"پھر؟"

"پھر کیا ہوتا؟ وہ آدمی تو سات سال کے لیے جیل چلا گیا مگر ہم اور کچھ بھی نہ کر سکے۔ ہادی علی آج بھی مونچھوں پر تاؤ دیتے پھرتا ہے۔ اب تو وہ اسمبلی کی ممبری کے لیے کھڑا ہو رہا ہے۔"

"مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے مشتاق! اگر وہ ایسا ظالم آدمی ہے تو اس کا تو جھٹکا کر دینا چاہیے۔"

"مگر اتنی ہمت کس میں ہے یار! بڑے غنڈے پال رکھے ہیں اس نے اور ادھر اس کی سرکار دربار میں بہت مانی جاتی ہے۔"

"اچھا! کمال ہے۔ اگر تم کہو تو میں کاٹ دوں اس کی ڈور ی؟"

"تمہیں کیا پڑی ہے بھائی میری آگ میں کودنے کی۔ میرا تمہارا ناطہ ہی کیا ہے۔ ابھی دو گھڑی بعد تم مجھے گولی مار دو گے مجھے اپنا انجام معلوم ہے مگر میں ہمت ہارنے والا نہیں ہوں۔"

"اچھا، تمہیں یہی لگتا ہے مجھ سے! نہیں یار، ایسا نہ سوچو! تمہارے بارے میں میری رائے بہت اچھی ہے۔ تم حوصلے والے آدمی ہو۔"

وہ فرش پر تھوک کر بولا۔

"تم نے مجھے مروڑ کر رکھ دیا ہے یار۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ہے جو تم مجھے تو بس تم ہی جانتے ہی دو۔" وہ مسکرایا۔ مگر اب کی بار اس کی مسکراہٹ میں تازگی نہیں تھی۔

"اتنے زخمی ہو تم، چل نہ سکو گے۔"

"یہی تو زیادتی کی ہے تم نے میرے ساتھ۔"

"اچھا دیکھو! یہ بتاؤ اگر ہادی علی کو میں تمہارے راستے سے ہٹا دوں تو تم اپنی زمین واپس لے سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔ میں دوسرے ہی دن وہاں اپنے ڈنگر پھیر دوں گا۔ پورا مربع زمین مجھے دوبارہ مل سکتی ہے۔"

"پھر تم کرامت سے دوستی چھوڑ سکو گے؟"

"اس پر تو میں نے آج ہی لعنت بھیج دی ہے وہ بڑا ہی چھچھورے قسم کا آدمی ہے خواہ مخواہ مروائے گا وہ اپنے یاروں کو۔ گھر میں اس نے تین بیویاں باندھ رکھی ہیں پھر بھی ادھر ادھر منہ مارنے سے باز نہیں رہتا۔"

"ٹھیک ہے میں ہادی علی کو ٹھکانے لگا دوں گا مگر ایک شرط پر۔"

"وہ شرط کیا ہو گی؟"

"کوئی خاص نہیں! بس تم مجھے ادھر اکبر کوٹ لے چلو گے اپنے گھر میں ٹھہراؤ گے اور ہادی علی کے بارے میں سب کچھ بتاؤ گے کہ وہ کہاں رہتا ہے کیا کرتا ہے۔ کس وقت اس کو پکڑا جا سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"وہ تو میں سب کچھ کر دوں گا مگر ایسا نہ ہو تم بھی کہیں پکڑے جاؤ۔"

"نہیں، تم بالکل سامنے نہیں آؤ گے۔"

"مگر جب تم میرے گھر پر ٹھہرو گے تو سب لوگ جان لیں گے کہ میرا تمہارا کیا تعلق ہے۔"

"تو پھر تم مجھے کسی اور جگہ ٹھہرا دینا۔ ہادی علی تک پہنچنے کے لیے مجھے چاروں طرف تو دیکھنا ہی پڑے گا نا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تم کیوں میری ہمدردی میں یہ سب کچھ کر رہے ہو تمہیں کیا مصیبت پڑی ہے؟"

وہ پہلے تو میری باتوں کو مذاق پر محمول کر رہا تھا مگر جب معاملے کو میں نے آگے بڑھانا چاہا تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔ حیرت اس کے چہرے پر نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔

"مجھے تم سے ہمدردی ہے بھائی! بس یوں سمجھو کہ میں نے تمہیں جو زخم لگائے ہیں ان کی قیمت چکانا چاہتا ہوں۔"

وہ مطمئن ہو گیا۔ بولا۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی اس خنزیر پر ہاتھ ڈال سکے تو کئی سات گاؤں پر احسان کرے گا۔ میرے باپ کا قاتل تو وہ ہے ہی۔"

"بس تو ٹھیک ہے مجھے تم اپنے گھر پہنچا دو، میں تمہارے باپ کے قاتل سے انتقام لے لوں گا۔"

میری یہ بات سن کر اس نے مجھے اکبر کوٹ میں اپنے گھر کا پتہ بتا دیا۔ بولا۔

"میرے زخم پتہ نہیں کتنے دنوں میں ٹھیک ہوں۔ بہرحال میں کل پندرہ دن کی چھٹی لے کر گھر جا پہنچوں گا۔ تم بھی کل شام کو ادھر آ جاؤ پھر دیکھیں گے تم کیا کر سکتے ہو۔"

اتنے میں ماجدہ چائے لے کر اندر آ گئی۔ اس نے بڑی پھرتی دکھائی تھی مگر اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی طاری تھی کہ کچھ کہنے کی مجھے ہمت ہی نہ پڑی۔ مشتاق اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا جب وہ کمرے سے باہر جانے لگی تو اس ظالم نے ایک دم پینترا بدلا اور نہایت ہی ملائم اور میٹھی آواز میں بولا۔

"بھابی! مجھے معاف کر دیں۔ میں پتہ نہیں کیا کچھ بکتا رہا ہوں۔ طیش میں آدمی کے ہوش ٹھکانے نہیں رہتے۔ مجھے معاف کر دیں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے نیچے جھکا اور اس نے ماجدہ کے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

ماجدہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس کے فرشتوں کو بھی یہ امید نہیں تھی کہ مشتاق یوں ایک دم بدل جائے گا اور اتنا نیچے گر جائے گا۔ وہ سُن ہو کر رہ گئی اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں پٹ پٹ جھپکاتی ہوئی بولی۔

"دیکھیے یہ آپ! یہ کیسا ڈرامہ رچا رہا ہے۔ کیا سمجھا ہے آپ نے؟"

وہ مسکرانے لگی تھی۔

"نہیں! خدا کی قسم بھابی! یہ بات نہیں ہے۔ میں سچے دل سے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اب کبھی کرامت سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ اپ کو بہت ستایا ہے ہم نے۔" مشتاق کی آواز گلوگیر ہو رہی تھی اور ہاتھ اس کے اب بھی ماجدہ کے سلیپروں پر رکھے تھے۔

"معاف کر دیں اسے ماجدہ! یہ اچھا آدمی ہے۔ سمجھ لیں کہ آج سے بندے کا پتر بن گیا ہے۔" میں نے اس کی سفارش کی۔ وہ منظر ہی ایسا تھا کہ میرا بھی دل پسیج گیا تھا۔ مشتاق نے ماجدہ کو اپنی عاجزی سے بے حد متاثر کر دیا تھا۔ وہ جھکی اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر الگ کر کے بولی۔

"ٹھیک ہے اگر آپ سچے دل سے ایسا کہہ رہے ہیں تو میں نے بھی تمہیں سچے دل سے معاف کیا۔ اب تم جا کر اس نذیر کو سنبھالو۔"

"اس کی فکر نہ کریں۔ اگر وہ زندہ ہے تو میں اس سے بیان دلوا دوں گا کہ اس پر کسی نے اندھیرے میں وار کیا تھا۔ اور یہ کہ وہ اپنے دشمن کو بالکل نہیں پہچانتا ہے۔" اس کی یہ بات سنتے ہی ماجدہ مسکرا دی۔ اس کے چہرے کی دونوں خواتین پٹ پٹا کر جھک رہیں۔ ان کی روشنی اچانک سرچند ہو گئی وہ مجھے اس گھڑی پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے اب آپ آرام کریں میں ان کو رخصت کر کے ابھی آتا ہوں۔"

وہ باہر چلی گئی تو مشتاق بولا۔

"میرا خیال ہے میں آہستہ آہستہ چل کر گھر پہنچ سکتا ہوں۔ میرا ٹھکانہ بھی نذیر کے پاس ہی ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور پاؤں پر بوجھ ڈال کر بولا۔

"کوئی لاٹھی دے دیں مجھے۔ اس ٹانگ پر بوجھ برداشت نہیں ہوتا۔" میں نے پلنگ کے نیچے رکھی ایک لاٹھی اسے تھما دی وہ اس کے سہارے چلتا ہوا باہر گلی میں نکلا تو میں نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں کل شام ادھر تمہارے بھائی مشتاق کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"میں کل دوپہر تک گھر چلا جاؤں گا اور تمہارا انتظار کروں گا — خدا حافظ۔" یہ کہہ کر مشتاق لاٹھی ٹیکتا بڑی مشکلوں سے آگے بڑھا۔ اس کا زخم اسے بے چین کر رہا تھا پھر بھی وہ اپنی بے پناہ قوتِ ارادی کے بل بوتے پر چلتا ہوا گلی سے نکل گیا۔ میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا لی۔ دو گھڑی کے تڑکے میری آنکھ کھلی۔

اچانک مجھے کرامت اور فیروز یاد آتے میں نے ماجدہ کو جگا دیا۔

"بی بی جی، اب اُٹھ جائیے اور اس گھر کو چھوڑ دیجیے۔ وہ سالے کرامت اور فیروز ادھر شور مچا رہے ہوں گے اور پولیس کو لے کر سیدھے ادھر آئیں گے۔"

"ہائے میں مر گئی! ان کے ساتھ آپ نے سلوک بھی تو بہت بُرا کیا تھا مگر میں جاؤں گی کہاں؟"

"میں ابھی ٹرک لاتا ہوں آپ اس میں سامان لادیں اور لاہور چلی جائیں۔ وہاں میرے ایک دوست ہیں آہو صاحب۔ بادامی باغ میں رہتے ہیں۔ ان سے کہیے وہ آپ کو کرائے پر مکان لے دیں گے۔ آج ہی۔ بس آپ چُپ چاپ وہاں رہیئے۔ پانچ سات دن تک میں بھی آ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے جلدی سے آپ جا کر ٹرک لے آئیے میں آج ہی چل دیتی ہوں یہاں رہنا بہت خطرناک ہو گا۔" مگر پھر کچھ سوچ کر بولی۔

"آپ میری فکر نہ کریں جیلانی صاحب میں یہیں ٹھہروں گی۔ ان کے پاس کیا ثبوت ہے۔ میں صاف مکر جاؤں گی۔"

"ہاں، یہ بھی درست ہے اب ذرا خون شون دھو ڈالیں اور کوئی نشان ایسا نہ رہنے دیں جس سے کسی کو کوئی شک پڑ سکے۔"

"یہ میں ابھی کر دوں گی مگر میرا یہاں سے بھاگ جانا اچھا نہ ہو گا خواہ مخواہ پولیس کو شک کرنے کا موقع ملے گا۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں اگر کوئی جھگڑا ہوا تو میں سنبھال لوں گا۔ مگر دیکھیں میں آج دوپہر تک یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"کہاں؟" وہ حیرت زدہ سی ہو کر میرا منہ تکنے لگی۔

"ایک کام ہے مجھے ادھر جہلم میں، وہ میں کر آؤں بس چار پانچ روز تک آ جاؤں گا۔" میں نے جہلم کا نام خواہ مخواہ لے دیا، حالانکہ میں اکبر کوٹ جا رہا تھا۔

"بہت بہتر جناب جیلانی صاحب کنیز کیا کہہ سکتی ہے۔" اس نے بہت ہی غمگین لہجے میں کہا میرے نام کو اس نے بڑی خوبصورتی سے بگاڑ دیا تھا۔

"ارے آپ پریشان نہ ہوں آپ کو اب کبھی نہ بھول سکوں گا۔" میں سوچتا تھا کہ اگر سب عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں تو پھر گرہستی پانسائیت کہاں ملتی ہے جو صدیوں تک دلوں میں آتشیں جذبے بیدار رکھتی ہے جو

مجنوں کو صحرا صحرا لیے پھرتی تھی۔ جو عزت بیگ کو مہینوال بنا گئی تھی۔ وہ شے کیا ہوتی ہے وہ ایسی تو ہرگز نہ ہو گی جو ہاتھ بڑھانے پر یوں مٹھی میں سمٹتی چلی آتی ہے۔ یہ خاصے ٹیڑھے سوالات تھے مگر میں ان کا اس لمحے کوئی جواب نہ پا کر پلنگ سے اتر گیا۔ دو گھڑی کے اس سفر کو علحدہ تو نہیں کرنا تھا۔ اس اجنبی قصبے کی ویران اور متعفن فضا میں اس کا میسر آجانا میرے لیے بہت غنیمت تھا کہ اس کی بدولت میرے کچھ لمحے اس اچھے گزر گئے تھے۔

دوپہر کو میں نے اپنا سامان سمیٹا، لباس تبدیل کیا۔ تبدیل کیا کیا، بس کرتہ شلوار پہن کر انگریزی سے دیسی جون میں آگیا۔ کرتے کے اوپر میں نے کوٹ پہنا اور کمبل اوڑھ لیا۔ اس روز آسمان ابر آلود ہو رہا تھا اور باہر ایسی یخ بستہ ہوا چلتی تھی کہ آدمی کو ڈھیر سارے کپڑوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ ڈر مجھے یہی لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی پولیس والا مجھے پہچان نہ لے کہ پولیس ہمہ وقت ہر جگہ چوکس رہتی ہے اور یار لوگ اور کچھ نہیں تو فساد فی سبیل اللہ کی خاطر ہی مشکوک لوگوں کو پکڑ کر تھانے پہنچانے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اسی خیال سے میں نے علیحدہ کا رایا ہوا ایک مفلر سر پر لپیٹ لیا۔ رقم جیبوں میں بھری اور قیمتی کپڑے اور سوٹ کیس وہیں چھوڑ دیا۔

رخصت ہونے سے پہلے میں نے پانچ ہزار روپیہ ماجدہ کے ہاتھ پر رکھا تو وہ بدک کر پرے ہٹ گئی۔ نوٹ نیچے گر گئے۔ اس نے ہتھیلی الٹ دی تھی۔ "کمال کرتی ہیں آپ بھی۔ یہ روپے رکھ لیں کہیں کام آئیں گے میرے لیے دعا مانگیں میں بخیر و عافیت واپس آ جاؤں پھر ہم اپنی زندگی کے بارے میں سوچیں گے۔ مجھے آپ کے ساتھ بہت دور تک جانا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے نوٹ اٹھا کر پھر اس کے ہاتھ میں دے دیے۔

"خدا جانے مردوں کا یہ بھرم کس دن ختم ہو گا کہ وہ عورتوں کی محبت روپے پیسے سے خرید سکتے ہیں۔ حضور یہ کستوری آپ اپنی جیب میں رکھیں آپ نئے سفر پر جا رہے ہیں۔۔۔ آپ کو ان کی زیادہ ضرورت ہے۔" یہ کہہ کر اس نے نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیے۔ میں کچھ خفیف سا ہو کر رہ گیا اور نوٹ دوبارہ اسے پیش کرنے کی مجھے جرأت نہ ہوئی۔

بازار میں نکلتے ہی میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور اس میں بیٹھ کر اکبر کوٹ کی طرف چل دیا۔ وہ ٹیکسی انہی دیہاتی علاقوں میں چلتی تھی۔ اکبر کوٹ کا نام سن کر ڈرائیور خوش ہو گیا۔ میں نے اس کے منہ مانگے دام اسے دینے کا وعدہ کر لیا تو وہ جھوم اٹھا۔ سمجھ گیا کہ کوئی بھاگوان سواری مل گئی ہے۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا اور اس علاقے کے تمام گاؤں اور ان کے رہنے والوں کے بارے میں خاصی معقول قسم کی معلومات رکھتا تھا۔ وہ اکبر کوٹ کے قریب کے گاؤں شاہ پور کا رہنے والا تھا۔

اکبر کوٹ کے ہادی علی کا ذکر آیا تو وہ بھی زہر اگلنے لگا۔ بولا۔

"اس کی کیا پوچھو ہو میاں جی۔ بڑوں نے لاڈ لا لپیے لے۔۔۔ وہ بیلا لاڈلا بچھا ہے مگر چاہتا ہے کہ سارے ضلع کا مال اپنے گھر میں ڈال لے بڑے ظلم توڑے ہیں اس نے اس علاقے میں۔"

"اس کا بچہ بچہ کوئی نہیں ہے؟"

"بچیاں تو اس کی دو ہیں مگر بچہ کوئی نہیں ہے۔ اور تم جانو میاں جی نر اولاد کے بغیر وارث کون ہو گا۔ جوائی ہوں گے نا۔ وہ کھا پی کر ہضم کر جائیں گے اس کی جائداد یا پھر شریک لے جائیں گے۔ اس کے ہاتھ کیا آئیگا۔ وہ تو مر کر قبر میں جا لیٹے گا۔ پھر ایسی حرص کا کیا فائدہ میاں جی۔ مگر وہ سمجھتا ہی نہیں ہے کہیں ایک گز زمین بھی لاوارث ملتی ہے تو وہیں لاٹھی گاڑ دیتا ہے۔"

"ایسا خبیث آدمی ہے وہ؟"

"کوئی ایسا ویسا میاں جی۔ ابھی آج شام کو پتہ نہیں ادھر کیا ہو جائے لالو وینڈے کے مزارعوں سے اس کی ٹھن گئی ہے اور شاید آج وہاں جھگڑا ہی ہو جائے پولیس کو بھی اس نے بلوا رکھا ہے۔"

"اچھا، تو یہ بات ہے۔ خیر! بابا جی ایک نہ ایک دن تو حساب دینا ہی پڑے گا اسے۔ ڈوری زیادہ ڈھیلی نہیں چھوڑتا رب اللہ میاں۔" میں نے بہت ہی نپے تلے لہجے میں کہا۔ سوچ میں یہ رہا تھا کہ جس کسی سے بھی میں پوچھتا ہوں ہادی علی کے بارے میں وہ بیچارا توبہ توبہ ہی پکار اٹھتا ہے۔ ایسی ہی دہشت پھیلا رکھی ہے اس بھیڑیئے نے علاقے میں۔ مگر وہاں کوئی ایسا نہیں تھا جو اسے نتھ ڈال سکے۔ ڈرائیور کا نام خیرات علی تھا۔ وہ جب اپنے دل کا غبار نکال چکا اور اس علاقے کے دو متمول لوگوں کو بھی بھر کر کوس کاٹ چکا تو میں نے پوچھا۔

"یہ بتاؤ خیرات بابا! یہ وہ مشتاق صاحب کی کیا حیثیت ہے اکبر کوٹ میں؟"

"وہ جو محکمہ جنگلات میں گارڈ ہے؟"

"ہاں ہاں وہی۔ میں دراصل انہی سے ملنے جا رہا ہوں۔"

"کیا کہوں میاں جی! وہ تین بھائی ہیں۔ ہادی علی کے مزارع ہیں۔ کسی زمانے میں ان کے پاس اپنی زمین تھی مگر لڑائی جھگڑوں میں پڑ کر انہوں نے وہ زمین بیچ ڈالی۔ ان پر کوئی دس سال پہلے ایک مقدمہ چلا تھا جس میں اشفاق کو تین سال کے لیے جیل جانا پڑا۔ اس نے ایک آدمی کو شدید زخمی کر دیا تھا۔"

"اب کوئی زمین نہیں ہے ان کے پاس؟"

"نہیں! ایک مربع زمین تھی ادھر ان کے پاس۔ وہ ساری کی ساری دریا کھا گیا۔ اب تو وہ ہادی علی کے مزارع ہیں۔"

"مگر میں نے سنا ہے کہ چوہدری نے اشتمال اراضی کے دوران ان کی زمین اپنے کھاتے میں ڈال لی تھی۔"

"وہ آدھا مربع زمین تھی۔ ان کے باپ غوث محمد نے لڑکی کی شادی پر ہادی علی سے پانچ ہزار روپے قرض لیا تھا، وہ ادا نہ کر سکا تو

اس نے زمین اسے دے دی۔ بعد میں بہت جھگڑا ہوا۔ اس کے تینوں بیٹے اشفاق، مشتاق اور قادر دن اٹھ کھڑے ہوئے بہت لڑائی ہوئی تھی گاؤں میں جس کے دوران ان کا میاں مارا گیا۔" خیرات علی وہی بات بتا رہا تھا جو میں مشتاق سے سن چکا تھا۔

اکبر کوٹ پہنچ کر میں خوش ہو گیا۔ وہ کوئی زیادہ بڑا گاؤں نہیں تھا پھر بھی اپنی صفائی ستھرائی کے اعتبار سے وہ بہت ہی قابل رشک گاؤں تھا۔ درختوں کے جھنڈ میں چھپا ہوا۔ اور اس میں سب سے الگ اور منفرد جو چیز مجھے نظر آئی تھی، وہ ہادی علی کی حویلی تھی۔ میں اس حویلی کے قریب سے گزرا تو مجھے لاہور کی کوٹ لکھپت جیل یاد آ گئی۔ یہاں سے وہاں تک وسیع زمین اس حویلی کے نیچے تھی۔ چار دیواری پر ہی اس نے بے حساب روپیہ خرچ کر دیا ہو گا۔ حویلی اس وسیع قطعہ زمین کے عین وسط میں کھڑی تھی۔ دو منزلہ عمارت تھی جس کے اندر ہر آسائش مہیا ہو گی۔ میں اس حویلی کے پاس سے گزر کر رستہ پوچھتا پوچھتا مشتاق کے گھر جا پہنچا۔ وہ مجھے دروازے پر ہی مل گیا میرے انتظار میں بیٹھا تھا۔ مکان اس کا کچا تھا اور گاؤں کی جنوبی سمت میں اس طرح بنا ہوا تھا کہ دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک ڈیوڑھی سی تھی جس کے آمنے سامنے دروازے لگے تھے اور دائیں بائیں زمین کو ابھار کے دونوں طرف چبوترے سے بنائے ہوئے تھے۔ ان پر ادھر بھی چارپائیاں بچھی تھیں اور ادھر بھی سامنے یہ بڑا سا صحن تھا جس میں دونوں سمت چار دیواری کے ساتھ سایہ دار درخت لگے تھے۔ صحن سے آگے ایک برآمدہ تھا اور اس کے پیچھے کمرے تھے۔ بائیں ہاتھ صحن کے وسط میں دیوار کے ساتھ ایک چھپر تھا جس کے نیچے دو بھینسیں بندھی تھیں اور تین بیل۔ یہی اس گھر کی کل کائنات تھی۔ تینوں بھائی ایک ہی جگہ رہتے تھے اور ان میں سے صرف اشفاق ہی شادی شدہ تھا۔ باقی دونوں کنوارے تھے۔

مشتاق نے مجھے ڈیوڑھی ہی میں چارپائی پر بٹھا دیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اور وہ جو بے پناہ اعتماد اور ٹھہراؤ اس کے چہرے پر میں نے ماجدہ کے گھر میں دیکھا وہ اب کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

رات کو اس نے میرے پاس ہی ڈیوڑھی میں بستر جما لیا۔ حقہ وہ ساتھ لے آیا تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ مجھ سے کھل کر بات نہیں کر رہا تھا۔ اسے شاید یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ میں یوں اچانک ان کے خاندانی دشمن کا سر اتارنے کے لیے وہاں پہنچ جاؤں گا ماجدہ کے گھر میں میری باتوں کو وہ بس گونگے کا خواب سمجھ کر سن آیا تھا۔ اب جو اس نے مجھے اپنے تیر و تفنگ سے لیس وہاں اپنے گھر میں دیکھا تو اس کے پرندے بے جان ہو کر زمین پر گرنے لگے۔ میری گولیوں نے اس کی ٹانگوں میں جو زخم لگائے تھے وہ بھی اسے نڈھال کیے ہوئے تھے اور وہ بیچارا بڑی مشکلوں سے چل پھر رہا تھا۔ رات کو جب ہر طرف سناٹا چھا گیا تو وہ بولا۔

"جیلانی بھائی ادھر بڑا فساد ہونے والا ہے پولیس آئی ہوئی ہے"

"کیا مطلب؟ پولیس کس لیے آئی ہے ادھر؟"

"ہادی علی نے بلائی ہے۔ ادھر بلادر گاؤں میں مزارع ہیں نا۔ ان سے فصل کی کٹائی پر جھگڑا ہو گیا ہے ہادی علی کا۔ چوہدری گندم کی ہری فصل کاٹ کر بازار میں بیچ دینا چاہتا ہے مگر مزارع نہیں مان رہے ہیں۔"

"اچھا پھر؟"

"پھر یہ کہ وہ مزارع بہت تگڑے ہیں۔ چار بھائی ہیں۔ چاروں بڑے شہ زور جوان ہیں اور ان کا بڈھا بھی بڑا جی دار ہے۔ انہوں نے للکار دیا ہے چوہدری کو۔ کہتے ہیں مر کٹ جائیں گے پر ہری فصل نہیں کٹے گی۔"

"بلادر کتنی دور ہے یہاں سے؟"

"تین کوس پرے ہے۔"

"اچھا، میں کل جاؤں گا وہاں۔ یہ تماشا ضرور دیکھوں گا میں۔"

"مت جانا ادھر۔ پتہ نہیں وہاں کیا ہو جائے۔"

"کچھ نہیں ہو گا دیکھا جائیگا۔ انہیں کیا پتہ میں کون ہوں۔ اپنی پگڑی مجھے دے دینا وہ میں باندھ لوں گا۔"

"تمہاری مرضی۔ مگر مجھے تو خیر نظر نہیں آتی ہے۔"

"میں بھی خیر نہیں چاہتا ہوں میاں مشتاق! اب تو وہ بٹوہ بھی لائی تھی آج؟"

"ہاں، میں دوا اور مرہم گھر میں لے آیا تھا۔ تو نے تو مار ہی دیا تھا مجھے پتہ نہیں کتنے دن لگ جائیں میرے۔ وہ بٹوہ تو دے دو اب۔"

"ہاں، یہ رہا تمہارا بٹوہ۔ دیکھ لو ساری چیزیں اس میں موجود ہیں ویسے مجھے افسوس ہے یار کہ میرے ہاتھوں تو زخمی ہوا اور پکڑا گیا۔" میں نے کوٹ کی جیب میں سے نکال کر بٹوہ اسے دے دیا۔ اس نے ساری چیزیں دیکھیں اور بولا۔

"یہ بھی ہمیشہ خالی رہا، ہمارے دل کی طرح۔ اس میں شناختی کارڈ نہ ہوتا تو میں تھوکتا بھی نہیں اس پر۔"

"یہ تو ہے۔ اچھا اپنا ہاتھ ادھر کر۔" یہ کہہ کر میں نے مٹی کے تیل کے دیئے کی مدھم روشنی میں اس کا ہاتھ اپنی طرف کھینچا اور ایک ہزار کے نوٹ اس کی مٹھی میں رکھ دیے۔

"یہ ہزار روپیہ تو میری طرف سے رکھ لے تیرے دوا دارو اور گھی دودھ کے لیے ہے کھا پی کر تگڑا ہو جا ذرا۔"

"نہیں یار! یہ گڑ بڑ مت کر۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔"

"خبردار کوئی بات کی تو نے تو۔ گولی مار دوں گا۔ یہ تیرے بھائی کی طرف سے ہے بے وقوف۔ مجھے پہلے ہی بہت دکھ ہوتا ہے تیری حالت دیکھ کر۔ یہ جنگلات کے گارڈ تو بہت امیر ہوتے ہیں۔ جنگل بیچ کر کھا جاتے ہیں۔ تیرا بٹوہ کیوں خالی ہے؟" اس کی مٹھی

میں نے لحاف میں دھنسا دی۔ وہ بڑی بے دلی سے مسکرایا۔ بولا۔
"یار وہ میاں جی تھے نا میرے، وہ قسم دے گئے تھے مجھے۔ اپنی بھی اور میری ماں کی بھی کہ میں کبھی حرام کا ایک پیسہ ہاتھ میں نہیں لوں گا۔ بس یہ سالی ایمانداری لے ڈوبی ہے مجھے۔ ورنہ تم جانو ان کارڈوں نے تو ادھر بڑی بڑی جائدادیں بنالی ہیں۔ بڑی آمدنی ہے اُن کی۔"

"جسے اللہ ایمان دے اور ایمان رکھے اسے کیا چاہیے میرے بھائی اس زمانے میں۔ مگر تو فکر نہ کر۔ تیرے بھی یہ دن سدا نہیں رہیں گے۔ میں زندہ رہ گیا تو تیرے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کروں گا میں ——
اور دیکھ خواہ کچھ ہو جائے میرے یہاں آنے اور اپنے گھر میں ٹھہرنے کا ذکر تو کسی سے نہیں کرے گا۔ ورنہ خواہ مخواہ مارا جائے گا تو۔"

"اس بات کی تو کوئی فکر ہی نہ کر میرے یار۔ بس میرا نام کسی بھی جھگڑے میں نہیں آنا چاہیے۔"

"تیرا تو کہیں ذکر ہی نہ آئے گا مشتاق میاں! لا ہاتھ ادھر کر۔"
یہ کہہ کر میں نے اس سے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور پھر میں لحاف میں منہ ڈال کر لیٹ گیا۔ نیند مجھ پر غالب آتی جا رہی تھی۔

مجھے معلوم نہیں رات کا وہ کون سا پہر تھا کہ میری نیند نے مجھے ایک عجیب غریب طوفان سے دوچار کر دیا۔ میں نے ایک بار پھر مسند آراء کو خواب میں دیکھا۔ اس حال میں کہ وہ سخت پریشان تھی۔ بال اس کے بکھرے ہوئے تھے اور کھل کر گلے میں آ پڑے تھے۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ کسی کے ہاتھ سے بندوق چھین رہی تھی۔ اس آدمی کا چہرہ اتنا دھندلا تھا کہ میں اس کو بالکل بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ بس وہ ایک ہیولیٰ سا تھا جس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ وہ مسند آراء کی کسی بات پر دھیان نہیں دیتا تھا اور کسی بھی طرح ہاتھ سے بندوق نہیں چھوڑتا تھا۔ مسند آراء پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ اس سے زور آزمائی کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے غصے کی وجہ سے جھاگ نکل رہے تھے اور یہی کہہ رہی تھی کہ خدا کے لیے گولی مت چلانا۔ میں مر جاؤں گی۔ خوف کے مارے اس کا چہرہ ہلدی ہو رہا تھا۔ مگر وہ ہیولیٰ اس کی کوئی بات نہیں سنتا تھا۔ مسند آراء کے اس واویلے نے مجھے بھی پریشان کر دیا تھا مگر میرا یہ حال تھا کہ میں بغلوں میں ہاتھ دیئے چپ چاپ کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس ہیولے نے گولی چلا دی "ٹز" ایسی خوفناک آواز پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں اپنے ہی بستر پر تھا۔ اس احساس نے مجھے اطمینان بخشا۔ مگر اس مسند آرا سے خواب میں رہی اس ملاقات نے ایک بار پھر مجھے حیران کر دیا۔ وہ ایک بار پہلے بھی ایسے ہی حالات میں مجھے خواب میں مل چکی تھی۔ میری نیند اچاٹ ہو گئی۔ پتہ نہیں وہ کس طرح کی لڑکی ہے جس نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ کتنی ہی دیر میں اس معاملے پر غور کرتا رہا مگر میری سمجھ میں جب کچھ نہ آیا تو ایک بار پھر میں لحاف میں منہ ڈال کر نیند کے تعاقب میں چل نکلا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ مسند آراء کو خواب میں دیکھنے کے بعد میں اتنی گہری نیند سویا تھا کہ رات ایک پل میں گزر کر آئی تھی۔

مشتاق نے مجھے اپنی بھوری بھینس کے مکھن، مکئی کی روٹیوں اور چٹپٹے ساگ کا ناشتہ دیا تو میرا دل خوش ہو گیا۔ ایسا ناشتہ میں نے شاید بارہ سال بعد چکھا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے مشتاق کی پگڑی سر پر باندھی اسٹین گن کوٹ کے نیچے لٹکائی اور پستول کو لبالب بھر کر جیب میں ڈالا اور پیدل ہی بلادر گاؤں کی طرف چل پڑا۔ میرا حلیہ ایسا تھا کہ مجھے پولیس نہ پہچان سکتی تھی۔ مشتاق اگر چلنے کے قابل ہوتا تو میرے ساتھ وہ بھی جاتا ضرور۔ مگر بہت ہی نڈھال ہو رہا تھا۔ ویسے بھی میں جس کام پر جا رہا تھا اس میں اس کی ضرورت مجھے راس نہ آ سکتی تھی اس لیے میں تنہا ہی بلادر کی طرف چل نکلا تھا۔

اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ دھند ابھی رستوں میں کھڑی تھی اور سورج کی کرنیں اسی کے پردوں میں سے گزرتے ہوئے نمودار ہو رہی تھیں میں کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر سے گزرتا ہوا بلادر کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ مشتاق نے مجھے بتایا تھا کہ عین ممکن ہے ہادی علی اپنے آدمیوں کو لے کر صبح ہی صبح بلادر جا پہنچے اسے یہی دھڑکا لگا تھا کہ وہاں آج خون خرابہ ضرور ہوگا۔ میں نے ایسی دھونس دھاندلی کا منظر اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ میں اندر سے خوش تھا بے حد خوش۔ ایک تو مجھے اس آدمی کا اصلی چہرہ دیکھنے کا موقع مل رہا تھا جس کے لیے میں وہاں تک جا پہنچا تھا۔ پھر مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ وہ مزارع لوگ ایسے تشدد کے سامنے کیا کرتے ہیں۔ آندھی سے ٹکرا جاتے ہیں یا اس کے رخ پر بھاگنے لگتے ہیں۔ کبھی شاخوں کی طرح لچک جاتے ہیں یا تناور درختوں کی طرح سینہ تان کر کھڑے رہتے ہیں۔

بلادر پہنچ کر میں نے سارا گاؤں گھوم پھر کر دیکھ لیا۔ وہ زندگی کی ادنیٰ سے ادنیٰ آسائشوں سے محروم مخلص و بے نوا لوگوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ان کی محنت نے گاؤں کے چاروں طرف ہریالی بکھیر رکھی تھی۔ زمینیں لہلہا رہی تھیں۔ گندم تیزی سے سنہری سونے کی منزلوں کی طرف بڑھ رہی تھی مگر ہادی علی جانتا تھا کہ اس کو اسی حالت میں کاٹ کر بازار میں چارے کی قیمت پر بیچ دے کیونکہ چارہ بہت مہنگا بک رہا تھا۔ چھ ٹرک گاؤں کے باہر راجباہ کے کنارے کھڑے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ آج ہی فصلیں کاٹ لینے پر آمادہ تھا۔

راجباہ لبالب بھرا بہہ رہا تھا اور اس کا پانی زمین کی شریانوں میں لہو کا کام دیتا تھا۔ بلادر کی زمین بلاشبہ سونا اگلتی تھی جو پہلی منزل پر فصل کی صورت میں سبز ہوتا تھا اور آخری منزل میں تپ کر کڑی دھوپ کی کٹھالی میں سے گزر کر سنہری ہو جاتا تھا۔

اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اور میں مسجد کے صحن میں کھڑا تھا اچانک مجھے اکبر کوٹ کی طرف سے چار گھڑ سوار تیزی سے بلادر کی طرف بڑھتے نظر آئے۔ ان کے پیچھے پندرہ بیس آدمی تھے جو پیدل چل رہے تھے مگر چل کیا رہے تھے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ رہنے کے لیے وہ پوری رفتار سے دوڑ رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ کھڑی فصلوں میں سے گزر کر بلادر کی مسجد کے سامنے کھڑے برگد کے درخت کے نیچے ٹھہرے۔ وہ سب کے سب چوہدری ہادی علی کے ساتھی تھے۔ پولیس کا کوئی آدمی ان میں موجود نہیں تھا۔ چوہدری ہادی علی کو میں نے انداز سے پہچانا۔ وہ کالی سرج کی خوبصورت اچکن پہنے ہوئے تھا۔ سر پر اس نے طرے دار پگڑی باندھ رکھی تھی۔ سفید شلوار کے نیچے اس نے پاؤں میں سنہری کام کی نوک دار جوتی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے کندھے پر گولیوں سے بھری ہوئی پیٹی لٹک رہی تھی جس کی جیب میں اس نے پستول اڑس رکھا تھا۔ وہ خاصا بارعب آدمی تھا۔ چہرہ اس کا سرخ و سفید تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی تاتاری سردار ہو۔ بڑی بڑی سرخ چمکتی ہوئی آنکھیں پھڑکتے ہوئے حساس نتھنے۔ چوڑا چکلا سینہ وہ واقعی سرداری اور سپہ سالاری کے لائق آدمی تھا۔ عمر اس کی یہی کوئی چالیس بیالیس سال کی ہو گی مگر اس کے چہرے کی کرختگی سے اس کا خبث باطن پوری طرح عیاں تھا۔

ابھی وہ لوگ وہاں پہنچے ہی تھے کہ دوسری طرف راجباہ کے کنارے کھڑے ٹرکوں کی اوٹ میں سے تین گھڑ سوار نمودار ہوئے وہ پولیس کی وردیوں میں ملبوس تھے۔ وہ قریب آئے تو میں نے دیکھا کہ ایک ان میں تھانے دار ہے اور دو سپاہی ہیں۔ وہ آئے اور سیدھے چوہدری ہادی علی کے پاس جا ٹھہرے انہوں نے بڑے ادب سے ہادی علی کو سلام کیا — اور تینوں ہی گھوڑوں سے اتر گئے۔

اتنے میں گاؤں کے دو چوکیدار وہاں آ نکلے۔ اُن کو دیکھتے ہی باقی سب لوگ بھی گھوڑوں سے اُتر گئے۔

ایک آدمی نے بڑے تحکم آمیز لہجے میں کہا:
"اوئے حاقو جا ان رشتوں کو بلا لا۔ کہاں ہیں وہ ساقی، صادق انور اور گاجی۔ بلا ان سب کو۔"

"وہ تو یہاں نہیں ہیں چوہدری جی۔ صبح سے شہر گئے ہوئے ہیں ان کا میاں گھر میں ہے۔"

ہادی علی نے جواب دیا۔ "اچھا ٹھیک ہے اسے ہی بلا لا۔ اور چارپائیاں بھی ڈال دے ادھر۔" ہادی علی نے انہیں للکارتے ہوئے کہا۔

ایک چوکیدار ابھی مسجد کی پچھلی گلی میں داخل ہی ہوا تھا کہ اسے وہ میاں جی مل گئے جن کو وہ بلانے گیا تھا۔ دُور سے بلند آواز میں بولا۔

"ادھر چلو میاں صفدر شاہ جی۔ وہ چوہدری ہادی علی صاحب آئے ہیں۔" میں نے ادھر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ ایک آدمی بھینس کی بغل مارے بڑے پُر وقار انداز میں آہستہ آہستہ چلتا آگے آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی خوبصورت داڑھی تھی جس کی سفیدی اس آدمی کی اعلیٰ پاکبازی کی شہادت دے رہی تھی۔ وہ برگد کے نیچے سے گزر کر سیدھا ہادی علی کے سامنے جا ٹھہرا۔ وہاں دھوپ تھی۔ سورج کی روشنی سے آنکھوں کو بچاتے ہوئے اس نے بایاں ہاتھ اوپر ماتھے پر رکھا اور دایاں ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا مگر ہادی علی نے اس کے ہاتھ کی طرف توجہ نہ دی، بولا۔

"صفدر علی ہم فصل کاٹنے آئے ہیں۔ کوئی اعتراض ہو تجھے تو اپنے لڑکوں کو بلا لے۔"

"میں کیا عرض کروں چوہدری صاحب فصل پک گئی تو یہ سونا بن جائے گی۔ میری فصل نہ کاٹیے یہی ہماری آپ سے بنتی ہے۔"

"تو ابھی تک سیدھا نہیں ہوا ہے بڈھے! یہ زمین تیرے باپ کی نہیں ہے اس کا میں مالک ہوں۔ چوہدری ہادی علی مالک ہے اس کا۔" یہ کہہ کر ہادی علی نے اپنے بید کی چھڑی کی نوک صفدر علی کے سینے میں چبھو کر اسے پیچھے دھکیلا۔

"میں پھر کہتا ہوں چوہدری جی یہ آپ کے بھلے کی بات ہے زمین آپ کی ہے مگر فصل میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ یہ ہماری محنت ہے۔"

"بکواس بند کر بڈھے! ہم یہ فصل کاٹ دیتے ہیں۔ ہمت ہے تو روک لے میرے آدمیوں کو۔ چلو اوئے شروع کرو کٹائی۔" یہ کہہ کر ہادی علی نے صفدر علی کو بڑے زور سے پیچھے ہٹایا اور بید کی چھڑی زور سے اس کی پیٹھ پر دے ماری۔ چھڑی کی آواز برگد کے نیچے گونجی تو دس بارہ عورتیں واویلا کرتی ہوئی آگے بڑھیں اور ہادی علی کو گالیاں دینے لگیں۔ وہ مسجد کی دیوار کی اوٹ میں کھڑی تھیں۔ اچانک آگے بڑھ کر آ گئیں۔ ان میں جوان بھی تھیں اور بوڑھی بھی۔ ان کو چوہدری ہادی علی کے گرد دیکھ کر پولیس کا وہ آدمی جو تھانیدار کی وردی پہنے تھا، بید لے کر اُن پر پل پڑا۔ اور اس نے کسی کی آنکھ دیکھی نہ کان۔ ان سب کو اس نے بُری طرح دھن ڈالا۔ عورتیں بُری طرح چیخ رہی تھیں۔ ان کی چیخ و پکار سن کر گاؤں کی دوسری گلیوں سے پانچ چھ بوڑھے آدمی باہر نکل آئے ان کے پیچھے دس بارہ جوان بھی تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں لاٹھیاں، اور برچھیاں تھیں۔ ان کو دیکھتے ہی تھانیدار نے اپنے دونوں سپاہیوں کو

بندوقیں مسجد حوالے کرنے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہادی علی نے اپنے ساتھ کھڑے تین گھوڑ سواروں کو بھی تیار رہنے کا حکم دے دیا اور وہ خود بھی پستول ہاتھ میں لے کر ان کے ساتھ قطار میں کھڑا ہو گیا۔ صورتِ حال یہ ہو گئی تھی کہ عورتیں بلند آواز سے رو رہی تھیں اور وہ آدمی جو مزارع تھے اور ابھی ابھی گاؤں سے نکلے تھے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے مگر اس طرح کہ وہ سب اُن آتشیں ہتھیاروں کے سامنے بُری طرح سہمے ہوئے تھے۔ وہ سب مسجد کے قریب پہنچ کر رک گئے۔

ان میں سے دو بوڑھے آدمی آگے آئے تو ہادی علی بولا۔

"کیا کہتے ہو گنتو! کس لیے آئے ہو تم مقابلہ کرو گے ہمارا، پولیس کا مقابلہ کرو گے۔"

"گنتے تم ہو، گنتے تمہارے یہ ساتھی ہیں۔ وہ صادق اور انور یہاں نہیں ہیں تو تم ان عورتوں پر ہاتھ اٹھا رہے ہو ہادی علی۔" اُن میں ایک جوان نے بلند آواز سے ہادی علی کو للکارتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز سنتے ہی ہادی علی نے گولی چلا دی جو اس جوان کے کندھے میں لگی اور وہ تڑپ کر نیچے جھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان سپاہیوں نے بھی گولیاں چلا دیں اور دو اور آدمی کٹے ہوئے پودوں کی طرح نیچے گر گئے۔ ادھر ہادی علی کے آدمی ان لوگوں سے بہت پیچھے ہٹ گئے جن پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ ہادی علی ان میں پیش پیش تھا۔

میرے لیے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت تھا۔ میں نے اسٹین گن کمبل کے نیچے سے نکالی اور ان کی طرف شست باندھ کر پہلی گولی میں نے ہادی علی کے سینے میں ماری وہ زخمی کتے کی طرح اچھلا تو میں نے ایک اور گولی اُس کے جسم میں اتار دی۔ پولیس کے سپاہی اور ہادی علی کے ساتھی اوٹ کی تلاش میں ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ انہوں نے مسجد کی دیوار کے اوپر رکھی اسٹین گن کو موت اُگلتے دیکھ لیا تھا۔

"رک جاؤ اور اپنے ہتھیار پھینک دو۔" یہ کہہ کر میں نے تھانیدار کی وردی میں ملبوس آدمی کی ٹانگوں پر گولی داغ دی۔ وہ اوندھے منہ آگے کو گرا تو اس کے سارے ساتھی ہتھیار پھینک کر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ہاتھ اُوپر اٹھا لیے تھے۔

"میاں جی یہ سارے ہتھیار اکٹھے کر کے ادھر رکھ دیں مسجد کے دروازے میں۔" میں نے صفدر علی سے کہا وہ مسجد کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے ان کے پستول اور بندوقیں اٹھائیں اور مسجد کے دروازے میں رکھ دیں۔

"تم ان سب کو ادھر باندھ کر پھینک دو، چلو۔" میں نے سامنے کھڑے دو جوانوں سے کہا۔ وہ خاصے قوی ہیکل دکھائی دیتے تھے اور مجھے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ وہ سب میری اس بروقت مداخلت پر خوش ہو گئے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی ان سات آدمیوں کو پگڑیوں سے رسیوں سے جکڑ کر ایک طرف ڈال دیا۔ تھانیدار کی ران سے خون بہہ رہا تھا اور درد نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ ہادی علی کے باقی سارے حمایتی بھاگ چکے تھے۔ اپنی درانتیاں وہ وہیں چھوڑ گئے تھے۔

اچانک مجھے سامنے سے راجباہ کے کنارے سکوٹر، ٹریکٹر کے انجن چلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ لوگ بھی بھاگ رہے تھے۔ گاؤں کے تمام بے بس و بے نوا مزارع آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے قریب آ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کوئی فرشتہ ہوں کہ انسان۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ خدا نے ان کی مدد کے لیے ایک مسلح فرشتہ مسجد میں اتار دیا ہے۔

"سب لوگ بے فکر ہو کر اپنے گھر جاؤ۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ ایک اجنبی تھا۔ کوئی ڈاکو تھا جس نے ہادی علی کو مار دیا ہے۔ جاؤ۔" یہ کہہ کر میں نے اسٹین گن کمبل کے نیچے چھپالی اور مسجد کے دروازے میں رکھے جوتے پہن کر باہر نکل گیا۔

"نہیں نہیں آپ ڈاکو نہیں ہیں آپ تو ہمارے محسن ہیں میرے بیٹے میرے بہادر بیٹے آپ تو رحمت کے فرشتے ہیں۔" ایک بوڑھے نے آگے بڑھ کر بڑی گلوگیر آواز میں کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیا۔

"آپ اپنے گھروں میں جا بیٹھیں بابا جی! اب وہ سؤر ختم ہو چکا ہے آپ کی ساری مصیبتیں بھی ختم ہو گئی ہیں۔ شکرانے کے نفل ادا کریں، اور کوئی پوچھے تو کہہ دیں کہ وہ کوئی اجنبی تھا۔ کوئی ڈاکو تھا جس نے ان کو مار دیا ہے۔ یہی کہیں اور صفدر علی کے بیٹوں سے میرا سلام کہہ دیں۔ پھر کسی وقت آؤں گا۔ میں پھر آؤں گا میاں جی! خدا حافظ۔" یہ کہہ کر میں نے ہادی علی کے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھا اور اس پر سوار ہو کر اسی وقت وہاں سے چل نکلا۔ میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ اب میرے لیے بلاد اور اگوکی میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ عورتیں مجھے دعائیں دے رہی تھیں۔ بوڑھے پُر نم آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے وقوع پذیر ہو گیا۔ کیسے میں نے آسمان سے نیچے آ کر اس اکھنش کو زمین بوس کر دیا۔ کیسے میں نے ان کے سب سے بڑے دشمن کو زیر کر لیا، اور کیوں؟

میں ابھی بلاد سے چار فرلانگ ہی دُور نکلا تھا کہ میں نے دیکھا کہ کچھ گھڑ سوار بہت تیزی سے میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ ان کی رفتار بتا رہی تھی کہ وہ میرے تعاقب میں آ رہے ہیں۔

میں نے ایک جگہ اوٹ میں رک کر انہیں غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ پولیس کے آدمی ہیں۔ ان کی وردیاں ان کی سرکاری حیثیت کا پتہ دے رہی تھیں۔ یہ بڑی خوفناک بات تھی اور میرا یہ حال تھا کہ میں اس علاقے سے قطعاً ناواقف تھا۔ اکبر کوٹ کی وہ سڑک جس پر چل کر میں پچھلی رات وہاں پہنچا تھا میری نظروں سے اوجھل تھی۔

اُن کو اپنے پیچھے یوں شکاری کتوں کی طرح لپکتے دیکھ کر میں نے گھوڑے کا رُخ دوسری طرف پھیرا۔ اور اسے کھیتوں میں دوڑاتا ہوا بائیں ہاتھ نکلا۔ میرے سامنے اب ایک پگڈنڈی تھی جس کے دونوں طرف اونچے اونچے سرکنڈوں کی باڑ اُگی تھی۔ میں نے گھوڑے کو اس پگڈنڈی پر ڈالا اور سرپٹ بھگاتا ہوا آگے نکل گیا مگر ابھی میں زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ مجھے محسوس ہوا وہ لوگ دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ علاقے کے زیادہ ہموار رستوں سے واقف ہونے کی وجہ سے وہ مجھ پر رفتار میں برتری حاصل کر چکے تھے۔ مجھے تین سوار دائیں ہاتھ سے اپنی طرف بڑھتے نظر آئے۔ میں نے تیزی سے گھوڑے کو بائیں ہاتھ موڑا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ لوگ میرے گرد اپنا حلقہ تنگ کرتے جا رہے تھے انہیں ہادی علی کے ساتھیوں نے میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ کاش میں نے ان میں سے کسی ایک کو بھی زندہ واپس نہ جانے دیا ہوتا۔ اب وہ میرے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔

اچانک ایک طرف سے گولیاں سرسراتی ہوئی میرے دائیں بائیں اور سر کے اوپر سے گزرنے لگیں۔ میں ان کی زد میں آ چکا تھا اور میرے فرار کے راستے مسدود ہوتے جا رہے تھے۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے میں گھوڑے سے کودا اور اس کی لگام گھسیٹتا ہوا ایک ٹیلے کی اوٹ میں ہو گیا۔ اب وہ مجھے دونوں طرف سے اس ٹیلے کی طرف بڑھتے نظر آ رہے تھے اور بھرپور اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔ میری زندگی کا وہ بدترین لمحہ تھا۔ میں نے اسٹین گن ہاتھ میں لی اور بہت سنبھل کر دائیں ہاتھ سے آگے بڑھتے ہوئے تین گھڑ سواروں پر فائر کھول دیا۔ میرا نشانہ خطا نہیں گیا۔ میری چلائی ہوئی پہلی گولی ایک گھوڑے کے سینے میں لگی تو وہ سوار سمیت الٹ کر زمین پر جا گرا۔ میری طرف سے گولی کا جواب گولی سے ملنے پر باقی فوراً پیچھے مڑے اور درختوں کی اوٹ میں جا پہنچے — ابھی میری توجہ اسی پر مرکوز تھی کہ بائیں ہاتھ کی جانب سے میری طرف گولیاں چلنے لگیں۔ میں نے اُدھر نگاہ ڈالی تو تین آدمی گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھے مجھے اپنے نشانے کی زد میں لے چکے تھے۔ میں ایک دم زمین پر لوٹ پوٹ ہو کر پیچھے ہٹا تو کئی گولیاں اس ٹنڈ مُنڈ بے آب و گیاہ ٹیلے کی زمین میں دھنس گئیں۔ میں نے اسٹین گن کا رُخ ادھر کر کے گولی چلا دی مگر وہ بہت تیز نکلے اور گھوڑوں کو بھگاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔

ابھی میں سنبھل ہی رہا تھا کہ دوسری طرف سے کسی خبیث کی گولی میرے ہاتھ سے نکل کر دُور جا گری۔ میری زندگی کا چراغ اس آدمی کی زد میں آ گیا تھا۔ اب مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ میں اپنی اسٹین گن سنبھال کر گولی چلا سکتا۔ پھر بھی میں نے بائیں ہاتھ میں اسٹین گن سنبھالی اور جھاڑیوں میں رینگتا ہوا ... گندم کے کھیت میں جا پہنچا۔ میرے بازو سے خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ شاید کوئی اہم نس کٹ گئی تھی۔ جوں توں کر کے میں اس کھیت سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ لوگ ایک دوسرے کو آگے بڑھنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ انہیں میرے فرار کی سمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں گندم کے کھیت میں رینگتا ہوا آگے بڑھا اور گنے کے کھیت میں جا گھسا۔ اب میرے لیے فرار زیادہ آسان تھا۔ میں نے اسٹین گن میں پھر سے گولیاں بھریں مگر اس حال میں کہ میرا دایاں بازو درد سے شل ہوا جاتا تھا۔

ابھی میں چند ہی قدم آگے نکلا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے کھیت کے کنارے سے ان کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"وہ ادھر ہی گھسا ہے۔ اس کھیت کو چاروں طرف سے گھیر لو۔ یہ دیکھو وہ گندم کو لتاڑتا ہوا ادھر آیا ہے۔" ایک بھاری بھرکم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں اپنا کوٹ اتار کر بازو کا زخم دیکھنے لگا۔ گولی خاصا گوشت اُدھیڑ چکی تھی اور خون سے میرے کپڑے تر ہونے لگے تھے۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر خون صاف کیا اور پھر چیونٹیوں کے گھر پر بنے ایک مٹی کے ڈھیر میں سے باریک سفوف ایسی مٹی لے کر زخم پر ڈال دی۔ اس کی تاثیر کا مجھے پتہ نہیں تھا لیکن اتنا مجھے معلوم تھا کہ اس کو زخم پر ڈالنے سے خون بند ہو جاتا ہے۔ مٹی نے اپنا اثر دکھایا اور خون بہنا بند ہو گیا۔ یہ بڑی خوشی کی بات تھی — میں نے کچھ اور مٹی رومال پر ڈالی اور اسے پٹی کی صورت میں بازو پر دانتوں کی مدد سے کس کر باندھ لیا۔ چند ہی لمحوں بعد مجھے محسوس ہوا کہ میری بے چینی بہت حد تک کم ہو گئی ہے۔ بازو میں درد کی شدت ڈھلنے لگی تھی۔

وہ سپاہی کھیت کے چاروں طرف گھوڑے بھگا رہے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ کھیت میں اس طرح چلوں کہ کوئی پودا ہلنے نہ پائے کیونکہ وہ ہلتے ہوئے پودے میری نقل و حرکت کی چغلی کھا سکتے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد میں کھیت کے دوسرے کنارے پہنچ چکا تھا مگر ابھی میرا باہر نکلنا کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہ تھا وہ لوگ دوسری طرف میرا انتظار کر رہے تھے اب میں ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے میں سامنے کا منظر بخوبی دیکھ سکتا تھا اُدھر دو گھڑ سوار موجود تھے اور وہ بہت بے چین تھے۔ انہیں احساس تھا کہ کھیت کے اندر سے میں کسی بھی وقت ان پر گولی چلا سکتا ہوں یہی وجہ تھی کہ وہ کھیت سے کبھی سو گز دُور چلے جاتے تھے کبھی دو سو گز دُور — وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ میں نے ذرا آگے بڑھ کر صورتِ حال کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ سامنے ایک درختوں کا جھنڈ ہے جس کے وسط میں پانی سے بھرا ہوا ایک جوہڑ ہے۔ پانی کی سطح پر کہیں کہیں کائی بھی نظر آتی تھی۔ اس جھنڈ میں پہنچنے کے بعد میں آگے سرکاری جنگل کی رکھ میں گھس سکتا تھا۔ اس رکھ میں پہنچنے کا مطلب یہ تھا کہ میں میلوں تک اس کے اندر ہی اندر چلتا ہوا آگے بڑھ سکتا تھا — وہ اتنی گھنی رکھ تھی کہ پچھلے روز جب میں ٹیکسی میں بیٹھ کر اکبر کوٹ پہنچا تھا تو راستے میں ڈرائیور نے اس کی طرف اشارہ کر کے مجھے بتایا تھا کہ اس جنگل میں جو میلوں تک پھیلا ہوا ہے ہر قسم کے جانور

میں اس کا تو یہ خیال تھا کہ وہاں پہنچتے بھی پائے جاتے ہیں ـــــ اس وقت میری یہی خواہش تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے میں اس جنگل میں داخل ہو جاؤں ـــــ

اب یہ بات میرے بس میں تھی کہ میں ان لوگوں کو ایک ایک کر کے قتل کر سکتا تھا۔ ان سے باہر نکل کر بھی مقابلہ کر سکتا تھا کیونکہ وہ بکھرے ہوئے تھے اور جب تک وہ سنبھل پاتے میں سامنے کے دو گھوڑ سواروں کو تو لمبا لٹا سکتا تھا۔ میرے بازو سے بہتا ہوا خون رک گیا تھا اور اس مٹی کے باریک سفوف نے معجزہ نما اثر دکھایا تھا۔ اس میں شاید چیونٹیوں کا لعاب رچا ہوا تھا۔ وہ مٹی میرے زخم سے درد کو چوس گئی تھی، اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ لبلبی دبانے میں کوئی دقت نہ ہو گی اسٹین گن میرے بہت کام آ رہی تھی۔ آہو نے مجھے بہت عمدہ ہتھیار دیا تھا۔

اچانک مجھے دائیں ہاتھ کچھ سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے اُدھر جو نظر دوڑائی تو مجھے گنے کے اونچے اونچے پودے چند ہی قدم دُور ہلتے نظر آئے اور پھر دو پودوں کی جڑوں کے درمیان میں سے مجھے ایک سیاہ دبوٹ نظر آیا۔ وہ شخص مجھ سے چار ہاتھ دُور تھا۔ میں نے جیب سے اپنا "چیپ شاہ" نکالا اور گولی اُدھر داغ دی۔ میرا نشانہ خطا نہیں گیا۔ ایک ہلکی سی چیخ ابھری اور کوئی دھم سے زمین پر ڈھے گیا۔ میں بھاگ کر اس کے پاس پہنچا تو یہ دیکھ کر مجھے بے حد افسوس ہوا کہ میرے سامنے پولیس کا ایک بہت ہی خوبصورت سا نوعمر جوان زمین پر ڈھیر پڑا تھا۔ اور میری گولی اس کے گلے میں سے آر پار ہو چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بیچارا چیخ بھی نہیں سکا تھا۔ اس کی شہ رگ اور نرخرے کی نالیاں کٹ گئی تھیں۔ اس کے چہرے پر پھیلی بے پناہ اذیت نے مجھے نڈھال کر دیا۔ بندوق کی لبلبی پر اس کی گرفت جام ہو کر رہ گئی تھی ـــــ اس کی موت کا مجھے آج تک افسوس ہے۔ وہ اپنے مقدس فرض کی انجام دہی میں میرے جیسے بداندیش کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ بلاشبہ وہ بہت ہی جرأت مند نوجوان تھا۔ مگر اس کی وہ جرأت ہی اسے لے ڈوبی۔ وہ چاہتا تو مجھے وہیں ختم کر سکتا تھا مگر اس نے سوچا ہو گا کہ وہ مجھے بندوق کی زد میں لے کر زندہ گرفتار کر لے گا مگر اپنی اس کوشش میں وہ یوں ناکام رہا کہ گنے کے پودوں کی گھنی قطاریں اسے چھپا نہ سکیں۔

میرے پاس وقت نہیں تھا ورنہ میں اس کی کھلی آنکھیں ہی بند کر دیتا جن میں سے موت کی بے پناہ اذیت جھانک رہی تھی۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور کھیت کے کنارے پر جا پہنچا۔ اب بھی چھ فٹ اونچے موٹے اور تر و تازہ گنوں کی دو گھنی قطاریں میرے سامنے تھیں۔

"محمود صاحب! آپ کہاں ہیں؟ محمود صاحب"

اچانک ایک تیز کٹیلی آواز چاروں طرف گونج گئی۔ پولیس کا ایک آدمی اس شخص کو پکار رہا تھا جو مجھے زندہ پکڑنے کے شوق میں اندھا دھند کھیت میں جا گھسا تھا۔ آواز دینے والا مجھ سے دس ہاتھ دُور تھا۔ میں نے اس موقعے سے فائدہ اٹھانے کے لئے اپنی آواز دبائی اور گھٹے گھٹے فریادی لہجے میں کہا۔

"میں ... میں یہاں ہوں مجھے بچاؤ۔ یہ میرا گلا گھونٹ ... مجھے بچاؤ ـــــ" یہ آواز دیتے ہی میں نے اس طرح چاروں طرف پھیلے ہوئے جو لوگ تھے وہ یہی سمجھے کہ ان کا ساتھی محمود میری گرفت میں آ چکا ہے۔ وہ ساری احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر گھوڑوں سمیت اس سمت کے جدھر سے انہیں وہ گھٹی گھٹی آواز سنائی دی تھی جو نہی وہ کھیت میں گھسے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ دائیں بائیں میدان بالکل صاف تھا۔ میں بھاگتا ہوا اس جھنڈ کی طرف لپکا جس سے آگے چند کھیت عبور کرنے کے بعد میں گھنی رکھ میں پہنچ سکتا تھا۔

مگر ابھی میں کھیت سے کوئی دو گز دور نکلا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ لوگ گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے میری طرف لپکے چلے آ رہے تھے۔ اب ان کا مقابلہ کرنے کے سوا میرے پاس کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ میں نے ایک مینڈھ کی اوٹ میں لیٹ کر اسٹین گن سیدھی کی اور ان پر اندھادھند گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ میری کوشش یہ تھی کہ ان کے گھوڑے بےکار کر دوں اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ میں نے ان کے تمام گھوڑے پہلی ہی بوچھاڑ میں ناکارہ کر دیئے۔ گھوڑے زخمی ہو کر نیچے گر گئے تھے اور درد سے اس طرح چلا رہے تھے کہ مجھے ان پر ترس آتا تھا۔ ان کے سوار نیچے آ گرے تھے اور اب وہ لیٹ کر اور اپنا آپ بچا کر مجھ پر فائر کر رہے تھے۔ اب وہ صرف فرض ہی ادا نہیں کر رہے تھے بلکہ اپنے انتقام کی آگ بھی مجھ پر برسا رہے تھے۔ ان کی گولیاں مجھے یہی پیغام دیتی تھیں کہ اگر میں ان کے ہاتھ آ گیا تو وہ میری بوٹی بوٹی کاٹ کر الگ کر دیں گے۔

وہ جہاں جہاں گھوڑوں سے گرے تھے ابھی تک وہیں جم کر بیٹھے تھے اور شست باندھ باندھ کر مجھ پر گولیاں چلا رہے تھے مگر اب ان کی گولیوں میں وہ بےباکی اور دلیری نہیں رہی تھی۔

میں رینگتا رینگتا پیچھے ہٹا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہاں کھیتوں کی سطح ایک دم نیچی ہو گئی ہے۔ وہ ایسے کھیت تھے جن میں سے دو دو فٹ گہری مٹی کھدوا دی گئی تھی تاکہ وہ زیادہ فصل دے سکیں۔ کھیتوں میں کام کرنے والے کسان گولیوں کی آواز سے پریشان ہو کر ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے مگر اس مصیبت کی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میرے بازو کا زخم ایک بار پھر مجھے پریشان کرنے لگا تھا۔ رومال سے جو مٹی میں نے اس پر باندھی تھی وہ شاید کھسک گئی تھی ـــــ مگر وہ لمحہ ایسا تو نہ تھا کہ میں اس زخم کی خاطر اپنی زندگی بیچ دیتا۔

گولیوں کی بوچھاڑ مدھم ہو رہی تھی۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر میں اٹھا اور گندم کے کھیت میں دوہرا ہو کر تیزی سے بھاگا مگر

انہوں نے مجھے دیکھ لیا۔ ایک ساتھ کئی گولیاں میرے اوپر سے گزر گئیں۔ میں نے سمجھا کہ اب بچنے کی کوئی امید نہیں رہی ہے مگر نہیں میں اندھادھند بھاگتا ہوا تیزی سے درختوں کے جھنڈ تلے جا پہنچا۔ اب میرے سامنے دو ہی صورتیں باقی رہ گئی تھیں یا تو میں کسی درخت پر چڑھ جاتا، یا پانی میں کود جاتا۔ وہ لوگ میرے تعاقب میں بڑھتے چلے آ رہے تھے اور میرے پاس صرف پانچ سات منٹ کی مہلت تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ جس جگہ میں کھڑا تھا وہاں ایک گڑھا بنا تھا اور اس کے ارد گرد ریت تھی۔ غالباً وہاں بھی مٹی نکالنے کے لئے کسی نے گڑھا کھودا تھا۔ میں نے اپنے تمام کپڑے اتار کر ہتھیاروں سمیت سب کچھ کمبل میں لپیٹ کر اس گڑھے میں ڈالا اور اوپر ریت ڈال دی۔ اتنی ریت ڈال دی کہ وہ گڑھا پُر ہو گیا۔ اس کام میں مجھے زیادہ سے زیادہ تین منٹ لگے ہوں گے یہ تھوڑی سی مہلت مجھے یوں مل گئی تھی کہ وہ لوگ گھوڑوں سے محروم ہو گئے تھے اور میرے پیچھے پیدل دوڑ رہے تھے۔ وہ تعداد میں پانچ تھے۔ میرے قریب ہی جوہڑ میں ایسے سرکنڈے کے پودے اُگے تھے جن کے تنے نالی دار تھے۔ میں نے ایک پودے کے پتے الگ کر کے اس میں پھونک ماری تو معلوم ہوا کہ اس میں سے ہوا آر پار نکلتی تھی میں نے وہ نالی ہاتھ میں لی اور تیزی سے جوہڑ کی طرف بڑھا ـــــ اس وقت میں جانگیہ پہنے ہوئے تھا۔

پولیس کے سپاہی کچھ زیادہ دُور نہیں تھے مگر میں ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے میں انہیں نظر نہیں آ سکتا تھا وہ بہت محتاط انداز میں کھیتوں سے نکل کر کھلی جگہ پر آ پہنچے تھے۔ ان کی رفتار خاصی تیز تھی۔ میرے اور ان کے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں تھا وہ سخت تذبذب میں تھے مگر اس بات کا انہیں یقین تھا کہ میں ابھی تک جھنڈ میں چھپا ہوا ہوں۔ میں درختوں کی اوٹ سے ان کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا۔ میری سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ میرا پیچھا چھوڑ دیں اور واپس چلے جائیں مگر ان کا استقلال مجھے حیران کئے دیتا تھا۔ وہ کسی طرح بھی میرے تعاقب سے دستبردار نہیں ہو رہے تھے۔

اب وہ بندوقیں تانے ہوئے ایک دوسرے سے الگ ہو کر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ میں نے ان سے بچنے کے لئے آخری فیصلہ کیا اور اپنے زخم پر رومال کی پٹی درست کر کے اللہ کا نام لیتے ہوئے جوہڑ میں اتر گیا۔ وہ جوہڑ خاصا گہرا تھا۔ پاؤں پانی میں ڈالتے ہی میں گلے تک نیچے ڈوب گیا۔ وہاں کائی اُگی ہوئی تھی شاید سنگھاڑے کا بیج بھی اس میں ڈال دیا گیا تھا.... اچانک ان لوگوں کی آوازیں مجھے بہت قریب سنائی دینے لگیں۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

"وہ اس جھنڈ میں ہی چھپا ہے۔ اسے اچھی طرح دیکھو۔"

آواز میں غصہ اتنا شدید تھا کہ مجھے اپنے اعصاب چٹختے محسوس ہوئے تھے۔ انتقام کی آگ نے انہیں پاگل کر دیا تھا ـــــ وہ آوازیں اور زیادہ قریب آ گئیں تو ان کی نظروں سے بچنے کے لئے میں نے وہ نالی منہ میں لی اور اپنا سر اس طرح پانی میں ڈبو لیا کہ نالی کا کچھ حصہ پانی کے اوپر رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں اس میں سے بڑی آسانی سے سانس لے سکتا تھا ـــــ نالی پانی کے اوپر چھ انچ اونچی ہو گی جہاں میں کھڑا تھا اس جگہ پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ میرے پاؤں زمین سے لگے تھے اور سر پانی میں ڈوبا تھا مگر اس طرح کہ منہ اونچا کر کے میں نے لب سختی سے بھینچ لئے تاکہ نالی پر میری گرفت مضبوط رہے۔

پانی بے حد ٹھنڈا تھا مگر میرا بدن اسے برداشت کر گیا۔ میں اسی حالت میں کوئی پون گھنٹے تک پانی میں ڈوبا رہا۔ وہ نالی اس روز میرے بہت کام آئی۔ پانی نے آہستہ آہستہ مجھے سُن کرنا شروع کر دیا تو میں نے اپنا سر باہر نکالا۔ اب وہاں میرے چاروں طرف مکمل خاموشی طاری تھی ـــــ میں نے ذرا اوپر ابھر کر جھنڈ کے آر پار دیکھا مگر کسی طرف سے بھی مجھے کسی ذی روح کی آواز نہ آئی۔ خطرہ ٹل چکا تھا۔ وہ لوگ مایوس ہو کر لوٹ گئے تھے۔

میں بڑی احتیاط سے اس جوہڑ میں سے باہر نکلا اور جھاڑیوں کی اوٹ میں ایسی جگہ جا ٹھہرا جہاں میں دھوپ سے اپنے بدن کو گرمی پہنچا سکتا تھا۔ دھوپ خاصی تیز تھی۔ چند ہی لمحوں میں میری یخ بستگی کا احساس چھٹنے لگا.... میرے کپڑے جوہڑ کی دوسری طرف گڑھے میں دفن تھے اس طرف جانے کے لئے میں جھاڑیوں میں سے نکلا تو مجھے ایک درخت کی اوٹ میں ایک سپاہی کھڑا نظر آیا۔ اس کا دھیان سامنے کی طرف تھا اور بندوق اس نے یوں ہاتھ میں تھام رکھی تھی جیسے وہ اپنے ارد گرد ذرا سی آواز ابھرتے پر گولی چلا دے گا۔ میرے سارے اندازے غلط ہو گئے تھے۔ وہ لوگ ابھی تک وہاں میری تلاش میں سرگرداں تھے۔ میں دبے پاؤں اس سپاہی کے پاس پہنچا اور بڑی ایسی احتیاط سے آگے بڑھ کر اس کی گردن کی رگیں مسل دیں ـــــ وہ شاید بہت ہی تھکا ہوا تھا ـــــ رگ دبتے ہی جھول کر زمین پر گر گیا۔

میں نے اسے کھینچ کر جھاڑیوں میں ڈالا اور اس کی بندوق ہاتھ میں لے کر اس کے گلے سے کارتوسوں کی پیٹی اتار لی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اس کی وردی اتار کر پہن لوں مگر اچانک دائیں ہاتھ سے ابھرتی ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"یار اختر! تیرے پاس کوئی سگریٹ ہے کہ سب ختم ہو گئے؟"

میں نے اُدھر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ ایک سپاہی بندوق ہاتھ میں لئے اس طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا جہاں چند لمحے پہلے وہ سپاہی

کھوا تھا جسے میں نے بے ہوش کر دیا تھا۔ اپنی بات کا جواب نہ پاکر وہ بلند آواز سے بولا: "اختر؟"

مگر وہاں اختر موجود ہوتا تو جواب دیتا وہ تو کبھی چھٹی پر چلا گیا تھا — میں نے اپنے حواس مجتمع کئے اور سانس روک کر جھاڑیوں میں دبک گیا۔ دوسرا سپاہی آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا۔

"پتہ نہیں وہ گیا کدھر ہے" وہ بدمعاش! مل گیا تو مار مار کر دُنبہ بنا دوں گا۔ یار اختر! تو کہاں جا مرا ہے؟" وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا اور پھر اچانک اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ اختر کو کہیں نہ پاکر وہ پریشان ہو گیا تھا۔

"اختر! بھئی بولتے کیوں نہیں ہو، وہ لعنتی لعین بھی واپس نہیں آیا۔ اصغر بھی اُدھر ہی مر گیا۔ کہتے تھے ہم گارڈ دے کر آئیں گے ایک نمبر کے کام چور ہیں۔ ابے اختر تو کدھر مر گیا ہے مجو ند خالی؟" وہ بلند آواز سے چلایا۔

اور پھر وہ وہاں آ پہنچا جہاں اختر کھڑا تھا۔ اس نے ایڑی پر حادثاً گھوم کر چاروں طرف نگاہ ڈالی تو میں نے اوپر اٹھ کر بندوق تان لی اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے للکارتے ہوئے کہا "خبردار! جو تو نے کوئی حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔ بندوق پھینک دے گدھے کی دُم۔"

وہ ایک دم ساکت ہو گیا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ بڑی احتیاط سے اس نے سر گھما کر مجھے دیکھا تو اس کا رنگ اڑنے لگا۔ اس نے فوراً ہی بندوق پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔ ایسے میں وہ بہت ہی مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ اس کا پیٹ خاصا پھولا ہوا تھا۔ ہاتھ اوپر اٹھنے سے اس کی جرسی کمر سے کھسک کر اوپر جا چڑھی تھی۔ اور پیٹی سمیت پتلون نیچے ڈھلک گئی تھی۔ وہ کوئی بہت پرانا اور پاپی قسم کا رشوت خور سپاہی تھا کیونکہ جب میں نے پیچھے سے دبے پاؤں اس کے قریب جا کر اس کی گردن کی رگ مسل کر اسے بے ہوش کر دیا تو تلاشی لینے پر مجھے اس کی جیب سے ساڑھے تیرہ سو روپے ملے اس کے علاوہ چار سو روپے کی قیمت کا ایک پارکر قلم بھی اس کی جیب سے نکلا — کچھ اور اَلا بلا قسم کی چیزیں بھی تھیں اس کی جیب میں، مگر میں نے وہ رہنے دیں اور پچاس روپے بھی اس کی جیب میں ڈال دیئے تاکہ وہ خرچ وغیرہ سے تو تنگ نہ ہو۔ اس کے پیٹ کی وسعت بتاتی تھی کہ اس کی آنت دو مرغیوں سے کم میں نہیں بھرتی ہو گی۔

میں نے ان دونوں کی بندوقوں میں سے کارتوس نکالے اور ان کی کارتوسوں سے بھری پیٹیوں سمیت ان کی بندوقیں جوہڑ میں پھینک دیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے گٹھڑی میں سے اپنے کپڑے نکالے اور ان کو اچھی طرح سے جھاڑ پونچھ کر پہن لیا۔ میرے بازو کا زخم مجھے مسلسل پریشان کر رہا تھا مگر مجھے تو وہ درد بہرحال برداشت کرنا ہی تھا۔ چکنی مٹی کا کچھ اور سفوف میں نے زخم میں بھر دیا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا رکھ کی طرف چل دیا۔ اس سپاہی کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے تھانے میں اطلاع بھجوا دی تھی اور کوئی دم جاتا تھا کہ پولیس کی ایک نئی ہیبت ناک مسلح گارڈ وہاں پہنچنے کو تھی۔ اس علاقے کے لوگوں کا جو حشر ہونے والا تھا اس کے تصور سے مجھے وحشت ہوتی تھی کیونکہ وہ لوگ دیہاتیوں کے اس بیان پر کبھی اعتبار نہیں کریں گے کہ جس آدمی نے ہادی علی کو مارا اور پھر جس نے ایک سپاہی کو قتل کر دیا وہ ان میں سے نہیں تھا۔ وہ تو اس روز بلا در [illegible] کے غریب کمی کمین اور مزارع قسم کے نہتے لوگوں کو ذلت کی انتہا کو پہنچا دیں گے۔ یہ احساس مجھے رہ رہ کر ڈس رہا تھا مگر میں بے بس تھا۔ ان کی کوئی بھی مدد نہ کر سکتا تھا، کر ہی نہیں سکتا تھا۔

رکھ اس کھنڈر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں اس کے اندر جا گھسا۔ وہاں شیشم، شہتوت، کیکر اور اس قسم کے دوسرے درختوں کی گھنی چھاؤں نے اندھیرا سا کر دیا تھا۔ بلاشبہ اس رکھ میں بہت قسم کے جانوروں کی موجودگی کا امکان ہو سکتا تھا۔ کیونکہ کئی مربع میل رقبے پر پھیلا ہوا وہ جنگل بہت مہیب نظر آتا تھا۔ میں کنارے سے اندر ہو کر درختوں کی اوٹ میں چلتا ہوا ابھی کوئی ایک میل آگے گیا تھا کہ مجھے اپنے بائیں ہاتھ جنگل کے دل سے ایک بہت ہی المناک آواز سنائی دی۔ کوئی اللہ کا بندہ بڑے ہی درد بھرے سُروں میں گا رہا تھا

کیہ پچھناں ایں ذات سجنے دی
لب مٹی تک چھائیاں

(سجنے سے اس کی ذات کیا پوچھتے ہو۔ وہ تو مٹی بھری اور [illegible] سیاہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے)

وہ آواز اتنی غم انگیز اور اس قدر درد میں ڈوبی ہوئی تھی کہ میرا دل بیٹھنے لگا میرے قدم آہستہ ہو گئے۔ وہ آواز جنگل کے اس سناٹے میں سحر پھیلا رہی تھی۔ میں سمجھا کوئی چرواہا تنہائی کے سبب دل میں پھنسا کراہ رہا ہے۔ آواز ذرا دیر کے لئے ابھری اور پھر تھم گئی جیسے چلتے چلتے رک گئی ہو۔ میں آگے بڑھنے لگا مگر اس طرح کہ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ آدمی یونہی راگ الاپتا رہے۔ اپنی ذات کی نفی کے اس عمل کو اس وقت تک جاری رکھے جب تک میں کسی صاف سیدھے رستے پر ہو نہیں جاتا۔

ابھی میں دس ہی قدم آگے نکلا تھا کہ وہ آواز ایک بار پھر سناٹے کو چیرتی ہوئی چاروں طرف پھیلنے لگی۔ میں راگ الاپ کا رسیا کبھی بھی نہیں رہا ہوں۔ بڑے بڑے سُر باز قسم کے لوگوں کو بھی کبھی میں نے اہمیت نہیں دی۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ بے کار اور متروک قسم کے لوگوں کا شغل ہے اور سُر بازی میں کچھ نہیں رکھا ہے مگر اس آواز میں کچھ ایسا تھا اس ایسی طرب انگیز اذیت اور ایسا درد تھا کہ میں نے اپنا رستہ

بدلا اور اس کی سمت چلنے لگا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کون آدمی ہے جس کے گلے میں خدا نے اتنی مقناطیسی کشش بھر دی ہے کہ وہ جب دھیمے دھیمے سُروں میں دل کے درد کا اظہار کرتا ہے تو پتھر جیسے سیاہ کار آدمی کا بھی من موہ لیتا تھا۔ وہ اب مسلسل گا رہا تھا۔

کیہ پچھناں ایں ذات سجنے دی
لب مٹی تک چھائیاں

میں کافی دیر تک جنگل کے قلب کی طرف چلتا رہا مگر اس آواز کے مخرج تک نہ پہنچ سکا۔ لگتا تھا جیسے وہ آواز ہر سمت پھیلی ہوئی ہے مگر اب میں جنگل کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔ حیرت یہ تھی کہ راستے میں میں نے کئی جنگلی جانور دیکھے، ان میں سؤر بھی تھے اور گیدڑ بھی، اور خرگوش تو اتنے دیکھے کہ ان کو گننے سے عاجز تھا اور یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ کیونکہ گیدڑ، بھیڑیے اور سؤر جیسے جانور جہاں رہتے ہیں وہاں خرگوش کی نسل زیادہ نہیں پنپ سکتی۔ اور اس رکھ کے بائیں ہاتھ دریائے چناب بہتا تھا — وہ موسم کے اس حصے میں بہت سی جگہوں پر لکیر کی صورت میں بہتا ہے مگر پھر بھی وہ دریا ان جانوروں کے لئے آبِ حیات مہیا کرتا تھا۔

میں نے اس آواز پر کان لگا رکھے تھے مگر وہ اس وقت اچانک ختم ہو گئی جب میں اس کے مرکز سے شاید تھوڑی ہی دور تھا۔ میں دم سادھے چند لمحوں تک وہاں کھڑا سوچتا رہا کہ اب کدھر نکلوں۔ اس سیٹی نَے کے تعاقب میں میں نے خواہ مخواہ اپنا رستہ کھوٹا کر لیا تھا مگر نہیں میری... حسیت کا یہ تجزیہ ایک بار پھر تحلیل ہونے لگا۔ وہ آواز ایک بار پھر جنگل پر چھائے سکوت کے شیشے کو توڑتی ہوئی ابھری۔ اب کی بار وہ ہیر الاپ رہا تھا۔

تقدیر اللہ دی نوں کون موڑے
تقدیر پہاڑ پلٹ دی اے
گیا بھج تقدیر دے نال ٹھوٹھا
ساتھوں قیمت لے کے لُٹ دی اے

(تقدیر کو کون بدل سکتا ہے۔ تقدیر تو وہ چیز ہے جو پہاڑوں کو اُلٹ دیتی ہے اور تیرا یہ پیالہ، جو تقدیر کے ہاتھوں ٹوٹ گیا ہے اس کا غم نہ کر۔ اس کے بدلے میں ہم سے ایک گھڑے کی قیمت لے لے)

وہ آواز اب زیادہ دور نہیں تھی۔ میں تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ میری اسٹین گن کمبل کے نیچے بائیں کندھے پر لٹک رہی تھی اور میرا دایاں بازو درد سے بھرا ہوا تھا۔ میں ابھی چند ہی قدم آگے گیا تھا کہ مجھے ایک جھونپڑی نظر آئی۔ اس کا عقب میرے سامنے تھا۔ وہ درختوں کے عین بیچ میں بنی وہ جھونپڑی دھوئیں سے کالی ہو رہی تھی۔ میں اس کے گرد گھوم کر سامنے کی طرف پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی میلے کچیلے لحاف میں ایک چارپائی پر بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے لکڑیاں سلگ رہی تھیں ڈھیر کی صورت میں۔ اس کے بال جو بہت لمبے تھے، کندھوں تک پھیلے ہوئے تھے — ان بالوں پر سفیدی غالب آ چکی تھی۔ یہی حال اس کی داڑھی کا تھا وہ بھی جھاڑ کی طرح اس کے سینے پر پھیلی ہوئی تھی چہرہ اس آدمی کا توے ایسا سیاہ تھا۔ یہی حال اس کے ہاتھوں کا تھا۔ وہ آگ کرید رہا تھا۔ میں اس کے سامنے جا پہنچا تھا مگر اسے میری آہٹ بھی سنائی نہ دی تھی۔ شاید وہ بہرہ تھا۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے بالکل قریب جا پہنچا تو اس نے سب سے پہلے میرے پاؤں پر نظر ڈالی اور پھر میرے قد کی ایک ایک پور کو دیکھتے ہوئے وہ اپنا چہرہ آہستہ آہستہ یوں اوپر لایا جیسے وہ اپنی نظروں کی میزان میں مجھے تول رہا ہو۔ اس کا چہرہ سُتا ہوا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں لگتا تھا اس نے بہت فاقے جھیلے ہیں۔ کڑی مشقتیں سہی ہیں جب وہ مجھے اپنی ان بے نور آنکھوں سے تول چکا تو بولا "کون؟"

"سلام بابا جی! میں ادھر سے گزر رہا تھا آپ کی آواز سن کر ادھر آ گیا ہوں۔ آپ بہت اچھا گاتے ہیں۔"

میری بات کا کوئی جواب نہ دیتے ہوئے وہ آگ کریدنے لگا۔ چنگاریوں کو اچھی طرح ننگا کر کے بولا۔

"بیٹھو!" اس کی آواز میں بھی زندگی نہیں تھی بہت ہی بھر بھری سی بے جان آواز تھی۔ مجھے حیرت یہ تھی کہ اگر یہی شخص گا رہا تھا تو اس کی آواز میں اتنا رس کہاں سے پیدا ہو گیا تھا۔

"آپ ہی گا رہے تھے نا بابا جی؟"

"ہاں! کبھی کبھی گا لیتا ہوں۔ گانا کہاں گا سکتا ہوں میں؟"

وہ اس بے کراں تنہائی میں مجھے اپنے قریب پا کر خوش ہونے کے بجائے اور زیادہ بجھ گیا تھا۔ کوئی بہت ہی سنکی قسم کا آدمی معلوم ہوتا تھا — مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے خواہ مخواہ اپنا رستہ کھوٹا کیا۔ میں اب تک بہت آگے پہنچ گیا ہوتا۔ اس شخص سے مجھے بھلا کیا لینا تھا جو دنیا سے سارے رشتے ناتے توڑ کر اس جنگل میں وحشی جانوروں سے بھی زیادہ بدتر زندگی گزار رہا تھا۔ میں اس کا گیت سن کر ادھر کیوں آ گیا؟ میں چند منٹ تک وہاں بیٹھا اس کے اجڑے اجڑے ویران گرد و پیش کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اگر کوئی ڈھلمل یقین توہم پرست آدمی میری جگہ ہوتا تو اس بوڑھے کے پاؤں پر سر رکھ دیتا اور کہتا۔ "میرے من کی مراد پوری کر دو بابا جی! مجھے اپنا غلام بنا لو" اور یہ بابا جی ایک دم اینٹھنے لگتے، پھڑے بازی دکھاتے، پاس پڑا ہوا چمٹا اٹھا کر اس کی کمر میں دے مارتے۔ ہر طرح سے اسے ذلیل کرنے اور اپنی کرامت دکھانے کے شوق میں شاید اسے اٹھا کر سر کے بل آگ میں ڈال دیتے کہ ہاں بچہ! ما بدولت مُردے کو بھی زندہ کر سکتے ہیں مگر میں نے ایسے توہمات کا طوطا کبھی پالا ہی نہیں تھا۔ مجھے اس کے وجود سے گھن سی آ رہی تھی۔

وہ بوڑھا رہ رہ کر اپنی ٹانگیں لحاف میں کبھی دائیں موڑتا تھا اور کبھی بائیں۔ مجھے یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ بیمار ہے اور شاید اس کی ٹانگوں میں شدید درد ہے۔ جب لڑکی جس بے چین کرتی تھی تو وہ حواکرا ہی پڑے رہنے کو ترجیح دیتا تھا۔

اچانک مجھے جنگل کے مشرقی حصے سے گاڑیوں کے انجنوں کی گھر گھر سنائی دی۔ وہ ایک دو نہیں بہت سی گاڑیاں تھیں۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس بوڑھے کی اس چھپر نما جھونپڑی سے کوئی دس پندرہ ہاتھ دور ایک کچی پگڈنڈی تھی اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ گاڑیاں اس پگڈنڈی پر بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ یہ بڑی خوفناک بات تھی۔ اس سپاہی کے الفاظ میرے ذہن میں.... گونج رہے تھے جسے میں بے ہوش کر کے جوہڑ کے کنارے پھینک آیا تھا۔ اس کی باتوں سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ساتھی تھانے میں اطلاع دینے گئے ہوئے تھے کہ اس ڈاکو کے ہاتھوں ان کا کیا حشر ہوا تھا؟ اور اب وہ لوگ جیپوں میں بھر کر میرے پیچھے آئے تھے تاکہ وہ مجھے جس طرح بھی ممکن ہو گرفتار کر لیں۔ گاڑیوں کی آوازیں لحظہ بہ لحظہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ میں ان سے بدک کر اٹھا اور ان آوازوں کی سمت کا تعین کر کے دوسری طرف بڑھا تاکہ جس قدر جلدی ممکن ہو میں وہاں سے نکل جاؤں۔

مگر ابھی میں اس بوڑھے کے سامنے لیٹنے الاؤ سے ایک ہی قدم ادھر نکلا تھا کہ اس نے بڑی گمبھیر آواز میں کہا۔

"رک جاؤ! یہاں تم بالکل محفوظ ہو —— بھاگو گے تو پکڑے جاؤ گے"

مجھے یوں لگا جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا ہے کیونکہ اب کی بار جو آواز میری سماعت سے ٹکرائی تھی وہ اس مریل سی آواز سے مختلف تھی جو میں پہلے سن چکا تھا۔ میرے پاؤں وہیں رک گئے۔

"ادھر جھونپڑی میں اندر جا بیٹھو!"

میں نے احمقوں کی طرح اسے گھری گھری نظروں سے دیکھا اور کسی سحرزدہ معمول کی طرح گردن جھکا کر چپ چاپ جھونپڑی کا میلا سا پردہ ہٹا کر اندر جا گھسا..... مگر اس سرکنڈے کی بنی جھونپڑی کے اندر پہنچ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہاں جھونپڑی کے فرش پر پیال بچھی تھی اور اس پیال پر ایک ایسی خوبرو لڑکی اپنے گرد لحاف لپیٹ کر بیٹھی تھی کہ اس کے چہرے پر نظریں نہ ٹھہرتی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی پیازی رنگت شہابی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں قوس قزح سی لہرا گئی۔ مجھے اپنے سامنے پا کر وہ سمٹی اور لحاف کو گھسیٹ کر جھونپڑی کی دیوار سے جا لگی۔ اس کے بالوں کی تابناک سیاہی مجھے حیران کر رہی تھی۔ وہ بوڑھا جس قدر گندا اور غلیظ تھا وہ لڑکی اتنی ہی صاف ستھری اور نہائی دھوئی نظر آتی تھی۔ میرے سامنے دونوں طرف ایک ایسا تضاد تھا جسے میری عقل تسلیم کرنے سے گریزاں تھی۔

اچانک مجھے گاڑیوں کی گھر گھر قریب آتی سنائی دی۔ میں نے اپنی اسٹین گن کمبل سے نکال کر سیدھے ہاتھ میں پکڑ لی۔ میری زندگی شاید اپنی تلخ ترین آزمائش سے دوچار تھی۔ میری سانسیں زیر و زبر ہو رہی تھیں۔ گاڑیاں آگے سے نہیں گزریں بلکہ وہ عین اس جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر رک گئیں۔ اس لڑکی نے وہ سنگین ہتھیار میرے ہاتھوں میں دیکھا تو مسکرا کر آگے بڑھی اور سرگوشی کے انداز سے نہایت ہی شیریں لہجے میں بولی "ہتھیار مت چلانا۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"وہ مجھے پکڑنے آ رہے ہیں" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ میرے منہ سے ایک گالی نکل گئی تھی۔

"تمہارے منہ سے گالی اچھی نہیں لگتی"

"تو اور کیا کہوں میں ان کو دعا دوں۔ وہ میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں وہ بھیڑیئے" میں نے اپنی جگہ پر جم کر کہا۔ رخ میرا ان کی طرف تھا اور اب مجھے جھونپڑی سے آگے پگڈنڈی پر تین جیپیں کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے کئی سپاہی اچھل اچھل کر اترے اور چاروں طرف پھیل گئے۔ پانچ سپاہی اور دو افسر تیز تیز قدم اٹھاتے جھونپڑی کی طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک اپنی وردی کے اعتبار سے مجھے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نظر آتا تھا۔ اس نے ہاتھ میں شیشم بید کی چھڑی سنبھال رکھی تھی اور اس کی چمکتی ہوئی پیٹی میں پستول لٹک رہا تھا۔ وہ مجھے اس کا طرّہ بہت ہی کھل رہا تھا۔ چہرے مہرے سے وہ میر سیال کا ایجا نجا نظر آتا تھا۔ بہت گورا چٹا اور خوبصورت جوان تھا وہ۔ ایسا جوان جسے اپنے بازوؤں کی مچھلیوں اور نگاہ کی تیزی پر بڑا فخر ہو۔ اس کے ساتھ دوسرا آدمی کوئی تھانیدار تھا۔ اپنی وضع قطع کے اعتبار سے وہ مجھے کوئی بڑا ہی سفلہ سا شخص دکھائی دیتا تھا —— اس کے بھی گلے رشوت نے پھلا رکھے تھے۔ اس نے اپنا پستول ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ ان کے دائیں بائیں پانچ سپاہی ہاتھوں میں بندوقیں تانے یوں جھونپڑی کی طرف بڑھ رہے تھے جیسے وہ ابھی [illegible] دیں گے۔

میرا ہاتھ اسٹین گن کی لبلبی پر تھا اور میں ان کے قدم گن رہا تھا۔ مجھے اب اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی ماسوائے اس کے کہ میں انہیں بھسم کر دوں۔ آن واحد میں فنا کے گھاٹ اتار دوں اس سے پہلے کہ وہ سب میرا بدن اپنی گولیوں سے چھلنی کر دیں۔ اس کے سوا اور کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ اس گندے غلیظ بوڑھے پر مجھے سخت طیش آ رہا تھا جس نے مجھے جھونپڑی میں چھپ جانے کا مشورہ دیا تھا اور وہ اس کی خوش شمائل چھوکری مجھے یہ مشورہ دے رہی تھی کہ میں گولی ہرگز نہ چلاؤں۔ اس کا تو یہ کہنا تھا کہ اس کی ضرورت ہی نہیں ہے لہٰذا ادھر وہ لوگ ملک الموت کی طرح میری جان قبض کرنے کے لئے بڑھے چلے آتے تھے اور

کہتی تھی میاں گولی مت چلانا۔ بت تیری خوش بختی کی ایسی تیسی! یہ وقت بھلا کوئی ایسے مشوروں کا ہے کھوتی کی بچی؟ میں سرک کر جھونپڑی کے پردے کے قریب ہو گیا۔ وہاں ایک گھڑونچی رکھی تھی اس پر دھرا گھڑا میں نے نیچے اتارا اور اسٹین گن کی نال اس پر جما کر رکھ دی۔ اب میں زیادہ بہتر طریقے سے ان خبیثوں سے نمٹ سکتا تھا۔

وہ لوگ اب جھونپڑی کے سامنے آ ٹھہرے تھے۔ اب وہ بالکل میری زد میں تھے۔ میں نے چاہا کہ میں فائر کھول دوں مگر ابھی میں لبلبی پر انگلی رکھ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنے رخسار پر ملائم سے لمس کا احساس ہوا۔ وہ لڑکی میرے پیچھے کھڑی تھی۔ اور میرا رخسار تھپتھپا رہی تھی۔

"صبر سے کام لو غلام جیلانی پیچھے آ جاؤ" اس کے منہ سے اپنا نام سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ میری آنکھیں اور میرا منہ حیرت کے مارے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"زیادہ حیرت دکھ دیتی ہے پیچھے ہٹ جاؤ"

یہ کہہ کر اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے پیچھے کھینچا تو میں سمجھا کہ ہوا سے ہلکا اور لفظ سے زیادہ بے وقعت ہو چکا ہوں۔ میرا رائی وزن ہی نہیں رہ گیا تھا۔ میں روئی کے گالے کی طرح اس کی بانہوں میں کھنچتا ہوا پیچھے گیا تو اس نے جھونپڑی کے کونے میں سے پیال ہٹائی۔ اس پیال کے نیچے دو تختے تھے۔ وہ اس نے تیزی سے کھینچے تو مجھے ان کے نیچے چھ فٹ گہرا گڑھا نظر آیا۔ اس لڑکی نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اس میں کود جاؤں۔ میرے لئے اس کا حکم ماننے کے سوا اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہ گیا کیونکہ وقت میرے خلاف چل رہا تھا میرے صبر و سکون کے سارے اونچے اونچے درخت نیچے گر چکے تھے۔ میں گڑھے میں کودا تو وہ بھی میرے ساتھ ہی نیچے آ گئی۔ اس نے ہاتھ اونچا کر کے فوراً ہی تختے اوپر رکھ کر پیال سے ڈھانپ دیئے۔ تختوں کا ایک کونا شاید اس نے ذرا سا ننگا رکھا تاکہ اس میں سے ہوا آ سکے۔ یہ سارا کام اس نے اتنی تیزی اور مہارت سے مکمل کیا کہ میں حیران رہ گیا۔

"یہ بابا جی کب سے رہتے ہیں یہاں؟" پولیس افسر نے بڑے طنطنے سے سوال کیا۔ مجھے اس کے لہجے سے نخوت اور تکبر کی بو آ رہی تھی۔ ان کی آوازیں میں صاف طور پر سن رہا تھا۔

"پتہ نہیں جناب! میں ایک سال پہلے بھی ادھر آیا تھا، ایک مجرم کی تلاش میں۔ تو یہ بابا یہیں دھونی رمائے بیٹھے تھے۔ لوگ انہیں رکھ شاہ کہتے ہیں"

"اچھا اچھا! تو یہ رکھ شاہ ہیں درختوں کے بادشاہ۔ مگر یہ سب بکواس ہے منیر صاحب! یہ دھونی شونی۔ بالکل فراڈ ہوتے ہیں یہ لوگ"

وہ لڑکی میرے ساتھ جڑ کر کھڑی تھی۔ گڑھے میں ان کی ضرورت کی چند چیزیں پڑی تھیں جن سے پیر بچا کر میں اس طرح کھڑا تھا کہ میرا بدن اس لڑکی سے مس نہ ہو مگر وہ جگہ ہونے کے باوجود بھی میرے ساتھ چمٹی ہی تھی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سر! میں تو ان باتوں پر بالکل یقین نہیں رکھتا"

"اس کی جھونپڑی تو دیکھیں ذرا۔ یہ پردہ ہٹاؤ"

اس افسر کی آواز پھر میرے کانوں میں پڑی۔ میں لرز کر رہ گیا کیونکہ اگر کسی طرح ان لوگوں کا پاؤں ان تختوں پر رکھی پیال پر آ پڑتا تو وہ ضرور سمجھ جاتے کہ وہ تختے وہاں بلا وجہ نہیں رکھے ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے جھونپڑی کا پردہ ہٹا کر اندر دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ بابا رکھ شاہ خاموش تھا۔ اس نے ان لوگوں سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

"جھونپڑی تو بالکل خالی ہے سر"

"ظاہر ہے وہ بدمعاش ادھر اندر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ ضرور بھاگ گیا ہوگا" اسی افسر نے کہا۔

"تیری قسمت اچھی ہے غلام جیلانی! وہ اندھے ہو رہے ہیں" اس لڑکی نے سرگوشی کی۔

اس کی آواز کی نغمگی مجھے حیران کرتی تھی۔

"یہ گڑھا کام آ گیا ورنہ تو میں مارا ہی گیا تھا آج"

"اور میں کام نہیں آئی تمہارے"

"ہاں مگر مجھے تو تم کوئی بھوت پریت قسم کی چیز نظر آتی ہو؟"

"نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔ مجھے ذرا چھو کر دیکھو۔ میں تمہیں بھوتنی لگتی ہوں"

"کیا کرتی ہو؟ پریشان نہ کرو مجھے" میں نے اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ہر وقت یہ اسٹین گن کام نہیں دیتی ہے۔ ایسے وقتوں میں دماغ پر زور دیا کرو" ایک بار پھر اس کے احمریں لب ہلے تو اس گڑھے میں جلترنگ سی بج اٹھی۔

"وہ سالے اندھراتے کے مارے ہیں دیکھ ہی نہ سکے ورنہ وہ معاف کر دیتے مجھے۔ وہ دن کے اندھے۔ وہ تو پھاؤڑے پر رکھ دیتے مجھے اور میرے ساتھ تمہیں بھی"

"اندھے کی داد نہ فریاد۔ اندھا مار بیٹھے گا" وہ دونوں ہاتھوں سے عجیب سی ترنگ میں گدا مار کر ہنسی تو اس کے شب چراغ دانت اس کے زخم ایسے تنگ دہن میں جھلملا اٹھے۔ وہ بلاشبہ حسین تھی بے حد حسین۔ وہ ایسی تھی کہ اس جیسی نہ میں نے کبھی دیکھی تھی نہ پھر دیکھ سکوں گا۔ شوخ اتنی تھی کہ ان بدترین لمحوں میں بھی وہ چٹکی لینے سے باز نہیں رہتی تھی۔

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے اور وہ میرے خون کا پیاسا؟ پوچھتے پھر رہے ہیں" میں نے جل کر کہا۔ میری جان پر بنی تھی اور اسے مذاق سوجھ رہا تھا——

"سورج چھپنے سے پہلے پہلے یہ جنگل دیکھ لو۔ ٹھیک ساڑھے چار بجے واپسی ہونی چاہئے۔ میری ادھر ایس پی صاحب سے میٹنگ ہے۔" اس پولیس افسر نے جھونپڑی سے باہر نکل کر واپس ہوتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے جناب! مگر میرا خیال ہے کہ وہ ادھر نہیں آیا ہے وہ بدمعاش۔ وہیں سے کسی طرف نکل گیا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ گاؤں میں کسی کے گھر چھپا ہوگا۔ میں ادھر اکبر کوٹ میں دیکھتا ہوں تم بلاور میں خانہ تلاشی لو مجید۔ اور دیکھو یار محمد! یہ تیسری جیپ رکھ لو۔ اس جنگل کو دیکھ کر ادھر ہی آ جاؤ مگر بہت ہوشیار رہنا۔ خواہ مخواہ کوئی اور آدمی نہ مروا لینا۔ اس محمود کی موت کا مجھے بہت افسوس ہوا ہے۔"

یہ کہتا ہوا وہ ڈی ایس پی پگڈنڈی کی طرف واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جیپیں وہاں سے روانہ ہو کر دوسری طرف نکل گئیں۔

جب ان گاڑیوں کی گھر گھر کی آواز آنی بند ہو گئی تو ہم دونوں گڑھے سے نکل کر اوپر آ گئے۔ وہ بہت خوش تھی اور میری سراسیمگی سے محظوظ ہو رہی تھی اور مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی تھی جیسے وہ میرے خیالات پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے دیکھنے کا انداز اپنائیت سے اتنا لبریز تھا کہ میں نے بھی اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور کہا۔

"بتایا نہیں تم نے...... وہ میرا نام تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں بہت پہنچی ہوئی بزرگ ہوں غلام جی...... جی...... جی...... لا...... لا...... لا...... نی جی۔"

اس نے پھر چٹکی لی۔ وہ میرے نام کو سا رے...... گا ما...... پا...... دھا...... نی...... سا کی طرز پر گا کر ادا کرتی تھی۔ میں جھنجھلا سا گیا۔ وہ مجھ سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہو رہی تھی۔ حالانکہ میں قوی تر بلکہ خونخوار قسم کا ہتھیار بند مرد تھا۔ اور اس کا محافظ وہ بوڑھا قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ میری عزت اور خاطر تواضع کرنے کے بجائے وہ ماہ رو میرا مذاق اڑا رہی تھی۔

"دیکھ ری! تجھے لڑکی سمجھ کر میں چپ رہ جاتا ہوں ورنہ میں تیرا گلا گھونٹ دوں ہاں۔ بہت بے عزتی کر رہی ہے تو میری۔" میں نے بہت سنجیدہ لہجے میں کہا۔

وہ ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ بولی: "اچھا! تو تیری کوئی عزت بھی ہے غو...... لا...... م...... ذی...... ی...... لانی۔"

"کیا؟ کیا کہا تم نے۔ میں ذیلانی ہوں۔ خبردار جو یہ بکواس تم نے پھر کی تو؟"

"تو کیا ہوگا غلام ذیلانی ذی؟" وہ پھر ہنسی اور سرک کر میرے قریب ہو گئی اور میرے چہرے پر پھیلی برہمی دیکھ کر بولی۔

"تیرا بازو تو بہت دکھتا ہوگا۔ انگلی بھر لمبی گولی گزر گئی تھی اس میں سے۔ میں دیکھ رہی تھی۔ لا میں مرہم لگا دوں۔ لا میرا اچھا غلام ذیلانی...... لا۔" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے کوٹ کے بٹن کھول دیئے۔ میری حیرت بے حد و حساب ہو چکی تھی۔ وہ کوئی ارضی مخلوق ہرگز نظر نہیں آتی تھی۔ وہ وقت، فاصلے اور پردوں کی قید سے بالکل آزاد تھی۔ وہ ہر بات جانتی تھی اور آدمی کے دل کے درون پردوں میں جھانک لینے کی قوت رکھتی تھی۔ پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ میں کسی مافوق الفطرت شے کے سامنے بیٹھا ہوں اور بالکل بے وقعت اور حقیر ہو گیا ہوں۔ میرے چہرے پر کھنڈی زردی دیکھ کر اس نے بڑی محبت سے میرے گال تھپتھپاتے بولی۔

"ڈرتے کیوں ہو غلام جیلانی! میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔ لاؤ میں تمہارا زخم تو دیکھوں۔ تم ہمارے مہمان ہو، غیر نہ بنو۔ لاؤ اتارو کوٹ۔" یہ کہہ کر اس نے پہلے میرا کمبل الگ کیا پھر کوٹ اتارا اور پھر کرتا بھی اس نے میرے گلے سے کھینچ کر الگ کر دیا ـــ جب وہ میری قمیص اتار چکی تو بولی۔

"تم بڑے خوبصورت ہو غلام ذیلانی۔ بہت خوبصورت اور صحت مند بھی!"

"دیکھ پھر تو نے میرا نام بگاڑا۔ مجھے غصہ آ جائے گا ہاں۔" میں نے جھوٹ موٹ کا طیش ظاہر کیا۔ اس کے سامنے میں بالکل کاٹھ کا الو بن چکا تھا اور میرے دل و دماغ کی چند ہی منٹوں میں اس نے ایسی حالت کر دی تھی کہ اس کی ہر بات مجھے لذت معلوم ہونے لگی تھی۔

"تیرا اصلی نام یہی ہے۔ تیرے کام بھی ایسے ہی ہیں تو پھر بولو نہ کیوں تجھے گو...... لا...... م...... ذی...... ی...... لا...... نی۔" وہ ایک بار پھر اپنے لہجے میں موسیقی پیدا کرتی ہوئی میرا زخمی بازو دیکھنے لگی لیکن اس کا معائنہ کرنے لگی جیسے وہ مجھے ازل سے جانتی ہو۔ میرے لئے دکھ سہتی رہی ہو۔ میرے فراق کے گیت گاتی رہی ہو۔ وہ یوں میرے ساتھ پیش آ رہی تھی جیسے میرے اور اس کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں تھا نہ صنف کا نہ جنس کا نہ دل کا نہ وجود کا۔ اس نے بڑی احتیاط سے میرے زخم پر سے پٹی ہٹائی تو بولی۔

"تو بڑا سخت دل ہے۔ درد نہیں ہوتا تجھے؟"

"ہوتا ہے پر کیا کروں؟ کون بیٹھی ہے میری یہاں جو میرا درد بٹائے؟"

"تیرے جیسے کے لئے کون برباد ہوتا پھرے۔ تو تو بڑا آفاقی بدمعاش، چور، اچکا، لفنگا۔" ایک ہی سانس میں اس نے مجھے کئی نام دے دیئے۔ ہونٹ اس نے یوں لگاوٹ سے سکوڑ لئے تھے کہ مجھے اس پر غصے کے بجائے پیار آنے لگا۔

"تو کیا کچھ جانتی ہے میرے بارے میں؟ تیرا اپنا کیا نام ہے؟ ذرا میں اسے بھی تو بگاڑ کر دیکھوں۔" میں نے اپنا بازو اس کے آگے

پھیلاتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرائی اور اپنی آنکھوں کو کیمرے کی طرح کلک کلک کرتی بولی: "میرا نام؟ تیرا کیا خیال ہے میرا کیا نام ہونا چاہئے؟" یہ کہہ کر اس نے گھڑے میں سے انڈیل کر ایک پیالے میں پانی بھرا اور جھونپڑی کے باہر نکل گئی۔ چند ہی منٹ بعد جب وہ واپس آئی تو اس پانی میں وہ کوئی بوٹی گھول رہی تھی جس سے پانی کا رنگ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ میرے قریب آئی اور میرا بازو کندھے پر رکھ کر بولی۔

"تیرا کیا خیال ہے؟ میرا کیا نام ہونا چاہئے غلام ذیلانی؟"

"تیرا نام؟ میرا خیال ہے کہ...... کہ تیرا نام...... تیرا نام بچا تاں ہونا چاہئے۔" یہ بات سنتے ہی وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور میرے بازو پر سرخ پانی ڈالنے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اس پانی کو گرم کر کے لائی ہے مگر مٹی کا پیالہ جب میں نے اپنے بائیں ہاتھ سے ٹٹولا تو اس کا پیندا سرد تھا۔ کوئی ایسی ہی تاثیر تھی اس بوٹی میں کہ پانی کھولنے کی حد تک گرم ہو چکا تھا ـــ اس پانی سے وہ میرا زخم دھو چکی تو پھر اس نے کونے میں پڑے ایک کپڑے سے میرا بازو خشک کیا اور بولی۔

"لے دیکھ! تیرا زخم آدھا بھی نہیں رہ گیا ہے۔ صبح تک تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اپنے زخمی بازو پر نگاہ ڈالی تو مجھے پھر حیرتوں نے گھیر لیا۔ میرا زخم بھر چکا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے انگور آ رہا ہے۔ اس کے ان انفسی لمس کے حامل ہاتھوں نے عجب معجزہ دکھایا تھا۔

"تو نے مجھے حیران کر دیا ہے کیا نام ہے تیرا بچا...... تا...... ں...... دل کھا تاں۔" میں نے اسے چڑانے کی کوشش کی۔ حالانکہ میں اپنے ذہن میں اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ میں اس سے بے تکلف ہو کر خود اپنی ہی تذلیل کا سبب بن رہا ہوں۔ اس کے چہرے کے گرد پھیلے نور کے ہالے نے اس جھونپڑی کو ایسا تقدس بخش دیا تھا کہ میں اس کا پوری طرح احاطہ کر ہی نہ سکتا تھا۔ خدا جانے وہ کیا چیز تھی اور کیوں اس روپ میں وہ اس ویرانے میں اتر آئی تھی۔ بس وہ میرے اندر کا اکھڑ، جاہل مطلق اور ڈھیٹ مرد تھا جو میری زبان سے ایسے کلمے کہلوا رہا تھا۔ ورنہ وہ تو ایسی تھی کہ صاف سیدھی خدا کی برگزیدہ ہستی نظر آتی تھی جسے اس کے پروردگار نے ان گنت معجزوں سے نواز رکھا تھا۔ وہ عیسیٰ نہیں تھی مگر مسیحائی کرتی تھی ـــ اس نے قدم قدم پر مجھے حیران کر دیا تھا۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس کے بھید کو کس طرح پا سکوں گا۔

"پٹی باندھ ـــ"

"نہیں اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تیرے اپنے پسینے سے یہ صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔ چل اب اپنی کھال کے اندر چلا جا، چل؟"

یہ کہہ کر اس نے مجھے کپڑے دوبارہ پہنانے شروع کر دیئے۔ جب میں کمبل بھی لپیٹ چکا تو وہ بولی۔

"تو اب جاتا کیوں نہیں وہ تیرے سائے تو پہلے بھاگ گئے کب کے چلے گئے۔"

"تنگ آ گئی ہے مجھ سے؟"

"چل بیچارہ! یہ رات تجھ پر بہت بھاری ہے۔ تیری آزمائش کی رات ہے۔ باہر نکلے گا تو کوئی شیشہ سپ تیرا ناس مار دے گا بیچارہ۔"

"بڑی مہربانی ہے تیری! یوں کہہ رہی ہو جیسے میں کوئی بھوک منگا ہوں۔" میں نے پشت کچی دیوار کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "میں وہاں سے ان کو جانے بنا کیسے چل دیتا۔ مجھے تو یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جو میرے لئے اتنی بڑی پناہ گاہ ثابت ہوئے ہیں۔"

اچانک باہر بیٹھے بوڑھے کی آواز پھر جاگی اور اپنی تمام تر شیرینی لئے پھیلنے لگی۔

لے کہہ بچھڑے او ذات بتھے دی
لپ مٹی تک چھانیاں
لپ مٹی تک چھانیاں

اس بوڑھے کی آواز کی نغمگی نے ایک بار پھر گرد و پیش کو مسحور کر کے رکھ دیا۔ میں بیان ہی نہیں کر سکتا کہ بلھے شاہ کے اس بول میں اس نے کیسے کیسے انوکھے مفہوم بھر دیئے تھے۔ وہ یہی بول الاپتا تھا اور بار بار اس سناٹے میں اگیا بیتال کی طرح سلگ اٹھتا تھا ـــ اس کی آواز نرم کومل جذبات کو انگیخت کرتی تھی۔

"بچا تاں! یہ بابا اندر سے بہت دکھی لگتا ہے مجھے؟"

"اوئے۔ تو نے تو میرا نام ہی بچا تاں ڈال دیا ہے۔ دیکھ میرا نام قدسیہ ہے قدسیہ!" اور اس نے جونہی یہ الفاظ کہے میری آنکھوں کے اندھیرا چھانے لگا۔ اس کے نام کے ساتھ بھی سیہ کا لفظ آتا ہے جس کے لئے میں یوں در بدر ہو گیا تھا ـــ وہ میری بہن آسیہ اس کی خاطر میں کیا سے کیا بن گیا تھا۔ جھونپڑی میں بیٹھی اس لڑکی نے مجھے جتنے بھی نام دیئے تھے وہ سب کے سب میرے ہی نام تھے۔ میں ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنے سے الگ نہ کر سکتا وہ میری ذات پر بہتان تھے نہ تہمت۔ وہ ایسی سیاہیاں تھیں جو میں نے خود اپنے منہ پر پوت لی تھیں۔ مگر کیوں؟ کس کے لئے؟ اپنی اس الھڑ، اکھڑ، غنچۂ نو دمیدہ ایسی بہن آسیہ کے لئے، اور وہ جیل کی اونچی اونچی سنگین دیواروں کے پیچھے بیٹھی لہو روتی تھی۔ اس کی رہائی کے لئے میں نے ہادی علی کو ٹھکانے لگا دیا تھا اور اب میں اس راستے پر چڑھنے کی کوشش میں تھا جو مجھے لاہور لے جاتا تھا۔

اگر وہ پولیس والے میرے پیچھے نہ لگ جاتے تو میں اب تک لاہور جا پہنچا ہوتا۔ کسی تیز رفتار کار میں بیٹھ کر میں اب تک لاہور میں آہو صاحب سے معاملہ طے کر رہا ہوتا۔

"کیا سوچنے لگے ہو؟" وہ میری طرف سرکی۔

"کچھ نہیں! تمہارا نام بہت اچھا ہے۔ مجھے بہت پسند ہے یہ نام۔"

"اچھا؟ آسیہ سے بھی زیادہ؟" اس نے حیرت کا ایک اور کوڑا

میرے لرزتے دل پر برسایا۔

"خدا کے لئے قدسیہ! مجھے...... مجھے...... بتاؤ تم کون ہو کیا ہو؟ تم نے مجھے حیران کر دیا ہے۔" میں نے ایک دم اس کی طرف کھسکتے ہوئے کہا۔ میری عاجزی اور انکساری اس گھڑی دیدنی تھی۔

"اے اے...... یہ کیا کرتے ہو غلام ذلی... ی... ی... لانی۔ پرے رہو۔" وہ سمٹ کر پیچھے ہٹی اور لحاف کھینچ کر دیوار کے ساتھ جا لگی۔

"مذاق نہ کرو قدسیہ مجھے خدا کے لئے بتا دو تم کون ہو؟ تمہیں میرا نام کس نے بتایا؟ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ کوئی آسیہ بھی ہے؟ تم کیسے جانتی ہو میرے بارے میں اتنی باتیں تمہیں کس طرح معلوم ہوئی ہیں میں نے تو تمہیں آج پہلی بار دیکھا ہے۔"

وہ میرے لفظوں کی آنچ لگا رہی تھی مگر اس کی وہ تیز تیز جھپکتی آنکھیں جو میری سانسوں کے آمد و شد کا ذریعہ بن گئی تھیں مجھے کچھ بھی نہیں بتا رہی تھیں۔ وہ مسکراتی رہی اور سامنے بیٹھی ٹک ٹک دیکھتی رہی۔

"تم بولتی کیوں نہیں ہو قدسیہ؟ میرے لئے یہ بات زندگی موت کا سوال بن گئی ہے۔ میرے ساتھ آنا کانی نہ کرو۔ مجھے صاف صاف بتا دو۔"

"تمہیں بھوک لگ رہی ہے دوپہر کو تمہیں کچھ بھی نہیں ملا۔ سچ سچ بڑی بات۔ اچھے بچے پہلے کھانا کھاتے ہیں پھر بات کرتے ہیں۔ تم بیٹھو میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور آفتابی کی طرح چلتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے سے یوں لگا جیسے جھونپڑی تاریک ہو گئی ہے وہ بد رکاب گھوڑی کی طرح مجھے پریشان تو کر رہی تھی پھر بھی میرا حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ میں اس پر اپنے طیش اور جبر کا کوڑا...... برساؤں۔ میں خود میں اتنی ہمت ہی نہیں پاتا تھا اور اب وہ میرے لئے کھانا لینے گئی تھی مگر کہاں؟ اس جھونپڑی کے سوا ابھی اس کا کوئی ٹھکانہ ہے۔ میں یہ بات معلوم کرنے کے لئے کمبل لپیٹ کر جھونپڑی سے باہر نکلا تو دیکھا کہ بوڑھا جھونک میں تھا اور خراٹے لے رہا تھا۔ میں اس کے پاس سے گزر کر جھونپڑی کے چاروں طرف گھوم گیا۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آئی۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو چکی تھی۔ میں زیادہ دور نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ پولیس کی ایک جیپ کے سپاہی ابھی ادھر ہی... سرگرداں ہوں گے ——— اس کو دور دور تک نگاہ دوڑا کر میں نے دیکھ لیا تو مایوس ہو کر میں ایک بار پھر جھونپڑی کے اندر جا بیٹھا۔ دن ڈھلتا جا رہا تھا میرے ہاتھ پر بندھے وقت کے بارے میں آدمی کا جہالت پیما آلہ بتا رہا تھا کہ شام کے ساڑھے چار بج چکے ہیں۔ سورج غروب ہونے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا ———

جب سورج غروب ہو چکا تو جھونپڑی کے اندر چاند طلوع ہونے لگا۔ وہ ایک بڑی سی چنگیر میں ڈھیر سارے جنگلی پھل بھر کر لائی تھی اور جھونپڑی میں داخل ہو کر کہہ رہی تھی۔

"تم کوئی خواب دیکھ رہے تھے۔ کسی اونچی مسند پر تو نہیں بیٹھے تھے؟ ریشمی سی خوبصورت سی مسند پر؟"

"کیا؟ کیا کہتی ہو تم؟ یہ ٹھہر ٹھہر کر چٹکی کیوں کاٹتی ہو؟" میں نے ایک بار پھر اپنی جگہ سے اچھل کر پوچھا ——— وہ شاید میری مسند آرا تک جا پہنچی تھی۔

"آہستہ بول، گلام ذلی...... ی...... ی...... لانی۔ آہستہ! بابا جاگ پڑیں گے۔ دو گھڑی سونے دے انہیں، کسی بچھو نے کاٹ لیا ہے تجھے۔ اچھلا کیوں تھا تو؟ ایں۔ یہ لے کھا۔ اپنے پیٹ کا دوزخ بھر اور پھر سو جانا۔"

پتہ نہیں وہ کس کس قسم کے پھل تھے؟ وہ میں نے جنگل میں بارہا دیکھے تو تھے مگر ان کے بارے میں یہی سنا تھا کہ وہ زہریلے ہوتے ہیں۔ ان میں کئی ایک واقعی کڑوے بھی تھے۔ وہ ان کو کاٹ کاٹ کے میرے سامنے رکھتی گئی۔ وہ شاید اس کے ہاتھوں کی شیرینی تھی یا اس کی آنکھوں کا سحر تھا کہ میں وہ تمام پھل ایک ایک قاش کر کے کھا گیا اور تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں نے وہ بھری ہوئی چنگیر خالی کر دی۔ وہ قدسیہ اس گھڑی مجھے روشنک نظر آتی تھی۔ سکندر کی طالع مند بیوی بھی جس کی تقدیر کے اوج نے سکندر کو بھی بالا بلند کر دیا تھا۔ میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کر رہا تھا مگر وہ میری بیوی تو ہرگز نہیں تھی۔

"بابا کے لئے بھی میں یہی پھل لائی ہوں ——— انہوں نے بھی کل سے نمک نہیں کھایا۔"

"ان کی ٹانگوں میں کوئی تکلیف ہے؟"

"ہاں! بہت دنوں سے وہ ایسے بیمار ہیں کہ چل پھر نہیں سکتے۔"

"تم ان کی کیا لگتی ہو! بیٹی ہو؟"

"تو باز نہیں آتا ہے سیندھ لگانے سے۔ پکا چور بن چکا ہے تو؟"

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"نکڑ سے پکڑ اٹھا کر دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے کیا کیا ہے میں نے؟ مونچھیں پونچھ اپنی، رس میں ڈوبی ہیں اور سیدھا ہو کر لیٹ جا......"

میں نے چھو کر دیکھا تو واقعی میری ایک مونچھ رنگین ہو رہی تھی اس پھل کے رس سے جو اب سامنے نہیں تھا۔

اچانک بابا کی آواز میرے کان سے ٹکرائی۔ "پھل کہاں ہیں میرے حصے کے؟"

"تیرے دائیں ہاتھ رکھے ہیں بابا۔ ٹھہر میں دیتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ باہر نکلی اور اسے سنبھالنے لگی۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ وہ دائیں ہاتھ ایک درخت کے تنے کے ساتھ لگے ایک چھپر کو کھینچ رہی تھی۔ ہم دونوں نے مل کر وہ چھپر بابا کی چارپائی کے اوپر اس طرح تان دیا کہ وہ رات کو پچھم سے چلنے والی ہوا اور اوس سے

بچ سکتا تھا۔

"بابا کو اندر کیوں نہیں لے چلتی ہو۔ باہر تو اتنی سردی ہے۔"

"اسے سردی نہیں لگتی۔ ذرا اس کو ہاتھ تو لگا کر دیکھ۔ بابا تجھ سے زیادہ جوان ہے۔" میں نے اس کے کہنے کے مطابق اس کالے بھجنگ بوڑھے کا ہاتھ چھو کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس کی حرارت غریزی جوانوں سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ ہوا سے بچنے کے لئے بابا کے دائیں ہاتھ چارپائی کے ساتھ اس نے ایک چھپر کھڑا کر دیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس لڑکی نے پھلوں کی چنگیر بوڑھے کے سامنے رکھ دی۔ وہ اٹھ کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بڑی رغبت سے پھل کھانے لگا۔

وہ جب فارغ ہو گیا تو اس لڑکی نے چنگیر اٹھائی، چھلکے اکٹھے کر کے دور پھینکے اور بولی۔

"اب سو رہو بابا! کوئی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا۔"

بوڑھے نے کچھ جواب نہ دیا۔ ہم دونوں کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا ہوا وہ لحاف کو اچھی طرح اپنے بدن پر لپیٹ کر لیٹ گیا۔

"اگر بارش آ گئی تو پھر کیا ہوگا؟"

"بارش نہیں آئے گی۔ تو اس کی فکر نہ کر۔" یہ کہہ کر وہ لہراتی ہوئی کمر کو بڑے ہی دلفریب انداز سے لچکاتی ہوئی کوٹھڑی میں جا گھسی۔ اندر اس نے دیا ابھی نہیں جلایا تھا۔ جب میں نے اصرار کیا تو وہ اٹھی اور ایک لکڑی کو باہر بابا کی چارپائی کے پاس دہکتے الاؤ سے جلا کر اندر لے آئی۔ وہ لکڑی خاصی روشنی دے رہی تھی۔ لکڑی کو اس نے جھونپڑی میں رکھی گھڑونچی پر اس طرح پھنسا کر رکھا کہ ہر شے منور ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے جھونپڑی کے دروازے پر چھپر تان دیا اور میرے پاس آ کر لحاف میں گھس کر بیٹھ گئی۔ اس طرح کہ میرے اور اس کے درمیان ذرا سا بھی فاصلہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ میں سرک کر پرے ہٹ گیا ——— پتہ نہیں کیا بات تھی اسے بانہوں میں لے لینے کی آرزو دل میں اٹھتی تو تھی مگر پھر میں عجیب سے خوف میں گھر جاتا تھا۔

"تو مجھے اندھیرے میں دیکھ نہیں سکتا تھا اسی لئے چاہتا تھا کہ میں روشنی کر دوں؟"

"یہ بات نہیں تھی بھاتاں ——— روشنی بہرحال اچھی چیز ہے۔"

"تجھے میں کیسی لگتی ہوں ذلی...... ی...... ی...... لانی؟" اس نے پھر چٹکی لی۔ اس کے لہجے کی شوخی مجھے حیران کرتی تھی۔

"تو...... تو...... بہت اچھی ہے...... بھ بھ...... بھ بھ...... بھاتاں اتنی اچھی کہ میں نے تجھ جیسی خوبصورت لڑکی آج تک نہیں دیکھی۔ تو مجھے انسان معلوم نہیں ہوتی۔"

"تو کیا ہوں پھر میں؟"

"پتہ نہیں تو کیا چیز ہے۔ ہو سکتا ہے تو کوئی جنی ہو جسے اس بابا نے اپنے کسی عمل سے تسخیر کر لیا ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور اس کے رخسار سرخ ہو گئے، آنکھیں چھلل چھلل کرنے لگیں۔

"یہ تو کس طرح کہہ سکتا ہے جیلانی! تجھے میں جنی نظر آتی ہوں؟"

"نہیں! تو ہے تو انسان کی صورت مگر تجھ جیسی حسین میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ تو نے کوئی بناؤ سنگھار نہیں کیا پھر بھی لاکھوں بناؤ سنگھار تجھ پر قربان کئے جا سکتے ہیں۔ تیرے بدن سے جو خوشبو اٹھ رہی ہے وہ نہ صندل میں ہے نہ گلاب میں۔ پتہ نہیں تو کیا چیز ہے؟"

"اچھا؟ تیری زبان بہت تیز چلتی ہے ذیلانی! مگر تو یہ پرے کیوں کھسک رہا ہے۔ ٹھیک سے بیٹھ نا۔ ادھر ہو جا میرے قریب!"

"نہیں! مجھے ادھر نہیں ہونا ہے۔ پہلے تو مجھے یہ بتا کہ تو میرا نام کس طرح جانتی ہے؟"

"تیرا پرنالہ ابھی تک وہیں ہے۔ رفع کر ان باتوں کو یہ تیری سمجھ میں آنے والی نہیں ہیں۔ ادھر ہو جا یہ رات پھر نہیں آئے گی۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھی اور روشنی گل کر دی۔

"کیا کرتی ہے تو؟ پرے ہٹ جا۔ تیرا میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ تو یہاں جو ادلی لگا کر بیٹھی ہے اس سے تو میرے نفس کے ہاتھی کو بے بس نہیں کر سکے گی۔ ناممکن ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے اپنے اوپر سے اچھال کر دوسری طرف گرا دیا ——— وہ لحاف کے اس کنارے پر چپ چاپ پڑی رہی پھر مجھے محسوس ہوا کہ وہ اٹھ گئی ہے ——— باہر اس گھڑی چاند بھی بجھا ہوا تھا اور جھونپڑی میں ایسا گھنا اندھیرا تھا کہ مجھے اپنا وجود اجنبی معلوم ہوتا تھا۔ دو تین منٹ اسی طرح گزر گئے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اتنی شدید سردی کے باوجود مجھے اس لحاف میں گرمی محسوس ہو رہی تھی اور میرے قرون میں ہلچل مچی تھی۔ بدن کی سرحدوں پر شباب کے تمام ریلے جذبہ رستک لیے بہتے تھے اور وہ لڑکی گردان میں رکھی انگیٹھیوں کی طرح سلگ کر سارے ماحول کو مسحور کئے دیتی تھی۔ پھر بھی کچھ ایسی ہی بات تھی کہ میں اس کی طرف بڑھنے سے گریزاں تھا۔ شاید اس کی بے حد و حساب بے تکلفی نے مجھے بدمزہ کر دیا تھا یا میں اس کی میجراتی قوتوں سے خوف زدہ تھا کوئی سبب ایسا ضرور تھا کہ میں نے اب تک خود کو اس سے دور رکھا تھا۔

ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ جھونپڑی روشنی سے لبالب بھر گئی۔ اس نے وہ لکڑی جلا دی تھی اور اب وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ یوں جیسے کسی یونانی مجسمے کو زندگی مل گئی ہو، جیسے کسی شاعر کا تخیل حقیقت کا روپ اختیار کر گیا ہو۔

"ہے...... ذیلانی...... دیکھ تو کیسی لگتی ہوں، ذرا دیکھ تو سہی۔"

پتہ نہیں اتنا صبر، اتنا حوصلہ، اتنی جرأت اس گھڑی میرے دل میں کیسے پیدا ہو گئی۔ میں نے پہلو میں رکھا اپنا "چپ شاہ" اٹھایا اور اس کی پسلی پر ہاتھ رکھ کر نالی کا رخ اس کے سینے کی طرف پھیر دیا۔ میرا

نظروں سے دُور ہو جا قدسیہ! ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔"

"نہیں! نہیں! تم ادھر دیکھو اور بتاؤ میں کیسی لگتی ہوں؟"

اب کی بار اس کی آواز میں بے پناہ ملائمت ابھر آئی۔ میں نے اپنے طیش پر اس سمے قابو پا لیا تھا مگر اس کی بات سنتے ہی میں غصے میں پھنکنے لگا اور میں نے شست باندھ کر گولی چلا دی۔

اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور پاگلوں کی طرح بھاگتی باہر نکل گئی۔ میں تیزی سے اس کے پیچھے لپکا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ جھونپڑی کے باہر اُگی ہوئی گھنی جھاڑیوں میں غائب ہو چکی تھی۔ میں کتنی ہی دیر تک اسے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا مگر اس کا مجھے کہیں بھی کوئی نشان نہ ملا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ سردی کے مارے سخت پریشان ہو رہی ہو گی۔ اس لیے میں اسے جلدی واپس لانا چاہتا تھا۔ میں کوئی ایک گھنٹے تک اِدھر اُدھر سرگرداں پھرتا رہا۔ مگر جب وہ مجھے کہیں بھی نظر نہ آئی تو میں بوجھل بوجھل قدموں سے ایک بار پھر جھونپڑی کے اندر جا گھسا۔

میں نے لحاف سیدھا کیا اور اسے اوڑھ کر پیال پر لیٹ گیا مجھے یقین تھا کہ وہ جلد یا بدیر واپس آ ہی جائے گی۔ افسوس مجھے یہ ہو رہا تھا کہ اگر وہ زخمی ہو چکی ہے تو اب تک ڈھیروں خون اس کے جسم سے نکل چکا ہو گا۔ اس کی وہ دلدوز چیخ تو ایسی ہی صورت حال کا پتہ دیتی تھی۔ مگر اس کو وہاں تلاش کر لینا میرے بس میں نہیں رہا تھا۔ میں نے بہت دیدہ ریزی کر لی تھی۔

لحاف قدسیہ کے بدن کی خوشبو سے معطر ہو رہا تھا اور میں اس سوچ میں گم تھا کہ اس بابا اور اس قدسیہ کے بارے میں حقائق کس طرح معلوم کر سکوں گا۔ وہ دونوں ہی مجھے بے حد پُراسرار معلوم ہوتے تھے مگر یہ بات مجھے قرینِ قیاس نظر نہیں آتی تھی کہ وہ دونوں کوئی ماورائی مخلوق ہیں، ایسی مخلوق جو غیب کی باتیں جان لینے کی طاقت رکھتی ہے ایسی کراماتوں پر مجھے کبھی بھی کوئی یقین نہیں رہا۔ اس توہم پرستی کی دلدل سے میں زندگی بھر دور رہا ہوں۔ مجھے ہر جگہ احسن التقویم کا ارشادِ ربانی کارفرما نظر آیا۔ میں نے کہیں یہ نہ دیکھا کہ دو اور دو مل کر چار نہیں بلکہ تین پر منتج ہوئے۔ میں نے کسی تیز دھار آلے کو زخم لگانے سے باز رہتے نہیں دیکھا۔ دھوپ نے ہر جگہ تمازت بکھیری ہے اور پانی کو میں نے ہر حالت میں زمین کی سیرابی اور بار آوری کا سبب بنتے دیکھا ہے۔ میں کیسے مان لیتا کہ اس بوڑھے میں کوئی مافوق الفطرت قوتیں موجود ہیں۔ پھر بھی اس قدسیہ کی باتیں مجھے حیران کرتی تھیں وہ میرا نام جانتی تھی اور میرے بارے میں شاید اسے اور بھی بہت کچھ معلوم تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھ سے اس حد تک بے تکلف ہرگز نہ ہوتی۔

رات خاصی گہری ہو چکی تھی مگر نیند مجھ سے ابھی تک کوسوں دُور تھی مجھے قدسیہ کا انتظار تھا جو چھلاوے کی طرح میری نظروں سے غائب ہو چکی تھی۔ اس کا وہ ملکوتی حسن مجھے متاثر کرتا تھا مگر وہ جنسی جذبے بیدار نہیں کرتا تھا بلکہ دل میں کچھ ایسی کیفیت پیدا کرتا تھا کہ دل آپ ہی آپ الوہیت کی منزلیں طے کرنے کی آرزو کرنے لگتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ واپس آ جائے اور آ کر مجھ سے پہلی ایسی بے تکلفی سے باتیں کرے۔ میری حیرت کو فزوں تر کرتی چلی جائے اور اپنی ہنستی مسکراتی آنکھوں کے خیرہ کُن چاند سے میرے دل کے خانۂ محزوں کو منور کرے مگر وہ آ ہی نہیں رہی تھی۔

اچانک باہر سے بوڑھے کی آواز ابھری۔

"پانی! مجھے پانی پلا دے ــــ پانی۔" میں جلتی لکڑی اٹھا کر بھاگتا ہوا باہر نکلا تو دیکھا کہ بوڑھا پیاس کی شدت سے نڈھال ہو رہا ہے ــــ میں پانی لینے کے لئے جھونپڑی میں گھسا تو دیکھا گھڑا بالکل خالی تھا۔ اس میں پانی کی ایک بوند باقی نہیں تھی حالانکہ شام سے پہلے اس میں پانی موجود تھا۔ میں گھبرا کر باہر نکلا تو دیکھا بوڑھا پیاس سے اور زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ مجھے بھی شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ یا تو یہ سب ان چیلوں کا کرشمہ تھا یا اس تشنگی پر اس صحرا کی برکت تھی جس میں سے قدسیہ نے مجھے گزارا تھا میرے اپنے لب خشک ہو رہے تھے۔

"میں پانی لے کر آتا ہوں بابا! تم ذرا صبر کرو۔" یہ کہہ کر میں نے گھڑونچی پر سے گھڑا اٹھایا اور سیدھے ہاتھ میں پستول پکڑ کر باہر نکل گیا۔ اسٹین گن میں نے بھر کر کندھے پر لٹکا لی تھی۔

اب سوال یہ تھا کہ میں پانی کہاں سے حاصل کروں۔ دریا وہاں سے مغرب کی سمت میں تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہاں تک آنے جانے میں مجھے کتنی دیر لگ جائے۔ اس جنگل میں دن کو بھی رات کا سماں نظر آتا تھا اور وہ تو وقت ہی رات کا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ میں نے روشنی کے لئے وہ لکڑی ہاتھ میں لے لی جسے قدسیہ جلا گئی تھی۔

"پانی کہاں سے مل سکے گا بابا جی؟"

"پتہ نہیں! شاید دریا سے مل جائے۔ کسی سے مانگ لاؤ، وہ زندگی کی ضرورت ہے۔" وہ بڑے نحیف و نزار لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے میں ابھی لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں دریا کی طرف چل نکلا۔ راستہ اتنا مہیب تھا کہ میرا دل دہل رہا تھا پھر بھی اس بوڑھے کے لئے میں ان خطرات سے لبریز جنگل کے اندر ہی اندر چلتا ہوا مختلف پگڈنڈیوں پر سے گزرتا بڑی مشکلوں سے دریا تک پہنچا اور گھڑا بھر کر انہی قدموں واپس ہو لیا۔

ابھی میں جنگل میں کچھ قریب ہی چلا ہوں گا کہ اچانک مجھے چاروں طرف سے بھیانک آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مجھے گیدڑوں نے تنہا پا کر گھیر لیا تھا۔ وہ لحظہ بہ لحظہ میرے گرد اپنا حلقہ تنگ کرتے

جا رہے تھے۔ ان سے بچنے کے لئے میں بھاگ کر ایک درخت کے موٹے تنے کی طرف لپکا تو اچانک میرا پاؤں کسی خشکی جڑ میں پھنسا اور میں منہ کے بل زمین پر گر گیا۔ میری ساری توجہ گھڑے پر تھی کہ وہ گر کر ٹوٹ نہ جائے اسے میں نے گرنے تو نہ دیا مگر جب میں خود منہ کے بل نیچے جا رہا تو اس میں سے سارا پانی زمین پر بہہ گیا۔ گھڑا خالی ہو چکا تھا اور وہ گیدڑ جن کی تعداد دس سے کسی طرح بھی کم نہ تھی مجھ پر پل پڑے تھے میں نے تیزی سے اسٹین گن سیدھی کی اور ان پر اندھا دھند گولی چلا دی جلتی ہوئی لکڑی زمین پر پڑی تھی۔ اس کی روشنی میں میں نے کئی.... گیدڑوں کو بھیانک انداز سے چیختے ہوئے زمین پر گرتے دیکھا۔ گولیوں کی آواز سے باقی گیدڑ خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلے اپنے پیچھے وہ چھ سات مُردہ چھوڑ گئے تھے۔ میں نے لکڑی کی روشنی میں ان کو اوندھا سیدھا پڑے دیکھا اور پھر گھڑا اٹھا کر دریا کی طرف چل دیا۔ ایک بار پھر مجھے لمبا راستہ طے کر کے دریا سے پانی بھر کر واپس آنا پڑا مگر وہ ایسی مشقت تھی کہ میرا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ سردی کا تو مجھے قطعاً کوئی احساس نہیں تھا لیکن اس فاصلے نے مجھے نڈھال کر دیا۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد جب میں بابا کے پاس پہنچا تو پیاس کے مارے اس کا حال اور بھی ابتر ہو چکا تھا۔ میں نے اس کے سامنے گھڑا رکھا تو اس نے ایک توانا و تندرست آدمی کی طرح وہ گھڑا اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ اس نے پیالے کا بھی انتظار نہ کیا۔ جب وہ سیر ہو کر پانی پی چکا تو گھڑا اس نے میری طرف بڑھا دیا ــــ معلوم یہ ہوا کہ وہ ظالم آدھا گھڑا پی گیا تھا۔

"اتنی پیاس لگی تھی آپ کو بابا؟"

"یہ جنم جنم کی پیاس ہے جوان! کبھی کبھی بہت بھڑک اٹھتی ہے تیرے پاس سگرٹ ہے کوئی؟"

میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو وہ بولا۔

"مجھے سلگا کر دے۔ اس تیلی سے میں بہت ڈرتا ہوں میرے بال جلا دیتی ہے۔" اس کا لہجہ بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ جب وہ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا تو اس گھڑی میرے دل میں یہ وسوسے اٹھ رہے تھے کہ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ میں نے اس کی لڑکی کو قتل کر دیا ہے تو وہ پتہ نہیں میرے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اس لڑکی میں اتنی معجزانہ قوتیں موجود تھیں تو اس کے باپ کے پاس کیا کچھ نہ ہو گا۔ میرا دل بُری طرح لرزنے لگا تھا۔

جب وہ آدھا سگریٹ پانچ چھ کش میں پی چکا تو بولا۔

"تجھے بڑی تکلیف اٹھانی پڑی پانی لانے کے لئے۔ راستے میں تجھے شینہہ سپ ملے ہوں گے۔ اُدھر گیدڑ بھی بہت ہیں۔"

"ہاں بابا! اُدھر راستہ بڑا خطرناک ہے۔ گیدڑوں سے ملاقات ہو گئی تھی۔"

"میں نے تیری گولیوں کی آواز سنی تھی۔ اِدھر آ ذرا میری ٹانگیں تو داب دے۔ بڑا درد اٹھ رہا ہے ان لکڑیوں میں۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میں اس کی چارپائی کی پائنتی جا چڑھا اور لحاف میں ہاتھ ڈال کر اس کی ٹانگیں ٹٹولنے لگا۔

میں بڑی دیر تک بابا کی پائنتی بیٹھا اس کی ٹانگیں دباتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ایک بار پھر گہری نیند میں کھو گیا۔ جب اس کے خراٹوں کی آواز میں تواتر پیدا ہو گیا تو میں بڑی احتیاط سے اس کی چارپائی پر سے اترا اور اس کے بدن پر لحاف درست کر کے جھونپڑی میں جا گھسا۔ وہ جلتی ہوئی لکڑی میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کی روشنی جب جھونپڑی میں پھیلی تو یہ دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا کہ قدسیہ ابھی تک واپس نہیں آئی تھی میں نے اپنی آنکھیں مَل مَل کر چاروں طرف دیکھا وہاں سب کچھ اسی طرح پڑا تھا مگر قدسیہ وہاں سے جا چکی تھی۔

میں نے ذرا غور سے جھونپڑی کے کچے فرش پر جھک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں کسی درندے کے قدموں کے نشان موجود ہیں۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ درندہ وہاں سے کوئی شے گھسیٹ کر باہر لے گیا ہے۔ جھونپڑی کی ایک دیوار میں خاصا بڑا سوراخ نظر آ رہا تھا۔ وہ اتنا چوڑا تھا کہ اس میں سے ایک چیتا آسانی سے گزر سکتا تھا اور اس سوراخ میں سے پچھم کی طرف سے چلنے والی ہوا سسکیاں بھرتی اندر آ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قدسیہ وہاں آ کر لیٹی تھی مگر کسی درندے نے اندر منہ ڈال کر باہر گھسیٹ لیا تھا۔ میرے لئے وہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ میں کتنی ہی دیر تک وہاں سُن ہو کر کھڑا رہا۔

اور پھر میں دیوانگی کے عالم میں اس سوراخ میں سے گزر کر دوسری طرف نکل گیا۔ اسٹین گن میرے سیدھے ہاتھ میں تھی اور اس کی لبلبی پر میرا دباؤ دم بدم گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ وہ درندہ اندر آیا۔ قدسیہ کی لاش گھسیٹ کر لے بھی گیا مگر اس بابا کو خبر تک نہ ہو سکی۔ یہ کیسا بابا ہے، کیسا فقیر ہے یہ؟ اس کی روشن ضمیری کا تو میں قائل ہوتا جا رہا تھا وہ اسی کے دم قدم کی برکت تھی، اسی کی کرامت تھی کہ قدسیہ کو ان دیکھی ان جانی باتیں معلوم ہو جاتی تھیں ــــ مگر یہ کیسا اندھیر تھا کہ وہ اس درندے کے بارے میں کچھ نہ جان سکا جو اس کی متاعِ عزیز کو جھونپڑی میں سے گھسیٹ کر لے گیا تھا اور جسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا تھا کہ جس آدمی سے وہ پانی مانگ رہا ہے وہ اس کی لڑکی کو زخمی کر چکا ہے۔

میں نے بائیں ہاتھ میں قدسیہ کی جلائی ہوئی شمع پکڑ رکھی تھی۔ اس روشنی کے لپکتے شعلوں میں اس کے بدن کی طرف لپکتی گولی بھی دیکھی تھی جو میرے "چپ شاہ" سے نکلی تھی۔ اب وہ روشنی اس درندے کے پرخچے اڑتے دیکھے گی جو قدسیہ کی بے حرمتی کا مرتکب ہوا تھا۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس درندے کے

پاؤں کے نشانات زمین پر دکھائی دیتے تھے۔ نشان بہت واضح اور صاف تھے۔ میں کوئی سو قدم تک ان نشانات کے پیچھے پیچھے چلتا رہا مگر آگے نکل کر وہ کھوج گھاس پر پہنچ کر معدوم ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے آگے نکل کر پھر ننگی زمین پر چلنا شروع کر دیا مگر اب مجھے کوئی بھی نشان نظر نہیں آتا تھا۔ میں سمجھا وہ درندہ یہیں کہیں چھپا بیٹھا ہو گا۔ یہ سوچ کر میں پیچھے مڑا اور اس جلتی لکڑی کی روشنی میں میں نے ایک ایک جھاڑی دیکھی مگر کسی بھی سمت میں مجھے نہ قدسیہ نظر آئی اور نہ وہ درندہ۔ کوئی ڈھائی گھنٹے تک میں پاگلوں کی طرح اس جنگل میں پھرتا رہا مگر مجھے کچھ بھی نہ مل سکا اور پھر میں ہر طرف سے مایوس ہو کر واپس آ گیا۔

بابا گھری نیند میں تھا اور اس کے خراٹے بڑے تسلسل سے جاری تھے۔ میں دبے پاؤں چلتا ہوا جھونپڑی میں داخل ہوا اور جلتی لکڑی کو پھر گھر چونجی کے ایک سوراخ میں پھنسا کر لحاف میں جا لیٹا۔ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ جھونپڑی کا ماحول مجھے آسیب زدہ سا نظر آتا تھا۔ میں ٹھہر ٹھہر کر بدک جاتا تھا۔ طرح طرح کے خیالات میرے ذہن کو پریشان کر رہے تھے۔ اس عالم میں میں نے کئی سگریٹ پھونک ڈالے مگر نیند مجھ سے پھر بھی روٹھی رہی۔

جب میں بہت زیادہ نڈھال ہو گیا تو میں نے کوٹ اتار کر الگ ڈال دیا اور اپنے زخمی بازو کو سہلانے لگا مگر یہ دیکھ کر میں دیوانہ سا ہو گیا کہ میرا زخم پوری طرح مندمل ہو چکا تھا۔ درد کا ذرا سا بھی احساس باقی نہ تھا۔ میں نے جرسی اور قمیص اتار کر اپنا زخم غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اب زخم پر ہلکا سا کھرنڈ باقی رہ گیا تھا۔ قدسیہ نے مسیحائی دکھائی تھی۔ اس نے مجھے رات ہی رات میں صحت یاب کر دیا تھا مگر کوئی میری کج فہمی دیکھیے کہ میں نے...... میں نے...... اس کے بے مثال بدن کی صورت میں قدرت کی بے مثال صناعی کی داد دینے کے بجائے اس پر گولی چلا دی تھی۔ محض اس لیے کہ وہ میری آرزو میں مری جاتی تھی اور صرف یہ چاہتی تھی میں اس سے محبت کروں۔ اس کی والہانہ خود سپردگی کو لبیک کہوں مگر میں نے اپنی بزدلی کے تارِ عنکبوت میں پھنس کر اس کو مجرم گردانا اور اس کے جذبوں بھرے نازک سے بدن پر گولی داغ دی۔ میرے سفلے پن کی تو کوئی انتہا ہی باقی نہ رہی تھی۔ میں اسے محبت نہ دے سکا۔ اس سے نفرت بھی نہ کر سکا۔ اور اسے کچھ دینے کے بجائے اس کی بے حد و حساب خاطر و مدارات کے عوض اس کی کوئی خدمت کرنے کے بجائے میں نے اس کی زندگی کے سارے لعل و گہر فنا کر دیئے تھے۔ پچھتاوے کے زہریلے ناگ مجھے ڈس رہے تھے مگر اب میرے بس میں تو کچھ بھی نہیں رہ گیا۔ اب میں کیا کر سکتا تھا میں نے چاہا کہ میں اسی "چپ شاہ" پستول کی گولی اپنی کنپٹی میں اتار کر اپنے اس گناہ کا کفارہ ادا کروں۔ مایوسی کے اتھاہ گرداب میں پھنس کر پستول میں نے نکال بھی لیا۔ میں بلاشبہ اپنے ہی جسم پر وار کرنے پر تیار ہو چکا تھا کہ اچانک مجھے اس بوڑھے کی آواز سنائی دی۔

"پانی!"

اسے پھر پیاس نے نڈھال کر دیا تھا۔ میں نے پستول جیب میں ڈالا اور تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس جا پہنچا۔ وہ لحاف کو اپنے گرد لپیٹ کر چارپائی پر سیدھا ہو کر بیٹھا تھا۔ میں نے اب کی بار گھڑے سے پیالہ بھر کر اسے دیا تو وہ مسکرایا، بولا۔

"یہ تو اندر کیا کر رہا تھا جگلے؟"

"میں...... میں...... کچھ بھی نہیں بابا جی کچھ بھی نہیں" میں ہکلایا۔

"تو شاید خودکشی کرنا چاہتا تھا" بابا نے سچی بات کہہ دی۔

"میں...... میں بہت دکھی ہوں بابا جی! میں نے...... میں نے اس لڑکی پر گولی چلا دی تھی جس نے مجھے بچایا ہے"

"قدسیہ پر؟"

"ہاں...... وہ شاید مر چکی ہے مگر مجھے کہیں نظر نہیں آتی۔ میں بہت شرمندہ ہوں بابا جی!"

"وہ مری نہیں ہے مگر تو نے بہت جلد بازی سے کام لیا تھا...... جیلانی...... وہ لڑکی میری بیٹی ہے ــــ وہ تجھے پسند کرنے لگی تھی مگر تو نے اسے اچھا سبق دیا ہے"

"وہ...... وہ آپ کی بیٹی ہے"

"ہاں! وہ ایسی نہیں ہے جیسی تو سمجھتا ہے مگر آج وہ بہک گئی تھی۔ ایکدم پاگل ہو گئی تھی وہ ــــ اب وہ کبھی تیرے سامنے نہیں آئے گی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی ہے"

"سلائی پھیر دی ہے! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وہ تیری گولی سے زخمی نہیں ہوئی تھی میں یہاں بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا۔ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ باہر نکلی تو سیدھی میری چارپائی کے نیچے آ کر چھپ گئی ــــ مگر میں اس کی اس آوارگی سے پریشان ہو گیا تھا۔ تو جب پانی لینے گیا تو میں نے اس کی آنکھوں میں ایک جنگلی بوٹی کے دو دو قطرے ٹپکا دیئے۔ جس سے اس کی نظر بہت دنوں تک بند رہے گی۔ اس کا علاج مجھے معلوم ہے۔ ایک اور بوٹی بھی میرے علم میں ہے جس کا پانی اس کی آنکھ میں ڈالوں گا تو اس کی نظر لوٹ آئے گی جو دوا میں نے اس کی آنکھ میں ڈالی ہے وہ پتلیوں پر جم جاتی ہے۔ اسے میں پگھلا دوں گا تو وہ پھر سے دیکھنے لگے گی"

"یہ کیا کر دیا ہے بابا جی آپ نے؟ اسے اتنی بڑی سزا نہیں ملنی چاہئے تھی"

"اور اگر اسے تیری گولی لگ جاتی تو......؟"

"وہ میری غلطی تھی بابا جی! میرا پاگل پن تھا وہ، اس پر میں بہت پچھتا رہا ہوں"

"جو کچھ ہوا بالکل ٹھیک ہوا ــــ"

"اب کہاں ہے وہ؟"

"اسے میں نے ترمیوں کے ساتھ گاؤں بھیج دیا ہے"

"ترمیوں! یہ ترمیوں کون ہے بابا جی؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ اس نام کے ایک ایسے آدمی سے واقف تھا جو میرے ساتھ ہی پھانسی کی ایک کوٹھڑی میں بند تھا۔ اس پر چار آدمیوں کے قتل کا جرم ثابت کیا گیا تھا اور اسے بھی میرے ساتھ ہی پھانسی کی سزا

کا حکم ہو چکا تھا اور وہ بھی اسی روز میرے ساتھ ہی وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کا نام بھی اخباروں میں چھپتا رہتا تھا۔

"تو نہیں جانتا اسے؟"

"میں اسے کیسے جان سکتا ہوں بابا؟"

"تو اسے جانتا ہے بچے! وہ تیرے ساتھ والی پھانسی کی کوٹھڑی میں بند تھا اور تیرے ساتھ ہی جیل سے بھاگا تھا۔"

"اچھا! تو آپ اس تریموں کا ذکر کر رہے ہیں مگر آپ اسے کیسے جانتے ہیں ہم بھی تریموں خاکی کو؟" "مجھے معلوم تھا کہ وہ جیل میں تریموں خاکی کہلاتا تھا۔ پنجابی میں شعر کہتا تھا اور خاکی تخلص کرتا تھا۔ بہت اچھا آدمی تھا وہ۔"

"وہ میرا منہ بولا بیٹا بنا ہوا ہے۔ وہ جہلم کا رہنے والا ہے اور جب سے بھاگ کر آیا ہے اسی جنگل میں رہ رہا ہے۔ بلادر میں اس کا ایک بھائی رہتا ہے۔"

"اچھا! آپ نے تو مجھے حیران کر دیا ہے باباجی، مگر یہ بتائیں آپ کو میرے نام کا علم کس طرح ہوا؟ قدسیہ کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے۔"

"ہمیں تریموں نے ہی سب کچھ بتایا ہے۔ جب تو نے بلادر میں ہادی علی کو مارا تو اس وقت وہ وہیں تھا۔ پولیس جب تیرے پیچھے بھاگی تو وہ بلادر سے نکل کر سیدھا ادھر آ گیا۔ اس نے تیرے بارے میں ہمیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اسی لئے جب تو ادھر آیا تو میں نے تجھے پہچان لیا تھا۔ تیرے رخسار کے اس کالے نشان کا اس نے مجھ سے ذکر کر دیا تھا۔"

"تو یہ بات ہے میں سمجھا کہ آپ کو شاید غیب سے یہ ساری باتیں معلوم ہو جاتی ہیں؟"

"ارے نہیں جیلانی بیٹے! ابھی میں ان منزلوں سے بہت دور ہوں۔ ہاں، اللہ نے مجھ پر اپنی بڑی رحمتیں نازل کر رکھی ہیں۔ مجھے جڑی بوٹیوں کا علم دے دیا ہے۔ میرے ہاتھ میں اس نے شفا بھر رکھی ہے۔"

"یہ کرامت تو میں دیکھ چکا ہوں۔ میرا زخم اچھا ہو چکا ہے مگر... باباجی! آپ یہ بتائیں کہ آپ نے یہاں جنگل میں کیوں ڈیرہ ڈال رکھا ہے؟ اور اپنی بیٹی کو بھی ادھر ہی باندھ رکھا ہے آپ نے؟"

"یہ بہت لمبی بات ہے بیٹے! ہم تجھ سے بہت خوش ہیں کہ تو نے ہادی علی جیسے ذلیل آدمی کے وجود سے یہ علاقہ پاک کر دیا ہے۔ ایک خلقت نالاں تھی اس سے۔ کوئی اور ہوتا تو ہم اس کے سامنے اپنی زبان نہ کھولتے مگر تم ہمیں اچھے لگتے ہو۔ خاکی نے آج تمہارے بارے میں ہمیں بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر تم ادھر آ نکلے تو ہم تمہارے لئے وہ سب کچھ کر دیں گے جو ہم کر سکتے ہیں۔"

"یہ آپ کی بڑی مہربانی ہے باباجی! ورنہ میں کس قابل ہوں؟ آپ کے ہاتھ میں اللہ نے واقعی بڑی شفا رکھی ہے اور آپ کو دیکھ کر میرا دل پرسکون ہو جاتا ہے۔ ورنہ تو خدا ہی جانتا ہے میں ذلت کی کن گہرائیوں میں گر چکا ہوں۔ اپنے آپ سے شرمندہ رہتا ہوں۔"

"ہاں! آدمی کو ہمیشہ اپنے عمل پر نگاہ رکھنی چاہئے مگر میں سمجھتا ہوں بیٹے کہ ہیرا اگر کیچڑ میں گر جائے تو بھی ہیرا ہی رہتا ہے۔ تیرے راستے تو ہم نہیں بدل سکتے مگر ہم اتنی امید ضرور رکھتے ہیں کہ تو کبھی کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔"

"میں ظلم کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتا ہوں باباجی! میں تو خود تباہ حال آدمی ہوں۔ میں اندر سے اتنا دکھی ہوں باباجی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"تمہارے دکھ کا ہمیں اندازہ ہے جیلانی بیٹے! خدا کرے تمہاری یہ مصیبتیں جلدی ختم ہو جائیں۔ تریموں نے تمہاری ساری کہانی ہمیں سنا دی تھی مگر ہمیں نہیں معلوم کہ ہادی علی کو تم نے کیوں مارا ہے؟"

"بس مجھے طیش آ گیا تھا باباجی! وہ اپنے مزارعوں پر ظلم کرتا تھا۔ میرے سامنے اس نے دو آدمی مار دیئے تھے۔ اس پر میں چپ نہ رہ سکا مگر آپ نے بتایا نہیں باباجی کہ آپ نے دنیا سے منہ کیوں موڑ لیا ہے؟"

"میں بہت بدنصیب آدمی ہوں جیلانی بیٹے۔ اور اب اس منزل کی تلاش میں ہوں جہاں پہنچ کر بندے اور خدا کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہیں رہتا۔ میں اس راستے پر عرفان کی منزلوں میں سے گزر کر نہیں چڑھا ہوں۔ میں نے بہت دکھ جھیلے ہیں۔ میں ادھر پنڈی بھٹیاں میں رہا کرتا تھا۔ سرکاری ہسپتال میں کمپاؤنڈر کا کام کرتا تھا میں۔ عمر میری تیس سال ہو چکی تھی مگر میری شکل و صورت تو جیسی ہے تم دیکھ ہی رہے ہو۔ رنگ بھی میرا توے ایسا سیاہ ہے۔ میں شادی کو ترستا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنا گھر بساؤں مگر کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا ——— اور زندگی میری ویران ہوتی جاتی تھی۔ میں یتیم خانے میں پلا ہوا آدمی ہوں اور مجھے نہیں پتہ کہ میرے والدین کون تھے اور کیا کرتے تھے۔ بس جب میں نے یتیم خانے کے سکول سے دسویں کر لی تو انہوں نے مجھے آزاد کر دیا۔ میں نے کمپاؤنڈری کا امتحان پاس کیا اور ہسپتال میں نوکری کر لی۔ پنڈی بھٹیاں میں جب میں آیا تو اس وقت مجھے نوکری کرتے ہوئے آٹھ سال ہو چکے تھے اس ہسپتال میں ان دنوں لیڈی ڈاکٹر کوئی نہیں تھی۔

ہسپتال میں ایک دن دس بجے کے قریب ایک ادھیڑ عمر کی عورت آئی۔ اس کے پیٹ میں شدید درد تھا۔ ڈاکٹر اس روز چھٹی پر تھا اور میں ہی اس کی کرسی پر بیٹھا مریضوں سے نپٹ رہا تھا ——— جب وہ عورت میرے کمرے میں آئی تو اس نے اپنا پیٹ دبا رکھا تھا وہ درد کی شدت سے نڈھال ہوئی جاتی تھی۔ میں نے اسے بیڈ پر لٹا کر اس کا معائنہ کرنا چاہا تو وہ ہچکچائی ——— وہ عجیب خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھ

رہی تھی۔

"نہیں کیا تکلیف ہے بی بی!" میں نے سیتھو سکوپ کانوں میں لگایا۔ میرے سوال پر وہ جھینپ گئی بولی۔ "مجھے کوئی زنانہ تکلیف ہے۔ کوئی لیڈی ڈاکٹر ہوتی تو اچھا تھا۔"

"وہ تو ادھر کوئی نہیں ہے مگر تمہیں دوا کی ضرورت ہوئی تو ہم دے دیں گے۔"

وہ گندمی رنگ کی چاق و چوبند صحت مند عورت تھی اور اس کی عمر بھی کوئی پینتیس چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی مگر ابھی تک اس کے وجود میں چمک دمک باقی تھی۔ اس کا نام مہر جان تھا اور وہ چک عزیز نامی گاؤں سے آئی تھی۔

"دوا کی نہیں مجھے اندرونی علاج کی ضرورت ہے۔ کوئی ڈاکٹرنی نہیں ہے یہاں؟"

"وہ تو یہاں کوئی نہیں ہے مگر تمہیں ہوا کیا ہے؟ اچھی بھلی تو نظر آتی ہو۔ کیا تکلیف ہے تمہیں؟"

"یہ تم دیدے پھاڑ پھاڑ کر مجھے کیا دیکھ رہے ہو۔"

"او اب سمجھا! مگر یہ مصیبت تم نے کیوں اپنے گلے میں ڈال لی ہے؟"

وہ تمتما اٹھی، بولی ———

"تم زیادہ باتیں نہ بناؤ ——— دوا دے سکتے ہو تو دے دو۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ خاصی عشوہ طراز قسم کی عورت ہے۔ اپنے حربے استعمال کرنے کا فن خوب جانتی تھی۔ وہ لاچا باندھے ہوئے تھی۔ سیلٹی رنگ کا ریشمی لاچا ——— وہ اس علاقے کا مخصوص لباس ہے جس کی خوبی یہ ہے کہ وہ بدن کے بھید چھپاتا بھی ہے اور ظاہر بھی کرتا رہتا ہے۔ مجھے اس عورت میں عجیب سی دلکشی محسوس ہو رہی تھی.... اس کی گفتگو کا انداز ایسا تھا جو میرا حوصلہ بڑھاتا تھا اور میرا یہ حال تھا کہ میں عورت کے لمس کا بھوکا تھا لیکن اس راہ پر میں کبھی ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ اس کی وجہ وہ کمتری کا احساس تھا جو میرے دل و دماغ کو ہر وقت گرفت میں لئے رہتا تھا۔ مجھے اپنے اوپر اعتماد ہی نہیں تھا ——— پھر بھی میں نے ہمت کر کے اس سے کہا۔

"ٹھیک ہے مہر جان ہم تمہارا علاج کریں گے مگر تمہیں ہمارے کوارٹر میں رہنا ہوگا۔"

میرا تیر نشانے پر لگا۔ اس نے برا نہیں منایا۔ بولی۔ "کہاں ہے تمہارا کوارٹر؟"

"ادھر قریب ہی ہے۔ تم ابھی چلو میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں... ادھر بیٹھ کر ہم تمہارا علاج نہیں کر سکتے۔ لوگ شک کریں گے۔"

مہر جان میری باتوں کا مطلب سمجھ گئی۔ تھوڑی سی رد و کد کے بعد وہ مان گئی۔ اسے میں نے اپنے کوارٹر میں چار دن رکھا۔ اس عرصے میں اس کی تکلیف بھی دور ہو گئی اور میری بھی۔

معلوم یہ ہوا کہ وہ بیوہ عورت ہے اور وہ سلسلہ اس نے یونہی شغل ہی شغل میں گاؤں کے کسی آدمی سے قائم کر لیا تھا جس کے نتیجے میں وہ اس مصیبت میں پھنس گئی۔ وہ مجھ سے اتنی خوش ہو گئی کہ میرے کوارٹر سے جانے کا نام ہی نہ لیتی تھی جب میں نے اسے سمجھایا کہ اگر وہ زیادہ دن یہاں رہی تو میری بدنامی کا موجب بن جائے گی تو وہ بولی۔

"دیکھ کالے خان! میں چاہتی ہوں کہ تیری میری یہ دوستی قائم رہے پکی طرح چلتی رہے۔"

"مگر وہ کس طرح! میں آج نہیں تو کل یہاں سے تبدیل ہو کر کسی اور شہر میں جا ٹھہروں گا۔"

"اچھا دیکھ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی پارو کی شادی تجھ سے کر دوں؟"

وہ مجھے بتا چکی تھی کہ اس کی ایک جوان نشیلی لڑکی بھی ہے جس کی عمر پندرہ سال ہے۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میرا گھر بھی بس جائے گا اور ہمارا یہ معاملہ بھی چلتا رہے گا۔"

"بڑا ڈھیٹ ہے تو کالے خان، تجھے شرم نہیں آئے گی۔"

"شرم کی ضرورت ہوئی تو وہ بھی کر لیں گے تم بات پکی کرو۔"

"تو ٹھیک ہے سمجھ تمہارا رشتہ منظور ہے۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا ———

"تم سن رہے ہو نا جیلانی؟"

"جی باباجی سن رہا ہوں۔"

"تو ہوا یہ جیلانی میاں! کہ اس بدمعاش عورت نے ایک ماہ بعد اپنی نشیلی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دی۔ اور میں اس کی پارو کو بیاہ کر اپنے کوارٹر میں لے آیا اسے میں نے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ لڑکی نہیں چاند کا ٹکڑا تھی جو کوئی بھی اسے دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ میری تو زندگی ہی بدل کر رہ گئی ——— اس کی ماں بھی بے حد حسین ہوگی۔

خدا کو شاید پارو سے میرے رشتے کی حرمت عزیز تھی.... مہر جان ہماری شادی کے ایک ہی مہینے بعد مر گئی ——— میں نے پنڈی بھٹیاں میں شادی کے بعد آٹھ سال بڑے اطمینان سے گزارے اس کے بعد میرا تبادلہ ہو گیا اور میں کنجاہ کے ہسپتال میں آ لگا۔ میری بدنصیبی کا آغاز اسی شہر سے ہوا۔ اس وقت مجھے کنجاہ میں کام کرتے ایک سال ہو چکا تھا۔ میری اس بچی کی عمر اس وقت آٹھ سال تھی... تین بچے اور بھی ہو چکے تھے بچہ اس وقت ڈیڑھ سال کا تھا اور وہ سب سے چھوٹا تھا۔ ان سے بڑا شاہد تھا اس کی عمر چار سال تھی اور

جو اس قدسیہ سے چھوٹا تھا اس کی عمر چھ سال تھی۔ میں نے اس کا نام کاظم رکھا تھا۔

پارو کے ساتھ میری زندگی بڑے آرام سے گزر رہی تھی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ میں ایک مریض کو ٹیکہ لگانے کے لئے دن کے دس بجے ہسپتال سے نکل کر اندرون شہر کی عمارت کی پچھلی آبادی میں گیا تو میں نے ایک مکان کے سامنے ایک کار کو رکتے دیکھا جس کا دروازہ کھلا تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کار میں سے پارو نکل رہی تھی۔ ڈیڑھ سال کا بچہ اس نے کندھے سے لگا رکھا تھا۔ وہ کار میں سے نکل کر مکان کے اندر جا گھسی اس کے پیچھے پیچھے کار میں سے ایک لمبا تڑنگا خوبصورت جوان نکلا۔ اس نے کار کو چابی لگائی اور اپنی سیاہ اچکن کے بٹن بند کرتا ہوا اسی دروازے میں داخل ہو گیا جس میں سے گزر کر پارو پہلے اندر جا چکی تھی۔

میرے لئے یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع اور اتنا حیرت انگیز تھا کہ میں سُن ہو کر رہ گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ پارو جس کی میں نے عبادت کی تھی، جسے زندگی کی سب سے بڑی خوشی سمجھا ہے وہ میری غیر حاضری میں گھر سے غائب ہو کر یوں بے راہ روی اختیار کئے ہوئے ہے۔ بلاشبہ وہ حسین تھی بے حد حسین۔ اسے بناؤ سنگھار کا بھی سلیقہ آتا تھا۔ وہ طرح دار تھی، ایسی طرح دار کہ وہ بازاروں میں کبھی کسی ضرورت سے میرے ساتھ چلتی تھی تو بڑے بڑوں کو میں نے ٹھوکر کھاتے دیکھا تھا اس پریشانی سے بچنے کے لئے میں نے ہمیشہ یہی کوشش کی تھی کہ اس کی ضرورت کی ہر شے اسے گھر میں مہیا کر دوں تاکہ اس کو خود باہر نہ جانا پڑے۔ اگر میں کبھی اسے ساتھ لے کر بازار جاتا تھا تو اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ وہ برقعہ پہن کر باہر نکلے۔ جدید طرز کے برقعے پر وہ جان دیتی تھی مگر میں نے ہمیشہ اسے سادہ برقعے پہننے پر مجبور کیا تھا۔ وہ میری کسی بات کو ٹالتی نہیں تھی، مان جاتی تھی مگر پھر بھی بازار میں چلتے چلتے وہ کبھی اگر نقاب اٹھا دیتی تھی تو وہاں کھلبلی سی مچ جاتی تھی۔ مجھے اس کی...... اس بلا خیز خوبی کا احساس تو تھا مگر اپنی جگہ میں اس کے رویے سے بالکل مطمئن تھا مجھے ہمیشہ یہی یقین رہا کہ وہ پاکباز ہے عفت مآب ہے اور کبھی بھی شوہر سے دغا نہیں کرے گی مگر میرا یہی اطمینان مجھے لے ڈوبا اور اس دن میں نے اپنی آنکھوں سے اسے ایک خوبرو نوجوان کی کار سے اتر کر اس کے گھر میں داخل ہوتے دیکھ لیا۔

جیلانی میاں میرے دل و دماغ کی اس گھڑی جو کیفیت ہوئی اسے تم بخوبی سمجھ سکتے ہو۔ میں نے جوں توں کر کے اس مریض کو ٹیکہ لگایا اور ہسپتال واپس پہنچ کر پورے دن کی چھٹی لے کر میں کوارٹر میں جا بیٹھا۔ پارو گھر سے غائب تھی اور چھوٹے بچے اس قدسیہ کی تحویل میں تھے میں نے قدسیہ سے اس روز پہلی بار پوچھا۔

"تمہاری ماں کہاں ہے قدسیہ؟"

"وہ بازار گئی ہے ابو جی ہمارے لئے مٹھائی لینے۔"

"پہلے بھی وہ جاتی رہی ہے بازار؟"

"وہ ابو جی ہر بدھ کو جاتی ہے ہمارے لئے پھل اور مٹھائی بھی لاتی ہے......"

"ہر بدھ کو؟ کس وقت؟"

"اسی وقت جاتی ہے اور دوپہر کو آتی ہے۔ ابو جی! ڈھیر سارے کھلونے بھی لائی تھی وہ پچھلے بدھ کو ہمارے لئے۔"

"اچھا! مجھے تو تم نے نہیں دکھائے؟"

"وہ ادھر صندوق میں رکھے ہیں ابو جی۔ دکھاؤں آپ کو؟"

یہ کہہ کر وہ صندوق میں سے ایک پلاسٹک کا تھیلا نکال لائی۔ جس تھیلے میں کئی قسم کے قیمتی کھلونے تھے اور ایک گڑیا بھی تھی جس کی قیمت اس وقت بھی پچیس روپے سے کم نہیں تھی۔ میں خود کئی بار سوچتا تھا کہ اپنی قدسیہ کے لئے بھی وہ گڑیا لے لوں مگر جیب اجازت ہی نہیں دیتی تھی۔ وہ قیمتی کھلونے اور وہ گڑیا دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا میں نے پاگلوں کی طرح وہ سب کچھ فرش پر پٹخ کر اپنے بوٹوں تلے دبا کر کرچی کرچی کر دیا۔ وہ سب کچھ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا، جیلانی۔ بیوی کی بے وفائی کسی بھی آدمی کے لئے اس دنیا میں سب سے بڑی آزمائش بن جاتی ہے اور میرا یہ حال تھا کہ میرا جی چاہتا تھا میں اپنے گھر کو آگ لگا دوں جسے میں نے تنکا تنکا جمع کر کے تعمیر کیا تھا جس کے چراغوں میں میں نے اپنی زندگی کا سارا تیل جلا دیا تھا میرا کلیجہ کٹ رہا تھا، جیلانی۔ پارو کی بے وفائی نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میں ایک ایک بچے کو اس روز جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر دیکھتا رہا۔ ان کے نقوش میں اپنے نقوش تلاش کرتا رہا۔ مجھے وہ سب کچھ ہی ناقابلِ یقین معلوم ہوتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ ان میں سے ایک بھی بچہ میرا نہیں ہے۔ میرے صلب سے ایک بھی نہیں ہے۔ سب کے سب پارو کے عاشقوں کا تحفہ ہیں۔ کبھی میں ان کی آنکھوں میں جھانکتا کبھی ان کے چہروں کے خطوط پر غور کرتا۔ ان کے بدن کی ساخت پر نگاہ کرتا۔ ان کے ناخنوں اور لبوں کی شکل پر نظر دوڑاتا اور وہ بچے حیرت زدہ سے ہو کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ سب کے سب ایسے تھے کہ ان کے چہروں میں مجھے پارو کے نقوش تو صاف جھلکتے نظر آتے تھے مگر میں خود ان کے وجود میں کہیں بھی نہیں تھا۔

بالکل دیوانوں ایسی کیفیت طاری تھی مجھ پر۔ کوئی دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے آہستہ آہستہ میری وہ دیوانگی کم ہونے لگی۔ میں نے ساری صورت حال پر نئے سرے سے غور کیا۔ مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت تھی کہ وہ خوبرو جوان کون ہے جس کو خدا نے اتنی حسین صورت دے رکھی ہے اور جسے اس نے دولت سے بھی نواز رکھا ہے۔ وہ کیسے کس طرح پارو کی زندگی میں داخل ہوا؟ کیونکر اس نے میرے آشیانے کو اتنی کامیابی سے آگ دکھا دی ہے۔ یہ سب کچھ کیونکر ممکن ہو گیا۔

پارو کے انتظار میں میں گھر کے دروازے پر جا بیٹھا۔ اندر قدسیہ

اس وقت آٹا گوندھ رہی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ ماں نے اسے گھر کے کام دھندوں میں لگا لیا تھا۔ اس چھوٹی سی عمر میں اس نے قدسیہ کو گرہستی کے جنجال میں پھنسا دیا تھا تاکہ اسے اپنی آوارگی کے لئے وقت مل سکے۔ میں بھی مطمئن رہوں اور بچے بھی۔ میں عموماً ہسپتال سے ایک بجے اپنے کوارٹر میں آ کر کھانا کھاتا تھا اور ہر روز مجھے پارو اپنے مقام پر حاضر ملتی تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ کھانا تیار نہ ہو ـــــ وہ ایسا صاف ستھرا انتظام کر کے جاتی تھی کہ مجھے کبھی کسی قسم کی کمی کا احساس نہ ہوا تھا۔

گھر کی صفائی ستھرائی کا کام بھی وہ عورت اپنی اس معصوم سی بچی سے لیتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ قدسیہ وقت سے پہلے بالغ ہوتی جاتی تھی۔ اس کا دماغ دن بدن پختگی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بچوں کو کس طرح بہلایا جاتا ہے۔ کھانا کس طرح کس وقت تیار ملنا چاہئے۔ اپنے سن و شعور سے کہیں بڑھ کر وہ کاوش کر رہی تھی۔ پارو نے میری قدسیہ بیٹی سے اس کا بچپن چھین لیا تھا۔ میں کوارٹر کے دروازے کے باہر کھڑا اندر ہی اندر پھنک رہا تھا۔

میرا ایک دل چاہتا تھا کہ وہ جیسے ہی آئے، میں دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر اس کی گردن مروڑ دوں۔ اسے دوسرا سانس بھی نہ لینے دوں۔ مگر پھر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ میں نے اس سارے سلسلے کو اس کے عاشق تک پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکا میں ان دونوں کو بدترین قسم کی سزا دوں گا۔ کیونکہ وہ عورت جس نے دس سال میرے بستر پر گزار دیئے، جس کیلئے میں نے دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات۔ جس کی خوشی کے لئے میں نے کڑی مشقتیں اٹھائی ہیں وہ اگر یوں میرے آنگن سے اٹھ کر دوسرے کی آغوش میں جا بیٹھی ہے تو اس کا اسے کوئی "انعام" تو ملنا ہی چاہئے۔

میرے ذہن میں اس گھڑی اس کی سوتیلی ماں کا تصور ابھر رہا تھا۔ وہ مہر جان جو زندگی کی اتنی ساری گھاٹیاں عبور کر لینے کے بعد بھی نہیں تھکی تھی وہ جب مجھے ملی تھی تو اس کے پیٹ میں بھی گناہ کا کیڑا بل رہا تھا جس سے جان چھڑانے کے لئے اس نے کوئی بہت ہی زود اثر قسم کی دوا کھائی تھی مگر اس کی گلوخلاصی نہ ہو سکی تھی۔ جب وہ بہت زیادہ بدحال ہوئی تو ہسپتال آ گئی۔ میں نے اس کا علاج تو کر دیا مگر وہ اپنے کھلے دل اور وسعت پذیر حساب کتاب میں مجھے بھی سموتی چلی گئی۔

میں نے زندگی کا یہ رخ کبھی نہیں دیکھا تھا اور اب جو مجھے اس کا سامنا کرنا پڑا تو میرا سارا وجود لرزنے لگا۔ اپنے دل ہی میں بار بار استقامت پیدا کرتا تھا مگر سوچتا میں یہ تھا کہ کوئی دشمن ہو تو اس سے آدمی نمٹ سکتا ہے، میں اس عورت سے کیسے نبرد آزما ہو سکوں گا جو دس سال سے میرا اوڑھنا بچھونا بنی ہے، جو میرے چار بچوں کی ماں کہلاتی ہے۔ جس کے دم سے میرے دل کی بہاروں میں خوشبو قائم ہے وہ یوں اچانک اتنے بھیانک روپ میں جو میرے سامنے آئی ہے تو میں اسے کس طرح اس کے اتنے بلند مقام سے اتار کر نیچے پھینک دوں۔ اس سے مجھے محبت تھی بے پناہ محبت۔ اس کے سوا میں نے کبھی کسی کو کچھ سمجھا ہی نہیں تھا مگر میری بد نصیبی دیکھو کہ اس نے دوسروں کے مقابلے میں مجھے کبھی کچھ... اہمیت ہی نہ دی تھی اور اس کا یہ رخ اتنا مکروہ تھا کہ میرے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

بارہ بج گئے تو میں کوارٹر سے نکل کر باہر بڑی سڑک پر جا کھڑا ہوا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ آدمی اسے کار میں بٹھا کر لائے اور سڑک پر ہی اتار کر واپس چلا جائے۔ اس لئے اس کو ایک بار اور دیکھ لینا ضروری تھا۔ ساڑھے بارہ بج چکے تھے مگر ابھی تک پارو کا کہیں نام و نشان نظر نہیں آتا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں آگے سرک گئیں۔ میں ایک بجے تک سڑک پر کھڑا رہا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ مایوس ہو کر میں کوارٹر کی طرف چل دیا۔ جب میں دروازے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ پارو کوارٹر کے برآمدے میں لگے چولہے کے پاس پیڑھی پر بیٹھی روٹیاں پکا رہی ہے۔ اس نے مجھے دیکھا تو مسکرائی۔ اس کی اس مسکراہٹ کو میں نے ہمیشہ خوش آمدید سمجھا۔ اس کی نگاہوں میں چمکتے چاند کو میں نے ہمیشہ اپنے لئے خوش بختی اور اس کے بے پایاں خلوص اور محبت کا نشان سمجھا مگر اس روز اس کی مسکراہٹ میں مجھے طنز نظر آ رہا تھا جیسے کہہ رہی ہو۔ تم کہاں تھے مجنوں میاں؟ تم کیا شے ہو؟ کس برتے پر میرے شوہر بنے ہو؟ میں تو بڑے بڑے لوگوں کو جیب میں ڈالے پھرتی ہوں تم کیا ہو ـــــ میرے چہرے پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہو گئی بولی۔

"یہ آپ نے بچوں کے کھلونے کیوں توڑ دیئے۔ میں ذرا دیر کے لئے بازار چلی گئی تو آپ کا پارہ ہی چڑھ گیا۔"

"تم بازار میں بیٹھ جاؤ تو زیادہ بہتر ہے پارو بیگم! بازار جانے سے تمہاری تسلی نہیں ہو گی۔" اس نے روٹی تھڑاپ سے توے پر ڈالی اور آٹے کی مروڑیاں ہاتھ پر سے اتارتے ہوئے بولی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟ کس بات پر اتنا ناراض ہو رہے ہو؟"

"مجھے ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے ماہ پارہ بیگم! مجھے تو خوشی ہے۔" اس کا اصل نام ماہ پارہ تھا۔

"کیا خوشی ہے تمہیں؟ ماتھے پر تو ٹھیکرے ٹوٹے پڑے ہیں تمہارے۔ خوش ایسے ہوتے ہیں؟"

"ہاں میں خوش ہوں پارو۔ دیکھو نا ہمارا کتنا اچھا گھر ہے کتنے پیارے پیارے خوبصورت بچے ہیں۔ ان میں سے ایک بچہ بھی ایسا نہیں ہے جو میرا بچہ نظر آتا ہو۔ ورنہ وہ بدصورت ہوتا، کالا کلوٹا ہوتا۔"

"کیا بکتے ہو تم؟ یہ بجھارتیں نہ بجھواؤ۔ تمہارے بچے کیوں نظر نہیں آتے؟ کیا یہ ہمسایوں کے بچے ہیں؟"

"کیا پتہ کون کس کا بچہ ہے۔ مجھے تو اپنی ولدیت پر بھی شبہ ہے۔ ان واقعات کا علم تو ماؤں کو ہی ہوتا ہے نا.... باپ بیچارے تو...... سمجھتی ہو نا؟" یہ کہہ کر میں اس کے پاس ہی پیڑھی پر بیٹھ گیا۔

اس نے بگھاری ہوئی دال کٹورے میں ڈالی تو میری طبیعت الٹنے لگی۔ بیچاری قدسیہ سے بھلا اس عمر میں ہانڈی کہاں پک سکتی تھی۔

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں قدسی کے ابا! میں ذرا دیر کے لئے اُدھر اپنی ایک سہیلی کے ہاں گئی تھی۔ اب اتنا تو شور نہ مچاؤ۔"

"میں نے کون سا شور مچایا ہے؟ میں تو......"

"کیا میں تو...... نہیں تو آج یہ نیچے بھی اپنے معلوم نہیں ہوتے کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"میرا خیال ہے اب مجھے بھی ایک کار خرید لینی چاہئے۔"

"کار اور تم! کہیں بھنگ تو نہیں پی لی ہے تم نے؟ کار والے اور ہوتے ہیں۔ ہم ایسوں کی ایسی قسمت کہاں؟"

"کیوں نہیں! تمہاری قسمت میں تو ضرور کار ہو گی۔ سواری کی ہے تم نے کبھی کار پر؟"

"خاک سواری کی ہے۔ اپنی کار کا تو اور ہی لطف ہوتا ہے۔ وہ میری سہیلی ہے نا اس کے میاں کے پاس کار ہے۔"

"کیا نام ہے تمہاری سہیلی کے میاں کا؟"

"اس کا نام ہادی علی ہے۔ چوہدری ہادی علی۔ اکبر کوٹ کے زمیندار ہیں وہ!"

بابا رگھو شاہ کے منہ سے ہادی علی کا ذکر اس شخص سے سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"یہ وہی ہادی علی تو نہیں بابا جی جسے میں نے قتل کر دیا ہے؟"

"ہاں ہاں یہ وہی تھا۔ جیلانی میاں وہ واقعی وہی شیطان تھا۔ اس وقت وہ جوان تھا اور کھل کھیلتا تھا۔ میری تباہیوں کا وہی ذمہ دار تھا۔ اسی لئے تو میں تمہیں اپنی یہ سرگزشت سنا رہا ہوں ورنہ میں اپنے ان ذلت بھرے زخموں کو کبھی تمہارے سامنے نہ کھولتا۔" بابا جی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ جنگل کی رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔ میں نے کچھ اور لکڑیاں الاؤ میں جھونک دیں اور سگریٹ سلگا کر بابا کو بھی دیا اور خود بھی پینے لگا۔ میرے کلیجے میں دعائیں ہونے لگی تھیں۔ مجھے زندگی نے ایک ایسے آدمی سے ٹکرا دیا تھا۔ جس کی موت نے اس علاقے کے بے شمار لوگوں کے دلوں میں خوشیاں بھر دی تھیں۔ وہ زمین کا بوجھ تھا وہ ہادی علی۔ اور جب اس کی لاش سے اتر کر وہ اس کے پیٹ میں دھنسا تو ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جلاد کے لوگ تو اس روز خوش تھے ہی مگر جو خوشی، جو طمانیت میں نے اس روز بابا رگھو شاہ کے چہرے پر دیکھی۔ اس نے مجھے یہ اطمینان دلا دیا کہ میں نے

اگرچہ وہ کام آہو صاحب کے کہنے پر ہی کیا تھا مگر آدمی اس نے بڑا ہی منتخب کیا اور ایسے ہی خباثت بھرے وجود پر اس نے موت کا حکم صادر کیا جس کی زندگی لعنتوں کا طوق بن گئی تھی۔ اس کے اپنے گھر میں اور اس کے گرد و پیش میں رہنے والے دوسرے لوگوں کے لئے بھی۔ جس وقت آہو صاحب بہت ہی اچھے نظر آ رہے تھے اور میں سمجھتا تھا کہ انہوں نے مجھے جو کام سونپا تھا اس کے لئے ان کے پاس بڑا ٹھوس جواز موجود تھا۔

بابا جی نے ایک بار پھر آگ کو کریدا۔ میں اوس میں بھیگا جا رہا تھا بولے۔

"ادھر چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔ چھپر اوس سے بچاتا ہے۔" میں ان کی پائنتی جا بیٹھا تو وہ بولے۔

"جیلانی میاں! میری بیوی نے جب ہادی علی کا نام لیا تو میرے تن بدن میں اور زیادہ آگ بھڑک اٹھی کیونکہ وہ ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر کا گہرا دوست تھا اور ان سے ملنے کے لئے اکثر وہ ان کی کوٹھی آتا جاتا رہتا تھا۔ میں نے اس کا نام تو سن رکھا تھا مگر صورت میں نے اس روز پہلی بار دیکھی تھی۔

میری بیوی میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھی بولی۔

"یہ آج تمہاری رنگت کیوں بدلتی ہے بار بار! کیا سوچ رہے ہو؟"

"اب میری سوچ پر بھی پہرہ لگاؤ گی؟"

"یہ بات نہیں ہے قدسی کے ابا! مگر تم مجھ سے کچھ چھپا بھی رہے ہو۔"

"تم مجھ سے چھپ چھپا کر نہ جانے کیا کچھ کر آتی ہو۔ میں کچھ نہیں کہا کبھی ہی نہیں سکتا۔ میرے پاس بھلا چھپانے کے لئے کیا رکھا ہے.... اپنی بدنصیبی؟"

وہ سٹپٹا سی گئی۔ روٹیاں میرے آگے رکھتی ہوئی بولی۔

"پتہ نہیں کیا کہہ رہے ہو تم! تمہارے دماغ ہی نہیں پلٹ چلے ہیں۔" میں نے کھانا وہیں چھوڑ دیا اور اسے گہری گہری نظروں سے دیکھتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

میرے وجود پر گالی تو چڑھ ہی چکی تھی۔ پارو نے میری عزت بیچ ڈالی تھی۔ اس روز پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ میری بدصورتی ہمیشہ کے لئے ایک لعنت کا طوق بنی رہی ہے۔ اسے مجھ سے کبھی محبت نہ تھی۔ اپنی طویل ازدواجی زندگی کے مختلف مراحل میری نظروں میں تھے۔ میں نے اسے بارہا اپنی سوتیلی ماں کو کوستے سنا تھا۔ جب بھی میری اس سے کسی بات پر بیچ بچاؤ ہوتی میں نے اسے اپنی مری ہوئی ماں کو.... بے تحاشا گالیاں دیتے سنا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس سے میری ماں کا تعلق کیا تھا مگر اب میں اسے کسی طور ساتھ مجھے یہ یہ بتا دینے کا تہیہ کئے ہوئے تھا کہ اس کی ماں بھی بدچلن تھی اور بیٹی اسی کی راہ پر چل رہی ہے۔ میں اسے یہ بات بتا کر ذہنی طور پر مفلوج کر دینا چاہتا تھا مگر سب سے

پہلی بات تو یہ تھی کہ اس جگہ کے بارے میں تو معلومات حاصل کروں جہاں ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔

ہسپتال سے نکل کر میں اس مقام تک جا پہنچا جہاں میں نے صبح ہادی علی کی کار دیکھی تھی۔ وہ مکان اس وقت مقفل تھا۔ یہ بڑا سا تالا اس کے دروازے پر لٹک رہا تھا جیسے میرا منہ چڑا رہا ہو وہ خاصا صاف ستھرا مکان تھا۔ میں نے گلی میں گھوم پھر کر ادھر اُدھر سے جو کچھ معلوم کیا اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ مکان ہادی علی نے کرائے پر لے رکھا ہے اور کبھی کبھار جب وہ شہر آتا ہے تو اس میں قیام کرتا ہے۔ اس کی صفائی ستھرائی کے لئے اس کا ملازم ہفتے دس دن بعد وہاں آیا کرتا ہے اور رات وہاں گزار کر واپس چلا جاتا ہے۔ میں نے ارد گرد کی ساری صورتِ حال پر نظر ڈالی تو مجھے محسوس ہوا کہ مکان کا جنوبی حصہ ایک چھوٹی گلی میں کھلتا تھا اور وہاں دیوار ایسی ہے کہ اس پر چڑھ کر آدمی آسانی سے اندر کود سکتا ہے۔

ان امکانات پر میں اس لئے غور کر رہا تھا کہ میرا ارادہ ان دونوں کو ایسی حالت میں پکڑنے کا تھا جس میں پھنس کر پارو کسی طرح بھی اپنے اس گناہ سے انکار نہ کر سکے۔ تمام صورتِ حال کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں گھر جا پہنچا۔

میری زندگی کی وہ پہلی رات تھی جس میں میں نے اپنا بستر پارو سے الگ کر کے دوسرے کمرے میں سونے کا فیصلہ کیا وہ بڑی حیران ہوئی بلکہ ششدر رہ گئی۔ "ایسی کیا مصیبت آ پڑی ہے آج! اُدھر کیا رکھا ہے تمہارا؟"

"اُدھر تو کچھ بھی نہیں ہے پارو مگر ادھر بھی میرا کچھ نہیں رہا۔ کیا رکھا ہے یہاں میرا؟" میں نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔

میرا جواب درست تھا نا جیلانی! میں اور کیا کہہ سکتا تھا؟ جس طرح آج میں نے قدسیہ کو اندھی کر دیا ہے۔ کاش اس ٹوٹی سے میں اس دور میں بھی واقف ہوتا۔ آج میں سوچتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر سخت غصہ آتا ہے۔ قدسیہ کی حرکتوں نے میرا زخم ہرا کر دیا ہے اسی لئے میں نے اس کی آنکھوں میں وہ سلائی پھیری ہے۔ وہ میری بیٹی ہے مجھے اس سے اپنی جان سے بھی زیادہ محبت ہے مگر میں اسے پارو کے نقشِ قدم پر چلتے نہیں دیکھ سکتا۔

میرے دل میں تمہاری بہت عزت ہے غلام جیلانی! تم نے اپنی عزت تو بچائی ہی ہے مگر مجھے بھی تم نے آج برباد ہونے سے بچا لیا ہے ورنہ وہ جس انداز سے تمہارے پیچھے لگی تھی، کوئی ولی اللہ بھی ہوتا تو بہک جاتا۔ وہ بڑی سزا کی مستحق ہے جیلانی! میں تمہارا احسان مند ہوں۔"

"نہیں بابا جی یہ میرا فرض تھا آپ نے مجھے کڑے وقت میں پناہ دی، مجھ پر شفقت فرمائی۔ میں بھلا آپ کا یہ احسان کیسے بھول سکتا تھا۔"

"تم اچھے آدمی ہو۔ تمہارے کردار کی میں جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ مگر میری بدنصیبی دیکھو میں اپنی ہی بیوی کے ہاتھوں مارا گیا۔"

میں اس رات الگ کمرے میں سویا تو پارو بلبلا کر رہ گئی۔ وہ سوچتی رہی کہ یہ تبدیلی میرے رویئے میں کیسے آ گئی مگر اپنے جرم سے تو وہ آگاہ تھی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا تھا لیکن جس آگ میں وہ کود چکی تھی اور جس جذبے نے اسے مغلوب کر لیا تھا وہ ایسا نہیں تھا کہ آدمی کو رکاوٹوں کے سامنے بے بس کر دے۔ وہ ایسا منہ زور جذبہ ہے کہ جس دل میں بھی سر اٹھاتا ہے اسے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ یہی حال پارو کا تھا۔ وہ صبح اٹھی تو سیدھی میرے کمرے میں چلی آئی اور میرے لحاف میں گھس کر بولی۔

"میں ساری رات نہیں سو سکی۔ یہ کوئی شرافت ہے تمہاری۔"

"میں کیا اور میری شرافت کیا ماہ پارہ بیگم! تم واقعی ماہ پارہ ہو، چاند کا ٹکڑا بنی ہوئی ہو، میرے جیسے بدصورت کے لئے کیوں پریشان ہوتی ہو۔"

"اچھا تو یہ احساس کب سے ہو گیا آپ کو میرے حضور میرے لئے تو کالے خان ہی سب کچھ ہے۔ دیکھو اب من جاؤ ورنہ میں بولوں گی نہیں۔"

"تنگ نہ کر پارو۔ جا اپنا کام کر میں بہت پیچھے رہ گیا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے بستر چھوڑ دیا اور کمبل اوڑھ کر صحن میں نکل گیا۔

ناشتہ تو پارو نے مجھے ٹھیک وقت پر دے دیا مگر وہ بڑی بجھی ہوئی نظر آ رہی تھی جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہو۔ ٹھیک آٹھ بجے میں ڈیوٹی پر جانے کے لئے گھر سے نکل آیا۔ میری جیب میں اس وقت ایک تیز دھار چاقو تھا اور میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ ان دونوں کو میں ان کے عیش کے لمحوں میں جہنم رسید کروں گا۔

ہسپتال سے میں نے چار دن کی چھٹی لے لی۔ ڈاکٹر میرا بہت لحاظ کرتا تھا۔ اس نے بلا چون و چرا میری درخواست منظور کر لی۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر کے پاس پستول ہے مگر وہ اسے ہمیشہ اپنی دراز میں مقفل رکھتا تھا اس نے پستول کے لئے باقاعدہ لائسنس لے رکھا تھا۔ جب میں ڈاکٹر کے کمرے سے چلنے لگا تو وہ بولا۔

"خان صاحب ذرا دواؤں کے رجسٹر کا یہ صفحہ دیکھیں اور خالی خانے پُر کر دیں، یہیں بیٹھ جائیں۔ میں ابھی آتا ہوں ایک مریض کو دیکھ لوں.... اسے گردن توڑ بخار ہے۔"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ میرے لئے وہ لمحہ بہت ہی غنیمت تھا جونہی ڈاکٹر باہر نکلا میں نے اس کے سوٹ کے کوٹ کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور اس کی دراز کو چابی لگا کر میں نے ڈاکٹر کا پستول نکال لیا۔ میرا دل اس گھڑی بلیوں اچھل رہا تھا۔ خوف نے روئیں روئیں سے پسینہ نکال دیا تھا۔ میں نے پستول کے ساتھ رکھی پیٹی میں سے چار گولیاں بھی نکال لیں اور دراز کو بند کر کے چابیاں کوٹ کی جیب میں رکھ دیں۔

ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق میں نے رجسٹر کی خانہ پری کی اور کوئی

بیس منٹ بعد میں وہاں سے نکل کر باہر بڑی سڑک پر جا ٹھہرا۔ مجھے یقین تھا کہ پارو اس روز بھی ہادی علی سے ملنے جائے گی وہ رک ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ ایک خوبرو اور دولت مند آدمی اس کے ہاتھ لگ گیا تھا یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ اس کا اظہار میں اس کے منہ سے بار بار سن چکا تھا جو اس نے اپنی کئی جگری سہیلیوں سے کیا تھا۔ جو مجھ سے بدمزگی کے لمحوں میں وہ صاف کہہ دیتی تھی، کہ اس کی تو قسمت پھوٹ گئی کہ اسے میری شکل صورت کے آدمی کے پلے باندھ دیا گیا۔ وہ میرے کردار کی کوئی قدر نہ کرتی تھی ـــــ اس کی ماں مہرجان کے سوا میری زندگی میں اس سے پہلے یا اس کے بعد کوئی عورت نہیں آئی تھی اور وہ مہرجان خود بچھے ہوئے جال کی طرح میری گود میں آ گری تھی ورنہ میں تو شاید وہاں بھی عادتاً چپ ہی رہ جاتا لیکن اب جس عذاب میں مجھے پارو نے ڈال دیا تھا وہ ایسا تھا کہ میں اپنی تمام شرافت کو الگ رکھ کر ان دونوں سے بدترین سلوک کرنے پر مجبور تھا کہ اگر میں چپ رہ جاتا یا میں اس سے سمجھوتہ کر کے آنکھیں موند لیتا محض اس لئے کہ پارو میری زندگی میں موجود رہے تو وہ گویا ایک بھیڑئیے کو وجود میں پھیلنے کی اجازت دینے کے مترادف تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں جو کچھ کرنے جا رہا ہوں اس سے میرا گھر بھی تباہ ہو جائے گا۔ میرے بچوں کا مستقبل برباد ہو جائے گا میرے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہے گا مگر مجھے اس کے سوا اور کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ میں اس طرح زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔

میرے تمام اندازے صحیح نکلے۔ پارو گھر سے بن سنور کر ٹھیک ساڑھے دس بجے نکلی اور اونچی ایڑی کی خوبصورت جوتی پر ٹھمک ٹھمک چلتی وہ ہسپتال کے چھوٹے دروازے میں سے نکل کر ہائی اسکول کی طرف جانے والی سڑک پر جا چڑھی۔ وہ اس روز چھوٹے بچے پپّو کو گھر چھوڑ گئی تھی۔ عیش میں خلل پڑتا ہو گا نا وہ ـــــ میرا خون کھول رہا تھا اپنے بچوں کی اس ماں کو دیکھ کر۔

میں اس سے خاصی دور ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ اس نے اس روز بھی جدید طرز کا فاختئی رنگ کا برقعہ پہن رکھا تھا اس کی چال میں ایسی لہردار تیزی تھی کہ میں سمجھا وہ ابھی ناچنے لگے گی جب وہ بہت خوش ہوتی تھی تو اسی طرح ٹھمکا مار کر چلتی تھی کہ میں بے خود ہو کر جھوم جاتا تھا مگر اس روز اس کی چال میں بھری مستی نے مجھے یہی احساس دلایا کہ وہ اوّل درجے کی بدمعاش عورت ہے اور دیکھنے والے کو خواہ مخواہ اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے لہراتی ہے۔

میں نے سڑک چھوڑی اور گلیوں گلیوں چلتا ہوا ایک درمیانی راستے سے ہادی علی کے مکان کی جنوبی گلی میں جا پہنچا۔ اس مکان کا چھوٹا دروازہ اسی گلی میں کھلتا تھا مگر وہ اندر سے بند تھا۔ گلی میں اس گھڑی چاروں طرف سناٹا تھا مکانوں کے دروازے چونکہ مشرقی سمت میں کھلتے تھے اس لئے ادھر آمد و رفت بہت کم رہتی تھی۔ ابھی میں اندر جانے کے امکانات کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ مجھے ہادی علی کے مکان کے بڑے دروازے کے سامنے کسی کار کے رکنے کی آواز سنائی دی۔

میں سمجھ گیا کہ شکاری اپنے شکار کو اٹھا کر اپنے اڈے پر پہنچ گیا ہے۔ میرے خون کا لاوا ایک دم ابلنے لگا مگر میں نے ضبط سے کام لیا اس وقت جبکہ وہ لوگ اندر داخل ہو رہے تھے میرا ہادی علی کے صحن میں کود جانا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔

تم سن رہے ہو نا جیلانی! یہ میری بدنصیبی کی تصویر ہے جو میں نے آج تک کسی کو نہیں سنائی۔"

"میں سن رہا ہوں بابا جی! میں سوچ رہا ہوں کہ اس ہادی علی کو تو میں نے اسے سستا چھوڑ دیا۔ ورنہ وہ تو ایسا تھا کہ اس پر تو کتے چھوڑے جانے چاہئے تھے۔"

"ہاں جیلانی تم ٹھیک کہتے ہو مگر جو کچھ بھی ہوا ہے، ٹھیک ہی ہوا ہے یہ نیکی تجھے ہی ملنی تھی نا ـــ ایک سگریٹ دو مجھے۔"

میں نے ایک سگریٹ خود لیا اور دوسرا اسے سلگا کر دیا۔

"جب وہ دونوں مکان کے اندر داخل ہو گئے تو میں نے اندازہ لگایا کہ اب وہ کمرے میں بند ہو چکے ہیں تو میں دیوار پر چھپکلی کی طرح چڑھا اور بڑی آہستگی سے دوسری طرف اتر گیا۔ صحن خالی تھا میں نے دیکھا کہ عمارت کے اندر صحن کی طرف ایک کھلا برآمدہ ہے۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اس برآمدے میں جا پہنچا۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ ان کی آواز مجھے بالکل سنائی نہیں دے رہی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس کمرے میں ہیں؟

برآمدے میں دبے پاؤں چلتا ہوا میں آگے بڑھا تو مجھے ایک راہداری نظر آئی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر چلنے لگا۔ وہ راہداری دائیں ہاتھ بھی مڑتی تھی اور بائیں ہاتھ بھی۔ ادھر بھی تین کمرے تھے اور ادھر بھی اتنے ہی۔ اچانک مجھے دائیں ہاتھ کے آخری کمرے سے پارو کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ میں اس وقت ربڑ سول کے جوتے پہنے ہوئے تھا۔ میرے قدموں کی آواز پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ لوگ کمرے میں بند ہو چکے تھے۔ میں ذرا آگے بڑھا تو مجھے پارو کی آواز سنائی دی۔

"جناب بڑے گھٹے بدمعاش ہیں آپ! کالے خان تو بیچارہ روتا ہی رہ جائے گا۔"

"تے یار تینوں لے جان گے۔" ہادی علی نے گرہ لگائی۔

"لے جان گے سے کیا مطلب لے گئے ہیں۔" پارو نے کہا۔ اس کی آواز میں ایسی انبساط اور ایسی مستی تھی کہ میں دنگ رہ گیا۔

"اسے پتہ چل گیا تو وہ تیری ناک کاٹ ڈالے گا۔"

"اس کا دماغ کل سے کچھ خراب ہو رہا ہے۔ اسے کچھ شک ہو

گیا ہے ورنہ وہ ایسا تو کبھی نہ تھا۔"

"کیا کہہ رہا تھا وہ؟" ہادی علی نے دوبارہ پوچھا۔

"دفع کریں اس کے ذکر کو۔ خواہ مخواہ بدمزہ ہونے کا فائدہ۔ وہ تو جانور ہے جانور۔"

"اور ہم ـــ؟"

"آپ تو شہزادے ہیں جناب! آپ کے لئے تو میں ساری دنیا چھوڑ سکتی ہوں۔"

"اپنے بچوں کو بھی اور شوہر کو بھی؟"

"کیوں نہیں۔ ان کی کیا حیثیت ہے آپ کے سامنے۔ آپ پر تو سارا شہر قربان کر سکتی ہوں۔"

میں نے اپنے سامنے کے کمرے کے دروازے پر ہاتھ ڈالا تو وہ کھل گیا مگر اس سے جو آواز پیدا ہوئی وہ مجھے بے بس کر گئی۔ میں تیزی سے کمرے میں جا گھسا۔ وہاں میری آنکھیں اندھیرے سے ابھی مانوس نہیں ہوئی تھیں۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ دونوں ساتھ کے کمرے میں بند ہیں اور میں اس میں داخل ہونے کا دروازہ ابھی تلاش کر رہا تھا کہ اچانک وہ دروازہ کسی نے باہر سے بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔۔ جس میں سے میں اندر داخل ہوا تھا ـــــ وہ بڑی خوفناک بات تھی میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کوئی آدمی ہے اندر۔" راہداری میں ہادی علی کی آواز سنائی دی۔ دراصل وہ کمرے کا دروازہ کھلنے سے جو آواز پیدا ہوئی وہ اسے چوکنا کر گئی۔ وہ فوراً ہی راہداری میں نکلا اور اپنی بے پناہ حاضر دماغی سے کام لے کر اس نے دروازے پر باہر سے کنڈی چڑھا کر مجھے اندر بند کر دیا تھا۔

"پتہ تو کریں کون ہے وہ۔" یہ پارو کی آواز تھی۔ وہ سخت دہشت زدہ تھی۔

"ابھی دیکھتا ہوں۔" ہادی علی نے یہ الفاظ دبی زبان میں کہے۔ اب میں کمرے کی ہر شے دیکھ سکتا تھا۔ ساتھ کے کمرے میں کھلنے والا دروازہ اب مجھے نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے ہینڈل کو کھینچا تو معلوم ہوا وہ دوسری طرف سے بند ہے۔ میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میرا منصوبہ ناکام ہوا جاتا تھا۔

ایک بار پھر مجھے راہداری میں قدموں کی چاپ سنائی دی......

ہادی علی لوٹ پہن کر باہر نکلا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی پر پڑا پردہ ذرا سا ہٹایا تو مجھے ہادی علی بائیں ہاتھ کھڑا نظر آیا۔ وہ کمرے کے دروازے کو گھور رہا تھا۔ پارو بھی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ پردے کی جھری کو بنا کر میں کھڑکی کے شیشے میں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پارو کا رنگ اڑ رہا تھا اور وہ برقعے کے بٹن تیزی سے بند کر رہی تھی۔

"ادھر کھڑکی میں سے دیکھیں تو سہی کہ اندر کون ہے؟ یہ آپ کا گھر ہے آپ کو کس کا ڈر ہے؟"

ہادی علی کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اس نے اس روز ولائتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ وہ جیبوں میں ڈالے ہوئے تھا۔ پارو کے کہنے پر وہ بڑی احتیاط سے کھڑکی کی طرف بڑھا مگر جونہی وہ میرے سامنے آیا میرے دماغ میں سنسنی پھیل گئی۔ میں نے غصے سے پاگل ہو کر شیشے میں سے نشست باندھ کر اس پر گولی چلا دی۔ شیشہ تڑاخ سے ٹوٹا اور گولی اس کی ران میں جا لگی۔ وہ بلبلا کر پیچھے ہٹا تو میں نے ایک اور گولی چلا دی مگر وہ سیدھی دیوار میں جا لگی۔ پارو اسے کھینچ کر پرے لے گئی تھی۔ ہادی علی نے کراہتے ہوئے کہا۔

"تم چلی جاؤ پارو! میں نے دیکھ لیا ہے وہ کون ہے، تم فوراً چلی جاؤ۔ میں اس سے خود نپٹ لوں گا۔"

"مگر آپ زخمی ہیں ـــ کون آدمی ہے وہ؟"

"یہ سوال مت پوچھو، میری بھی خیر ہے۔ میں سب دیکھ لوں گا تم بس فوراً نکل جاؤ ورنہ بدنامی ہو گی، جاؤ!" وہ بڑے غصے سے بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے میں بلال کو بتا دیتی ہوں۔"

"ہاں اسے فوراً بھیج دو اور دیکھو سیدھی گھر چلی جانا۔" ہادی علی نے کہا۔ پھر مجھے پارو کے قدموں کی آواز دور ہوتی سنائی دی۔ وہ صحن میں سے گزر کر مکان کے چھوٹے دروازے کی راہ سے نکل گئی تھی۔

اس کے جانے کے چند ہی لمحے بعد ہادی علی دیوار کے سہارے گھسٹتا ہوا میرے کمرے کے دروازے کے قریب آیا اور میرے پستول کی زد سے پوری طرح محفوظ رہ کر بولا۔

"اچھا تو یہ تم ہے کالے خان! بیوی کے پیچھے آیا تھا؟"

"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا ہادی علی! آج نہیں تو کل میں تیرا خون ضرور پیوں گا بدمعاش! یہ سودا تجھے بہت مہنگا پڑے گا۔"

"قیمت تو میں نے دے دی تھی کالے خان! اب تک ہی اسے

پانچ ہزار روپے دے چکا ہوں بچے! اور یہ زخم تُو نے مجھ کو جٹ میں لگا دیا ہے — مگر اب تُو گھر نہیں جا سکے گا۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹنے لگا اس کے بوٹ کی ٹھپ ٹھپ دُور ہوتی جا رہی تھی۔

"میں دیکھ لوں گا تُو کیا بگاڑے گا میرا۔"

میں نے پیچھے مڑ کر سارے کمرے کو کھنگال کر دیکھ لیا۔ میرے باہر نکلنے کے تمام راستے بند تھے۔ دو ہی دروازے تھے اس کمرے میں۔ ایک راہداری میں کھلتا تھا اور دوسرا اس کمرے میں جس میں وہ دونوں بیٹھے تھے اور وہ دونوں دروازے باہر سے بند ہو چکے تھے۔ دو.... کھڑکیاں تھیں مگر ان دونوں میں یہ موٹی موٹی سلاخیں لگی تھیں میرے لئے باہر نکلنا کسی طرح بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ میں تو تلملا کر رہ گیا۔ ہادی علی مجھ پر غالب آتا جا رہا تھا۔

ابھی دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ مکان کا بڑا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کئی آدمی اندر آ گئے ہیں۔ میں نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر دیکھا تو مجھے پولیس کے چار سپاہی نظر آئے۔ وہ اسلحہ ساتھ لے کر آئے تھے۔ پارٹی نے ہادی علی کے ذکر کر ہی بتایا ہوگا کہ مکان کے اندر کوئی چور چھپا بیٹھا ہے جس نے گولی مار کر ہادی علی کو زخمی کر دیا ہے۔

"چوہدری صاحب!" ایک بھاری بھرکم آواز ابھری۔

"میں یہاں ہوں شاہ جی! ادھر آ جائیں۔" ہادی علی نے ساتھ کے کمرے سے جواب دیا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا — دلدار شاہ تھانیدار خود آیا تھا موقعہ دیکھنے۔

"کیا ہوا چوہدری صاحب! ارے آپ تو سخت زخمی ہیں۔ گولی لگی ہے آپ کو؟"

"جی ہاں شاہ جی! کوئی چور ہے اندر اس کمرے میں۔ اس نے پستول سے گولی چلائی ہے مجھ پر۔ اوئے بلال ذرا سہارا دے مجھے ہسپتال لے چل۔"

"ہاں تم جاؤ عادل ان کے ساتھ۔ ان کی مرہم پٹی تو کراؤ کہیں خون زیادہ نہ بہہ جائے۔ جلدی جاؤ اور تم دیکھو کبیر علی ادھر۔ اس چور کے پُتر کو اندر ہی بھون ڈالو — لوڈ ہے نا رائفل؟"

"جی شاہ جی!"

"بس ٹھیک ہے تم ادھر سے پوزیشن لے لو سلیم! میں نے دیکھ لیا ہے وہ دہن کا باجا رہے ہیں سے میں دیکھ رہا تھا۔ ابھی اندر ہی ہے وہ۔" دلدار شاہ نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ بہت تیز نظر تھی اس تھانیدار کی۔ آتے ہی اس نے ساری صورت حال کا صحیح صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔

"اوئے سؤر کے پُتر باہر آئے گا کہ اندر ہی گولی کھائے گا۔ اپنا پستول باہر پھینک دے اور چپ چاپ باہر آ جا ورنہ تیار ہو جا۔ کتے کی موت مرے گا سالے!" سپاہی کبیر علی نے مشرقی سمت کے برآمدے میں سنتری کی اوٹ میں سے رائفل کی نالی کھڑکی کی طرف سیدھی کر کے کہا۔

"میں باہر آتا ہوں جناب! مگر میرے ساتھ انصاف ہونا چاہئے۔"

"اوئے تیرے ساتھ تو ہم ایسا انصاف کریں گے بچو! کہ تیری روح بھی خوش ہو جائے گی، چوہڑے کے پُتر! پھینک باہر اپنا اسلحہ کیا ہے تیرے پاس۔" دلدار شاہ نے بلند آواز سے کہا وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا — اس کی آواز میں ایسا تحکم تھا کہ میں اندر سے چڑ مُڑ ہو کر رہ گیا میں نے یہ مرحلے کہاں دیکھے تھے جیلانی! میں یتیم خانے میں پلنے والا بدنصیب آدمی۔ میں نے کھڑکی کی چٹخنی کھولی اور اپنا پستول گولیوں سمیت باہر پھینک دیا۔

"شاباش! آدمی تو سمجھدار لگتا ہے بچے! اب ذرا اپنی موہنی صورت بھی تو دکھا نا، اپنے عاشقوں کو۔" دلدار نے خوش ہو کر کہا۔ پستول ایک سپاہی نے اٹھا لیا تھا۔

میں نے بڑے بجھے ہوئے دل سے دروازہ کھولا اور ہاتھ اوپر کر کے برآمدے میں جا نکلا۔

"اوئے یہ تو کمپاؤنڈر کالے خان ہیں۔" کبیر علی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ رائفل کی نال اس نے میرے سینے کے ساتھ لگا دی۔

"اوئے تُو ادھر کیا کر رہا تھا کالے خان! یہ دھندا بھی کرتا ہے تُو — یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں سیٹھی۔ وہ ڈاکٹر عظمت تو ڈوب مر جائے گا کہ اس کے بندے ایسے ایسے آپریشن بھی کر لیتے ہیں۔" دلدار نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ وہ سب مجھے پہچانتے تھے ہر روز ہی ان سے ہمارا واسطہ پڑتا تھا۔ لڑائی فساد میں زخمی ہونے والوں کے لئے رپورٹ لینے وہ ہمارے ہی پاس آیا کرتے تھے۔

میں کچھ نہیں بولا۔ نظریں جھکائے میں ان کے سامنے کھڑا تھا۔ حالت میری یہ تھی کہ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور میرا سارا جسم لرز رہا تھا۔

"یہ قصہ کیا ہے میرے یار! یہ دن دہاڑے کیسی کارروائی ڈال رہا تھا تو ادھر۔" دلدار شاہ نے اب کی بار نرم لہجے میں پوچھا۔

میں ایک دم بکھر گیا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"یہ ڈرامہ کر رہا ہے شاہ جی! چوریاں اسی لئے نہیں پکڑی جا رہی ہیں کہ ایسے سادھ اس کاروبار میں لگ گئے ہیں۔" کبیر علی نے کہا۔

"لگا ہتھکڑی اس سالے خان کو۔ مار مار کر چمڑی اُدھیڑ دو اس کی، حد ہو گئی ہے ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ شہر کے ایسے لوگ یہ کام کر رہے ہیں۔" دلدار شاہ نے کہا اس نے ویٹنگ میں بیٹھ کر ضمنی رپورٹ تیار کی اور گلی کے دو تین معتبر آدمیوں کو بلا کر ان کی شہادتیں کاغذ پر تحریر

کروا لیں۔

"میں چور نہیں ہوں شاہ جی! میں برباد ہو گیا ہوں سرکار! میرا کچھ نہیں رہا۔"

"ابھی کہاں بچے! ابھی تو اُدھر چل کر تیری بربادی کریں گے ہم۔ چل اوئے لے چل اس کو۔"

کبیر علی نے کھٹ سے میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالی اور وہ مجھے گلی میں سے نکال کر بھرے بازار میں میری نمائش کرتے ہوئے مجھے تھانے لے گئے۔ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا راستہ اختیار کیا تھا جس پر چل کر سب لوگ جان جاتے کہ کالے خان چور ہے۔

وہ میری بربادی کا پہلا دن تھا جیلانی! تُو سمجھ رہا ہے نا کہ میں کس عذاب میں پھنس گیا تھا۔"

"جی بابا جی! مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔ خدا دشمن کو بھی یہ دن نہ دکھائے۔"

تھانے لے جا کر ان لوگوں نے مجھے حوالات میں بند کر دیا.... دلدار شاہ اسی وقت ہسپتال پہنچا۔ وہاں ہادی علی نے خدا معلوم اسے کیا بتایا وہ جب واپس آیا تو بہت بھرا ہوا تھا۔ اس نے مجھے حوالات سے نکلوا کر اپنے کمرے میں بلوایا تو بولا۔

"کالے خان! تیرے بُرے دن آ گئے ہیں بیٹے! تجھے بتانا ہوگا کہ تُو نے اور کس کس کے گھر میں سیندھ لگائی ہے۔" اسے ہادی علی نے یقین دلا دیا تھا کہ کالے خان چور ہے۔

"میں چور نہیں ہوں جناب! میری بات تو پہلے سن لیں اور پھر کوئی فیصلہ کریں۔"

"تیری بات! تُو کیا کہنا چاہتا ہے آخر! حرامی کے پُتر۔ صاف سیدھا تجھے ہم نے موقعے پر گرفتار کیا ہے۔ پھر بھی تیرے پاس کوئی خاص بچاشن ہے بچانے لئے۔"

"میں ٹھیک کہتا ہوں شاہ! مجھ پر ہادی علی نے ظلم کیا ہے۔ وہ میری عزت سے کھیل رہا ہے۔"

"اوئے تیری بھی کوئی عزت ہے۔ کس عزت کی بات کر رہا ہے تُو! ذرا کھل کر بتا مجھے۔" یہ کہہ کر دلدار شاہ نے کرسی میرے قریب کر لی —

میں نے بے کم و کاست اپنی ساری بپتا اسے سنائی تو وہ عجیب سے تمسخر آمیز انداز سے ہنسا۔

"بڑے بھی چنگے! اچھی سٹوری تیار کی ہے تُو نے۔ تجھے تو اُدھر فلم لین میں ہونا چاہئے تھا۔ ٹھیک ہے بچو! تُو یوں نہیں مانے گا اوئے کبیر علی لے جا اسے اُدھر چڑھا دے اسے ٹکٹکی پر۔ سالا کیا یاد کرے گا یہ بھی۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے ایسی ایسی گندی گالیاں دیں کہ میں کٹ کر رہ گیا۔

اور یہ سب کچھ مجھے پارٹی کی وجہ سے جھیلنا پڑا تھا۔ اس پارٹی کی وجہ سے جس پر میں نے اپنی زندگی نثار کر دی تھی تھانے کی چار دیواری کے اندر اگلے چودہ دن تک مجھ پر جو کچھ بیتی وہ میں جانتا ہوں یا میرا خدا۔ وہ مجھ سے ہر قسم کی چوریوں کا اعتراف کروانے پر تلے ہوئے تھے اور میں نے جب دیکھا کہ وہ مجھے کہیں جان ہی سے نہ مار ڈالیں تو چپ چاپ یہ مانتا چلا گیا کہ ہاں فلاں چوری بھی میں نے کی تھی اور فلاں چوری بھی میرا ہی کارنامہ ہے۔ مختلف گھروں سے زیورات کی چوریوں کا الزام جب میں اپنے سر لے چکا تو وہ مجھے سمجھا کر اپنی تمام پٹیاں اچھی طرح پڑھا کر گجرات اور لاہور کے صرافہ بازاروں میں لئے پھرے سپاہی رائفل کا دستہ میری کمر میں مار کر اشارہ کرتے تو میں انگلی اٹھا کر انہیں بتاتا کہ فلاں دکاندار کے ہاتھ میں نے فلاں زیور بیچا تھا اور پھر وہ اس صراف کو بھی ساتھ لے کر تھانے جا پہنچتے۔ اس طرح میں نے پندرہ بیس بے گناہ آدمی گرفتار کروا دیئے۔ وہ یہی چاہتے تھے۔ کیونکہ میرا جسمانی ریمانڈ وہ لے چکے تھے۔ اگر میں ان کی بات نہیں مانتا تھا تو پھر مجھے اپنی چمڑی اُدھڑوانی پڑتی تھی۔

میرے خلاف انہوں نے مقدمہ اتنا ٹھوس بنایا تھا اور شہادتیں ہادی علی کے ایما پر اتنی مضبوط رکھی تھیں کہ میری بات کسی عدالت میں... درخور اعتنا سمجھی ہی نہ گئی اور مجھے ساتویں پیشی پر عدالت نے ہادی علی پر قاتلانہ حملے اور اس کے گھر میں چوری کی نیت سے داخل ہونے کے جرم میں چار سال کی قید بامشقت کی سزا دے دی۔ مقدمہ صرف چار مہینے چلا۔ میرا وہاں کون بیٹھا تھا جو میرے مقدمے کی پیروی کرتا۔ حالت یہ تھی کہ میری بیوی بھی مجھ سے بیگانہ ہو گئی تھی۔ اس نے کوارٹر چھوڑا اور ہادی علی کی داشتہ بن کر کسی اور مکان میں جا اتری۔ اس میں نہیں جہاں سے مجھے گرفتار کیا تھا — مگر نہیں جیلانی میاں! اللہ تعالیٰ تو ہر شے کا حساب رکھتا ہے اور وہ اپنے کسی بندے کے حال سے غافل نہیں رہتا۔

جب میں سزا پا کر جیل جا پہنچا تو اس کے دس مہینے بعد مجھے ایک دن وہاں قیدیوں کا لباس پہنے کبیر علی سپاہی چکی پیستے نظر آیا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ہتھکڑی تو مجھے اسی نے لگائی تھی نا۔ میں اسے بھلا کیسے بھول سکتا تھا وہ مجھ سے بڑی دیر تک نظریں چراتا رہا مگر میں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

اسے جب فرصت ملی تو میں اسے کھینچتا ہوا الگ لے گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ رشوت لیتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ جرم ثابت ہو گیا تھا کیونکہ مجسٹریٹ نے نشان زدہ نوٹ اس کی جیب سے برآمد کر لئے تھے۔ عدالت نے اسے ایک سال قید بامشقت کی سزا دی تھی اور اس کی اپیل بھی خارج ہو گئی تھی۔

"یہ تو بہت برا ہوا بھائی! تیری تو ابھی نوکری بہت پڑی تھی۔"

"ہاں یار قسمت کے کھیل ہیں۔ پر تیری حالت پر مجھے بہت ترس

"آ گیا ہے کالے خان! تُو تو اپنی بیوی کے ہاتھوں تباہ ہوا ہے۔"

"ہاں بھائی! میرے لئے تو وہ ڈائن ثابت ہوئی ہے۔"

"مگر چین سے وہ بھی نہیں بیٹھی ہے کالے خان! تجھے تو پتہ ہی ہے اللہ نے انصاف کیا ہے۔"

"نہیں یار۔ مجھے تو کچھ پتہ نہیں کہاں ہوتی ہے وہ آج کل؟"

"ارے حد ہو گئی بھئی وہ تو چودہ سال کے لئے جیل میں بھیج دی گئی ہے۔"

"نہیں یار! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ میرے بچوں کو سنبھال کر بیٹھی تھی۔ وہ ہادی علی کے ساتھ خراب ضرور تھی مگر پھر بھی، وہ میرے بچوں کی ماں ہے میرے بھائی۔" میرا کلیجہ اس کے ذکر پر کٹنے لگا تھا۔

"تُو بہت بھولا ہے کالے خان۔ اس کے تو اخبار چھپ گئے تھے پتہ ہے کیا کیا ہے اس نے؟"

"ہوا کیا تھا آخر؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔"

"وہ بڑی خوفناک بات تھی کالے خان! خبر یہی ملی تھی کہ دو بچوں کی لاشیں نہر میں بہتی ہوئی ملی ہیں — نہر کے پل کے پاس تمہیں پتہ ہے جال لگا ہے، اس میں آ لگی تھیں۔ وہ ایسی حالت میں تھیں کہ پہچانی جا سکتی تھیں۔ پولیس نے ان کو اپنی تحویل میں لے کر ان کی تصویریں بنوائیں اور اگلے دن اخبار میں شائع کروا دیں۔ اگلے دن صبح ہی صبح تمہارے ہسپتال سے ایک جھنگی ہمارے پاس آیا اس نے بتایا کہ صاحب وہ بچے تو کالے خان کے ہیں اور میں انہیں پہچانتا ہوں۔ یہ اطلاع ملتے ہی ہم جھنگی کے بتائے ہوئے پتے پر جا پہنچے۔ وہ مکان اسے ہادی علی نے لے کر دیا ہوا تھا۔ تمہاری بیوی اس وقت گھر پر ہی تھی اور دُہائی مچا رہی تھی کہ اس کے تینوں بچے کسی نے اغوا کر لئے ہیں۔"

"کیا کہتے ہو کبیر علی میرے بچے مر چکے ہیں، نہیں ایسا نہ کہو میں مر جاؤں گا کبیر علی۔"

"میری بات حوصلے سے سنو! یہ دکھ تمہیں اب سہنا ہی پڑے گا کالے خان۔ تمہیں پتہ چلے گا کہ تمہارے ساتھ کتنا ظلم ہوا ہے۔"

"کس نے مارا ہے انہیں! میں اسے قبر کی دیواروں تک نہیں چھوڑوں گا کبیر علی! مجھے بتاؤ وہ کون ہے؟" میں نے کبیر علی کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"صبر سے کام لے کالے خان! میں بتاتا ہوں تمہیں وہ کون تھا تمہاری بیوی نے جو بیان دیا اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس کے تین بچے پچھلی دوپہر سے غائب ہیں۔ اس نے انہیں ہر جگہ ڈھونڈ لیا مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔"

"دلدار شاہ کو تو تم جانتے ہی ہو کہ وہ کتنا تیز آدمی ہے۔ وہ تفتیش کے لئے مجھے بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ تمہاری بیوی کی حالت بہت ہی خراب ہو چکی تھی۔ رو رو کر اس نے اپنی آنکھیں سجا لی تھیں دلدار شاہ نے اس کی باتوں پر اعتبار نہیں کیا۔ اس نے کہا۔

"بی بی! تم نے تھانے میں رپٹ کیوں نہیں درج کرائی؟"

پارو اس کا یہ سوال سن کر سٹپٹا سی گئی، بولی "میں تو اس انتظار میں تھی جناب کہ وہ خود ہی آ جائیں۔ تھانے کچہری کا راستہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اب میں سوچ رہی تھی کہ آپ کے پاس جاؤں کسی کو ساتھ لے کر۔"

"تمہارا کوئی اور بچہ بھی ہے؟"

"جی ہاں میری ایک بیٹی بھی ہے۔ قدسیہ وہ اندر بیٹھی ہے۔"

"اسے بلاؤ ذرا۔"

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بخار آ رہا ہے اسے۔" پارو نے کہا۔

"ذرا اس سے ہمیں ملاؤ تو سہی۔ دیکھیں کیسا بخار ہے اسے۔" دلدار شاہ نے کہا اور اٹھ کر کمرے میں جا پہنچا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ وہ بچی اس وقت بستر میں لیٹی تھی اور رنگ اس کا زرد ہو رہا تھا۔ وہ ہمیں اپنے قریب دیکھ کر ایک دم چلانے لگی۔

"چلے جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے! مجھے ہاتھ مت لگاؤ میں مرنا نہیں چاہتی۔"

"گھبراؤ مت بیٹی۔ ہم تو تمہارا بخار دیکھنے آئے ہیں۔"

"اسے پریشان نہ کریں تھانیدار صاحب! یہ بہت خوف زدہ ہے۔"

"کیوں خوف زدہ ہے؟ کس نے ڈرایا ہے اس کو؟"

"پتہ نہیں۔ بس اپنے بھائیوں کے صدمے نے نڈھال کر دیا ہے اسے۔ بڑی محبت کرتی تھی یہ ان سے۔" یہ کہہ کر پارو نے قدسیہ کو اپنی بانہوں میں لے کر اس پر لحاف ڈال دیا۔ ہم اس کی تمام حرکتیں بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ پارو نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے دو تین بار کچھ ایسے اشارے کئے جن کا مطلب یہ تھا کہ وہ قدسیہ کو منہ بند رکھنے کی تاکید کر رہی ہے۔

"بی بی! چلو تم باہر صحن میں بیٹھو۔ ہم اس بی بی سے کچھ باتیں کریں گے۔"

"اس سے بھلا کیا کہیں گے آپ! اسے کیا پتہ کہ کیا ہوا ہے، ان بچوں کے ساتھ؟"

"اس کا خوف تو دور کر ہی دیں گے ہم۔ چلو باہر بیٹھو۔" دلدار شاہ نے اب کی بار اسے ڈانٹتے ہوئے کہا اور اسے باہر نکال دیا۔

دلدار شاہ نے جیب سے ایک روپے روپے کے پانچ نوٹ نکال کر قدسیہ کی طرف بڑھائے۔

"یہ لے میری بیٹی! مٹھائی کھائے گی شاباش یہ لو رکھ لو۔ ہم تمہارے چچا ہیں بیٹے۔ بڑی اچھی بیبی ہے ہماری۔ لو شاباش۔" یہ کہہ کر دلدار شاہ نے روپے قدسیہ کی مٹھی میں دے دیئے۔ وہ اپنے ہاتھ میں

نوٹ دیکھ کر خوش ہو گئی۔ دلدار شاہ نے اسے گود میں لے کر اس کا منہ سر چوما تو وہ بچی مسکرانے لگی مگر وہ ایسی مسکراہٹ تھی جس میں خوف کا عنصر بے حد نمایاں تھا۔

"شاباش! بڑی بہادر بیٹی ہے ہماری۔ یہ تمہارے گلے پر نشان کیسے ہیں یہ نیلے نیلے اور یہ گال پر نیل پڑے ہیں۔ کیا ہوا ہے بیٹی؟"

"امی نے مارا تھا۔" وہ دروازے کی طرف دیکھ کر دبی زبان میں بولی۔

"کیوں مارا تھا اس نے؟"

"وہ کہتی ہیں کہ میں کسی کو نہ بتاؤں کہ پپو اور شاہد کہاں ہیں۔"

"کہاں گئے تھے وہ؟"

"وہ...... وہ...... انکل ان کو امی نے نہر میں پھینک دیا تھا۔"

"خود پھینک دیا تھا اس نے؟"

"ہاں انکل! ایک آدمی بھی اس کے ساتھ تھا — امی نے کہا تھا میں تم پر اپنی ہر شے قربان کر سکتی ہوں...." بچی نے یہ بات ابھی کہی ہی تھی کہ پارو دوڑتی ہوئی اندر آئی اور قدسیہ کو دلدار شاہ کے ہاتھوں سے نوچتی ہوئی باہر لے گئی۔

دلدار شاہ اس کے پیچھے لپکا اور اس کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے آیا۔

"یہ دروازہ بند کر دے کبیر علی اور اس بچی کو ادھر لے آ میرے پاس۔" میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی تو دیکھا کہ پارو چارپائی پر سر جھکائے بیٹھی ہے۔ وہ سخت پریشان ہو چکی تھی۔

"ہاں تو پھر کیا ہوا تھا پارو بی بی تمہارے بچوں کو؟ یہ قدسیہ تو کچھ اور ہی کہانی سنا رہی ہے۔"

"یہ جھوٹ بولتی ہے صدمے سے پاگل ہو گئی ہے یہ۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ ماں کو تو بچوں کی فکر نہیں ہے اور بیٹی بچھاڑیں کھا رہی ہے۔ دیکھ پارو! اگر تو سیدھی طرح مجھے بتا دے کہ تُو نے اپنے بچوں کو نہر میں کیوں پھینکا تھا اور تیرے ساتھ کون تھا؟ تو پھر شاید میرے ہاتھوں تُو ذلیل ہونے سے بچ جائے ورنہ تُو جانتی ہے میرا نام دلدار شاہ ہے۔"

"کوئی ماں اپنے بچوں کو نہر میں ڈال سکتی ہے، کیسی بات کرتے ہو تم تھانیدار جی۔ یہ بچی پاگل ہو گئی ہے، اس کی باتوں میں آ گئے ہیں آپ؟" پارو نے اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں نچاتے ہوئے کہا......

"یار کالے خان! بڑی خوبصورت تھی وہ تمہاری پارو۔ پاگل ناگن ایسے رنگ تھے اس کے۔ وہ کسی طرح پتے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتی تھی۔ بڑی دیر تک الجھتی رہی وہ دلدار کے ساتھ۔ مگر وہ بھی اپنے باپ کا تخم ہے۔ اس نے جب دیکھا کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا تو اس نے وہیں بچھا دیا تیری بیوی کو۔ بس تیسرے ہی بید پر وہ بلبلا اٹھی۔ ہاتھ جوڑنے لگی۔ بولی: "بتاتی ہوں شاہ جی..... بتاتی ہوں۔"

"ہاں بتا وہ یار کون تھا تیرے ساتھ؟ کیوں مار دیا ہے تُو نے اپنے بچوں کو؟"

"وہ ہادی علی تھا شاہ جی میرے ساتھ۔ اس کی خاطر میں نے اپنا گھر اجاڑ لیا ہے شاہ جی! میرا خاوند جب جیل میں چلا گیا تو ہادی علی نے مجھے شہر میں مکان لے دیا میرے تمام اخراجات بھی برداشت کرتا تھا مگر پھر بھی اسے میری محبت پر یقین نہیں آتا تھا۔"

"تیرا اس سے تعلق کیسے قائم ہوا؟"

"وہ...... وہ مجھے بازار میں مل گیا تھا ایک دن — اس نے میرا کوارٹر تک پیچھا کیا پھر بعد میں اس نے اپنے نوکر بلال کے ذریعے مجھے پیغام بھیجا اور اس طرح میری اس سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔"

"ملاقاتیں تو ہو گئیں تُو نے اس کالے خان کو جیل میں بھجوا دیا مگر یہ بتا تُو نے اپنے بچے کیوں مار دیئے۔ تُو ڈائن کیوں بن گئی؟"

"میں اس پر اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہوں شاہ جی۔ وہ کہتا تو میں اس کے ہاتھ سے زہر بھی پھانک لیتی۔ میں نے اس سے سچی محبت کی ہے شاہ جی، اس کے سوا مجھے دنیا میں کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"ہاں کیوں نہیں! عشق کی آگ ایسی ہی ہوتی ہے بی بی! آدمی کو اوپر سے بھی جلاتی ہے اور اندر سے بھی مگر تیرے بچوں کا کیا قصور تھا۔ ان معصوموں کو کیوں مار دیا تم نے؟"

"وہ...... وہ میرا امتحان لینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ تم جس طرح چاہو مجھے آزما لو۔ وہ مجھے کل نہر پر لے گیا تانگے میں بٹھا کر وہ جو غازی پور سے ادھر چھوٹا پل ہے نا، ہم وہاں جا پہنچے۔ یہ قدسیہ بھی میرے ساتھ تھی اور میرا پپو، شاہد اور کاظم بھی — ہادی علی کو یہی ضد تھی۔ وہ کہتا تھا کہ میں تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر تمہارے یہ بچے مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے اور پل پر پہنچ کر جب ہم نے تانگہ واپس بھیج دیا تو وہ بولا۔

"دیکھ پارو! اگر تُو اپنے بچوں کو نہر میں پھینک دے تو مجھے تیری محبت کی سچائی پر یقین آ جائے گا۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میں نے پپو کو اس کے سامنے نہر میں اچھال دیا۔ قدسیہ نے پپو کو یوں پانی میں گرتے دیکھا تو وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلی۔ کاظم اور شاہد سہمی سہمی نظروں سے کبھی پانی میں دیکھتے تھے کبھی مجھے۔ پپو کو دیکھتے ہی دیکھتے پانی نے نگل لیا۔ وہ اب کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

"وہ پپو ڈوب گیا ہے امی اسے بچاؤ۔" کاظم چلایا۔

"جاؤ تم اسے نکال کر لاؤ۔" یہ کہہ کر میں نے کاظم کو دونوں ہاتھوں

سے اٹھا کر نہر میں پھینک دیا۔ اور میرا وہ خوبصورت بیٹا بھی نہر کی۔۔۔ خوفناک لہروں میں چھپتا ہی چلا گیا۔ وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔

ہادی علی بولا: "شاباش پارو! مگر ابھی تمہارا ایک امتحان اور باقی ہے۔"

اس وقت میرا کلیجہ تو پتھر ہو چکا تھا میں نے ہادی علی کی خوشی کی خاطر اپنے تیسرے بچے شاہد کو بھی اٹھا کر نہر میں پھینک دیا۔ ہادی علی نے زوردار قہقہہ لگایا۔ شاہد کی چیخ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے مگر ہادی علی کو ذرا ترس نہ آیا۔ وہ مجھے پاگلوں کی طرح باہوں میں لے کر ناچنے لگا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ قدسیہ اس وقت ہم سے تھوڑی دور ایک درخت کی اوٹ میں کھڑی کانپ رہی تھی مجھے اس پر اس وقت بے حد ترس آیا۔ آپ نے دیکھا ہے اسے وہ ہو بہو میری صورت ہے۔ ہادی علی نے اسے دیکھا تو بولا۔

"اس کا کیا کرو گی؟ اسے بھی پھینکو ادھر۔"

وہ مستی میں جھوم رہا تھا مگر اس وقت تک میرے جنون کی حالت ختم ہو چکی تھی۔ میں نے بہت سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں چوہدری صاحب! نہیں میں اپنی اس بچی کو نہیں مار سکتی۔ نہیں، نہیں! خدا کے لئے میرا اور امتحان نہ لیں۔"

"ٹھیک ہے پارو! دیکھو میں آج شام اکبر کوٹ جا رہا ہوں۔ میرا انتظار نہ کرنا۔ میں اگلے جمعے کو تم سے شادی کر لوں گا اور پھر تمہیں گجرات میں رہنے کے لئے مکان لے دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے اٹھا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اب کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"تم تانگے میں بیٹھ کر گھر چلی جاؤ۔ میں جمعرات کی شام کو تمہارے پاس آؤں گا۔" سڑک پر اس وقت ایک لاری گزر رہی تھی۔ ہادی علی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور اس میں بیٹھ کر دوسری طرف چل دیا۔ اور میں ٹنڈ منڈ درخت کی طرح وہاں اسی بچی حالت میں کھڑی دیر تک یہ سوچتی رہی کہ یہ میں نے کیا کر دیا ہے۔۔۔۔ مامتا نے ایک بار پھر میرے دل میں طوفان اٹھا دیا۔ مگر میں تو سب کچھ ہی کھو بیٹھی تھی میرے پاس تو اب کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ ایک اپنے اس یار کی خوشی کی خاطر میں نے اپنی ہر شے لٹا دی تھی اور قدسیہ مجھے سہمی سہمی نظروں سے دیکھ رہی تھی میں خود کو گھسیٹتی ہوئی اس تک پہنچی اور اسے سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شاہ جی! میں تباہ ہو گئی ہوں مگر میں خوش ہوں کہ میں ہادی علی کی محبت میں ثابت قدم ہوں اب ہمیں کوئی ایک دوسرے سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ اس پر میں اپنی جان بھی قربان کر دوں گی۔ وہ جو مانگے گا میں دوں گی۔"

"ہاں! وہ سسی، سوہنی اور ہیر تو بیچاری تیرے آگے کچھ بھی نہیں پارو! اصل عشق تو تو نے کیا ہے مگر یاد رکھ اب تو بھی بہت جلدی اپنے بچوں کے پاس پہنچ جائے گی حرامزادی کشتی! تیرے عشق کا بھوت تو میں تھانے چل کر نکالوں گا۔ لگاؤ اسے ہتھکڑی اسے کبیر علی! ایسی ڈائن ہے یہ عورت، اپنے بچوں کو کھا گئی توبہ ہے" دلدار شاہ نے غصے میں تپتے ہوئے کہا۔ میں نے پارو کو ہتھکڑی پہنائی تو دلدار شاہ بولا۔

"دیکھ تو اس کشتی کے رنگ دیکھ! مسکرا رہی ہے جیسے اسے کنگن پہنائے گئے ہوں۔"

"آپ دل کی لگی کو نہیں سمجھ سکتے ہیں شاہ جی! آپ اس منزل پر پہنچ ہی نہیں سکتے جو میں۔۔۔ عبور کر چکی ہوں ___ یہ قید، یہ جیل، یہ پھانسی سب بے کار باتیں ہیں۔ یار کی خاطر یہ سب کچھ میں خوشی خوشی جھیل لوں گی۔"

ڈھٹائی کی حد کر دی تھی اس نے کالے خان! تیری اس عورت کو میں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا تھا۔

ہم نے پارو کو اسی دن لے جا کر حوالات میں بند کر دیا۔ قدسیہ کو دلدار شاہ نے اپنے گھر بھیج دیا۔ وہ وہیں رہتا تھا ان دنوں۔ مزے کی بات یہ ہے کالے خان کہ پارو نے تھانے جا کر جو بیان دیا اس میں اس نے ہادی علی کا نام تک نہیں لیا، صاف مکر گئی۔ اس نے کہا کہ بچوں کو اس نے خود اپنی مرضی سے نہر میں پھینکا ہے۔ کیونکہ وہ جس شخص کے بچے ہیں اس سے اسے شدید نفرت ہے۔ حالانکہ وہ کشتی ان کی ماں تھی ___ اس کے اپنے جسم کا حصہ تھے وہ بچے۔ مگر وہ۔۔۔۔ ہادی علی کو صاف بچا گئی۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح وہ ہادی علی کو بھی اپنے جرم میں شامل ہونے کا ثبوت فراہم کرے مگر وہ ایسی پکی نکلی کہ اس نے عدالت کے آخری مرحلے تک بھی ہادی علی کا نام نہیں لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسے سیشن کورٹ سے چودہ سال قید کی سزا سنا دی گئی اور ہادی علی ہر الزام سے بری الذمہ رہا۔

وہ ایسی ہی تھی کبیر علی! اس جیسی حسین عورت اپنے حسن کی ایسی ہی اونچی قیمت لگایا کرتی ہے۔ "واہ! میرے مولا" میں نے [illegible] ہو کر کہا۔

میری جو حالت ہو رہی تھی اس کا تم اندازہ ہی نہیں کر سکتے ہو غلام جیلانی ___ ہم دونوں برباد ہو گئے تھے۔ وہ اپنے حسن کے زعم میں ماری گئی اور مجھے اس سے میری بے پناہ محبت لے ڈوبی۔

کبیر علی نے اس کے بارے میں مجھے اور بھی بہت کچھ بتایا مگر میں کس کس کا ذکر کروں تم سے جیلانی میاں! بس یوں سمجھ کہ میں نے دل پر پتھر کی سِل رکھ لی مگر وہ غم ایسا تھا کہ میں اسے سہار ہی نہیں سکتا تھا۔ میری صحت کو گھن لگ گیا۔ جیل کی وہ سنگین دیواریں مجھے قبر ایسی اذیت دیتی تھیں ___ مگر میں کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہاں سے وقتِ مقررہ سے پہلے میرا نکلنا ناممکن تھا اور میری یہ بیٹی قدسیہ

دلدار شاہ کے گھر میں تھی۔ میں اس کا شکر گزار ہوں جیلانی! اس نے میری بیٹی کو اپنی ہی بیٹی کی طرح گھر میں رکھا۔ اس کا یہ احسان میں عمر بھر نہیں بھول سکتا۔

میں جب جیل سے نکلا تو میرا یہ حال تھا کہ میری ٹانگیں بیکار ہو چکی تھیں۔ ان میں ایسا درد رہنے لگا کہ میں دو قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ ہادی علی میری نظر میں تھا مگر میں اس قابل کہاں تھا کہ اس سے انتقام لے سکتا۔ میں نے دلدار شاہ سے اپنی بیٹی واپس لی تو وہ یوں رو دیا جیسے اس سے اس کی اپنی بیٹی چھن رہی ہے مگر میری تو نظر کی روشنی ہے یہ قدسیہ۔ میں اسے لے کر ادھر، بلاور کی طرف آ گیا۔ پھر کسی نے مجھے بتایا کہ اس جنگل میں ایک فقیر رہتا ہے جو میری ٹانگوں کا علاج کر سکتا ہے۔ میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے میری کایا ہی پلٹ دی۔ وہ ایسا صاحب نظر فقیر تھا کہ اس نے میرے دل سے نفرت اور انتقام کا سارا گندہ مادہ نکال کر باہر پھینک دیا۔ میری ٹانگیں تو اس نے ٹھیک کر دیں مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے میرے نفس پر بھی تالا ڈال دیا۔ اب میرا یہ حال ہے کہ مجھے اپنے اس پیر و مرشد ٹھیکری والے کے طفیل اللہ نے ایسی برکت دی ہے کہ مجھے دنیا جہان کی ہر نعمت سے بے نیاز کر دیا ہے۔ مجھے یہاں رہتے ایک عرصہ گزر گیا ہے۔ خدا نے مجھے میرے مرشد ٹھیکری والے کی دعا سے جڑی بوٹیوں کے علم سے مالا مال کر دیا ہے کہ خلقِ خدا مجھ سے فائدہ اٹھا رہی ہے میرے ہاتھ میں اللہ نے شفا بھر دی ہے اور میں خوش ہوں کہ پارو کو کھو کر میں نے اپنی منزل پالی ہے۔"

"قدسیہ کا گناہ معاف کر دیں بابا جی! وہ مجھے اپنی آسیہ بہن ایسی نظر آتی ہے اس کی بینائی ٹھیک کر دیں۔"

"ہاں میں ایسا ہی کروں گا اس کے بغیر تو میرا ایک پل بھی نہیں گزرتا ہے اس کی وہ حرکت دیکھ کر مجھے پارو یاد آ گئی تھی بیٹے! مگر اب میں اسے معاف کر دوں گا۔ میں اسے پریشان نہیں دیکھ سکتا۔"

"میرے لئے بھی دعا کریں بابا جی! میں۔۔۔۔ میں بہت دکھی ہوں۔" اس کی باتوں نے میرے اندر کے تمام پتھر توڑ کر پگھلا دیے تھے۔ میری آنکھیں بہہ نکلی تھیں۔

"ہاں رو لیا کر۔۔۔۔ زیادہ وقت دل کے بے لگام گھوڑے پر چابک برسانے میں گزارا کر۔ تیری آنکھ کا غسل تیری روح پر اچھا اثر ڈالے گا رونا بھی سیکھ کہ خدا کو زاری پسند ہے۔ وہ منہ زوری برداشت نہیں کرتا کہ اصل طاقت اور شہ زوری اسی کے ہاتھ میں ہے اور اسے ہی زیب دیتی ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر میری آنکھیں اور زیادہ شدت سے بہہ نکلیں۔ میں اس کے سامنے سر جھکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ پتہ نہیں کن کٹھن منزلوں سے گزار رہا تھا مجھے۔ کسی کٹھالی میں پگھلا رہا تھا میرے وجود کے سارے فاسد مادے پگھل پگھل کر آنکھوں کی راہ سے خارج ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی باتوں نے میرے دل میں چھید ڈال دیئے تھے۔ وہ مجھے ایسی گپت مار دے رہا تھا جس سے نہ لہو بہتا ہے نہ زخم لگتا ہے مگر اندر ہی اندر آدمی ٹوٹ پھوٹ کر کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔

مجھے یوں اُمڈ اُمڈ کر روتے دیکھ کر اس نے ایک بار پھر بڑے زور سے میرا کندھا تھپتھپایا۔ بولا: "صبح زیادہ دور نہیں ہے۔ لا میں تجھے ایک اپنی نشانی دے دوں۔ لا اپنا بازو ننگا کر۔ دایاں بازو تیرا زخم تو بھر گیا ہوگا؟"

"ہاں بابا جی! زخم تو رات ہی رات میں ٹھیک ہو گیا اب تو پتہ بھی نہیں چلتا۔" یہ کہہ کر میں نے کوٹ اتار کر اپنا بازو کندھے تک ننگا کر دیا۔

اس نے الاؤ میں سے ایک باریک سی جلتی ہوئی لکڑی اٹھائی۔ بولا ___

"آنکھیں بند کر لے۔ شاید میرا مولا تیری فریاد سن لے۔ تجھے عزت دے دے۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں تو اس نے میرا بازو ہاتھ میں پکڑا اور اس لکڑی کا جلتا سرا میری کلائی کے اندر کی طرف جلد پر رکھ دیا اور درد کی ایک تیز کٹیلی لہر میرے بدن میں سرایت کر گئی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول لیں تو دیکھا کہ وہ مسکرا رہا تھا۔ میں نے کلائی اس سے چھڑانی چاہی مگر ناکام رہا۔

اس نے میری کلائی پر اندر کی طرف تین جگہ سے برابر فاصلہ دے کر میری جلد جلا دی مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ درد کا احساس جو پہلی بار جلتی لکڑی کا سرا جلد پر اترتے ہی پیدا ہوا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرا بازو سن ہو گیا تھا پھر دل میں خوف کی کوئی رمق موجود نہیں تھی۔ درد نے مجھ سے شرما کر گھونگھٹ نکال لیا تھا۔ جب وہ میری کلائی کو تین جگہوں سے داغ چکا تو میں نے دیکھا کہ وہاں تین ہلکے ہلکے زخم ابھر آئے ہیں۔

"شاباش! اب وہ ذرا سی گرم گرم راکھ دے دے مجھے۔" میں نے الاؤ کے گرد پھیلی راکھ مٹھی میں بھر کر اس کی ہتھیلی پر رکھی تو اس نے سرہانے رکھی ایک شیشی میں سے چند قطرے راکھ پر ڈالے پھر اسے اچھی طرح ملا کر وہ گیلی راکھ اس نے میرے ان زخموں پر لگا دی اور پھر ہاتھ جھاڑ کر لحاف میں دبک گیا۔ بولا ___

"جا اب اندر جا کر سو جا! صبح سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے "چڑھدے" کو چل دینا میرے جنگل میں تیرے لئے یہی کچھ تھا بچے۔ اب جا اٹھ جا۔" یہ کہہ کر اس نے چارپائی پر لیٹ کر لحاف میں منہ ڈال لیا۔ میں ہکا بکا سا ہو کر کبھی اسے دیکھتا تھا اور کبھی اپنی کلائی کو، جس پر

تین زخم اس نے ڈال دیئے تھے مگر وہ ایسے زخم تھے کہ بات ہی نہیں کرتے تھے، اپنا آپ منوانے کی انہیں پروا ہی نہیں تھی۔

میں نے اسے نیند میں ڈوبتے دیکھا تو اپنا کوٹ اور وہ جلتی لکڑی اٹھا کر اندر جا بیٹھا۔ لحاف میں نے اپنے گرد لپیٹ لیا مگر بازو ابھی تک میں اوپر اٹھائے ہوئے تھا اس ڈر سے کہ کہیں وہ راکھ نیچے نہ گر جائے۔ ورنہ زخم ننگے ہو جاتے۔ میں نے بائیں ہاتھ سے سگریٹ منہ میں رکھا اور تیلی جلانے کے لئے بایاں ہاتھ ذرا سا آگے کیا تو وہ لحاف سے یونہی بے خیالی میں یوں رگڑا کھا گیا کہ ساری راکھ زخموں پر سے اتر گئی اور...... اور...... شاید میری بات کا کسی کو یقین نہ آئے مگر حقیقت یہی ہے کہ وہ پیسے پیسے برابر چوڑے اور گول تینوں زخم مندمل ہو چکے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے وہ بہت پرانے زخم ہیں جن پر بڑے موسم گزر چکے ہیں۔ میں سمجھا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ ایک ناممکن بات نظر آتی تھی۔

میں نے اپنا شک دور کرنے کے لئے ان زخموں پر چٹکی بھری تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ بس معمولی قسم کے داغ ہیں۔ زخم تو وہاں کبھی تھے ہی نہیں۔ تب میرا جی چاہا کہ میں ساری زندگی اس بابا کے قدموں میں گزار دوں۔ اپنی عاقبت سنوار لوں۔ اس کے پاؤں کی دھول دھو دھو کر پیتا رہوں اور میرے اندر کا سارا فاسد مادہ آپ ہی آپ زائل ہو جائے۔ وہ تو خدا کا کوئی بہت ہی برگزیدہ بندہ تھا جسے نادیدہ قوتوں پر اختیار حاصل تھا۔ میں تو اس کو صحیح طور پر سمجھ ہی نہ سکا تھا۔ اسے تو خدا نے طرح طرح کی کرامتوں سے نواز رکھا تھا۔ میں تو جھلا ہی رہا۔ مجھے تو سب کچھ چھوڑ کر اسی جنگل میں رہ جانا چاہئے۔

مگر پھر اچانک مجھے اس بابا کے وہ لفظ یاد آ گئے۔ وہ بڑے بے رحم اور بے التفاتی سے لبریز لفظ۔ اس نے مجھے صبح سویرے وہاں سے نکل جانے کو کہا تھا اور تب کہیں سے ہواؤں کے دوش پر اڑتی ہوئی آسیہ کی تصویر میرے حافظے کی سطح پر اتری اور میں ایک بار پھر نڈھال ہونے لگا۔ مجھے اس تک ضرور پہنچنا تھا۔ اتنی کڑی منزلوں سے میں گزرا ہی اس کے لئے تھا۔ میں وہاں رک گیا، فقیر ہو گیا تو کون اس کی آزادی کے لئے تگ و دو کر سکے گا۔ میں نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے۔ مجھے بابا نے جانے کا جو حکم دیا ہے تو اس میں بھی کوئی مصلحت ہو گی۔ مجھے وہاں نہیں رکنا چاہئے۔ خواہ وہ مجھے جنت کی بشارت کیوں نہ دے۔ مجھے وہاں نہیں ٹھہرنا ہے کہ آسیہ میری منتظر ہے۔ اس بابا کی اوس سے میری پیاس نہیں بجھ سکے گی۔ میرا سفر لمبا بھی ہے اور کٹھن بھی۔ اور یہ بابا تو میری منزل ہرگز نہیں ہے۔

میں نے اپنے بازو پر قمیص چڑھا کر جرسی کی آستین نیچے گرا لیں اور کوٹ ایک طرف رکھ کر سو گیا۔ اب مجھے اور کچھ بھی نہیں کرنا تھا صبح سویرے اٹھ کر وہاں سے چل دینا تھا۔ یہی بابا کا حکم تھا اور یہی میری آرزو بھی۔

میرا خیال ہے میں زیادہ دیر تک نہیں سویا تھا۔ میرے بدن پر ابھی کسلمندی طاری تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ وہ لکڑی ابھی تک جل رہی تھی۔ میں نے باہر نکل کر سامنے نظر ڈالی تو صبح کی روشنی زیادہ نہیں تھی۔ سیاہی سے سفیدی الگ کی جا سکتی تھی۔ میں نے جھونپڑی کے اندر جا کر کوٹ پہنا۔ بوٹ کے تسمے باندھے کمبل اوڑھا سر پر پگڑی پٹکے کی صورت میں باندھی اور اسٹین گن کندھے پر لٹکا کر میں جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ بابا لحاف میں منہ ڈال کر سویا ہوا تھا اور اس کے ہلکے ہلکے خراٹے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ گہری نیند میں ہے۔ الاؤ کی آگ مدھم پڑ چکی تھی۔ میں نے کچھ اور لکڑیاں اس میں ڈال کر آگ تیز کر دی اور دل ہی دل میں اس برگزیدہ ہستی کو سلام کہتا ہوا چپ چاپ وہاں سے چل نکلا۔

جب میں جنگل سے باہر آیا تو پو پھٹ رہی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا بابا کی بتائی ہوئی مشرقی سمت میں چل دیا۔ "چڑھتے" کا مطلب یہی تھا۔ میں کوئی ڈھائی تین میل ناک کی سیدھ میں چلا تھا کہ میرے قدم پکی سڑک پر جا چڑھے ـــــ ابھی مجھے وہاں کھڑے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ایک ٹیکسی مجھے اپنی طرف آتی نظر آئی۔ اسے میں نے ہاتھ کے اشارے سے روکا تو معلوم ہوا کہ اس ٹیکسی میں دو آدمی دہقانوں کی شکل والے پچھلے حصے میں بیٹھے تھے۔ ان کی پگڑیاں کالی تھیں جن کے لڑ انہوں نے مجھے دیکھ کر منہ پر لپیٹ لئے تھے۔ ان کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک ان کے اندرونوں کا حال کہہ رہی تھی۔ وہ بھی کوئی واردات قسم کے لوگ تھے۔

"کیا بات ہے میاں جی؟"

"یار میں گجرات جانا چاہتا ہوں جگہ ہو تو بٹھا لو ـــــ بہت پریشان ہوں۔"

"کیوں، خان جی بٹھا لوں، بیچارا مسافر ہے۔"

"بٹھا لے یار! مگر جلدی کر، خواہ مخواہ روک لی ٹیکسی تو نے؟" ایک آدمی نے بہت جز بز ہو کر کہا۔ وہ میری آمد کو شاید کوئی نیک شگون نہیں سمجھ رہا تھا۔

ابھی میں گھوم کر اگلی سیٹ کا دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ دوسرا آدمی بولا ـــــ

"ٹھہر بھایا ٹھہر! یہ بتا تو آیا کہاں سے ہے؟"

"جی میں ادھر رکھ سے آیا ہوں فارسٹ گارڈ ہوں۔ ادھر کسی نے بہت سارے درخت کاٹ لئے ہیں دریا کی طرف سے۔ میں اس کی اطلاع اپنے افسر کو فوراً دینا چاہتا ہوں۔" میں نے نہایت ہی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بیٹھ جا یار! میں سمجھا پتہ نہیں کس منحوس کا منہ دیکھ رہا ہوں سویرے سویرے بیٹھ جا۔"

وہ بہت ہی بدتمیز اور منہ پھٹ قسم کے لوگ تھے۔ مجھے تاؤ تو بہت آیا مگر میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اپنی ضرورت نے مجھے باندھ رکھا تھا۔

ڈرائیور نے گاڑی چلائی تو میں نے سگریٹ جیب سے نکال کر سلگائی۔

"اوئے بند کر یہ دھوئیں بازی! سخت نفرت ہے ہمیں اس سے بجھا اس چاچی کو ورنہ اتر جا یہیں۔"

میں اس کے اس لہجے سے اوپر سے نیچے تک سُلگ کر رہ گیا۔ غصے سے میرا سارا بدن پھنکنے لگا۔

"تو کوئی انسان کا بچہ نظر نہیں آتا ہے مجھے! تیری ماں نے تجھے تمیز نہیں سکھائی ہے حرامزادے!" یہ کہہ کر میں نے دائیں ہاتھ کا ایک تھپڑ اس آدمی کے منہ پر کچھ اس طرح مارا کہ اس کا نچلا جبڑا اوپر کے جبڑے سے ہٹ کر بائیں طرف نکل گیا اس کی شکل یوں بگڑ گئی جیسے وہ کوئی انسان نہیں بھوت پریت ہے اس کے گلے سے ایسی آوازیں نکلیں جیسے کتے کے زخرے میں ہڈی پھنس گئی ہو۔ اس کی حالت اس آدمی جیسی ہو گئی تھی جس پر اچانک لقوے کا حملہ ہوا ہو۔

دوسرا آدمی اس کی یہ حالت دیکھ کر سٹپٹا گیا اور وحشت زدہ ہو کر بولا۔ "اوئے صنوبر خان یہ کیا ہو گیا تجھے اوئے صنوبر خان!" مگر صنوبر خان تو شاید بے ہوش ہوتا جا رہا تھا۔ اس آدمی نے اس کا چہرہ ہاتھ میں لیا اور اس کے اپنی جگہ سے ہلے ہوئے جبڑے پر اس نے زوردار مکا مارا جس سے جبڑا فوراً ہی اپنی صحیح حالت میں آ گیا مگر آواز اس کی پھر بھی نہیں نکل رہی تھی۔ رنگ اس کا ہلدی ہو گیا تھا۔

"اوئے صنوبر خان! تو ٹھیک تو ہے نا میرے یار۔ اوئے بہن کے یار! یہ کیا کر دیا تو نے؟ تو جانتا نہیں ہے ہمیں۔" یہ کہہ کر اس نے تیزی سے اپنی ڈب میں سے پستول نکال لیا۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ ہاتھ سیدھا کرتا میں نے دائیں ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ کر جھٹکا جو دیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی کلائی کی ہڈی تڑاخ کر کے ٹوٹ گئی۔ پستول اس کے ہاتھ میں جھول کر نیچے گر گیا۔

"اُف میرے اللہ!" اس نے جو درد سے بلبلا کر چیخ ماری تو ڈرائیور نے فوراً گاڑی کو بریک لگائے اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس پر ایسی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ باید و شاید۔ میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"اوئے کسی ڈرائیور کے بچے! رک جا ورنہ گاڑی کو آگ لگا دوں گا چل ادھر۔" اگرچہ میں خود بھی گاڑی چلا سکتا تھا مگر میں خواہ مخواہ کسی جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

ڈرائیور نے میری آواز سنی تو اس نے ہاتھ اوپر اٹھائے اور پھر پاؤں پر لٹو کی طرح گھوم کر واپس آ گیا۔

"بیٹھ جا اندر بھوتنی کے بندر! اور بٹھا اپنی اس ماسی کو۔ ان پر مجھے خواہ مخواہ ہاتھ اٹھانا پڑا۔ چل اندر ـــــ" وہ لرزتا ہوا اپنی سیٹ پر بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے چل دیا۔ جس آدمی کی کلائی ٹوٹی تھی وہ درد سے بری طرح کراہ رہا تھا۔ صنوبر خان ابھی تک آنکھیں موندے پڑا تھا۔ سر اس کا سیٹ کی پشت پر ٹکا تھا اور جھول رہا تھا۔

"دکھا ادھر کیا ہو گیا ہے تجھے! بڑی تیز زبان چلا رہا تھا سور کا تخم۔" میں نے اس کی کلائی کہنی سے پکڑ کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ اندر سے ہڈی بالکل دو حصے ہو چکی تھی۔ خون بالکل بھی نہیں نکلا تھا۔ اس کی کھال سالم و ثابت تھی۔ میں نے کلائی کو ہاتھ لگا کر دیکھا تو درد سے وہ اتنا نڈھال ہوا کہ اس کے پسینے چھوٹ گئے۔

"دیکھ اوئے! ان کو سیدھا ہسپتال لے جانا سمجھا کہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے چوہدری صاحب! میں سیدھا ہسپتال لے جاؤں گا انہیں۔"

"ہاں! ان کو ان کے کئے کی سزا ملی ہے۔ میں عاجزی دکھا رہا تھا تو یہ سالے بکواس کرتے تھے۔ اب ان کو نصیحت ہو جائے گی آئندہ کے لئے کہ ہر ایک سے سینگ پھنسانا کتنا مہنگا پڑتا ہے۔"

"توبہ میری توبہ چوہدری جی! کوئی مہنگا ایسا مہنگا۔" ڈرائیور نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ رنگ اس کا بھی ہلکا پیلا ہو رہا تھا۔

"کہاں سے لایا ہے تو انہیں؟"

"بس جی وہ ادھر تلواڑہ گاؤں ہے نا ادھر۔ کل شام کو لے گئے تھے یہ مجھے۔ رات مجھے ایک حویلی میں سلا کر خود یہ پتہ نہیں کہاں چلے گئے تھے۔ صبح اذان کے وقت انہوں نے مجھے اٹھا لیا اور اب انہیں لے کر میں غوث پور جا رہا تھا۔"

"کتنے پیسے طے کئے تھے انہوں نے؟"

"تین سو روپے!"

"اور تو بھوتنی کا بلکٹرا چلا آیا ان کے ساتھ۔ ابے یہ تو شکل سے ہی ڈاکو لگتے ہیں مجھے۔"

"شک مجھے بھی پڑا تھا چوہدری جی! پر میں پھنس گیا تھا جی، کیا کرتا ـــــ میں تو مزدور آدمی ہوں جی جس نے جدھر کہا ادھر چلنا پڑتا ہے۔ سواری کا محتاج ہوں نا جی، پر یہ...... بڑا گندا دھندا ہے جی یہ ٹیکسی ڈرائیوری کا۔" اس نے اپنے پیشے کو گالی دی۔

"ذرا گاڑی روک! میں اس کی کلائی ذرا باندھ تو دوں یہ سالا بکرے کی طرح میں میں کر رہا ہے۔"

اس نے گاڑی روکی تو میں نے گاڑی کے اندر پڑی ایک لکڑی کی پٹی سی لے کر اس کی کلائی کے نیچے رکھی اور اپنے طور پر ہڈی کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر اس کی پگڑی سے کس کر باندھ دیا۔ وہ چیخا تو بہت مگر پھر بھی اس نے وہ پٹی بندھوا ہی لی۔ حالانکہ اس کی ہمت بھی

دگرگوں ہو رہی تھی۔ اور میں حیران تھا کہ وہ سالا اتنا لمبا چوڑا چھ فٹا اونچا جوان، بازو پر ایسی چینی کی بنی کلائی لئے پھرتا ہے جو ایک ہی جھٹکے میں تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔

اُدھر سے فارغ ہو کر میں پھر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ چند منٹ کے بعد میں نے ایک نظر پھر پیچھے ڈالی تو معلوم ہوا کہ اسے کچھ سکون سا محسوس ہونے لگا تھا اور وہ جو دم بدم اس کی حالت غیر ہوئی جا رہی تھی اس میں قدرے اعتدال آ گیا تھا البتہ وہ صنوبر خان ابھی تک بے ہوش تھا۔

گاڑی پھر آگے چل نکلی۔ اور جب ہم گجرات پہنچے تو اس وقت صبح کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ سورج سات بجے طلوع ہوتا تھا۔

میں نے شہر کی بڑی سڑک پر پہنچتے ہی گاڑی چھوڑ دی۔ ڈرائیور نے مجھے بڑے ادب سے سلام کیا اور ٹیکسی بھگاتا ہوا فوراً ہی میری نظروں سے غائب ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ انہیں سیدھا ہسپتال ہی لے جائے گا کیونکہ انہیں طبی امداد کی فوری ضرورت تھی۔

لاہور کے لئے مجھے ٹیکسی ڈھونڈنے میں دس پندرہ منٹ لگ گئے مگر کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ تھک ہار کر میں بسوں کے اڈے پر جا پہنچا وہاں ایک سُرمئی رنگ کی نئی چمکتی دمکتی ٹیکسی کار کھڑی تھی۔ اس کے ڈرائیور نے خود ہی مجھے آواز دی جسے غنیمت جان کر میں اس کے اندر جا بیٹھا: "چل یار! مجھے لاہور لے چل۔"

"سو روپیہ لگے گا چوہدری صاحب!"

"ٹھیک ہے میں تمہیں دے دوں گا مگر جلدی چل۔ کچہری کے وقت تک مجھے وہاں پہنچا دے۔"

وہ خوش ہو گیا بولا۔

"ابھی لو جی! میری گاڑی تو راکٹ ہے راکٹ۔ بیالیس ہزار میں خریدی ہے، میں نے دس دن ہوئے، بالکل برانڈ نیو ہے۔ شو روم سے نکلوائی ہے میں نے۔" یہ کہہ کر وہ جھومتا ہوا گاڑی کو اسٹارٹ کر کے لاہور کی طرف چل دیا۔

اب میں بالکل مطمئن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نئی کار کو دیکھ کر راستے میں کوئی مجھے روکنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ افسوس مجھے اپنی حالت پر بہت تھا کہ میں اب اس قابل ہی نہ رہا تھا کہ منہ کھول کر سڑک پر چل سکوں۔ مجھے اپنے سائے سے بھی دہشت ہوتی تھی۔

وہ بہت آرام دہ گاڑی تھی۔ جھٹکا تو اس کا بالکل نہیں لگتا تھا۔ میں اس کی پچھلی سیٹ پر کمبل کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر بیٹھ گیا۔ اور سگریٹ سلگا کر اپنے مصائب و مسائل کی پٹک کھول کر اس کے افق کی سیاہی کا اندازہ کرنے لگا۔ سارے ہی افق سیاہ ہو رہے تھے روشنی کا دور دور تک کہیں کوئی نشان نہیں ملتا تھا ہاں اگر کہیں روشنی نظر آتی تھی تو وہ تھی جھونپڑی اس بابا کی جس

سے میں اس کا نام بھی نہیں پوچھ سکا تھا۔ اس بات کا مجھے بے حد افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اس بزرگ کا نام تک بھی معلوم نہ کیا جس نے مجھ پر اپنی محبتوں کی بارش برسا دی تھی۔

میرا ذہن چلتے چلتے ایک نکتے پر پہنچ کر رک گیا۔ مجھے بابا کی وہ نشانی یاد آ گئی جو اس نے میری کلائی پر مُہر کی صورت میں ثبت کر دی تھی۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ میری ضرب میں اتنی بے پناہ قوت کہاں سے آ گئی ہے کہ میں نے ایک تھپڑ اس صنوبر خان کے منہ پر مارا اور اس کا نچلا جبڑا اپنی جگہ چھوڑ کر دوسری طرف مڑ گیا اور جب میں نے اس کے ساتھی کی کلائی کو جھٹکا دیا تو وہ دو ٹکڑے ہو گئی۔ یہ اتنی ساری طاقت میری کلائی میں پہلے تو ہرگز نہیں تھی۔ میں کسی کی گردن پوری قوت سے مسلتا تھا تب کہیں جا کر میری آسامی بے ہوش ہوتی تھی۔ مگر اب تو یہ بم شے بن گئی تھی۔ میں سمجھا یہ میرا وہم ہے۔ ان سالوں کو میں نے یونہی بے خبری میں توڑ موڑ کر رکھ دیا تھا۔ اگر وہ سیدھی طرح اڑتے اور جذبے سے جم کر میری مزاحمت کرتے تو یوں نقصان نہ اٹھاتے۔ یوں میرے خیال میں تو کوئی پہلوان بھی صراحی جیسی ہلکی شے کو اٹھائے تو اس کی بھی کلائی میں موچ آ سکتی ہے۔ یہ قطعاً میرے ہاتھ اور کلائی کی قوت کا اعجاز نہیں تھا بلکہ وہ یونہی ڈھیلے بدن اپنی ہڈیاں تڑوا بیٹھے تھے۔

وزیر آباد سے گزرتے وقت میں نے ڈرائیور سے کہہ کر اخبار لیا تو اس کی بڑی بڑی سرخیاں پڑھ کر میرے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اخبار میں چوہدری ہادی علی کے قتل کی خبر شہ سرخیوں میں چھاپی گئی تھی مُردہ حالت میں اس کی تصویر بھی اتاری گئی تھی انہوں نے لکھا تھا کہ بلادر کی مسجد کے صحن میں کھڑے نامعلوم قاتل نے اس وقت چوہدری صاحب پر گولیاں چلائیں جب وہ گاؤں کے مزارعوں سے بات چیت کر رہے تھے۔ اس وقت اتفاقاً پولیس بھی کسی معاملے کی تفتیش کے لئے موجود تھی۔ پولیس کا ایک اور دستہ اس وقت اکبر کوٹ میں کسی ڈاکو کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ نامعلوم قاتل نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر چوہدری صاحب پر حملہ کیا جو اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ چوہدری صاحب موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ اس نے اسٹین گن کے فائر سے گاؤں کے مزارعوں کو بھی قتل کر دیا۔ ایک آدمی اس کی گولی سے سخت زخمی ہو گیا۔ قاتل نے پولیس کے آدمیوں سے ہتھیار رکھوائے اور چوہدری صاحب کی گھوڑی پر سوار ہو کر بھاگ نکلا۔ عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ قاتل نے اپنا منہ پگڑی کے پلّے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس لئے اس کو کوئی بھی پہچان نہیں سکا۔ پولیس نے اس کا پیچھا کیا تو اس نے جوابی فائرنگ کر کے ایک سب انسپکٹر کو گنے کے کھیت میں ہلاک کر دیا۔ قاتل کے پاس بے آواز چلنے والا پستول بھی موجود تھا۔ اس کی تلاش میں پولیس نے سارے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ امید ہے کہ وہ

جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔ غالب قیاس یہ ہے کہ اسے گاؤں کے کسی آدمی نے اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے یا وہ جنگل میں روپوش ہو چکا ہے۔

خبر کی تفصیلات خاصی سنسنی خیز تھیں۔ خبر کا بقیہ پچھلے صفحے پر درج تھا جس میں رپورٹر نے بڑے دکھ کے ساتھ عوام کو یاد دلایا تھا کہ تین دن پہلے ایک قاتل اپنے مقتول کی لاش ریلوے کے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں چھوڑ کر گوجرانوالہ اسٹیشن سے اس وقت فرار ہو گیا تھا جب پولیس اسے گرفتار کرنے کے لئے اس ڈبے کو کھلوا رہی تھی۔ اس نے ڈبے کو اندر سے مقفل کر رکھا تھا۔ ڈبے میں موجود ایک معزز شہری نثار احمد کو وہ ادھ موا کر کے چھوڑ گیا تھا اور اس نے اس کے کپڑے بھی اتروا کر گاڑی سے باہر پھینک دیئے تھے اس نے آگے چل کر یہ بھی لکھا تھا کہ صوبے میں امن و امان کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی ہے اور پولیس بظاہر بے بس نظر آتی ہے کیونکہ صندوق میں بند سر بریدہ لاش کے قاتل کو بھی پولیس ابھی تک گرفتار نہیں کر سکی ہے۔

جی ہی جی میں میں اس اخبار والے کو کوس رہا تھا۔ اس نے میرے خلاف لمبی چوڑی بکواس لکھی تھی۔ عینی شاہدوں اور ہادی علی کے مزارعوں سے پوچھ پوچھ کر اس نے میرا حلیہ درج کیا تھا میرے کمبل کی رنگت تک اس نے لوگوں کو بتا دی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ لوگ سالے ہر کالے کمبل والے کو روک کر پوچھیں کہ میاں کہیں ہادی علی کو تو تُو نے قتل نہیں کیا تھا۔ یہی مطلب تھا اس کا۔

ہنسی مجھے اس بات پر آ رہی تھی کہ اس سالے نثار جیب تراش نے میرے سارے خدشوں کی تصدیق کر دی تھی۔ اس نے مظلوم بن کر پولیس کو یہی بتایا تھا کہ وہ ٹرنک میں نے گاڑی میں رکھوائے تھے۔ جن میں کسی بدنصیب کی لاش کے ٹکڑے بند تھے۔ خود وہ پولیس کے سامنے معزز شہری بن بیٹھا تھا۔ گپ تو وہ بلاشبہ بہت شاندار قسم کی ملاتا تھا ایسی کہ سننے والا ایک دفعہ تو ششدر ہو کر رہ جاتا تھا۔ وہ جیب کترا اسی قسم کی لن ترانیوں سے کام لے کر اپنے کھب چھڑا گیا ہو گا۔

کار کا ڈرائیور کوئی بہت ہی بھلا آدمی تھا اس نے راستے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور میں بڑے اطمینان کے ساتھ سفر کرتا رہا۔ اس نے ٹھیک نو بجے مجھے لاہور پہنچا دیا اور میں اسے سیدھا آہو صاحب کے دروازے پر لے گیا۔

"لے بھائی سو کے بجائے میں تجھے ایک سو بیس روپے دیتا ہوں بڑی مہربانی تیری۔" میں نے رقم اس کے ہاتھ پر رکھی تو وہ خوش ہو گیا۔ بولا۔

"آپ کا بہت شکریہ صاحب جی بڑی مہربانی۔" یہ کہہ کر اس نے گاڑی کا رُخ بدلا اور انہی قدموں واپس چلا گیا۔ اخبار میں نے

تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا تھا۔

جب میں نے آہو صاحب کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے مجھے نالہ و شیون کی صدائیں سنائی دیں۔ کوئی عورت اوپر کی منزل میں بیٹھی بین کر رہی تھی۔

میں نے دستک پر شدت سے اصرار کیا تو کسی نے دوسری طرف صحن میں تیز تیز قدم چل کر دروازے کو کھولا۔ میرے سامنے کبری کھڑا تھا مگر اس حال میں کہ اس کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے۔

وہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا جیسے اس کی آنکھیں اس کے ذہن تک کوئی تصویر منعکس نہیں کر رہی ہیں۔

"کیا حال ہے کبری بچے! یہ تو بھونقوں کی طرح میرا منہ کیا تک رہا ہے۔ پہچانا نہیں مجھے۔ ابے میں......"

"سلام علیکم استاد معاف کرنا۔ میں دراصل کچھ پریشان ہوں۔ آؤ اندر آ جاؤ۔"

"ابے پریشانی کیسی ہے تجھے! یہ اوپر کون رو رہا ہے۔ خیر تو ہے۔"

"وہ استاد! مالکن ہیں میری، سرداری خانم! ان کے والد مر گئے ہیں کسی نے انہیں قتل کر دیا ہے۔"

"کیا کہتے ہو یار! کس نے قتل کر دیا ہے انہیں۔ کہاں قتل ہوئے ہیں وہ؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر صحن میں قدم دھرتے ہوئے کہا۔

"اندر چل کر بیٹھو! میں ابھی بتاتا ہوں۔ بڑا لمبا چوڑا فساد پڑ گیا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہو جائے۔" یہ کہہ کر اس نے میرے لئے کمرے کا دروازہ کھولا اور میرے ساتھ ہی اندر پہنچ کر بولا۔

"تم بیٹھو استاد! دو گھڑی آرام کرو۔ میں تمہارے لئے چائے پانی کا بھی بندوبست کرتا ہوں۔ مالکن بہت پریشان ہیں، پچھاڑیں کھا رہی ہیں۔ میں ابھی آ جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکلا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے صحن میں چلا گیا۔

اس کبری سالے نے ہمیشہ ہر بات کو ڈرامہ بنا کر مجھے حواس باختہ کیا تھا اور اب بھی وہ اُلّو کا کان یہی کچھ کر رہا تھا۔ میں نے اسٹین گن سامنے کی الماری کے سب سے نچلے خانے میں چھپا کر رکھی اور جوتے اتار کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ لحاف وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے کمبل اپنے گرد اچھی طرح لپیٹا اور سگریٹ سلگا کر دھوئیں کے مرغولے بنانے لگا۔ میرے سالے بدن پر عجیب طرح کی تھکن طاری تھی۔ میں اپنے منصوبے میں پوری طرح کامیاب ہو کر لوٹا تھا مگر اس بدمعاش کبری نے مجھے نروس کر دیا تھا۔ اس نے یہ تک پوچھنے ... کا موقع نہ دیا تھا کہ آہو صاحب کہاں ہیں اور کیسے ہیں۔ سالا مالکن سے کہیں زیادہ پریشان لگ

رہا تھا۔ کوئی پوچھے کہ اس سروری کا تو خیر باپ مرا ہے مگر تیرا کون مر گیا ہے۔ تو کیوں یوں ٹسوے بہاتا پھر رہا ہے ــــ تیرے لیں ناٹک کے تجھے کتنے پیسے دے گی تیری مالکن سروری بیگم۔

دوسری منزل میں شاید کچھ اور عورتیں بھی آ گئی تھیں۔ نالہ و شیون کی صدائیں اور زیادہ گمبھیر ہو گئی تھیں ــــ تیری قسمت ہی پھسڈی ہے جیلانی! تو جہاں گیا ایسے ہی حالات سے دوچار ہوا۔ اب بھلا اس کے مرنے کی خبر کے اس وقت وہاں پہنچانے کی کیا تک تھی بھلا۔ ظاہر ہے کہ وہ کہیں کل دن کو قتل ہوا ہو گا۔ بھئی تم ان کو اسی وقت خبر پہنچا دیتے تا کہ وہ رو دھو کر رات کو دو گھڑی آرام تو کر لیتے۔ اب صبح اس خبر کو وہاں پہنچا کر تم نے جو سارے گھر کو بے آرام اور.... بے چین کیا ہے تو اس سے تمہیں کیا حاصل ہوا؟ میں نے اٹھ کر وہاں غسل خانے میں منہ ہاتھ دھویا اور پھر پلنگ پر جا کر لیٹ گیا۔ کبری کسی طرح آ ہی نہیں رہا تھا۔

میں سخت پیچ و تاب میں تھا۔ مجھے ہر شے الٹ ہوتی نظر آ رہی تھی۔ میں آہو صاحب سے ان کے وعدے کے مطابق آسیہ کی رہائی مانگنے آیا تھا اور وہاں صفِ ماتم بچھی نظر آ رہی تھی۔

کبری کوئی آدھ گھنٹے بعد واپس آیا۔ سالا پہلے سے بھی زیادہ پریشان لگ رہا تھا۔ اپنے ساتھ وہ میرے لئے ناشتہ بھی لیتا آیا تھا ــــ آتے ہی بولا۔

"استاد! یہ لے تو چائے تو پی۔ گھر میں تو کسی کو کسی بات کا ہوش ہی نہیں ہے۔"

"ابے کبری! یہ تو منہ زنخا کیسے ہو گیا ہے۔ عورتوں کی طرح رو رہا ہے۔ دیکھ تو تیری آنکھیں کتنی سوجی ہوئی ہیں؟"

"بات ہی ایسی ہے استاد! وہ اپنی سروری خانم ہیں نا، میری مالکن، ان کے باپ کو کسی نے گولی مار دی ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا۔ آدمی تو مرتے ہی رہتے ہیں۔ تو اس کے نطفے سے تو نہیں ہے؟"

"مذاق نہ کر استاد! وہ بہت بڑا آدمی تھا میری مالکن کا باپ۔ گجرات ضلعے کا سب سے بڑا رئیس تھا وہ۔"

"کیا؟ ضلع گجرات کا۔ تیرا کیا مطلب ہے کبری؟"

"ہاں ہاں! اس قتل کے تو اخبار چھپ گئے ہیں۔ چوہدری ہادی علی کا نام تو تم نے بھی سنا ہو گا؟"

چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں لرز کر رہ گئی۔ "یہ کیا کہتے ہو تم! وہ ہادی علی جس کی تصویر آج کے اخبار میں چھپی ہے۔" میرے دل میں ٹیس سی اٹھنے لگی تھی۔ سارا کمرہ مجھے اپنی نگاہوں کے سامنے گھومتا نظر آتا تھا۔

"ہاں ہاں! اسی کی تو بات کر رہا ہوں استاد! وہ آہو صاحب کا خسر تھا۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ اس آہو نے...... یہ اس کا داماد ہوتا ہے۔" میں نے اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ حیرت کا پہاڑ ریلا میرے وجود پر سے گزر چکا تھا۔

"ہاں! اسی لئے تو وہ بھی صبح سے پریشان ہیں۔ ہاکر اخبار دے کر گیا تو میں نے پڑھا نہیں، بس اوپر لے جا کر وہ آہو صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ ان کی نظر جونہی اخبار کے پہلے صفحے پر پڑی ان کا خون ہی خشک ہو گیا۔ بستر سے یوں اچھلے جیسے انہیں خود گولی لگ گئی ہو۔"

"حالانکہ اس خبیث کو خوش ہونا چاہئے تھا۔" میں نے دل میں کہا۔ اپنے چہرے پر پھیلتی حیرت کو میں نے دبا لیا تھا۔

"کیا کہتے ہو استاد! ایسی کمینگی کی بات تو نہ کرو۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سیاسی قتل ہے۔"

"ابے نہیں! خواہ مخواہ دماغ پچی مت کر۔ لے سگریٹ پی اور بھول جا اس قصے کو۔ آہو کہاں ہے اس وقت؟"

"وہ تو اخبار سروری بیگم کے آگے رکھ کر اسی وقت کہیں نکل گئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ان کا فون آیا تھا کہ وہ آدھ گھنٹے تک آئیں گے اور گاڑی میں گجرات چل دیں گے۔"

"اچھا! وہ آئیں تو انہیں میرا سلام بولو۔ کہو میں حاضر ہو گیا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے ناشتے پر جلدی جلدی ہاتھ صاف کیا اور پھر کمبل لپیٹ کر سگریٹ پھونکنے لگا۔ کبری برتن اٹھا کر باہر نکل گیا۔ میں نے اسے پھر تاکید کی کہ جیسے ہی آہو آئے اس سے میری ملاقات کرا دے۔ میرے دل سے اس آدمی کی عزت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی تھی۔ وہ ایسا عیار آدمی تھا کہ اس نے ایک تیر سے دو نہیں کئی شکار مار گرائے تھے۔ اس کی منصوبہ بندی کی جتنی بھی داد دیتا کم ہوتی۔ وہ بہت ہی کائیاں آدمی ثابت ہوا تھا مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اس نے اپنے ہی رشتے کو کیوں بالائے طاق رکھ دیا۔ وہ صرف بڑے صاحب کو خوش کرنے کے لئے اس آدمی کو ٹھکانے لگوا دینے پر آمادہ نہ ہو سکتا تھا۔ یقیناً اس کے مقاصد کہیں زیادہ گہرے اور وسیع تر ہوں گے۔ کسی بڑے فائدے کی امید نے اسے یہ کام کرنے پر آمادہ کیا ہو گا ورنہ وہ ایسا خوفناک فیصلہ کبھی نہ کرتا۔

میرے دماغ کی اس وقت جو حالت ہو رہی تھی اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجھے اپنے وہ خواب یاد آ رہے تھے جن میں مسند آرا نے مجھ سے روتے بلکتے بار بار یہ کہا تھا کہ میں گولی نہ چلاؤں۔ تو وہ ہادی علی تھا مسند آرا کا باپ جس کے قتل کی اسے پہلے سے بشارت مل گئی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ہادی علی میرے ہی ہاتھوں قتل ہو گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یوں عالمِ خواب میں مجھے کیوں بار بار جھنجھوڑتی۔ میرا برا ہو، میں نے ان دونوں خوابوں کو کوئی اہمیت ہی نہ دی تھی۔ میں سمجھا تھا کہ وہ محض میری محبت میں غلطاں ہونے کی وجہ سے مجھے اس راہ پر چلنے سے روک رہی ہے ورنہ اس کا ذاتی مفاد اس میں کوئی نہیں تھا۔ وہ مجھے کسی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لینے کے بعد کی اذیتوں سے بچانے کے لیے ہی یہ سب کچھ کر رہی ہے۔ میں تو خدا کی قسم یہی سمجھتا رہا تھا۔ اس کی نادیدہ محبت میرے لیے نعمتِ غیر مترقبہ تھی مگر یہ معلوم نہیں تھا وہ میرے ہی ہاتھوں یتیمی کے صحرا میں جا گرے گی۔ میں ہی اس کی تمام تر تباہیوں کا سبب بن جاؤں گا۔ یہ سب کچھ میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ حالات جو رخ اختیار کر گئے تھے وہ ایسے تھے کہ میں مسند آرا کی محبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکا تھا۔ عین ممکن ہے اسے یہ بھی معلوم ہو چکا ہو کہ میں اس وقت آہو کے گھر میں موجود ہوں۔ اس بات کے امکان کو کسی طرح بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی اسی مستقبل بینی کی بے مثال قوت سے سارے حالات معلوم کر کے پولیس کو میرے پیچھے بھیج دے۔ میں نے اس کے باپ کو مار دیا تھا۔ بلا وجہ بے قصور اور بے سبب وہ بھلا مجھے کیسے معاف کر دے گی۔ مجھے یہ احساس ڈسنے لگا تھا کہ میں سارے جہاں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بچ سکتا ہوں مگر مسند آراء کو خدا نے جو آئینہ سا صاف شفاف ذہن عطا کیا تھا۔ اس کی رسائی مجھ تک کسی طرح بھی روکی نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے چاہا کہ میں آہو کے مکان سے اٹھ کر کسی اور طرف نکل جاؤں مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں نے جو اتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے ایک آدمی کی زندگی سے یوں بے دریغ کھیل گیا ہوں تو میری یہ ساری محنت رائیگاں تو نہیں جانی چاہیے۔ میرے پاس آہو کی تحریریں موجود ہیں۔ مجھ سے اس نے آسیہ کی رہائی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ میں اب اس کی گردن پہ انگوٹھا رکھ کر بھی آسیہ کو اس سے مانگ سکتا ہوں۔ وہ انکار کر ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا تو پھر خدا ہی جانتا ہے کہ اس کا کیا حشر ہو گا۔ میں... میں تو اس کے مکان کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ اس کی چھتیں سروری خانم کو وہاں سے اٹھا کر ٹبی میں بٹھا دوں گا۔ پتہ نہیں میں کیا کر دوں۔ آہو کے بارے میں جو کچھ مجھے کبری نے بتایا تھا وہ بلاشبہ بہت ہی اذیت ناک تھا۔ میں مسند آرا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شرمندہ ہو گیا تھا۔ میرے پاس اپنے اس فعل کا کوئی جواز تھا ہی نہیں نا ــــ کتنی ہی دیر تک میں پلنگ پر بیٹھا اپنے آپ سے الجھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ زندگی نے مجھے زبردست مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ ہادی علی اگرچہ اسی قابل تھا کہ یونہی سرِ راہ بے سوچے سمجھے اس کا سر اتار لیا جاتا کہ وہ زمین کا بوجھ تھا۔ وہ ایسا مردم آزار تھا جس سے ایک خلقت بے زار تھی۔ اور جب میں نے اسے قتل کیا تھا تو میرا خدا گواہ ہے اس وقت میرے دل و دماغ میں اس کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو چکی تھی اور میں نے اس کے سینے میں جو گولی اتاری تھی، وہ ان دو مظلوموں کے نام کی تھی جن کی لاشیں میرے سامنے تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو رہی تھیں اور اتنے سارے مجبور و بے بس مزارع اس ہادی علی کے سامنے کھڑے لرز رہے تھے۔ میں نے اس گھڑی خدا جانتا ہے ہادی علی کو اپنے لیے یا اپنی آسیہ کے لیے نہیں مارا تھا میں قدرت کے خوفناک انتقام کی صورت اختیار کر چکا تھا اور اس پر اور پولیس والوں پر خدا کا قہر بن کر ٹوٹا تھا۔ میں نے بلاشبہ اپنے اعمال میں ایک نیکی لکھوائی تھی۔ ہادی علی کے خون میں کاتبِ تقدیر کا قلم ڈوبنے کے بعد جب ابھرا تھا تو مجھے یقین تھا کہ اس نے میرے نامۂ اعمال میں اچھے لفظوں میں میرا ذکر کیا ہو گا۔ میں اپنے اس فعل پر ہرگز نادم نہیں تھا۔ جو کچھ ہو چکا تھا وہ بہت اچھا تھا۔ اسے ہونا ہی چاہیے تھا اگر منہ کالا کسی کا ہوا تھا تو وہ آہو کا تھا اس دل شیر آہو کا جس نے اپنے ہی کسی مکروہ مقصد کے لیے مجھے استعمال کر لیا تھا اور اب میں لٹی پٹی حالت میں اس کے گھر کے اس کمرے میں اس امید پر بیٹھا تھا کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرنے آئے گا۔ مگر وہ نہیں آیا۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ دوسری منزل سے نالہ و شیون کی صدائیں بھی اب نہیں آ رہی تھیں مگر کبری نے مجھے اپنی شکل نہیں دکھائی۔

اس وقت دن کے بارہ بج رہے تھے کہ کبری تیز تیز قدم اٹھاتا اندر داخل ہوا۔ بولا۔

"استاد معاف کرنا مجھے ادھر آنے میں دیر ہو گئی۔ بھاگ دوڑ میں مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔"

"ہاں بیٹے! تجھے ہم کہاں یاد رہ سکتے تھے۔ ادھر تیرے مالک کے خسر کا جلوس جو نکل رہا ہے۔"

"بڑے سنگدل ہو استاد قسم اللہ کی جو کوئی بھی سنتا ہے دل تھام لیتا ہے مگر تم مذاق اڑا رہے ہو۔"

"تو مذاق کی کہہ رہا ہے، ابے میرا دل تو اس واقعے پر ہنسنے کو چاہتا ہے۔ وہ آہو کہاں ہے وہ چھپڑ قناطیا؟"

میرے منہ سے آہو کے بارے میں یہ لفظ سن کر وہ حیران رہ گیا۔ بولا۔

"اب آہو صاحب کو گالی بھی دے گا تو، بری بات ہے اوستاد، وہ تیری اتنی عزت کرتے ہیں۔"

"ابے یہ بتا وہ گیا کہاں ہے وہ چرفینہ۔ میں صبح سے اس کے انتظار میں ہلکان ہو رہا ہوں"۔ میں نے اب کی بار ذرا دبنگ لہجے میں کہا۔

"وہ گجرات چلے گئے ہیں، مالکن بھی ان کے ساتھ گئی ہیں جنازے میں شرکت کے لیے۔"

"اور کون گیا ہے ان کے ساتھ؟"

"کہہ کر گئے تھے کہ کالج سے وہ اپنی سالی کو بھی ساتھ لے کر جائیں گے۔"

"میرے بارے میں بتایا تھا تو نے انہیں؟"

"ہاں، انہوں نے کہا ہے کہ آپ ان کا انتظار کریں — انھیں وہاں دو تین دن لگ جائیں گے۔"

"اور گھر کس کے سپرد کر گئے ہیں وہ۔"

"گھر کی دیکھ بھال میں کروں گا۔ اور کون ہو گا یہاں۔ وہ ساری ذمے داری مجھے دے گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بیٹے۔ جا پھر کھانا لے آ مجھے بڑی سخت بھوک لگ رہی ہے اور دیکھ ادھر ایک لحاف بھی ڈال دے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے اوستاد، میں ابھی لحاف لا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ جانے لگا تو میں نے اسے ٹھہرا لیا۔

"یہ بتا اس مجیدن کا کیا حال ہے اس سے ملا تھا پھر تو کہ نہیں؟"

"ہاں میں کل گیا تھا ادھر۔ اس بڑھیا نے مکان خرید لیا ہے اور اب وہ بہت خوش ہیں وہ دونوں ماں بیٹی۔"

"کب ہو رہی ہے مجیدن کی شادی؟"

"اگلے مہینے کی اکیس تاریخ مقرر کر لی ہے انہوں نے۔"

"ٹھیک ہے ہم دونوں چلیں گے اس کی شادی میں۔ مجھے خوشی ہو گی۔ وہ بہت ہی بے آسرا لوگ ہیں۔"

"بے آسرا لوگوں سے تو ملک بھرا پڑا ہے اوستاد، بات کچھ اور ہی ہے جو تو ان پر اتنا مہربان ہے۔"

"وہ میری ماسی بن گئی ہے۔ جا کھانا تیار کر اور لحاف پہلے پہنچا دے ادھر۔ تجھے تو ہر بات میں گھپلا نظر آتا ہے چل نکل۔"

کبری نے میری بات پر برا سا منہ بنایا اور چپ چاپ باہر ہو گیا۔ میں کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کبری ٹھہر ٹھہر کر میری آنکھوں میں جھانکتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی خاص بات جانتا ہے اور میرے منہ سے اس کی تفصیل معلوم کرنا چاہتا ہے مگر میں کوشش کے باوجود نہ سمجھ سکا کہ وہ مجھ سے کیا سننا چاہتا ہے۔

کوئی ایک گھنٹے بعد وہ واپس آیا تو ٹرالی میں اس نے کھانا سجا رکھا تھا۔ میرے لیے اس روز اس نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ مرغ مسلم بریانی فرنی پلاؤ زردہ اور نہ جانے کیا کیا الم غلم وہ اٹھا لایا تھا۔

"ابے یہ اتنی ساری چیزیں تیرا باپ کھائے گا۔ خواہ مخواہ حاتم طائی کا بھتیجا بن بیٹھا ہے۔"

"عیش کرو اوستاد! آہو صاحب مجھے کہہ گئے ہیں کہ میں تیرا بہت خیال رکھوں پتہ نہیں کیا سنگھا یا ہے تو نے انہیں؟"

"آہو؟ وہ آہو وہی جو تمہارا مالک ہے، اچھا آدمی ہے کیا خیال ہے تیرا۔ اس نے کوئی قتل شتل بھی کیا ہے کبھی کوئی؟"

"دفع کر یار! اندر سے سب ایسے ہی ہوتے ہیں — میں نے تمھیں بتایا تو تھا کہ وہ کس کینڈے کا آدمی ہے۔ تو کھانا کھا میں تیرے لیے لحاف بھی لے آؤں۔"

میری بھوک اس گھڑی بہت چمک رہی تھی۔ میں نے تمام چیزوں پر دل کھول کر توجہ دی۔ جب میں نے فرنی کی پلیٹ اٹھائی تو اس گھڑی کبری اندر داخل ہوا۔

بولا "بے بھائی میں یہ لحاف لے آیا ہوں تیرے لیے۔ ارے یہ فرنی کیوں نہیں کھا رہا ہے تو اوستاد، یہ میں نے خاص طور پر بنائی ہے تیرے لیے۔"

"ابے گھامڑ! یہ دیکھ اس میں تو مکھی بنی پڑی ہے" میں نے بدمزہ ہو کر وہ پلیٹ الگ رکھ دی۔ اس میں ایک مکھی صاف نظر آ رہی تھی۔

"اچھا؟ کمال ہے دفع کر لعنت بھیج اس پر میں اور لا دیتا ہوں تجھے۔" یہ کہہ کر وہ پلیٹ اٹھا کے الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک اور پلیٹ تھی جس میں فرنی بھری تھی اس نے یہ اہتمام کیا تھا کہ اس پر چاندی کے ورق بھی لگا لایا تھا۔ وہ فرنی میں نے بڑی رغبت سے کھائی۔ کبری اچھا باورچی تھا اور اس نے وہ تمام کھانے بڑی محنت سے تیار کیے تھے۔

میں کھانے سے فارغ ہوا تو وہ برتن سمیٹ کر باہر نکل گیا۔ میں نے کلی کی ہاتھ دھوئے اور ہر طرف سے مطمئن ہو کر

میں لیٹ گیا۔ مگر جب میں نے سگریٹ سلگایا تو مجھے محسوس ہوا کہ سگریٹ اپنی ساری لذت کھو چکا ہے میرے منہ کا ذائقہ بدلا ہوا تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میں ابھی قے کر دوں گا۔ میرا جی متلانے لگا تھا۔ میں نے سگریٹ الگ پھینکی اور بھاگ کر غسل خانے میں جا گھسا۔ مجھے ابکائیاں سی آ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ میرے معدے میں ایسی جلن ابھرنے لگی تھی کہ اس کا تجربہ مجھے اس سے پہلے زندگی بھر کبھی نہیں ہوا تھا۔

یہ بڑی خوفناک بات تھی میرا سر بھی چکرانے لگا تھا۔ اچانک مجھے قے ہو گئی اور یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ اس میں خون بھی تھا میرے معدے میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ تب مجھے یہ احساس ہوا کہ مجھے کبری نے زہر دے دیا ہے۔ یہ خیال میرے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا اور میں پاگلوں کی طرح کوٹ پہن کر کمبل بدن پر لپیٹ کر باہر صحن میں نکل گیا۔

گیٹ سے ذرا ادھر مجھے باٹی نظر آ گیا۔

"میرے ساتھ آ باٹی جلدی کر مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چل جلدی کر۔" میں نے اسے اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے کہا۔ وہ حیرت زدہ سا ہو کر میرے ساتھ گیٹ تک پہنچا تو مجھے ایک اور قے ہو گئی۔ اب کی بار جو کچھ میں نے کھایا پیا تھا سب باہر نکل گیا مگر اس میں خون آ رہا تھا میرا بدن ٹوٹنے لگا۔ نقاہت کا احساس بھی مجھے ڈسنے لگا تھا۔ اس نے بڑے گیٹ کو مقفل کیا اور مجھے سنبھالنے لگا۔

"ٹیکسی پکڑ باٹی جلدی کر۔" میری یہ بات سن کر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور فوراً ہی ایک ٹیکسی روک کر میری طرف لپکا۔ اس نے مجھے بڑی احتیاط سے سنبھالا اور ٹیکسی میں ڈال کر وہ میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"چل بھائی ڈاکٹر باری کے پاس لے چل، مگر جلدی کر۔" باٹی نے تیزی سے کہا۔ وہ بھی سخت گھبرا گیا تھا۔ ٹیکسی نے ہمیں تین ہی منٹ میں ڈاکٹر باری کی دکان پر پہنچا دیا۔ وہ اپنا کام ختم کر کے باہر نکل ہی رہا تھا کہ باٹی نے اسے روک لیا۔

"ڈاکٹر صاحب ان کو دیکھیں ان کا بیڑہ غرق ہو رہا ہے۔" ڈاکٹر کا اونہہ میرے چہرے پر نظر ڈال کر مطب میں جب بیٹھا، اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور بولا۔

"کیا ہوا ہے آپ کو؟"

"مجھے... مجھے شاید زہر دیا گیا ہے مگر مجھے پتہ نہیں وہ کون تھا۔"

"پولیس کیس؟" وہ ذرا پیچھے ہٹا۔

"پولیس پر لعنت بھیج ڈاکٹر۔ یہ میری زندگی کا سوال ہے میرا علاج کرو۔" یہ لو۔ میں نے جیب سے پانچ سو روپے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔ نوٹ دیکھ کر اس کا رویہ فوراً ہی بدل گیا وہ مجھے نرس کی مدد سے کلینک کے پچھلے حصے میں لے گیا۔ اس نے مجھے یکے بعد دیگرے کئی ٹیکے لگائے۔ مجھے قے کے لیے دوا دی۔ جس سے میرا معدہ بالکل صاف ہو گیا۔ میں وہاں شام تک لیٹا رہا۔ یہ سارا عرصہ بیچارا باٹی باہر ہی بیٹھا میرا انتظار کرتا رہا۔ اسے مجھ سے دلی ہمدردی تھی۔ بار بار اندر آ کر مجھ سے میرا حال پوچھتا رہا۔ اس کا میں شکرگزار ہوں کہ اس نے اتنی توجہ سے اس روز میری دیکھ بھال کی۔ ڈاکٹر بیچارا بھی اس روز دوپہر کے کھانے کے لیے گھر نہیں گیا۔ آہو کا نام سن کر وہ اور مروت سے پیش آیا۔ باٹی نے اسے بتا دیا ہو گا کہ میں آہو کا مہمان ہوں۔ وہ گھر پر نہیں ہے اور اس کی غیر حاضری میں یہ سب کچھ ہوا ہے۔

ڈاکٹر باری کا کلینک دن رات کھلا رہتا تھا۔ رات کو نو بجے تک میری طبیعت بڑی حد تک سنبھل چکی تھی مگر کمزوری اتنی بڑھ گئی تھی کہ میں وہاں سے اٹھ کر اپنے قدموں پہ واپس نہیں جا سکتا تھا۔ نو بجے گھر جانے سے پہلے اس نے مجھے آخری بار دیکھا اور پھر وہ اپنے ماتحت ڈاکٹر کو ضروری ہدایات دے کر اپنے گھر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد باٹی میرے پاس آ بیٹھا بولا۔

"یہ زہر آپ کو کس نے دیا ہے جناب صاحب ادھر کیا کھایا تھا آپ نے؟"

"پتہ نہیں کیا ہوا ہے بابا۔ بس وہ کبری نے مجھے جو کھانا دیا اس میں کوئی گڑبڑ تھی۔ اور تو کوئی چیز میں نے نہیں کھائی۔"

"کبری؟" باٹی نے یہ نام منہ میں دو تین بار دہرایا۔ بولا "وہ... بدبخت تو مجھے یہ کہہ کر گجرات چلا گیا ہے کہ اسے آہو صاحب نے ایک کام بتایا تھا جس کے لیے وہ ان سے ملنے جا رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔ بہر حال اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے بابا جی۔ میں بچ گیا ہوں۔ دوبارہ کوئی یہ ہاتھ نہیں دکھا سکے گا۔" میں نے بڑے پرعزم لہجے میں کہا۔

باٹی دس بجے تک میرے پاس بیٹھا رہا۔ اور پھر یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا کہ گھر میں اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے اس لیے اس کا وہاں ہونا بہت ضروری ہے۔

صبح تک میری طبیعت بہت بہتر ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر اس روز سات ہی بجے مطب میں آ گیا۔ آتے ہی اس نے میرا معائنہ کیا اور بولا۔

"آپ معجزانہ طور پہ بچ گئے ہیں مسٹر جیلانی، ورنہ وہ زہر بہت ہی خطرناک تھا۔ ذرا بھی دیر ہو چکی ہوتی تو آپ کا قصہ پاک تھا۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں ڈاکٹر۔ آپ نے بڑی توجہ دی ہے مجھ پر۔"

"یہ میرا فرض تھا اور پھر آپ کی فیس۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ بچ گئے ہیں۔ آپ کو پانچ سو روپیہ اور دینا ہوگا۔"

اس کی یہ بات سن کر میں مسکرا دیا۔ وہ اپنے مطلب کی بات کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اچھی طرح میری کھال ادھیڑ لے۔ میری جیب میں اس نے ڈھیر سارے نوٹ دیکھ لیے تھے۔

"پانچ سو کی کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب۔ یہ لو میں تمہیں ایک ہزار روپیہ دیتا ہوں۔ تم اچھے آدمی ہو یہ لو۔" یہ کہہ کر میں نے اس کی ہتھیلی پہ سو سو کے دس نوٹ گن کر رکھ دیئے۔

"اور بھی دوں؟"

"نہیں نہیں! میں نے صرف پانچ سو مانگے تھے۔"

"اپنی زندگی سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں ہوتی ہے ڈاکٹر۔ میری بے تکلفی کو معاف کر دو۔ مجھے تم اچھے لگتے ہو مسیحائی کرتے ہو۔" یہ کہہ کر میں اس کے پلنگ سے اٹھ بیٹھا۔

"اب اجازت ہے مجھے۔"

"ہاں مگر بہت محتاط رہنا۔ یہ تمہارے کسی دوست نما دشمن کا کارنامہ تھا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ پتہ نہیں میرے ہاتھ سے کس کی موت آئی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے جوتے پہنے۔ تکیے کی طرف رکھا کوٹ بانہوں میں پھنسایا اور کمبل اوڑھ کر باہر نکل آیا۔۔۔ میری تمام چیزیں میری جیبوں میں محفوظ تھیں۔ کلینک میں کسی نے مجھ سے کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ حیرت اسے یہ تھی کہ میں نے اسے اپنے دشمن کا نام پتہ نہیں بتایا تھا اور جس آدمی کے گھر میں ٹھہرا تھا اس کے کردار سے بھی شاید وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے مطلب میں میرے قیام کے دوران آہو کا جس لہجے میں ذکر کیا تھا اس میں مجھے گہرے طنز کا رنگ کھلا نظر آتا تھا۔

میں جب دوبارہ آہو کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ کبری ابھی تک وہاں سے غائب ہے۔ بیچارے بانی نے میری بہت آؤ بھگت کی۔ بڑا خیال رکھا اس نے میرا۔ ضرورت کی ہر شے اس نے میرے کمرے میں پہنچا دی۔ میں چاہتا تو آہو کے گھر سے اٹھ کر کسی ہوٹل میں جا ٹھہرتا مگر اس میں مجھے سو خطرے نظر آتے تھے۔

بانی نے ٹھیک کہا تھا۔ کبری مجھ پہ اپنا ہاتھ آزما کر گجرات بھاگ گیا تھا اپنے گرو گھنشال کے پاس۔ میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ کبری نے مجھے آہو کے کہنے پہ ہی کھانے میں زہر ملا کر کھلا دیا تھا ورنہ کبری کو مجھ سے بھلا کیا کد ہو سکتی تھی۔

وہ تو بات بات پہ میرے سامنے کورنش بجا لاتا تھا۔ بہت ادب کرتا تھا وہ میرا اور مجھ سے بھی بات تو یہ ہے کہ میں نے اسے کبھی کوئی دکھ نہیں پہنچایا۔ مجھے اس کی تشکر سے بھری آنکھیں ابھی تک یاد تھیں جو مجھ سے پانچ ہزار روپے لے کر اس رات بھیگ گئی تھیں۔ ایسے آدمی سے کسی کور کسر کی امید رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا تھا وہ آہو کا کیا دھرا تھا۔ اب اس کے حساب کا وقت آ گیا تھا۔ اس نے مجھ سے اس آدمی کا سر کٹوا لیا تھا جسے وہ کسی نہ کسی طرح اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا۔ مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ مجھے صاحب کا نام اس نے بیچ میں خواہ مخواہ ٹھونس دیا تھا ورنہ وہ حقیقتاً اپنی ہی داڑھی کی جوئیں نکلوا رہا تھا۔ اس نے ہادی علی کو میرے ہاتھ سے مروا کر کوئی اپنا ہی ارمان نکالا تھا۔ اور اب وہ مجھے اپنی راہ سے ہٹانے پر تل گیا تھا۔ اس کا منصوبہ صاف سیدھا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ آدمی جس نے ہادی کو مارا ہے اگر خود بھی اس جہاں سے گزر جائے تو کوئی ایسا نہیں رہے گا جو کسی بھی موڑ پر یہ کہہ سکے کہ ہادی علی اسی کے ایما پر قتل ہوا تھا اس کے علاوہ میرے اتنی ہزار اس کے پاس پڑے تھے۔ پھر اس نے مجھے ایسی تحریر دے رکھی تھی جو اس بات کا دستاویزی ثبوت تھی کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی بہت ہی اہم سودا ہوا تھا۔ اور اب وہ مجھے لداؤ کی بھینٹ چڑھا رہا تھا اس طرح کہ میں جس کروٹ بھی بیٹھوں لڑھکتا ہوا نیچے جا گروں۔ اور نیچے جو گہرائی تھی وہ اتنی مہیب تھی کہ میری ہڈیاں تک ریزہ ریزہ بن سکتی تھیں۔

میں نے دل میں کہا آہو بیٹے تیرا پنجہ ایسے آدمی سے لڑا ہے جس نے ہر شے ہواؤں کے رحم و کرم پہ چھوڑ رکھی ہے جس کے جہاز کے سارے بادبان پہلے ہی جل چکے ہیں تو اس بدنصیب سے بھڑ کر خود بھی راکھ ہو جائے گا۔ تو نہیں جانتا کہ میں وہ پتھر ہوں جس پہ گھس کر ہر شے جل جاتی ہے اپنا وجود ہی کھو دیتی ہے۔ تو نے ایسے سوداگر کے ہاتھ اپنا مال بیچا ہے جس کے اونٹوں پر بدنصیبی لدی ہے تو کیا پائے گا مجھ سے۔ کچھ بھی نہیں جب تو حالات کے اس گرداب سے نکلے گا تو تجھ سے اپنی بھی شکل نہیں پہچانی جائے گی۔ دکھیارہ تو مایا پتر ہے تو میں مایا روپی ہوں۔ تیرا تو میں ستیاناس مار دوں گا۔ آہو سے سگ نہ بنا دیا تجھے تو سمجھنا مجھے میری ماں نے نہیں کتیا نے پالا ہے۔

وہ رات اور اگلا پورا دن تو میں نے آہو کے کمرے میں بیٹھے سلگتے گزار لیا مگر جب میں نے دیکھا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں لوٹا ہے تو میں نے شام کو وہ کمرہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں ان کے گھر میں ہوں وہ مجھ پر کسی بھی وقت کسی بھی طرف سے وار کر سکتے ہیں ایسے میں کسی لمحے لوٹتی بے خبری

میں لا جاؤں گا۔ اور وہ چپ چاپ گھر کے پچھلے آنگن میں میری لاش دفن کر دیں گے بے گور و کفن دبا دیں گے وہ مجھے اور قیامت تک کسی کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ وہ غلام جیلانی کیا ہوا جو پھانسی کی کوٹھڑی سے بھاگ نکلا تھا۔

میں نے سٹین گن نکال کر کمبل کے نیچے رکھ کر کندھے پر لٹکائی اور بانی سے یہ کہہ کر میں وہاں سے چل نکلا کہ میں چار دن بعد پھر آؤں گا۔

بانی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا جب سے وہ زہر خورانی کا واقعہ پیش آیا تھا وہ اپنی جگہ بہت پریشان تھا اور بس خیال سے ہی خوفزدہ تھا کہ وہاں کوئی ہنگامہ نہ اٹھ کھڑا ہو۔

میں نے آہو کے گھر سے نکل کر ریلوے لائن عبور کی اور اپنی یادداشت کے سہارے چلتا ہوا مجیدن کے گھر جا پہنچا۔ میں نے اس نحیف دروازے پر دستک دی تو چند ہی ثانیوں میں کسی نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے مجیدن کھڑی تھی۔ اس روز وہ بہت صاف ستھرے سے نئے گلابی رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھی اور اسی رنگ کا اس نے دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ بے ساختہ لہجے میں بولی۔

"بھائی جان آپ! آیئے آیئے اندر آیئے۔ اماں دیکھ تو، کون آیا ہے۔" وہ کلیلیں بھرتی ہوئی کوٹھری میں جا گھسی اور پھر اس کی آواز کی بازگشت صحن میں گونج ہی رہی تھی کہ تین بچے کمرے میں نکل آئے۔ ان کے پیچھے مجیدن کی ماں بھی دوپٹہ سنبھالتی ہوئی باہر آ گئی اور مجھے دیکھتے ہی بولی۔

"دھن بھاگ جو میرا پتر آیا۔ اری تیل چوا ادھر دہلیز پہ، تیرا بھائی آیا ہے تیرا اچھا ویر آیا ہے۔" اس کا چہرہ مجھے دیکھ کر تمتما اٹھا تھا۔ "اندر آ جا بیٹے۔ ادھر اندر آ جا۔" یہ کہہ کر وہ ایک طرف ہٹ گئی اور میں ان کی کوٹھڑی میں جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بچے مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی مہمان ان کے گھر آ گیا ہو۔ چند ہی دن پہلے اس گھر کی یہ حالت تھی کہ نہ چولہے میں آگ تھی، نہ گھڑے میں پانی مگر اس بڑھیا نے میرے دیئے ہوئے دس ہزار روپوں کو بڑے سلیقے سے استعمال کیا تھا۔ گھر کی صورت نکھری نکھری نظر آتی تھی۔ کوٹھری میں چار چارپائیاں پڑی تھیں جن پر صاف ستھری چادریں بچھی تھیں۔ ایک طرف چھوٹی سی تپائی پر چھوٹا سا ریڈیو دھرا تھا گھر میں چاروں طرف سفیدی ہو چکی تھی چند ہی دنوں میں ان لوگوں نے اپنے سارے دلدر دھو ڈالے تھے۔

"یہ گھر خرید لیا ہے تم نے کہ نہیں؟"

"خرید بھی لیا بیٹے۔ رجسٹری بھی کروا لی ہے تیرے۔ میں نے تو تیری کسی۔۔" بڑھیا نے خوش ہو کر کہا۔

"کب شادی کر رہی ہو اس بچی کی؟"

"بس وہی تاریخ جو تم نے دی تھی۔ اگلے مہینے کی اکیس انگریزی کے حساب سے۔"

"بہت اچھا کیا ہے تم نے اماں۔ یہ بوجھ اتار ہی دینا چاہیے ہماری یہ بہن بیاہی جائے گی تو ہماری فکر دور ہو جائے گی۔"

"اللہ تجھے اتنا دے بیٹا کہ تو شمار نہ کر سکے، گن نہ سکے۔۔۔ میرے دل سے تو دن رات تیرے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔"

"زیادہ دعائیں نہ مانگا کر اماں! اُدھر اوپر جو فرشتے ہیں ان کے حساب کتاب میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ کیا پکایا ہے تو نے آج؟"

"ساگ اور مکئی کی روٹی ہے بیٹے۔ چل ری تازہ پکا کے دے بھائی کو۔ چل۔"

مجیدن بھاگ کر چولہے کے پاس جا بیٹھی۔

"میں دو چار دن یہاں رہوں گا اماں! تمہیں کوئی دقت تو نہ ہوگی۔"

"آئے ہائے کیسی باتیں کرتا ہے تو بیٹے، ماں کے پاس رہے گا اور کہتا ہے ماں کو دقت ہوگی۔ یہ تیرا گھر ہے میرے بچے بیٹھ رہے میں ذرا بستر ڈھنگ سے بچھا دوں۔" اس نے تینوں بچوں کو دیوار کے ساتھ لگی چارپائی پر سے اتارتے ہوئے کہا۔

کوٹھری میں باہر سے اُپلوں کا دھواں دھنسا چلا آ رہا تھا۔ اس کی فضا میں عجیب سی ناگوار بو پھیلی تھی۔ وہ بادشاہ اس گھر کا ایک حصہ تھی مگر میری ناک اس سے بالکل ناآشنا تھی۔ مجھے یہاں ٹھہرتے ہوئے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ادھر مجھے کسی بھی شے کا آرام نہیں ملے گا۔ دن کو وہاں مکھیاں ہوں گی اور رات کو مچھر۔ پھر بھی میں نے یہی فیصلہ کیا کہ جس طرح بھی ہو سکے مجھے دو چار دن وہاں گزار لینے چاہئیں۔ آہو کی واپسی کا انتظار مجھے وہاں بیٹھ کر ہی کرنا چاہیے تھا۔

کچھ ہی دیر بعد مجیدن کٹورے میں ساگ اور چنگیر میں مکئی کی روٹیاں رکھ کر اندر لے آئی۔ مکھن کا تو ادھر تصور ہی محال تھا پھر بھی وہ بناسپتی سے روٹیاں تر کر لائی تھی۔ ساگ اس نے بہت اچھا پکایا تھا اور روٹی بہت میٹھی تھی جو میں نے پیٹ بھر کر کھائی اور پھر اللہ کا شکر ادا کر کے دیوار کے ساتھ لگی چارپائی پر جا لیٹا۔ اماں نے جو لحاف مجھے دیا تھا اس میں بھی مجھے وہ تے اور بو آ رہی تھی جس سے بچنے کے لیے میں نے کمبل اس کے ساتھ جوڑ لیا۔ شاید قدرت کو میری انا کا امتحان لینا مقصود تھا۔ میری طبیعت کی اس جھوٹی نفاست کو سہل کی ضرورت تھی۔ میں نے خود کو اس آزمائش میں ڈال ہی دیا اور وہ رات میں نے اس کنبے کے ساتھ ایک ہی چھت تلے گزار دی۔ جس کے افراد کو زندگی کے شعبے سے کچھ بھی نہیں مل سکا تھا جن کی آنکھوں میں رچی بھوک اور گرسنگی دل کو ہلائے دیتی تھی۔ اماں

تو نہال ہو ہو جاتی تھی۔ بڑھیا دنیاداری کے فن سے خوب آشنا تھی اور میرا خیال ہے کہ آدمی جب فلت کی اس حد تک نیچے گرا ہوتا ہے تو اس کے لبوں سے تشکر، کلمۂ صبر کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ وہ زردار کو دیکھ کر اس کی جوتیاں چاٹ لینا اپنے لیے باعثِ رحمت تصور کرتا ہے۔ میں نے ان بچوں کے لشکروں پر اس مجیدن کے رخسار پر، اس بڑھیا کے جھریوں کی لپیٹ میں آتے ہوئے اجڑے ویران چہرے پر ایسی ایسی چیزیں اس رات دیکھیں کہ میں اپنی ساری زندگی انہی لوگوں کی خدمت میں گزار دوں۔ عمر بھر انہی کا پانی بھرتا رہوں تاکہ وہ چہرے تابناک ہو جائیں۔ زندگی کی آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کر سکیں۔

صبح اٹھ کر میں نے غیر متوقع طور پر بڑھیا کے ہاتھ پہ دو ہزار روپیہ رکھ دیا۔

"اماں بازار سے مجیدن کے جہیز کے لیے کچھ چیزیں خرید لا۔ گھر میں جس جس چیز کی ضرورت ہے وہ بھی لے آ۔ اور کچھ اگر بتیاں بھی لے آ تیرے گھر سے یہ بدبو نہیں نکل رہی ہے اور دیکھ یہ جو تو ادھر اتنی دور سے پانی لاتی ہے نا یہ قصہ بند کر اور ادھر آج ہی ایک پمپ لگوا کر اس کے گرد غسل خانہ بنوا لے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا، بالکل ٹھیک ہے۔ میں پمپ تو سب سے پہلے لگواتی ہوں اور غسل خانہ بھی آج ہی بنوا لیتی ہوں۔ تیرا میں کس منہ سے شکر ادا کروں بیٹے تو تو ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ بن گیا ہے۔"

"پھر وہی باتیں! بیٹے کو ذلیل کرتی ہو۔ جاؤ شاباش۔۔ آج ہی یہ سب کچھ ہونا چاہیے اور دیکھ میں ادھر اندر ہی بیٹھوں گا کسی سے مت کہنا کہ تیرے گھر میں کون آیا ہے، لوگ سو باتیں بنائیں گے۔"

"تو فکر نہ کر بیٹے، میں بھلا کسی سے کیوں کہوں گی۔"

"بیشک کہتی پھر۔ یہ نہ سمجھ کہ میں کوئی منہ چھپا کر بیٹھا ہوں یا کسی سے گھونگھٹ نکالتا ہوں یہ بات نہیں ہے بس مجھے تیری عزت زیادہ عزیز ہے۔ جا اب یہ کام نپٹا دے۔"

یہ کہہ کر میں پھر چارپائی پر لیٹ گیا۔

بڑھیا نے اس روز بہت پھرتی دکھائی۔ وہ پانچ سو اینٹیں دو بوری سیمنٹ، ایک ریڑھا بھر ریت دس بجے سے پہلے پہلے خرید لائی۔ پمپ کا سامان بھی وہ ساتھ ہی لے آئی۔ شام تک اس نے غسل خانہ بھی بنوا لیا اور پمپ بھی نصب کروا لیا۔ مستری مزدور سب اسی بستی میں موجود تھے اور وہ بڑھیا کے لیے زیادہ تردد سے کام کرتے تھے۔

شام تک اس گھر کی صورت بہت بہتر ہو چکی تھی۔ جیسے جو تو کیا نہیں ہو سکتا۔ اس گھر کی دنوں میں کایا پلٹ ہو گئی تھی

میں دن بھر اندر بیٹھا رہا اور بڑھیا بچوں کو لے کر صحن میں براجمان رہی۔ دن بھر اس کے ہاں ہمسائیوں کا تانتا بندھا رہا وہ ان سے یہی پوچھتی تھیں کہ سونے کی کان اس کے ہاتھ کہاں سے لگ گئی ہے اتنا پیسہ اسے کہاں سے مل گیا ہے۔ جو وہ راتوں رات گھر میں ضرورت کی اتنی ساری چیزیں بھر کر بیٹھ گئی ہے اس کے گھر کے چاروں طرف جو افلاس تھا اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور میں سوچتا تھا کہ اس بڑھیا کو تو مجیدن کے خالق خدا نے اتنا کچھ دے دیا ہے ان کے دن کیسے پھر رہیں گے؟ انھیں غلام جیلانی کہاں سے میسر آئے گا۔ اور کب؟ مگر یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب تو شاید کاتبِ تقدیر ہی دے سکتا تھا۔ میں تنہا اپنا لہو کس کس آنگن میں بکھیر سکتا تھا۔ وہاں تو ہر آنگن زہر میں بجھا ہوا تھا۔ ان لوگوں میں سے ہر ایک موت مانگتا پھرتا تھا۔ کسی کے چہرے پر کوئی رونق تھی نہ زندگی کی رمق۔ سب کے سب اس دنیا میں آ گئے تھے اور لد جانے کے لیے شعوری طور پر تیار بیٹھے تھے۔ وہ ارسطو کے معاشرے کا وہ حصہ تھے۔ جو کھیتوں میں کھاد اور کارخانوں میں ایندھن کے طور پر استعمال ہوتا تھا مگر میں ان بدنصیبوں کے گرد کھڑی اونچی موٹی دیوار کو کس طرح گرا سکتا تھا۔ کہ ان کا حصار تاریخ کی تہہ در تہہ چڑھی بے انصافیوں سے تعمیر ہوا تھا۔ خدا کی اس وسیع و عریض دنیا میں آ کر یہ اس حد تک سکڑ چکے تھے کہ ان کا وجود عنقا معلوم پڑتا تھا۔ پھر بھی وہ مطمئن تھے کہ انہیں صبر کی عادت پڑ گئی، شکر ادا کرنے اور کرتے رہنے کا سلیقہ آ گیا تھا۔

تیسری رات میں نے اماں سے کہا کہ وہ کسی طرح یہ معلوم کرے کہ آہو یا کبری گھر واپس آ چکے ہیں کہ نہیں۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ وہ میرا ذکر کسی سے ہرگز ہرگز نہ کرے مگر وہ کوئی بہت ہی بھولی بھالی قسم کی عورت تھی۔ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ اس عورت کی بے وقوفی نے مجھے خواہ مخواہ موت کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ واپس آئی۔ تو بولی "بیٹا وہ دونوں آج ہی شام واپس آئے ہیں۔ اور اس وقت گھر پر ہیں۔"

"یہ بات تجھے کس نے بتائی ہے اماں۔"

"وہ ان کا نوکر کبری ہے نا، اسے تو میں نے گلی میں سے گزرتے دیکھا تھا۔ پھر ان کے گھر کی نوکرانی ہے ناجاندی بوا وہ مجھے مل گئی تھی۔"

"کیا بتایا ہے اس نے۔"

"وہ کہتی ہے کہ آہو کا سسر قتل ہو گیا ہے وہ اس کے جنازے کے لیے گجرات گئے ہوئے تھے۔ سنا ہے اس کے کسی پرانے دشمن نے اسے مار دیا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو اماں! میں ذرا اس سے مل آؤں۔ تھوڑی دیر بعد آ جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر میں نے کمبل اوڑھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میں آہو کے گھر کی طرف چل دیا۔ اس وقت تک یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ اس بڑھیا نے ان حرامزادوں کو میرے بارے میں پوری اطلاعات فراہم کر دی تھیں۔

میں ریلوے لائن عبور کر کے گوبھی کے ایک کھیت کے کنارے کنارے چل رہا تھا کہ اچانک میرے سامنے کوئی بیس قدم دور ایک شعلہ سا لپکا۔ ڈز کی آواز پیدا ہوئی اور ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے کندھے کے اوپر سے گزر گئی۔ میری جان سخت خطرے میں تھی۔ میں نے جھوٹ موٹ ایک چیخ ماری اور فوراً نیچے بیٹھ کر منڈیر کی اوٹ میں لیٹ گیا۔ مجھ پر کسی نے اندھیرے میں چھپ کر وار کیا تھا۔

میرے دشمن نے مجھے گرتے دیکھا۔ میری بلند چیخ سنی تو سمجھا کہ اس نے میدان مار لیا ہے۔ وہ تن کر کھڑا ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔ اب وہ میری زد میں تھا۔ میں چپ سادھے لیٹا رہا۔ اس حال میں کہ اپنا سائلینسر لگا پستول میں نے سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ وہ مجھ سے ابھی دس قدم دور تھا کہ میں نے اس کے بت کو اندھیرے میں تاک کر گولی چلا دی۔ میرا نشانہ خطا نہیں گیا۔ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ زخمی درندے کی طرح اچھل کر آگے گرا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ تیزی سے اپنی جگہ پر سے اٹھ کر میں اس کے سر پر جا پہنچا مگر جب میں نے اس کی صورت دیکھی تو میں حیران رہ گیا کیونکہ میرا دشمن میرا اپنا یار کبری تھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی میرا دماغ الٹ گیا میں نے بڑے غصے سے اس کے منہ پر تھوکا۔ وہ بری طرح کراہ رہا تھا۔ مگر مجھے اب اس سے کوئی ہمدردی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اسی قابل تھا۔ وہ محسن کش۔۔۔ وہ کسی بھی رو رعایت کا حقدار نہیں تھا۔ غصہ مجھے اس بڑھیا پر آنے لگا تھا جو میرے دشمنوں کو خبردار کر آئی تھی اور انھوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر مجھے اپنے پتال جنتر پر رکھ لیا تھا تاکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرا تیل نکال کر مجھے ٹھنڈا ٹھار دل بہار کر دیں۔

میں نے کبری پر الوداعی نظر ڈالی اور اپنا کمبل جھاڑتا ہوا آہو کے گھر کی طرف چل دیا۔ مجھے اب بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ مجھے ان لوگوں نے ایسی چڑیا نوچن میں ڈال دیا تھا کہ میں اپنے سائے سے بھی بدگمان ہونے لگا تھا۔ وہ آہو مجھے کس طرح تباہ کر چکا تھا۔ اور میری حیثیت اب وہ کبری اپنے حصے میں ڈال رہا تھا۔ اس کا تو میں نے بندوبست دوامی کر ہی دیا تھا لیکن آہو سے نپٹنا تھا جو نہیں چاہتا تھا کہ میں اس سے اپنا حق طلب کروں۔ وہ سمجھتا ہو گا کہ اس طرح مجھے ہلاک کر کے وہ مجھ سے ابھی جان چھڑا لے گا۔ اس نے شاید میرے ماتھے پر لکھا پڑھ لیا تھا کہ میں بس یونہی مٹھی کھٹن گوپال ہوں۔ مٹی کا مادھو ہوں۔ سوچ نہیں سکتا ہوں۔ وحشی تو ضرور ہوں مگر ہمرنگِ زمین دام کو پہچان نہیں سکوں گا۔ یہی سوچ رہا تھا وہ گیدڑ کی اولاد۔ اسی لیے اس نے کبری کو میرے پیچھے لگا دیا تھا مگر یہ اس کی محض خوش فہمی تھی۔ کاش وہ مجھے اچھی طرح سمجھ سکتا۔ میرے ٹھکانے کو اتنا معمولی نہ سمجھتا، کیونکہ میں تو وہ ہوں کہ... جس کسی سے بھی ٹکرایا ہوں اسے بھسم کر کے لوٹا ہوں۔

اپنے اندر میں بڑا جس پاتا تھا۔ پھر بھی اس آہو کے ٹیٹک منچے نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ زندگی کے اس پیٹا پھیر نے میرا سر چکرا دیا تھا۔ ابھی اس کبری سالے کی گولی کام کر جاتی تو میں لمبا لیٹ چکا ہوتا اس گوبھی کے کھیت میں اور وہ کتے کے بچے میری لاش وہاں سے اٹھواتے تھوڑی! وہیں پڑی رہنے دیتے۔ اور میں صبح تک ایسا ہو گیا ہوتا کہ جو کوئی مجھے دیکھتا وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلتا۔ رات کو جنگلی جانور میرا بھرکس نکال کر میری بتیسی ننگی کر دیتے اور نظر میں یوں آتا جیسے ہنس رہا ہوں۔ اس کبری بچے کا بھی اب یہی حال ہو گا۔ پڑا مرتا... رہ سالے ادھر ہی۔ وہ تیرا یار آہو آئے گا تو تو یہاں سے اٹھے گا۔ اگر اس نے بھی دل کے آنکھوں کے کانوں کے اور تیری طرف سے اپنی دوسری انتڑیوں کے پٹ بھیڑ رکھے تو پھر تیرا خدا ہی حافظ ہے میرے بچے میرے پرانے جیب کترے۔

کبری پر لعنت بھیجتا ہوا میں تیز تیز قدم اٹھاتا آہو کے گھر جا پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی تو کوئی پانچ منٹ بعد بابا نے دروازہ کھولا۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہوئے بولا

"جناب صاحب وہ آہو صاحب تو گھر پر نہیں ہیں۔"

"کہاں ہیں؟"

"کہیں باہر گئے ہیں۔ شام کو آئے تھوڑی دیر بیٹھے اور پھر باہر نکل گئے۔"

"کب تک آئیں گے؟"

"پتہ نہیں جناب صاحب! ہو سکتا ہے انہیں بہت دیر ہو جائے۔" اس کا اندازہ بہت نپا تلا تھا اور اس کے چہرے پر وہ جو بشاشت تھی وہ پھٹکار میں بدل چکی تھی۔

"تو ٹھیک ہے تم کمرہ کھولو۔ میں ان کا انتظار کروں گا۔"

"آپ کا نام جناب صاحب غلام جیلانی ہے نا؟"

"ہاں یہی نام ہے۔ پہلی بار دیکھ رہے ہو مجھے۔"

"جی نہیں... وہ... وہ جناب صاحب آپ کو آہو صاحب نے کہا ہے کہ آپ آئیں تو آپ کو اندر نہ بٹھاؤں۔" بانی بابا نے بڑی مشکلوں سے اپنے مالک کی بات مجھ تک پہنچائی۔

"کیا؟ کیا کہتے ہو تم؟ مجھے نہیں جانتے۔ ان سے بہت ضروری کام ہے مجھے۔ وہ کبری کہاں ہے اسے بلاؤ۔"

"وہ بھی کافی دیر سے باہر گیا ہوا ہے جناب صاحب۔"

"اچھا تو پھر مجھے بٹھاؤ گے نہیں۔" میرے منہ کا ذائقہ بدلنے لگا تھا۔

"جی نہیں جناب صاحب مجھے افسوس ہے مالک کا یہی حکم ہے۔ آپ صبح تشریف لے آئیں۔" یہ کہہ کر اس نے کھٹاک سے دروازہ میرے منہ پر بند کیا اور دوسری طرف سے ادل چڑھا کر صحن کی طرف چلا گیا۔ میرے اندر کوئی شے تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔ میری انا کی ساری اسب اڑتی جا رہی تھی۔ آہو نے مجھے دھتکار دیا تھا۔ وہ گھر کے اندر موجود تھا مگر مجھ سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ حال کیا تھا اس نے میرا۔ اور اپنے وعدوں کا مجھے وہ سارا قصہ ہی غلط ہوتا نظر آ رہا تھا اور شیبہ آہنی سلاخوں کے پیچھے میری منتظر تھی۔ وہ کیا سوچتی ہوگی تیرے بارے میں۔ وہ کیا رائے قائم کرے گی جیلانی؟

آہو کے گھر کا وہ بڑا سا آبنوسی لکڑی کا بنا ہوا بہت ہی خوبصورت بند دروازہ میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ میں جو بڑا کوہِ الوند بنا پھرتا تھا، پل بھر میں سکڑ کر ذرہ بن گیا تھا۔ اتنی سکت میرے اندر نہیں رہی تھی کہ میں اس دروازے کو توڑ دیتا۔ کہ مصلحتوں نے میرا دامن پکڑ رکھا تھا۔ یہ تو سچ ہے کہ میری گردن آہو کے ہاتھ میں آ گئی تھی وہ مجھے کسی بھی وقت پولیس کے ہاتھ فروخت کر سکتا تھا۔ شاید اب بھی اسے پچاس ہزار روپیہ انعام مل جاتا۔ کیونکہ میرے سر کی ان لوگوں نے یہی قیمت مقرر کی تھی مگر اس سے آگے بھی تو بہت کچھ تھا۔ اس سے آگے آہو کی گردن شکنجے میں آتی تھی۔ میں بھی تو منہ میں زبان رکھتا تھا۔ میں بھی تو پولیس کو عدالت کو اور عدالتِ عالیہ کو بتا سکتا تھا کہ میں نے ہادی علی کو کیوں قتل کیا تھا۔ میں جو اسے پکڑتا تو وہ آہو صاحب کو بے آبرو کرنے کے لیے بہت کافی ثابت ہو سکتی تھی۔ آپ تو میں ڈوبتا ہی مگر ججمان کو بھی ساتھ لے ڈوبتا۔ یہی وجہ تھی کہ آہو میرے سامنے آنے سے گریزاں تھا اور پولیس کو بھی میرے بارے میں کوئی بات بتانے سے ڈرتا تھا ورنہ تو اب تک کب کا مجھے چکی کے پاٹ نیچے دبا چکا ہوتا۔ اتنا نیک بچہ تو وہ ہرگز نہیں تھا کہ مجھے وہ بلا وجہ چھوڑ دیتا۔

ابھی اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں نے کبری کو کہاں پہنچا دیا تھا۔ اس کی موت کا جو بلاشبہ کتے کی موت تھی مجھے بے حد افسوس تھا اس بر کٹے کو یہ احساس نہ ہوا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ وہ بھی سالا مجھ سے نفرت ہی کرتا تھا۔ مگر میں نے بھی قسم کھا لی تھی کہ اس کو زیادہ اہمیت دوں گا ہی نہیں۔ اب وہ جس آڑ اگوڑی پر لگ گیا تھا اس میں شاید آہو سے جلد چھٹکارا مل جاتے مگر میں تو شاید اس کے منہ میں کہیں زیادہ چھچھلا چکا تھا۔ پھر بھی اس کی تسلی نہیں ہوتی تھی اب اس کی چھاتی کو سر لیے کہ اس نے چند ٹکوں کی خاطر اور آہو سے اپنی وفاداری نبھانے کے لیے مجھ پر وار کروایا جو اگر خالی نہ جاتا تو میں کہاں جا چکا ہوتا۔

چند منٹ تک میں گم صم سا کھڑا اس دروازے کو تکتا رہا اور پھر مایوس ہو کر وہاں سے واپس چل دیا۔ اس تک پہنچنے کے لیے اب مجھے کسی اور ہی دروازے کی ضرورت تھی۔ کسی اور ہی راہ سے اب مجھے اس کی گردن تک پہنچنا تھا اور مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ معاملہ ایسا نازک تھا کہ جب تک آہو خود آگے بڑھ کر اس کے لیے جیل کا دروازہ نہ کھولتا وہ وہاں سے نکل ہی نہیں سکتی تھی۔ اور میری یہ حالت تھی کہ مایوسی کے اس اتھاہ اندھیرے نے میری ذات کو اور تر بتر کر کے رکھ دیا تھا۔ میں بڑے بوجھل بوجھل قدم اٹھاتا ایک اور راستے سے ہوتا ہوا بڑھیا کے گھر جا پہنچا۔ اس نے مجھے صحن میں دیکھا تو چھوٹتے ہی بولی۔

"اچھا ہوا بیٹے تم آ گئے مجھے بڑی فکر لگی ہوئی تھی۔"

"کیوں تجھے کیا فکر لگی تھی میری؟"

"وہ... وہ ادھر کہتے ہیں کوئی آدمی مرا پڑا ہے کسی نے اسے قتل کر دیا ہے۔"

"اور تو سمجھی کہ وہ میں ہی ہوں گا۔ یہی سمجھی تھی نا تو؟" میں نے خاصے درشت لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں بیٹے! خدا کرے تجھے تو میری اور میرے ان بچوں کی بھی عمر لگ جائے۔ یہ بات نہیں تھی۔ میں تو تیری سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی بیٹا۔"

بڑھیا بہت ہی سادہ تھی۔ وہ دراصل اس قتل کی خبر مجھے سنا رہی تھی مگر اس کے لفظ جو تاثر دے رہے تھے وہ ان سے بالکل بے خبر تھی۔

"میری اتنی فکر نہ کیا کر اماں! مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ تو جا دیکھ کون مرا ہے ادھر اور کیا قصہ ہے۔ مگر رہنے ہی دے۔ تیری تو مت ماری گئی ہے۔ کوئی ضرورت نہیں تجھے ادھر جانے کی۔"

میں نے کوٹھری میں جا کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں سخت پریشان ہو رہا تھا۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا مگر میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں وہاں سے فوراً نکل جاؤں کیونکہ آہو جانتا تھا کہ میں بڑھیا کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہ مجھے کبری کے قتل کے الزام میں گرفتار کرا سکتا تھا۔ کرنا اسے صرف یہ تھا کہ وہاں

اپنا پستول کھیت میں سے اٹھاتا اور اسے کہیں چھپا دیتا اس کے بعد ٹیلیفون پر پولیس کو اطلاع دیتا کہ ادھر کھیتوں میں اس نے کسی کی لاش دیکھی ہے اسے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ معاملہ بالکل سیدھا سادا تھا۔

پولیس لاش تک پہنچتی تو وہ تھانے والوں کو بڑھیا کے گھر کی نشاندہی کروا دیتا۔ اپنا نام بتائے بغیر وہ پولیس کی رہنمائی کر سکتا تھا۔ بعد میں وہ تھانے پہنچتا اور کہتا حضور یہ تو میرے نوکر کبری کی لاش ہے۔ پولیس مجھے بڑھیا کے گھر سے پکڑ لیتی اور اس کے سامنے لے جاتی تو وہ یہی کہتا کہ جناب اسی نے کبری کو قتل کیا ہوگا۔ فلاں آدمی ہے اور اس کا نام یہ ہے۔ نہ کوئی اونچا سنتا نہ کان پہ ہاتھ رکھتا۔ سارا قصہ ہی پاک ہو جاتا میرے خدشے دم بدم بڑھتے ہی جاتے تھے میرے خوف کی آنت آہستہ آہستہ پیچس ہوتی جا رہی تھی۔ اور وہ جو مجھے اپنے اوپر تصرف اور اعتماد حاصل تھا وہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کوٹھری میرے لیے کسی بھی طرح محفوظ نہ رہی تھی کہ سامنے کھیتوں میں کبری کی لاش پڑی تھی ریلوے لائن کے اس پار اور اس کی وجہ سے علاقے میں ہاہاکار مچ گئی تھی۔ آہو کوئی بھی غلط قدم اٹھا سکتا تھا۔

میں بڑھیا کے گھر میں بیٹھا سوچ کے تارِ عنکبوت میں الجھا ہوا تھا اور باہر دنیا کہاں کی کہاں جا پہنچی تھی۔ جب مجیدن کھانا چنگیر میں دھر کر اندر لائی تو عین اس وقت باہر زبردست شور اٹھتا سنائی دیا۔ میں نے گھبرا کر کمبل اپنے گرد لپیٹا اور اسٹین گن بستر کے گدے تلے سے نکال کر کندھے سے لٹکا لی۔

اچانک بڑھیا کا منجھلا بیٹا باہر سے بھاگتا ہوا اندر آیا بولا۔ "اماں وہ پولیس آ رہی ہے۔ ہمارا گھر پوچھ رہے تھے وہ لوگ انہیں بتا رہے تھے کہ مجیدن ادھر رہتی ہے۔ ایک بابو ان کو ادھر ہی لا رہا ہے۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میں مجیدن کو دھکیلتا ہوا باہر صحن میں نکلا۔ "اماں میں جا رہا ہوں میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا۔" یہ کہہ کر میں نے بڑھیا کے صحن میں دھری لکڑی کی سیڑھی پر قدم رکھا اور گلہری کی سی رفتار سے چھت پر جا پہنچا۔ لوگوں کا ایک ہجوم بڑھیا کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں جن کی روشنی میں مجھے آہو کا غضبناک چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میرے تمام خدشے درست ثابت ہوئے تھے۔ آہو چال چل گیا تھا۔ یہ بات تو ثابت ہو سکتی تھی کہ میں نے ہادی علی کو مارا ہے مگر کبری کی موت کا الزام وہ مجھ پہ ثابت نہ کر سکتے تھے۔ بلا دریں تو کئی لوگ کہہ دیں گے پولیس کے دباؤ میں آ کر کہ ہاں یہی وہ آدمی ہے کہ جس نے ہادی علی پر گولی چلائی تھی مگر میرے لیے یہ ثابت کرنا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا کہ وہ کام میں نے آہو کے ایما پر سر انجام دیا تھا اور پھر اگر وہ مجھ پر ان دونوں سلسلوں میں کچھ بھی ثابت نہ کر پاتے تو بھی میری گرفتاری ان کے لیے بہت بڑا انعام ہوتی جو وہ اس گھڑی بڑھیا کی کوٹھری میں ہاتھ مارنے سے حاصل کر سکتے تھے۔

میں نے اپنے ارد گرد نگاہ ڈالی تو مجھے چھتیں ہی چھتیں نظر آئیں۔ منڈیر کسی پر بھی نہیں تھی نیچے صحن میں بڑھیا اور اس کے بچے مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے انہوں نے ابھی ابھی کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ مجیدن کی تو آنکھیں بہہ نکلی تھیں اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ شاید مجھے اپنے سینے میں چھپا کر زمین کے اندر اتر جاتی۔ ایسا کرب تھا اس کی آنکھوں میں کہ میں لرز کر اور پیچھے ہٹ گیا۔

وہ لوگ اور قریب آ پہنچے تھے۔ اچانک روشنی کا ایک نیزہ میرے جسم پر پڑا اور مجھے ان پر عیاں کر گیا۔ میں تڑپ کر وہاں سے آگے نکلا اور دوسری چھت پر جا پہنچا۔ ابھی میں آخری چھت سے ادھر ہی تھا کہ تڑ تڑ گولیاں چلنے لگیں۔ وہ گولیاں آڑی ترچھی سمتوں سے میری طرف آ رہی تھیں۔ میں ایک ہی جست میں دوڑتا ہوا چھٹی ساتویں چھت عبور کر گیا۔ اب شاید میں اس بستی کے پچھواڑے تک پہنچ چکا تھا کیونکہ ادھر پیچھے کھیت ہی کھیت دکھائی دیتے تھے۔ گولیاں اب ختم ہو گئی تھیں۔ میں ان کی زد سے نکل گیا تھا۔ اپنی چھتوں پر میرے پاؤں کی دھمک سن کر کئی لوگ اوپر چڑھ آئے تھے۔ ان کو چھتوں پر دیکھتے ہی میں نے ایک کوٹھے پر سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ زیادہ اونچی چھت نہیں تھی۔ نیچے پہنچتے ہی میں سامنے کی طرف بھاگا۔ اتنا تیز بھاگا کہ میرا تھوڑی ہی دور پہنچنے پر دم پھول گیا۔ وہ لوگ اپنا رخ بدل کر بستی کے پیچھے آ گئے تھے اور ان کی ٹارچوں کی روشنی ان چھتوں کے اس طرف دکھائی دے رہی تھی جدھر سے میں نیچے کودا تھا مگر میرے اور ان کے درمیان فاصلہ بہت بڑھ چکا تھا۔

میرا دل میرے قابو میں نہیں تھا۔ میں نرغے میں آئے ہوئے کتے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ پھر بھی میں نے اپنی رفتار کم نہیں کی اور مسلسل بھاگتا رہا۔ اتنا تیز — میں زندگی میں شاید ہی کبھی دوڑا ہوں گا۔ وہ لوگ میرے تعاقب میں زیادہ آگے نہیں آئے اندھیرا اتنا گھنا تھا اور کچا راستہ اتنا ناہموار تھا کہ ان لوگوں نے آگے آنے کے بجائے تھانے پہنچ کر خانہ پُری کو زیادہ بہتر سمجھا ہوگا۔ ویسے بھی ایسے خطرے کے سامنے کوئی بھی مائی کا لال اپنا سینہ تان کر آگے نہیں بڑھ سکتا ہے، چہ جائیکہ پولیس کے تنخواہ دار ملازم — میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اگر میری

ہی طرح اُن میں کوئی ایک آدمی بھی اپنے مقصد سے سچی لگن اپنے سینے میں محسوس کرتا تو وہ استقلال کے ساتھ میرا پیچھا کر کے اُس روز مجھے بہت آسانی سے پکڑ سکتا تھا کیونکہ میرے راستے میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں میں پناہ لے سکتا۔ کئی بار میں ریلوے لائن پر چڑھ کر بھی دوڑا تھا۔ میں آڑا ترچھا بھاگ رہا تھا کیونکہ مجھے کہیں بھی کوئی آڑ نہیں مل رہی تھی۔ چلتا چلتا میں محمود بوٹی بند پر جا چڑھا۔ یہ وہی راستہ تھا جو چند روز پہلے میں نے آپی سے ملنے کے بعد صبح سویرے گھوڑی پر سوار ہو کر اختیار کیا تھا مگر اب میں پیدل تھا اور مسلسل دوڑنے کی وجہ سے میرا حوصلہ اور دم دونوں ہی پھول چکے تھے۔

افسوس مجھے یہ ہو رہا تھا کہ اس گھر سے میرے یوں بھاگ آنے کے بعد وہ لوگ اس بڑھیا اور اس کی جوان بیٹی مجیدن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں گے۔ کون کسی کے ساتھ ایسے حالات میں کوئی رُو رعایت کر سکتا ہے کہ جگر جگر ہے اور دگر دگر ہے اور یہ پولیس والے تو کسی کے بھی میت نہیں ہوتے۔ یہ اب اس لکیر کو پیٹیں گے، جو سانپ اپنے پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔

میری تمہارہ تقدیر مجھے رسوا کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ میرا یہ حال تھا کہ میں اس گھڑی اس ویران راستے پر یوں چل رہا تھا، جیسے میرے تمام ہمراہی ایک ایک کر کے کٹ گئے ہوں اور میں ایک بھرے پُرے ہنستے کھیلتے معرکے سے صرف اپنی گردن بچا لانے میں کامیاب ہو سکا ہوں۔ میری کوئی منزل نہ تھی، میرا کوئی گھر نہ تھا۔ نہ میرے کوئی آگے رہا تھا نہ کوئی میرے پیچھے۔ میرے نصیب نے میری زندگی کے ایک ایک حصے پر چھینٹے ڈال دیے تھے۔ اور آپی کا چہرہ ہو رنگ آنسوؤں میں نہلایا ہوا میرے سامنے تھا۔ وہ پھر مجھ سے سوال کر رہا تھا پھر پوچھ رہا تھا کہ بھیا اب کیا ہوگا۔ اب کیا کرے گا تو۔ وہ آدمی جس کے کہنے پر تو نے ہادی علی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اپنے وعدے سے پھر گیا ہے اور میری امید کے چراغوں کی روشنی دھندلی پڑتی جا رہی ہے میرے بارے میں اب کیا سوچا ہے تو نے میرے بھیا! میں کب تک یہ اذیت سہتی رہوں گی۔ میں تو جیل میں جب چکی پیستی ہوں تو مجھے وہ جتا ساری گیت بھی یاد نہیں آتے جو گاؤں کی لڑکیاں اس مشقت کے وقت خوشی سے گایا کرتی ہیں۔ میں تو بالکل ہی بجھ کر رہ گئی ہوں میرے بھیا میرے لیے کیا سوچا ہے تو نے۔

بڑھیا کی وہ صورت مجھے نہیں بھولتی تھی۔ اُسے کتنا صدمہ ہوا ہوگا جب اس پہ یہ بات عیاں ہوئی ہوگی، کہ وہ آدمی جو اسے اماں کہہ کر پکارتا تھا اتنا بڑا مجرم ہے۔ وہ لہو روتی ہوگی۔ اس کے اعتماد کے سارے شیشے تڑاخ تڑاخ ٹوٹ گئے ہوں گے۔ مجیدن پر بھی وہ گھڑی بہت بھاری تھی۔ اس کی وہ ڈبڈبائی آنکھیں رہ رہ کر میرے حافظے کی سطح پر ابھرتی تھیں۔ پولیس نے خدا جانے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔ اُن بے چاروں کی حالت تو دیدنی ہوگی۔ ساری بستی اُن پر تھُڑی تھُڑی کر رہی ہوگی۔ وہ بڑھیا جس کا میں نے اپنے بیٹے سے مان بڑھایا تھا جس کو نئی زندگی کی نوید سنائی تھی وہ یہ سارے صدمے کہاں سہہ سکے گی۔ اندر سے وہ بیچاری ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گی۔ میں نے انہیں سکھ پہنچانے کے بجائے اور زیادہ دُکھ میں مبتلا کر دیا تھا۔ میرے جیسے مُورکھ سے دوستی پال کر انھوں نے کیا نفع کمایا تھا۔

میں بخت بلند تو کبھی بھی نہیں تھا مگر اب تو میری یہ صورت بنی تھی کہ بخت اُڑ گئے تھے اور صرف بلندی رہ گئی تھی۔ ایسی بلندی جس پر پستیاں ہنستی رہی تھیں۔ میں اندھیرے میں آہستہ آہستہ بوجھل بوجھل قدم اٹھاتا ہوا بند روڈ پر چلتا رہا۔ رات کے وقت اس سڑک پر ٹرکوں کی آمد و رفت بہت بڑھ جاتی ہے۔ وہ ٹرک بجری ریت، سیمنٹ سریا لے کر چلتے ہیں تاکہ اطمینان سے وہ ٹریفک کے ہجوم سے بچ کر رات ہی رات میں یہ کام نمٹا لیں۔ اُن میں سے بہت سے ٹرک سبزی اور اناج سے بھی لدے پھندے ہوتے ہیں — ان ٹرکوں کی تیز تیز روشنیوں سے بچتا ہوا میں سڑک کے ایک طرف ہو کر چل رہا تھا کہ اچانک ایک ٹرک میرے سامنے سے آیا اور اپنی ڈگر پر سیدھا چلنے کے بجائے دائیں ہاتھ مڑا اور اتنی تیزی سے میری طرف بڑھا کہ میں سمجھا وہ ڈرائیور مجھے جان بوجھ کر کچل دینا چاہتا ہے۔ میں پاگلوں کی طرح پیچھے ہٹا اور مٹی کے اس ٹیلے پر جا چڑھا جو بند کے دائیں ہاتھ دریا کی سمت میں مٹی کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ ٹرک کے اگلے دونوں پہیے اس ٹیلے کی بھُر بھُری مٹی میں دھنس گئے اور اس کا انجن خاموش ہو گیا۔ میں سمجھا کہ وہ ڈرائیور سالا چنڈو باز ہے اور نشے میں دھت ہونے کی وجہ سے یہ حرکت کر بیٹھا ہے۔ ابھی وہ انجن چپ ہوا ہی تھا کہ پیچھے سے دو آدمی تیزی سے نیچے اترے اور ڈرائیور کی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر دیکھنے لگے۔ میں بھی ٹیلے سے اتر کر آگے بڑھا۔ ڈرائیور اپنی سیٹ پر بے ہوش پڑا تھا اس حال میں کہ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی نظر آتی تھیں اور وہ ایک طرف لڑھکا پڑا تھا۔ ایک ہاتھ اس کا اسٹیرنگ پر تھا اور دوسرا کچھ اس طرح مڑا ہوا تھا جیسے اس کو مرگی کا دورہ پڑا ہے اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

"اوئے کاکا یہ کیا ہو گیا ہے تجھے پُتر!" ایک آدمی نے بلکتے ہوئے کہا۔

"چاچا اسے کوئی دورہ پڑ گیا ہے اسے نیچے اتار لو۔" دوسرے آدمی نے لرزتے لہجے میں کہا۔ دونوں ہی سخت پریشان ہو گئے تھے۔ میں اُن کے قریب پہنچا تو میرا غصہ اس ڈرائیور کی

کی حالت دیکھ کر بڑی حد تک فرو ہو چکا تھا ورنہ اگر وہ ہوش میں ہوتا تو شاید میں مار مار کر اس کا بھُرکس نکال دیتا۔

"کیا ہوا ہے اسے۔ اس نے تو ٹرک چڑھا ہی دیا تھا مجھ پر۔" میں نے بہت سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"معاف کر دیں بھاجی! یہ میرا بیٹا ہے اسے پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔"

"بڑے اچھے کام پر لگا رکھا ہے تو نے اسے۔ شہر میں ہوتا تو مار دیا تھا اس نے دس بیس کو۔"

"ہاں بھاجی!" ہم بھی مارے ہی گئے تھے آج اس کے ساتھ۔ وہ تو اچھا ہوا پہیے اس بند کے مٹی میں دھنس گئے۔ سامنے پربت تھا ورنہ تو ٹرک ہی اُلٹ جاتا۔"

اس آدمی نے اپنے دوسرے بیٹے کے ساتھ مل کر ڈرائیور کو نیچے اتار کر ایک صاف جگہ پر چادر بچھا کر لٹا دیا۔

"کیا نام ہے اس کا؟"

"اس کا نام روشن دین ہے جی! اوئے احمد دین کہیں سے پانی لا بیٹے۔" اس بوڑھے نے بیٹے کی مخدوش حالت دیکھ کر کہا۔

احمد دین اسی وقت وہاں سے بھاگا۔ کہیں قریب ہی ٹیوب ویل کے پانی کی شاں شاں سنائی دے رہی تھی لگتا تھا وہ پانی خاصی بلندی سے نیچے گر رہا ہے۔ میں اس ڈرائیور کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کی حالت دم بدم بگڑتی جا رہی تھی اس کا سارا بدن مروڑا جا رہا تھا۔ اور اُس کے گلے سے خوفناک قسم کی آوازیں نکل رہی تھیں معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی دم کا مہمان ہے — مجھے اس کی حالت پر بے حد ترس آ رہا تھا۔ اچانک وہ ہاتھ بھر اونچا اچھلا اور دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ اس کے منہ سے اور زیادہ جھاگ نکلا۔ اس کا چہرہ بگڑتا جا رہا تھا اور اس کے باپ کی حالت دیدنی تھی۔

"کچھ کرو بھاجی! میرے بیٹے کو بچاؤ بھاجی۔ کوئی ٹرک روکو۔ اسے ہسپتال لے چلو۔"

"اسے ٹرک میں ڈالو۔ میں خود چلا کر اسے ہسپتال پہنچاتا ہوں۔"

"چاچا میں پانی لے آیا ہوں۔" احمد دین ہاتھ میں ٹین کا ڈبہ لیے واپس آ رہا تھا مگر روشن دین کا تو شاید چل چلاؤ تھا۔ اس کی حالت لحظہ بہ لحظہ بگڑتی جا رہی تھی۔ احمد دین نے آتے ہی گلاس میں پانی بھر کر اس کے منہ سے لگایا مگر وہ پانی اس کے حلق میں اترنے کے بجائے دائیں بائیں بہہ گیا اس کے بدن کا تشنج بڑھتا جا رہا تھا۔ روشن دین کا باپ اس کی یہ حالت دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"ہٹو ذرا میاں جی! اس کی نبض تو دیکھنے دو مجھے۔" میں نے آگے بڑھ کر اس کی نبض ٹٹولی تو معلوم ہوا کہ اس کے دل کی حالت زیر و زبر ہو رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر ہاتھ بھر اوپر اچھلا اور زمین پر ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح لوٹنے لگا مگر میں نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے روکا اور پھر ایک ہاتھ اس کے سینے پر دل کی طرف رکھا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ روشن دین کے دل پر جونہی میں نے ہاتھ دھرا وہ ساکن ہونے لگا۔ میں نے آہستہ آہستہ اس کے مڑے ہوئے ہاتھوں پر اپنا دایاں ہاتھ پھیرا تو وہ یوں سیدھے ہو گئے جیسے میں نے سلوٹوں بھرے کپڑے پر استری پھیر دی ہو۔ اس کا نچلا جبڑا ابھی مڑ چکا تھا اور زبان اس کی دانتوں تلے کچلی جانے کی وجہ سے مُنہ سے خون بہہ نکلا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے اُس کے مڑے ہوئے جبڑے پر ہاتھ پھیرا تو میری حیرت فزوں تر ہو گئی۔ اس کا وہ جبڑا بغیر کسی دباؤ کے آپ ہی آپ اپنی حالت پر آ گیا اور اس کا اکڑا ہوا بدن ڈھیلا ہونے کے بعد اپنی فطری حالت کی طرف لوٹنے لگا۔

اس کا باپ مجھے یوں حیرت سے دیکھ رہا تھا جیسے اُس نے کوئی عجیب و غریب خواب دیکھا ہو۔ میں نے اُس کے بدن کے مختلف حصوں کو دیکھا جہاں خون نہ پہنچنے کی وجہ سے جگہ جگہ سفید برص ایسے داغ نظر آنے لگے تھے۔ اس کے ہاتھوں اور بازوؤں کی حالت تو خاص طور پر بہت ہی کریہہ منظر پیش کر رہی تھی۔ روشن دین کا سانس اب معمول پر آ رہا تھا۔

"اوہ میرے بادشاہ! یہ کیسے ہو گیا میرے مائی باپ آپ نے یہ سب کیسے کر لیا میرے پیر و مرشد میرے سائیں، یہ کرامت آپ نے کیسے دکھا دی؟"

"کیا بکتے ہو؟ کیسی کرامت؟" میں نے روشن دین کو چھوڑ کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ میرا لہجہ خاصا تلخ تھا۔

مگر وہ دونوں باپ بیٹا میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر یوں کھڑے تھے جیسے میں کوئی شہنشاہ ہوں جسے ان کی زندگیوں پر بھی اختیار حاصل ہے۔

"نہیں پیر و مرشد! آپ بڑے کرنی والے ہیں میرے بادشاہ! میرے بچے کو آپ کے ہاتھ سے شفا ہو گئی۔" روشن دین کے باپ نے بڑے ہی مودبانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں سائیں بادشاہ! اس کو تین سال پہلے ایسا ہی دورہ پڑا تھا۔ اس وقت اس کی حالت اتنی خراب نہیں تھی پر علاج کے لیے اسے تین مہینے ہسپتال میں رہنا پڑا تھا مگر آپ نے کمال کر دیا ہے مائی باپ۔" احمد دین نے آگے بڑھ کر میرے پاؤں چھو لیے۔ اس کا لہجہ عقیدت و احترام سے سرابور تھا۔

"کیا کرتے ہو بھئی! یہ میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ اس کا

دورہ ختم ہو گیا ہے اب یہ خود بخود ٹھیک ہو رہا ہے۔ یہ دیکھو۔" ابھی میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ روشن دین نے آنکھیں کھول دیں۔ یوں جیسے وہ بہت عرصے سے بیمار ہو۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور اس کے رخساروں پر بھی سفید داغ سے ابھر آئے تھے۔

"ادہ میاں جی! پانی دو مجھے پانی دو میاں جی۔"

"لے میرے بچے پی۔ یہ لے، اور ان کو سلام کر۔ یہ اللہ کے پہنچے ولی ہیں جو تیری مدد کو آ پہنچے ورنہ آج تیرا بچنا محال تھا میرے لال۔" اس بوڑھے نے ایک گلاس اور بھر کر روشن دین کے لبوں سے لگایا جسے وہ بڑی آسانی سے پی گیا۔ اسے بہت پیاس لگی تھی دیکھتے ہی دیکھتے اس نے تین گلاس حلق سے نیچے اتار لیے اور پھر اچانک اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑ گئی جو داغ داغ ہو رہے تھے۔

"یہ... یہ کیا ہو گیا ہے مجھے میاں جی یہ داغ کیسے ہیں؟"

اس نے دیوانوں جیسی بے قراری سے اپنے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ رگڑا۔ مگر وہ داغ تو بہت نمایاں تھے۔ اندر کے کسی روگ کا پتہ دیتے تھے۔"

"پتہ نہیں میرے لال، کیا ہو گیا ہے یہ! اپنا شکر کر انھوں نے تیری جان بچالی ہے ان کے ہاتھ میں اللہ نے بڑی شفا رکھی ہے میرے بیٹے۔ ان کے پاؤں سے اپنا ماتھا رگڑ۔ اللہ کرم کرے گا۔ مرے بچے کر اپنا چوم لے ان کے پاؤں۔"

روشن دین احمقوں کی طرح کبھی مجھے دیکھتا تھا اور کبھی اپنے باپ کو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا اول فول بک رہا ہے۔ ایسا تو اس نے کبھی دیکھا ہو گا نہ سُنا ہو گا۔ اسے اپنے باپ کی ذہنی صحت مشکوک نظر آئی۔ وہ ہنسا۔ عجیب سے طنز بھرے انداز میں ہنسا مگر نقاہت نے اس کی آواز بلند نہ ہونے دی۔ اپنا گلا ہاتھ میں لے کر کھانستا ہوا بولا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو میاں جی؟ ان کے پاؤں کیوں چوم لوں؟ کیا دیکھا ہے ان میں تو نے؟ سدا کا وہمی ہے تو چل کسی ڈاکٹر کو دکھاتے ہیں یہ سالے داغ کہاں سے پیدا ہو گئے؟" پھر اس کی نظر تہمد میں سے جھانکتی ہوئی اپنی ٹانگوں پر جا پڑی اور وہ سراسیمہ ہو کر بولا۔

"یہ... یہ کوئی چیز بھر گئی ہے میرے بدن پر۔ کیا ہوا تھا مجھے —"

"پتہ نہیں بچے! تو نے ٹرک اُدھر مٹی پر چڑھا دیا تھا — جب ہم نے دیکھا تو تو بے ہوش تھا اور تیرا بڑا حال ہو رہا تھا۔ کچھ کریں مائی باپ! اپنا ہاتھ پھیر دیں میرے اس بدنصیب بچے پر۔" یہ کہکر اس آدمی نے زبردستی میرا دایاں ہاتھ پکڑ کر بڑی ہی اضطراری حالت میں چوم کر اپنے بیٹے کی ٹانگ پر رکھ کر آگے پیچھے پھیر دیا۔ اور... اور... میری بات کا شاید کوئی یقین نہ کرے۔ جہاں جہاں میرا ہاتھ پھرتا جاتا تھا وہاں وہاں سے روشن دین کے بدن کے داغ مٹتے جاتے تھے۔ اور اس کی وہ گندمی جلد معمول پر آتی جاتی تھی۔ یہ تماشا دیکھ کر میرا ذہن خود اپنے آپ سے اُلجھنے لگا اور میں نے گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"بتاؤ اس ٹانگ کو۔ یہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بس بس، ہمیں آپ کے یہی الفاظ کافی ہیں مائی باپ۔ یہی بہت کافی ہیں۔ اُٹھو میرے بچے، اُٹھو ان کو سلام کر۔"

اپنے داغوں کو میرے ہاتھ تلے مٹتے دیکھ کر روشن دین بھی دنگ رہ گیا تھا وہ دیوانہ وار آگے بڑھا اور بے اختیار ہو کر اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ میں نے جلدی سے اپنے پاؤں پیچھے کھینچے اور بڑے تلخ لہجے میں کہا۔ "بند کرو یہ بکواس۔ جاؤ اب اپنی راہ لو۔ کہاں جا رہے تھے تم؟"

روشن دین خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ اب وہ تینوں میرے سامنے سراپا عجز و نیاز بنے یوں کھڑے تھے کہ انھیں اگر حکم دیتا کہ خود کو آگ لگالیں تو شاید وہ اس سے بھی دریغ نہ کرتے۔

"کہاں جا رہے تھے تم؟" میں نے پھر پوچھا۔

"ہم کنجاہ جا رہے تھے سرکار۔ وہاں سے ہم مو کبی لائیں گے مائی باپ! ہمارے لیے دعا کریں۔"

کنجاہ کا نام سنتے ہی میرا ذہن زقند بھر کر پیچھے لوٹ گیا۔ وہاں ماجدہ تھی جس کو میں مل کر نہیں آیا تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس کو دیکھ لوں۔ مگر پھر میں نے اس خیال کو جھٹک دیا۔

"ٹھیک ہے جاؤ۔ اللہ تمھارا نگہبان ہو گا۔"

"ہمارے جوگا کوئی کام بتائیں ہمیں کوئی حکم دیں سرکار! ہم آپ کے قدموں کی دھول کو امرت سمجھتے ہیں۔" اس بوڑھے نے مجھے کوئی ولی ابدال ہی سمجھ لیا تھا۔ کنجاہ کا منظر بار بار میرے حافظے میں جھلملا رہا تھا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"اس عاجز کو فیروز دین کہتے ہیں سرکار! کوئی خدمت بتائیں اور مجھے اپنا پتہ بھی دے دیں مائی باپ۔" وہ عاجزی اور انکساری کی تصویر بنا تھا وہ فیروز دین۔

"دیکھو میرا ایک کام کرنے آؤ۔"

"ہزار کام کہیں میرے بادشاہ! مجھے اپنے کُتّے کا بھی غلام سمجھیں۔"

"تم بکواس بہت کرتے ہو فیروز دین! سنو..." یہ کہہ کر میں نے اسے ماجدہ کے اسکول اور گھر کا پتہ بتایا جو فیروز دین کے کہنے پر اس کے بیٹے احمد دین نے ٹرک میں رکھی ایک کتاب میں

لکھ لیا۔ میں نے فیروز دین سے کہا۔ "دیکھو میں کل شام کو چھ بجے ادھر اسی جگہ پر ملوں گا۔ تم ماجدہ کو اپنے ساتھ ٹرک میں بٹھا کر لے آنا۔ یہ میری نشانی ہے اسے دے دینا۔ وہ سمجھ جائیگی۔" میں نے ماجدہ کا دیا ہوا رومال جیب سے نکال کر اسے دے دیا۔

"بہت بہتر سرکار، آپ فکر نہ کریں اگر وہ بی بی آگئی تو میں ضرور لے کر آؤں گا۔ ورنہ میں آپ کو یہاں بتا ضرور جاؤں گا، مائی باپ آپ بے فکر رہیں۔"

"اپنا پتہ بھی مجھے بتا دو۔"

"ہم ادھر لکھو ڈھیر میں رہتے ہیں سرکار۔ محمود بوٹی کے قریب۔ میں آپ کو پتہ لکھ دیتا ہوں۔" یہ کہکر اس نے احمد دین سے کہکر ایک پُرزے پر اپنا پتہ لکھ کر مجھے دے دیا۔

"ٹھیک ہے میں کل شام چھ بجے تم سے یہیں ملوں گا۔"

"آپ کی بڑی مہربانی سرکار! کچھ میرے لال پر مہربانی ضرور کریں۔ اس کا منہ دیکھیں کیا ہو گیا ہے۔ چھکتے پڑ گئے ہیں۔"

"اللہ کرم کرے گا۔ جاؤ اب اپنی راہ کھوٹی نہ کرو۔" میں نے روشن دین کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا سارا ہی منہ داغ داغ ہو رہا تھا۔

وہ تینوں مجھے جھک کر سلام کرتے ہوئے میری طرف منہ کئے یوں پیچھے ہٹے جیسے کوئی اپنے پیر کے مزار پر سلام کر کے اس کی طرف پیٹھ موڑ کر چلنے کو گناہ کبیرہ تصور کرتا ہو۔ فیروز دین کے دونوں بیٹے ٹرک میں جا بیٹھے تو وہ خود کچھ سوچتا ہوا پیچھے مڑا اور بولا۔

"سرکار میرا گناہ معاف کر دیں کیا یہ بہتر نہ ہو گا مائی باپ کہ آپ آج کی رات اور کل کا دن مجھ غریب کی جھگی میں گزاریں۔ میں ماجدہ بی بی کو لے کر وہاں کل حاضر ہو جاؤں گا۔"

اس نے بڑی معقول بات کہی تھی۔ "ٹھیک ہے! اگر تمھیں تکلیف نہ ہو تو مجھے یہ بات پسند آئی ہے۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اس کا گھر میرے لیے جائے اماں ثابت ہو سکتا تھا۔ میں اپنی سیاہ بختی کی وہ رات اس کے گھر میں گزار لینا ہر لحاظ سے غنیمت سمجھ رہا تھا۔ میری بات سن کر وہ اپنی جگہ یوں خوش ہو گیا جیسے اسے دنیا جہان کی دولت ہاتھ آگئی ہو۔

بولا۔ "اوئے کاکا خوش ہو جاؤ سرکار مان گئے ہیں۔ حضور ہمارے گھر ٹھہریں گے آج رات۔ اوئے تمھاری خوش نصیبی کی رات آگئی چلو واپس چلو۔" یہ کہہ کر اس نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کا دروازہ کھولا اور مجھے بڑے ادب سے اندر بٹھا کر اس نے نہایت احتیاط سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے احمد دین کی طرف گیا اور بولا۔

"حضور آج رات ہمارے گھر پر رہیں گے۔ کل کا دن بھی وہ وہیں گزاریں گے۔"

"اچھا یہ تو بہت اچھا ہوا میاں جی۔ چلو ان کو پہلے میں گھر پر پہنچاتا ہوں۔ ہمیں تو اللہ نے اپنی رحمت میں لے لیا ہے۔" وہ بھی یوں خوش ہو گیا جیسے اسے کوئی عجوبۂ روزگار شے مل گئی ہو۔ اُن کی احمقانہ باتیں سُن سن کر میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ٹھیک ہے سالو بنا لو مجھے اپنا پیر اور ولی۔ تمھاری توہم پرستی آج رات میرے بہت کام آئے گی۔ میں اس ویران اداس — اور منحوس رات میں اپنی بدنصیبی کو ساتھ لیے کہاں مارا مارا پھرتا تمھارے گھر کی کوئی جھلنگا سی چارپائی اور ٹوٹی پھوٹی سی کوٹھری اس ویرانے میں خوار و زبوں ہونے سے میرے لیے ہزار بہتر ہو گی۔

اب ٹرک احمد دین نے سنبھال لیا تھا۔ وہ بھی ڈرائیونگ جانتا تھا۔ روشن دین کو بیماری کے اس حملے کے بعد سخت آرام کی ضرورت تھی۔ احمد دین نے اسی وقت ٹرک کا رُخ موڑا اور واپس چل دیا۔ فیروز دین اور روشن دین ٹرک کے پچھلے حصے میں سوار تھے۔ میں نے دل میں کہا اچھا ہے منڈو... تمھارا یہ وطیرہ مجھے خوش کر گیا ہے۔ تم سب عقل سے پیدل ہو میرے جیسے عقل سوار کے لیے تم اچھی کاٹھی ثابت ہو سکتے تھے۔ میری اس تیرہ بختی کی رات اور صبح کی امید افزا روشنی کے درمیان تم مضبوط پل کا کام دے سکتے ہو مجھے تم ایسے ہی کاٹھ کے الوؤں کی تلاش تھی کیونکہ میں تو وہ آدمی ہوں جس کے نتھنوں میں بدنصیبی نے تیر دے رکھا ہے میری تو اوقات ذلت اور خواری ہے۔ میں شاید مچھلی کا جایا ہوں کہ مجھے کسی نے تیرنا تو نہیں سکھایا مگر میں اپنی اس خوبی کے سبب صاف ستھری ندی سے نکل کر گندے غلیظ سمندر میں آگرا ہوں اور اب یہ مصائب و آلام سے لبریز ساگر مجھے راہ نہیں دیتا۔ میں لوٹ نہیں سکتا اور باہر نکلوں گا تو مر جاؤں گا مگر میرے متکلین یہ سمجھتے ہیں کہ میں خدا کی کوئی برگزیدہ ہستی ہوں۔ کوئی ولی ہوں ابدال ہوں مجھ پر ہزار لعنت کہ تقدیر نے یہ نیا رُوپ بھی مجھے ابھی بخشا تھا" تاکہ میں اپنے آپ سے ہی شرمسار ہو جاؤں اور تنگ آکر اپنے ہی وجود کی نفی کرنے لگوں۔

رات نے اپنا جوڑا کھول لیا تھا۔ چاروں طرف گھُپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ٹرک کی روشنیاں اس اندھیرے کو چیرتی چلی گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ محمود بوٹی گاؤں میں سے گزر کر لکھو ڈھیر پہنچے اور ایک خاصی چوڑی گلی میں سے گزر کر ایک مکان کے سامنے رُک گئے۔

فیروز دین اُچھلتا ہوا آگے آیا اور دروازہ بڑے ادب سے کھول کر بولا۔ "آئیں حضور میرے گھر پر اپنی برکت کا سایہ ڈالیں

مجھ عاجز پر کرم کی نظر کریں۔"

اس کی وہ نرمی و گداختگی عجز و انکساری اور لہجے کی وہ حیران کن فروتنی مجھے حیران کر رہی تھی۔

"میں ایک شرط پر تمہارے گھر ٹھہروں گا۔"

"ہزار شرطیں بتائیں سرکار! کہیں تو میں سارے گھر کے سارے جنوں کو باہر نکال دوں۔"

"نہیں بھئی ہماری شرط یہ ہے کہ تم ہمارے بارے میں کسی بھی آدمی سے کچھ نہیں کہو گے۔ بس ہم گمنام رہنا چاہتے ہیں۔" میں نے بھاری بھر کم لہجے میں کہا۔ ایسے لہجے میں جس کا طنطنہ اپنا کام دکھائے۔

"جو حکم سرکار میرے گھر میں رحمت آئی ہے میں کسی سے اس کا ذکر کیوں کروں گا۔ اپنی بدنصیبی کو آواز دینی ہے مجھے حضور بالکل بے فکر رہیں۔"

"بس ٹھیک ہے۔ اس شرط پر ہم تیری جھونپڑی میں رات گزار لیں گے۔" میں نے خاص قلندرانہ انداز سے کہا۔

اس نے بڑے ادب سے مجھے ٹرک پر سے اتارا اور گھر کے کھلے دروازے میں سے اندر لے گیا۔

سامنے کھلا صحن تھا اس میں سے گزار کر اس نے مجھے ایک کمرے میں لے جا کر صاف ستھرے پلنگ پر بٹھا دیا۔ اس کے دونوں لڑکے ابھی باہر ہی تھے۔

"روشن کے میاں تم واپس کیوں آ گئے ہو؟" ایک عورت نے دروازے کی اوٹ میں رک کر پوچھا۔

"بتاتا ہوں بھلی لوک بتاتا ہوں ذرا دم لے۔ تجھے پتہ نہیں ہمیں آج کتنی بڑی دولت مل گئی ہے۔" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ دروازہ وہ اپنے پیچھے بڑی آہستگی سے بند کر گیا تھا۔ میں پاؤں لٹکا کر پلنگ پر بیٹھا کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ فیروز دین خاصا خوش حال آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کمرے کے ایک سمت پر دیوار کے ساتھ ایک اونچے پایوں پر کھڑا بڑا سا ٹیلیویژن سیٹ رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ لمبی دیوار کے ساتھ ساتھ دو صوفے دھرے تھے جن کے سامنے دو لمبی لمبی میزیں پڑی تھیں۔ فرش پر اس نے سرخ اور نیلے رنگ کی موٹی دری بچھا رکھی تھی۔ دیواروں پر ملک کے مختلف رہنماؤں کی تصویریں آویزاں تھیں جن میں سب سے نمایاں قائداعظم کی تصویر تھی جو دیوار کے عین وسط میں تھی اور دوسری تصویروں سے خاصی بڑی تھی۔

پلنگ اور کمرہ دونوں بڑے آرام دہ دکھائی دیتے تھے۔ میں نے دل میں کہا عیش کر غلام جیلانی بچے! پتہ نہیں کس کی دعا کی برکت سے آج رات یہ صاف ستھرا پلنگ اور یہ آرام دہ کمرہ تجھے میسر آ گیا ہے ورنہ تو اس لائق ہرگز نہیں ہے۔ تیرے کرتوت تو ایسے ہیں کہ یار لوگ تجھ پر تھوکنے کے بعد بھی چھوڑ دیں۔ تجھے کر کر گڑھے میں دفن کر دیں تو بھی کسی کو ملال نہ ہوگا۔ تیری جیب تپ تو گولی اور بندوق ہے۔ خون کی ہولی تیرا شغل ہے۔ تیری رکابی میں بھات خدا جانے کیسے ڈال دیا جاتا ہے۔

میں کتنی ہی دیر تک اسی سوچ میں غرق بیٹھا رہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ہاتھ میں واقعی شفا آ گئی ہے یا اس بدبخت کا دورہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا تھا۔ یہ امر میرے لیے لاینحل معمہ بنتا جا رہا تھا۔ تقدیر کی ٹھوکر مجھے دہلائے دیتی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ صبح جو سورج طلوع ہوگا وہ لہو رنگ ہوگا کہ سنہری ہوگا۔

میرے گناہوں کی فہرست طویل ہوتی جا رہی تھی اور اسی حساب سے میرے دل کی پشیمانی بھی بڑھتی جا رہی تھی اور میں سوچتا تھا کہ مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے۔ میری ماں نے میرے لیے یہ سپنے تو کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اسے تو اپنے اس جیلانی سے محبت تھی جو راستی پر تھا، راستبازی کا پرستار تھا جس نے تسبیح خوانوں ایسا مزاج پایا تھا۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی یہ نہیں دیکھا ہوگا کہ اس کا بیٹا ڈاکو لٹیرا اور قاتل بن جائے گا۔ مگر میں بن چکا تھا اور بلا در کی رکھ میں جو میرے باباجی نے کہا تھا۔ "تیرے بھی بس میں کچھ نہیں ہے بچے۔" تو انھوں نے ٹھیک ہی کہا تھا میرے بس کا تو یہ حال تھا کہ مجھے اپنے اوپر بھی کوئی اختیار حاصل نہیں رہا تھا۔ مجھے گناہ کی تلوار نے ٹنڈ منڈ کر کے رکھ دیا تھا۔ اب میرے شجر کی شاخوں پر کوئی خوشبودار پھول نہیں اگتا تھا کہ جرم و عصیاں کی برف نے مجھے لتاڑ کر رکھ دیا تھا۔

ابھی کوئی پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ فیروز دین ایک صاف ستھرے جگ میں دودھ بھر کے لے آیا تھا۔

"یہ لیں حضور، یہ دودھ پئیں ہماری اپنی بھینس کا دودھ ہے قبول کریں۔"

وہ اس گھڑی میری تواضع کے لیے بہت عمدہ چیز لایا تھا دودھ گرم تھا اور اس میں ڈھیر ساری بالائی موجود تھی۔ میں نے ایک گلاس پیا تو ایک اس نے اصرار کر کے اپنی خوشی کی خاطر مجھے پلا دیا۔ میں بہت ہی تھکا ہوا تھا۔ اس دودھ نے میرے دل و دماغ میں تازگی پیدا کر دی۔ فیروز دین کا کمال یہ تھا کہ وہ پچارا دینے میں ماہر تھا۔ آدمی کو ایسا تیل لگاتا تھا کہ وہ اس کے ہاتھ میں موم کی ناک بن جاتا تھا۔ میرے سلسلے میں تو اس نے اپنی ساری توانائیاں اس بات پر صرف کر دیں کہ جس طرح بھی بن پڑے، وہ میری خوشنودی حاصل کر لے۔ وہ مجھے واقعی کوئی پہنچا ہوا بزرگ سمجھ بیٹھا تھا۔ حالانکہ میں داڑھی مونچھ منڈا پانچوں عیب شرعی کا حامل

پھٹا ہوا بدمعاش آدمی تھا۔ میری صورت ہی مکروہ ہو چکی تھی شاید مگر اس میں بھی اسے نور جھلکتا نظر آتا تھا۔

میں نے دل میں کہا ٹھیک ہے فیروز دین جی! تو مجھ کو پوجنے لگا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں اپنی اس حماقت کی دلدل میں دھنستا چلا گیا ہے مجھے تو رات ہی گزارنی ہے۔ وہ ویرانے میں گزرتی تو بہت بے آرام ہوتا، صبح تک سارے لوگوں کو گالیاں دیتا رہتا مگر اب تو مہربان ہو گیا ہے تو ٹھیک ہے بھلے ہی سہی۔ مگر مجھے نہیں معلوم کہ تو اپنی اس عبادت کو، اپنی اس عقیدت اور احترام کے بے پایاں جذبے کو کس طرح پٹیل رہا ہے میرے جیسے گناہ کے جذام میں مبتلا آدمی کو تو سمجھا تو ہوتا میرے یار۔

میں نے کمبل اپنے بدن پر اچھی طرح لپیٹا اور سگریٹ سلگا کر یوں پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا جیسے میں واقعی کوئی پہنچا ہوا بزرگ ہوں۔ اپنے اس حال پر مجھے بہت ہنسی آ رہی تھی مگر میں کھل کر ہنس نہیں سکتا تھا لیکن ہوا یوں کہ اس صورت حال پر غور کرتے کرتے میں آپ ہی آپ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

فیروز دین برتن لے کر ساتھ کے کمرے میں گیا تھا۔ اس نے میرا قہقہہ سن لیا تھا۔ بولا۔

"دیکھا تم نے برکتے! حضور خوش ہو گئے ہیں ہماری اس خاطر تواضع سے۔ اب تو یوں کر کہ ایک مرغی چھیل دے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے روشن کے میاں! پر تو نے سوچا بھی ہے کچھ۔ وہ نکی کہہ رہی تھی کہ اس کے پاس بندوق بھی ہے کمبل کے نیچے سے نکال کر اس نے گدے تلے رکھ دی ہے۔ پتہ نہیں کس کو اٹھا لایا ہے تو۔"

"زیادہ بڑبڑ نہ کر ماں! وہ بھسم بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ان کا معجزہ دیکھا ہے۔ بھائی کو انھوں نے موت کے منہ سے بچا لیا ہے۔" یہ احمد دین کی آواز تھی۔ وہ اپنی ماں پر خفا ہو رہا تھا۔

"اچھا بابا تم جانو اور تمہارا کام۔ مجھے تو یہ کوئی وارداتیا معلوم پڑتا ہے ولی ہے تو بندوق کیوں لیے پھرتا۔ دھاڑے تو نہیں مارتے ہیں پیر فقیر۔"

"پھر وہی بک بک! ایک تو اس عورت کی کھوٹی مت الٹی ہے مجھے اری نیک بخت۔ ان فقیروں کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔ سات جنم سانپ لیتا ہے تو تب وہ گٹھ بھر کا آدمی بنتا ہے۔ فقیر کو تو پتہ نہیں ولایت کا درجہ حاصل کرنے کے لیے کتنی صعوبتیں جوکھم جھیلنا پڑتا ہے اگر تیری سمجھ میں کچھ نہیں آتے گا تو جا تو ادھر مرغی بھون دے۔ تو ذبح کر دے احمد دین۔" یہ کہہ کر فیروز دین شاید صحن میں نکل گیا تھا کیونکہ اس کے قدموں کی چاپ دور ہوتی جا رہی تھی۔

تو یہ قصہ ہے گویا۔ یہ سالی برکتے ہماری کرامت کا یقین ہی نہیں رکھتی ہے۔ اس کا کچھ بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔ خاصی موٹی تھی وہ۔ عمر اس کی بھی کوئی چالیس سال ہوگی۔ اچھی صحت تھی اس کی اور ناک نقشہ بھی اچھا اور ابھی دلفریب تھا مگر دماغ — اس نے کافر کا پایا تھا۔ ہم پر ایمان ہی نہیں لا رہی تھی۔ اور یہ نکی پتہ نہیں کس بلا کا نام تھا۔ وہ شاید دروازے کی جھریوں میں سے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ میں نے واقعی اپنی اسٹین گن کندھے سے اتار کر گدے کے نیچے رکھی تھی تاکہ ذرا کھل کر پلنگ پر بیٹھ سکوں مگر وہ سالی میری جاسوسی کرتی پھر رہی تھی اسے یہ نظر نہیں آیا کہ سامنے کتنا بانکا سجیلا جوان بیٹھا ہے۔ اونچا لمبا چوڑا چکلا، کھلتے رنگ اور شربتی آنکھوں والا۔ اس بات پر غور ہی نہیں کیا تھا اس نے۔ دیکھا تو صرف یہ دیکھا کہ میں نے کندھے پر بندوق بھی لٹکا رکھی تھی اور اس برکتے سے کوئی پوچھے اری بھلی مانس تو مجھے کب سے جانتی ہے تجھے کس نے بتایا کہ میں کوئی وارداتیا ہوں۔ کتنا رذیل لفظ استعمال کیا تھا اس نے میرے لیے۔ زبردست گستاخی کی تھی اس نے فیروز دین کے پیر صاحب کے حضور۔

میں نے پلنگ پر رکھا گاؤ تکیہ کمر کے پیچھے رکھا اور ذرا ٹانگیں پسار کر نیم دراز ہو گیا۔ وہ میرا کمبل میرے لیے پوٹ کی چادر بنا ہوا تھا۔ ہر جگہ میرے کام آتا تھا جب میرا دم بہت گھٹتا تھا اور مجھے دنیا قبر کی طرح تنگ اور تاریک نظر آتی تھی تو اس گھڑی وہ کمبل مجھے کسی بانکی سجیلی نار کے ارمانوں بھرے دوپٹے کی طرح ڈھانپ لیتا تھا۔ میں بہت ہی مضمحل ہوتا تھا۔ اتنا مضمحل کہ اپنا آپ مجھے ہر آنکھ کے سامنے عریاں نظر آتا تھا تو اس گھڑی بلاشبہ وہ کمبل میرے لیے پوٹ کی چادر بن جاتا تھا اور اس رات بھی میرے تصور میں کفن ہی ابھر رہا تھا کہ میں موت کے لب چوم کر واپس آیا تھا۔ ورنہ ان پولیس والوں نے مجھ پر جس طرح گولیاں برسائی تھیں۔ اس بڑھیا کی چھت پر سے بھاگتے وقت وہ ایسی تھیں کہ مجھے کاٹ کے ڈال سکتی تھیں۔ یہ انگلی برابر لمبی لمبی گولیاں چلاتے ہیں وہ۔ اور بے دریغ چلاتے ہیں۔ جانتے ہیں سرکاری مال ہے۔ لٹاؤ جس طرح بھی لٹتا ہے۔ وہ خود خریدیں تو پتہ چلے کہ ایک گولی پانچ روپے سے کم میں ہرگز نہیں پڑتی اور جسے لگتی ہے اسے بہت ہی مہنگی پڑتی ہے۔ زندگی کے عوض۔ خوف کے بھاؤ—

کوئی دس منٹ بعد فیروز دین میرے کمرے میں واپس آ گیا بولا۔ "سرکار اب ہمیں اجازت دیں آج رات ہمارا کنجاہ پہنچنا بہت ضروری ہے وہاں سے مال اٹھانا ہے۔ میری بیوی ہو اور بیٹی نکی آپ کی خدمت کریں گی۔ روشن دین کو بھی میں آپ کی خدمت کے لیے

یہاں چھوڑ رہا ہوں۔ بس کل شام تک ہم واپس آجائیں گے۔"

"ٹھیک ہے فیروز دین! ہمیں کچھ عجیب سا لگتا ہے یہاں دیکھو تم سے ہمارا کوئی رشتہ ہے نہ ناطہ۔ ہمیں بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے یہاں۔ دل چاہتا ہے یہاں سے ہم ابھی چل دیں۔" میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"لیکن سرکار ایسا ظلم نہ کریں۔ سرکار ابھی تو آپ کو روشن دین پر دم درود بھی کرنا ہے۔ وہ بکی بھی بکروی نہیں رہتی ہے اسے بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی حضور! میں کل شام تک ضرور.... آجاؤں گا اور ماجدہ بی بی کو بھی ساتھ لے آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے بھائی جی! ادھر لحاف رکھوا دو ایک۔ وضو کے لیے تھوڑا پانی اور ایک مصلّیٰ بھی بھیج دو۔"

"آپ فکر نہ کریں حضور، برکتے آپ کو ساری چیزیں مہیا کر دے گی اچھا اب اجازت دیں۔" یہ کہہ کر اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور میرا ہاتھ آنکھوں سے لگا کر باہر چلا گیا۔

اس اپنے کی سادگی مجھے حیران کیے دیتی تھی۔ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں اس دنیا میں۔ اللہ کی شان ہے۔ وہ باہر چلا گیا تو تھوڑی ہی دیر بعد برکتے اپنے سر پر دوپٹہ درست کرتی ہوئی اندر آئی وہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا اور وضو کے لیے پانی کا لوٹا ایک طرف اور غالیچہ نما مصلّیٰ دوسری طرف رکھتی ہوئی بولی۔

"آپ نماز پڑھ لیں بابا جی پھر میں کھانا لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ٹھمک ٹھمک چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ مجھے حیرت تھی کہ اس کی ہڈیاں تو جسم میں کہیں نظر ہی نہیں آتی تھیں۔ بہت ہی گول مٹول جسم کا بدن تھا اس کا۔

رات کو گیارہ بجے کے قریب ان لوگوں نے مجھے کھانا کھلایا۔ مرغ تو اس برکتے اور اس کی بہو نے پکا لیا تھا مگر مزہ اس کا صرف اتنا تھا کہ اس میں کچے گھی کی بساند تھی اور پیاز کی بو۔ میں نے جوں توں کر کے وہ کھانا زہر مار کیا اور کمرے کا دروازہ اندر سے چٹخنی لگا کر بند کر دیا۔ اب میں بالکل مطمئن تھا۔ میرے دشمن اس رات میری ہوا کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ مجھے میرے مولا نے ایک نئی چھت مہیا کر دی تھی۔ جو بڑھیا کی چھت سے ہزار گنا زیادہ بہتر اور محفوظ تھی۔

صبح میں منہ اندھیرے ہی بستر سے اٹھ گیا۔ برکتے تو شاید فجر کی اذان پر ہی بستر چھوڑ دیتی تھی۔ صحن میں سے اس کے جوتوں کی سٹر پٹر سنائی دے رہی تھی۔ میرے کمرے کی بتی اس نے جلتی دیکھی تو دروازے پر آگئی بولی۔

"آپ اٹھ گئے ہیں سرکار۔" یہ سرکار کا لفظ وہ فیروز دین اس کے منہ میں ڈال گیا تھا ورنہ جو کچھ اس نے میرے بارے میں بکواس کی تھی وہ میں اپنے کانوں سے سن چکا تھا۔ بہت گھٹیا عورت تھی وہ۔ دل میں اس کے کچھ تھا اور زبان پر کچھ۔

"جی ہاں! مائی جی میں اٹھ گیا ہوں۔" اسے چڑانے کے لیے اس کی عمر میں نے ایک ہی جست میں تیس سال بڑھا دی۔ مائی جی کا لفظ میرے منہ سے سن کر وہ کچھ سٹپٹا سی گئی مگر تڑکی بہ تڑکی جواب دینے سے باز نہ رہی بولی۔

"نماز کے لیے پانی رکھ دوں بابا جی۔"

"ہاں دے دیں اذان تو ہو بھی گئی ہے۔" میں نے پلنگ سے اتر کر کہا۔ حالانکہ نماز میں نے رات بھی محض دکھاوے کے لیے پڑھی تھی۔ خدا میرے گناہ معاف کرے۔ ان لوگوں نے خواہ مخواہ مجھے ایسے بانس پر چڑھا دیا تھا کہ مجھے بلا وجہ اپنے زہد و تقویٰ کا ڈھونگ رچانا پڑ رہا تھا۔ ورنہ کہاں میں کہاں میرا معصیت سے لبریز دل اور کہاں خدا کی یاد۔ اس روشنی سے تو میں شاید ازل سے محروم تھا کہ میری تقدیر میں وہ سجدہ لکھا ہی نہ تھا جو آدمی کو ہزار سجدوں سے واقعی نجات دلا دیتا ہے۔

میں نے دروازہ کھولا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ وضو کا لوٹا ہاتھ میں لیے۔ وہ عجیب کینڈے کی عورت تھی۔ شوقِ خود نمائی میں ابھی تک مبتلا تھی۔ مجھ سے کانا گھونگھٹ نکال کر اس نے لوٹا میرے ہاتھ میں دیا اور بڑے گھٹے گھٹے لہجے میں بولی۔

"آپ کو نیند تو اچھی طرح آئی تھی نا؟"

"ہاں میں خوب سویا ہوں۔"

"آپ نماز پڑھ لیں پھر زینب آپ کے پیر دبا دے گی۔"

"کیوں؟ میرے پاؤں کو کیا ہوا ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میاں جی کہہ گئے تھے کہ ہم آپ کی خدمت خاطر میں کوئی کسر نہ رکھیں۔ مجھے بھی بڑی آس ہے جی آپ سے۔"

"نہیں نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے درشت لہجے میں کہا اور دروازہ اندر سے بھیڑ کر وضو کرنے لگا۔ کمرے کے کونے میں ایک کھرا سا بنا تھا جس میں سے پانی نالی کے ذریعے باہر نکل جاتا تھا۔

نماز پڑھ کر میں جلدی ہی مصلّے سے اٹھ گیا۔ مجھے کرنا ہی کیا تھا۔ صبح کی نماز تھی دو سنتیں دو فرض۔ الحمد للہ اور خیر سلّا، اور کوئی دم درود، اسم وظیفہ تو نہ مجھے یاد تھا نہ میرے دل میں اس کا کوئی شوق ہی تھا۔ مصلّے سے اٹھ کر میں پلنگ پر جا لیٹا کہ ابھی صبح ہونے میں بڑی دیر تھی۔ میں نے اندر سے کنڈی چڑھائی اور لحاف کو اپنے گرد لپیٹ کر بیٹھ گیا۔

میں نے اپنی سوچوں کے تانے بانے میں پھنس کر وہیں لحاف کے اندر بیٹھ کر کئی سگریٹ پھونک ڈالے پھر بھی میرا ذہن صاف نہ ہو

سکا۔ ابھی سورج نکلنے میں خاصی دیر تھی۔ میں ایک بار پھر لحاف میں منہ ڈال کر سو گیا۔

وہ عجیب سی بھیدوں بھری نیند تھی جو کسی خمار آگیں بن گئی کر مجھے دور دور تک بانہوں میں بھر کر لیے پھرتی رہی۔ اس نیند نے مجھے اس تھوڑے سے عرصے میں کئی گھر دکھا دیے۔ میں دور دور تک ہو آیا تھا کہ آہستہ آہستہ میرے ذہن میں ایک چہرہ ابھرا اور میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ مسند آرا میرے خواب کی بصارت پر نازل ہو رہی تھی۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور نہ اسے سر کا ہوش تھا اور نہ سرپوش کا۔ وہ مجھے خالی خالی سی ویران اور اجڑی اجڑی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے مگر وہ بات نہیں کرتی تھی۔ مجھے اس نے چند ثانیوں تک گہری گہری نظروں سے دیکھا اور پھر آخ تھو کرتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ اس آخ تھو کی آواز اتنی واضح تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں اسے پکار رہا تھا مگر نیند جب ٹوٹی تو معلوم ہو کہ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بس میں تھا، اور میری تنہائی تھی۔

میں ایک بار پھر اٹھ بیٹھا۔ گھڑی میں اس وقت سات بج رہے تھے اور باہر روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ مسند آرا کے خواب کی توجیہہ میں کر سکتا تھا۔ اپنے جرم کا مجھے علم تھا اور میں جانتا تھا کہ مسند آرا بھی اچھی طرح ان تمام واقعات سے آگاہ ہے جو پیش آ چکے ہیں۔ کوئی بات اس سے پوشیدہ نہ رہ سکی ہوگی کہ میرے اور اس کے درمیان جو لاسلکی اور غیر مرئی تعلق قائم ہے وہ اتنا گہرا مضبوط اور واضح ہے کہ میں جن مراحل سے بھی گزرتا ہوں وہ ان سے آپ ہی آپ آگاہ ہوتی چلی جاتی ہے۔

میں نے بستر چھوڑ دیا۔ ناشتہ کرنے سے پہلے میں نے بکّی کو بلوا کر ہاتھ منہ دھویا اور تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں جس طرح بھی ہو سکا مسند آرا سے ضرور مل لوں گا تاکہ اسے ساری صورت حال سے خود آشنا کر دوں، وہ وجوہات اسے بتا دوں جن کی بنیاد پر میں نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ یہی بات سوچ کر میں نے ناشتہ کرنے کے بعد روشن دین کو آواز دی۔ وہ بیچارا بھاگتا ہوا آیا، بولا۔

"حکم پیر سائیں، حکم۔ مجھے معاف کر دیں میری نیند جلدی نہ کھل سکی مجھے ابھی ماں نے جگایا ہے۔" اس کی آنکھوں میں ابھی تک نیند کا خمار باقی تھا اور چہرے پر سفید سفید سے داغ ابھی تک موجود تھے۔

"دیکھو میں تھوڑی دیر کے لیے شہر جا رہا ہوں شاید دوپہر تک واپس آجاؤں اگر دوپہر کو نہ آسکا تو شام تک میں بہرحال آجاؤں گا۔ ماجدہ بی بی شاید فیروز دین کے ساتھ آجائیں۔"

"ٹھیک ہے پیر سائیں! لیکن آپ کوئی چیز منگوانا چاہتے ہیں تو میں لا دیتا ہوں۔"

"نہیں مجھے ایک آدمی سے ملنا ہے۔"

"بہت بہتر پیر سائیں۔ پر شام کو واپس ضرور آجائیں ورنہ میاں جی میری جان نہیں چھوڑیں گے۔" برکتے اور زینب اس وقت باہر دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھیں۔ ان کی موجودگی محسوس کر کے میں نے بلند آواز سے کہا۔ "فکر نہ کرو میں ضرور آجاؤں گا مگر اپنی ماں اور اپنی بھابی سے کہو کہ وہ آج پاک صاف ہو کر مصلّے پر بیٹھیں اور عصر کی اذان تک قرآن کریم پڑھتی رہیں۔ ان کو باندھ کر بھی بٹھانا پڑے تو ضرور بٹھانا۔ ورنہ ان کی وجہ سے اس گھر میں زبردست تباہی آسکتی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے سٹین گن احمد دین کو گدا الٹ کر دکھائی — "یہ میری بندوق پڑی ہے یہاں خیال سے کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ سمجھا کہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے پیر سائیں بے فکر رہیں۔ میں ادھر کسی کو نہیں آنے دوں گا۔ تالا ہی ڈال دوں گا ادھر۔"

اس کی یہ بات سن کر میں صحن میں نکلا تو دیکھا کہ وہ دونوں سر جھکائے ابھی تک دیوار کے ساتھ کھڑی تھیں۔

"چلو اندر بیٹھو۔ کسی نے تمہیں سمجھایا نہیں ہے کہ غیر مرد سے پردہ کرنا چاہیے بدبختو چلو اندر۔" انہیں میں درشت لہجے میں ڈانٹتا ہوا صحن میں نکلا اور دروازہ کھول کر باہر گلی میں جا پہنچا۔

ابھی میں فیروز دین کی گلی عبور کر کے دوسری طرف بڑھا ہی تھا کہ سامنے سے مجھے ایک ہاکر نظر آیا۔ اس کی سائیکل اخباروں سے لدی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً ہی اس سے دو اخبار خریدے اور ان کو وہیں کھڑے کھڑے جستہ جستہ دیکھنے لگا۔ سیاسی خبریں بڑی سنسنی خیز تھیں مگر جرائم کی خبریں ان لوگوں نے اور زیادہ نمک مرچ لگا کر چھاپی تھیں۔ میں نے اخبار کا اندر کا صفحہ کھولا تو میری سٹی گم ہونے لگی۔ پولیس نے ایک بار پھر میری تصویر چھاپ دی تھی مگر اب کی بار اس میں میری گرفتاری کا انعام ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ خبر انھوں نے یہ دی تھی کہ پھانسی کی کوٹھری سے بھاگے ہوئے مجرم غلام جیلانی نے شہر میں کل شام کبری نام کے آدمی پر گولی چلا دی۔ کبری کی حالت نازک ہے۔ معلوم یہ ہوا ہے کہ کبری غلام جیلانی کو پہچان گیا تھا وہ اس کا پیچھا کر رہا تھا کہ اس سے جان چھڑانے کے لیے غلام جیلانی نے اس پر گولی چلا دی — مجرم کبری کو شدید زخمی کر کے بادامی باغ کی کچی آبادی میں ایک عورت حاجاں کے گھر . . . . . میں جا چھپا تھا۔ حاجاں نے بتایا ہے کہ مجرم دوڑتا ہوا اس کے گھر میں آگھسا۔ اس کے ہاتھ میں مشین گن تھی جس سے اس نے گھر والوں کو خاموش رہنے کا حکم دیا مگر پھر پولیس کے ڈر سے وہ ان سے کچھ کہے سنے بغیر چھت پر چڑھا اور چاروں طرف گولیاں برساتا ہوا فرار ہو گیا۔ پولیس کا کہنا ہے کہ مجرم بہت جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔

میں نے دونوں اخبار لپیٹ کر کمبل میں چھپائے اور اپنی قدمو

فیروزدین کے گھر پہنچا۔ میرا اس روز شہر میں نکلنا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ اخبار تو گھر گھر جاتے ہیں۔ ایک ایک تیز نظر آدمی شہر میں پڑھا ہے۔ میری گرفتاری پر انعام حاصل کرنے کے لالچ میں لوگ قدم قدم پر ایک دوسرے آدمی کو ٹھٹک ٹھٹک کر دیکھیں گے اور حالت یہ ہو گئی تھی کہ اب میں ہی پولیس کی نگاہ میں صوبے کا سب سے زیادہ اہم اور خطرناک مجرم تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس روز دوسروں سے بالکل الگ اشتہار کی صورت میں ایک بار پھر میری تصویر شائع نہ کرتے اس روز کے اخبار میں اور کسی بھی مفرور کی تصویر نہیں چھپی تھی۔ وہ سب لوگ پس منظر میں چلے گئے تھے اور ایک صرف غلام جیلانی ایسا تھا، جس کا انہیں نام یاد رہ گیا تھا۔

مجھے اگر کوئی اطمینان اس صبح حاصل ہوا تو وہ یہ تھا کہ کبری ابھی زندہ تھا۔ اللہ جانتا ہے اسے جان سے مار دینا میرا مقصد تو ہرگز نہیں تھا۔ میں صرف اسے اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ اگر وہ مجھ پر گولی نہ چلاتا اور وہ بھی یوں چھپ کر، تو میں اتنی بیدردی سے اس پر گولی کبھی نہ چلاتا مگر ابتدا اس نے خود کی تھی۔ بہر حال میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ وہ بچ جائے۔ اس کی موت سے مجھے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میرے منہ کو لہو لگ چکا تھا اور میں لوگوں کو بے دریغ قتل کر کے خوشی محسوس کرتا تھا۔ حاشا وکلا یہ بات ہرگز نہیں تھی ۔۔۔ میں ایسا کبھی نہیں چاہتا تھا۔ میں پیشہ ور قاتل بن کر زندگی گزارنا نہیں چاہتا تھا۔

ایک اور اطمینان جو مجھے ملا وہ یہ تھا کہ مجیدن کی ماں حلیماں نے پولیس کے سامنے بہت عمدہ بیان دیا تھا ایسا بیان جو اس کی جان بچانے کے لیے بہت کافی تھا۔ اس نے حاضر دماغی سے کام لیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس آبادی کا چوہدری جس نے حاجاں سے مکان کی قیمت وصول کی تھی میرے خلاف کوئی بیان نہیں دے گا کیونکہ اس کا میرے بارے میں کوئی بات کہنا حاجاں کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ اور اس چوہدری کے متعلق میں نے جو کچھ سنا تھا اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کو اپنی رعایا سمجھتا تھا اور یہ برداشت نہیں کرتا تھا کہ ان میں کسی کو بھی کسی کی طرف سے کوئی گزند پہنچے۔

میں نے جب فیروزدین کے دروازے پر دستک دی تو برکتے آگے بڑھی بولی، "کون ہے۔"

"میں ہوں بی بی، دروازہ کھول۔"

میری آواز پہچان کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ بڑے چاؤ سے بولی۔ "پیر سائیں آپ واپس آ گئے؟"

"ہاں میں نے استخارہ کیا ہے آج میرا اس گھر کے اندر رہنا بہت ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے روشن دین کو پھر میری ضرورت پڑ جائے۔" میں نے بڑے دبنگ لہجے میں کہا۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا صحن عبور کرنے لگا۔ زینب اس گھڑی دائیں ہاتھ نلکے پر کھڑی دانت مانجھ رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ ابھی ویسے ہی کھلا تھا جیسے میں چھوڑ گیا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو روشن دین میری اسٹین گن کو ہاتھ میں لیے اس کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو روشن دین، بری بات ہے۔ ہمارے اس کھونٹے کو وہیں رکھ دو۔"

اس نے گھبرا کر مجھے دیکھا اور اسٹین گن فوراً گدے کے نیچے چھپا دی۔ "آپ ہا آپ واپس آ گئے پیر سائیں۔ آپ تو۔۔۔"

"ہاں یار۔ بس تیری وجہ سے میں واپس آ گیا ہوں۔ میرا حساب بتاتا ہے کہ تجھے آج پھر میری ضرورت پڑ جائے گی۔" میں نے نہایت ہی فلسفیانہ لہجے میں اسے اپنی واپسی کی وجہ بتائی وہ گھبرا گیا بولا۔

"آپ کی بڑی مہربانی ہے پیر سائیں! مجھے کوئی تعویز دے دیں میں باندھ لوں گا بہت ڈر گیا ہوں۔"

"دیکھیں گے کیا ہو سکتا ہے تو ابھی اندر جا کر آرام کر اور دیکھ اپنے بدن پر زیتون کے تیل کی مالش کر جہاں جہاں بھی داغ ہیں۔ ہاں تیل لگا دے جا شاباش۔"

میری یہ بات سن کر وہ فوراً ہی باہر نکل گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور لحاف کھول کر ایک بار پھر پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ اگر فیروزدین کے گھر والوں میں سے کسی ایک نے بھی آج کا اخبار دیکھ لیا تو وہ مجھے پہچان لیں گے۔ میری حماقت کی حد یہ تھی کہ میں نے اپنے چہرے کو بدلنے کے لیے اور لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے ابھی تک کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

مصیبت یہ آن پڑی تھی کہ پولیس والوں نے میری وہ تصویر بھی چھاپ دی تھی۔ جس میں میرے چہرے پر لمبی داڑھی تھی اور وہ بھی شائع کر دی تھی جس میں میری ڈاڑھی اور مونچھیں منڈی ہوئی تھیں اب فرق صرف یہ آ پڑا تھا کہ میں نے اپنے لبوں پر یہ بڑی بڑی مونچھیں پال لی تھیں اور انہی کے پردے میں میں اپنی شناخت کو چھپائے پھرتا تھا مگر اس حال میں کہ میں اپنے سائے سے بھی لرزاں تھا۔

فیروزدین کے گھر میں واپس پہنچ کر میں نے سکھ کا سانس لیا۔ میرے دل کی بے ترتیب دھڑکنیں معمول پر آنے لگیں تو میں نے ایک بار پھر دونوں اخباروں میں چھپی خبر بڑی تفصیل سے پڑھی۔ حیرت مجھے یہ ہوئی کہ اس میں دل شیر آہو کا ذکر علاقے کے سرکردہ سیاسی نمائندے کی حیثیت سے کیا گیا تھا اور لکھا تھا کہ انہوں نے مجرم کے تعاقب کے وقت پولیس سے بہت تعاون کیا اور گذشتہ رات تک اس کوشش میں مصروف رہے کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ خطرناک مجرم گرفتار ہو جائے۔

انہوں نے مجھے جو پیشکش دی تھی اس کی وجہ سے میں بلا شبہ اوندھے منہ جا گرا تھا۔ مگر میں جو کچھ اس کے ساتھ کرنے والا تھا اس کا تو اس کے فرشتوں کو بھی اندازہ نہیں تھا۔

وہ دن میں نے فیروزدین کی بیٹھک میں اس طرح گزارا کہ ساری نمازیں اذان کے بعد وقت پر باقاعدگی سے پڑھیں اور ہر بار برکتے سے پانی گرم کروا کر وضو کیا۔ نمازوں کے درمیان کا وقت میں نے سو کر گزار دیا۔

میں بڑی شدت سے فیروزدین کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا اخبار میں نے دونوں لپیٹ کر سنبھال لیے تھے تاکہ اگر ضرورت پڑے تو میں ماجدہ کو اپنے بارے میں ساری باتیں تفصیل سے بتا دوں میرا ارادہ یہ تھا کہ اس کے سامنے میں خود کو ظاہر کر دوں گا کیونکہ ہمارے درمیان اب کوئی بھی پردہ حائل نہیں رہنا چاہیے تھا یہی بات مجھے مناسب معلوم ہوتی تھی میرے سارے پانسے الٹے پڑ رہے تھے اور میں چاہتا تھا کہ خدا کے بعد کوئی ایک تو ہستی ایسی ہو جس کے سامنے میں جھوٹ نہ بولوں جس پر میں خود کو جیسا ہوں ویسا ہی ظاہر بھی کر سکوں جس سے مجھے ڈرنے یا خوف کھانے کی ضرورت محسوس نہ ہو اور وہ ہستی ماجدہ کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ مجھے اس کے خلوص پر بے پناہ اعتماد تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ میرا پیغام سنتے ہی دوڑی چلی آئے گی۔ اور میرا ایک ایک پل اب اسی کے انتظار میں گزر رہا تھا۔

برکتے اور زینب نے میرے کہنے پر باقاعدہ عمل شروع کر دیا تھا۔ وہ میرے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں بیٹھی تھیں اور بلند آواز سے قرآن پڑھ رہی تھیں۔ بارہ بجے کے قریب وہ اٹھ کر باورچی خانے میں جا گھسیں۔

دوپہر کا کھانا روشن دین نے مجھے میرے پلنگ پر ہی پہنچا دیا۔ عصر کی اذان سن کر میں نے روشن دین کو آواز دے کر اس سے وضو کے لیے پانی منگوایا۔ جب میں نماز پڑھ چکا تو اچانک مجھے بائیں ہاتھ کے کمرے سے رونے پیٹنے کی آوازیں سنائی دیں۔ برکتے اور زینب بلند آواز سے واویلا مچانے لگی تھیں۔ روشن دین بھاگا بھاگا میرے پاس آیا۔ بولا۔

"پیر سائیں! خدا کے لیے بچی کو دیکھیں اسے پھر دورہ پڑ گیا ہے۔"

"کیسا دورہ! کیا کہتے ہو تم؟"

"پیر سائیں! اس کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہو رہے ہیں منہ سے جھاگ نکل رہی ہے۔ آ کے دیکھیں پیر سائیں کوئی دم درود کریں۔"

"چلو دکھاؤ مجھے کیا ہوا ہے اسے! تم سب کو بس دورے ہی پڑتے رہتے ہیں کہ اور بھی کوئی کام کرتے ہو۔" میں کمبل اپنے گرد لپیٹ کر اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں جا پہنچا۔ بچی ٹھنڈے فرش پر پڑی پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں یوں باہر کو نکلی پڑ رہی تھیں جیسے ابھی اس کے ڈھیلے اپنے خانوں سے باہر گر جائیں گے۔ اس کے منہ سے جھاگ چھوٹ رہے تھے اور ہاتھ اس نے ٹہنیوں کی طرح موڑ رکھے تھے۔ وہ فرش پر لوٹ پوٹ ہوتی کبھی ادھر جاتی کبھی ادھر اور برکتے سے وہ سنبھالے نہ سنبھلتی تھی۔ اس کی حالت دم بدم خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اور زیادہ وحشتناک ہوتی جا رہی تھیں۔ اور وہ پلنگ سے اٹھ اٹھ کر باہر کو دوڑتی تھی۔ کبھی پایوں سے سر پھوڑتی تھی اور کبھی بلند آواز سے سب کو نام لے لے کر گالیاں دے رہی تھی۔ میں تو سناٹے میں آ گیا۔ وہ لڑکی واقعی کسی جن کے قبضے میں جا چکی تھی۔ اس کے پاس جاتے ہوئے مجھے ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ جونہی میں اس کے سامنے ہوا وہ اپنی ماں سے ہاتھ چھڑا کر پلنگ سے اتری اور میری طرف یوں سر آگے کر کے بڑھی جیسے کوئی مغز پھری گائے اپنے سینگ سیدھے کر کے اپنے مخالف پر حملہ آور ہوتی ہے۔ میں ایک دم دوسری طرف ہٹا تو وہ اپنی جھونک میں بھاگتی ہوئی دروازے میں سے نکلتی چلی گئی مگر دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہی اس کا پیر شلوار کے کھلے پانچے میں پھنسا اور وہ دھڑام سے منہ کے بل فرش پر گر گئی۔ اس کے ہونٹوں پر سخت چوٹ لگی۔ برکتے اور زینب نے بھاگ کر اسے اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ اس کے رخسار چھل گئے تھے اور اس کے ہونٹوں سے خون رسنے لگا تھا۔ وہ خاصی صحت مند لڑکی تھی۔ ڈیل ڈول بھی اس کا بہت اچھا تھا مگر مرض نے اسے اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ جونہی برکتے اور زینب نے اسے اٹھایا وہ ان کو دو ہتڑیں مارتی ہوئی چیختی چلاتی ہوئی کمرے میں گھسی اور دروازے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور مجھے گالیاں دے رہی تھی۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہلکا سا طمانچہ مارا مگر وہ طمانچہ ہی غضب کا ہو گیا۔ وہ یوں زمین پر گری جیسے کسی نے جڑ سے کاٹ کر درخت کو نیچے گرا دیا ہو۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ ہاتھ اس کے ابھی تک مڑے ہوئے تھے اور اب نچلا جبڑا بھی قدرے باہر کو سرکا نظر آ رہا تھا۔

"اسے ادھر پلنگ پر ڈال دے روشن دین۔"

میری یہ بات سنتے ہی برکتے اور زینب نے اسے اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ اب اس بدنصیب کے پاؤں بھی اندر کی طرف مڑنے لگے تھے۔ اس کا مرض بڑھتا جا رہا تھا۔ اس لمحے اس بیچاری پہ مجھے بے حد ترس آیا۔ میں نے سوچا میں نے کیوں اس تیرہ بخت پر ہاتھ اٹھایا کیوں اس کی اذیت میں مزید اضافے کا سبب بنا۔ اپنے اس گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں مڑے ہوئے ہاتھ دائیں ہاتھ میں لے کر اس کے قدرے باہر کو نکلے جبڑے پر بڑی محبت اور شفقت سے ہاتھ پھیرا تو

مجھے محسوس ہوا کہ ذرا سا دباؤ ڈالنے پر اس کا جبڑا اپنی جگہ پر آ گیا ہے۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ آہستہ آہستہ سیدھے کیے تو اُس کی انگلیاں یوں کھلنے لگیں جیسے ان میں ہڈی تھی ہی نہیں ——— اپنے ہاتھ کے اس اعجاز کو مزید آزمانے کے لیے میں نے اُس کے مُڑے ہوئے پاؤں پہ ہاتھ پھیرا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ لکڑی کی طرح سخت ہوتے ہوئے پاؤں نرم ہونے لگے تھے۔ میرے ہاتھ کی حرکت کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی اصلی حالت پر آتے گئے۔

"اوہ میرے پیر! آپ نے تو کمال کر دیا ہے حضور! آپ نے کمال کر دیا ہے۔"

بے اختیار یہ لفظ روشن دین کے منہ سے نکلے تو میں ایک دم پورے قد سے تن کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا بکتے ہو، میرا کیا کمال ہے اس میں بدبخت! مجھے ذلیل کرتا ہے تو۔" جا پانی کا ایک گلاس لا۔" میں نے اسے بُری طرح ڈانٹ دیا۔ وہ دُم دبا کر باہر بھاگا اور فوراً ہی پانی کا گلاس بھر کر اندر لے آیا۔ میں نے وہ گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر بچی کے منہ سے لگا دیا۔

"لے میری بہن یہ لے پانی پی۔ اللہ کرم کرے گا۔"

بچی ابھی تک بے ہوش تھی اور اُس کی کھلی آنکھوں کی وہ الم ناک وحشت ابھی تک برقرار تھی مگر میری یہ بات سنتے ہی وہ آہستہ آہستہ اٹھی۔ اور میرے ہاتھ سے گلاس لے کر خود پینے لگی۔ ایک ہی سانس میں وہ سارا پانی حلق سے اتار گئی مگر پانی پینے کے فوراً ہی بعد وہ پھر تکیے پر گر گئی۔ اب اس کی آنکھیں مندنے لگی تھیں۔

"سونے کی ضرورت نہیں ہے اب اُٹھ جاؤ بہنا۔ دیکھو تو تیرا بھائی کتنا پریشان ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے کھلے بالوں پر ہاتھ پھیرا تو اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ اس کے گلے میں پڑے دوپٹے سے میں نے اس کے منہ پر لگی جھاگ صاف کی اور پھر دوپٹہ اس کے سینے پر ڈال دیا۔

"اٹھ جا میری بہن شاباش! دیکھ تو اب ٹھیک ہو گئی ہے۔ اب تو پھر کبھی بیمار نہیں ہو گی۔" یہ کہہ کر میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ آپ ہی آپ اٹھتی چلی گئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور پھر وہ حیران پریشان ہو کر ہم سب کو دیکھنے لگی۔ اس لمحے میری نظر برکتے اور زینب کے چہروں پر پڑی۔ ان کی آنکھوں میں جو تحیر تھا۔ اس کا کوئی آدمی اندازہ ہی نہ کر سکتا تھا۔ اُن کے نزدیک شاید میں نے ایک ناممکن بات کو ممکن بنا دیا تھا۔ ان کے منہ کھلے تھے اور نظریں میرے چہرے پر گڑی تھیں۔ اُن کا بس نہ چلتا تھا ورنہ شاید وہ اس لمحے رو بھی دیتیں مگر وہ روئی نہیں۔ دونوں تیزی سے میری طرف بڑھیں اور دونوں نے میرے پاؤں پر سر رکھ دیئے۔ جی ہاں۔ اپنے سر میرے قدموں میں ڈال دیے۔ میں نے پاؤں کھینچ کر ان دونوں کو بڑی احتیاط سے اوپر اٹھایا۔

"جاؤ بی بی جاؤ۔ اُدھر بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کرو۔ تم نے بڑا وقت ضائع کر دیا ہے جاؤ میری بات پر عمل کرو۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ مجھے اپنا بھائی سمجھو سگا بھائی۔" میں نے ان کے اشک آلود گال تھپتھپائے اور پھر تیزی سے باہر نکل کر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ میری حیرت کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ یہ میرے ہاتھ میں ایسی معجزانہ قوتیں کہاں سے پیدا ہو گئی تھیں۔ میں تو خدا کا عاجز گناہگار بندہ ہوں ایسا گناہگار کہ جس کے نام پر سارا زمانہ تھوک رہا ہے۔ یہ میرے وجود میں میرے اس گندے خون آلود ہاتھ میں اتنی ساری شفا کہاں سے آ گئی ہے۔ میں نے اپنی آستین کھولی اور اپنی کلائی کے ان داغوں کو دیکھنے لگا جو باباجی نے جلتی لکڑی سے لگائے تھے۔ وہ پُراسرار داغ دیکھنے میں بس عام زخموں والے داغ تھے مگر مجھے ان کی پُراسراریت نے حیران کر دیا تھا۔ یہ تیسرا موقع تھا کہ میں نے دل میں جو چاہا تھا۔ وہ وقوع پذیر ہو گیا تھا۔ رات بھی میں نے اپنے ہاتھ کی کرامت دیکھی تھی۔ روشن دین کے سلسلے میں اور اب بچی کو میں نے بدترین حالت میں سے صحیح سالم باہر آتے دیکھا تھا۔ یہ کیا قصہ ہے میرے خدا۔ یہ کتنا سنگین مذاق ہو رہا ہے میرے ساتھ۔ میں۔۔۔ میں غلام جیلانی، خونی، قاتل! انسانوں کی بستی کا بھیڑیا۔ یہ مجھے ارذل ترین سطح سے اٹھا کر قطب غوث کا درجہ دینے کی کیا سوجھی ہے تجھے میرے مولا۔ میرے امتحان میری آزمائشیں اور زیادہ سنگین نہ بنا میرے مالک میں۔۔۔ میں یہ بوجھ نہیں اٹھا سکوں گا۔ میں تو۔۔۔ میں تو تسلیم ہی کر چکا ہوں کہ میری مزاولت، ذلت و خواری ہے۔ میں اُن ملامتیوں میں سے ہوں جو سر پر خاک ڈالے پھرتے ہیں جو بدترین قسم کی غلاظتوں میں لوٹتے پھرتے ہیں اور جنھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ ذلتوں کے لیے ہیں اور ذلتیں ان کے لیے ہیں۔ مجھے کیوں اس صاف ستھری بے داغ عظیم اور یکتا مسند پہ بیٹھ جانے کی رغبت دلا رہا ہے میرے خدا۔ میں تو یہ بوجھ ہرگز نہیں اُٹھا سکتا۔ میں سر جھکائے بیٹھا اپنی کلائی کے داغوں کو دیکھ رہا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں دھاڑیں مار مار کر روؤں اور یہی ہوا بھی۔ میں نے کمبل میں اپنا منہ چھپایا تو اندر سے میرے دل کے پھپھولے پھوٹ نکلے۔ میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا جیسے کوئی بچہ بہت زیادہ پٹ جانے کے بعد بلک بلک کر روتا ہے۔ ایسا رونا ہے جس میں شکوہ بھی ہوتا ہے اور ندامت بھی، ناز بھی ہوتا ہے اور اپنے حقیر و بے بس و ناتواں ہونے کا احساس بھی۔ اور جب میں کمبل میں منہ چھپا کر آنکھیں موندے جی بھر کر رو چکا اور میرے آنسوؤں کا تار ٹوٹنے لگا تو میں نے کمبل سے منہ نکال کر آنکھیں جو کھولیں تو مجھے اپنے گرد و پیش پہ

یکدم طیش آنے لگا۔ روشن دین، برکتے اور زینب دروازے میں کھڑے ٹکٹکی مجھے دیکھ رہے تھے۔ اُن کے رنگ زرد پڑ چکے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں رو کیوں رہا ہوں اور پھر بلک بلک کر آخر ایسی کیا بات ہوئی کہ میں کمبل میں منہ دے کر پھوٹ پھوٹ کر گریہ زاری کر رہا ہوں۔ اُن کو سامنے دیکھ کر میں نے اپنے لہجے کی پوری گھن گرج سے ڈانٹا۔

"یہاں کیوں کھڑے ہو، دفع ہو جاؤ میری نظروں سے۔۔۔ جاؤ۔۔۔ ورنہ میں خود نکل جاؤں گا یہاں سے۔"

میں نے پلنگ پر سے پاؤں نیچے لٹکا دیئے۔

"بس بس پیر سائیں ہمیں معاف کر دیں۔ ہم جا رہے ہیں پیر سائیں! آپ نہ جائیں۔ خدا کے لیے آپ یہیں رہیں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" روشن دین نے دوڑ کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر چوم لیے۔ اس کی سادہ لوحی مجھے خوش کر گئی۔ میرا غصہ فرو ہونے لگا۔

"ٹھیک ہے روشن دین دروازہ بند کر دو اور جاؤ اپنا کام کرو۔ مجھے آرام کرنے دو۔"

چند لمحوں تک وہ مجھے غور سے تکتا رہا اور پھر وہ فوراً ہی اُلٹے قدموں مُڑا اور ان دونوں کو دھکیل کر اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ ان سب کے لیے وہ سب کچھ قطعی طور پہ ناقابلِ یقین اور ناقابلِ فہم تھا۔ میرے اپنے ذہن کی حالت بھی اُن سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ مجھے بھی اپنے اوپر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ میں بھی اپنی شناخت بھولتا جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں بھی سینکڑوں ہزاروں سوالات سنپولیوں کی طرح اُبھر رہے تھے اور وہ میرے دماغ کی سطح پر برابر ڈنک مار رہے تھے ان کے وہ ڈنک اتنے تیز اور زہریلے تھے کہ میرا سارا وجود لرزنے لگا تھا۔ وہ بات جس کا میں نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا وقوع پذیر ہو رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں جادوئی طاقت پیدا ہو چکی تھی میں جس نے ایک عرصے سے لوگوں کی گردنیں مل دینے کے سوا کوئی اور کام نہیں کیا تھا۔ خدا کا برگزیدہ بندہ بننے کے عمل سے گزر رہا تھا۔ اپنے خدا کی ان بخششوں کی مثالیں تو میں نے بہت دیکھ رکھی تھیں کہ اُس نے شیطانوں کو قارون کے خزانے اور اندھوں کو فرعون ایسے اختیارات دے دیئے تھے ——— کروڑوں لوگ رات کو بھوکے پیاسے سو جاتے ہیں جب کہ سینکڑوں ایسے ہیں جن کے کتے راتب پچانے کے لیے اُچھل کود کرتے ہیں۔ یہ خدا کی باتیں ہیں وہی ان کے اسرار کو صحیح سمجھ سکتا ہے۔ مگر میں ایسا کہاں کا ایاز تھا کہ مجھے اس نے اپنا خاص بندہ بنانے کی ٹھان لی تھی۔ یہی وہ سوال تھا جو میں شام ہونے تک سر کھپانے کے باوجود حل نہ کر سکا۔

سب سے بڑی مشکل یہ آ پڑی تھی کہ مجھے اس روز دکھانے کے لیے عصر کی نماز بھی پڑھنی پڑی تھی اور مغرب کی بھی۔ خدا میرے گناہ معاف کرے۔ میں کوشش کے باوجود اپنے دل میں یکسوئی اور گداز کی کیفیت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اور مجھے اپنی وہ نمازیں کھوکھلی اٹھک بیٹھک معلوم ہوتی تھیں میرا دل چاہتا تھا کہ میں سب کچھ چھوڑ کر وہاں سے بھاگ نکلوں۔ وہ لوٹا مصلّے اٹھا کر باہر صحن میں پٹخ دوں۔ میں خدا کو منہ دکھانے کے قابل رہا ہی کہاں تھا۔ کس برتے پر میں تتا پانی مانگتا تھا روشن دین سے۔ اپنی رُوسیاہی پر وضو کا پانی ڈالتے مجھے سخت ندامت محسوس ہوتی تھی۔ مگر میں نمائشی پاکیزگی طہارت اور عبادت و زہد کے ایسے جال میں پھنس گیا تھا کہ مجھے ان لوگوں کو مطمئن رکھنے کے لیے وہ سب کچھ کرنا پڑ رہا تھا اور میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ یا تو وہ مجھے مکمل طور پر اپنی طرف متوجہ کر کے میرے دل میں یکسوئی پیدا کر دے یا پھر مجھے اس عذاب سے باہر نکلنے دے کہ میں ساری دنیا سے تو مکر و منافقت کر سکتا ہوں مگر وہ جو میرے سامنے ہے حاضر ہے ناظر ہے میری شہ رگ سے بھی قریب ہے اسے میں کیونکر فریب دے سکتا ہوں۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب میں مغرب کی نماز پڑھ کر مصلّے سے اُٹھا تو میرا دل بُری طرح سسک رہا تھا اور میں نے طے کر لیا تھا کہ اس ڈرامے کو ختم کر کے میں کل صبح سورج نکلنے سے پہلے پہلے وہاں سے چل دوں گا۔ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ میں خدا کے سامنے اور اپنی نظروں میں اور زیادہ ذلیل و رسوا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ جب میری طبیعت اُدھر مائل ہی نہیں تھی حالانکہ مجھے ثوابِ طاعت و زہد معلوم تھا پھر میں کیوں خواہ مخواہ اُن رذیل لوگوں کی نظروں میں اپنی پیر خانی کا بھرم قائم کرنے کے لیے بے سود اور بیہودہ اُٹھک بیٹھک جاری رکھوں۔ مجھے ان جھمیلوں سے کیا لینا تھا۔

ایک آدھ رات کی پناہ کے سوا وہ مجھے اور کیا دے سکتے تھے اور وہ پناہ، وہ امان، وہ تحفظ مجھے مل ہی چکا تھا۔ اب مجھے نئی منزلوں کی طرف چل دینا تھا۔ ان منزلوں کی طرف جن پہ پہنچ کر میں آہو سے اپنا حساب چکا سکتا۔ اسے کوہائی والے اور ڈاکٹر دھمن سے انتقام لینے کے لیے کچھ کر سکتا۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد میں نے کھانا کھا کر اندر سے کُنڈی چڑھائی اور ایک بار پھر اخبار کھول کر بیٹھ گیا۔ آہو اور گُجر کی خبر تو اپنی جگہ بے حد اہم تھی مگر پہلے ہی صفحے کے ایک کونے میں ایک اور خبر نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ خبر یہ تھی کہ گجرات اور گوجرانوالہ کے ضلعوں کے تمام بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں کل زبردست ہڑتال ہوئی تھی اور وہ ہڑتال اس سیاسی پارٹی کی اپیل پر کی گئی تھی جس کے ٹکٹ پہ چوہدری ہادی علی انتخابات کے

لیے کھڑا ہوا تھا۔ پارٹی کا موقف یہ تھا کہ ہادی علی کو برسرِ اقتدار پارٹی نے مروا دیا ہے تاکہ اس کی راہ صاف ہو جائے اور بڑے صاحب بلا مقابلہ منتخب ہو جائیں۔

یہ بڑی ہی خطرناک خبر تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے ایک تیر سے دو شکار مارے تھے۔ وہ اپنی راہ بھی صاف کر چکا تھا اور بڑے صاحب کی بھی۔ مگر مجھے اس نے اس سارے معاملے سے یوں الگ کر دیا تھا جیسے کوئی مکھن سے بال کھینچ کر باہر پھینک دیتا ہے۔ اس خبر کی تفصیلات پڑھ کر میرا سارا وجود لرزنے لگا تھا۔ وہ ہستی جس کی آزادی کے لیے میں نے ہادی علی کو قتل کیا تھا ابھی تک جیل کی سنگین دیواروں کے پیچھے محبوس تھی اور میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ میں ہنوز اس سے ہزاروں لاکھوں میل دور تھا۔ وہ راتوں کے دلگیر سناٹوں میں اپنے جوؤں اور کھٹملوں سے اٹے بستر سے اُٹھ اٹھ کر سوچتی ہوگی کہ اس کا بھائی جیلانی اس کی رہائی کے لیے کوشاں ہوگا۔ مگر اُس حرماں نصیب کو یہ خبر ہی نہیں تھی کہ جیلانی کس حد تک بے بس ہو چکا تھا اور اسے حالات کی سنگینی نے کس حد تک اپاہج بنا دیا تھا۔

اس وقت رات کے نو بج رہے تھے ابھی میں کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ صحن میں مجھے فیروز دین کی آواز سنائی دی — میں نے کھڑکی میں سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ تنہا ہے۔

"پیر صاحب کہاں ہیں ؟"

"وہ اندر بیٹھے ہیں۔ نکّی کے ابّا وہ اندر بیٹھے ہیں۔" یہ برکتے کی آواز تھی۔ فیروز دین تیز تیز قدم اٹھاتا میرے کمرے میں داخل ہوا۔

"السلام علیکم پیر صاحب۔"

"وعلیکم السلام۔ تم تو اکیلے ہی واپس آ رہے ہو فیروز دین۔"

"ہاں۔ پیر سائیں وہ لڑکی تو ہمیں نہیں ملی۔ اس کے گھر پر تالا لگا ہے ہمسایوں نے بتایا ہے کہ اسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔"

"پولیس پکڑ کر لے گئی ہے مگر کیوں ؟"

"کنجاہ کے دو آدمی ہیں۔ چوہدری کرامت اور فیروز — وہ ہسپتال میں پڑے ہیں۔ اُن کی رپورٹ پر انھوں نے ماجدہ کو گرفتار کیا ہے۔"

"تم کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ ادھر اور مجھے بتاؤ کہ یہ باتیں تمھیں کس نے بتائی ہیں۔"

"اس کے ہمسائے میں ایک بڑھیا رہتی ہے اس نے یہ سب کچھ مجھے بتایا ہے وہ تو بہت گالیاں دیتی تھی۔ ماجدہ کو کہتی تھی ... کہتی تھی کہ وہ بہت ہی ... بہت ہی ... ۔" فیروز دین نے

میرے پلنگ کی پائنتی پر بیٹھ کر کہا۔

"ہاں ہاں بولو کیا کہتی تھی وہ۔"

"وہ تو پیر سائیں یہی کہتی تھی کہ وہ ماجدہ کوئی اچھی لڑکی نہیں ہے۔ تھی تو وہ شہانی مگر وہ کہتی تھی کہ اس کے پاس بہت سے لوگ آتے تھے۔ سارا محلہ تنگ تھا اس سے۔"

"ایسے ہی بکواس کرتی ہے وہ بدکار بڑھیا۔ اور کیا خبر ہے ادھر کی۔"

"میں تو آپ کی وجہ سے آ گیا پیر سائیں۔ ورنہ ادھر تو سارا کاروبار ٹھپ پڑا ہے۔ گجرات، کنجاہ، جلال پور، وزیر آباد، گوجرانوالہ تک زبردست ہڑتال ہے۔ میں تو ٹرک بھی نہیں لا سکا۔ اس ڈر سے کہ کہیں لوگ اسے آگ ہی نہ لگا دیں۔ راستے میں کئی گاڑیوں کو لوگوں نے توڑ دیا ہے۔"

"وہ کیوں ؟" میں نے دبی زبان سے پوچھا۔ "یہ ہڑتال کیوں ہوئی اور لوگ تشدد کیوں کر رہے ہیں۔ ہوا کیا ہے آخر ؟"

"وہ ... وہ پیر سائیں کوئی چوہدری تھا ادھر ہادی علی وہ قتل ہو گیا ہے کہتے ہیں وہ ممبری کے لیے کھڑا ہو رہا تھا۔ اسے کہتے ہیں سرکاری آدمیوں نے قتل کروا دیا ہے۔"

"اچھا ؟ تو یہ بات ہے۔ اچھا ٹھیک ہے فیروز دین تم یہ بتاؤ کہ ادھر کوئی آدمی رہتا ہے جس کی اپنی ٹیکسی ہو۔ میں ابھی ایک جگہ جانا چاہتا ہوں۔"

"ٹیکسی تو مل جائے گی پیر سائیں ادھر وہ اپنا یوسف بادر رہتا ہے وہ یہی کام کرتا ہے میں اسے بلا لیتا ہوں مگر اس وقت آپ کہاں جائیں گے ؟"

"مجھے ایک کام ہے ادھر ہر یکا گاؤں میں۔ تم اسے بلا دو میں اسے ڈبل کرایہ دے دوں گا۔" برکتے تیزی سے آگے بڑھی۔

"مگر پیر سائیں ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے اس وقت۔ دیکھیں تو کتنی رات ہو گئی ہے۔" وہ مجھے بڑی دلفریب معصومیت سے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں بی بی ہم ابھی جائیں گے۔ کام ہی کچھ ایسا ہے تم اسے بلاؤ فیروز دین۔"

"اچھا پیر سائیں، میں ابھی جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکلا تو برکتے بھی اس کے پیچھے لپکی اس کے پیچھے روشن دین بھی۔ صحن میں جا کر ان لوگوں نے فیروز دین کو خدا معلوم سرگوشیوں میں کیا بتایا کہ وہ انہی قدموں واپس آ گیا اور بولا۔

"پیر سائیں میں ... میں ... اس قابل تو نہیں ہوں کہ کچھ عرض کر سکوں مگر مگر آپ پھر بھی یہاں ضرور تشریف لائیں گے۔"

"فیروز دین! لگتا ہے تیرا دماغ خراب ہو گیا۔ پاگل آدمی تو پتہ

نہیں مجھ گنہ گار کو کیا سمجھ بیٹھا ہے۔ بھائی اگر تجھے پتہ چل جائے کہ میں کیا ہوں تو تو میرے نام سے بھی خوف زدہ ہو جائے — تیری تو مت ماری گئی ہے۔"

میں نے پلنگ سے اتر کر کوٹ پہنا۔ پاؤں میں بوٹ ڈالے اور کیبل پیسٹ کر اسٹین گن کندھے سے لٹکالی۔

وہ چند لمحوں تک بڑے غور سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

"مجھے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیں پیر سائیں۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں آپ کی سیوا کروں گا۔"

"تو واقعی پاگل ہو گیا ہے میرے یار۔ بس وہ کیا کہتے ہیں کہ بیوقوف اور کچھ نہ کھول۔ سمجھتا ہے نا۔ سنا نہیں تو نے کہ چمکنے والی ہر چیز سونا نہیں ہوتی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پیر سائیں مگر ... مگر میں جانتا ہوں۔ اللہ کے بندوں کو میں پہچان لیتا ہوں مجھے برکتے نے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"برکتے ؟ کیا کہتا ہے تو میرے یار! اس کا خیال رکھا کر، فیروز دین! مجھے لگتا ہے تو اس سے دور دور رہتا ہے۔ اُس کی آنکھیں ہی بتاتی ہیں۔"

فیروز دین کے چہرے پر ایسا تحیر پھیلا کہ بایدو شاید۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں پیر سائیں آپ صاحبِ نظر ہیں، کرامات والے ہیں۔ مجھے اپنا غلام بنا لیں۔"

"دیکھ زیادہ باتیں نہ بنا۔ بھاگ کر میرے لیے ٹیکسی لے آ اور چار پیکٹ سگریٹ بھی، مجھے ابھی جانا ہے۔"

چند ہی لمحوں بعد روشن دین اندر آ گیا۔ بولا۔

"پیر سائیں ٹیکسی میں لے آیا ہوں۔"

"تو چلو پھر۔ بٹھاؤ مجھے اس کے اندر۔" یہ کہہ کر میں اس کے ساتھ باہر نکلا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا گلی میں جا پہنچا۔ روشن دین جو ٹیکسی لایا تھا وہ بالکل نئی تھی اور دلہن کی طرح اندر باہر سے سجی ہوئی تھی۔

میں ٹیکسی میں بیٹھا تو فیروز دین میرے لیے سگریٹ لے آیا بولا۔ "یہ لیں پیر سائیں سگریٹ اور یہ ماچس بھی رکھ لیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک بڑا سا لفافہ میری طرف بڑھایا۔ وہ لفافہ ہاتھ میں لے کر میں نے کھولا تو معلوم ہوا کہ اس میں فیروز دین نے میرے لیے چھ پیکٹ گولڈ لیف کے سگریٹ اور دو ڈبیہ ماچس کی رکھ دی تھیں مگر ان کے ساتھ کچھ اور بھی تھا۔ وہ میں نے باہر نکالا تو حیران رہ گیا۔ فیروز دین نے میرے لیے دس دس کے نوٹوں کی ایک گڈی بھی لفافے میں ڈال دی تھی۔ وہ نئے نوٹوں کی گڈی تھی اور مجھے محسوس

ہو رہا تھا کہ وہ ایک ہزار روپیہ تھا جو اس نے میری نذر کیا تھا۔

میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر نکل کر فیروز دین کو دھکیلتا ہوا پرے لے گیا۔ وہ بھکا بکا سا ہو کر میرے ساتھ دھکتا چلا گیا۔ ٹیکسی سے دس قدم دور لے جا کر میں نے اسے روکا تو اس کلام بھول چکا تھا۔

"یہ ... یہ روپے تو نے کیوں ڈالے ہیں لفافے میں فیروز دین۔ تو باز نہیں آئے گا مجھے ذلیل کرنے سے۔ کیا سمجھا ہے تو نے مجھے۔" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں اسے ڈانٹا۔ مگر ... مگر میری باتوں کا اس پر اُلٹا اثر ہوا میرے آگے وہ اور زیادہ بچھنے لگا۔ بولا۔

"سرکار! مجھے پتہ ہے آپ کی نظر میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے پیر سائیں مگر یہ میری طرف سے آپ کی نذر ہے اسے قبول کر لیں۔"

"تو اول درجے کا احمق آدمی ہے مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے میرے بھائی۔ تیری اس محبت کا بہت بہت شکریہ۔" یہ کہہ کر میں نے وہ نوٹوں کی گڈی اس کے لمبے سے جُغے ایسے لٹرے سے خریدے ہوئے کوٹ کی جیب میں ڈال دی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ سمجھا میں اس سے ناراض ہوں۔ بہت ہی آزردہ ہو رہا تھا وہ گلوگیر آواز میں بولا۔

"پیر سائیں۔ مجھے معلوم ہے آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ میرے گھر سے آپ خوش نہیں نکلے ہیں۔ میری خدمت میں کمی رہ گئی ہوگی۔"

"نہیں فیروز دین یہ بات نہیں ہے پگلے۔ مگر میں ... میں ... وہ نہیں ہوں جو تو سمجھتا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔ موقع ملا تو میں کسی دن پھر آؤں گا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ٹیکسی کے اندر جا بیٹھا۔

"چل یار مجھے ادھر ذرا ہریکے لے چل۔ وہ جو منا داں کے پاس ہے مجھے ایک بہت ضروری کام ہے وہاں مگر تو ادھر داروغہ والا کی طرف سے چل۔"

"ٹھیک ہے جناب۔ مجھے کب تک وہاں رہنا ہوگا۔"

"میں کہہ نہیں سکتا ہوں درست ہو سکتا ہے ساری رات کے لیے میں تجھے روک لوں۔ بس تو چل دے اب۔"

وہ ستائیس اٹھائیس سال کا کوئی بہت ہی سنجیدہ طبع آدمی تھا اور بڑے رکھ رکھاؤ سے بات کرتا تھا۔ میری بات پر ذرا دیر کے لیے غور کرنے کے بعد اس نے گاڑی چلا دی۔

اس نے میرے کہنے پر عمل کیا اور سلامت پورہ کے سامنے سے گزرنے والی سڑک پر سے ہوتا ہوا وہ ہریکے روڈ کی طرف چل دیا۔

میرا ذہن قلابازیاں کھا رہا تھا۔ مجھے ماجدہ کی عقل پر رونا

آتا تھا۔ اس بوڑھے نے جان بوجھ کر اپنی جان شکنجے میں ڈال دی تھی۔ اگر وہ گھر چھوڑ کر میرے کہنے کے مطابق کسی اور جگہ چلی جاتی تو آج پولیس کے چکر میں تو نہ پڑتی مگر جب مجھے یاد آتا تھا کہ میں نے اسے راستے میں شیر آہو کے گھر جانے کا مشورہ دیا تھا تو مجھے اپنے آپ پر ہنسی آتی تھی۔ وہ آہو کے گھر پہنچ جاتی تو پھر شاید وہ میرے لیے کسی زبردست مصیبت کا سبب بن جاتی۔ آہو اسے ڈھال بنا کر مجھ سے جو چاہتا کروا سکتا تھا۔ اور اب مجھے آہو سے نمٹنے کے لیے اسلم آبی کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔ اس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ وہ اور بہادر علی ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ مجھے امید تھی کہ بہادر علی سے مل کر میں آبی تک پہنچ جاؤں گا۔ مگر رات میرے راستے میں حائل تھی اور نہیں معلوم تھا کہ میں بہادر علی کو کیسے تلاش کروں گا۔

بہر حال میرا وہ اضطراری فیصلہ میری ذہنی کیفیت کا عکاس تھا۔ میرے لیے کوئی بھی راستہ کھلا نہیں رہ گیا تھا اور میرے پاس اس بات کی بھی کوئی حتمی ضمانت نہیں تھی کہ وہ آبی میرے کسی کام بھی آسکے گا۔ خاص طور پر آہو کے خلاف جو منصوبہ میرے ذہن میں پک رہا تھا اس پر عمل درآمد کے لیے مجھے آبی سے جس تعاون کی توقع تھی اس کے بارے میں میں خود بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

ڈرائیور بیچارا بہت ہی خاموش طبع آدمی تھا وہ سارا راستہ خاموش رہا۔ میں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا مگر جب ہم آگے نکلے تو وہ بولا۔ "جناب کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ تو نہیں ہے؟"

"کیوں بھئی کیا مطلب ہے تیرا خیر تو ہے؟" میں نے کہا۔

میرا خیال ہے کہ میں نے بے خیالی میں کہیں کمبل کو ذرا کھول کر بدن پر لپیٹا تھا اور اس نے شیشے پر نظر ڈال کر دیکھ لیا تھا کہ میرے کندھے سے ایک بندوق لٹکی ہوئی ہے۔

"ادھر رات پولیس گشت پر ہوتی ہے وہ رات کو سمگلروں کو پکڑتے ہیں انھوں نے کہیں روک کر تلاشی لے لی تو بڑی گڑبڑ ہو گی۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے پیارے، ویسے تیری اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ میرے پاس ایک اسٹین گن بھی ہے اور پستول بھی۔ ان کی گولیاں بھی موجود ہیں۔" میری اس بات پر اس نے ذرا سی بھی گھبراہٹ ظاہر نہیں کی۔ بڑے اعتماد سے مسکرا کر بولا۔

"مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے یہ بات بتا دی ہے۔ آپ کی سیٹ کے نیچے ایک خانہ بنا ہے جس میں اپنی چیزیں ڈال دیں۔ یہ چور خانہ ہے کسی ٹیکسی میں نہیں ہوتا۔ کسی نے تلاشی لی بھی تو وہ کچھ نہ پا سکے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے سڑک کے کنارے ذرا دیر کے لیے گاڑی روک کر مجھے میری سیٹ سے اٹھایا اور اس کے نیچے بنے خانے کو کھولنے کے لیے اس نے ایک تختہ ہٹایا۔ وہاں واقعی ایک خانہ موجود تھا مگر جو تختہ اس نے ہٹایا تھا وہ کچھ اس طرح لگا تھا کہ اس کا گہری نظر سے مشاہدہ کیے بغیر پتہ نہ چل سکتا تھا۔ میں نے اس کے کہنے کے مطابق اپنی تمام ضروری چیزیں اس میں رکھ دیں۔ اور پھر نشست پر بیٹھ گیا۔

گاڑی ایک بار پھر آگے چل دی۔ مگر اب اس کی رفتار اس نے بہت تیز کر دی تھی۔ ابھی ہم ایک دو فرلانگ ہی آگے بڑھے تھے کہ ہمیں سڑک پر چار سپاہی کھڑے نظر آئے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے اور سڑک پر پھیل کر یوں ایستادہ تھے جیسے وہ کسی بھی تیز رفتار گاڑی کو چھاتی کے زور سے روک لیں گے ان کو یوں سامنے دیکھ کر میرے تو پسینے چھوٹ گئے۔ اس ڈرائیور نے میرے تمام ہتھیار نیچے رکھوا دیئے تھے۔ اور اتنے سارے مسلح سپاہیوں کے سامنے بالکل تنہا اور نہتا تھا۔ شکل صورت میری ایسی ہو گئی تھی کہ کوئی بھی شخص مجھے شریف آدمی قرار نہیں دے سکتا تھا۔ میرے حوصلے کی تو کرچیں کتنے گئی تھیں۔ اس باؤ یوسف نے مجھے زبردست مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔

"تیزی سے گزر چل یوسف۔ یہ خواہ مخواہ مصیبت کھڑی کر دیں گے۔"

اس نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی۔

"یہ زیادہ سے زیادہ چھ سو پیٹرے لیں گے جناب! میں جانتا ہوں انہیں فکر نہ کریں۔"

"کیا مطلب؟"

"تجربے کی بات بتا رہا ہوں جناب آپ انہیں بتا دیں کہ آپ کہاں جا رہے ہیں کیوں جا رہے ہیں۔ میں بھی انھیں سمجھا دوں گا مگر پھر بھی یہ پیسے لیے بغیر نہیں چھوڑیں گے آپ کو۔"

اتنے میں گاڑی ان سپاہیوں تک جا پہنچی۔ وہ اسے رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ میں نے غلطی یہ کی تھی کہ اپنی ساری رقم بھی میں نے خانے میں ڈال دی تھی۔

باؤ یوسف نے بڑے اطمینان سے گاڑی ان کے قریب روکی اور انجن بند کر دیا۔ یوں جیسے وہ مجھے وہیں لانا چاہتا تھا۔

ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر ڈرائیور پر نظر ڈالی۔ بولا۔

"اوئے یوسف پتھے کدھر جا رہا ہے آج؟"

"وہ جی ایک سواری ہے بھٹی صاحب۔ ادھر ہریکے گاؤں جا رہے ہیں ہم۔" اس نے گاڑی کے اندر کی بتی جلا دی اور خود اتر کر باہر جا کھڑا ہوا۔ یوں جیسے وہ ان کا بہت پرانا بے تکلف دوست ہو۔

دو سپاہی اندر سر ڈال کر مجھے دیکھنے لگے۔ تیسرے نے دوسری طرف سے دروازہ کھول دیا۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ پھر میری آنکھیں جل اٹھیں۔ میرے سامنے ملک شیر تھانیدار کھڑا تھا۔ وہی تھانیدار جس نے تین بار مجھے سپاہیوں کی گارد کے ساتھ عدالت میں پیش کیا تھا۔ وہ ان دنوں باغبانپورہ تھانے میں متعین تھا۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر

مجھ پر ڈالی تو مجھے معلوم ہوا جیسے اس کی آنکھوں میں اچانک ایک چمکارا سا پیدا ہوا ہو۔ اس کے دائیں ہاتھ میں چھڑی تھی اور بائیں میں لمبی سی ٹارچ۔ کلک کی آواز پیدا کر کے اس نے ٹارچ جلائی اور اس کی روشنی میرے چہرے پر ڈالتے ہی اس کے تیور بدل گئے۔

"اوئے! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں سردار خان۔ ذرا باہر تو نکالو اس سواری کو۔"

اس نے پیچھے ہٹ کر پستول نکال کر سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس کا سپاہی سردار خان آگے بڑھا اور مجھے دیکھ کر بولا۔

"باہر آؤ میاں صاحب ذرا اپنا معائنہ تو کراؤ۔"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے جناب! یہیں سے بتا دیں کیا حکم ہے۔" میں نے حتی الوسع اپنی آواز بدلتے ہوئے کہا۔ سردار خاں ایک دم بھڑک اٹھا۔

"اوئے باہر آ۔ طبیعت خراب کیسے ہو گئی تیری اچانک کوئی حمل گر گیا ہے کیا تیرا۔ چل باہر آ۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی رائفل کا دستہ گاڑی کے دروازے میں جمایا اور دائیں ہاتھ سے مجھے دوسری طرف دھکیلنے لگا۔ میرا حال اس گھڑی اس دھنیے کا سا تھا جس کا کمانچہ ٹوٹ چکا ہو۔ اس گھڑی میری جگہ کوئی کرنجیت بھی ہوتا تو ہمت ہار جاتا۔ میں بھی اندر سے ٹوٹ گیا تھا کیونکہ اس مصیبت کے لیے میں قطعاً تیار نہ تھا۔ ڈرائیور کی بات مان کر میں بڑی غلطی کا مرتکب ہو چکا تھا اور میری وہ غلطی اب مجھے بدترین صورت حال سے دوچار کر رہی تھی۔ اس سپاہی نے نہایت ہی بدتمیزی سے مجھے دوسری طرف دھکیلا تو میں نے اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کرتے ہوئے اس کی گردن کی رگ احساس کو پوری قوت سے مسل دیا وہ جھول کر مجھ پر گرا۔ کوئی آواز پیدا کیے بغیر دو غین ہوا تو میں نے اس کی رائفل جھپٹ کر اسے اپنے اوپر ڈال لیا۔ اس طرح کہ دوسری طرف کھڑا ملک شیر اگر گولی چلاتا تو وہ سیدھی سردار خاں کے سر میں لگتی۔ میں نے ایک سیکنڈ کے سوویں حصے میں۔۔۔۔ یہ کارروائی مکمل کر کے رائفل ملک شیر پر تان لی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس رائفل کے چیمبر میں گیارہ راؤنڈ موجود ہوتے ہیں۔ رات کو وہ سپاہی اس طرح اپنی رائفلیں بھر کر چلتے ہیں۔ رائفل کی نالی اپنے سامنے تنی دیکھ کر ملک شیر تلملا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"اگر تم نے ہمیں راستہ نہ دیا تو میں اس سردار خاں کو مار دوں گا اور تم میری زد میں ہو مسٹر تھانیدار!"

میری بات سن کر وہ گرجدار آواز میں بولا۔

"میں تجھے پہچان گیا ہوں جیلانی تو بچ کر نہیں جا سکتا۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میں نے اس کی ران کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ مجھے فوری فیصلے کی ضرورت تھی وہ میرے اس حملے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔ گولی اس کی ران میں لگی تو وہ بری طرح چیخا اور اچھل کر پیچھے گر گیا مگر پستول پر اس کی گرفت ابھی تک مضبوط تھی۔ میں نے ایک گولی اور چلائی تو اس کے ساتھ ہی اس نے بھی گولی چلا دی مگر وہ گاڑی کی باڈی میں لگی البتہ میری گولی اس کے کولہے میں جا دھنسی۔ اچانک دوسری طرف کھڑے سپاہی نے بند دروازے کے چڑھے شیشے میں سے مجھے تاک کر گولی چلا دی۔ مگر شیشہ ٹوٹنے سے پہلے میں نیچے جھک گیا۔ گولی دوسری طرف کھلے دروازے میں سے نکل گئی۔ اس سپاہی کو میں نہ دیکھتا تو میرا سر اڑ چکا ہوتا۔

تیسرا سپاہی گاڑی کی ونڈ اسکرین کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نیچے جھکا وہ وہاں سے ہٹ کے کئی قدم پیچھے جا کر کھلے دروازے کی راہ سے مجھ پر گولی چلانے کے لیے گھٹنا ٹیکنے لگا تو میں نے اسے مہلت دینے کے بجائے سردار خان کو آگے کر کے اس پر گولی چلانی چاہی لیکن وہ مجھ سے کہیں تیز نکلا اور اس کی گولی سیدھی سردار خان کے کندھے میں آ لگی مگر اس کے ساتھ ہی میں نے بھی گولی چلا دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سپاہی گیند کی طرح اچھل کر کئی ہاتھ پرے جا گرا۔ شاید میری گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ میری خوش قسمتی یہ تھی کہ دو سیٹوں کے درمیان جھکنے کی وجہ سے میں چوتھے سپاہی کو نظر نہیں آ رہا تھا اور یکے بعد دیگرے چار گولیاں چلانے کے باوجود مجھ تک نہ پہنچ سکا تھا میں نے سردار خان کو شدید زخمی دیکھ کر کھلے دروازے میں سے باہر گرا دیا۔ اور پھر اس کے پیچھے خود بھی اسی طرف اتر گیا۔ چوتھا سپاہی گاڑی کی دوسری طرف تھا وہ خود کو پوری طرح اوٹ لیے رکھ کر مجھے مارنا چاہتا تھا اس کے حوصلے پر اس کی عقل حاوی تھی۔ وہ بہت ہی محتاط قسم کا آدمی تھا۔

"اوئے جوانوں! رائفل پھینک دے ورنہ بے موت مارا جائے گا۔" میں نے اسے للکارتے ہوئے کہا اور خود کھسکتا ہوا انجن کی اوٹ میں جا پہنچا۔ اس نے میری آواز سنی تو سمجھ گیا کہ میں گاڑی سے نکل چکا ہوں میرے ان لفظوں نے اور میرے لہجے کی کڑک نے اس پر کچھ ایسی ہیبت طاری کی کہ وہ تیزی سے پیچھے ہٹا اور سڑک کے کنارے بنی کھائی میں جا لیٹا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے بھی میری طرف سے کوئی گزند پہنچے۔ تین آدمیوں کو میں پہلے ہی بیکار کر چکا تھا۔ مگر کھائی کی ڈھال ملتے ہی اس کی ہمت عود کر آئی۔ بولا،

"تو بچ کر نہیں جا سکتا کتے کے پتر!" یہ کہہ کر اس نے ٹائر کو تاک کر گولی چلا دی مگر ٹائر بچ گیا۔ گولی پہیے کے لوہے میں لگی تھی۔ وہ باؤ یوسف مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ پہیے پر گولی لگی تو معلوم ہوا کہ وہ سالا گولیوں کی سسکار سے ڈر کر ٹیکسی کے نیچے گھس گیا تھا وہ بڑبڑانے لگا۔ بولا۔

"بہت تمھارا ستیاناس ہو جائے میری ٹیکسی تباہ کر دی تم

نے۔ اپنی لڑائی لڑو میرا کیوں کباڑہ کرتے ہو؟"

میں ٹیکسی کی اوٹ میں بہت سنبھل کر بیٹھا تھا اور اس سوچ میں تھا کہ کس چیز کو ڈھال بنا کر اسے دبوچوں مگر ابھی میری سمجھ میں کوئی بات بھی نہیں آئی تھی کہ میں نے دیکھا کہ وہ سپاہی کہنیوں کے بل سرکتا ہوا خاصا آگے نکل رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ پوری طرح مجھے زد میں لے کر مجھ پر فیصلہ کن وار کرے۔ یہ اتفاق تھا کہ اس پر میری نظر پڑ گئی اور وہ بھی اس لیے کہ ٹیکسی کی بتیاں ابھی تک روشن تھیں۔ میں نے جونہی اسے دیکھا میں اپنی جگہ سے سرکا اور ٹیکسی —— کے بڈ کے اوپر رکھ کر میں نے نال کا رخ ادھر کیا اور شست باندھ کر گولی چلا دی۔ میری گولی اس کی کمر میں لگی اور وہ ایک لرزہ خیز چیخ مار کر کھائی میں منہ کے بل گر گیا۔

اب میرے لیے میدان بالکل صاف تھا۔

"اوے باہر آ اوئے کسی گیدڑ کی اولاد! تو نے مجھے مروا ہی دیا تھا آج۔ باہر آ۔" میں نے ٹیکسی کے پیچھے ہاتھ ڈال کر یوسف کو ٹانگ سے پکڑا اور باہر گھسیٹ لیا۔ وہ لرز رہا تھا۔ بالکل جھانکڑ نظر آتا تھا مجھے وہ اس لمحے۔ کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا اور بولا۔

"ان لوگوں نے تو جناب میری ٹیکسی تباہ کر دی ہے۔"

"بہت اچھا کیا ہے انہوں نے سالے۔ تو ہے ہی اسی قابل۔ تو جانتا تھا کہ تیرے ماما ادھر کھڑے ہوتے ہیں پھر بھی تو مجھے اس راستے سے لے آیا۔"

"اس میں میرا کیا قصور ہے جناب! استاداں کا راستہ تو یہی ہے۔"

"ابے تو ادھر راجاہ کے راستے سے بھی تو جا سکتا تھا مگر تیری تو ٹیکسی کے پیر میلے ہوتے تھے۔"

"اب۔ اب میرا کیا بنے گا جناب؟"

"اب تیرا مقبرہ بنے گا یہاں۔ چل ادھر اندر بیٹھ — اور مجھے میری منزل پر پہنچا۔" یہ کہہ کر میں نے ایک ایک کر کے ان سپاہیوں کو دیکھا۔ وہ سب کے سب زندہ تھے البتہ زخموں نے انہیں نڈھال کر دیا تھا مگر زخم کوئی بھی ایسا نہ تھا جو مہلک ثابت ہوتا۔ وہ سپاہی جو کھائی میں لیٹا تھا خوف کی وجہ سے سن ہو رہا تھا ورنہ گولی اس کا کولہا چھیدتی ہوئی آگے نکل گئی تھی فلک شیر کی ران البتہ زیادہ کھل گئی تھی۔

"چل اوئے ٹیکسی کے اندر بیٹھ۔" میں نے ڈرائیور کو ٹیکسی کے اندر دھکیلا اور خود اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سپاہیوں کی تمام رائفلیں میں نے اکٹھی کر کے خود ہی ٹیکسی کے اندر رکھ لی تھیں اور فلک شیر کا پستول بھی۔

ڈرائیور بہت ہی خوفزدہ تھا، بولا۔

"نہیں جناب میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔"

"ٹھیک ہے بیٹے۔ تو یہاں بیٹھ کر مکھیاں مار، میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اس کی سیٹ پر بیٹھا اور گاڑی چلا دی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ میں خود گاڑی چلا سکوں گا۔ جب میں اس کی نشست پر بیٹھا تو وہ یہی سمجھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں مگر جب گاڑی حرکت میں آئی تو وہ گاڑی کے ساتھ بھاگنے لگا۔

"میں چلتا ہوں جناب میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" وہ چیخنے لگا مگر میں نے ایک دم گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ میں اسے ساتھ لے جا کر اس کا مستقبل تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پولیس اسے کبھی معاف نہ کرتی وہ یہی سمجھتے کہ باؤ یوسف نے ہی مجھے پناہ دے رکھی ہے۔ اب وہ پیچھے رہ گیا تھا تو اسی میں اس کی بہتری کا راز مضمر تھا۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ اس آدمی نے اس سے ٹیکسی چھین لی ہے وہ زبردستی اسے گاڑی سے اتار گیا ہے۔ وہاں رہ کر وہ ان زخمیوں کی تیمارداری بھی کر سکتا تھا ان کے بارے میں کسی کو اطلاع بھی دے سکتا تھا کیونکہ ان کا علاج فوری طور پر بہت ضروری تھا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ان میں سے کسی کی بھی موت واقع ہو سکتی تھی اور یہی میں نہیں چاہتا تھا وہ میرے دشمن نہیں تھے۔ میرا راستہ روک کر وہ اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ میں سمجھتا ہوں اگر وہ لوگ منظر سے ہٹ جائیں، گلیوں اور بازاروں سے نکل جائیں تو سارا معاشرہ تباہ ہو جائے۔ وہ جو میرے ایسے خونخوار بھیڑیے ماؤں نے جن رکھے ہیں، وہ تو راتوں رات سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دیں کہ انسان پر انسان کا اعتماد کبھی بھی نہیں رہا ہے۔ یہ قانون یہ عدالتیں یہ کچہریاں — یہ محبس یہ زنجیریں نہ ہوں تو زندگی کا سارا حسن ختم ہو جائے کہ انسان کے اندر جو ابلیس پرورش پاتا ہے وہ گرد و پیش میں پھیلے ہوئے رنگ و نور کے تمام آثار مٹا دینے پر آمادہ رہتا ہے۔ میں سوچتا تھا کہ وہ فلک شیر بھی کسی ماں کا بیٹا ہے کسی بیوی کا شوہر اور کسی بچے کا باپ ہے وہ ذاتی منفعت کے لیے تو اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھ کھلی رکھتا تھا تو صرف اس لیے کہ شہروں اور گاؤں میں رہنے والے ہزاروں لاکھوں لوگ آرام کی نیند سو سکیں اس نے اپنی جان ایک چھوٹی سی تنخواہ کے عوض نہیں بیچی تھی بلکہ اس کے پیش نظر کوئی اور بہت ہی اعلیٰ و ارفع مقصد تھا اور وہ مقصد یہ تھا کہ زندگی کی قدریں ملیامیٹ نہ ہوں۔ اس کا غازہ قائم رہے اور اس کی خوشبوؤں میں جرائم کی بدبو نہ رچ سکے۔ یہی وہ اعلیٰ و ارفع نصب العین تھا جس کے حصول کے لیے اس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ میں اس کی موت کا ہرگز خواہاں نہیں تھا۔ اگر وہ اس رات میری گولی سے مر جاتا تو مجھے بے حد افسوس ہوتا کہ پہلے ہی میں ایک قتل کا مرتکب ہو چکا تھا۔ جلادہ کے قریب گھنے سرکے کھیت میں پہلے ہی میں ایک سپاہی کو موت کے گھاٹ

اتار چکا تھا اور اس کو زندگی کے حسن سے محروم کر کے جو پچھتاوا مجھے ڈس رہا تھا ابھی سے ہی میں عہدہ برآ نہ ہو سکا تھا اور اب وہ ایک نہیں چار تھے جنہیں میں گھائل کر آیا تھا۔ میں دل سے دعا مانگ رہا تھا کہ وہ زندہ رہیں۔ انہیں میری بھی عمر لگ جائے کہ میں تو زندگی کے چہرے پر ایک بدنما داغ ہوں۔ میں جیا جیا، نہ جیا میرا کیا ہے۔

میں اس ڈرائیور کو بڑے اطمینان سے اپنے ساتھ لے سکتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا تو صرف اس وجہ سے کہ وہ ان لوگوں کے پاس رہ کر ان کی دیکھ بھال کر سکتا تھا، انہیں سکھ پہنچا سکتا تھا ان کو یوں بے موت مرنے سے بچا سکتا تھا۔

گاڑی کا انجن ٹھیک کام کر رہا تھا اور اس میں پٹرول بھی کافی مقدار میں موجود تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس سپاہی کی گولی سے اس کا ٹائر بچ گیا تھا ورنہ میں تو وہیں بندھ کر رہ جاتا۔ میں نے کئی میل آگے جا کر گاڑی اینٹوں کے ایک بھٹے کی طرف جانے والی کچی سڑک کی طرف ڈال دی۔ وہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس بھٹے سے ذرا آگے دوسری طرف بھی ایک راستہ ہے جو ٹرکوں کے لیے بنا ہوا ہے۔ بڑی سڑک جو سیدھی واہگہ جاتی ہے میں نے قصداً چھوڑ دی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میں ہربچے گاؤں جا رہا ہوں اور میرے لیے یہ بات کسی طرح بھی سود مند نہ تھی کہ میں اس وقت وہاں پہنچوں جب وہ پہلے سے ہی وہاں میری راہ روک کر بیٹھے ہوں یقیناً نورہ پولیس کے لوگ فون پر مناواں تھانے کی پولیس کو خبردار کر رہے تھے۔ ان کو یہی امید ہو گی کہ میں ٹیکسی لے کر سیدھا وہاں پہنچوں گا۔ اسی خطرے سے بچنے کے لیے میں نے راستہ بدل لیا۔

اینٹوں کے بھٹے پر اس وقت مکمل خاموشی طاری تھی۔ مزدوروں کے لیے وہاں جو جھونپڑے بنے تھے ان میں بھی مجھے کسی جگہ کوئی روشنی نظر نہ آئی۔ وہ جھونپڑے بھٹے سے ذرا ہٹ کر بنائے گئے تھے۔ بھٹے کے ایک ٹیلے پر چوکیدار کی کوٹھری تھی۔ میں ٹیکسی سے اتر کر ادھر چل دیا۔ اصل میں اس چوکیدار سے ہربچے گاؤں کا راستہ معلوم کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں نے وہ گاؤں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب میں اینٹوں کے بڑے بڑے ڈھیروں کی اوٹ میں سے نکل کر کوٹھری کے سامنے پہنچا تو مجھے اس کوٹھری میں روشنی نظر آئی۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور کوٹھری کے دروازے کے سامنے جا ٹھہرا۔ مجھے اندر سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں عجیب سی ہاؤ ہو پیدا ہو رہی تھی۔ وہاں لگتا تھا اندر بہت سے آدمی موجود ہیں۔ اچانک مجھے ایک زنانہ قہقہے کی آواز سنائی دی معلوم ہوا کہ وہاں کوئی عورت بھی موجود ہے میں سمجھا چوکیدار کی بیوی ہو گی۔ میں نے دستک دینے سے پہلے دروازے کی ایک جھری پر آنکھ رکھ دی۔ اندر جو منظر مجھے نظر آیا وہ ایسا تھا کہ میرا سارا بدن جھنجھنا اٹھا۔ کوٹھری... میں دو عورتیں اور تین مرد موجود تھے اور وہ سب کے سب شراب نوشی میں مصروف تھے۔ سامنے صف پر شراب اور سوڈے کی بوتلیں دھری تھیں اور وہ اس کو گلاسوں میں بھر کر پی رہے تھے۔ تینوں آدمی شکل صورت سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ عورتیں جوان تھیں اور اپنے لباس کی وضع قطع سے بالکل دیہاتی معلوم ہوتی تھیں رنگت ان دونوں کی سانولی تھی۔ ایک نے راجپوتانہ کی مزدور عورتوں ایسا لہنگا پہن رکھا تھا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اسی بھٹے پر کام کرتی ہے اور کسی پتھیرے کی عورت معلوم ہوتی تھی۔

"اوئے گوگے تو اس آبی سے ملا تھا آج کہ نہیں؟" ایک آدمی نے پوچھا۔

آبی کا نام اس کے منہ سے سن کر میں چونکا، وہ آدمی مجھے اپنے ہی قبیلے کا معلوم ہوتا تھا۔

"یار اسی کے لیے تو تمہیں ادھر لایا ہوں آج۔ ٹھیک بارہ بجے وہ یہاں پہنچ جائے گا۔"

"پر تیرا ارادہ کیا ہے گوگے! دیکھ تو وقت کتنا ہو چلا ہے۔"

"ابھی تو بارہ ہی بجے ہیں یار، پر یہ بوتل بھی تو ختم ہو چلی ہے تو بالکل بجوا اس آدمی ہے گوہرے۔ لا ابھی تو صرف ایک ہی بوتل۔ یہ تو میری جان پینو ہی چڑھا گئی ہے۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ دوسرے آدمی کا نام گوہر تھا اور وہ ایک عورت جس کے دائیں رخسار پر ننھا سا تل تھا اس کا نام پینو تھا۔

"اوئے اس کے واری صدقے بعد میں ہونا پہلے یہ بتا گوگے کہ آج تیرا پروگرام کیا ہے؟"

"پروگرام؟ بھئی اس حبیب شاہ کے چول ڈھیلے کرنے ہیں ہمیں آج رات۔ بڑی دولت لایا ہے وہ ولایت سے۔"

"اچھا اچھا۔ ہمیں ادھر دھکڑی جانا ہے آج۔ پہلے اس کتر دین نے اس کا پتہ بتایا ہوگا تمہیں؟"

"دیکھ اوئے میرا نام قطب دین ہے قطب دین۔" کتر دین نے چمک کر کہا۔ "اپنی اس پینو کی اطلاع یہ ہے کہ حبیب شاہ کے گھر میں دو سیر سونا ہے اور کم سے کم دو لاکھ روپیہ موجود ہے۔"

"بینک میں نہیں رکھتا ہے وہ اپنا مال؟" گوہر نے پوچھا۔

"نہیں، روپیہ گھر لے آیا ہے بیٹی کی شادی کر رہا ہے نا وہ اس مہینے۔" گوگا اپنا گلاس خالی کر کے بولا۔

"پر یار وہ تو بڑا غریب آدمی ہے۔" گوہر نے کہا۔

"کیا مطلب؟ وہ..... سؤر کا بچہ غریب آدمی ہے تیری نظر میں۔" گوگا تپ کر بولا۔

"ہاں ہاں دو سیر سونا ہے اس کے پاس اور یہ اسے غریب بتا رہا ہے۔" اس لہنگے والی نے ہنس کر کہا۔

"ہائے میری باگڑ بلی تو ٹھیک کہہ رہی ہے تو بس اپنی طرف سے

سین کو شین بتاتی جا۔"

"چل ہٹ کتر دین تیرے منہ سے بڑی بدبو آتی ہے۔"

"چل اوئے ادھر مسواک کر پہلے پھر عشق کی نماز پڑھ پلید کہیں کے۔" گوہر نے کتر دین کی گردن میں دھپ مارتے ہوئے کہا۔

"ایسے ہی بکتی ہے یار یہ خراب کرتی ہے مجھے۔" کتر دین نے اپنے کھیس سے سامنے کے دانت صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی گوہرے وہ غریب کیسے ٹھہرا تیری نظر میں؟"

"یار گوگے۔ تو سوچتا کیوں نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ حبیب شاہ ادھر تیس سال تک فیکٹری میں کام کرتا رہا ہے کاریں بنتی ہیں اس فیکٹری میں۔ کہتے ہیں کہ وہ اٹھارہ گھنٹے کھڑا رہتا تھا وہاں۔ اس کے گوڈے گٹوں میں پانی اتر آیا ہے۔"

"گوڈے گٹوں میں نہیں بلکہ کہیں اور پانی اتر آیا ہے۔" کتر دین نے کہا۔

"چل اچھا یوں ہی سہی۔ کوئی تھوڑی محنت تو نہیں کی ہے اس نے۔" گوہر نے اس کی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"تو ٹھیک کہتا ہے گوہرے، مگر یہ کہاں لکھا ہے کہ ہم اس کے گھر ڈاکہ نہ ماریں، وہ مالدار تو ہے نا۔"

"نہیں وہ مالدار نہیں ہے عیالدار ہے عیالدار۔ تین بیٹیاں ہیں اس کی، اور دونوں لڑکے نالائق اور آوارہ ہیں۔"

"تیری طرح۔" کتر دین نے کہا۔

"چل یوں ہی سہی۔ میری طرح ہی سمجھ لے۔"

"اچھا پھر؟ اس سے کیا ہوتا ہے تو کہنا کیا چاہتا ہے آخر؟" گوگے نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں... میں یہ کہتا ہوں گوگے یار کہ یہ... یہ ظلم ہے۔ وہ مزدور آدمی ہے اس نے بڑی محنت سے وہ روپیہ کمایا ہے۔ یہ اچھی بات نہ ہوگی۔"

"غداری کرے گا تو ہم سے۔"

"نہیں! تمہارے ساتھ تو میں دوزخ میں بھی جانے کو تیار ہوں پر یار اصول بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"اوئے اصول نام کی کوئی شے ہوتی ہے اس دنیا میں۔" گوگے نے بوتل میں باقی بچی شراب سوڈے کی ضمانت کے بغیر حلق سے نیچے اتار کر کہا۔

"تمہاری مرضی ہے گوگے مگر یہ ظلم ہے۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ اس ٹمونڈی والے کے گھر جاؤ تو ایک بات بھی ہے۔"

"اچھا وہ دبگڑی کا چوہدری خالق داد۔ وہی ہے نا ٹمونڈی والا۔"

"ہاں! وہ حرام کا تخم پشتوں سے عیش کرتا آ رہا ہے اسے چھیل دو تو میں راضی ہوں۔"

نہیں آئی ہے۔" گوگے نے کہا
"نہیں یار۔ ابھی اس کی باری کے پیچھے تجھے کس نے لگایا
"مگر، مگر اس حبیب شاہ ہے؟"
ہے؟ یہ تیرا اپنا منصوبہ تو ہرگز نہیں پیارے مگر ہمارا منصوبہ بندی سے
"اس میں بھی ایک بھید ہے شامل نہیں ہوتا۔" بینو نے
"اشا تو یہ تمہارے منصوبے
پھر اپنے شین پھینکے۔"
"ہائے تیرے ان منصوبوں پہ قربان جاؤں۔ تیری کیسی
خوش ہو کر کہا۔
سوہنی واج ہے۔" کتر دین نے گوگے نے دروازے کی طرف
"وہ آنی ابھی تک نہیں آیا؟"
دیکھ کر کہا۔
"وہ آ بھی گیا تو کوئی فرق نہیں پڑیگا۔" گوہر نے بڑے
بے زار لہجے میں کہا۔
"کیا کہتا ہے یار تو ادھر بیٹھا دھ کے منہ پر بیٹھ کر یارماری
کرتا ہے تو۔" گوگے نے حیران ہو کر ہے۔ بوتل اس نے ہاتھ مار کر دور
پھینک دی۔
"نہیں ـــ یارماری کی بات نہیں ہے گوگے۔" میں اس کام میں تمہارا
ساتھ نہیں دے سکتا۔"
"تو سن رہا ہے نا قطب دین اسے سمجھا۔ میں اس جنتے کی وجہ
سے اس کا لحاظ کر رہا ہوں مگر یہ غداری نہیں چلے گی۔ کوئی رشتہ
نہیں ہے وہ حبیب شاہ ہمارا۔" ہے شکار کے وقت ہونے لگتی
"یہ گوہرا ایسی ہی گئی شے ہے؟"
ہے کیوں بھئی کیا صلاح ہے تیری ن! یہ اصول کی بات ہے۔ میں
"تو زیادہ بڑبڑ نہ کر کتر دین۔ ادھر وہ چنن چوہدری ہے
کسی غریب پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا ہے عارف علی رائس ملز والا —
بڑی دال کا، ادھر چلو وہ سیٹھ حبیب شاہ؟ نہیں یار و—
اس کے گھر پہنچو میں تیار ہوں مگر خاطر اس نے بڑی محنت کی ہے
میں نے اسے دیکھا ہے۔ اس پیسے کی ام ہے۔" گوہر نے ان لوگوں سے
نہیں نہیں، اس کا گھر میرے لیے حرام بھورے رنگ کا کمبل اوڑھے
تین چار قدم پیچھے سرک کر کہا۔ وہ تھا تو اس کی نظر بڑی تیزی سے
تھا اور جب وہ ان سے بات کر رہا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سے بہت
ان کے چہروں پر گردش کر رہی تھی تھا۔ اس کی وہ گھنی لمبی لمبی سیاہ
زیادہ محتاط رہنے کی کوشش کر رہا مونچھیں۔
مونچھیں عجیب انداز سے پھڑک رہی ہے! وہ تیرا ماما نہیں لگتا ہے تجھے
"تو اس طرح نہیں مانے گا گوہر
ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔" گے۔ میں اس کام میں تمہارا ساتھ
"یہ تمہاری خام خیالی ہے گوگے شاہ کو دیکھو اس کی عمر ہی کیا
نہیں دوں گا۔ میری بات سمجھو۔ اس حبیب

پچاس سال ہوگی مگر لگتا ہے وہ گور کنارے پہنچ گیا ہے۔ ساری جوانی وہ اس کارخانے میں تباہ کر کے آیا ہے۔ اس کو چھوڑ دو۔ یہ ظلم ہے۔"

"چھوڑ دو، اس کو چھوڑ دو، یہ ظلم ہے۔" گوگے نے اس کی عجیب انداز سے نقل اتاری پھر بڑے گمبھیر اور خوفناک لہجے میں بولا۔ "یہ نہیں ہوگا گوہر۔ یہ نہیں ہوگا۔ ابھی وہ آنی آ جائے تو پھر فیصلہ کروں گا کہ ہمیں تیرا کیا بندوبست کرنا چاہیے۔"

عین اسی وقت مجھے دور سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ گھوڑ سوار سیدھا اُدھر ہی آ رہا تھا۔ میں ان کی نظروں سے بچنے کے لیے کوٹھری کی پچھلی دیوار کے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ آدمی اُدھر سے آ رہا تھا جدھر ٹرکوں کے لیے ایک چبوترا سا بنا ہوا تھا۔ وہ آیا اور سیدھا اس کوٹھری کے سامنے پہنچ کر گھوڑے سے اتر گیا۔ اس نے سر پر سیاہ پگڑی باندھ رکھی تھی۔ وہ دروازے پر پہنچا تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی وہ آنی نہیں تھا کوئی اور تھا۔

اس نے بڑی آہستگی سے دروازے پر دستک دی تو چند ہی لمحوں بعد کنڈی کھل گئی۔ اس کے فوراً ہی بعد مجھے دروازہ اندر سے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں سرکتا ہوا پھر دروازے کے سامنے جا ٹھہرا۔ میں نے جھری کی راہ سے اندر نظر ڈالی تو دیکھا کہ گوگا اور وہ بغلگیر ہو رہے تھے۔

"یار تا بیے وہ آنی نہیں آیا ابھی تک؟"

"وہ نہیں آئیگا آج ــ ادھر جرکے گاؤں میں اس کا یار بہادر مر گیا ہے۔ اسے سانپ نے ڈس لیا ہے۔" اس نے اپنے کالے کمبل کی بکل درست کرتے ہوئے کہا۔ وہ کوئی ساڑھے چھ فٹ اونچا جوان تھا اور سر اس کا کوٹھری کی چھت کو چھو رہا تھا۔

"اوے بیڑا غرق۔ یہ تو بہت برا ہوا۔ بڑی دلیر آدمی تھا یار وہ بہادر علی۔" گوگے نے بڑے متاسف لہجے میں کہا۔

"ہاں یار۔ اس کی موت کا تو مجھے بھی بہت افسوس ہے۔ اس جنتے کو تم ابھی تک یہاں بٹھلائے ہوئے ہو؟"

"یہ آج رات ادھر بینو کے گھر رہے گا۔ آنی خود ہی سے جانے گا اسے کسی وقت۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ اسے ادھر بھیجو اور جلدی کرو بگری وقت بہت ہو چلا ہے۔"

"چلتے تو ہیں تا بیے مگر پنایہ گوہر مانتا نہیں ہے کہتا ہے یہ ظلم ہے۔"

"یار۔ اس کی کہیں سے ڈاکٹری کراؤ کہیں یہ عورت تو نہیں بنتا جا رہا۔ میں نے سنا ہے آج کل ایسا بھی ہو رہا ہے۔ کیوں اوے گوہرے! کیا ہو گیا ہے تجھے؟"

"یہ بات نہیں ہے تا بیے! تم ابھی آزما کر دیکھ لو مجھے۔ بیشک مگر میں ڈکیتی نہیں جا سکتا۔ یہ ظلم ہے۔" گوہر نے بڑے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس کی یہ بات سنتے ہی تا بیے نے گھوم کر کمبل کے نیچے چھپی بندوق کا دستہ کچھ اتنے زور سے اور اتنی برق رفتاری سے گوہر کی کنپٹی میں مارا کہ وہ بے چارا دیوار سے جا لگا اور بے سدھ ہو کر لمبا لیٹ گیا۔

تا بیے نے گالی دے کر کہا۔ "خنزیر کا پتر۔ اوئے قطب دین باندھ دے اس کے ہاتھ پیر اور دیکھ بینو وہ ونجلی خان جو کیدا ہے نا اسے کہنا کہ اسے ادھر ہی باندھ رکھے۔ ہم کل اسے یہاں سے لے جائیں گے۔"

"اشا چوہدری جی اشا میں اٹھنے کہ دوں گی وہ ادھر میرے گھر میں بیٹھا ہے اس وقت۔" بینو نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ گوہر کو اس نے ٹٹول کر دیکھا۔ پھر اس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"جندہ ہے یا ابھی جندہ ہے چوہدری جی۔ نبض چل رہی ہے اشکی۔ گوہر کی بندوق اس کے بھورے کمبل میں سے جھانک رہی تھی

"ایسے ستورا اتنی جلدی نہیں مرا کرتے۔ چل اوئے قطب دین باندھ دے اس کے ہاتھ پاؤں۔"

قطب دین نے بڑی فرمانبرداری سے اٹھ کر ایک رسی سے گوہر کے ہاتھ اس کی کمر کے پیچھے کس کر باندھے اور پھر پاؤں بھی کمر کی طرف موڑ کر پیٹ کے ساتھ جکڑ دیئے۔

"چل بھئی گوگے۔ کوئی دارو شارو ہے کہ چڑھا گئے ہو سارا؟"

"نہیں یار بس ایک ہی بوتل تھی یہ گوہر ہی دوا تھا۔ بالکل زنخا ہے سالا۔"

"اچھا چلو ہیں دیر ہو رہی ہے چل بینو تو اس جنتے کو اپنے گھر لے جا۔"

یہ کہہ کر وہ پیچھے مڑا تو میں تیزی سے کوٹھری کی پچھلی دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ میرا وہ چپ شاہ پستول اس گھڑی میرے ہاتھ میں تھا اور ان کی طرف سے کسی قسم کی ذرا سی گڑبڑ میں وہ ان دونوں پر خالی کر دینے کو تیار تھا۔ اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو مجھے یقین تھا کہ کسی قسم کا سوال کیے بغیر وہ مجھ پر وار کر دیتے کیونکہ ایسے لوگ اپنے راز کی ہر قیمت پر حفاظت کرتے ہیں اور میں وہاں اس لیے رک گیا تھا کہ مجھے گوہر کی مدد کرنی تھی۔ میری نظر میں وہ بہت بڑا آدمی تھا۔ اتنا بڑا کہ اس کے مقابلے میں میں خود کو بالکل ہیچ سمجھ رہا تھا۔ اس نے اپنے اصول کی خاطر اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ ان بھیڑیوں کو حبیب شاہ کے شکار سے روکنے کے لیے اس نے بڑی بہت بڑی قربانی دی تھی اور میرے دل میں اس کے لیے عزت و احترام، ہمدردی اور محبت کے بے پناہ جذبات موجزن ہو چکے تھے۔

وہ پانچوں کوٹھری سے نکلے تو قطب دین نے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ بینو اور جلتے مزدوروں کے جھونپڑوں کی طرف چل دیں اور وہ تینوں بائیں ہاتھ نکل گئے۔ بلیسے نے گھوڑے کی لگام پکڑ لی تھی اور وہ اسے گام گام چلا رہا تھا۔

چند منٹ تک میں کوٹھری کی دیوار کے۔۔۔ پیچھے کھڑا رہا اور ان کے دور ہٹ جانے کا انتظار کرتا رہا جب مجھے یقین ہو گیا وہ کافی فاصلہ طے کر گئے ہیں تو میں نے آگے بڑھ کر کوٹھری کا دروازہ کھول دیا۔ گوہر گہرے گہرے سانس لے رہا تھا میں نے اس کے پاؤں کے جکڑ بند کھول کر اسے دیوار کے ساتھ بٹھایا تو اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر اپنے حواس وہ مجتمع نہ کر پا رہا تھا۔ کونے میں ایک گھڑا رکھا تھا۔ میں نے اس میں سے پانی لے کر اس کے ہونٹوں سے لگایا تو یہ دیکھ کر مجھے اطمینان محسوس ہوا کہ وہ پانی قبول کر رہا تھا۔ کوئی دس منٹ کے تگ و تنبو کے بعد وہ ہوش میں آ گیا مگر جب گرد و پیش کو سمجھنے کے قابل ہوا تو مجھے دیکھ کر حیرت کا اظہار کرنے لگا۔ ابھی وہ کوئی سوال کر نہیں پایا تھا کہ بھٹے کا چوکیدار ونجلی خان تیز تیز قدم اٹھاتا اندر آ گیا۔ اس کی آہٹ سن کر میں نے ایڑی پر گھوم کر پستول کی نالی کمبل کے نیچے سے اس کی طرف گھما دی۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا مگر چہرے مہرے سے وہ بہت ہی کرخت نظر آتا تھا۔ مجھے اس نے گوہر پر جھکے دیکھ لیا تھا، کڑک کر بولا۔

"تم کون ہو بھئی۔ ادھر کیا کر رہے ہو؟" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی لاٹھی زمین پر جما دی۔ اس نے ابھی تک یہ اندازہ نہیں لگایا تھا کہ کمبل کے نیچے میں نے اس کے سامنے کیا چیز تان رکھی ہے۔

"یہ بیچارا زخمی ہے میں اسے ہوش میں لا رہا تھا۔" میں نے نہایت ہی خوشگوار لہجے میں کہا۔

"مگر تم ہو کون! ادھر کیا کرنے آئے ہو؟" اب بھی اس کا لہجہ نہایت ہی اکھڑ تھا۔

"دیکھو ونجلی خان زیادہ مت بھڑکو۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں میں ہریکے گاؤں جا رہا تھا مگر راستہ معلوم نہیں تھا سوچا ادھر کسی سے پوچھ لیتا ہوں مگر میں جب یہاں آیا تو دیکھا کہ یہ آدمی بے ہوش تھا اور اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ پاؤں تو میں نے کھول لیے ہیں مگر ہاتھ ابھی تک بندھے ہیں۔"

"اسے ادھر بندھا ہی رہنے دو اور تم جاؤ۔ ہریکے کا راستہ ادھر ہے۔ اس کچی سڑک پر چل دو۔ جاؤ۔"

اس کے لہجے کی گھن گرج بدستور قائم تھی اور گوہر کبھی مجھے دیکھتا تھا اور کبھی اسے۔ وہ ہکلاتا ہوا بولا۔

"مم۔۔ مم۔ میر۔۔۔ یہ ہا۔۔ ہا۔۔۔ ہاتھ تو کھولو خان ان حرامزادوں نے۔۔۔۔۔۔۔"

"ادھر کسی کو گالی والی مت دو استاد۔ ہاتھ نہیں کھلیں گے تمہارے۔ چلو میاں جی تم باہر نکلو۔ یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے باہر نکل جانے کے لیے کہا۔ اس کی وہ دھونس دیدنی تھی۔ میں نے پستول کمبل سے نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔

"مجھے نہیں جانتے ہو ونجلی خان! میں آدمی کو چیر کر رکھ دیتا ہوں۔ کتے کے بچے! تیرا میں نے بہت لحاظ کیا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے پیٹ میں پوری قوت سے گھٹنا دے مارا۔ وہ زخمی بھینسے کی طرح چیخا اور وحشی پرے پھینک کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھام لیا مگر درد کی شدت سے وہ کھڑا نہ رہ سکا اور لڑکھڑا کر دیوار میں جا لگا۔ میں نے پیچھے سے اس کی کمر پر لات جمائی تو وہ اوندھا ہو گیا۔

"میرا خیال ہے اب تیری زبان بہت دن تک سیدھی چلے گی۔" یہ کہہ کر میں نے غصے کی شدت سے الٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ اس کی صورت سے مجھے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ میری کوئی بات سمجھ ہی نہیں رہا تھا اور ایسے سوّر۔۔۔ آدمی تو قدم قدم پر ملتے ہیں جن کے دماغ میں چیرا لگائے بغیر کوئی بات اتاری ہی نہیں جا سکتی۔ وہ بھی کسی ایسے ہی الّو کے پٹھے کی اولاد تھا۔ اس سے نپٹ کر میں نے گوہر کے دونوں ہاتھ بھی کھول دیے۔

"تو۔۔۔ تو کون ہے جوان! کیوں میرے لیے اتنا تپ گیا ہے تو؟" اس نے اپنے ہاتھوں کی اکڑی ہوئی رگوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"تو اچھا آدمی ہے گوہر اور مظلوم بھی ہے۔ چل اٹھ میرے ساتھ آ۔ دیر نہ کر۔۔۔ اٹھ میرے ویر۔" میں نے اسے زمین پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی بندوق کندھے سے لٹکائی اور کمبل کی بکل مار کر میرے ساتھ باہر نکل آیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ کوٹھری سے باہر آ کر بولا۔

"تجھے پتہ ہے تو کیا کہہ رہا ہے جوان۔ وہ ایسے ماتھا پیٹی کے جنے ہیں کہ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں ڈال دیتے ہیں۔"

میں نے کمبل کی بکل کھول دی تاکہ وہ میرے کندھے سے لٹکی اسٹین گن دیکھ سکے۔

"تو مجھے نہیں جانتا ہے گوہر، پر چل تجھے میں آج اپنی کرامت دکھاؤں گا۔ چل آ۔ حبیب شاہ کو بچانا چاہتا ہے نا تو؟"

"ہاں یار! وہ تو بیچارا تباہ ہو جائے گا مگر۔۔۔ مگر میں تیرے ساتھ کیسے چل دوں میرے یار۔ پتہ نہیں تو۔۔۔ تو۔۔۔"

"ابے نحس کھڑا نہ ہو۔ چل میرے ساتھ چل۔ میں تجھے

کہ نہیں جاؤں گا تیرے حبیب شاہ کو بچانا ضروری ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے آگے دھکیل دیا۔ چند قدم آگے جا کر بولا۔

"وہ۔۔۔ وہ لوگ تو گھوڑیوں پر گئے ہیں اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔ وہ تو ڈاکہ ڈال چکے ہوں گے۔"

"تو فکر نہ کر وہاں تک گاڑی جا سکتی ہے کہ نہیں۔ اب بھی ہم ان کو روک سکتے ہیں۔"

"ہاں گاڑی تو جا سکتی ہے کوئی کار ہے تیرے پاس؟" اس کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

"ہاں میرے پاس ٹیکسی ہے۔ ادھر کھڑی ہے۔" یہ کہہ کر میں اسے پھر گھسیٹتا ہوا آگے لے چلا۔ اس کے قدم زمین پر جم جم جاتے تھے مگر میں نے اسے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا اور آگے لے جا کر ٹیکسی میں ڈال دیا۔

"دیکھ باقی باتیں بعد میں ہوں گی تو مجھے بس ہریکے کا راستہ بتا دے۔"

"اچھا ٹھیک ہے تو سیدھا چل آگے کچی سڑک ہے۔ وہ لوگ ادھر ہی گئے ہیں وہ تینوں۔"

وہ اب کی بار زیادہ اعتماد سے بولا۔ وہ میرے ساتھ ہی بیٹھا تھا اور ٹک ٹک مجھے دیکھے چلا جا رہا تھا۔

میں نے گاڑی کچی سڑک پر ڈال کر اس کی رفتار تیز کر دی۔ رات چاندنی تھی اور راستہ صاف نظر آ رہا تھا اس لیے میں نے کار کی بتیاں نہ جلائیں۔ اس کی نظریں اب بھی میرے چہرے پر جمی تھیں بولا

"آدمی تو شیر دل نظر آتا ہے مجھے۔ پرائی آگ میں بھی کود جائے گا، تو۔"

"ہاں! کیوں نہیں! اس ظلم کو تو روکنا ہی چاہیے نا۔ ظلم ہی ہے نا یہ تیری نظر میں، وہ جو گوگا تایا اور وہ گتر دین کرنے جا رہے ہیں؟"

میری یہ بات سن کر وہ کھل کر مسکرا دیا۔ گاڑی کی گھڑ گھڑ سے اپنی آواز زیادہ بلند کر کے بولا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تو نے ہماری ساری باتیں سن لی تھیں مگر تو ادھر آیا کیسے تھا یار۔ کیا کام تھا تجھے ادھر۔ تو بھی کسی شکار کے پیچھے ہے؟"

"نہیں یار! میں تو اسلم آبی سے ملنے آیا ہوں۔ وہ میرا جگری یار ہے مگر تیری باتیں سن کر اور تیرا حال دیکھ کر میں نے سوچا کہ پہلے حبیب شاہ کا ثواب تو کما لوں۔"

"اچھا تو اسلم آبی کا دوست ہے۔ میں بھی سوچتا تھا کہ تو کوئی عام آدمی نہیں ہے آبی کے یار تیرے ایسے ہی ہو سکتے ہیں۔"

"مگر وہ آج ادھر کیوں نہیں آیا؟"

"وہ ایسے چھوٹے موٹے کام نہیں کرتا ہے زخموں والے۔ مرد جنگ ہے وہ۔ یہ تایا خواہ مخواہ اسے اس کام میں ڈال رہا تھا۔ اچھا ہوا وہ نہیں آیا۔ وہ آ بھی جاتا تو کبھی ان لوگوں کے ساتھ نہ جاتا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ تیری بات مجھے بہت پسند آئی ہے گوہر، اسی لیے میں تیرے ساتھ چل رہا ہوں اب جو کرے کرتار۔"

"وہاں مقابلہ ہو جائے گا ہمارا ان سے۔ تایے کے پاس بڑا خوفناک اسلحہ ہے۔ دستی بم بھی ہیں اس کے تھیلے میں۔"

"کوئی بات نہیں ہے گوہر، ہم ایک اچھے کام کے لیے جا رہے ہیں۔" میں نے اسے اطمینان دلایا۔

"پر جوان، تو نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا ہے مجھے۔ اس ونجلی خان کا تو نے اچھا بندوبست کیا ہے، بہت فرفر کرتا تھا وہ۔"

"اس کا آپریشن بہت ضروری تھا میرے بھائی۔ جب گوشت نہ گلے تو اسے دم پخت کر دیتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے پر تیرا نام کیا ہے یار؟"

"میرا نام؟ میرا نام خواہ مخواہ ہے تو مجھے چاچا خواہ مخواہ کہہ لیا کر۔"

وہ ہنس دیا، بولا۔

"اب سمجھا تو مجھے اپنا نام نہیں بتانا چاہتا ہے، مگر ہو سکتا ہے تو حبیب شاہ کے لیے غیبی فرشتہ ثابت ہو جائے۔"

"پتہ نہیں غیبی فرشتہ ہوں کہ احمق ہوں بہرحال یہ قصہ میں تیری نظر سے دیکھ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے ایک سگریٹ اسے دیا اور ایک خود سلگا لیا۔ وہ خوش ہو گیا ایک دم لہک اٹھا۔ بولا۔

"تو اچھا آدمی ہے یار، راشن پانی ساتھ رکھتا ہے ——— اس سگریٹ نے مٹیار کے ہونٹوں ایسا مزہ دیا ہے اس وقت۔ گولیاں ہیں نا تیرے پاس؟"

"ہاں تو ذرا دیکھتا جا۔ میرا خیال ہے ہم انہیں پیچھے چھوڑ جائیں گے۔"

"وہ سیدھوں سیدھ کھیتوں میں سے گئے ہوں گے۔" اس نے چاروں طرف سر گھما کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم کافی آگے نکل چکے تو میں نے پوچھا۔

"تجھے اس کے گھر کا، گلی کا پتہ ہے نا؟"

"مجھے سب پتہ ہے جوان، مگر وہ بڑے خوفناک آدمی ہیں۔ کئی گھر اجاڑ چکے ہیں۔ میں بھی کوئی ولی کا پتر نہیں ہوں پر اصول بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے مگر تو حبیب شاہ کو جانتا ہے نا؟"

"جانتا کتنا ہے تو! میں۔۔۔ میں تو کچھ زیادہ ہی جانتا ہوں اسے یار جی۔"

اس کی آواز میں عجیب سی بھیدوں بھری چمک پیدا ہو گئی تھی یہ بات کہتے ہوئے۔ کوئی ایسی ہی راز کی بات تھی جسے وہ اس لمحے مجھ سے چھپا گیا تھا۔ میں اس سے ابھی کچھ پوچھنے والا ہی تھا کہ دائیں ہاتھ سے تین گھڑ سوار ہماری گاڑی کے آگے سے گزر کر

بھی سڑک پھلانگتے ہوئے تیزی سے دُوسری طرف کے کھیتوں میں جا گھسے۔

"یہ وہی ہیں جوان اور ... اور ابھی راستے ہی میں ہیں۔" گوہر نے بڑے جوش میں کہا۔

"اب تو کوئی فکر نہ کر، اب ہم ان سے نپٹ لیں گے۔ ڈبگری کتنی دُور ہے اب؟"

"بس تھوڑی دُور ہے۔ یہ اُدھر نہر کی طرف سے وہاں جائیں گے ذرا تیز کر دو ٹیکسی کو۔"

میں نے اس کے کہنے کے مطابق گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی۔ کچھ ہی دُور جا کر اس نے مجھے دائیں ہاتھ مڑنے کا اشارہ کیا۔ ایک کچی سڑک ادھر آ نکلی تھی۔

سرما کی چاندنی نے چاروں اور فضا کو عجیب انداز سے سوگوار بنا رکھا تھا۔ سامنے ڈبگری گاؤں تھا جو مجھے اداس اور بے یار و مددگار دکھائی دیتا تھا۔ کہیں کہیں مجھے کوئی دیا ٹمٹماتا نظر آتا تھا اور وہ بھی ان جگہوں پر تھا جہاں ڈھور ڈنگر بندھے تھے۔

میں نے ٹیکسی گاؤں سے کافی فاصلے پر ایک گنے کے کھیت کے قریب کھڑی کر دی۔

"یہاں کیوں رک گئے ہو؟"

"اب ہم پیدل چلیں گے مگر ذرا قدم تیز اٹھاؤ۔" یہ کہہ کر میں نے گاڑی کے دروازے بند کر کے ڈلیش بورڈ میں لگی چابیوں کے گچھے سے اس کو مقفل کیا اور گوہر کو ساتھ لے کر گاؤں کی طرف لپکا۔

"تم حبیب شاہ کو ذاتی طور پہ جانتے ہو؟"

"ہاں۔"

"اسے جگا کر اطلاع دے سکتے ہو کہ اس کے گھر ڈاکہ پڑنے والا ہے؟"

"نہیں بابو! یہ بہت مشکل ہے۔ وہ پوچھے گا ماما جی تمھیں کیسے پتہ ہے اور تمھارا ان سے کیا تعلق ہے جو ڈاکہ ڈالنے آ رہے ہیں؟"

"ہاں یہ تو ہے خیر تم مجھے وہاں تک پہنچا دو۔"

"ہاں۔ اُدھر تو ہم جا ہی رہے ہیں۔ میں ان سب کو بھون کر رکھ دوں گا۔ ایسی تیسی ہو گئی ان کی دوستی۔" گوہر نے بڑے جوش سے کہا۔

گاؤں میں اس گھڑی چار سُو سناٹا طاری تھا۔ ہم جب اُن درختوں کے قریب پہنچے جو مسجد کے قریب اُگے تھے تو ہم نے دیکھا کہ وہاں دو کتے لمبے لیٹے تھے۔ انھیں کچھ سنگھا دیا گیا تھا۔ اور وہ اکھڑے اکھڑے سانس لے رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ ہم دونوں نے اپنے چہروں کو کپڑوں سے ڈھانپ لیا۔ چند قدم آگے جا کر مجھے گوہر نے کہا "حبیب شاہ اسی گلی میں رہتا ہے۔"

میں نے اسے اپنے ساتھ گھسیٹا تو یہ دیکھ کر شش و پنج میں پڑ گیا کہ مسجد کی پچھلی دیوار کے قریب ایک آدمی چیت لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور لاٹھی کہیں۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

"یہ ... یہ شاید چوکیدار ہے۔" گوہر نے دبی آواز میں کہا "وہ لوگ اسے زخمی کر گئے ہیں۔"

"چلو مجھے حبیب شاہ کا گھر دکھاؤ جلدی کرو۔"

"وہ ... وہ رہا اس کا گھر۔" گوہر نے بندوق سیدھے ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا۔ وہ جس مکان کی طرف اشارہ کر رہا تھا وہ ہم سے کوئی سات مکان دور تھا۔ وہ دو منزلہ پختہ عمارت تھی جسے کسی نے بڑی محبت سے تعمیر کرایا تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ کھینچا اور تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ اچانک ایک کچے مکان کی چھت پر سے کسی نے بڑی بے جگری سے ہمارے اوپر چھلانگ لگائی اور بائیں ہاتھ سے میری گردن دبوچنے کی کوشش کی۔ میرے دائیں ہاتھ میں پستول تھا۔ وہی میرا حبیب شاہ جو کام کرتا تھا مگر وقت نہیں تھا۔ اس نے نیچے آتے ہی بایاں ہاتھ میری گردن پر ڈالا۔ اور دائیں ہاتھ میں پکڑا چھرا اس نے گوہر کے سینے میں دھنسانے کی کوشش کی مگر وہ کمبل اوڑھے ہوئے تھا اور نیچے اس نے موٹا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس لیے اس کی کوشش ناکام ہو گئی۔ وہ ابھی ہم دونوں پر سوار ہی تھا کہ میں نے پستول پھینک کر اس کی گردن دبوچی اور اس کی رگ دبا دی۔ وہ فوراً ہی جھول کر نیچے گر گیا۔ وہ موٹے کا پہاڑ تھا وہ آدمی۔ اس نے ایک بار تو ہم دونوں کو بدحواس کر دیا تھا۔ وہ دھم سے نیچے گرا تو معلوم ہوا کہ وہ ... وہ قطب دین ہے۔ پینو کا عاشق، گوگے کا غلام اور تاہیے کا زر خرید۔

"ارے یہ تو کمتر دین ہے۔" گوہر نے کمبل سنبھالتے ہوئے کہا۔ اس کی حیرت بے حد و حساب تھی۔

"اسے چھوڑ، اب آگے چل۔" میں نے اسے دبی آواز میں کہا اور زمین پر سے اپنا پستول اُٹھا کر آگے بڑھ گیا۔

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے حبیب شاہ کے مکان کے سامنے پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی دوسری منزل کی کھڑکی کے سامنے بنے شہ نشین پر اتر رہا تھا۔ انہوں نے دُوسری منزل کی چھت پر بنے جنگلے پر کمند ڈال رکھی تھی ایک آدمی آگے جا چکا تھا اور دُوسرا جا رہا تھا کمند کا رستا نیچے جھول رہا تھا۔ وہ کھلی کھڑکی کے اندر غائب ہوا تو ہم دونوں نے کمبل کندھوں پر ڈالے اور اس آدمی کے پیچھے شہ نشین پر جا چڑھے۔ پہلے وہاں میں اترا اور پھر گوہر۔ وہ دونوں اب آگے جا چکے تھے۔ ہم دبے پاؤں کھڑکی میں سے گزر کر دُوسری طرف پہنچے تو دیکھا کہ سامنے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس میں ایک پلنگ بچھا تھا مگر وہاں کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔ میں گوہر کو وہاں دروازے میں کھڑا کر کے آگے بڑھا۔ سامنے دوسری منزل کا صحن

تھا۔ میں نے دیکھا کہ گوگا اور تاہیا دونوں ایک کمرے کے سامنے جا کھڑے ہوئے تھے۔ میں ایک صندوق نما تنور کی اوٹ میں جا ٹھہرا۔ وہ تنور انھوں نے چھت پر کھلے موسم میں روٹیاں پکانے کے لیے لگا رکھا تھا۔ گوگے نے بڑی آہستگی سے سامنے کے دروازے پر دستک دی۔ انہیں معلوم تھا کہ اہل خانہ کس کمرے میں سوتے ہیں اور حبیب شاہ رات کو کہاں ہوتا ہے۔

دستک کا کوئی جواب نہ پا کر گوگے نے پھر بڑی آہستگی سے دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے کسی کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

"دروازہ کھولو شاہ جی ہم آئے ہیں آپ کے مہمان۔ یہ تاہیا بھی ہمارے ساتھ ہیں۔" گوگے نے بڑے مجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مہمان ہیں کیسے مہمان؟" اندر سے پھر وہی آواز ابھری۔ اب کی بار اس آواز میں سراسیمگی نمایاں تھی۔

"اوے دروازہ کھول۔ کھوتے دے پتر۔ ورنہ تیری کس شاہنی کو اور تیری بیٹیوں کو یہیں ختم کر دیں گے۔" یہ تاہیا تھا۔ اس کی یہ بات سنتے ہی گوگے نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ وہ بڑے ماہرانہ انداز میں عورت کی طرح رو دیا۔ یوں جیسے اس کے گلے پر چھری چلائی جا رہی ہو۔ اور وہ آواز سنتے ہی اس سادہ لوح نے دروازہ کھول دیا۔ یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ تاہیے نے فوراً ہی گردن سے دبوچ کر باہر کھینچ لیا۔ وہ بیچارا گھگھیانے لگا۔

"ت ... ت ... تم کیا چاہتے ہو بھائیو، میرا کیا گناہ ہے؟"

"گناہ! شاہ جی گناہ کی بات چھوڑو۔ مال نکالو۔ سونا کہاں رکھا ہے تم نے اور نوٹ کدھر ہیں؟"

"وہ ... وہ تو اُدھر سب اُدھر بینک میں رکھے ہیں بھائیو۔"

"میرے گھر میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔" حبیب شاہ نے خوف سے تھر تھر لرزتے ہوئے کہا۔ اس کی یہ بات سنتے ہی تاہیے نے بائیں ہاتھ سے ایک زبردست تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

"بینک میں رکھا ہے! اور ہم اِدھر سوتیاں کھانے آئے ہیں تیرے گھر۔ ہمیں مال چاہیے بڈھے، مال۔" یہ کہہ کر اس نے بندوق کی نالی اس کی ہنسلی کے اُوپر دھنسا کر اسے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ میں چٹکی چاندنی میں یہ خوفناک منظر دیکھ رہا تھا۔ ان کی سنگدلی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔

"مجھے۔ مجھے مت مارو بھائیو! سارا مال اندر ہے۔ اندر صندوق میں۔ وہ سب لے لو۔ مگر مجھے معاف کر دو۔"

"چابیاں کہاں ہیں؟" تاہیے نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"وہ اُدھر ... اُدھر تکیے میں رکھی ہیں۔ اندر میرے بستر پر۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔" اس کی یہ بات سنتے ہی تاہیے نے اسے کمرے میں دھکیل دیا۔ حبیب شاہ کمرے میں گرا تو وہ اس کے پیچھے لپکے

ابھی وہ دہلیز پہ پاؤں رکھ ہی رہے تھے کہ میں نے اپنے سائیلنسر لگے پستول سے تاہیے کی پنڈلی کو تاک کر گولی چلا دی۔ وہ اچھل کر دروازے کے باہر کی طرف گرا اور فوراً ہی منہ کے بل لیٹ کر شست باندھنے لگا مگر میں اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں در اصل مرغیوں کے پختہ ڈربے کی اوٹ میں بیٹھ چکا تھا۔

"ہتھیار پھینک دے تاہیے ورنہ میں تیرا مغز پھاڑ دوں گا۔"

گوگا کمرے میں گھس کر اوٹ میں ہو کر شست باندھ رہا تھا۔ چاندنی کی لکیر سی اس کے بازو پر پڑ رہی تھی اور اس کی بندوق کی نال مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس کی کلائی کو تاک کر گولی چلائی تو بندوق اس کے ہاتھ سے دور جا گری اور وہ اپنا زخمی بازو تھام کر چیختا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

تیسری گولی پھر تاہیے پر چلائی مگر میرا نشانہ چوک گیا اور اس کے ہاتھ کے بجائے گولی اس کے بازو میں جا لگی۔ میں حیران اس بات پر تھا کہ اس نے فوراً ہی مجھ پر گولی کیوں نہیں چلائی تھی۔ بازو میں گولی لگتے ہی اس نے بندوق پرے پھینک دی اور اف اف کرتا تیزی سے پیچھے سرکا اور کمرے میں گھسنے لگا۔ میں نے بھاگ کر اُسے دہلیز پر جا لیا اور گردن سے پکڑ باہر گھسیٹا مگر اس طرح کہ اس کی رگ احساس بھی میں نے پوری طرح مسل دی وہ فوراً ہی بے ہوش ہو گیا۔ اس سے نپٹتے ہی میں اندر گھسا تو دیکھا کہ گوگا ایک کونے میں نڈھال پڑا ہے۔ اس کا بازو بُری طرح زخمی تھا۔ میں نے جاتے

ہی پوری قوت سے ایک لات اس کی پسلی میں جمائی وہ الٹ کر دیوار میں جا لگا۔ اس کی بندوق مجھے نظر نہیں آ رہی تھی حبیب شاہ بھی مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے گوگے کی گردن پر اپنا ہاتھ آزمایا۔ میں انہیں کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ گوگے نے گردن پر میری گرفت مضبوط ہوتی دیکھ کر اپنی جان چھڑانے کے لیے بائیں ہاتھ سے میری دونوں ٹانگیں جکڑ لیں اور مجھے جھٹکا دے کر نیچے گرانے کی کوشش کرنے لگا مگر میں نے اسے مہلت نہ دی۔ میں اس فساد کو فوراً ہی ختم کر دینا چاہتا تھا مگر اس کی موٹی گردن میرے ایک ہاتھ میں نہیں... آ رہی تھی۔ میں نے پستول کی نال دانتوں میں دبا کر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن پکڑی اور جھٹکا دے کر اس کی رگیں مسل دیں۔ میری ٹانگوں پر سے اس کی گرفت فوراً ہی ڈھیلی پڑ گئی وہ بیہوش ہو چکا تھا۔ وہ پہلا آدمی تھا جس کو بے ہوش کرنے کے لیے مجھے خاصی محنت کرنی پڑی۔ ورنہ اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ مجھے مطلوبہ رگ ہر گردن میں فوراً ہی مل جاتی تھی۔

ان دونوں سے فارغ ہو کر میں نے لائیٹر جلا کر ادھر ادھر دیکھا مگر حبیب شاہ کہیں نظر نہ آیا۔ آخر میں نے اسے تلاش کر ہی لیا۔ وہ پلنگ کے نیچے جا گھسا تھا۔

"باہر آ جائیے شاہ جی! اب خطرہ ٹل چکا ہے۔" میں نے بڑے اطمینان سے پلنگ کے نیچے لائیٹر کی روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ میری بات کا اس پر اچھا اثر ہوا اور وہ آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا باہر آ گیا مگر حالت اس کی یہ تھی کہ وہ سر سے پاؤں تک تھر تھر کانپ رہا تھا عین ممکن تھا کہ کچھ دیر اگر اس کی یہی کیفیت رہتی تو اس کے دل کی حرکت ہی تھم جاتی۔ وہ دشمنوں کا مارا ہوا آدمی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ وہ پلنگ کے نیچے سے نکلا تو میں نے بڑی احتیاط سے اوپر اٹھایا۔

"اب پریشانی کی کوئی بات نہیں رہی ہے شاہ جی، آپ کے دشمن ڈھیر ہو چکے ہیں وہ دیکھیں۔" میں نے گوگے اور تاجے کی بندوقیں اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیں۔ اسے اپنی بصارت اور سماعت پر اب تک بھی اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا "یہ سب کچھ کیسے ہو گیا بیٹے! تم نے مجھے ان سے کیسے بچا لیا؟"

"اطمینان سے بیٹھ جائیں شاہ جی ادھر پلنگ پر۔"

"میں... میں پہلے لیمپ تو جلاؤں۔" یہ کہہ کر اس نے میز پر رکھی ماچس کی ڈبیا اٹھا کر ایک تیلی جلائی اور لیمپ روشن کر دیا۔ اب کمرے کا ماحول واضح ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنی قمیص کے دامن سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھا اور پھر رخساروں کے اندر دھنسی آنکھوں کو پوری طرح کھول کر مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے میں کوئی اچنبھا چیز ہوں اس کے لیے۔ کوئی عجوبہ ہوں۔ کوئی ماورائی مخلوق سمجھ رہا تھا وہ مجھے۔ میں نے لحاف کھول کر اسے پلنگ کی طرف دھکیلا تو وہ اپنے سلیپروں سے پیر نکال کر اوپر بیٹھ گیا۔ بدن اس کا اب تک لرز رہا تھا۔ وہ لحاف اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر بولا۔

"تم کون ہو بیٹے! تم نہ ہوتے تو میں تو برباد ہو گیا تھا آج ان کے ہاتھوں۔" اس کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔

"شاہ جی آپ کو میں نے نہیں گوہر نے بچایا ہے آپ جانتے ہیں نا اُسے؟"

"گوہر نے؟ وہ جو عبدالکریم کا بیٹا ہے۔ ہمارے گاؤں کا گوہر ہے نا وہ؟"

"پتہ نہیں کہاں کا ہے وہ مگر اس کا نام گوہر ہے۔" میں نے دروازے کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ گوہر اس وقت تاجے کے پاس کھڑا اسے پاؤں سے پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

"ادھر آ بھئی ۔۔ شاہ صاحب تیرے بارے میں پوچھ رہے ہیں گوہر۔" میری یہ بات سنتے ہی گوہر کمرے میں آ گیا۔

"السلام علیکم شاہ صاحب! یہ بدمعاش تو آج آپ کو چٹا کر ہی چلے تھے۔"

"وعلیکم السلام گوہر بیٹے! مگر تم کیسے یہاں آ پہنچے۔ تمہیں کس نے بتایا تھا کہ یہ میرے گھر ڈاکہ ڈالنے آ رہے ہیں؟" شاہ جی نے حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے کہا۔ ان کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تیرنے لگے تھے۔ تکیے کے نیچے رکھے سگریٹ کا پیکیٹ اٹھا کر انہوں نے لرزتے ہاتھ سے ایک سگریٹ سلگایا۔

"مجھے تھوڑی ہی دیر پہلے کسی نے بتایا تھا شاہ جی کہ یہ لوگ آپ کے گھر آ رہے ہیں۔ میں نے اپنے اس دوست کو ساتھ لیا اور فوراً ہی ادھر آ گیا۔ یار یہ تو مر گئے دونوں ہی ختم ہو چکے ہیں۔" وہ گوگے کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولا۔

"مرے نہیں ہیں یہ ابھی زندہ ہیں۔ کہو تو مار دوں۔ بھلا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"مار دو ان دونوں کو۔ میرے ہی گاؤں میں ڈاکہ ڈالنے آ گئے تھے مگر پتہ نہیں تھا انہیں ادھر گوہر بھی رہتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بڑی نفرت سے گوگے کی کمر میں ٹھوکر ماری۔

"نہیں یار! اتنی ہی نصیحت کافی ہے انہیں، اب یہ ادھر کا رخ کبھی نہیں کریں گے۔"

"میں تمہارا کس منہ سے شکریہ ادا کروں بیٹے! مجھے تو یہ تباہ ہی کر دیتے آج۔"

اچانک صحن سے پار سیڑھیوں میں مجھے تین چار سائے سے نظر آئے۔ میں چونک کر ایک طرف ہو گیا اور پستول کا رخ میں نے ان کی طرف کر لیا۔

وہ لوگ سیڑھیوں سے نکل کر صحن میں آئے تو چاندنی نے مجھے ان کے چہرے دکھا دیے۔

"یہ کس سے باتیں کر رہے ہو شاہ جی؟" ایک ادھیڑ عمر کی عورت بولی۔ اس کے ساتھ دو جوان لڑکیاں بھی تھیں اور ان کے دائیں ہاتھ دو لڑکے تھے۔

"ادھر تو آ سلیماں! یہ دیکھ کیا ہو گیا ہے ادھر۔"

"ہائے میں مر گئی۔ یہ کون اُلٹا پڑا ہے یہاں۔" وہ تاجے کے پاس پہنچ کے رُک گئی۔

گوہر اس کی یہ بات سنتے ہی باہر نکلا اور بولا "سلام خالہ جی۔"

"تو ہے تو اس وقت یہاں کیا کر رہا ہے؟" اس عورت نے بڑے بیزار لہجے میں کہا۔

"میں۔ میں آپ کی حفاظت کر رہا ہوں خالہ جی۔ میں نہ ہوتا تو آج ڈھل گئے تھے آپ سب کپڑے لیٹے کی طرح۔" گوہر نے دُون کی لیتے ہوئے کہا۔

"کیا ڈھل گئے تھے ہم؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" اس عورت نے بڑی رعونت سے کہا۔ اس کی دونوں بیٹیاں اور دونوں بیٹے حیرت سے اُسے تک رہے تھے۔ ایک لڑکی نے اپنا چہرہ چادر میں چھپا لیا تھا۔

"میں بتاتا ہوں تمہیں سلیماں! میں تو مارا ہی گیا تھا آج۔ یہ ڈاکو مجھے لوٹنے آئے تھے۔ مگر اپنے اس گوہر بیٹے نے، اور اس جوان نے مجھے بچا لیا۔" حبیب شاہ نے کمرے سے باہر نکل کر کہا۔

"میرے پلے تو کچھ نہیں پڑ رہا ہے۔ یہ مونڈی کاٹے ہیں کون آخر؟"

"یہ چکر کیا ہے آخر ابا جی! یہ کون لوگ ہیں؟" حبیب شاہ کے ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر کہا۔

"مجھے کیا پتہ۔ ان سے پوچھو یہی تمہیں سب کچھ بتائیں گے۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔" حبیب شاہ نے بڑے بے زار لہجے میں کہا۔

"میں بتاتا ہوں خالہ جی۔ یہ دونوں ڈاکو ہیں۔ میں انہیں نہیں جانتا مگر مجھے کسی نے بتایا تھا کہ آج رات آپ کے گھر ڈاکہ ڈالنے آئیں گے مجھے یقین نہیں آتا تھا پھر بھی میں ساری رات ادھر اپنے دوست کے ساتھ پہرہ دیتا رہا۔ ہم شاید گاؤں کے دوسری طرف تھے جب یہ تین آدمی گھوڑیوں پر بیٹھ کر ادھر آ گئے ہم دونوں نے ان کا پیچھا کیا مگر جب ہم یہاں پہنچے تو یہ چھت پر چڑھ چکے تھے۔ ہم بھی ان کے پیچھے اوپر آ گئے۔ اور یہاں پہنچ کر ہم نے ان دونوں کو الٹ دیا بس اتنی سی بات ہے میں تو آپ کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں خالہ جان۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔ تو نے تو بڑا احسان کیا ہے ہم پر گوہر ہمیں کیا پتہ تھا تو ہمارا اتنا خیال رکھتا ہے۔" حبیب شاہ کی بیوی نے گوہر کی باتوں سے متاثر ہو کر کہا۔

"میں نہ کہتی تھی بی بی جی کہ یہ گوہر ہمارا ہمدرد ہے۔ یہ نہ ہوتا تو پتہ نہیں آج کیا ہو جاتا۔" حبیب شاہ کی ایک لڑکی نے خوش ہو کر کہا۔ وہ اپنی دوسری بہن سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ شوخ نظر آتی تھی۔

"ان باتوں کو ختم کر گوہر اور ان کو اٹھا کر باہر چل۔ میں انہیں یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔" میں نے صورتحال کو مزید بگڑنے سے بچانے کے لیے کہا۔

"مگر ہم تو انہیں پولیس کے حوالے کریں گے۔" حبیب شاہ بولا۔

"نہیں شاہ جی۔ یہ دونوں زخمی ہیں کیا پتہ مر ہی جائیں۔ ہم ان کو کہیں پھینک دیں گے ورنہ پولیس خواہ مخواہ آپ کو پریشان کرے گی۔ میں نہ اپنا نام تھانے میں دینا چاہتا ہوں، نہ گوہر کا۔" یہ کہہ کر میں نے تاجے کو اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔

"ان کو تو اٹھا لے گوہر۔ جلدی کر ورنہ ہم خود کسی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔"

گوہر نکتہ رس آدمی تھا بولا۔

"ہاں یار۔ انہیں یہاں چھوڑنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے ورنہ پولیس مجھے بھی گھسیٹتی پھرے گی۔ پتہ نہیں وہ اس سارے چکر کا کیا مطلب سمجھیں۔" یہ کہہ کر اس نے گوگے کو اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔

حبیب شاہ حیرت زدہ ہو کر ہمیں تک رہا تھا بولا "ٹھیک ہے بیٹے۔ جو مناسب سمجھتے ہو کرو۔ مگر گوہر صبح مجھ سے ضرور ملنا۔ اور یہ بھی معلوم کر کے آنا کہ یہ لوگ ہیں کون؟ مجھے تو ان کو پولیس کے حوالے کیے بغیر چین نہیں ملے گا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر اس چکر میں ہم خواہ مخواہ مارے جائیں گے شاہ جی۔ اگر یہ زندہ بچ گئے تو پھر ان سے میں سب کچھ پوچھ لوں گا۔ ورنہ پھر یہ جانیں اور ان کی قسمت۔"

یہ کہہ کر گوہر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ میں بھی تاجے کو اٹھا کر پیچھے آ گیا۔

"تو یہاں ٹھہر۔ میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔ تم میرے ساتھ آؤ یار۔" میں نے حبیب شاہ کے ایک لڑکے سے کہا۔ وہ فوراً ہی میرے ساتھ چل دیا۔ مسجد کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے اُسے قطب دین کے بھی درشن کرائے۔ وہ گلی میں ابھی تک اوندھے منہ پڑا تھا اور بے ہوش تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر وہ لڑکا بے حد

حیران ہوا بولا۔ "یہ کون ہے بھاجی؟"

"یہ بھی انہی کا ساتھی ہے۔ پہلے ہم نے اسی کی گردن دبائی تھی۔ اس نے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔"

"آپ نے تو کمال کر دیا ہے بھاجی۔ میری تو بہن کی شادی ہے اگلے جمعے کو۔ گھر میں سارا جہیز تیار کر رکھا ہے ہم تو لٹ گئے تھے آج۔"

"ہاں! مگر گوہر نے تمہیں بچا لیا ہے وہ نہ ہوتا تو تم مارے گئے تھے آج رات۔"

"پر وہ تو اچھا آدمی نہیں ہے بھاجی! وہ میری بہن ہے نا شمشاد۔ وہ... وہ اس کے پیچھے لگا ہے میں نے تو بہت لحاظ کیا ہے اس کا ورنہ..."

"وہ بہت اچھا آدمی ہے یار کیا نام ہے تیرا؟"

"میرا نام ارشاد ہے جی! میرے ابا جی ولایت سے روپیہ لائے ہیں تو ہم اب باجی سلمٰی کی شادی کر رہے ہیں۔ مگر وہ گوہر میری چھوٹی بہن کو بدنام کرتا ہے۔ اس نے تو اپنی ماں کو بھی بھیجا تھا۔ میری امی کے پاس۔ شمشاد کے رشتے کے لیے مگر یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا۔ امی نے صاف انکار کر دیا۔"

"نہیں یار! وہ گوہر اچھا آدمی ہے بڑے پیسے ہیں اس کے پاس۔ اُدھر شہر میں ایک دکان بھی لے رکھی ہے اس نے۔ بس وہ اگلے مہینے سے وہاں کام بھی شروع کر رہا ہے۔ میری مانو تو یہ رشتہ کر دو۔ بہت اچھا آدمی ہے وہ گوہر۔" میں نے ارشاد کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"مگر وہ... نہیں بھاجی۔ وہ کوئی کام نہیں کرتا ہے۔ بدمعاشوں کے ساتھ مل کر وہ بھی بدمعاش ہو چکا ہے۔"

"اس کے باپ کو جانتے ہو تم؟"

"ہاں۔ عبدالکریم صاحب کو تو میں جانتا ہوں۔ وہ فوج میں سپاہی رہ چکے ہیں اب وہ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ وہ تو بہت اچھے آدمی ہیں۔" ارشاد نے میرے ساتھ قدم ملاتے ہوئے کہا۔ ہم باتیں کرتے ہوئے گاؤں سے باہر نکل آئے تھے

"تو پھر اور کیا چاہیے تمہیں! آج اس گوہر نے اپنی جان پر کھیل کر تمہیں بچا لیا ہے ورنہ کون کسی کے لیے اتنا خطرہ مول لیتا ہے۔" میں نے ارشاد کو سمجھایا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بھاجی پر... وہ بدنام بہت ہے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گوہر کو تم لوگ سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔

اب ہم ٹیکسی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے ارشاد کو ساتھ بٹھایا اور ٹیکسی اسٹارٹ کر کے ان کی گلی میں جا گھسا۔

گاؤں کے مذیدے کتوں نے اس گھڑی وہاں گاڑی کا شور سن کر واویلا مچایا۔ ہر طرف سے وہ ہم پر یلغار کرنے لگے مگر میں نے کوئی پرواہ نہ کی۔ ان کی کسی بات کا جواب دیئے بغیر میں نے گاڑی لے جا کر پہلے قطب دین کے قریب ٹھہرائی اور اسے اندر ڈالا۔ پھر میں حبیب شاہ کے دروازے کے سامنے جا ٹھہرا۔ گوہر نے اب تک ان کے بازو اور تابیے کی پنڈلی پر راکھ ڈال کر پٹیاں باندھ دی تھیں اور ان کے زخموں سے بہتے خون کو روک دیا تھا۔ اس نے حبیب شاہ کے نہ چاہنے کے باوجود جب ان دونوں کو گاڑی کے اندر ڈالا تو وہ لوگ مکان کے دروازے کے سامنے تصویرِ حیرت بنے کھڑے تھے۔ وہ گدرائی ہوئی لڑکی شمشاد بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ جب میں گاڑی کو گلی کے باہر لے آیا تو گوہر بولا۔

"یار یہ سب کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ وہ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ ہم نے ہی اس ڈاکے کا انتظام کرایا تھا اور پھر خود ہی ان کے حامی بن گئے!"

"جو کچھ بھی ہو رہا ہے ہونے دو۔ یہ تمہارے دوست ہیں ان کو یہاں چھوڑنا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے تو چلو پھر لعنت بھیجو اس قصے پر۔ پہلے میں نے شاہ جی سے کہہ دیا ہے کہ وہ اس واردات کا کسی سے ذکر نہ کریں اور اپنا سارا جمع جتھا بینک میں رکھ آئیں۔"

"ہاں یہ اچھا کیا تو نے۔ ویسے میں نے اس ارشاد سے تمہاری سفارش کر دی ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ شمشاد سے تیری شادی کرا دے۔"

"نہیں یار! گپ نہ ہانک۔ تجھے کیا پتہ ہے کہ شمشاد کون ہے اور...."

"مجھے سب پتہ ہے پیارے! تو نے حبیب شاہ کو صرف اس شمشاد کے لیے ہی بچایا ہے۔ ورنہ تو اس آگ میں ہرگز بھی چھلانگ نہ لگاتا۔"

"یار یہ ساری باتیں تمہیں کس نے بتائی ہیں۔ تو بڑی پہنچی ہوئی شے معلوم ہوتا ہے۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔ ہماری تینوں سواریاں پچھلی سیٹوں پر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ وہ سب لمبی چھٹی پر جا چکے تھے اور ابھی تک بے ہوش تھے۔

"مجھے الہام نہیں ہوتا ہے گوہر! میں نے ارشاد سے سب باتیں معلوم کر لی تھیں۔"

"اچھا! تو پھر کیا جواب دیا ہے اُس نے؟"

"میرا خیال ہے کہ اگر تو اپنی شہرت ذرا درست کر لے تو وہ مان جائیں گے۔ ویسے میں نے کہہ دیا ہے کہ تو نے شہر میں دکان لے رکھی ہے اور تو اگلے مہینے وہاں کام بھی شروع کر دے گا۔"

"یہ گپ ہانکنے کی کیا ضرورت تھی میرے پاس کون سی دکان ہے بھلا؟"

"تیرے پاس کوئی مال شال تو ہو گا ہی۔ ان کے ساتھ مل کر تو جو کارروائیاں کرتا ہے اس کا حصہ تو ملتا ہی ہو گا تجھے؟"

"نہیں یار! کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس۔ میں تو تھوڑے ہی دن ہوئے ان سے ملا ہوں۔ صرف ایک بار انہوں نے مجھے چھ ہزار روپے دیئے تھے کوئی پندرہ دن پہلے، اس سے میں نے ایک بھینس خرید لی اور پندرہ سو روپے میاں جی کو دے دیئے تھے انہیں بیج اور کھاد کے لیے روپے کی ضرورت تھی۔"

"تیرے میاں جی نے پوچھا نہیں کہ یہ مال تو نے کہاں سے لیا ہے؟"

"میں نے کہہ دیا تھا کہ کچھ کاروبار کر رہا ہوں۔ میں آج کل ایک آڑھتی کے ساتھ مل کر۔ بس وہ مطمئن ہو گئے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تو فکر نہ کر میں تجھے کاروبار کے لیے بیس ہزار روپے دے دوں گا۔ یہ اسلم آپی ہے نا ہریکے والا، اس سے دس دن بعد لے لینا۔ پھر اس سے کوئی ڈھنگ کا کاروبار کر کے تو یونہی شمشاد سے شادی کر سکے گا۔ تیرا کاروبار دیکھ کر وہ مان جائیں گے۔"

"یار تو! تو بھلا مجھے اتنے روپے کیوں دے گا۔ میں کیا لگتا ہوں تیرا۔ یہی تیرا بڑا احسان ہے کہ تو نے آج ان سے حبیب شاہ کو بچا لیا۔ ورنہ میں اکیلا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ساری عمر مجھے اس بات کا افسوس رہتا۔"

"میں تجھے بیس ہزار روپے ضرور دے دوں گا گوہر۔ میں چاہتا ہوں تو یہ رستہ چھوڑ دے یہ تجھے سیدھا جیل لے جائے گا۔"

"تیری مہربانی ہے یار کہ تو میرے بارے میں ایسی اچھی باتیں سوچ رہا ہے ورنہ مجھے تو ادھر سب لوگ گالی دیتے ہیں۔"

"یہ سب اندھے ہیں۔ انہیں کیا پتہ کوئی اندر سے کیا ہے۔ اب تو مجھے ہریکے کا راستہ بتا دے۔"

"وہ تو میں بتا دیتا ہوں مگر ان کا کیا کریں؟"

"تجھے گاڑی چلانی آتی ہے؟"

"ہاں یہ کام تو میں نے سیکھ رکھا ہے۔ تابیے سے سیکھا تھا میں نے۔"

"اچھا تو مجھے ادھر ہریکے پہنچا کر آپی کے گھر چھوڑ دے اور پھر واپس آ کر یہ ٹیکسی تو سیدھی اُدھر بھٹے پر لے جا اور ان سالوں کو وہاں چوکیدار کے پاس چھوڑ دے۔"

"مگر وہ پوچھے گا تو میں کیا بتاؤں گا انہیں؟"

"کہہ دینا کہ تجھے اُدھر زخمی حالت میں ملے تھے ڈنگری کے باہر۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے اب میں ان سے اچھی طرح نپٹ لوں گا— پہلے ہی بے خبری میں مارا گیا تھا۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم ہریکے پہنچ گئے۔ اس وقت صبح کے دو بج رہے تھے۔ رات کی ناگن ابھی تک دھرتی پر کنڈلی مارے بیٹھی تھی اور ستارے دم بخود تھے۔ چار سُو ہُو کا سناٹا تھا۔ سردی اتنی شدید تھی کہ ہم دونوں اپنے اپنے کمبلوں میں ٹھٹھر رہے تھے اور ہماری سواریاں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر پیچھے پڑی تھیں۔ یوں جیسے کسی مذبح میں ذبح شدہ جانور ایک کے اوپر ایک کر کے ڈال دیئے گئے ہوں۔

گاڑی میں نے گاؤں سے باہر کافی فاصلے پر کھڑی کر دی۔ گوہر اُن راستوں سے پوری طرح آشنا تھا۔ وہ مجھے لے کر گاؤں میں جا گھسا۔ کچھ ہی دور چلنے کے بعد ہمیں ایک حویلی کے بڑے سے صحن میں گیس کے لیمپ جلتے نظر آئے۔ وہاں لوگ ابھی تک جاگ رہے تھے اور گھر سے ٹھہر ٹھہر کر نالہ و شیون کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

"معلوم ہوتا ہے یہاں کوئی آدمی مر گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں یہاں چوہدری بہادر علی مر گیا ہے۔ وہ اسلم آپی کا جگری یار تھا۔ آپی اسی لیے آج تابیے کے پاس نہیں پہنچا تھا۔ یہ چوہدری بہادر علی کا ہی گھر ہے۔ بیچارا۔ بڑی دولت جمع کی تھی اس نے مگر کس کام آئی۔" گوہر نے حویلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے کہا۔

میں چپ رہا۔ مجھے تو یہ بات پہلے ہی معلوم تھی مگر میری خاموشی کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ گاؤں کا ماحول مجھے دہلا رہا تھا اور میری چھٹی حس مجھے کسی شدید خطرے کا احساس دلانے لگی تھی۔ حویلی کے سامنے کھلی جگہ سے ذرا آگے مجھے درختوں کے نیچے سائے سے چلتے نظر آئے تھے۔ ان سایوں کے ہیولوں نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ وہ یقیناً پولیس کے سپاہی تھے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس تو ہوا مگر اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس بار یوسف نے غالباً پولیس والوں کو بتا دیا تھا کہ جس آدمی نے انہیں زخمی کیا تھا وہ ہریکے جا رہا تھا۔ وہ میری تلاش میں وہاں پہنچ چکے تھے۔ میرا سارا بدن سنسنا گیا میں نے گوہر کو اپنی طرف گھسیٹا۔

"گوہر ہم سخت خطرے میں ہیں۔ یہاں سے بھاگ چلو۔" میں نے سامنے کی تاریک گلی میں گھستے ہوئے کہا۔

"کیوں خطرے کی کیا بات ہے؟" گوہر نے میرے قدم کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے کہا۔

"بات کچھ ایسی ہی ہے۔ نکل چل۔" یہ کہہ کر میں نے گھپ اندھیری گلی میں دوڑ لگا دی میرے ساتھ گوہر بھی دوڑنے لگا۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے بھاری بھرکم بوٹوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ سپاہی ہمارے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

"رک جاؤ ورنہ گولی مار دی جائے گی۔" ایک گمبھیر آواز فضا میں ابھری۔ کسی نے ہمیں پیچھے سے للکارا تھا مگر ہم رکے نہیں،

بڑھتے رہے۔ اور اس کے ساتھ ہی کئی گولیاں سنسناتی ہوئی میرے دائیں بائیں سے گزر گئیں۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی وہ گلی خاصی لمبی تھی۔ گولیوں کی ایک اور باڑھ ماری گئی۔ ان سے بچنے کے لیے میں تیزی سے ایک دروازے کی اوٹ میں ہو گیا، مگر گوہر آگے نکل گیا۔ میرا گلی میں آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا تھا کیونکہ وہ بہت قریب آ پہنچے تھے۔ میں نے زور سے دروازے کو پیچھے دھکیلا تو اس کی اندر کی کنڈی کھل گئی میں پاگلوں کی طرح اس کچے مکان کے صحن میں جا گھسا اور گارے مٹی کی بنی بے ہنگم سی سیڑھی کو عبور کر کے چھت پر جا چڑھا۔ وہ لوگ گلی میں بھاگتے ہوئے اس دروازے تک آئے مگر پھر گوہر کو بھاگتا دیکھ کر وہ اس کے پیچھے لپکے۔ وہ ایک لمحہ مجھے بے حد غنیمت لگا اور میں چھتوں پر چلتا ہوا دوسری گلی کے اختتام تک جا پہنچا۔ میرے ساتھ ایک بار پھر وہی ہو رہا تھا جس کا تجربہ مائی جاجاں کے گھر پر ہو چکا تھا۔ میں ایک بار پھر ویسے ہی حالات میں گھر چکا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کدھر جاؤں کس طرف نکلوں۔ آبی کا گاؤں میرا مقتل بن رہا تھا۔ وہ لوگ بہت بپھرے ہوئے تھے ان کی بوچھاڑ نے ایسے دھماکے پیدا کئے تھے کہ سارا گاؤں نیند سے بیدار ہو چکا تھا۔ ہر گھر سے مجھے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میرے لیے دوسری گلی میں کودنا کسی طرح بھی سودمند نہ تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ کھلی جگہ پر دیکھتے ہی مجھ پر گولیاں برسانے لگیں گے۔ ان کے دلوں میں انتقام کی آگ سلگ رہی تھی۔ اور وہ مجھے ہر قیمت پر پکڑنے کے لیے اپنی پوری کوشش صرف کر رہے تھے۔

میرا اندازہ صحیح نکلا۔ مجھے دوسری گلی میں ان کے بوٹوں کی دگڑ دگڑ سنائی دینے لگی۔ وہ ادھر نکل آتے تھے۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا۔ مجھے بہرحال ان کی نظروں سے بچنا تھا۔ میری نبضیں دھڑ دھڑ بج رہی تھیں۔ میرا حال اس وحشی کا سا تھا جو چاروں طرف سے نیزہ بازوں کے انبوہ میں گھر گیا ہو۔ مجھے ان کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں تھا۔ مگر یہ بات صاف ظاہر تھی کہ وہ ایک دو نہیں کئی تھے۔ پوری گارد میرے تعاقب میں وہاں پہنچی ہوئی تھی۔

میں گھبرا کر اس مکان کی چھت پر منڈیر کے ساتھ لگ کے لیٹ گیا تاکہ وہ کسی بھی طرف سے مجھے نہ دیکھ سکیں۔

"یہ ... کیا ہو رہا ہے دینو یہ گلی میں دبڑ دبڑ کیسی ہو رہی ہے گولیاں بھی چلی ہیں۔" کسی عورت نے خوف زدہ گھٹے گھٹے لہجے میں کہا۔ وہ نیچے صحن میں کھڑی تھی۔

"چل اندر۔ تو کیوں باہر نکل آئی ہے، خواہ مخواہ ....

...... چل اندر۔ اذان کے وقت —— چلی جاؤ یہ کیسی مرد کی آواز تھی۔

"ہائے میرا دل ٹوٹ رہا ہے دینو ماں بھی جاگ گئی ہو گی وہ تو میری جان کھا جائے گی۔"

"دفع کر جیلاں، اس دم پر مٹی ڈال۔ پتہ نہیں کیا مصیبت ہے باہر — چل آ، اندر بیٹھتے ہیں۔"

"نہیں بیبا، میں چلتی ہوں۔" وہ عورت بولی۔

"نہیں بھئی۔ میں ابھی نہیں جانے دوں گا تجھے۔ ابھی تو دل بھرا نہیں۔" مرد کی آواز بہکی ہوئی تھی۔ اس کا لہجہ بہت ہی کھردرا سا تھا۔ مگر اس میں مجھے اس گھڑی ایک دیوانگی میں مبتلا آدمی کی کیفیت جھلکتی نظر آتی تھی۔ میں نے سر آگے کر کے صحن میں جھانک کر دیکھا تو وہ اس عورت کو پیچھے کھینچ رہا تھا۔

چھت یہی کوئی آٹھ نو فٹ اونچی تھی۔ کچے گھروندوں کی چھتوں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ اچانک گلی میں کسی سپاہی کی کرخت آواز گونجی۔ "وہ بھاگتا ہوا چلا رہا تھا" وہ کسی گھر میں چھپ گئے ہیں سارے گھروں کی ناکہ بندی کر دو۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میں نے صحن میں چھلانگ لگا دی دینو مجھ سے دو ہاتھ دور تھا۔ مجھے صحن میں دیکھ کر وہ تیزی سے دیوار کی طرف ہٹا جیلاں بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں یوں گنگ ہو گئے تھے جیسے انہوں نے صحن میں کسی بھوت کو دیکھا ہو۔ میں نے پستول کی نال دینو کے سینے سے لگا دی۔

"تم دونوں اندر چلو۔ خبردار جو منہ سے کوئی آواز نکالی ... گولی مار دوں گا۔"

میری دھمکی کا ان پر خاطر خواہ اثر پڑا۔ اور وہ دونوں کوٹھری کی طرف چل دیئے۔

"تیز چلو" میں نے انہیں آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔

باہر پولیس کے سپاہی اب سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو خبردار رکھنے کے لیے وہ چاروں طرف بکھر کر مجھے تلاش کر رہے تھے۔

دینو اور جیلاں کو جب میں کوٹھری میں دھکیل چکا تو دیئے کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ دینو یک چشم گل آدمی تھا اور وہ جیلاں شکل سے بس یونہی سی نظر آتی تھی۔ سیاہ رنگت، موٹے موٹے ہونٹ جسم البتہ اس کا خوب کسا ہوا تھا۔ عمر اس کی زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی پچیس چھبیس سال ہو گی۔ اس کی آنکھیں بہرحال لوبھتی نظر آتی تھیں ایسی خوبصورت آنکھیں میں نے زندگی میں بہت کم دیکھی ہیں۔ یہ بڑی بڑی۔ گائے کی آنکھوں ایسی۔ اور ان کی چمک ایسی تھی کہ نگاہوں کو خیرہ کرتی تھی۔ ہر عورت کو قدرت کی طرف سے کوئی نہ کوئی خوبی ضرور عطا ہوتی ہے جو کسی نہ کسی کو اس کا دیوانہ ... بنا دیتی ہے۔

وہ دونوں ٹک ٹک مجھے دیکھ رہے تھے۔ دونوں کا رنگ اڑ رہا تھا۔

"تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے دینو! میں ادھر چوہدری اسلم سے ملنے آیا تھا۔ اسلم آبی سے مگر میرے پیچھے پولیس لگ گئی۔ گولیوں کی جو آواز تم نے سنی ہے وہ انھوں نے مجھ پر ہی چلائی تھیں میں تھوڑا عرصہ یہاں گزاروں گا۔" میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ جیلاں کے بال کھلے تھے اور وہ اتنے لمبے تھے کہ اس کے کولھوں تک پھیلے نظر آتے تھے۔ دینو نے کھیس کی بکل مار رکھی تھی۔ اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ نیچے قمیص نہیں پہنے ہوئے ہے۔ میری بات کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دینو اپنی واحد آنکھ بار بار جھپک رہا تھا۔

"تم بیٹھتے کیوں نہیں ہو۔ بیٹھ جاؤ ادھر" میں نے چارپائی کی پائنتی کھسکتے ہوئے کہا۔ اسٹین گن کا رخ ابھی تک میں نے انکی طرف کر رکھا تھا۔

"میں جا رہی ہوں دینو، مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"تم ابھی نہیں جاؤ گی جیلاں۔ میرا بھی ایک کام کر دو۔ اس کام کے تمہیں پیسے بھی دے سکتا ہوں۔ یہ دیکھو۔ یہ سو کا نوٹ رکھ لو" میں نے بائیں ہاتھ سے جیب کو ٹٹول کر ایک نوٹ باہر نکالا اور اس کے سامنے کر دیا۔

"میں ... میں ... تھوکتی بھی نہیں ہوں تمہارے نوٹ پر —— میں کوئی کنجری نہیں ہوں۔" وہ ایک دم بھڑک کر بولی۔ میرے ہاتھ میں نوٹ دیکھ کر وہ خدا جانے کیا سمجھ بیٹھی تھی۔

"اسے سمجھاؤ دینو، میں ... میں آدمی کو سمجھ جاتا ہوں۔"

"سو روپیہ بڑی چیز ہے میں نے تو اسے تیس روپے دیئے تھے۔"

"بکواس نہ کر دینو، میں تو تیری محبت میں یہاں آ گئی تھی۔ یہ لو اپنے یہ پیسے رکھ لو۔"

وہ اپنی پہلو کی جیب میں ہاتھ ڈالنے لگی۔

"تم دونوں غلط سمجھے ہو۔ جیلاں میں یہ پیسے کسی ایسے ویسے کام کے لیے نہیں دے رہا ہوں تجھے۔ میں چاہتا ہوں کہ تو اسی وقت جا کر اسلم کو یہاں بلا لائے۔ یہ تیری بڑی مہربانی ہو گی۔ مجھے اس سے ایک بہت ضروری کام ہے۔"

"اچھا؟ تو پہلے کیوں نہیں بتایا تو نے۔ اس نوٹ کی ضرورت ہی نہیں ہے میں اسے ویسے ہی بلا لاتی ہوں۔ پر پتہ نہیں وہ گھر میں ہو گا بھی کہ نہیں۔" جیلاں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ دینو نے وہ نوٹ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ بولا،

"یہ نوٹ تم مجھے دے دو۔ میں بلا لاتا ہوں اسے۔"

"نہیں تمہارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ باہر پولیس موجود ہے۔"

"میں کہہ دوں گا کہ میں چوہدری بہادر علی کے گھر جا رہا ہوں۔ اسلم کا گھر اس کے قریب ہی ہے۔"

"مگر بہادر علی تو مر گیا ہے۔"

"ہاں! ادھر وہ سب لوگ جاگ رہے ہیں مجھے سب پتہ ہے۔"

"مگر تو پولیس کو کچھ نہیں بتائے گا۔ ورنہ یاد رکھ دینو یہاں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی تیری اس ذرا سی غلطی پر۔"

"نہیں جی، میں انہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ وہ میرے 'ساک' تو نہیں لگتے۔ مجھے کن سے کیا لینا ہے۔" دینو نے نوٹ کو دہرا کرتے ہوئے کہا۔

"تو ٹھیک ہے تو ہی چلا جا مگر بڑی احتیاط سے جانا۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں بھائی جی۔ چل جیلاں تو اب جا تیری ماں فکر کر رہی ہو گی۔"

"نہیں یہ ابھی نہیں جائے گی۔ تو آئے گا تو پھر یہ بھی چلی جائیگی تجھے کسی نے ادھر روک لیا تو اس کے ذریعے میں معلوم تو کر سکوں گا۔ جا اب جلدی نکل جا۔"

"اچھا ٹھیک ہے جی! میں بس ابھی آیا۔" یہ کہہ کر اس نے کرتہ پہنا اور پھر کھیس کے پلے کو سر پر بل دے کر باندھتے ہوئے وہ بکل مار کر باہر نکل گیا۔ جیلاں نے صحن میں جا کر اندر سے کنڈی چڑھائی اور پھر ننگے پیروں چلتی ہوئی اندر آ گئی مگر چارپائی پر نہیں بیٹھی، حالانکہ وہاں بڑی جگہ تھی۔ سردی سے وہ ٹھٹھرنے لگی تھی۔

"اری تو بھی ادھر بیٹھ جا۔ وہاں کیوں کھڑی ہے۔ میں کوئی کھا تو نہیں جاؤں گا تجھے۔ بے بس اور مجبور آدمی ہوں پناہ کے لیے ادھر آ گیا ہوں جیلاں بیٹھ جا۔"

"وہ تیرے پیچھے پولیس کیوں لگی ہے؟" وہ چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"یہ لمبا قصہ ہے جیلاں۔ وہ بچارے میری محبت میں مرے جا رہے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ مجھے سینے سے لگا لیں۔" میں نے دائیں ہاتھ سے لحاف اس کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

"یہ اوپر اوڑھ لے۔ تجھے سردی لگ رہی ہے نا۔"

اس نے لحاف کو اپنی طرف سمیٹا اور بولی "کوئی قتل شتل کیا ہو گا تو نے یا پھر کہیں ڈاکہ ڈالا ہو گا۔ مجھے تو تیری شکل سے ڈر لگتا ہے۔"

"تجھے ڈرنا بھی چاہیے۔ آدمی آدمی اندر ہوتا ہے۔ پتہ نہیں میں کیا کر دوں۔ مگر تو ادھر دینو کے پاس کیا کر رہی تھی۔"

وہ خجل ہو گئی۔ چہرے کے آگے اس نے لحاف پھیلا لیا۔

"ساری بات تو خیر دینو نے خود ہی بتا دی تھی۔ بڑا اچھا یار ہے تیرا۔"

"بڑا ذلت ہے یہ دینو۔ اس کے پیچھے میں اتنی جان مارتی ہوں

اور یہ سمجھتا ہے کہ میں پیسے کے لالچ میں یہاں آتی ہوں۔"

"وہ حساب صاف رکھتا ہوگا تاکہ کل کلاں کو کوئی بکھیڑا نہ کھڑا ہو جائے۔"

"آج تو اس نے مجھے بہت ذلیل کیا ہے اب میں اس سے کبھی نہیں ملوں گی۔"

"اور وہ تیس روپلے؟"

"وہ میں اس کے منہ پر دے ماروں گی۔ اس کمینے نے سمجھا کیا ہے مجھے۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے تیس روپے نکال کر زمین پر پھینک دیئے۔ اس کی اس سادگی نے مجھے حیران کر دیا۔ ایسی ندامت اس کے چہرے پر ابھر آئی تھی کہ میں سمجھا کہ وہ ابھی وہاں سے اٹھ کر چل دے گی۔ باہر گلی میں اس وقت مکمل سناٹا چھا چکا تھا۔ پولیس کے سپاہی گلیوں کی ناکہ بندی کر کے ایک دوسرے سے الگ تھلگ کھڑے تھے یہی وجہ تھی کہ ہمیں ان کی طرف سے کسی قسم کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

"یہ دینو اکیلا رہتا ہے یہاں۔"

"ہاں! اس کی ماں بھی مر چکی ہے اور باپ بھی۔ ادھر سوتر مل میں کام کرتا ہے یہ۔ تین سو روپے لیتا ہے۔ مجھے بڑھاتا رہتا ہے کہتا تھا میں تجھ سے شادی کروں گا مگر دو سال ہو گئے۔ میری اس کی بول چال کو مگر اب یہ کنی کھسکاتا ہے۔"

"یہ تو ہوتا ہی ہے۔ تو جب ویسے ہی اس کا دل خوش کر دیتی ہے تو پھر وہ تجھ سے شادی کیوں کریگا۔ تو اس کی پیاس بڑھائے گی تو وہ سیدھا ہو جائے گا۔" اس کے چہرے پر شرم کی ردا بچھنے لگی۔ ایک بار پھر اس نے لحاف میں منہ چھپا لیا۔ بولی،

"تو بڑا وہ ہے۔ سخت بے شرم آدمی ہے تو۔"

"میں یہ سارے پتن تیر چکا ہوں بی بی۔ مجھ سے کوئی بات اوجھل نہیں ہے۔"

"لگتا ہے تیرے پاس بڑے پیسے ہیں۔ بغیر کسی وجہ کے تو نے اُسے سو روپیہ تھما دیا۔"

"بھئی وہ کام ہی ایسا ہے رشوت کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا میں ویسے ہی داغی آدمی ہوں وہ بھلا کیوں میرا کام کرتا — اور پیسے تو تیری دعا سے میرے پاس بہت ہیں۔"

"اچھا! اتنے پیسے ہیں تیرے پاس۔ کوئی دو چار سو مجھے بھی دے جا۔"

میرا ذہن قلابازیاں کھانے لگا۔ پیسہ پیسہ پیسہ۔ ایک ہی سوال ابھرتا ہے ہر جگہ، ہر مقام پر، اور اس پیسے کے بل بوتے پر مرد نے عورت کو کس کس مرحلے سے نہیں گزار دیا ہے اگر پیسے پر مرد کی اجارہ داری نہ ہوتی تو عورت بھی شاید اسے اتنے ہی جانگسل مراحل سے گزارتی اور اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ اذیت پہنچاتی جتنی مرد نے اسے پہنچائی ہے اور وہ گاؤں کی سیدھی سادھی، الھڑ، اکھڑ، دوہرے بدن والی جیلاں مجھے اس گھڑی اندر سے پگھلا کر میری سو میانی نکالنے پر آمادہ ہو گئی۔ پیسے کے لیے اس کی گرسنگی دیدنی تھی۔

عین اُسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ ٹھٹک گئی۔

"یہ لے تو سو روپیہ رکھ لے اور جا دیکھ شاید وہ دینو آیا ہے۔" میں نے اسے سو روپے کا نوٹ تھما دیا۔ وہ خوش ہو گئی۔ نوٹ کو میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا، تہ کر کے چولی کی جیب میں ڈالا اور دبے پاؤں صحن میں نکل کر اس نے کنڈی پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں بھی اس کے پیچھے دروازے پر جا پہنچا۔

"کون ہے؟" وہ بولی۔

"میں ہوں دینو۔ دروازہ کھول۔" باہر سے دینو نے سرگوشی کی۔ جیلاں نے دروازہ کھولا تو پہلے دینو اندر آیا اور پھر اس کے پیچھے ایک اور آدمی اندر آ گیا۔ اس نے آتے ہی گھپ اندھیرے میں مجھے دیکھا اور ایک دم مجھ سے لپٹ گیا۔ "اوئے میرے یار تو ادھر کیسے آ گیا۔" دینو نے دروازے کو کنڈی لگانے سے پہلے جیلاں کو باہر نکال دیا اور پھر ہماری طرف مڑا۔ بولا۔

"اندر چل کر بیٹھو چودھری جی۔ وہ پولیس والے بہت تیز ہیں۔" آبی مجھے کھینچتا ہوا کوٹھری میں لے گیا۔ وہ مجھے دیئے کی مدھم روشنی میں یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی عجوبہ چیز ہوں۔ پھر وہ مجھے بڑی محبت سے چارپائی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

"یار، میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ تجھ سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا میرا۔ یہ پولیس والے کہیں تیرے پیچھے تو دھنا دھن نہیں کر رہے تھے؟"

"بات کچھ ایسی ہی ہے آبی۔ میں ان کے گھیرے میں آ گیا تھا۔ اللہ نے ہی جان بچائی ہے آج۔"

"وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ جو سپاہی آتے جاتے ہیں ادھر اور ایک تھانیدار ہے۔ بڑا تھانیدار کہتے ہیں تو نے ادھر پولیس سے مقابلہ کیا تھا۔"

"ہاں! مجھے ان پر گولی چلانی پڑی تھی۔"

"پھر یار انہوں نے تو گاؤں کی ناکہ بندی کر رکھی ہے گاؤں کے آدمیوں کو بھی ادھر ادھر [illegible] ہے۔"

"تجھے کیسے آنے دیا انہوں نے؟"

"ہم تو ایک پل نہیں سوئے آج۔ وہ بہادر علی مر گیا ہے نا جگری یار۔ اس کے کوئی دو سو رشتے دار آ چکے ہیں اب تک

کے لیے مجھے ساری رات ادھر ادھر پھرنا پڑا۔ کسی سے بستر مانگا کسی سے چارپائی کہیں سے کھیس لیے اور کہیں سے رضائیاں — ایک عذاب جھیلا ہے میں نے رات بھر۔"

"ہاں یار، بہادر علی کی موت کا مجھے بہت افسوس ہوا ہے۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا؟" اس نے حیرت ظاہر کی۔ میں نے چاہا کہ میں تابیے کا نام لے دوں مگر مصلحتاً میں نے اپنا ارادہ بدل لیا — تابیا آبی کا دوست تھا اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ میں نے اُن کا کیا حشر کیا ہے تو پتہ نہیں وہ مجھ سے کیا سلوک کرتا۔ میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔ "تو نے خود ہی تو بتایا ہے مجھے۔"

"اچھا، ہاں! بس اس کا وقت آ گیا تھا ورنہ انہی کھیتوں میں وہ پل کر جوان ہوا تھا یہاں کے تو سانپ بھی اسے جانتے تھے مگر کل ایک سانپ نے اسے ڈس ہی لیا۔"

"کوئی اجنبی سانپ ہوگا بے خبری میں کام دکھا گیا۔"

میری یہ بات سن کر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا۔ بولا، "تو کتنے پکڑنے میں ماہر ہے میرے یار! خیر — اب تو مجھے بتا کہ تجھے میں کیسے یاد آ گیا۔"

"تجھے تو میں کبھی بھی نہیں بھول سکا ہوں آبی۔ بڑے دھکے کھائے ہیں میں نے مگر تو مجھے یہاں سے نکالے تو میں کچھ کہوں۔"

"ہاں یار! یہ تو بڑی مصیبت کی بات ہے۔ وہ تو ادھر چھاؤنی ڈالے بیٹھے ہیں۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور یوسف بھی ان کے ساتھ ہے بتا رہا ہے وہ تو اس کی ٹیکسی بھی لے آیا تھا۔"

"ہاں مگر یہ تو بہت برا ہوا۔ وہ تو مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے۔"

"ہاں میرا خیال ہے کہ سورج نکلنے پہ وہ گھر گھر تلاشی لیں گے۔" آبی نے کہا۔ وہ بہت فکرمند نظر آنے لگا تھا۔

"ذرا اس دینو کو ٹلا یہاں سے پھر میں تجھے ساری بات بتاتا ہوں۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

دینو کوٹھری کے کونے میں بچھی چارپائی پر بیٹھا تھا اور ہماری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ آبی نے میرے مشورے پر غور کیا اور پھر بولا۔

"یار دینو! تیرے پاس فالتو رضائی تو ہے وہ ادھر دے آ بہادرے کے گھر کسی مہمان کے کام آ جائے گی۔"

"ٹھیک ہے بھاجی! میں یہ لحاف دے آتا ہوں یہ ذرا صاف ہے۔" اس نے چارپائی پر رکھے لحاف کو لپیٹ دیا اور اسی وقت اسے بغل میں دبا کر باہر نکل گیا۔

آبی نے صحن میں جا کر اندر سے کنڈی چڑھائی اور پھر میرے پاس آ کر بڑے اطمینان سے بیٹھ گیا۔ بولا۔ "اب بتا یار، قصہ کیا ہے۔ تو نے تو ادھر گورنمنٹ ہلا کر رکھ دی ہے۔"

"بات ہی کچھ ایسی ہے آبی۔ میں شکنجے میں جکڑا گیا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے دلشیر آہو کا سارا قصہ اسے سنا دیا۔ وہ حیرت کی تصویر بنا میری باتیں سنتا رہا۔ میں نے قطب دین، تابیے اور گوگے کی بات اسے جان بوجھ کر نہ بتائی اس خیال سے کہ کہیں وہ بھڑک نہ اٹھے تابیے سے اس کے تعلق کی گہرائی کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

"یار، اس آہو کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ تو معاملے کا بڑا کھرا آدمی ہے۔ اپنے کسی یار کو اس نے کبھی اس طرح دھوکا نہیں دیا۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ میرا تو خیال ہے کہ اس کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ گئی ہے۔"

"یہی ہوا ہے۔ وہ کاغذات ہیں تیرے پاس جو اس نے لکھ کر دیئے تھے۔"

"ہاں۔ وہ تو میرے پاس محفوظ ہیں۔ یہ رہے۔" میں نے اپنی جیب سے آہو کے ہاتھ کی لکھی وہ دستاویزات اسے دکھا دیں۔ آبی نے ان کو بڑے غور سے پڑھا اور پھر مسکرا دیا۔ بولا۔

"بالکل بچوں ایسی حرکت کی ہے تو نے۔ تو ان کاغذوں کو کسی کچہری میں پیش کر سکتا ہے؟ ان کو تو کس کے سامنے رکھے گا؟"

میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ کاغذات جن پر مجھے بہت بھروسہ تھا آبی کی نظر میں محض ردی تھے۔ میں نے اپنی خفت مٹاتے ہوئے کہا۔

"دیکھ آبی! میں اس معاملے میں تجھے ہی سب سے بڑی کچہری سمجھتا ہوں تو نے ہی مجھے اس کے گھر بھیجا تھا۔ اس سے میں تیری ہی وجہ سے مل سکا تھا۔ ورنہ میں تو اسے جانتا بھی نہیں تھا۔"

"اب تو مجھ سے منصفی کرائے گا اس جھگڑے کی۔ معاملہ بڑا پیچیدار ہو گیا ہے جیلانی مگر خیر تو فکر نہ کر میں تیرے ساتھ ہوں۔ آہو کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ اس نے کئی بار مجھے کئی جھگڑوں سے نکالا ہے مگر یہاں میں سمجھتا ہوں کہ تو حق پر ہے۔ میں تیرے ساتھ چلوں گا پھر دیکھیں گے وہ کیا کہتا ہے۔"

"مگر اس کا کوئی بھروسہ نہیں ہے وہ مجھے گرفتار کرانا چاہتا ہے۔"

"نہیں، تیری گرفتاری سے تو وہ خود مارا جائے گا۔ اس کا بہت بڑا راز تیرے پاس ہے اور پھر اس وقت یہ کاغذ تیرے بہت کام آ سکتے ہیں۔ ان کے ذریعے تو اس کے راز کا ثبوت بھی پیش کر سکتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ اسی لیے میں نے یہ تحریر لی تھی اُس سے۔"

"مگر یہ تو جب کام آئیں گے جب تو گرفتار ہو گا۔ پر میرے

یار تیری گردن پہ کئی لوگوں کا خون ثابت ہوتا ہے۔ تو کیا کرے گا گرفتار ہو کر۔" آبی نے کہا وہ خاصا سمجھدار آدمی نظر آتا تھا۔

"اس نے وہ تھیلا دبا ہوا اسی ہزار روپیہ بھی دبا لیا ہے۔۔۔ بے ایمان ہو گیا ہے وہ۔"

"میں سمجھ رہا ہوں جیلانی۔ اسی لیے اس نے تجھے زہر دلوایا۔ اسی لیے تجھے بکری کے ذریعے مروانے کی کوشش کی تھی اس نے۔ پر خیر، اب سب سے بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ تمہیں یہاں سے کس طرح نکالوں۔ اگر یہ تجھے پکڑ کر لے گئے تو پھر تو قصہ ہی پاک ہو جائے گا جیلانی۔ بڑا مورکھ ہے تو۔ آج رات تجھے ادھر آنے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔ کسی کے ذریعے مجھے بلا لیا ہوتا۔"

"اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ میری سمجھ میں تو اب صرف ایک ہی تدبیر آتی ہے یہاں سے نکلنے کی۔"

"وہ کیا۔ اگر کوئی کام کی بات ہے تو جلدی بتا دے۔"

"تو کسی سپاہی کو کسی بہانے ادھر گلی میں لے آ۔ میں اسے بے ہوش کر کے اسی کی وردی خود پہن لوں گا اور پھر اسی وردی میں باہر نکل جاؤں گا۔"

وہ آگے بڑھ کر میری آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"تو جاگ رہا ہے نا بھائی۔ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے والی بات ہو گی۔ اور پھر میں اگر اسے یہاں لے بھی آؤں تو اسے بلے بنا تو بے ہوش کیسے کریگا۔"

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔ کسی ایک کو بس ادھر لے آ۔ زیادہ نہ ہوں، ورنہ شور مچ جائے گا۔"

"یار بجوں ایسی باتیں کرتا ہے تو۔ وہ بہت بھڑکے ہوئے ہیں کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔"

"پھر کیا کروں۔ میں تو بند ہو کر رہ گیا ہوں یہاں۔"

"زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے تو ادھر اطمینان سے بیٹھا رہ۔ دینو حوصلے والا آدمی ہے۔ تیرا خیال رکھے گا۔ میں اسے کچھ پیسے بھی دے دوں گا۔"

"ایک سو روپیہ تو میں بھی دے چکا ہوں اسے تمہیں بلانے کا معاوضہ۔"

"اچھا! تو نے پہلے ہی کانا کر دیا اسے۔"

"ہاں، مگر دیکھ یار وہ ایک چیز ہے جیلاں۔"

"ہاں ہاں! ہے تو۔ مگر تو اسے کیسے جانتا ہے؟"

"وہ ادھر دینو کے ساتھ مصروف تھی۔"

"اچھا یہ قصہ ہے۔"

"وہ میرے کام آ سکتی ہے۔"

"وہ کس طرح؟"

"بس وہ گلی میں نکلے اور کسی نہ کسی سپاہی کو اپنے پیچھے لگا کر ادھر لے آئے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے! وہ زیادہ دور نہیں ہے یہاں سے۔ اس دینو کے گھر میں سیڑھی نہیں ہے ورنہ میں چھت پر جا کر اسے بلا لاتا یا اس کو سمجھا دیتا۔"

"یہ کون سی اونچی چھت ہے تو میرے کندھے پر بیٹھ اور چڑھ جا اوپر۔"

ہاں یہ ٹھیک ہے۔ وہ فوراً مان جائے گی۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا میں نے صحن میں جا کر اسے کندھے پر بٹھایا تو وہ میرے اوپر سے ہی چھت پر جا چڑھا۔ اور میں ایک بار پھر کوٹھڑی میں جا بیٹھا۔

اندر سے اپنی اس بے بسی پر میرا کلیجہ کٹ رہا تھا۔ میری زندگی کا سارا چلن ہی بدل گیا تھا۔ میں وہ تھا کہ میں نے کبھی تھانے میں قدم ہی نہیں رکھا تھا۔ پولیس کے نام سے مجھے چڑ تھی۔ میری زندگی کے سارے چشمے صاف شفاف تھے۔ مجھے نہ کوئی ڈر تھا، نہ خوف اور اب یہ حال تھا کہ قدم قدم پر میں دہل جاتا تھا۔ اپنے آپ سے ہی ترساں و لرزاں پھر رہا تھا۔ میرا نہ کوئی گھر تھا نہ در۔ کوئی دہلیز ایسی نہیں تھی جو شام کے جھٹپٹے میں میری منتظر ہوتی۔ میں ماں سے بھی محروم ہو گیا تھا اور بہن سے بھی۔ میرا حال اس ٹنڈ منڈ درخت ایسا تھا جسے موسموں کی سختی نے اجاڑ دیا تھا۔ جس کی جڑیں بھی کھوکھلی ہو چکی تھیں میرے لیے کوئی بھی راستہ کھلا نہ رہ گیا تھا۔ چار سو مجھے تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی۔ میں کبھی اس تنکے کا سہارا لیتا تھا اور کبھی اس تنکے کا۔ ہوائیں مجھے ایک خشک پتے کی طرح ادھر ادھر اڑائے لیے پھرتی تھیں۔ میرا جینا بھی کوئی جینا تھا یارو۔ مجھے بہت عجلت تھی آبی کے گاؤں پہنچنے کی۔ میں چاہتا تھا کہ جس قدر بھی جلدی ممکن ہو سکے۔ میں آبی کے تعاون سے آہو کو راہ راست پر لے آؤں تاکہ میری بہن آسیہ جیل کی سنگین دیواروں کے پیچھے مرجھا جانے سے پہلے رہائی پا سکے۔ مگر اب میں چوہے کی طرح پنجرے میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ میں آبی کے پاس پہنچ تو گیا تھا مگر یوں کہ حالات کی ستم ظریفی نے میرے لیے باہر نکلنے کے تمام راستے مسدود کر دیئے تھے۔

میں دینو کی اس کوٹھڑی میں بیٹھا کتنی ہی دیر تک اپنے آپ سے الجھتا رہا۔ اپنے ہر اقدام میں مجھے اس رات سو عیب نظر آتے تھے مجھے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ میرا ہر قدم ہر فیصلہ مجھے گمراہی کے گڑھے میں اور گہرا دھکیلتا چلا جا رہا تھا۔ میں اس بچارے فیروز دین کے گھر سے اس لیے تو نہیں نکلا تھا کہ میں پولیس سے مقابلہ کروں گا اور یوں قانون کے ان بے گناہ محافظوں کو گھائل کر کے اپنا راستہ بناؤں گا۔ مگر نہیں میرے نصیب میں وہ سپاہی بھی لکھی تھی۔ لوح محفوظ پر میرے لیے خدا جانے کیا کیا کچھ مرقوم تھا کہ وہ

پر اسرار تحریر جونہی میرے سامنے لمحوں کے تختے پر چڑھ کر ذرا سی کھلتی تھی تو میں خود کو اور زیادہ مہیب ذلتوں سے دوچار پاتا تھا۔ میں ایک طمانچہ ابھی سہہ بھی نہ پاتا تھا کہ میرے دوسرے رخسار پر تقدیر کا نادیدہ ہاتھ دوسرا طمانچہ دے مارتا تھا۔ کوئی پوچھے تو ایسے ہیں کہ انہیں خشک سالی مار ڈالتی ہے مگر میں ایسا کھیت تھا جس کی فصل بن کال نے تباہ کر دی تھی۔ ایسے بن کال نے جس میں مجھے بڑی دولت ملی۔ بڑی کشادگی نصیب ہوئی۔ نئے راستے، نئی منزلیں سامنے آئیں۔ مگر وہ سب کی سب چیزیں ایسی تھیں جو مسلسل مجھے ایک مہیب اور اندوہناک انجام کی طرف دھکیل رہی تھیں کاتب تقدیر نے شاید اسی لیے مجھے ان بلا خیز بگولوں کی گود میں ڈال دینے کا اہتمام کیا تھا یوں کہ جو پنہاں تھا وہ میری نظر کے سامنے ظاہر نہیں ہوتا تھا اور جو ظاہر تھا میں اس کی نوعیت سمجھنے سے قاصر ہو چکا تھا۔ شاید میرا شمار اب ان لوگوں میں کیا جا سکتا تھا جو بیگانے بڑے آزاد کہتے ہیں۔ اور دوسروں کے مال پر عیش سے زندگی گزارتے ہیں مگر میں تو عیش کے نام سے بھی واقف نہیں تھا۔ بہت روپیہ پڑا تھا بینک میں میرے نام مگر وہ ایسا تھا جسے میں چھو نہ سکتا تھا کہ میں خود سے ہی خوفزدہ تھا۔ اور اتنی ہمت نہیں رکھتا تھا کہ جا کر اپنے حساب میں سے چار آنے ہی نکلوا سکوں۔ وہ سب کچھ بھی مجھے پرائے کھاتے میں پڑا نظر آتا تھا اور وعدے میں بڑی فراخدلی سے کرتا پھرتا تھا۔ میں نے بمبین کی ماں حاجاں سے بھی یہی کہا تھا کہ میں اس کی بیٹی کی شادی پر کوئی کور کسر باقی نہیں رکھوں گا۔ اب میں گوہر سے بھی وعدہ کر بیٹھا تھا کہ میں اسے دکان کھولنے میں مدد دوں گا۔ مگر میں سوچتا تھا کہ یہ سب کچھ تو شاید میں عالم خواب میں کرتا جا رہا ہوں کیونکہ جس صورت حال سے میں دوچار تھا وہ تو ایسی تھی کہ میں اس کارگہ شیشہ میں سانس بھی دبا لینے پر مجبور تھا۔

آبی کوئی بیس منٹ بعد واپس آیا۔ اس کی دستک کو سمجھتے ہوئے میں نے کنڈی کھولی تو وہ دبی آواز میں بولا۔

"لے بھئی وہ تیری جیلاں تو ڈرتی ہے باہر ہی نہیں نکلتی تھی میں نے بہت کہا مگر وہ نہیں مانی۔ مگر تیرے لیے خوش خبری یہ ہے وہ سپاہی یہاں سے نکل بھاگے ہیں۔"

"کیا مطلب؟ انہیں کس نے بھگا دیا؟"

"ادھر کوئی ٹیکسی کھڑی تھی۔ ادھر ڈنگے پیر کے مزار کے قریب۔ اس میں بیٹھ کر کوئی آدمی یہاں سے فرار ہوا ہے۔۔۔ کسی سپاہی نے وہ ٹیکسی دیکھ لی تھی اس نے تھانیدار کو بتا دیا۔ وہ یہی سمجھے ہیں کہ تو خود ٹیکسی لے کر بھاگا ہے۔ اب وہ اس کے تعاقب میں نکل گئے ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا ہے آبی! مگر تجھے یہ ساری باتیں کس نے بتائی ہیں؟"

"وہ دینو وہیں تھا ان کے پاس۔ وہ جب لحاف پہنچا کر واپس آ رہا تھا تو سپاہیوں نے اسے بلا لیا تھا۔ وہ اس سے گاؤں کے حالات پوچھ رہے تھے۔ ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک سپاہی نے انہیں ٹیکسی کی اطلاع دے دی اور وہ سب منہ اٹھا کر ادھر چل دیئے۔"

"گڈ۔ ویری گڈ۔ اب تو چل میرے ساتھ۔ میں آہو سے آج ہی ملنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں یار، اب تو میرے گھر چل اور اپنی نیند پوری کر۔ میں صبح اپنے یار کے جنازے سے فارغ ہو لوں گا پھر ہم کل شام لاہور چلیں گے۔ چل اٹھ میرے بھائی۔ بہت خراب ہو لیا ہے تو۔ اب ذرا آرام بھی کر لے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور دینو کے گھر کی کنڈی چڑھا کر گلی میں نکل گیا۔

آبی کا گھر بہادر علی کی حویلی کے قریب ہی تھا۔ میں جب اس میں داخل ہوا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس کا گھر ایک عام سے مفلس دیہاتی ایسا تھا جس میں آسائش نام کی کوئی شے نہیں تھی اور آبی اس گھر میں اپنی ماں کے ساتھ تنہا رہتا تھا۔ اس نے شادی بھی نہیں کی تھی اور گھر کی یہ حالت تھی کہ وہاں نہ کوئی آسائش تھی نہ زیبائش صحن خاصا بڑا تھا اور یہاں سے وہاں تک کچا تھا۔ دائیں ہاتھ ایک دستی نلکا تھا جس کے گرد اس نے ایک غسل خانہ پختہ اینٹوں کا بنا رکھا تھا۔ سامنے ایک دالان تھا جس کے بائیں ہاتھ چھوٹا سا رسوئی خانہ تھا۔ دالان خاصا وسیع تھا مجھیں کوئی تیس فٹ لمبا اور بارہ فٹ چوڑا ہو گا۔ اس کے پیچھے دو کوٹھریاں بنی تھیں۔ گھر اندر سے صاف ستھرا اور لپا پُتا تھا۔

"تم یہاں اکیلے رہتے ہو آبی؟"

"ہاں یار۔ ایک میری ماں ہے وہ آج رات ادھر حویلی میں گئی ہوئی ہے۔ آ جا ادھر کوٹھری میں تیرے لیے بستر لگا ہے۔" یہ کہہ کر وہ مجھے دائیں ہاتھ کی کوٹھری میں لے گیا۔ وہاں آمنے سامنے دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ دونوں پر بستر لگے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ایک میز رکھی تھی جس پر اس نے مٹی کے تیل سے جلنے والا لیمپ رکھ دیا۔ میں چارپائی پر بیٹھا تو میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر بولا۔ "یار میرا خیال ہے میرا گھر دیکھ کر تجھے حیرانی ہوئی ہے۔"

"ہاں، حیرانی کی بات ہی ہے آبی۔ یہ مجھے اسلم آبی کا گھر نظر نہیں آتا۔"

"کیوں ایسی کیا بات ہے۔ یہ میرا ہی گھر ہے جیلانی۔"

"تو اتنے لمبے لمبے ہاتھ مارتا ہے آبی اور تیرے گھر کی یہ

حالت ہے کہ ڈھنگ کی کوئی چیز بھی نظر نہیں آتی ہے مجھے؟"

"میں... میں اپنے لیے تو کچھ بھی نہیں کرتا ہوں میرے یار، سب کچھ دوسروں کی نذر کر دیتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب تو اس ڈھائی لاکھ کی ہی بات سن لے۔ ایک لاکھ میں نے تجھے دے دیا تھا۔ پچاس ہزار میں نے ادھر آہو کو دے دیا۔ باقی بچا ایک لاکھ تو وہ میں نے ادھر آ کر خرچ کر دیئے۔"

"کہاں خرچ کر دیئے؟"

"مت پوچھ یار۔ ادھر میں نے پچیس ہزار تو ایک بڑھیا کو دے دیئے۔ اس کی دو بیٹیاں دروازے پر بیٹھی تھیں۔ وہ اس نے چار دن پہلے بیاہ دی ہیں۔ بیوہ عورت تھی بیچاری۔ میرا جی خوش ہو گیا۔ پچیس ہزار روپے میں نے ایک اور بیوہ عورت کو دے دیئے تھے۔ وہ ادھر ماڈل ٹاؤن میں رہتی ہے بیچاری، بڑی دعائیں دیتی ہے مجھے۔ پچاس ہزار روپے میں نے زمین کے ایک ٹکڑے پر خرچ کر دیئے۔ اس پر ایک اسکول بن جائے گا ادھر۔ بچے پڑھا کریں گے تو مجھے خوشی ہو گی ادھر کوئی ہائی سکول ہی نہیں ہے۔ بس چوتھی جماعت پڑھ کر بچے گھر بیٹھ جاتے ہیں۔ اپنے لیے تو میں نے کچھ بھی نہیں رکھا۔"

"مگر تیرا گزارہ کس طرح ہوتا ہے آبی؟"

"میں نے بہت دن ہوئے یہاں زمین خرید لی تھی۔ آدھا مربع۔ بس اسی پر گزارہ کرتا ہوں۔ مزارع کو دے رکھی ہے میں نے وہ زمین۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اگر اسی طرح اڑا دیتے ہو اپنا مال جو نیزے کی نوک پر چڑھ کر کماتے ہو تو پھر فائدہ ہی کیا تیری اس مار دھاڑ کا۔ کیوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہو۔"

"بس یار، مجھ سے کسی مفلس کی بے بسی نہیں دیکھی جاتی۔ میں... بس میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

"اور... اور... لوگ نہیں پوچھتے تجھ سے کہ تو یہ مال کہاں سے لاتا ہے؟"

"میں نے انہیں کہہ رکھا ہے کہ ادھر بہاول پور میں میری سو مربع زمین ہے۔"

"اور اگر کسی دن تو پکڑا گیا تو؟ لوگ تجھے شاباش تو نہیں دیں گے۔"

"وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔ جس دن میں کسی نرغے میں پھنس گیا، کسی گھیرے میں آ گیا۔ اس دن میں... میں وہ گولی نگل لوں گا۔ اپنا انتظام میں ہر وقت اپنی جیب میں رکھتا ہوں۔"

"نہیں آبی۔ یہ بات مجھے پسند نہیں آئی۔ تو نے مجھے ایک لاکھ روپیہ کیوں دیا تھا جب مجھے تو اس کی ضرورت ہی نہیں تھی؟"

"بس میں تجھ سے وعدہ کر بیٹھا تھا۔ اور پھر میرا خیال تھا کہ تو اُن دنوں بہت زیادہ ضرورت مند تھا۔ بس ایک اندازہ لگایا تھا میں نے تیرے چہرے سے اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ ہسپتال کے بستر پر جب تو نے مجھے دبوچا تھا تو میں تجھ سے بہت خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اسی لیے میں نے تجھ سے وہ وعدہ کر لیا تھا اور میں اپنے وعدے پر تو اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

"تو ہو سکتا ہے اپنی جگہ ٹھیک کہہ رہا ہو مگر اس آہو کو تو کیوں اتنے پیسے تھما آیا تھا؟"

"یار وہ ایسا آدمی ہے کہ اگر میں کبھی تھانے کچہری کے چکر میں پھنستا ہوں تو وہ مجھے صاف بچا لیتا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ بڑے کمال کا آدمی ہے وہ۔ تین بار وہ میری مدد کر چکا ہے۔ بڑے صاحب تک رسائی ہے اس کی۔ تو تو خود دیکھ چکا ہے مگر اتنے پیسے میں بس اسے سال میں ایک آدھ بار ہی دیتا ہوں۔ اور وہ خوش ہو جاتا ہے۔ کئی بار خود اس نے مجھے اسامیاں بتائی ہیں اور اس کا انتظام بہت اچھا ثابت ہوتا ہے۔"

"تو بس خواہ مخواہ ہی جگا ڈاکو بننے کی کوشش کر رہا ہے وہ جو پلستر تو نے لگا رکھا تھا اس سے تو چلتا پھرتا کیسے تھا؟"

"وہ تو محض دھوکا تھا میرے یار، ہلکی پٹی کا پلستر تھا وہ۔ کوئی وزن تو نہیں تھا اس کا۔"

"اچھا! یہ بتا کہ اس خورشید احمد کے گھر سے تو کس کے اسکوٹر پر بیٹھ کر باہر بھاگا تھا؟"

"یہ میں تجھے نہیں بتاؤں گا جیلانی۔ بس اس بات کو ڈھکی ہی رہنے دے۔"

"مجھے بتانے میں حرج ہی کیا ہے آخر؟"

"مجھے اپنی اس حرکت پر آج تک بے حد افسوس ہے جیلانی وہ آدمی جسے تم زخمی حالت میں ہسپتال لائے تھے، وہی تھا جس کے اسکوٹر پر بیٹھ کر میں اس رات وہاں سے بھاگا تھا۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جب میں وہاں سے نکلا تو وہ ادھر سے گزر رہا تھا میں نے اسے زبردستی روک لیا تھا اور اسے پستول کی زد میں لے کر وہاں سے بھاگا تھا مگر سڑک پر آتے ہی اس نے مجھے خراب کرنا شروع کر دیا۔ میں نے چاہا کہ اسے گولی مار دوں مگر میرا پستول جام ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ درے کا بنا ہوا دیسی پستول تھا عین وقت پر میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ اس آدمی نے جب یہ دیکھا کہ میرا ہتھیار بے کار ہو گیا ہے تو اس نے مجھے دوبارہ نیچے گرانے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہیں ہوا۔ اسکوٹر دائیں بائیں ڈول رہی تھی۔ اسی وقت سامنے سے ایک ٹرک آیا۔ وہ آدمی میری وجہ سے

ہینڈل سنبھال نہ سکا اور اس کی اسکوٹر ٹرک سے ٹکرا گئی۔ میں اچھل کر دور جا گرا۔ جب میں اٹھا تو دیکھا کہ ٹرک جا چکا تھا، اور وہ آدمی زخمی حالت میں پڑا تھا۔ اس کی اسکوٹر بھی چور چور ہو چکی تھی۔ مجھے اس کی حالت پر بڑا ترس آیا مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ مجھے تو اپنی منزل پر پہنچنا تھا۔ میں اسے اسی شدید زخمی حالت میں چھوڑ کر ہسپتال جا پہنچا اور اپنے بستر میں جا دبکا۔ اسے تم میرے ہی وارڈ میں چھوڑ کر گئے مگر وہ جانبر نہ ہو سکا۔ ساتویں دن مر گیا تھا۔ مجھے اس کی موت کا آج تک بے حد افسوس ہے۔ پچیس ہزار میں نے اسی کی بیوہ کو دیئے تھے۔ مجھے پتہ ہی بعد میں چلا ورنہ شاید میں اسے ایک لاکھ روپے دے آتا مگر اس وقت تک میں رقم بانٹ چکا تھا۔"

"اس کے گھر کا پتہ تو میں وہاں لکھوا آیا تھا۔"

"ہاں اسی سے تو مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس کا گھر کہاں ہے۔ دو بچے ہیں اس کے۔ اور بیوی اس کی ابھی نو عمر ہے۔ یہی کوئی پچیس سال کی ہو گی وہ۔ بڑا ترس آتا ہے مجھے اس پر۔ موقع ملا تو میں اسے کسی دن بہت بڑی رقم پہنچا دوں گا۔"

آبی اس سلیم احمد کے ذکر پر بہت اداس ہو گیا تھا، یوں جیسے وہ آدمی اسی کے ہاتھوں قتل ہوا ہو۔ اتنا نازک دل تھا اس عادی مجرم کا۔ اور حالت اس کی یہ تھی کہ وہ اس رات خورشید کے گھر سے نکلتے نکلتے مجھے بھی موت کے گھاٹ اتار دینے سے دریغ نہیں کر رہا تھا۔ وہ تو ابھی میری زندگی باقی تھی ورنہ اس کی گولیاں تو سیدھی میری طرف اڑی آتی تھیں۔

"تیری بات میری سمجھ میں نہیں آئی ہے آبی۔ تو شاید بہت بڑا آدمی ہے۔ بہت سے بڑے لوگوں سے بھی بڑا۔"

"نہیں یار! اول درجے کا اوت آدمی ہوں میں۔ لو اب یوں کر کہ لحاف کھول کر سو جا اور دماغ پر زیادہ بوجھ نہ ڈال۔ کل شام تک ہم لاہور ضرور چلیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے بتی مدھم کی اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔ میں نے اٹھ کر اندر سے کنڈی چڑھا لی اور بستر میں لیٹ گیا۔

اس گریز پا رات کے دو ہاتھ باقی بچے دامن کو غنیمت سمجھ کر میں نے لحاف اوڑھا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے نیند آ گئی۔

آنکھ میری جب ہی کھلی جب کسی نے زور زور سے دروازے پر دستک دی۔ باہر آبی کھڑا تھا۔

"بادشاہو اٹھ جاؤ اب! دیکھو تو سورج کہاں آ پہنچا ہے۔"

میں نے اٹھ کر کنڈی کھولی تو آبی کمبل میں لپٹا لپٹایا اندر آ گیا۔ آنکھیں اس کی سوجی ہوئی تھیں لگتا تھا وہ بہت دیر تک روتا رہا ہے۔

"یار دس بج گئے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں جگا دیا۔"

"میں تو ابھی واپس آیا ہوں قبرستان سے۔ میری ماں بھی آ گئی ہے۔ اسے اپنا اسلحہ شسلحہ بالکل نہ دکھانا۔ اسے بالکل پتہ نہیں ہے میں کیا ہوں۔"

"فکر نہ کر۔ یہ سب کچھ ادھر ہی رہے گا بستر کے نیچے۔" میں نے کوٹ پہن کر کمبل اوڑھ لیا۔

منہ ہاتھ دھونے کے لیے میں باہر نکلا تو آبی میرے ساتھ تھا۔ اس کی ماں سامنے تخت پر کھڑی تھی۔

"ماں یہ ہے میرا دوست جیلانی۔ جس کا میں ذکر کر رہا تھا۔"

"سلام ماں جی۔" میں نے نہایت ادب سے اسے سلام کیا۔

"جیتے رہو بیٹے۔ آؤ ادھر منہ ہاتھ دھو لو۔ پھر کھانا کھا لینا۔" یہ کہہ کر وہ رسوئی خانے میں جا بیٹھی۔

ابھی ہم کھانے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ آبی کے دروازے پر بڑی زوردار دستک ہوئی۔ میں اس وقت کوٹھری میں بیٹھا تھا۔ آبی ایک جھٹکے سے اٹھا اور سلیپر پاؤں میں پھنسا کر بولا۔

"یہ کون رانی خاں کا سالا آ گیا ہے اس وقت۔ دیکھو تو، دروازہ کس طرح ٹھوک رہا ہے لگتا ہے بیاج وصول کرنے آیا ہے کوئی۔" یہ کہتا ہوا وہ تیزی سے باہر نکلا۔ کوئی دس منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو سخت بوکھلایا ہوا تھا۔ آتے ہی اس نے سلیپر پرے پھینکے اور چارپائی کے نیچے سے اپنے بوٹ نکال کر پہننے لگا۔ اس کا چہرہ غصے سے پھنکنے لگا تھا۔ کونے میں ایک بھاری بھرکم صندوق تھا جس پر بڑا سا تالا لگا تھا۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر وہ تالا کھولا اور پھر اس میں سے اس نے پستول نکال کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اس پر عجیب سی جنونی کیفیت طاری تھی۔ میرے سامنے ہی اس نے ایک ڈبے میں سے مٹھی بھر کر پستول کی گولیاں نکال کر جیب میں ڈال لیں۔ پھر اس نے لنگی پر شلوار اتار کر پہنی اور کوٹ کے اوپر کمبل اوڑھ کر بولا۔

"یار تو ادھر ہی بیٹھ جیلانی، میں ادھر ایک بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ شام تک اگر میں واپس نہ آیا تو میرا ادھر انتظار کرنا۔" لہجہ اس کا بے حد غضبناک ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بڑی مشکل سے اپنے غصے کو ضبط کر رہا ہے۔

"تو جا کہاں رہا ہے آبی! مجھے بھی تو پتہ چلے۔"

"یار ادھر تو ہمارا بیڑہ ہی غرق ہو گیا۔ ہم تو تباہ ہو گئے۔"

"آخر ہوا کیا ہے کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے؟"

"ٹھہر، میں ابھی آیا ایک تو اس ماں نے مجھے بزدل بنا رکھا ہے

یہ کہہ کر وہ باہر نکلا اور صحن میں اِدھر اُدھر جھانک کر فوراً ہی واپس آیا۔ بولا

"اچھا ہوا وہ باہر نکل گئی ہے۔ ادھر بہادر علی کے گھر گئی ہو گی۔ تو بس میرا انتظار کر ادھر بیٹھ کر۔ میں شام تک ضرور آجاؤں گا۔"

"پر تو چلا کہاں ہے؟ کسی نے کھلیان جلا دیئے ہیں تیرے؟"

"نہیں یہ بات نہیں ہے میرے یاروں کو کسی نے زخمی کر دیا ہے۔ اگر بہادر علی کل نہ مرتا تو رات ان کا یہ حشر نہ ہوتا۔"

"آخر ہوا کیا ہے کس نے مارا ہے ان کو۔ کتنے آدمی تھے وہ؟"

"یار دیکھ رات ہم نے ادھر ڈنگری میں ڈاکہ ڈالنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ میں اُدھر نہ جا سکا۔ وہ لوگ ادھر کریم بخش کے بھٹے پر جمع تھے۔ وہ خود ہی اُدھر چلے گئے اکیلے ہی۔ مگر ابھی دنجلی خان نے مجھے بتایا ہے کہ ان تینوں کو کسی نے مار مار کر بے ہوش کر دیا اور پھر ان کو لا کر واپس بھٹے کے قریب پھینک دیا۔ انہیں رات کو تین بجے دنجلی خان کے پاس پہنچایا تھا۔ وہ پہنچے تو ضرور مگر مُردوں سے بدتر حالت میں۔ تابیے کی پنڈلی پر گولی لگی ہے اور گوسگے کے بازو پر۔ کسی نے ان کو زخمی کرنے کے بعد مرہم پٹی بھی کر دی اور پھر گاڑی میں ڈال کر ان کو واپس بھٹے پر بھی چھوڑ گیا۔ اس کی بات سن کر میں اپنی مسکراہٹ چھپا نہ سکا۔ بس وہ اسی بات پر گرمی کھا گیا۔ بہت زیادہ تپ کر بولا۔

"یار تو اچھا ہمدرد ہے ہمارا۔ اُدھر کسی نے ہمارا بھٹہ بٹھا دیا ہے اور تو ہنس رہا ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے آبی! میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ ایسا کبھی ہوا نہیں ہے۔ وہ دنجلی خان جھوٹ نہ بول رہا ہو۔ تمہیں فوراً وہاں بُلانے کے لیے کوئی چکر نہ چلا رہا ہو۔"

"نہیں بھئی۔ وہ غلط بات نہیں کہہ سکتا ہے۔"

"کیا نام ہے تیرے یاروں کا؟ کون کون شامل ہے تیرے جتھے میں؟"

"اُدھر ایک تو تابیا ہے ایک گوسگا ہے اور ایک قطب دین۔"

"کوئی اور بھی ہے تمہارے ساتھ؟"

"ہاں، ایک گوہر ہے ڈنگری کا۔"

"وہ بھی ساتھ تھا؟"

"نہیں، اسی نے تو بیڑا غرق کیا ہے ہمارا۔ مگر دنجلی خان بتاتا ہے کہ اُدھر ایک آدمی آیا تھا اونچا لمبا جوان وہ گوہر کو ساتھ لے گیا تھا۔"

"وہ تابیے کے ساتھ کیوں نہیں گیا؟"

"یار تو ادھر بیٹھا جرح کرتا رہے گا۔ میرا میٹر الٹا چلنے لگے گا پھر مجھے افسوس ہو گا کہیں میں تیری شان میں کوئی گستاخی نہ کر دوں۔ مجھے جانے دے۔ تیری دوستی مجھے بہت عزیز ہے۔" وہ بہت سنجیدہ نظر آتا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ ایک دم بھڑک اٹھے گا۔ اس کی یہ بات سنتے ہی میں کمبل اوڑھتا ہوا چارپائی سے اُٹھ گیا۔ اور اسٹین گن میں نے بستر کے نیچے سے اٹھا کر کندھے پر ڈال لی۔

"ٹھیک ہے آبی تیرا میرا تعلق اگر ایسا ہی کچا ہے کہ تیرا میٹر الٹا چلنے لگے گا تو پھر میں چلتا ہوں میرے بھائی سلام علیکم۔"

وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے سامنے بیٹھ کر بوٹوں کے تسمے بند کر لیے۔

"کیا کرتے ہو یار۔ مجھے خواہ مخواہ ذلیل نہ کرو جیلانی بھائی۔ میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔ میں اس وقت پاگل ہو رہا ہوں تمہیں نہیں پتہ اِدھر کیا گڑبڑ ہوئی ہے کس نے ہمیں برباد کیا ہے میں اس آدمی کی گردن توڑ دوں گا جس نے گوہر کو وہاں سے نکالا ہے اور پھر میرے یاروں کو اس نے ڈنگری گاؤں جا کر زخمی کیا۔ دنجلی خان نے مجھے جو باتیں بتائی ہیں وہ ایسی ہیں کہ ہمیں تو ڈوب مرنا چاہیے۔"

"آخر کیا کیا ہے اس نے؟ مجھے تو تم کچھ بتاتے نہیں ہو۔"

"یار وہ اُدھر ایک آدمی ہے حبیب شاہ، اس کے گھر گئے تھے۔ لیکن اس وقت جب وہ حبیب شاہ کو پکڑ کر اس سے سیف کی چابی مانگ رہے تھے کسی نے ان پر گولی چلا دی۔ وہ زخمی ہو کر گرے تو اس آدمی نے ان کی گردن دبا کر انہیں بے ہوش کر دیا۔ ہاں پتہ نہیں وہ بدمعاش کون سا علم جانتا ہے کسی پرجن کا تخم معلوم ہوتا ہے وہ، اس نے ان کی گردن کی کوئی رگ دبا دی اور بس۔ وہ دونوں غوطے میں چلے گئے۔ اُدھر گلی میں قطب دین پہرے پر تھا۔ انھوں نے اس کا بھی یہی حشر کیا۔ اس قطبے نے دنجلی کو بتایا ہے کہ ادھر دو آدمی تھے، ایک گوہر تھا مگر گردن اسکی دوسرے نے دبائی تھی۔"

"اچھا پھر کیا ہوا، وہ بھٹے پر کیسے پہنچے؟"

"بھائی پھر تو انھیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا، ان تینوں کو۔ ان کی تو ماں ہی مر گئی۔ بعد میں وہ کتے کا پُتر ان کو کار میں ڈال کر بھٹے پر چھوڑ گیا۔ یہ کام اس نے گوہر کے مشورے پر ہی کیا ہو گا۔ اب میں پہلے اس گوہر سے ملوں گا۔ اس کو تو میں کچا ہی چبا جاؤں گا۔"

"یار وہ تو تمہارا ساتھی ہے۔ اسے کیا ضرورت تھی کسی اور آدمی کا ساتھ دینے کی۔"

"یہی تو پتہ نہیں چلتا۔ ویسے اس تابیے نے بتایا ہے کہ وہ حبیب شاہ کے گھر ڈاکہ ڈالنے کے خلاف تھا۔ اس بات پر

تابیے نے اس کے سر میں بندوق کا دستہ مار کر اسے بے ہوش بھی کر دیا تھا۔ اگر میں وہاں ہوتا تو اسے شاید گولی ہی مار دیتا۔"

"اچھا ٹھیک ہے تو جا میں تیرا یہاں انتظار کروں گا، لیکن ایک وعدہ کر۔"

"کیا؟"

"اس گوہر کو ابھی تو کچھ نہیں کہے گا۔"

"کیوں کچھ نہ کہوں۔ اس سے تو میں ضرور پوچھوں گا کہ وہ مداری کا بچہ کون تھا جو رگ دبا کر آدمی کو لمبا لٹا دیتا ہے۔"

"اگر وہ آدمی تجھے مل جائے تو تو کیا کرے گا؟ اس نے تو حبیب شاہ کو لٹنے سے بچایا ہے اور پھر تیرے آدمی صحیح سلامت اڈے پر واپس پہنچا دیئے ہیں۔ یہ تو اس کی مردانگی کی دلیل ہے کہ نہیں؟"

"میں مانتا ہوں، وہ بہادر دشمن ہے یار۔ پر اس طرح تو ہم ادھر 'چھنکنا' بن کر رہ جائیں گے جو چاہیگا وہ ہم سے کرائے گا۔"

"نہیں میرا خیال ہے اسے تمہارے کام میں کھنڈت ڈالنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ ہو سکتا ہے وہ گوہر کا کوئی خفیہ پتہ ہو۔"

"یہی تو میں ڈرتا ہوں کہ اس گوہر نے سائی ہم سے لگا رکھی ہے مگر۔۔ بدھائی کہیں اور دیتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا بولا۔ "میری بات کا بُرا نہ ماننا میرے بھائی تیرا تو میں ویسے ہی ہاتھ بندھا غلام ہوں۔ بس میں شام تک آجاؤں گا۔" یہ کہہ کر میرے روکنے کے باوجود وہ باہر نکل گیا۔

میرے کلیجے سے ہُوک سی اُٹھنے لگی۔ صورت حال میرے لیے بڑی ہی تکلیف دہ ہو گئی تھی۔ مجھے گوہر پر ترس آرہا تھا۔ اگر آج وہ اُن کے ہاتھ آگیا تو مجھے یقین تھا کہ وہ اس کی بوٹیاں کاٹ کر رکھ دیں گے۔ اپنی تمام تر ناکامی کا انتقام وہ اس سے لیں گے اس آدمی سے جو ابھی تک پوری طرح اُن کے رنگ میں نہیں رنگا تھا جس میں ابھی تک آدمیت کی بُوباس باقی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اُسے کتنی زبردست اذیتوں سے گزار دیں گے، حالانکہ جو کچھ بھی ہوا تھا وہ میں نے خود کیا تھا۔ اس نے تو صرف اپنے ایک دکھ کی نشاندہی کی تھی۔ ایک گرتی ہوئی دیوار کا پتہ بتایا تھا۔ اس گرتی ہوئی دیوار کا جس کے انہدام کو وہ کسی طرح بھی پسند نہیں کرتا تھا اور اب وہ آبی اپنے تیر و تفنگ سے لیس ہو کر اس کے تعاقب میں نکل گیا تھا۔

اگر وہ عقل مند آدمی ہوا وہ گوہر تو اسے اگلے کئی دنوں تک اپنے گھر میں نہیں رہنا چاہیے، اسے ان لوگوں کے سائے سے بھی بچنا چاہیے تھا۔ یہی میں چاہتا تھا، یہی اس کے لیے بہتر تھا۔ اور اگر وہ اتنی سی بات بھی سمجھ نہیں پایا تھا تو یہ اس کی بڑی بدنصیبی تھی۔

میرا جی چاہا کہ میں ڈنگری جا کر گوہر کو خبردار کر دوں مگر پھر سارے حالات کو مدِ نظر رکھ کر میں کوٹھری میں بند ہو کر بیٹھا رہا۔ آبی کی ماں نے دو بجے کے قریب مجھے کھانا دیا اور پھر میں لمبی تان کر سو گیا۔ اب مجھے آبی کا انتظار تھا۔ اب جو کچھ بھی ہو سکتا تھا وہ اس کی آمد پر ہی ممکن تھا۔

آبی رات کو نو بجے واپس آیا۔ اس حال میں کہ اس کا بند بند ٹوٹا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ بہت ہی مضمحل دکھائی دیتا تھا۔ اس نے کوٹھری میں واپس آکر بڑی بے دلی سے سلام کیا اور پھر بوٹ اتار کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس طرح کہ کمبل اس نے اپنے چاروں طرف تمبو کی طرح تان لیا تھا۔

"وہ گوہر ملا کہ نہیں۔"

"نہیں! وہ گھر سے غائب ہے۔"

میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

"تمہارے یار کیا کہتے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ بالکل بیکار ہیں وہ سالے۔ اُدھر بھٹے پر بیٹھے اپنی گردنیں سینک رہے ہیں۔" وہ بہت بجھا ہوا تھا اور لہجہ اس کا اتنا زہریلا تھا کہ مجھے حیرت ہوتی تھی۔

"یار اس میں اتنا کڑھنے کی کیا بات ہے دفع کر اس قصے کو۔ مٹی ڈال اس پر۔"

"وہ تو میں ڈال ہی آیا ہوں، پر یار اس نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ اس کی شرافت کی بھی داد دیتا ہوں۔ اس نے انہیں جان سے نہیں مارا۔ حالانکہ یہ بہت آسان بات تھی۔ اس لیے کہ وہ سالے پرائے گھر میں تھے۔ ڈاکہ ڈالنے گئے تھے۔ ان کو وہیں قتل کر دینا اس کے بس میں تھا۔ کسی پر بھی کوئی بات نہ آسکتی تھی مگر نہیں یار اس کی جواں مردی دیکھ۔ اس نے تابیے کی پنڈلی پر اور گوسگے کی کلائی پر ہی گولی ماری۔ تاکہ وہ مریں بھی نہیں اور سالے اَدھڑ بھی ہو جائیں۔"

میں ہنس دیا۔ اس نے منہ ہی ایسا بنا رکھا تھا۔ وہ بھی مسکرا دیا اور سگریٹ سلگا کر گہرے کش لگانے لگا۔

"تیری باتیں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں آبی۔ تو دل کا بہت صاف آدمی ہے۔ اب کیا ارادے ہیں تیرے؟"

"بس صبح اٹھ کر چل دیں گے یار اُدھر کو۔ آج تو میں بہت تھک گیا ہوں۔"

"اس پولیس کا کیا ہوا جو میرے پیچھے لگی تھی۔"

"وہ بھی سارے واپس چلے گئے۔ انھیں وہ ٹیکسی والا ہاتھ ہی نہیں آیا۔"

"چلو اچھا ہوا، جان بچی سو لاکھوں پائے۔ اب تو یہ بتا کہ صبح یہاں سے جائیں گے کیسے؟"

"ادھر ایک ٹرک والا رہتا ہے میں اسے کہہ آیا ہوں وہ صبح پانچ بجے ہمیں ادھر سے اُٹھائے گا۔"

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ میرے ساتھ والی چارپائی پر لیٹ گیا۔ میں اُس سے پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ پینو اور اُس جلنتے کا اس سے کیا تعلق ہے مگر مصلحتاً چُپ ہو رہا۔ کیونکہ میں اپنی کسی بھی بات سے اسے یہ احساس نہیں دلانا چاہتا تھا کہ اُس کے ساتھیوں پر جو گزری ہے اس میں کس کا ہاتھ کارفرما رہا ہے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو شاید میرے اور اس کے درمیان ہمیشہ کے لیے ٹھن جاتی اور یہی میں نہیں چاہتا تھا۔ اس جیسے قول کے دھنی اور مخلص آدمی کو میں ہاتھ سے کھو دینا نہیں چاہتا تھا۔

صبح ٹھیک پانچ بجے ہم دونوں تیار ہو کر ٹرک میں جا بیٹھے وہ ٹرک بجری لینے کے لیے سیدھا شہر جا رہا تھا۔ ایک بار پھر میرے ذہن میں دلشیر آہو کا مکان اُبھر رہا تھا۔ آہو سے میرے تعلق کی نوعیت کچھ عجیب و غریب ہو گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس سے کس رُخ سے ملوں۔ اسے پستول کی زد میں لوں یا اس کے قدموں پر سر رکھ دوں۔ عجیب بات یہ بھی کہ آبی کی کوٹھری میں رات میں نے ایک بار پھر مسند آراء کو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ بہت مضمحل اور آزردہ نظر آتی تھی اور ایسی نظروں سے گرد و پیش کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ کسی چیز کو خلاؤں میں تلاش کر رہی ہو۔ اس کی وہ بڑی بڑی آئینہ سی حساس عکاس آنکھیں اشکوں سے لبریز نظر آتی تھیں۔ وہ بس پل بھر کے لیے میرے تصور میں ابھری اور پھر پلک جھپکتے میں غائب ہو گئی۔

اس لڑکی نے اُس رات بھی مجھے عجیب سے ذہنی ہیجان میں مبتلا کیا تھا۔ وہ بارہا میرے خوابوں میں آئی تھی مگر جب تک میں نے اسے روبرو نہیں دیکھا تھا میں نے اس سے کوئی تاثر نہیں لیا تھا۔ میں اُس کے پیکر کو آتشیں جذبوں کا مرہونِ منت سمجھتا رہا۔ ہر بار یہی ہوتا رہا۔ اس نادیدہ کی دید مزہ دیتی تھی مگر اپنے تخیل کے تراشیدہ بُت کو جب سے میں نے مرئی طور پر اپنے سامنے دیکھا تھا میں اس کے بارے میں خاص نکتہ نظر سے سوچنے لگا تھا۔ مگر میرے دکھ اتنے بے پناہ تھے اور ذلتیں اتنی لامتناہی تھیں کہ میں اُسے کسی خوبصورت طاق میں سجا لینے کی آرزو کو عبث سمجھتا تھا۔ مگر اب جس تاریک دائرے میں وہ گھِر چکی تھی اور جس طرح میں نے آہو کو اس کے گھر کی بربادی کے درپے دیکھا تھا۔ اس کے سبب میں چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح مسند آراء کو ان نحوستوں سے بچا لوں جو اس کے تعاقب میں تھیں۔ اور جن بلاؤں کی زنجیریں اس کے پیچھے آہو نے کھول دی تھیں اُن سے اسے محفوظ کر لوں مگر کوئی واضح لائحہ عمل ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ پھر بھی میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکا میں لاہور جا کر اس سے ضرور ملوں گا مگر یہ تو جب ہی ممکن ہو گا جب وہ اپنے کالج میں موجود ہو۔ اگر وہ باپ کی موت کے بعد سے ابھی تک ادھر اکبر کوٹ ہی میں بیٹھی ہے تو پھر اس سے ملاقات کا سرے سے تو سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔

زندگی کانٹوں پر گھسٹ کر رہ گئی تھی اور میرے روم روم سے لہو رستا نظر آتا تھا۔ میں ساری راہ اپنے ہی آئینہ خانے پر پتھر برساتا رہا۔ اپنے آپ سے دست و گریباں رہا اور آبی دل ہی دل میں اس شخص کو کوستا رہا جس نے ان کے حبیب شاہ کو لوٹ لینے کے منصوبے پر پانی پھیر دیا تھا۔

جب ہم راوی روڈ پر پہنچ کر ٹرک سے اُترے تو اُس وقت تک سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ ہم صبح کے ملگجے اُجالے میں چلتے ہوئے آہو کے مکان کی طرف بڑھے۔

"تم نے سوچا بھی ہے آبی کہ وہ تمہارا آہو تو مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتا ہے۔"

"پہلے میں خود اس سے ملنے جاؤں گا۔ اگر اُس نے کوئی گڑبڑ کی اور راہِ راست پر نہ آیا تو پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔"

"کیا یہ بہتر نہیں کہ تم اُسے کہیں باہر بلا کر ملو۔ میرا مطلب ہے تم فون کرو کہ وہ تمہیں کسی جگہ فوراً مل لے۔"

"نہیں! اس کا نوکر مجھے اندر بیٹھک میں بٹھائے گا تو میں موقع ملتے ہی پچھلے دروازے سے تمہیں اندر لے جاؤں گا۔ تم کہیں بیٹھک میں چھپ کر بیٹھ جانا۔ پھر دیکھ لیں گے ہم کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ باہر اس سے ملنا ٹھیک نہیں ہے۔" آبی نے میری تجویز رد کر دی۔

"چلو یوں ہی سہی۔ میں اس کے مکان کے عقب میں جا کھڑا ہوتا ہوں۔"

آبی تو تیز تیز قدم چلتا آہو کے مکان کے بڑے دروازے پر جا پہنچا اور میں اس چھوٹے سے عقبی دروازے پر جا کھڑا۔ جس سے وہ گزار کر کبری مجیدن کو میرے پاس لایا تھا۔ آبی کی تجویز کارگر ثابت ہوئی۔ مجھے وہاں کھڑے ہوئے ابھی پندرہ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ وہ چھوٹا عقبی دروازہ بے آواز کھلا

سامنے آبی کھڑا تھا۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا، اور خود تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہ بیٹھک میں جا گھسا۔ کمبل میں منہ چھپا کر میں بھی دالان عبور کر کے اندر جا گھسا۔

آبی نے پلنگ کے نیچے لیٹ جانے کا اشارہ کیا۔ بولا۔

"ادھر نیچے لیٹ جا، تاکہ تو ساری باتیں اپنے کانوں سے سُن سکے جب مجھے تیری ضرورت ہو گی میں ہلکی سیٹی بجاؤں گا، فوراً باہر نکل آنا۔" اس کی تجویز بے حد معقول تھی۔ پلنگ کے نیچے بھی قالین بچھا تھا۔ میں دم سادھ کر اس کے نیچے لیٹ گیا۔ اپنا سائلنسر لگا پستول میں نے سیدھے ہاتھ کی زد میں رکھا۔ تاکہ اگر کوئی گڑبڑ ہو تو میں اسے اطمینان سے استعمال کر سکوں۔

آہو نے کوئی آدھے گھنٹے تک ہمیں سُولی پر لٹکائے رکھا۔ اس عرصے میں اس کے نوکر نے آبی کو چائے وغیرہ پلا دی۔ مجھے تو چائے کی ایسی کوئی طلب نہ تھی اس پر میں صبر کر سکتا تھا مگر سگریٹ کی اشتہا نے مجھے نڈھال کر دیا۔ پھر بھی میں ضبط کیے لیٹا رہا۔ بالآخر آہو آ ہی گیا۔

آبی سے علیک سلیک کے بعد جب وہ جم کر پلنگ پر بیٹھ چکا تو بولا۔ "اس وقت کیسے آنا ہوا آبی جی؟"

"یہ کبری کہاں ہے آج کل؟" آبی نے پوچھا۔

"وہ ایک ماہ کی چھٹی پر گاؤں گیا ہوا ہے۔ آپ خیر سے تو آئے ہیں نا؟" آہو نے بے صبر ہو کر پوچھا۔

"خیر ہے میرے بادشاہ۔ میں دراصل اس غلام جیلانی کے سلسلے میں یہاں آیا تھا۔"

"غلام جیلانی! وہی جسے تم نے ایک لاکھ روپیہ سوچے سمجھے بغیر دے دیا تھا؟"

"جی ہاں اس کے بارے میں میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا ہوا ہے اسے۔ تم سے ملا تھا وہ؟"

"جی ہاں وہ مجھ سے ملا تھا اور اس نے مجھے آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چیزیں بھی دکھائی تھیں۔"

"کیا چیزیں تھیں وہ؟"

"یہ تو آپ کو بھی معلوم ہو گا آہو صاحب۔ یہ سچ ہے کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے مگر آپ کی وہ دل و جان سے عزت کرتا ہے آپ نے اس سے ملنے سے کیوں انکار کر دیا؟"

"میرا اس سے کیا واسطہ ہے۔ تمہاری وجہ سے میں نے ایک بار اسے یہاں ٹھہرایا تھا۔ دوسری بار تو تم نے اسے نہیں بھیجا تھا اگر دوسری دفعہ بھی وہ تمہارے کہنے پر آیا تھا اور میں نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا تھا تو پھر تو یہ میری غلطی تھی میں اس کی معافی چاہتا ہوں تم سے۔"

"یہ بات نہیں ہے جی! آپ کے کہنے پر اس نے چوہدری ہادی علی کو قتل کر دیا۔ اب وہ چاہتا ہے کہ آپ اس کی بہن کی رہائی میں اس کی مدد کریں۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔ اس نے یہ بکواس کی ہے۔ چہ خوب! دیکھ آبی میاں وہ جھوٹ بولتا ہے۔ میں بھلا کسی آدمی کے قتل کے لیے کیسے کہہ سکتا تھا۔ کسی سے مجھے دشمنی ہوتی تو نہیں کہتا۔ کئی اور میرے تم ایسے محسن ہیں میں انھیں کہتا۔ وہ جھوٹ بکتا ہے۔ پتہ نہیں کس کو کس کے ایما پر قتل کر آیا ہے اور نام میرا لے رہا ہے۔"

"اس کے پاس آپ کی تحریر موجود ہے وہ اپنا اسی ہزار روپیہ آپ کے پاس چھوڑ گیا ہے۔ اس کی رسید آپ نے لکھ کر دی ہے۔ آپ نے لکھ کر وعدہ کیا ہے کہ اگر آپ اس کام کے عوض جو وہ کر کے آیا ہے اس کی مدد نہیں کریں گے تو آپ کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ وہ کام کوئی یونہی سا تو نہیں ہو گا۔"

"تو پھر اسے کہو کہ وہ میری تحریر عدالت میں لے جائے۔ مجھ پر مقدمہ دائر کر دے۔ ایسے جھوٹ تو خدا جانے کتنے لوگ تراش لیتے ہیں۔ تم بھی اتنے سمجھ دار آدمی ہو کر اس کی باتوں میں آ گئے۔"

"آہو صاحب آپ جانتے ہیں کہ وہ عدالت میں نہیں جا سکتا کیونکہ وہ مفرور ہے۔"

"تو پھر میرا اس سے کیا واسطہ، جہنم میں جائے وہ۔"

"بات یوں ختم نہیں ہو گی جناب! آپ نے اس کو کبری کے ذریعے زہر دلوایا وہ بچ گیا پھر آپ نے ادھر ریلوے لائن کے قریب اندھیرے میں اس پر کبری کے ذریعے گولی چلوائی مگر وہ بچ گیا۔ اس جھگڑے میں آپ کا کبری زخمی ہو گیا تھا۔ پھر آپ نے اُسے پکڑوانے کے لیے ادھر مائی حاجاں کے مکان پر پولیس کا چھاپہ ڈلوایا۔ آخر کیوں؟ کیوں آپ اس کے دشمن بن گئے ہیں؟"

"یہ سب جھوٹ ہے۔ وہ تمہیں کہانی گھڑ کر سنا رہا ہے۔ میرا تمہارا اتنا پرانا ساتھ ہے کیا تم بھی مجھے ایسا ہی ہیچ سمجھتے ہو۔ میں دشمن پر پیچھے سے نہیں سامنے سے وار کرنے کا عادی ہوں مگر اس سے تو میری نہ کوئی دشمنی ہے نہ دوستی۔ میں اسے کیوں مرواؤں گا؟"

"پھر کبری پر گولی کس نے چلائی تھی؟"

"کبری کے بازو پر گولی لگی تھی اور وہ بزدل ڈر کر یہ ظاہر کرنے لگا جیسے وہ مر گیا ہے۔ اسی حالت میں اس نے اپنے دشمن کو دیکھ لیا تھا وہ جیلانی ہی تھا۔"

"مگر کبری نے اس پر گولی کیوں چلائی تھی۔ اس کا کیا جواب

ہے آپ کے پاس ؟"

"اس نے گولی نہیں چلائی تھی اس کو تو بندوق اٹھانی بھی نہیں آتی۔" آہو کی مکاری نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ آبی کو بھی طیش آنے لگا۔ وہ تیز لہجے میں بولا۔

"آہو صاحب پہلے تو جناب آپ وہ اسّی ہزار روپیہ منگوایئے اُوپر سے ابھی اور اسی وقت۔ کیونکہ وہ جیلانی کا روپیہ ہے اور آپ کے پاس امانت کے طور پر رکھا گیا ہے۔"

"یہ تمہیں کس نے کہا ہے۔ وہ جعلی کاغذ لیے پھرتا ہے اگر اس کے پاس ہیں بھی تو وہ بالکل جعل سازی کا نتیجہ ہیں۔ اگر وہ میری تحریر ہوتی تو میں تمہیں لاکھ کے دو لاکھ دے دوں گا، ابھی۔ اور اسی وقت۔"

"تو کیا آپ دو طرح سے لکھتے ہیں؟" آبی نے حیرانی سے پوچھا

"تم میری توہین کر رہے ہو آبی۔"

"نہیں آہو صاحب میں پھر آپ سے یہی التماس کروں گا جناب عالی کہ اس مظلوم سے منہ نہ پھیریں۔ اسے اس کی بہن کی رہائی میں مدد دیں۔ آپ نے اس سے وعدہ کیا تھا۔"

"میں نے وعدہ تو ضرور کیا تھا مگر یہ بات میرے بس میں نہیں رہی ہے۔ آئی جی جیل خانہ جات سے میرے تعلقات درست نہیں رہے۔"

"تو پھر اسے صاف صاف کہہ دیں۔ اس کا دل تو نہ توڑیں اُس سے منہ تو نہ پھیریں۔"

"یہ ضروری نہیں ہے میرا اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ اس کا مجھ پر کوئی حق ہے میں کیوں خواہ مخواہ اس کے سامنے جھکتا پھروں؟"

"تو گویا آپ اپنے تمام وعدوں کو بھلا چکے ہیں۔"

"میں نے اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔"

"میں بتاؤں آہو صاحب آپ کو کہ آپ نے کیا کیا ہے۔"

"کیا کیا ہے میں نے۔ میں کوئی مجرم ہوں تمہارا۔"

"آپ بہت بڑے اور گھٹیا مجرم ہیں دل شیر آہو صاحب! اور آپ نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ آپ نے بڑے صاحب کو بھی خوش کر دیا ہے کہ اس کا حریف ختم ہو گیا ہے۔ آپ نے اپنے سگے سسر کو کرائے کے قاتل کے ہاتھوں مروایا ہے تاکہ اس کی کروڑوں کی جائداد آپ کو مل جائے۔ کیونکہ اس کی صرف دو بیٹیاں ہیں اور ایک آپ کے عقد میں ہے۔ یہی کیا ہے نا آپ نے؟"

"تم بکواس کرتے ہو۔ یہ جھوٹ ہے بالکل جھوٹ ہے۔ بہتر ہے کہ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ ورنہ میں تمہیں بھی پولیس کے سامنے ننگا کر دوں گا۔ آبی! مت سمجھو کہ تم میرے ہاتھ سے نکل چکے ہو۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی آبی نے ہلکی سی سیٹی بجائی، یوں جیسے کوئی بے حد حیران اور خجل ہو کر اپنی خفت مٹانے کے لیے ایسا کر رہا ہو۔ اس کی سیٹی کی آواز سنتے ہی میں نے تیزی سے پلنگ کے نیچے سے نکل کر اپنا پستول آہو پر تان لیا۔

"ادھر دیکھو مسٹر آہو مجھے پہچانتے ہو نا بیٹے۔"

آہو اپنی جگہ سے یوں اچھلا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

"زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے آہو صاحب! اطمینان سے بیٹھ کر حساب دیجیے۔ ہم تو آپ کے پرانے خادم ہیں۔" آبی نے اچانک ہی اپنا لہجہ بدل لیا۔ اس کے لفظوں کی کاٹ ایسی تھی کہ آہو پسینہ پسینہ ہو گیا۔ ہکلاتے ہوئے بولا۔

"تم کیا چاہتے ہو مجھ سے؟"

"میں نے آپ کے ارشاد کے مطابق آپ کے سسر چوہدری ہادی علی کو قتل کر دیا ہے۔ اب میں اپنی بہن آسیہ کی رہائی چاہتا ہوں جناب دل شیر آہو صاحب۔" میں نے اس کی پسلی میں پستول کی نالی چبھوتے ہوئے کہا۔ "آپ کا دیا ہوا پستول اب بھی بے آواز چلتا ہے جناب، اور کرشمے دکھاتا ہے۔ کہیں تو آپ کو بھی دکھاؤں۔"

"انہیں وہ رسید دکھاؤ جیلانی۔ مجھے افسوس ہے آہو صاحب کہ آج میرا آپ کا تعلق ٹوٹ گیا ہے۔ درمیان کی کڑی کہیں گر گئی ہے۔"

"اسے اندر لا کر تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔"

"ایک دھوکے باز سے نمٹنے کے لیے ہمیں اور کیا کرنا چاہیے تھا آہو صاحب، بہر حال قصہ مختصر کریں بتائیں کہ آپ اپنا وعدہ پورا کرتے ہیں کہ نہیں۔" میں نے اس کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی تمہیں اس آدمی کے نام رقعہ لکھ دیتا ہوں جس نے مجھ سے اس کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"تو پھر جلدی کریں۔ قلم کاغذ تو رکھا ہو گا یہاں۔" میں نے اس کے بال چھوڑ دیئے۔

"ہاں ادھر الماری میں کاغذ قلم رکھے ہیں۔"

"ذرا دیکھو آبی، وہ الماری کھولو۔"

آبی اٹھ کر الماری میں سے کاغذ قلم اٹھا لایا۔

آہو نے صوبائی حکومت کے ایک بہت ہی اعلیٰ افسر ... کے ... نام ایک رقعہ ہمارے سامنے تحریر کیا جس میں اس نے

صاف طور پر لکھا کہ وہ ——— آسیہ نامی عورت کی رہائی کے لیے حامل رقعہ ہذا کی مدد کریں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی لکھا کہ چونکہ یہ رقعہ نہایت عجلت کی حالت میں لکھ رہے ہیں اس لیے وہ اس میں زیادہ تفصیل نہیں دے سکتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے لفظ 'عجلت' ہی لکھا تھا۔ مجھے آہو کی اس نالائقی پر بہت حیرت ہوئی مگر میں چپ رہا۔ وہ رقعہ اس نے لکھ کر مجھے دے دیا۔ اس میں انھوں نے اس افسر کے دفتر اور گھر کا پتہ بھی لکھ دیا تھا اس لیے میں نے مطمئن ہو کر وہ رقعہ آبی کے حوالے کر دیا۔ اس نے بھی اسے پڑھ لیا مگر وہ مطمئن نظر نہیں آیا۔ رقعہ مجھے دیتے ہوئے بولا۔

"دیکھیں جناب آہو صاحب! اگر آپ اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہیں تو آپ کو چپ چاپ یہاں میرے حکم پر اس وقت تک چلنا ہو گا جب تک آسیہ رہا نہیں ہو جاتی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرا مطلب ہے جناب کہ آپ اپنی بیگم کو بھی ادھر ہی بلا لیں اور اپنے نوکر باقی کو کہیں کہ وہ ٹیلیفون بھی ادھر ہی رکھ دے۔ آپ کا کھانا پینا رہنا سہنا سب ادھر ہی ہو گا۔ اس وقت تک جب تک آسیہ رہا نہیں ہو جاتی۔"

"تم مجھے اپنا قیدی بنانا چاہتے ہو۔" آہو سٹپٹا اُٹھا۔

"مجبوری ہے جناب۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔ ادھر باہر کے دروازے پر ہم تالا ڈال دیں گے اور آپ اپنے نوکر سے کہیں گے کہ وہ ایک مہینے کے لیے گاؤں چلا جائے۔ گھر کا سارا کام دھندا آپ کی بیگم کریں گی۔ باہر کا کام ہم کریں گے اور اگر آسیہ رہا ہو گئی تو ہم آپ کا شکریہ ادا کر کے چلے جائیں گے ورنہ ہادی علی کے پیچھے آپ کو بھی دوزخ کے سفر پر روانہ کر دیا جائے گا۔ وہ اُدھر آپ کا منتظر ہو گا جناب۔ یہ ہے ذرا سی زحمت جو ہم آپ کو دیں گے۔ اب اس پر ذرا جلدی سے عمل شروع کر دیں جناب ہرن لاہوری صاحب قبلہ و کعبہ! آپ کی میں نے چار سال تک بہت خدمت کی ہے آخر میرا بھی تو کچھ حق ہے آپ کے جوٹھے پر۔"

آبی کی وہ باتیں سن کر میں حیران رہ گیا۔ اس نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ میرے لیے اپنے ایک بہت بڑے سہارے کو اس نے تج دیا تھا۔ اس نے اپنے اس دوست کی گردن دبوچ لی تھی جس کی تعریفوں میں وہ زمین و آسمان کے قلابے ملایا کرتا تھا۔ اسے بہت ناز تھا اس آہو پر۔ اس کی خوش معاملگی پر۔ اس کی دیانت پر۔ اس کے سرکاری درباری اثر و رسوخ پر۔ لیکن اس روز اس نے میری خاطر وہ سب کچھ پس پشت ڈال دیا تھا۔ کیونکہ اسے یقین ہو چکا تھا کہ آہو

صاحب نے میرے ساتھ بدترین قسم کی زیادتی کی ہے۔

آبی کے اس تخ لہجے نے آہو کو متزلزل کر دیا۔ اس کا رنگ اُڑنے لگا پھر بھی اس نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے چیخ کر کہا۔ "تم دونوں یہاں سے نکل جاؤ ورنہ اچھا نہ ہو گا۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی آبی نے تڑاخ سے الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور اسے گھسیٹ کر پلنگ سے اتار لیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ شور نہ مچا دے آبی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی مگر آہو نے پوری قوت سے اپنا ماتھا آبی کے ماتھے سے ٹکرا دیا۔ آبی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور صوفے پر گر گیا۔ آہو اس کے اُوپر جا پڑا اور اس کی گردن پر ہاتھ ڈالنے لگا۔ اس کی قوت کا مجھے اندازہ ہی نہیں تھا۔ وہ آبی کو پریشان کر گیا تھا مگر اچانک میں نے دیکھا کہ آبی نے آہو کے دونوں بازو پکڑ کر اپنے دونوں پیر اس کے پیٹ میں دے کر اسے صوفے کے اُوپر سے دوسری طرف اچھال دیا مگر اس کے ساتھ ہی صوفہ بھی اُلٹ گیا اور آبی اس کے نیچے آ گیا۔

آہو نیچے گرتے ہی بلند آواز سے چیخا۔

"باقی ادھر آ۔ میری بندوق لا ادھر۔" وہ پھر اُٹھ گیا تھا۔ اس کی آواز کمرے میں گونجی تو میں ڈرا کہ اگر معاملات دوسروں کے ہاتھ میں آ گئے تو سارا قصہ ہی خراب ہو جائے گا۔ میں لپک کر آہو کے سر پر پہنچا اور پوری قوت کے ساتھ اس سے ٹکرا گیا۔ وہ بوسیدہ دیوار کی طرح ڈھے گیا۔ اس کا سر دیوار میں جا لگا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر آبی سے نظریں بچاتے ہوئے اس کی گردن میں اپنی انگلیاں دھنسا کر اس کی رگِ احساس مسل دی وہ فوراً ہی بے سدھ ہو گیا۔ اُس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا جب وہ بے ہوش ہوا، تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ آبی اس وقت تک صوفے کو سیدھا کر چکا تھا

"یار آبی! تو اُوپر جا کر اس سردِی خانم کو قابو کر اور باقی کو بھی ادھر باندھ لے۔ یہ لے میرا پستول لیتا جا، بے آواز چلتا ہے یہ۔"

آبی نے میرا پستول ہاتھ میں لیا تو اس کی غیر معمولی لمبی نال دیکھ کر بولا۔

"یہ کیا چیز ہے بھئی۔ کمال کا ہتھیار ہے یہ۔" اُس نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ نالی جو اس کے ساتھ لگی ہے یہ آواز کو دباتی ہے۔ تو فوراً اُوپر چلا جا۔ میں اسے سنبھالتا ہوں۔"

"اسے بے ہوش کیسے کر دیا ہے۔ تو نے۔ اس نے تو بڑی

جان کمائی ہوئی ہے۔ اس نے تو مجھے بھی الٹ دیا تھا۔۔۔"

ابھی میں اس کی بات کا جواب دے پایا تھا کہ دروازہ کھلا۔ سامنے باٹی کھڑا تھا۔ میں نے آہو کو لوٹ میں لے لیا۔ سامنے صوفہ پڑا تھا۔ باٹی کی نظر آہو تک جا سکی۔

"اوپر بی بی جی بلا رہی ہیں آہو صاحب کو، کہاں ہیں وہ؟"

"ابھی آتے ہیں وہ، تم ذرا اندر آؤ۔" یہ کہہ کر آبی نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔

"دیکھ باٹی یہ پستول ہے نا۔ اس کی نال سیدھی تیرے مغز میں اتار دوں گا۔ اگر تو نے کوئی گڑبڑ کی۔" یہ کہہ کر اس نے باٹی کے کندھے پر پڑا رومال اچک کر اپنی دونوں ٹانگیں اس کی ٹانگوں میں پھنسا کر رومال اس کے منہ پر کس دیا۔ یہ اتنی تیزی سے ہوا کہ باٹی صورتِ حال کو اس وقت ہی صحیح طور پر سمجھ سکا جب میں اس کی دونوں باہیں کمر پر باندھ چکا تھا۔ اس کام کے لیے میں نے اس کی شلوار سے ازار بند نکال لیا تھا۔

"یار تو خود ہی جا اوپر۔ میں اس کا سامنا نہیں کر سکتا۔ اس سروری خانم کا۔" آبی نے باٹی کو پلنگ پر گراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے لا پستول مجھے دے دے۔" یہ کہہ کر میں نے جھپٹ شاہ اس کے ہاتھ سے جھپٹا۔ اور دروازہ کھول کر صحن میں نکل گیا۔ گھر میں ہر طرف اس وقت خاموشی طاری تھی۔ بچہ تو ان کے ہاں کوئی بھی نہیں تھا اور کبری شاید ہسپتال میں تھا، یا ہو سکتا ہے آہو ٹھیک کہتا ہو کہ وہ گاؤں گیا ہوا ہے۔ گھر میں سروری خانم کے سوا اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ کوئی عورت بھی ان کے ہاں ملازم تھی مگر اس کے بارے میں مجھے اس وقت تک کچھ معلوم نہیں تھا۔ بہر حال میں دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر جا پہنچا سامنے ایک بڑا سا ہال کمرہ تھا جس کے چاروں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں ہال کمرے میں داخل ہوا تو مجھے سروری خانم ایک دروازے میں داخل ہوتی نظر آئی۔ وہ اس وقت گلابی رنگ والی بڑی ہی خوبصورت ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ بال بڑی نفاست کے اس نے کندھوں پر پھیلا رکھے تھے۔ اور اس کا وہ سرو سا قد دروازے میں سج گیا تھا۔ میں فاصلہ پھلانگتا ہوا ایک دم اس کے اوپر جا پہنچا اور اسے بالوں سے پکڑ کر اس کا منہ اپنی طرف کر لیا۔

"خبردار جو تم نے منہ سے کوئی آواز نکالی تو۔ چلو ادھر اندر چلو۔" یہ کہہ کر میں نے اسے دھکیل کر آگے بڑھایا تو اس کا رنگ ہلدی ہو۔۔۔ میری آنکھوں میں جمی بربریت اس کے لیے عجوبہ چیز تھی۔ منہ اس کا یوں کھل گیا تھا حیرت سے کہ اس کے حلق کا کوا تک مجھے نظر آ رہا تھا۔ اس کے خوبصورت سے گلاب کی پتیوں ایسے ہونٹ لرز رہے تھے۔ میں نے اندر لے جا کر اس کو ایک پلنگ پر گرا دیا جس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہاتھ میں باٹی کا آدھا ازار بند۔

"تم مجھے جانتی ہو سروری خانم! میں آہو سے اپنا حساب چکانے آیا ہوں۔ اس نے مجھے تباہ کر دیا ہے اور اسی سلسلے میں، میں تمہیں باندھ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے پلنگ کے ایک طرف پڑا اس کا دوپٹہ اٹھا کر تیزی سے اس کے منہ پر باندھ دیا۔ اس کا سارا بدن لرزنے لگا تھا۔ ایسا صدمہ اس نے شاید زندگی میں پہلی بار جھیلا تھا۔ اس کے منہ سے اُف تک نہ نکلی حالانکہ وہ خاصی اونچی لمبی دراز عورت تھی اور ڈیل ڈول اس کا ایسا تھا کہ اگر وہ مجھ سے الجھتی تو دو چار ہاتھ تو وہ مجھے دکھا ہی سکتی تھی۔ اس کا منہ باندھ کر میں نے اس کے دونوں ہاتھ اس کی پیٹھ پر لا کر ازار بند سے باندھ دیئے۔ میں نے اس کی خوبصورت اونچی ایڑی کی سبک سی جوتی اس کے پاؤں سے اتاری اور اس کی دونوں ٹانگیں اٹھا کر اسے پلنگ پر پہلو کے بل گرا دیا۔

آہو کا فون اسی کمرے میں رکھا تھا ایک خوبصورت سی تپائی کے اوپر۔ وہ بہت ہی سجا سجایا کمرہ تھا۔ آئینہ خانہ نظر آتا تھا وہ مجھے۔ آمنے سامنے دو بڑے بڑے قدِ آدم آئینوں والی سنگھار میزیں رکھی تھیں۔ فوم کے گدوں والے دو پلنگ ساتھ ساتھ بچھے تھے۔ اور فرش پر قالین اتنا دبیز تھا کہ اس پر چلنے سے آدمی کی ساری کلفت دور ہو جاتی تھی۔ دیواروں پر بڑے سلیقے سے انہوں نے عمدہ قسم کی تصویریں سجا رکھی تھیں جن میں سے کچھ تو بڑی ہیجان خیز تھیں۔

سروری خانم کو بے بس کر کے میں نے دروازہ بند کیا اور ہال کمرے سے گزر کر سیڑھیوں میں آ گیا۔ پہلے قدم پر آبی کھڑا تھا وہ باٹی کو کھینچ کر وہاں تک لے آیا تھا۔

"اسے اوپر لے آ یار۔ میں نے اسے باندھ دیا ہے۔" میں نے دبے لہجے میں کہا۔ آبی نے باٹی کی کمر میں ٹھوکا دیا تو وہ آہستہ آہستہ سیڑھی چڑھنے لگا مگر جب وہ درمیانی زینے پر پہنچا تو ایک دم پلٹ کر آبی پر گرا اور اسے اپنے ساتھ لے کر لڑھکتا ہوا صحن میں جا پڑا۔ اب وہ آبی کے اوپر یوں جھکا تھا کہ اس نے اپنے دونوں گھٹنوں میں آبی کا پیٹ دبا لیا تھا اور اپنے۔۔۔ سر سے اس کے ماتھے پر ٹکریں مار رہا تھا حالانکہ اس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے وہ باٹی اپنی جوانی میں سیکھے ہوئے پہلوانی کے گُر اس پر استعمال کر رہا تھا۔ سیڑھیوں میں یوں اچانک لڑھکنے کی وجہ سے آبی کے سر پر گہری چوٹ آ گئی تھی۔ وہ باٹی کے سامنے بے بس ہوا جاتا تھا۔ میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اترا اور جاتے ہی پوری قوت سے باٹی کی پسلی میں لات جمائی۔ وہ الٹ کر دوسری طرف جا گرا۔ غصے نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میں نے باٹی کو بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔ منہ اس کا بندھا تھا ورنہ شاید وہ مار سہتے ہوئے اتنا چلاتا کہ دور دور تک لوگ اس کی آواز سن لیتے۔ پانچ چھ ہاتھ جب بہت کرارے سے اس کے بدن پر پڑ چکے تو وہ بے سدھ فرش پر گر گیا۔ اس عرصے میں آبی اٹھ کر خود کو سنبھال چکا تھا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"اس نے تو مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا یار۔ بڑا خطرناک بڈھا ہے یہ۔"

"چوٹ تو نہیں آئی تجھے؟"

اس نے سر پر ہاتھ پھیر کر میرے آگے کر دیا۔ اس کی انگلیاں خون آلود ہو گئی تھیں۔

"سیڑھی کی نوک لگ گئی ہے سر میں۔ اس باٹی نے تو کمال کر دیا ہے۔"

"حق نمک ادا کر رہا ہے سالا، چلو اسے اوپر لے چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے باٹی کے ٹھوکر لگا کر اسے۔۔۔ اٹھایا اور پھر اسے اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے اوپر لے گیا۔

"میں اسے بھی اوپر ہی لے آتا ہوں۔" آبی نے سیڑھیوں میں منہ ڈال کر کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔ باٹی میں اب مزید مار کھانے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ بڑی فرمانبرداری سے میرے ساتھ اوپر چڑھا تھا۔ میں نے اسے ہال کمرے میں سے گزار کر سروری خانم کے ساتھ والے کمرے میں ڈال دیا۔۔۔ یہ سروری خانم کا وہ کمرہ تھا جہاں وہ لباس تبدیل کرتی تھی۔ اس الگنی پر اس کی تین چار شلواریں ٹنگی تھیں جن میں ریشمی ازار بند پروئے ہوئے تھے۔ میں نے ازار بند نکال کر باٹی کی ٹانگیں بھی کس کر باندھ دیں۔ اس کے پاؤں کی آزادی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں سروری خانم کے کمرے میں گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ شاید دوسرے کمرے میں جا گھسی تھی۔ اس کی ٹانگیں بھی آزاد تھیں صرف ہاتھ بندھے تھے اور اس پہلو کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے اس کو دھکیل کر کھولنے کی کوشش کی مگر معلوم یہ ہوا کہ وہ اندر سے کنڈی چڑھا چکی ہے۔ وہ کنڈی ایسی تھی تختے کے درمیان میں لگی تھی۔ سروری خانم نے اپنے ہاتھ کو ذرا سا بڑھا کر اسے بڑی آسانی سے بند کر لیا تھا۔ میں نے ہال کمرے میں جا کر عقب میں کھلنے والی کھڑکیوں میں سے باہر جھانک کر دیکھا تو مجھے اطمینان ہو گیا کہ ادھر کوئی راہداری نہیں تھی اور اس طرف سے سروری خانم باہر نہیں نکل سکتی تھی۔

ابھی میں وہاں کھڑا ہی تھا کہ آبی سیڑھیاں چڑھ آیا۔ اس نے آہو کو کمر پر لاد رکھا تھا۔ آبی بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ پھر بھی اس نے آہو کو آگے لا کر دھڑام سے فرش پر پھینک دیا۔

"اسے پکڑو اور ادھر اندر لے چلو، پلنگ پر ڈال دیں گے ہم اسے۔"

"بڑا وزن ہے یار اس سور کا۔ مجھے تو تھکا دیا ہے اس نے۔" اس نے اپنا سانس بحال کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے گناہوں کا بوجھ بھی تو شامل ہے اس کے وزن میں بے چارے اُدھر ہے۔"

ہم دونوں نے آہو کو اوپر نیچے سے پکڑا۔ اور اسی پلنگ پر لے جا کر ڈال دیا۔ جس پر تھوڑی دیر پہلے میں نے سروری خانم کو لٹایا تھا۔

"یار وہ سروری بیگم تو ادھر مورچہ بند ہو گئی ہے اس نے اندر سے کنڈی چڑھا لی ہے۔"

"تم نے باندھا نہیں تھا اسے؟"

"اس کے ہاتھ اور منہ تو میں نے باندھ دیئے تھے مگر اس کی ٹانگیں آزاد تھیں۔"

"کمال کرتا ہے تو بھی میرے یار۔"

"اتنا تجربہ نہیں تھا مجھے اس لیے چوک ہو گئی ٹھہر میں دیکھتا ہوں یہ اندر کیا کر رہی ہے۔" میں نے دروازے کے اوپر چھوٹا سا روشندان دیکھتے ہوئے کہا اور تپائی آگے کھینچ کر اس پر پاؤں رکھ دیا۔ وہ میرا وزن سہار سکتی تھی۔ تپائی پر چڑھ کر میں نے روشندان کے شیشے میں سے دوسرے کمرے کے اندر نگاہ ڈالی سروری خانم اس گھڑی اپنے سارے بدن کو باہوں میں سے گزار کر پیچھے بندھے ہوئے بازو آگے لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کا لچکیلا بدن اس کی باہوں کے حلقے میں سے گزر جائے گا مگر مجھ سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ میں نے ڈوری اس کی کلائیوں پر وہاں باندھی تھی جہاں وہ اپنی گھڑی باندھے ہوئے تھی۔ اس کی وجہ سے اس کی بلا آستین بلاؤز کی برہنہ باہیں اتنی جگہ ضرور بنا رہی تھیں کہ اگر وہ ذرا سی اور کوشش کرتی تو باہوں کو آگے لا سکتی تھی اور پھر اپنے دانتوں سے وہ بڑی آسانی سے ڈوری کی گرہ کھول سکتی تھی۔ وہ سوتی ازار بند اس کے لیے ہتھکڑی تو بن گیا تھا مگر اسے کھول لینا کسی طرح بھی مشکل نہیں تھا۔

میں تپائی سے نیچے اتر آیا۔ صورتحال خاصی مخدوش تھی۔ اگر وہ اپنی باہیں کھول لیتی ہے تو وہ دوسری طرف کے دروازے کی کنڈی نیچے گرا کر بڑی آسانی سے آگے نکل سکتی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ آگے کیا ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس کمرے کے

راستے وہ کسی اور طرف نکل کر ہماری دسترس سے باہر چلی جائے مجھے کسی فوری اقدام کی ضرورت تھی۔

"کیا کر رہی ہے وہ؟"

"یار وہ اپنے ہاتھ کھولنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

"اسے پکڑو میرے بھائی۔ اس کمرے کے آگے ایک راہداری ہے جو ادھر مکان کے عقب میں چھوٹی سیڑھی کی طرف جاتی ہے اسے روک۔" آبی نے پریشان ہو کر کہا۔

میں پستول سیدھے ہاتھ میں لے کر ایک بار پھر تپائی پر چڑھ گیا۔ سروری خانم ابھی تک اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

"اٹھ جا سروری اور ادھر آ کر کنڈی کھول دے ورنہ میں تیرے سر میں سوراخ کر دوں گا۔"

میں نے اپنی آواز کا تمام تر تحکم اس کے کانوں میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میری آواز سن کر اس نے سر گھما کر اوپر دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کا دوپٹہ اس کے منہ پر بدستور بندھا تھا اور اس کا ساتھ دے رہا تھا مگر اس طرح کہ اس نے اس چوہدری ہادی علی کی سرو قد بیٹی کی ساری گویائی چھین لی تھی۔ اس نے مجھے روشن دان میں دیکھا تو اس کی آنکھوں میں نفرت سلگنے لگی۔ میں نے اس کو خوفزدہ کرنے کے لیے اس کے سر کے اوپر سے گولی چلا دی۔ اس کے بنے کے گھونسلے ایسے ابھرے ابھرے ریشمی بالوں کو چھوتی گولی آگے نکلی اور دیوار میں جا لگی۔ گولی کو دیوار میں لگتی دیکھ کر وہ تیزی سے اٹھی اور میری طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔ وہ نسائیت کے تمام ہتھیاروں سے لیس تھی اور فطرت نے اسکے جسم کی تراش خراش میں بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ آہو کا انتخاب بلاشبہ لاجواب تھا۔ بانہیں اس کی ابھی تک پیچھے بندھی تھیں۔

"یہ دروازہ کھول دو اسی طرح جس طرح تم نے بند کیا تھا۔ ورنہ مجھے اسے توڑنا پڑے گا۔" میں نے ایک بار پھر تحکم بھرے لہجے میں کہا۔

وہ اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر مجھے دیکھنے لگی۔ وہ میری بات ماننے پر آمادہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

"ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے سروری خانم، ہمیں تم سے ہمدردی ہے تم ایسے آدمی کی بیوی ہو جس نے تمہیں مکمل طور پر برباد کر دیا ہے۔ ہم نے تمہیں خاموش رکھنے کے لیے باندھا ہے ورنہ ہم تمہیں کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتے۔ دروازہ کھول کر میری بات اطمینان سے سن لو پھر جو فیصلہ تم کرو گی ہمیں منظور ہو گا۔ تمہارا شوہر ہم سے بدترین قسم کی زیادتی کر چکا ہے چلو دروازہ کھول دو چلو۔ ورنہ اب کی بار گولی تمہارے دل میں اتر جائے گی۔"

میری باتوں کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ آگے بڑھی اور دروازے کے پاس پہنچ کر پیٹھ موڑ کر کھڑی ہو گئی پھر اس نے ذرا سا جھک کر اپنی انگلیوں کو پھیلا کر لاک کو کھینچا اور دروازہ کھول دیا۔

میں تپائی سے نیچے اتر آیا۔ اب وہ میرے سامنے کھڑی تھی، پورے قد سے تن کر۔ آنکھیں اس کی جھرنے بن رہی تھیں اور آنسو اس کے رخساروں پر لگاتار بہہ رہے تھے۔

"آؤ ادھر بیٹھ جاؤ۔" یہ کہہ کر میں نے بڑی ملائمت سے اس کا بازو تھام کر پلنگ پر بٹھا دیا۔ اس عرصے میں آبی نے آہو کو دھکیل کر دوسرے پلنگ پر ڈال کر اس کو لحاف اوڑھا دیا تھا، اس طرح کہ اس کا سر بھی اس میں چھپ گیا تھا اور پیر بھی۔

آبی نے مجھ سے کچھ کہے بغیر تیزی سے سروری خانم کے منہ پر سے دوپٹہ اتار دیا میرے پستول کی نال اس کے سینے کی طرف تھی۔ منہ سے دوپٹہ اترتے ہی وہ بولی۔

"تم... تم کیا چاہتے ہو۔ کیا کیا ہے آہو صاحب نے تمہارے ساتھ۔ وہ... وہ تو اتنا خیال رکھتے تھے آپ لوگوں کا۔"

"اچھا ہے کہ آپ ہم سے ساری باتیں پوچھ لیں... مگر یہ بھول جائیں کہ آپ شور مچا کر ہم سے چھوٹ جائیں گی۔" آبی نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا اور دیوار کے ساتھ پڑی کرسی کو کھینچ کر سروری کے قریب ہو بیٹھا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا جیسے وہ اس عورت کو سانس کے ذریعے پی جانے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ دراصل اس لمحے سروری خانم کے بدن پر لگی اس خوشبو کو سونگھ رہا تھا جو اس خوبصورت کمرے میں بہت ہی خوشگوار محسوس ہو رہی تھی اور ماحول کے تکدر کو دور کیے دیتی تھی۔

"مجھے بتائیں کہ میرے شوہر کا کیا قصور ہے؟"

"آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے والد ہادی علی چوہدری کو آہو صاحب نے خود مروایا ہے۔"

"نہیں نہیں یہ غلط ہے یہ جھوٹ ہے سراسر جھوٹ۔ میرے شوہر ایسے نہیں ہو سکتے ہیں۔"

"وہ ایسے ہیں سروری خانم جی۔ انہوں نے ہادی علی کو خود مروایا ہے۔"

"مگر مگر کیوں۔ کیوں۔ اس سے انہیں کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ میں کبھی نہیں مان سکتی کہ انہوں نے ایسا کیا ہے۔"

"دیکھیں جس آدمی کے ذریعے انھوں نے ہادی علی کو قتل

کروایا ہے اس کی ایک بہن ہے وہ ادھر جیل میں قید ہے۔ اُس کی رہائی کا وعدہ کر کے آہو صاحب نے اس سے سودے بازی کی تھی۔ کہا انھوں نے یہ تھا کہ اگر وہ ہادی علی کو مار دے تو وہ اس آدمی کی بہن کو رہا کروا دیں گے۔" میں نے سروری کے قریب ہو کر کہا۔

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"اس سلسلے میں انہوں نے ایک تحریر بھی لکھ کر دی تھی۔ وہ یہ ہے۔" یہ کہہ کر میں نے آہو کے ہاتھ کی تحریر بھی اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ حیرت زدہ سی ہو کر اس کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ اسے پڑھ کر بولی۔

"اس میں تو میرا بھی ذکر ہے۔"

"جی ہاں، انھوں نے کہا تھا کہ اگر وہ اپنا وعدہ پورا نہ کریں یا نہ کر سکیں تو وہ سمجھیں گے کہ ان کی بیوی طلاق ہو گئی۔"

سروری خانم کا رنگ اور زیادہ دھواں دھواں ہونے لگا۔

"اس وقت انھوں نے اس آدمی سے اسی ہزار روپیہ بھی لیا تھا۔ امانت کے طور پر اور غالباً اس خیال سے کہ اگر وہ آدمی ہادی علی کو نہ مار سکا تو وہ اسی ہزار روپیہ لے لیں گے — جرمانے کے طور پر — اور یہ اس روپے کی رسید ہے۔"

"یہ... یہ روپیہ تو ادھر موجود ہے، مجھے دے رکھا ہے انھوں نے پورا اسی ہزار ہے۔"

"جی یہ وہی روپیہ ہے۔" میں نے کہا۔

"اور یہ وہی آدمی ہے جس نے یہ روپیہ آہو کو دیا تھا۔"

"تم! تم نے میرے باپ کو قتل کیا ہے۔" وہ بدک کر مجھ سے کچھ ہاتھ پرے سرک گئی۔ مگر رہی وہ پلنگ کے اوپر ہی۔

"گھبرائیے نہیں! میں نے جو کچھ کیا ہے بالکل لاعلمی میں کیا ہے۔ مجھے خدا گواہ ہے بالکل علم نہیں تھا کہ ہادی علی آپ کے والد ہیں۔ ورنہ میں مر جاتا مگر ان پر ہاتھ کبھی نہ اٹھاتا۔" میں نے آبی کی اس حماقت کی وجہ سے اس کے آشکارا ہو جانے پر خجل ہوتے ہوئے کہا۔

"بالکل جھوٹ۔ تمہیں پتہ تھا کہ ہادی علی سے ان کا کیا رشتہ ہے۔"

"میں قسم کھا سکتا ہوں سروری خانم۔ او... اور... آپ جانتی ہیں مسند آراء سے میرا کیا رشتہ ہے۔ بھلا اُسکے باپ پر کس طرح ہاتھ اٹھا سکتا تھا۔ نہیں نہیں ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا تھا۔"

مسند آراء کا نام میرے منہ سے سن کر اس کی آنکھیں ایک بار پھر بہہ نکلیں۔

"تم نے... تم نے مجھے اور اسے برباد کر دیا ہے۔"

"نہیں میں نے نہیں بلکہ آپ کے شوہر نے آپ کو تباہ کیا ہے اور ایک خاص مقصد کے تحت۔"

"مقصد! انھیں کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے اپنے سسر کو مارنے سے۔" وہ بہت ہی آزردہ خاطر ہو گئی تھی۔ آبی نے آگے بڑھ کر اس کی کلائیوں پر بندھی ڈوری کھول دی۔ بولا۔

"آپ اطمینان سے بیٹھیں ہم آپ کے دشمن نہیں ہیں۔ سمجھیں کہ آپ اپنے بھائیوں کے سامنے بیٹھی ہیں۔ خدا کی قسم مجھے آپ اپنا بھائی سمجھیں۔" یہ کہہ کر اس نے سروری کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

اس نے ایک دم ساری صورتِ حال بدل ڈالی تھی۔ میں بھی شاید اسے یہی کہنے والا تھا مگر میری زبان کو یارا نہ ہوا۔ وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آبی کو دیکھنے لگی۔ آبی بہت ہی متاثر ہو گیا تھا، اس کے آنسوؤں سے۔ اس نے دوپٹہ اٹھا کر اس کے رخساروں پر بہتے آنسو پونچھ ڈالے۔ بولا۔

"آپ کو اس صدمے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ آپ کا شوہر تو چوروں اور ڈاکوؤں کی کمائی کھاتا رہا ہے۔"

"کیا کہتے ہو تم! وہ شریف آدمی ہے۔"

"ہاں سرکاری طور پر وہ واقعی شریف آدمی ہے سروری خانم! مگر اصل روپ اس کا اور ہی ہے۔ جس دن یہ شخص یہاں ٹھیرا تھا اس دن آپ کو آہو نے پچاس ہزار روپیہ دیا تھا کہ نہیں؟"

"ہاں دیا تھا مگر وہ تو، وہ تو ان کا منافع تھا جو انہیں کاروبار میں ہوا تھا۔"

"کیا کاروبار کرتے ہیں وہ؟"

"وہ آڑھت کا کام کرتے ہیں ان کے دو ٹرک بھی چلتے ہیں پھر اور بھی کئی کام ہاتھ میں لے رکھے ہیں انھوں نے۔"

"یہی تو آپ سمجھ نہیں سکی ہیں۔ وہ روپیہ اس روز میں انھیں دے کر گیا تھا۔ میں نے ایک آدمی کے گھر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اس میں سے ایک لاکھ میں نے اس دوست کو دیا اور پچاس ہزار آہو کو۔" سروری خانم کی حیرت دیدنی تھی بڑی بجھی ہوئی آواز میں بولی۔

"ان کو کیوں دیا تھا وہ روپیہ آپ نے؟"

"وہ اس لیے میری بہن کہ آہو ہمیں پولیس کے چکروں سے بچاتا رہا ہے۔ کچہری میں سو طرح سے مدد کرتا ہے اس لیے میں ہی نہیں کئی اور لوگ بھی اسے لمبی لمبی رقمیں دے جاتے ہیں۔"

"اُف میرے اللہ یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ آہو ایسے آدمی ہیں، یہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

"جی ہاں! آپ نے پتہ نہیں کیا سوچ کر ان سے شادی کر لی تھی۔ کہاں سے ٹکرے تھے یہ آپ کو؟"

"یہ ادھر میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ ہم ایم اے کر رہے تھے ان دنوں۔ یہ سائیکالوجی پڑھ رہے تھے اور میں سیاسیات۔"

"تو یہ بات ہے انہوں نے اپنی اس نفسیات کے علم کو آپ پر بھی آزمایا اور جرائم پیشہ لوگوں پر بھی۔ سیاست میں دلچسپی ان کو آپ نے دلائی ہو گی۔"

"یہ بھی ان کا شوق تھا اور اس میں بھی خاصے کامیاب رہے ہیں۔" اب وہ قدرے بہتر محسوس کرنے لگی تھی۔

"بہت ہی کامیاب کہیں — ایسے آدمی تو ڈھونڈے سے نہیں ملتے ہیں جناب۔" میں نے دل کھول کر آہو کی تعریف کی۔

"اب آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے۔"

"میں چاہتا ہوں میری بہن کہ تم اپنے شوہر کو سمجھاؤ کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے۔ میری بہن آسیہ ادھر جیل میں بیٹھی ہے اس کی رہائی کے لیے میں اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں — اس کی خاطر میں نے اتنے بڑے آدمی کو قتل کر دیا مگر اب یہ اپنے وعدے سے پھر گئے ہیں یہ بھائی آہو صاحب۔"

"وہ اب کہاں ہیں۔ آپ سے ملنے کے لیے پہنچے گئے تھے۔"

"وہ ادھر آپ کے پیچھے لیٹے ہیں۔ لحاف اٹھا کر دیکھیں" میں نے اسے آہو کا سراغ دیا۔ وہ پلٹ کر پیچھے ہٹی اور آہو کے منہ سے لحاف الٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ "یہ سوئے ہوئے ہیں کیا کھلا دیا آپ نے انہیں؟"

"کچھ نہیں، بس ذرا بے ہوش ہو گئے تھے یہ اپنے غصے کی شدت میں۔"

"انھیں ہوش میں لائیے تو میں ان سے بات کروں۔"

"یہ جلدی ہوش میں آ جائیں گے بی بی پہلے تو آپ وہ اسی ہزار روپیہ ادھر لائیں۔" آبی نے اسے خاص کام یاد دلایا۔

"ہاں وہ میں لا دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور پہلے کمرے کی طرف چلدی۔ میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ اس پر کسی قسم کے اعتماد کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ اول تا آخر آہو کی بیوی تھی۔ ہمارے دشمن کی جیون ساتھی۔ میں بھی اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں جا گھسا۔ وہاں پہنچ کر اس نے الگنی پر ٹنگے اپنے کوٹ کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا، اور سامنے دیوار کے ساتھ رکھے سیف کو کھولنے لگی۔ تین چابیاں وہ لگا چکی تو پھر اس نے دستہ گھما دیا سیف آپ ہی آپ کھل گیا۔ اس کے بہت سے خانے مقفل تھے۔ اس نے صرف ایک خانہ کھولا۔ اس میں بہت سے نوٹ دھرے تھے۔ وہ خاصا بڑا خانہ تھا۔ نوٹوں کی کچھ گڈیاں ایک طرف ہٹا کر اس نے ایک رومال میں لپٹے نوٹ نکالے اور میری طرف بڑھا کر بولی۔

"یہ لیں۔ یہ وہی نوٹ ہیں اور اسی طرح رومال میں بندھے ہیں جس طرح مجھے ملے تھے، انہیں گن لیں۔"

میں نے وہ نوٹ بائیں ہاتھ میں تھام لیے پستول کا رخ میں نے ابھی تک اس کی طرف کر رکھا تھا۔ وہ مجھے کوئی بہت ہی عیار عورت نظر آتی تھی۔ اپنے سارے خوف پر قابو پا لینے کے بعد بڑی حد تک پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ جب آبی نے اسے میری اور اپنی بہن بنایا تھا تو میں دیکھ رہا تھا کہ اس کو اس لفظ سے کوئی خاص خوشی محسوس نہیں ہوئی بلکہ ایک مخصوص قسم کی کراہت سی اس کے چہرے پر ابھر آئی تھی۔ اور میں سمجھتا تھا کہ وہ ہم پر کسی بھی ناطے سے کسی قسم کا اعتبار کرنے پر تیار نہیں تھی۔ نوٹ مجھے تھما کر اس نے سیف بند نہیں کیا بلکہ ایک اور چابی سے ایک اور خانہ کھولنے لگی۔ اس وقت اس نے سارے سیف کو اپنے بدن کی اوٹ میں لے لیا تھا۔

وہ اس خانے میں چابی گھما چکی تو میں نے اس کے کندھے کے اوپر سے آگے جھانکا۔ اس نے سر گھما کر مجھے دیکھا اور بولی۔

"یہ کیا کرتے ہیں آپ، نیت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔ پرائی عورت کے اتنا قریب نہیں ہوتے۔" وہ مسکرانے لگی تھی۔

"اس خانے میں کیا رکھا ہے آپ نے؟"

"آپ کے لیے خوشبو نکال رہی ہوں۔ میرا کمرہ بدبو سے بھر دیا ہے آپ نے۔ پتہ نہیں کب سے نہائے نہیں ہیں آپ۔"

ایسے نازک اور وحشت کے لمحات میں اسے ایسی ایسی نازک باتیں سوجھ رہی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر مجھے نگاہ غلط انداز سے دیکھا اور خانہ کھول دیا۔ اس میں خوشبو کی دو شیشیاں دھری تھیں جن پر پمپ سے لگے تھے۔ ایک شیشی اس نے اٹھائی، اور بولی۔

"ذرا گریبان کھولیں اپنا۔ دیکھیں یہ کیسی عمدہ خوشبو ہے۔"

میں ابھی تک کمبل اوڑھے ہوئے تھا۔ مجھے بھلا ایسی خوشبو سے کیا لینا تھا۔ اچانک میری چھٹی حس نے مجھے یہ احساس دلایا کہ جیلانی تجھ پر شاید یہ عورت وہی حربہ آزما رہی ہے جس کی بدولت عالیہ نے تجھے زیر کر لیا تھا۔ میں نے تیزی سے وہ شیشی اس کے ہاتھ سے چھیننا چاہی مگر وہ بہت تیز نکلی۔ اس نے شیشی کا پمپ چلا دیا۔ عجیب سی بھینی بھینی خوشبو میرے نتھنوں میں چڑھی، مگر پیشتر اس کے کہ اس کے اس کا پورا فوارہ میرے چہرے کو تر کر دیتا میں اچھل کر پیچھے ہٹا اور کمبل کا پلّہ پورے زور سے

اس کے ہاتھ پر دے مارا۔ شیشی اس نے پوروں میں پکڑ رکھی تھی۔ وہ اس کے ہاتھوں سے نکل کر فرش پر جا گری اور ٹوٹ گئی مگر اس کا ٹوٹنا ہی غضب ہو گیا۔ کمرے میں عجیب سا کثیف دھواں پھیلنے لگا جس میں سے بڑی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ میں گھبرا کر کمرے سے نکلا اور اس کا دروازہ اپنے پیچھے بند کر کے باہر سے کنڈی چڑھا دی۔

میرے چہرے کی سراسیمگی آبی نے بھانپ لی، بولا۔ "کیا ہوا خیر تو ہے؟"

"پتہ نہیں اس نے کوئی خوفناک چیز مجھ پر آزمائی ہے۔" دوسرے کمرے میں سردری زور سے کھانسنے لگی تھی اور اب وہ دروازے پر دوہتڑیں مار رہی تھی مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چند سانس جو اس کثیف دھوئیں میں میں نے لئے تھے میرے اعصاب سُن کر گئے تھے۔ میرا گلا خشک ہوتا جا رہا تھا۔

"مجھے تھوڑا پانی پلا آبی، پتہ نہیں اُس سالی نے کیا کر دیا ہے۔" میں نڈھال سا ہو کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ دروازے پر سردری کی دستک اور شدید ہو گئی تھی اور پھر وہ خوفناک انداز سے چلائی۔ "دروازہ کھولو خدا کے لیے مجھے باہر نکالو۔" یہ کہہ کر وہ پھر نہایت ہی ہولناک طریقے سے کھانسنے لگی۔ یوں لگتا تھا اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ آبی پانی لایا تو میں نے سردری کی آواز سُن لی۔

"یار میں یہ دروازہ کھول دوں، پتہ نہیں کیا ہوا ہے اسے۔"

"دروازہ مت کھولنا آبی۔ اس نے بڑا خوفناک ہتھیار آزمایا ہے مجھ پر۔" میں نے آبی کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے دروازہ کھولو۔"

"یار یہ کیا کر رہا ہے تو! اسے دیکھو تو۔"

میں نے اپنے خشک ہوتے گلے کو پانی سے تر کیا، اور سینے پر بڑھتے ہوئے بوجھ کو گہرے گہرے سانسوں سے اتارتے ہوئے کہا۔

"یہ دروازہ مت کھولنا آبی! اس نے بڑی خوفناک گیس چلائی ہے مجھ پر۔ وہ گیس ادھر آ گئی تو ہم سب مر جائیں گے۔" میں ہانپنے لگا تھا۔ موت کے لرزہ خیز تصور نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ اور پھر مجھے بڑے کمرے کے دروازے کے پیچھے سے دھم کی سی آواز سنائی دی۔ سردری کی کھانسی ختم ہو گئی تھی اور اب وہ دروازہ کھولنے پر اصرار نہیں کر رہی تھی۔

یار یہ ہوا کیا ہے اب اس کی آواز بھی نہیں آ رہی دیکھو تو سہی۔ وہ کہیں ادھر سے دوسری طرف نہ نکل گئی ہو۔

"ادھر بیٹھ جا آبی۔ یہ دروازہ میں ابھی نہیں کھولوں گا۔ اس نے جو حربہ مجھ پر استعمال کیا ہے وہ ایسا ہے کہ اس کے سامنے شیر بھی بے بس ہو جاتے ہیں۔" عالیہ نے مجھے اسی طرح تباہ کیا تھا۔ میں یہ دروازہ نہیں کھولوں گا۔"

میں نے سراسیمہ ہو کر کہا۔ میرا خیال ہے میرا بھی اس گھڑی رنگ اڑ رہا تھا اور آبی میری وہ حالت دیکھ کر سخت حیران تھا مجھے معلوم تھا کہ وہ کمرہ جس میں انہوں نے سیف رکھا تھا، چاروں طرف سے بند تھا۔ اس میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ روشن دان۔ اسی میں انہوں نے اپنی تمام لوٹ مار کی دولت جمع کر رکھی تھی۔ اور جس نگاہِ غلط انداز سے اس سردری نے مجھے دیکھا تھا۔ اس سے میں یہی نتیجہ اخذ کر سکا تھا کہ وہ بہت ہی عیار عورت ہے۔ اور ہادی علی کے قتل کا سارا انتظام اس کے علم میں بھی تھا۔ وہ آہو کے تمام اقدامات میں برابر کی شریک تھی۔

تب اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ یہ عورت یہ جرمن وچ ہوا کے مارے ہوئے آدمی کی یہ پڑھی لکھی بیوی کہیں اپنی بے حد و حساب ہوسِ زر میں مبتلا ہو کر مسند آرا کو تو راستے سے نہیں ہٹا بیٹھی ہے تاکہ باپ کی کروڑوں کی جائداد پر یہ بلا شرکتِ غیرے قابض ہو سکے — مجھے اس سے پوچھنا چاہیے کہ مسند آرا کہاں ہے۔ جونہی یہ خیال میرے ذہن میں ابھرا میں نے پاگلوں کی طرح آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ مگر یہ میری بہت بڑی حماقت تھی۔ وہ کمرہ سفید رنگ کے کثیف دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اور دروازے کے پیچھے سردری خانم بے سُدھ پڑی تھی۔ بالکل چت۔ دھوئیں کا ایک بادل سا خوفناک شکل میں دروازے سے باہر نکلا اور مجھے اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔ میں کمبل منہ پر لپیٹ کر چیخا۔

"آبی یہ سارے دروازے کھول دے اور یہ پنکھے چلا دے جلدی کر۔" یہ کہتا ہوا میں تیزی سے ہال کمرہ میں نکل گیا۔ آبی بھی کھاؤں کھاؤں کھانسنے لگا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے نہایت جی داری سے کمرے کے تینوں دروازے کھول دیئے اور ہال کمرے میں آنے سے پہلے اس کے پنکھے کا بٹن دبا دیا۔

"اسے پکڑ اس آہو کو ادھر کھینچ۔" میں نے آبی کو کھانستے ہوئے کہا اور ہم دونوں نے کمرے میں پھیلتے دھوئیں میں آگے بڑھ کر آہو کو اس کے پلنگ پر سے کھینچ کر اتارا اور اسے ٹانگوں سے گھسیٹتے ہوئے ہال کمرے میں لے آئے۔

میں نے پاگلوں کی طرح آگے بڑھ کر اس کمرے کی آٹھوں کھڑکیاں کھول دیں۔ چار عقب میں تھیں اور چار صحن میں کھلتی تھیں۔ تازہ ہوا مکان کے اس حصے میں بھرنے لگی تو دھوئیں کی

کثافت گھٹنی شروع ہو گئی جس کمرے میں باقی بیٹھا تھا وہ چاروں طرف سے بند تھا اس لیے میں اس کے بارے میں زیادہ پریشان نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس طرح بے دردی سے بچ گیا ہو گا جب ذرا دھوئیں کا زور کم ہوا اور کمروں کی فضا صاف ہو گئی، تو میں بڑے محتاط انداز سے اس کمرے میں گیا جس میں سروری خانم محبوس ہو کر رہ گئی تھی۔

میں نے دھوئیں کے مہیب اثرات سے بچنے کے لیے منہ پر اپنا کئی دنوں کا دھویا ہوا رومال رکھ لیا تھا۔ میں جب اندر پہنچا تو دیکھا کہ سروری خانم اندمال و علاج کی تمام سرحدیں عبور کر گئی تھی۔ اس کی نبضیں ڈوب چکی تھیں اور موت اس سونے ایسی رنگت کے دلآویز بدن پر وارد ہو چکی تھی۔ زندگی اسے دغا دے گئی تھی۔

"آبی! ادھر آ آبی۔ دیکھ تو اسے کیا ہو گیا ہے۔" میں نے سروری خانم کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ میری آواز یوں لرز رہی تھی جیسے کسی زخم سے مس ہو کر نکل رہی ہو۔ آبی نے میرے گلوگیر لہجے پر حیرت زدہ ہو کر زقند بھری اور بجلی ایسی سرعت سے میرے پاس آ پہنچا۔

"یہ... یہ کیا ہو گیا ہے اسے۔" اس نے سروری کی کلائی ہاتھ میں لے کر اس کی نبض ٹٹولی اور پھر ہکا بکا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ سروری کی کلائی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے بے جان سینے پر دھپ سے گر گئی تھی۔

"یہ... یہ تو مر گئی ہے جیلانی۔ یہ کیا ہو گیا میرے یار! یہ تو ہمارا مقصد ہرگز نہیں تھا۔"

"ہاں یہ مر گئی ہے اپنے ہی خنجر سے ہلاک ہو گئی ہے۔"

"مگر یہ... یہ سب ہوا کیسے میرے بھائی؟"

"ایسے دغاباز امیروں کے خزانے سیف کی ایسی ہی خوفناک چیزوں کی پناہ میں ہوتے ہیں آبی! یہ اپنے ہی ہتھیار سے ماری گئی ہے۔"

"مگر اب... اب کیا ہو گا میرے بھائی۔ اس کو ہم کہاں چھپائیں گے؟" آبی نے ڈوبتے ڈولتے لہجے میں کہا۔

"اس کی فکر نہ کر۔ اس کا بندوبست ہم کر ہی لیں گے۔ چل اس آہو کے ہاتھ پاؤں باندھ دے، وہ سالا ہوش میں آ رہا ہو گا۔ اس کا ٹائم پورا ہو گیا ہے اب۔"

"کوئی ٹائم بیس فٹ کر دیا ہے تو نے اس کے اندر۔ تیری کئی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی ہیں جیلانی۔" وہ بڑے بجھے دل سے اٹھتے ہوئے بولا۔

میں بھی اس کے ساتھ ہی ہال کمرے میں جا پہنچا۔ آہو کے سانس کی آمد و رفت ٹھیک تھی۔ ہم دونوں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور پھر اٹھا کر اسے دوبارہ پلنگ پر لٹا کر اس کے اوپر لحاف ڈال دیا۔ وہ ابھی تک بے سدھ پڑا تھا۔

آبی کی حیرت ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی بولا۔ "یار! یہ ایسی خوفناک گیس بھر رکھی تھی اس نے اس شیشی میں۔"

"ہاں! یہ لے وہ رقم جو اس نے مجھے سیف سے نکال کر دی تھی۔" میں نے کوٹ کی جیب سے رومال میں بندھے نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ اس نے رومال کھولا اور نوٹ گننے لگا۔

"یہ پورے اسی ہزار ہیں مگر یہ تم مجھے کیوں دیتے ہو۔ رکھو اپنے پاس۔"

"نہیں مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے گھر میں چلو چیزیں خرید کر ڈال دے آبی۔ مجھے وہ تیرے ایسا ویران لگتا ہے۔"

"نہیں یار! میں ٹھیک ہوں مجھے وہ درویشی ہی اچھی لگتی ہے۔ یہ دھوم دھڑکا سب بیکار ہے۔ لے یہ تو رکھ لے۔" اس نے وہ پوٹلی میری طرف اچھال دی۔ نوٹوں سے اس کی اس قدر بے رغبتی میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں نے بہرحال کسی مناسب وقت پر وہ روپے اسے لوٹا دینے کے ارادے سے وہ پوٹلی اپنی جیب میں ڈال لی۔

اب ہمارے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ ہم آہو کو کیا بتائیں گے اسے کس طرح مطمئن کریں گے کہ سروری خانم کی موت میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں ہے وہ تو باؤلا ہو جائے گا یہ سن کر۔ سروری پر تو اس کی ساری زندگی کی تابناکی کا انحصار تھا۔ وہ دونوں اسی کینٹرے کے تھے، اور میں نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے صلاح مشورے سے ہی تمام اقدامات کرتے تھے تو یہ میرا خیال ہی نہیں بلکہ پختہ یقین تھا کہ میرا وہ اندازہ بالکل درست تھا مگر اب اس آدھے آہو کو ہم کس طرح راہِ راست پر لائیں گے کہ اس کا نصف حصہ تو موت نے نگل لیا تھا اور وہ بھی ایسے عجیب غریب حالات میں کہ اس سانحہ کی ساری ذمے داری ہم پر آ رہی تھی ہم اپنی بے گناہی کے ثبوت میں کوئی بھی دلیل نہیں دے سکتے تھے آہو تو ہماری قسموں پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔

دیر تک ہم اسی ادھیڑبن میں رہے مگر کوئی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ باقی اور آہو کی مسلسل بے ہوشی پر آبی بدحواس ہونے لگا تھا، تنگ آ کر بولا۔

"یار تو نے کیا کر دیا ہے انہیں، کچھ کھلا دیا ہے کیا؟"

"میں نے کیا کرنا تھا میرے بھائی، بس گدی پر ہاتھ پڑتے ہی یہ بے ہوش ہو گیا تھا یہ آہو اور یہی حال اس باقی کا ہوا۔" دراصل میں اپنے حربے کو آبی سے چھپا لینا چاہتا تھا کیونکہ وہ جس انداز سے

ہیپے ہو گئے اور اس کمتر دین کے سلسلے میں پریشان ہوا تھا اور جس بے پناہ غم و غصے کی حالت میں وہ سارا دن ادھر اپنے دشمن کو تلاش کرتا رہا تھا اس سے میں بہت زیادہ تشویش میں تھا اور اس سے میرا جو تعلق تھا اسے میں ہر حال میں برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ آبی بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ وہ دوستوں کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار رہتا تھا۔ دھونس دھاندلی اور بے ایمانی کے خلاف وہ چٹان کی طرح ڈٹ جاتا تھا۔ آہو کے سلسلے میں اس کی سرگرمی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ بھی کہ اسے روپے پیسے کا قطعاً کوئی لالچ نہیں تھا وہ جو کچھ لوٹتا تھا کوڑیوں کی طرح لوگوں میں بانٹ دیتا تھا۔ یہی بات تھی کہ میں اپنی کسی بات سے اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

سب سے پہلے آہو ہوش میں آیا۔ ہم اس کے سامنے ہی بیٹھے تھے۔ کرسیوں پر وہ لحاف کے نیچے کسمسایا تو میں چونک اٹھا۔ میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس نے کروٹ لی تو لحاف اس کے منہ پر سے اتر گیا۔ اس نے آنکھیں جھپکا جھپکا کر ہمیں دیکھا۔ اس کے ادراک کی سطح پر گرد و پیش کے نقوش ثبت ہونے لگے تو۔ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ اپنے ہاتھ کر کے پیچھے بندھے دیکھ کر اس نے مجھے بڑی فحش گالی دی۔ بولا "میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بدمعاشو میرے یہ ہاتھ کھول دو۔" پھر اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں بھی بندھے ہیں تو اس نے دونوں ٹانگیں اکٹھی اٹھا کر لحاف پرے پھینک دیا۔

"زیادہ شور نہ مچا آہو۔ ابھی تو شاید تجھے بڑے صدمے سہنا پڑیں میرے پیارے آہو۔" آبی نے بڑے مغ بستہ لہجے میں کہا۔

"تم چاہتے کیا ہو آخر؟"

"ہمیں اس آدمی سے ملاؤ جس کے کہنے پر تم نے ہادی علی کو قتل کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے تمہیں رقعہ لکھ دیا تھا۔" اب کی بار وہ شعوری طور پر قدرے تحمل سے بات کر رہا تھا۔

"دیکھیں آہو صاحب! آپ ہمارے دوست ہیں اور آپ سے ہم وہی کچھ مانگ رہے ہیں جس کا آپ نے وعدہ کر رکھا ہے۔"

"ہاں کوئی بدمزگی پیدا کرنے سے بہتر ہے کہ آپ ہم سے تعاون کریں یہ بات آپ کے اختیار میں ہے۔" میں نے آہو کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"بہتر ہو گا کہ آپ اس آدمی سے فون پر ہماری بات کرا دیں۔"

"نہیں ایسی باتیں فون پر نہیں ہو سکتی ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے آبی۔ تم یہ رقعہ لے کر ان صاحب کے پاس چلے جاؤ اور دیکھو کہ وہ کیا کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میرا وہاں تنہا جانا درست نہ ہو گا۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

"ٹھیک ہے میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ تم خود ہی اس سے مل لیتے تو اچھا تھا۔ مگر خیر میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔ پر اس سے ہم دفتر میں نہ ملیں تو اچھا ہو گا۔"

"تو پھر گھر پر مل لیں گے۔ ہم یہاں سے تین بجے اکٹھے چلیں گے اس وقت تک تو وہ گھر جا چکا ہو گا۔" آبی نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"وہ... وہ سروری کہاں ہے۔ وہ مجھے نظر نہیں آ رہی۔" آہو نے پلنگ پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے دونوں پاؤں پلنگ پر سے اتار لیے تھے حالانکہ وہ دونوں بندھے ہوئے تھے۔

"آپ کے لیے شاید یہ کوئی اچھی خبر نہ ہو جناب ہرن لاہوری صاحب کہ آپ کی بیوی مر چکی ہے۔" آبی نے ایک بار پھر بڑے ہی مغ بستہ لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں۔ خدا کے لیے ایسا نہ کہو۔ ورنہ میں... میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ پلنگ سے اترا اور اچھل اچھل کر آبی کی طرف بڑھنے لگا۔ مگر پھر توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دھڑام سے قالین پر گر گیا۔ اب وہ ہذیان بکنے لگا تھا۔ اور ہم دونوں کو بڑی فحش گالیاں دے رہا تھا۔ ساری صورتِ حال ایک دم بدل گئی تھی۔

"اسے لگام دے جیلانی۔ باندھ دے ٹیکا اس کتے کے منہ پر۔ یہ سب گالیاں اس نے پولیس والوں سے سیکھی ہیں۔ دن رات ان کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔"

میں نے الگنی پر لٹکتا سروری کا ایک فاختئی رنگ کا دوپٹہ لیا اور آہو کے منہ پر باندھ دیا۔ اس کی آنکھوں سے جو شعلے سے نکل رہے تھے وہ میں آج تک نہیں بھول سکا ہوں اور پھر وہ شعلے اس کے آنسوؤں نے بجھا دیے۔ وہ رونے لگا تھا۔ اپنی بے بسی پر اور اس کسمپرسی کی حالت پر جس میں اس کی بیوی مر گئی تھی۔ آبی کے اشارے پر میں نے آہو کو بانہوں میں بھر کر اٹھایا تاکہ میں اسے پلنگ پر ڈال دوں مگر وہ مجھ سے اٹھ نہ سکا۔

"یہ بہت وزنی شے ہے جیلانی تجھ سے کیسے اٹھ سکے گا؟ پکڑ اسے ادھر سے۔" یہ کہہ کر اس نے آہو کو ٹانگوں سے پکڑا تو میں نے کندھوں کی طرف ہاتھ ڈال کر اسے پلنگ پر ڈال دیا۔ آہو شدتِ غم سے اب لرزنے لگا تھا۔ کچھ سردی بھی بہت زوروں پر تھی۔ ہم نے اس کو سکون پہنچانے کے لیے اس پر لحاف ڈالا اور پھر بجلی کا ہیٹر اس کے پلنگ کے قریب لا کر جلا دیا تاکہ وہ ٹھٹھرنے سے بچ جائے۔

آبی نے آہستہ آہستہ اسے وہ سارے واقعات بتائے جن کی وجہ سے سروری خانم ہلاک ہوئی تھی۔ وہ سنتا رہا اور روتا رہا۔ منہ سے وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ میں نے دوپٹہ کس کر باندھ رکھا تھا آبی اپنی طرف سے سروری خانم کی موت کا جواز پیش کر کے مطمئن ہو گیا۔

پھر جانے اسے کیا سوجھی وہ تیزی سے اس کمرے میں گھسا جس میں سروری خانم فرش پر ڈھیر ہو رہی تھی۔ اس نے اسے باہوں میں بھر کر اٹھایا اور لا کر آہو کے پہلو میں ڈال دیا۔ آہو نے اسے یوں اپنے قریب دیکھا تو دیوانہ وار اس پر گرنے لگا۔ میں نے ان دونوں پر لحاف ڈال دیا۔ زندگی موت سے ہمکنار ہو گئی تھی۔ آہو کی آنکھوں سے اشکوں کا تار بندھ گیا تھا وہ کبھی سروری خانم کے رخسار چومتا تھا اور کبھی ہونٹ جن کی سرخی موت نے ہمیشہ کے لیے نوچ لی تھی۔

ہم دونوں ان کے پلنگ کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ اور دونوں نے وقت کٹی کے لیے سگریٹ سلگا لیے تھے۔

"یار! یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔ یہ سالا تو صدمے سے ہی مر جائیگا۔"

"نہیں جیلانی! یہ یوں نہیں مر سکتا ہے پیارے۔" اس کے اندر کی میں کو یہ میت فنا کر دے گی۔ پھر یہ ہمارا ہر حکم چپ چاپ مانتا چلا جائے گا۔" آبی نے بڑی معقول بات کی تھی۔ وہ آہو کا نفسیاتی علاج کر رہا تھا۔

"تو اسے کب سے جانتا ہے آبی! تجھے یہ کہاں سے ٹکر گیا تھا؟"

"اس کی صورت پر نہ جا جیلانی! یہ ان لوگوں میں سے ہے جو ماں کی کوکھ سے مجرم بن کر نکلتے ہیں۔" اس کی یہ بات سنتے ہی آہو نے سروری خانم پر سے اپنی توجہ ہٹا کر کچھ ایسی خوفناک نظروں سے آبی کو دیکھا کہ میں سمجھا وہ اسے وہیں بھسم کر دے گا۔ صرف اپنی نظر کی آگ سے اسے بھون ڈالے گا۔ آہو کی سب سے بڑی قوت اس کی نظروں میں مخفی تھی۔ وہ جب کسی چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کر دیتا تھا تو پھر اس کا مخاطب بے سوچے سمجھے اس کے اشاروں پر چلنا شروع کر دیتا تھا۔ آبی نے اس کی ٹکٹکی سے گھبرا کر میرا بازو دبایا اور اٹھ کر ہال کمرے میں جا بیٹھا۔ میں بھی وہاں سے نکلا۔ وہاں بھی دیوار کے ساتھ سوئی گیس کے ہیٹر کے ارد گرد کرسیاں بچھی تھیں۔ آبی نے وہ ہیٹر جلا دیا اور بولا۔

"بیٹھ جا ادھر۔ میں تجھے بتاتا ہوں کہ یہ بدبخت ہے کیا چیز۔"

"معلوم ہوتا ہے تو اسے بہت عرصے سے جانتا ہے۔"

"یہ پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ میں تو ہمیشہ پلاٹ لیکر اسی گھر پہنچا ہوں جہاں پہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ مال موجود ہے۔ میں اس روز ایک بینک کے اندر کھڑا تھا۔ میں کسی ایسے آدمی کی تاک میں تھا جو وہاں سے بڑی رقم نکلوا رہا ہو۔ میرا ایک ساتھی اچھی بھی میرے ساتھ تھا۔ نام تو اس کا افتخار تھا مگر ہم سب اسے اچھی اچھی کہتے تھے۔ بس بگڑ گیا تھا نام اس کا۔ وہ بھی اس دھندے میں میرے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک بہت عمدہ کار تھی جو ہمارے بہت کام آتی تھی۔ اس اچھی نے بڑے معنی خیز انداز سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

"ادھر دیکھو آبی! اس قیامت کو تو دیکھو۔"

میں نے سر گھما کر دوسری طرف نگاہ کی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی حور آسمان سے اتر آئی ہے۔ ایک عورت بے تحاشا سجی سنوری۔۔۔۔ رقص کے انداز میں تیرتی ہوئی کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ ایک تو یونہی سا تھا شاید نوکر تھا اس کا مگر دوسرا آدمی بارعب اور باعزت نظر آتا تھا۔

"یہ کون ہے اچھی؟"

"ابے اسے نہیں جانتا۔ یہ فلم ایکٹریس سلمیٰ ہے۔"

"اوئے تیرا بیڑہ غرق! یار ایسی خوبصورت چیز ہے یہ۔ اور یہ آدمی کون ہے اس کے ساتھ؟" میں نے کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"یہ اس کا شوہر فارابی ہے۔"

میں نے اس چیک پر نگاہ ڈالی جو وہ کاؤنٹر پر بیٹھے کلرک کو دے رہی تھی۔ اچھی نے بھی وہ چیک دیکھ لیا۔ مجھے پیچھے گھسیٹتے ہوئے دبی آواز میں بولا۔ "یہ ہے وہ اللہ کی نیک بندی جس کا ہمیں انتظار تھا۔"

"ہاں یار! تو چل ادھر گاڑی میں بیٹھ۔ میں اس کا بندوبست کرتا ہوں۔"

سلمیٰ کو ایک خلقت پہچانتی تھی۔ اس کی آمد پر بینک میں عجیب سی افراتفری مچ گئی تھی۔ ہر شخص اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ یار لوگ اپنا کام دھندا بھول کر بس اسی کے دیدار میں محو ہو گئے تھے۔ بینک کا منیجر اسے دیکھ کر کاؤنٹر پر آ گیا اور بولا: "میڈم آپ ادھر تشریف لے آئیے روپے وہیں مل جائیں گے آپ کو۔" وہ اسے اصرار کر کے اپنے کیبن میں لے گیا۔ اس کا شوہر اور اس کا نوکر بھی اس کے ساتھ تھے۔ بینک میں اس وقت زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے اس وقت۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں کیونکہ میں دیکھ چکا تھا کہ وہ عورت سب کی نگاہ میں تھی۔ میری جیب میں گولیوں سے لبالب بھرا پستول تو موجود تھا مگر میں کوئی ہنگامہ وہاں کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایسے مال کا فائدہ ہی کیا تھا کہ جس کو اچکنے سے آدمی خود شکنجے میں پھنس جائے۔ میں نے ایسی حماقت کبھی نہیں کی۔

میں کاؤنٹر سے ہٹ کر سرکتا ہوا اندر منیجر کے کیبن تک جا پہنچا۔ وہ کیبن لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس میں جابجا شیشے لگے ہوئے تھے۔ منیجر اس اداکارہ کے سامنے بس بچھا جا رہا تھا۔۔۔۔۔۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سالا اپنی نئی دلہن کے سامنے بیٹھا ہو۔ ڈھیر سارے بسکٹ ڈبے سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے تھے۔ چائے بھی اس نے فوراً ہی منگوا لی تھی۔ فارابی اور اس کے نوکر کو وہ یوں سگریٹ پیش کر رہا تھا جیسے وہ ان کا ادنیٰ غلام ہو۔ اس پر اس وقت جو کیفیت طاری تھی! میں اسے بیان نہیں کر سکتا ہوں جیلانی! میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کا بس چلتا نا تو وہ اس سلمیٰ کو لے کر اسی وقت کہیں چلا جاتا۔"

"آخر اتنے روپے کی آپ کو اچانک کیسے ضرورت پڑ گئی؟"

"میں نے دراصل ایک اپنی فلم شروع کی ہے کل کچھ لوگوں کو پے منٹ کرنی ہوگی نا۔ اس لیے۔ چیک وہ نہیں لیتے ہیں۔ ادھر انکم ٹیکس کا چکر ہے۔"

"اس میں ہیروئن تو آپ ہی ہوں گی نا؟"

"جی ہاں، سنٹرل رول میرا ہی ہوگا۔"

"واہ واہ کیا بات ہے آپ کی۔ میں تو آپ کی ہر فلم دس دس بار دیکھتا ہوں میڈم۔ اداکاری بس آپ پر ختم ہے۔ کیا بات ہے آپ کی۔ یہ لیں یہ بسکٹ کھائیں نا۔"

"جی بڑی مہربانی ہے آپ کی۔"

"کیا نام رکھا ہے آپ نے اپنی فلم کا؟"

"خزاں کا گیت۔"

"ہاں یار اس فلم کے اشتہار تو میں نے بھی دیکھے تھے مگر وہ فلم کہیں لگی نہیں۔"

آبی کی اس بات پر اس فلم کا اشتہار میرے ذہن میں بھی ابھر آیا تھا جو میں نے بہت عرصہ ہوا کئی فلمی رسالوں میں بار بار دیکھا تھا۔

"ہاں وہی فلم مگر وہ بن نہیں سکی تھی۔"

فلم کا نام سن کر منیجر بلند آواز سے بولا۔

"واہ صاحب واہ کیسا خوبصورت نام رکھا ہے آپ نے 'خزاں کا گیت'۔ بہت سپرہٹ فلم بنے گی جناب۔"

وہ منیجر اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں پیے جا رہا تھا۔ بالکل فنا ہو گیا تھا وہ اس گلبدن کی صورت دیکھ کر۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے سلمیٰ کو دو لاکھ روپیہ گنوا دیا۔ سلمیٰ نے وہ پیسہ اپنے بریف کیس میں بند کیا اور دلوں پر دھپ دھپ ایڑی رکھتی ہوئی وہ بینک سے باہر نکل گئی۔ فارابی میری توقع کے برعکس اس کے ساتھ نہیں بیٹھا بلکہ ایک ٹیکسی لے کر دوسری طرف نکل گیا۔

اس میڈم نے پچھلی سیٹ سنبھالی وہ بریف کیس بغل میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ دوسرا آدمی جو ان کے ساتھ تھا وہ اس کا شوفر نکلا۔ اس نے سٹیرنگ سنبھالا اور کار لے کر چل دیا۔ ہم بھی ان کے پیچھے لگ گئے۔ میڈم کی کار مال روڈ پر جا رہی تھی۔ نہر کے پل پر

پہنچ کر وہ بائیں ہاتھ مڑے۔ اب ان کا رخ گلبرگ کی طرف تھا۔ ابھی نے کار کی رفتار تیز کی اور بائیں ہاتھ سے میڈم کی گاڑی سے آگے نکلتے ہوئے کچھ اس طرح اسے سائڈ ماری کہ کار لڑکھڑا کر دائیں ہاتھ باڑھ میں جا گھسی۔ میڈم کا ڈرائیور کوئی بہت ہی احمق آدمی تھا۔ اس سے وہ ذرا سی ضرب بھی برداشت نہ ہو سکی۔ اور وہ کار کو باڑھ میں گھسنے کے باوجود بھی سنبھال نہ سکا، اور آگے نکل گیا۔ یہ صورت حال دیکھتے ہی مجھے ابھی نے گاڑی سے اتار دیا۔ میں نے جیب میں رکھے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کی اور میڈم کی کار کے پیچھے بھاگا۔ ڈرائیور نے گاڑی کھیت میں گھسنے سے پہلے ہی روک لی تھی۔ میں جب وہاں پہنچا تو میڈم بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں نے وہاں پہنچتے ہی دروازہ بہت زور سے بند کیا مگر یوں کہ اس کی خوبصورت کلائی دروازے میں پھنس گئی اس طرح کہ اس کی طلائی چوڑیاں اور نازک سی گھڑی دروازے کی ضرب سے بُری طرح کچلی گئیں۔ میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں لے کر اونچا اٹھانے کے بجائے اس کی گود میں رکھا اور ایک خوفناک جھٹکے سے بریف کیس اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ یہ صورتحال دیکھتے ہی وہ شور مچانے لگی۔ میں نے دروازہ کھول کر اسے باہر کھینچا اور تڑاخ تڑاخ چار زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارے۔ وہ سب کچھ اس کے لیے اتنا غیر متوقع تھا جیلانی بھائی کہ وہ اُلٹ کر گاڑی کے کھلے دروازے کے ساتھ جھول گئی — مگر اس عرصے میں اس کا ڈرائیور ایک لوہے کی سلاخ لے کر مجھ تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے تیور بڑے ہی خوفناک تھے۔ میں چاہتا تو اسے گولی مار سکتا تھا مگر میں نے خواہ مخواہ لوگوں کو گولی کی آواز سے اپنی طرف متوجہ کرانے کے بجائے بریف کیس کو اپنی ڈھال بنا لیا۔ وہ برچھی کی طرح اپنی اس نوکدار سلاخ کو مجھ پر آزما رہا تھا۔ دو بار اس نے مجھ پر کچھ اس طرح دونوں ہاتھوں میں تول کر وہ چار فٹ لمبی سلاخ ماری کہ اگر میں بریف کیس آگے نہ کر دیتا تو وہ سلاخ سیدھی میرے سینے میں اُتر جاتی۔ تیسری بار جب وہ مجھ پر حملہ کرنے کے لیے پیچھے ہٹا تو میں نے پستول نکال لیا۔ یقین کرو جیلانی بھائی پستول کی صورت دیکھ کر اس کا رنگ ہلدی ہو گیا اور وہ سلاخ وہیں پھینک کر سیدھا کھیت میں جا گھسا۔

"ٹھہر جا" میں نے چار قدم اس کے پیچھے بھاگ کر اس کی طرف یہ موٹی سی گالی لڑھکا دی۔ میری آواز سن کر وہ ایسا بدحواس ہوا کہ دھڑام سے منہ کے بل گر گیا۔ اس سے جان چھڑانے کے لیے میں نے سلاخ اٹھائی اور اس کے اوپر پہنچ کر میں نے وہ سلاخ لاٹھی کی طرح اس کے سر پر دے ماری۔ وہ ضرب میں نے اچھی طرح ناپ تول کر لگائی تھی۔ میں اشد ضرورت کے بغیر کسی کو قتل نہیں کرتا ہوں جیلانی — یہ میرا اصول ہے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بے ہوش ہو چکا ہے تو میں وہاں سے پلٹا۔ ابھی میرا منتظر تھا۔ مگر اس طرح کہ اس کے پیچھے ایک کار کھڑی تھی اس کار کا رنگ ٹماٹر ایسا سرخ تھا۔ میں نے بینک کے سامنے میڈم کی کار سے ذرا فاصلے پر دیکھا تھا۔ ابھی پر میری نظر پڑی تو میں حیران رہ گیا۔ اس کا رنگ اُترا ہوا تھا اور بے بسی اس کے چہرے پر عیاں تھی۔ اس کے ساتھ کی سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا تھا اور اس نے پستول ابھی کی پسلی سے لگا رکھا تھا۔ ابھی میں کچھ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ آدمی بولا۔

"یہ لوٹ کا مال مبارک ہو میرے بھائی مگر آدھا حصہ میرا ہو گا۔ ایک لاکھ مجھے گن کر دے دو تو میں خوش میرا خدا خوش، ورنہ تم جانتے ہو کیا ہو گا اور ہاں اپنا پستول بھی ادھر کر دو۔" وہ اتنے دبنگ لہجے میں بات کر رہا تھا کہ میں بھی حیران رہ گیا۔"

"وہ آدمی کون تھا یار۔ وہ اللہ کا نیک بندہ، وہ درویش کون تھا؟"

"وہ بھی تھا یار! یہ کُتّے کا پُتر، یہ آہو۔"

"اچھا؟ کمال ہے ایسا بیر کاریگر آدمی ہے یہ۔" میں حیران رہ گیا۔

"ہاں۔ اس نے تو ہمیں گردن سے پکڑ لیا تھا۔ ابھی مجھے جان سے زیادہ عزیز تھا۔ اور اس کی آنکھیں یہ بتا رہی تھیں کہ وہ مجھ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔ میں نے کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اپنا پستول چپ چاپ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے اسے فوراً پکڑا اور مسکرا دیا۔ بڑا جاندار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کالی شیروانی پہن رکھی تھی اور آنکھوں پر اس نے سیاہ چشمہ چڑھا رکھا تھا۔ چہرے مہرے سے یہ بہت ہی بارعب اور مہذب آدمی معلوم ہوتا تھا۔

میں نے سو سو کے نوٹوں کی دس گڈیاں الگ کر لیں تو یہ بولا۔ "یہ نوٹ رومال میں باندھ دو میرے بھائی۔ بڑی مہربانی ہو گی تمہاری۔" میں نے اس کے حکم کی تعمیل کر دی تو وہ پوٹلی میرے ہاتھ سے اُچک کر بولا۔ "یہ لو یہ میرا پتہ ہے کبھی پولیس شولیس کے چکر میں پڑ جاؤ تو مجھے بتا دینا۔ فون نمبر بھی لکھا ہے اس میں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک وزٹنگ کارڈ میری طرف پھینکا، اور دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اپنا پستول اس نے رومال میں چھپا رکھا تھا اور اس کا رخ اب بھی ابھی کی طرف تھا۔ بڑے محبت بھرے لہجے میں بولا۔ "اب جاؤ اور کم از کم پندرہ دن تک شہر سے دور رہو۔"

"ٹھیک ہے میرے بادشاہ! مگر ہم تجھ سے حساب ضرور لیں گے۔" میں نے سٹپٹاتے ہوئے کہا۔ سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی مگر کسی کو احساس تک نہ ہوا تھا کہ وہاں کیا

ہو گیا ہے۔ میڈم کی گاڑی دائیں ہاتھ گئی۔ جھاڑیوں کی باڑھ کے پیچھے کھڑی تھی اور اس زاویے پر تھی کہ کسی کی نظر اس پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ اس آدمی نے میری وہ دھمکی سُنی تو مسکرا دیا۔

"میں تمہارا انتظار کروں گا۔ تم دونوں کا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اپنی کار میں جا گھسا۔

"یار اس بدمعاش کا مغز توڑ دے آبی، پچھڑے اس کو۔" ابھی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"نہیں! یہ کام کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک لاکھ ہی کافی ہے۔ چل اب گاڑی اسٹارٹ کر۔" میں نے ابھی کو تسلی دی اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور چپ چاپ آگے چل دیا۔ آدمی نے اپنی گاڑی وہیں سے موڑی اور دوسری طرف چلا گیا۔

"یہ تو ہمیں خواہ مخواہ ذلیل کر گیا ہے یار! تم نے اسے رقم دے کے اچھا نہیں کیا ہے آبی۔"

"لعنت بھیج اس قصے پر ابھی اور جلدی نکل چل — وہ میڈم ہوش میں آ گئی تو مصیبت کھڑی کر دے گی۔"

ابھی نے میری یہ بات سُنی تو اس نے خوفزدہ ہو کر گاڑی کی رفتار ایک دم تیز کر دی اور ہم اسی وقت شہر سے باہر نکل کر ہریکے جا پہنچے۔

اگلے چھ دن ہم نے گاؤں میں گزارے۔ میڈم پر ڈاکوؤں کے حملے کی خبریں اگلے دن اخباروں میں شہ سرخیوں سے چھاپی گئیں۔ میڈم کہتی تھی کہ وہ مجرموں کو پہچان سکتی ہے۔ اس کے ڈرائیور فتّن کا بیان تھا کہ وہ بھی ڈاکوؤں کو آسانی سے شناخت کر سکتا ہے۔ شہر میں کہرام مچ گیا تھا۔ فلمی حلقوں میں صفِ ماتم بچھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا ہے اور اس کے پیچھے کوئی سیاسی مقصد کارفرما ہے۔ وہ لوگ حکومت کے خلاف اول فول بکنے لگے تھے۔ میں ہر روز منڈاواں سے اخبار منگوا کر پڑھتا رہا۔

چوتھے دن معلوم ہوا کہ پولیس نے بہت سے آدمیوں کو شبے میں گرفتار کر لیا ہے۔ گرفتار ہونے والے سب کے سب بے گناہ تھے مگر پولیس نے ان میں سے چند ایک پر جب اپنے خاص نسخے استعمال کیے تو کئی ایک نے اپنی جان بچانے کے لیے اعتراف بھی کر لیا کہ ہاں میڈم کو انہوں نے ہی لوٹا تھا۔ اخباروں میں پولیس کی ساری کارروائی بڑی تفصیل سے چھپ رہی تھی۔ میڈم ایسی ایکٹریس تھی کہ ایک دنیا اس کے غم میں برابر کی شریک ہونے کا دعوے کر رہی تھی۔

میڈم نے سب سے بڑا اور احمقانہ دعویٰ یہ کیا تھا کہ ڈاکوؤں نے اس کی عصمت لوٹنے کی بھی کوشش کی تھی مگر جب اس کے ڈرائیور فتّن نے مزاحمت کی تو وہ صرف بریف کیس اٹھا کر بھاگ نکلے۔ میڈم کے اس بیان پر بہت سے سماجی اور سیاسی حلقوں کی طرف سے اس "درندگی" کی سخت مذمت کی گئی۔

پانچویں دن اخباروں کے اس واویلے سے تنگ آ کر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ایک اخباری کانفرنس بلائی جس میں اخبار نویسوں کو اس نے بتایا کہ ملزم گرفتار کیے جا چکے ہیں — انہوں نے اعتراف تو کر لیا ہے مگر ابھی تک رقم برآمد نہیں ہو سکی۔ کیونکہ ان کا یہ کہنا ہے کہ انہوں نے پولیس کے چھاپے سے گھبرا کر رقم سے بھرا بریف کیس نہر میں پھینک دیا تھا مگر نہر سے وہ بریف کیس ابھی تک برآمد نہیں ہو سکا ہے۔ انہوں نے اس بات کی سختی سے تردید کی کہ مجرموں نے میڈم کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ ایس پی نے کہا کہ مجرم ایسی کمینی حرکت کے مرتکب ہرگز نہیں ہوئے کیونکہ وہ تو صرف رقم کے لالچ میں اس پر حملہ آور ہوئے تھے۔"

"تو تو یہ خبریں پڑھ کر خوب ہنستا ہو گا۔"

"ہاں یار اس میڈم سالی نے رسی کا سانپ بنا دیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کے پاس بینک میں کم از کم چالیس لاکھ روپیہ موجود تھا۔ مگر وہ صرف دو لاکھ کے بھر جانے کی وجہ سے چلا رہی تھی۔

ساتویں دن میں ابھی کو اس کے گھر چھوڑنے کے لیے شہر آیا تو شالامار باغ سے ذرا آگے باغبانپورہ چوک میں سے گزرتے ہوئے ہماری بدقسمتی نے ہمیں آ گھیرا۔ ایک راہگیر ابھی کی کار سے ٹکرا گیا۔ حالانکہ اس کی رفتار کچھ اتنی زیادہ نہیں تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ وہ کار سے ٹکرا کر سڑک پر گرا تو اس کے سر پر ایسی چوٹ آئی کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کی ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر لوگوں نے ہماری کار کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ میں تو سمجھا وہ سالے کار کو آگ لگا دیں گے مگر ابھی فوراً ہی گاڑی سے اتر گیا۔ لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ خیریت یہ گزری کہ ہم نے اپنے ہتھیار سیٹ کے نیچے چھپا رکھے تھے کیونکہ چوک میں کھڑے دو سپاہیوں نے ہمیں اس وقت گھیر لیا تھا۔ وہ ہمیں سیدھے تھانے لے گئے۔ اپنے لباس کی وضع قطع سے اس وقت ہم کوئی بہت بڑے جاگیردار نظر آتے تھے۔ میرے سر پر اونچے شملے والی پگڑی بھی تھی اور میں نے سیاہ شیروانی، سفید شلوار اور سنہری طلے دار سبک ملتانی کھسہ پہن رکھا تھا۔ مگر تھانیدار نے کوئی گھاس نہیں ڈالی۔ بہت ذلیل کیا اس نے ہمیں لیکن تہذیب کے دائرے کے اندر رہ کر۔ کیونکہ اسے یہ احساس ضرور تھا کہ ہم کوئی ایسے ویسے آدمی نہیں ہیں۔

ہمارے خلاف وہ خاصا پیچیدہ مقدمہ درج کرنا چاہتا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں اس چکر میں بہت دن خوار ہونا پڑتا۔ اس تھانیدار کا نام رفیع گورایا تھا۔ جب وہ کسی طرح بھی ہمارے خلاف مقدمہ درج کرنے سے باز نہیں آیا تو میں نے اس سے کہا کہ مجھے وہ اپنے دوست کو ٹیلیفون کرنے کی اجازت تو دیدے۔ وہ مان گیا۔ میں نے اسی وقت اس آہو کے بتائے ہوئے نمبر گھمائے تو پیر مجھے گھر پر ہی مل گیا اب سوال یہ تھا کہ میں اس سے اپنا تعارف کس طرح کراؤں۔ گورایا سامنے بیٹھا تھا اور جن حالات میں ہرن کا بچہ ہم سے ملا تھا وہ ایسے تھے کہ ہم اسے اپنا نام بھی نہ بتا سکے تھے۔

جب اس نے فون پر ہیلو کہا تو میں نے بڑی بے تکلفی سے اسے سلام علیک کیا مگر یہ سن کر تمہیں حیرت ہوگی جیلانی کہ وہ آدمی فوراً میری آواز پہچان گیا، بولا۔

"اچھا، اچھا! تم وہی ہو نا وہ ایک لاکھ والے۔ کہو کیسے یاد کیا ہے مجھے، کوئی گڑبڑ ہو تو مجھے بتاؤ۔"

میں تو اس کی ذہانت پر سٹپٹا کر رہ گیا۔ میری سب سے بڑی مشکل اس نے خود ہی آسان کر دی۔

"دیکھیں جناب! ادھر ہماری کار سے ٹکرا کر ایک آدمی شدید زخمی ہو گیا ہے اور اب ہم یہاں باغبانپورہ کے انچارج گورایا صاحب کے رحم و کرم پر ہیں۔"

"ابھی پرچہ کٹا تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں مگر وہ کسی طرح بھی ہمیں چھوڑنے پر تیار نہیں۔"

میری یہ بات سنتے ہی وہ بولا۔

"ذرا فون گورایا صاحب کو دے دو۔"

میں نے اس کے کہنے پر تھانیدار کو ٹیلیفون تھما دیا۔

تھانے دار نے اس کی آواز سنی تو فوراً ہی اس کے چہرے پر خنکی مائند پڑنے لگی۔ بولا۔

"اوہ، میں سمجھا! فکر نہ کریں آہو صاحب! بس اب آپ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں آپ کا خادم ہوں جناب۔ بس وہ ہمارا کام بھی کر ہی دیں۔۔۔۔"

"بس ٹھیک ہے مجھے نہیں پتہ تھا کہ یہ آپ کے آدمی ہیں۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ بس انہیں چھوڑ ہی رہا ہوں۔ بالکل فکر نہ کریں، آہو صاحب۔"

یہ کہہ کر تھانیدار نے فون بند کیا اور بولا۔

"چوہدری صاحب آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا بس اب آپ جائیں۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ اگر آپ اس آدمی کو ہزار پانچسو روپے دے دیں تو میں اس کا منہ بند کر دوں گا۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میں نے دو ہزار روپے کے نئے نئے نوٹ نکال کر تھانیدار کے سامنے ڈال دیئے اور بولا۔

"یہ لیں یہ آپ کے سپاہیوں کے چائے پانی کا خرچ ہے میری طرف سے رکھ لیں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے صاحب۔" تھانیدار نے سارے نوٹ سمیٹتے ہوئے کہا۔

"آپ کی مہربانی کے سامنے اس کی کیا وقعت ہے صاحب، بس اب ہمیں اجازت دیں۔"

تھانیدار نے تمام نوٹ دراز میں ڈالے اور ہمیں رخصت کرنے کے لیے کمرے کے دروازے تک ہمارے ساتھ آیا۔ اس کا سلام کرنا ختم ہو چکا تھا۔ اس کا رویہ یوں بدلا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

ہم اسی وقت تھانے سے نکل کر انہی کے گھر جا پہنچے۔ یہ آہو سے میری پہلی ملاقات تھی جیلانی۔ اس کے بعد تو میرا اس سے باقاعدہ دوستانہ ہو گیا۔ اس نے بڑے بڑے صبر آزما موقعوں پر میری اتنی مدد کی کہ میں خود بھی کبھی کبھی دنگ رہ جاتا تھا حالت اس کی یہ ہے کہ جہاں سے ہوا نہ گزرتی ہو یہ وہاں سے بے دھڑک گزر جاتا ہے۔"

"اسی لیے تو میں نے بھی اس پر اعتبار کر لیا تھا یار۔ اس کے کہنے پر میں نے ہادی علی کو مار دیا مگر اب یہ میرا ہی دشمن ہو گیا ہے۔"

"یہ تم سے ڈر گیا ہے جیلانی۔ ہادی علی کے قتل سے اسے بے حد و حساب فائدہ ہو گا۔ سیاسی بھی اور مالی بھی۔ دونوں ہاتھوں سے یہ دولت کمائے گا مگر تو جو اس کے سامنے رہا تو یہ ہمیشہ بے چین رہے گا۔ اسی لیے اس نے تجھ پر بار بار حملہ کیا ہے۔ یہ اچھا ہے کہ سرور کبری ابھی تک زندہ ہے اس سے ہمیں بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔"

"مگر اب کیا کرنا چاہیے؟"

"بس ہم اس سروری خانم کو آج رات لوہراں میں دفن کر دیں گے۔ اگر یہ آہو ہمارے کام نہیں آیا تو اسے بھی میں ختم کر دوں گا۔"

"مگر ہمارا مسئلہ تو حل نہ ہو گا۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ کوئی نہ کوئی راستہ میں ضرور تلاش کر لوں گا۔ سب سے پہلے تو ہم اس آدمی سے ملیں گے جس کے نام اس نے یہ رقعہ ہمیں دیا ہے۔"

"ہاں اس آدمی کو ضرور آزمانا چاہیے۔ مگر یار! آہو کے پہلو میں سروری کو لٹا کر تو نے اس پر بہت ظلم کیا ہے۔"

"اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔ یہ سالا بالکل سیدھا ہو جائے گا۔"

اچانک ہمیں آہو کی آواز سنائی دی، وہ پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر سروری کو پکار رہا تھا۔

ہم دونوں بھاگ کر اس کے کمرے میں پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ آہو نے اپنے منہ پر بندھا ہوا دوپٹہ اتار لیا تھا اور وہ بری طرح سسک رہا تھا۔ بازو اور ٹانگیں ابھی تک بندھی تھیں پھر بھی وہ سروری پر پوری طرح چھایا ہوا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے سروری سے پرے ہٹایا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سروری کا جسم پہلے جیسا سرد نہیں تھا۔ اس میں حرارت پیدا ہو رہی تھی۔ میں تو خوفزدہ ہو گیا۔ ایسا تو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مردوں کے زندہ ہو جانے کی کہانیاں تو میں نے سنی تھیں مگر اس روز سروری کے مردہ جسم میں نئے سرے سے پیدا ہوتی حرارت نے مجھے ششدر کر دیا تھا۔ میں نے ایک دم پیچھے ہو کر پھٹی پھٹی نظروں سے آبی کو دیکھا۔ وہ آہو کے منہ پر دوپٹہ ایک بار پھر کس کر باندھ چکا تھا۔ اس نے میرے چہرے پر پھیلی بے پناہ حیرت دیکھی تو بولا۔

"کیا ہوا۔ خیر تو ہے۔ تیرا تو رنگ اڑ رہا ہے۔"

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ اس کا جسم گرم ہو رہا ہے۔ دیکھ تو سہی۔"

وہ کوک بھرے کھلونے کی طرح پلٹا اور سروری کی نبض ٹٹولنے لگا۔ پھر اس نے اس کی ناک کے قریب ہاتھ رکھا۔ اس کی نبض کو بائیں ہاتھ سے محسوس کر کے بولا۔

"یہ۔۔۔ یہ تو زندہ ہے یار! اس کا سانس بھی بحال ہو رہا ہے۔ یہ مری تو نہیں ہے۔" اس کی یہ بات سنتے ہی آہو تیزی سے اس کے قریب ہو گیا اور اپنے رخسار اس نے سروری کے رخسار پر رکھ دیئے۔

میں نے ایک بار پھر سروری کی نبضیں دیکھیں، اس کا ماتھا چھوا۔ اس کے بدن میں زندگی پھر سے لہلہانے لگی تھی۔

"اس کا مطلب ہے یار، کوئی مر کر بھی زندہ ہو سکتا ہے۔"

"یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے جیلانی۔ ہو سکتا ہے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ ایسی حالت میں لوگ پورا پورا دن مردوں سے بدتر حالت میں پڑے رہتے ہیں۔ دیکھ تو اس کی نبض درست ہوتی جا رہی ہے۔" آبی نے ایک بار پھر سروری کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔

آہو نے ایک بار پھر سروری کے بالوں میں لگی پن نے ساتھ دوپٹہ پھنسا کر اپنے منہ پر بندھی پٹی اتار لی تھی۔

"یار! اس کتے نے دوپٹہ پھر کھول لیا ہے۔۔۔ اس کا اچھی طرح۔۔۔" میں نے آبی کو ادھر متوجہ کیا۔

عین اسی وقت بڑے دروازے پر دستک ہوئی۔ ٹھک۔ ٹھک۔ کوئی بہت عجلت میں تھا اور تیزی سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں تھام لیا۔ آبی نے مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھا اور بولا۔

"تو ادھر ٹھہر۔ اس دروازے کو باہر سے بند کر کے سیڑھیوں پر کھڑا ہو جا۔ میں دیکھتا ہوں کون آیا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا سیڑھیاں اتر گیا۔ میں نے آہو کے منہ پر ایک بار پھر کس کر دوپٹہ باندھا اور اسے پلنگ سے اتار کر فرش پر ڈال دیا۔ اس کے بعد میں نے سروری کے دونوں ہاتھ اس کی کمر پر باندھ دیئے اور دروازے کو باہر سے بند کر کے سیڑھیوں کے دروازے پر جا ٹھہرا۔

ابھی مجھے وہاں کھڑے دو منٹ ہی ہوئے تھے کہ آبی زینے میں نمودار ہوا مگر وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کوئی برقعہ پوش عورت تھی۔ وہ سیاہ برقعے میں لپٹی ہوئی تھی۔ آبی کے پیچھے دو تین قدم اوپر پہنچی تو اس نے نقاب الٹ دیا۔

مجھ پر تو شادیٔ مرگ ایسی کیفیت طاری ہو گئی۔ میرے سامنے ماجدہ تھی۔ چاندنی رات کی طرح تاریکی میں بھی روشنی پھیلا دینے والی مہربان ماجدہ۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ مجھ سے اس کی نگاہیں ملیں تو وہ آبی کو کاٹتی ہوئی تیزی سے اوپر چڑھی۔ میں بھی کئی زینے پھلانگ کر اس تک جا پہنچا اور جب ہم روبرو ہوتے تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ ثمر بار شاخ کی طرح جھکتی ہوئی میرے سینے سے لگ گئی۔ آبی چپ چاپ اوپر چلا گیا۔

"یہ۔۔۔ یہ میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ میں نے تو سنا تھا آپ گرفتار ہو گئی ہیں۔"

"ہاں، مگر میری ہیڈ مسٹریس نے مجھے ضمانت پر رہا کروا لیا ہے۔"

"یہ تو بہت ہی اچھا ہوا ہے ماجدہ مگر یہاں تک تم کس طرح پہنچیں؟"

"آپ نے یہاں کا پتہ لکھوایا تھا نا وہ مجھے یاد رہ گیا۔ میں نے سوچا میں آہو صاحب سے مل کر آپ کا پتہ معلوم کر لوں گی۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا ہے ماجدہ۔ میں آپ کے لیے بہت پریشان تھا اور۔۔۔ سوچ رہا تھا کہ کل صبح میں کنجاہ ضرور جاؤں گا۔"

"ایسے ہی گولی کھلا رہے ہیں آپ مجھے نیند آور ورنہ میں بھلا آپ کو کہاں یاد رہوں گی۔"

"آئیں اوپر چلتے ہیں۔ میں آپ کو اپنا دل چیر کر دکھا دوں۔ آئیں اوپر۔" یہ کہہ کر میں ماجدہ کو لے کر ہال کمرے میں جا پہنچا۔ آبی کو میں ماجدہ کے بارے میں سب کچھ پہلے ہی بتا چکا تھا۔ اسی لیے وہ اسے بلا جھجک اوپر لے آیا تھا اور وہ کنجاہ سے اس حال میں

آ گئی تھی کہ اس کے ہاتھ میں اپنا پرس بھی نہیں تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ اسے دوبارہ گھر جانے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ ضمانت پر رہا ہوتے ہی وہ لاہور کے لیے روانہ ہو گئی تھی۔

میں نے اُسے بیڈ کے سامنے کرسی پر بٹھایا تو وہ بولی:-

"یہ آپ کے آہو صاحب کہاں ہیں؟ ان کی بیگم کے بارے میں بھی تو آپ نے بتایا تھا، وہ کہاں ہیں؟"

"وہ سب اِدھر ہی ہیں ماجدہ آپ کو ہم ابھی سب کچھ بتا دیں گے پہلے تو آپ اُدھر باورچی خانے میں جا کر ہم سب کے لیے کھانا تیار کریں ہمیں سخت بھوک لگی ہے۔"

آبی سامنے کی کرسی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا بولا۔

"یہ اچھا انتظام کر دیا ہے اللہ نے۔ بھوک سے میرا بھی بُرا حال ہو رہا ہے۔"

ماجدہ نے برقعہ اُتار دیا۔ اس کے پیکر کے وہ دلکش خطوط ایک بار پھر میرے دل و دماغ میں کوڑے برسانے لگے۔ میں اُسے کھینچ کر باورچی خانے میں لے گیا۔

"آپ کو میں بہت یاد کرتا تھا ماجدہ! اچھا ہوا آپ آ گئیں میں بہت اداس رہنے لگا تھا۔"

"میں نے سوچا تھا کہ آپ مل گئے تو آپ کو خوب ماروں گی اچھی طرح سزا دوں گی اس بدمعاشی کی جو آپ میرے ساتھ کر آئے تھے۔"

یہ کہتی ہوئی وہ فریج کی طرف بڑھی۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ گوشت سبزی انڈے مکھن دودھ۔ ڈبل روٹی، پھل — ہر شے آہو نے وہاں جمع کر رکھی تھی۔

جب ماجدہ چولھے پر ہانڈی رکھ چکی تو بولی۔

"وہ مجھے تیسرے ہی دن پکڑ کر لے گئے تھے۔ چوہدری کرامت اور فیروز نے ہوش میں آتے ہی ہسپتال والوں کو بتا دیا تھا کہ ان پر جو کچھ بیتی وہ اس آدمی کی کارستانی ہے جو ماجدہ کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ان کے اس بیان پر پولیس مجھے پکڑ کر لے گئی مگر میں نے کہہ دیا کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ ان کے پاس ثبوت تو کوئی بھی نہیں ہے اس لیے میری ضمانت بھی ہو گئی۔ مگر سارے شہر میں لوگ ہنس رہے ہیں۔ پولیس والے مجھے شناخت کے لیے فیروز کے پاس بھی لے گئے تھے اس کی حالت دیکھنے کے لائق ہے۔"

"وہ تو ہیجڑا بن چکا ہے سالا۔ ساری عمر کے لیے گیا وہ کام سے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں! یہ موٹی موٹی گالیاں دیتا ہے وہ مجھے بھی اور آپ کو بھی۔"

"آپ نے کیا کہا اُس سے؟"

"میں نے کہا کہ میں تو اسے جانتی بھی نہیں۔ پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ میری اس بات پر وہ بہت چیخا چلایا [illegible] نے کہا میں نے تمہیں کبھی دیکھا نہیں ہے۔"

"اچھا کیا۔ بہت اچھا کیا آپ نے ماجدہ۔ تفتیش والے تو پریشان نہیں کرتا تھا آپ کو؟"

"نہیں۔ وہ بھی یہی سمجھتا ہے کہ وہ دونوں جھوٹ کہتے ہیں۔"

"انھوں نے اس قرض کا ذکر تو نہیں کیا جو تمہارے شوہر نے اُن سے لیا تھا؟"

"اس کا ذکر بھی کرتے تھے بدمعاش۔ میں نے کہا کہ وہ جانیں اور میرا شوہر — مجھے کیا پتہ۔ میں تو گھر میں رہتی ہوں۔"

"یہ بہت اچھا ہوا ہے ماجدہ۔ اب اگر مقدمہ بھی چلے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"آپ نے ویسے انہیں اچھا سبق دیا ہے جناب [illegible]"

"آپ کے لیے تو میں سارے شہر کا بھی حشر کر سکتا ہوں ماجدہ۔ آپ نہیں جانتیں کہ میرے دل میں آپ کے لیے کتنی عزت ہے۔ بس اب آپ اچھا سا مزیدار کھانا پکا دیں ہمیں اور دیکھیں یہاں کی صورتِ حال خاصی دگرگوں ہے مگر آپ گھبرائیں ہرگز نہیں۔"

"کیا مطلب؟ یہاں بھی کسی کا آپریشن تو نہیں کر دیا ہے آپ نے؟"

"بات کچھ ایسی ہی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے ماجدہ کو ساری بات بتا دی۔ آبی کا سارا پس منظر بھی میں نے اسے سمجھا دیا [illegible] گاؤں کا سارا قصہ بھی میں نے اس کے گوش گزار کر دیا۔ جب وہ ساری بات سن چکی تو بولی: "اچھا تو اس ہادی علی کو آپ نے راہِ ہدایت دکھائی ہے۔ میں بھی کہوں آپ جیسا پہنچا ہوا بزرگ ادھر کیسے آ نکلا۔"

"اچھا تو آپ ہمیں پہنچا ہوا بزرگ سمجھتی ہیں؟"

"یہ بات تو ہے۔ پتہ ہے اُدھر کیسا چکر چلا ہے سارے بازار بند ہو گئے جلسے ہوئے جلوس نکلے سارے شہر میں افراتفری مچ گئی۔ بڑی ہڑتال ہوئی وہاں وہ کہتے تھے یہ سیاسی قتل ہے۔"

"بات تو یہی تھی مگر اب یہ آہو ہمیں خراب کر رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے میں خود صبح جیل جا کر آپ کی اس سے مل لیتی ہوں وہاں ایک لیڈی کانسٹیبل میری جاننے والی ہے۔ میرے ساتھ پڑھتی رہی ہے وہ۔"

"ہاں آپ بیشک وہاں چلی جائیں ویسے آج ایک آدمی سے ہم ملنے جا رہے ہیں۔ آہو نے اس کے نام ہمیں ایک رقعہ دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ اُدھر ہے ہو آئیں ویسے میں اپنے طور [illegible] سے ضرور ملوں گی۔"

اچانک آبی دروازہ کھول کر باورچی خانے میں آ گیا۔

"میاں! اب اِدھر آواز دے کر آیا کرو۔ سمجھے ہو کہ نہیں وہ پردہ ہے یہ۔ وہ کیا کہتے ہیں، انگریزی میں، ہاں یہ میری گرل فرینڈ ہیں۔"

"تیرے مزے ہیں استاد۔ مگر وہ گشتی ہوش میں آ گئی ہے اور شور مچانے کی خواہش کرتی ہے۔"

"کچھ کھلا دے یار، اس جل ککڑی کو۔ باندھ بھی دیا ہے کہ نہیں؟"

"باندھ تو دیا ہے بھائی مگر وہ دونوں اب تک نرم نہیں ہوئے ہیں۔"

"ہو جائیں گے۔ میں خود ذرا ان دونوں کی کپڑ چھان کروں گا سیدھے ہو جائیں گے وہ۔"

"وہ رقعہ ہے نا تیرے پاس؟"

"ہاں وہ تو میں نے جیب میں رکھ لیا ہے، یہ رہا۔"

"ٹھیک ہے اسے سنبھال کر رکھو۔ وہ آدمی ضرور ہماری مدد کرے گا۔ ٹھیک دس بجے ہم یہاں سے چل دیں گے۔"

"اب تو فکر کی کوئی بات نہیں ہے آبی۔ اب تو سارا معاملہ یہ بھی سنبھال سکتی ہیں۔"

"ہاں! مجھے یقین ہے کہ ہماری یہ بھابھی تم سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔" آبی نے ماجدہ کو پہلی بار غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کا نام آبی ہے ماجدہ۔ اسلم آبی۔ ایسے جگری یار تو خوش نصیبی سے ہی ملتے ہیں۔ بڑا نصیب یاور ہو تو آدمی کو ایسا دوست میسر آتا ہے۔"

"ہاں وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ ننھا سنگھ اینڈ پریم سنگھ آر ون اینڈ دی سیم تھنگ۔"

"اچھا تو یہ بات ہے سنتے ہو آبی ہم دونوں ان کی نظر میں ننھا سنگھ اینڈ پریم سنگھ ہیں۔"

"بہت اونچی شے معلوم ہوتی ہیں تمہاری یہ گرل فرینڈ۔"

یہ کہہ کر آبی باہر نکل گیا۔ وہ بہت کھل کر مسکرا رہا تھا۔ اس کے چہرے ہی سے عیاں تھا کہ اس نے ایسی بےباک عورت زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔

ایک بجے کے قریب ہم کھانے سے فارغ ہو گئے۔ اس عرصے میں بانی بھی ہوش میں آ چکا تھا مگر اس کو ہم نے ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ بھی بڑے صبر و استقامت سے بندھا پڑا رہا۔ اپنے جکڑبند پر اس نے کوئی طبع آزمائی نہیں کی۔ آہو کی بیگم سروری پوری طرح ہوش میں آ چکی تھی۔ اور میں خوش تھا کہ اس نے موت کو شکست دے کر ہماری گردن پر ایک اور خون کا بوجھ نہیں ڈالا تھا۔ ورنہ ہم کیا کر لیتے۔ وہ مر تو گئی ہی تھی۔ اسی حالت میں اٹھا کر ہم رات کو اسے آہو کے لان میں دفن کر دیتے۔ یہی ہم نے طے کر رکھا تھا۔ مگر اب صورتِ حال بالکل بدل گئی تھی، اور اب آہو پہلے کی طرح زیادہ پریشان نہیں تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم دونوں نے آہو کے ٹرنکوں میں سے دو جوڑے کپڑوں کے نکال کر پہن لیے۔ میرا اور آبی کا ڈیل ڈول آہو سے ملتا جلتا تھا۔ اس لیے وہ کپڑے پہن کر ہمیں یہی محسوس ہوا کہ وہ اس نے ہمارے ہی لیے تیار کروائے تھے۔ اس کے پاس آٹھ شیروانیاں تھیں۔ ایک ایک نکال کر ہم نے پہن لیں اور وہ ہمیں سج بھی گئیں۔ میں نے سیاہ اچکن کا انتخاب کیا اور آبی نے فاختئی رنگ پسند کیا۔ اور اس طرح اپنے بدن کے تمام دلدر دُور کر کے رحمان صاحب کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ آبی نے سروری خانم کی ڈریسنگ ٹیبل سے اٹھا کر خوشبو کی آدھی شیشی میرے اوپر انڈیل دی اور آدھی اس نے اپنے کپڑوں میں جذب کر لی۔ اور یوں ہم شہر کے معززین کا حلیہ اپنا کر اور ماجدہ کو ضروری ہدایات دے کر آہو کے گھر سے روانہ ہو گئے۔ آنکھوں پر ہم نے آہو کی سیاہ عینکیں چڑھا لی تھیں اپنی شناخت کو زائل کرنے کے لیے میں نے آبی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنی مونچھیں بھی رگڑ کر صاف کر دی تھیں اور اب میں بالکل نیا آدمی تھا۔ آہو کے بڑے دروازے پر ہم نے تالا ڈال دیا۔ اور پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر رحمان صاحب کی طرف چل دیے۔ ماجدہ کو میں نے سمجھا دیا تھا کہ اگر وہ کوئی خطرہ محسوس کرے تو فوراً پچھلے دروازے سے نکل کر کچی آبادی میں مجیدن کے گھر چلی جائے۔

سروری خانم سے جو نوٹ میں نے لیے تھے وہ اس رقم کے ساتھ جو میرے پاس پہلے سے موجود تھی میں نے ایک بریف کیس میں رکھ لیے تھے۔ میرا پستول بھی بریف کیس میں ہی رکھا تھا۔ آہو کا ٹیلیفون مجھے کاٹ دینا چاہیے تھا مگر یہ بات مجھے اس وقت یاد آئی جب ہم بہت دور نکل چکے تھے۔

رحمن صاحب واقعی بہت بڑے آفیسر تھے۔ وہ نہر کے قریب جی او آر اسٹیٹ میں رہتے تھے۔ ان کی کوٹھی اپنی وسعت اور آرائش و زیبائش کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھی۔ زندگی کی ہر سہولت انھیں وہاں حاصل تھی جب ہم نے ان کے دروازے پر دستک دی تو اس وقت سہ پہر کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔

کوٹھی کے دروازے پر پولیس کا ایک سپاہی متعین تھا اس نے ہم سے ہمارا نام پوچھا تو میں نے کہا۔
"میرا نام ابرار احمد ہے اور ان کا نام سید علی اکبر ہے رحمٰن صاحب سے کہیں کہ ہمیں دل شیر آہو صاحب نے بھیجا ہے۔"
سپاہی اندر گیا تو میں نے آبی سے کہا۔
"بھئی یاد رکھنا تیرا نام علی اکبر ہے اور میرا نام ابرار احمد۔"
"یہ بڑی مصیبت کی بات ہے یار۔ ذرا بھول چوک ہو گئی تو ستیاناس ہو جائے گا مسٹر ابرار احمد۔"
ہاں مائی ڈیئر سید علی اکبر مگر کیا کریں یہ مصیبت تو جھیلنی ہی پڑے گی۔"
سپاہی جلدی سے واپس آ گیا۔ ہمیں رحمٰن صاحب نے شرفِ باریابی عنایت کر دیا تھا۔ سپاہی نے کوٹھی کے اندر لے جا کر ہمیں ایک خوبصورت سے سجے سنورے کمرے میں بٹھا دیا۔ وہ کمرہ برآمدے کے سامنے ہی تھا اور رہائشی کمرے اس کے ساتھ ہی بنے ہوئے تھے۔
کمرے میں خاصا عمدہ قسم کا دبیز قالین بچھا تھا سرخ رنگ کا۔ تینوں دیواروں کے ساتھ بڑے قرینے سے صوفے رکھے تھے جن کے سامنے شیشے سے مزین میزیں دھری تھیں۔ ان میزوں پر اعلیٰ قسم کے سگریٹ ڈبوں میں بند تھے۔ اور ان کے ساتھ سنگِ مرمر کی خوبصورت ایش ٹرے رکھی تھیں۔
وہاں بیٹھے ہمیں ابھی پانچ ہی منٹ گزرے تھے کہ ایک سرخ و سفید رنگ کے صاحب کمرے میں داخل ہوئے قد ان کا چھ فٹ سے بھی اوپر نکل رہا تھا۔ وہ بہت خوبصورت قسم کا گاؤن پہنے ہوئے تھے۔ اور ان کے ہاتھ میں پائپ سلگ رہا تھا۔ وہ بڑے کرّوفر سے آئے اور ہم سے علیک سلیک کے بعد ہمارے پاس ہی صوفے میں دھنس گئے۔ بولے۔
"آہو صاحب خود کیوں نہ آ گئے؟ فون پر بھی بتا دیا ہوتا انہوں نے مجھے۔"
"خود تو وہ نہیں آئے۔ بس یہ رقعہ دیا ہے انھوں نے مجھے۔"
یہ کہہ کر میں نے آہو کا لکھا ہوا رقعہ رحمٰن صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ انھوں نے سرسری نظر سے رقعہ پڑھا مگر پھر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اور ایک بار پھر بڑے غور سے رقعہ پڑھنے لگے۔ چند ہی سطریں تھیں اس میں مگر ان صاحب نے ایک بار نہیں کئی بار وہ رقعہ پڑھا۔ ان کے چہرے سے یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ معمہ حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے اس رویے نے مجھے شش و پنج میں ڈال دیا۔ اس آہو نے تو صاف طور پر لکھا تھا کہ رحمٰن صاحب آپ حاملِ رقعہ کی بہن آسیہ کی رہائی کے سلسلے میں ان کی مدد کریں۔
"ہوں، کیا نام بتایا ہے آپ نے اپنا؟"
"میرا نام ابرار احمد ہے جناب۔"
"اور ان کا؟"
"یہ سید علی اکبر ہیں۔"
"ہوں۔ اس لڑکی سے کیا تعلق ہے آپ کا؟"
"وہ میری بہن ہے۔"
"مگر اس کے بھائی کا نام تو جیلانی ہے؟"
"جی ہاں۔ میں آسیہ کا خالہ زاد بھائی ہوں۔"
میں نے بے دھڑک ہو کر کہا۔ مجھے اپنی شناخت بہرحال مخفی رکھنی چاہیے تھی۔
"جب یہ رقعہ آہو صاحب نے آپ کو لکھ کر دیا تو اس وقت وہ کہاں تھے؟" اس نے بڑا ہی بے ڈھب سوال پوچھا۔
"وہ... وہ اس وقت مال روڈ پر کار میں کہیں جا رہے تھے کہ میں نے انھیں روک لیا۔ انھوں نے وہیں کھڑے کھڑے رقعہ لکھ دیا۔"
میں نے بات بنائی مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بڑا ہی دروں بیں آدمی تھا۔ وہ پولیس کا پرانا گھاگ افسر تھا۔ سامنے مینٹل پیس پر رکھی اور پھر دیواروں پر لگی اس کی تصویروں سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کا زیادہ وقت برسرِ اقتدار پارٹی کے بڑے بڑے رہنماؤں کے ساتھ گزرتا تھا۔ کئی تصویروں میں وہ گورنر کے پہلو بہ پہلو نظر آتا تھا۔
اس نے میرا یہ جواب سُنا تو مسکرایا۔ یوں مسکرایا جیسے اُسے میری بات پر اعتبار نہ آیا ہو۔ اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ کر آبی بولا۔
"صاحب ہم آپ کے پاس بڑی آس لے کر آئے ہیں۔ جیلانی نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے اب آپ بھی اپنا وعدہ پورا کریں اور آسیہ کو رہا کروا دیں۔"
رحمٰن صاحب نے تیزی سے پہلو بدلا۔ بولے
"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ جیلانی نے کون سا وعدہ پورا کیا ہے؟"
"وہی ہادی علی والا قصہ پاک کر دیا تھا اس نے۔ اور وہ سب کچھ میرا خیال ہے آپ ہی کے کہنے پر ہوا تھا۔"
"میں تو اس قصے کو بالکل نہیں جانتا ہوں جناب بہرحال اگر جیلانی خود آتے تو میں اس سے بات کر سکتا ہوں۔"
"ہم آہو صاحب کا رقعہ لے کر آئے ہیں جس میں انھوں نے صاف طور پر لکھا ہے کہ آپ آسیہ کو رہا کروا دیں۔" آبی نے

"وہ تو ٹھیک ہے مگر جیلانی کو خود آنا چاہیے۔ اس کے بغیر میں کچھ نہ کر سکوں گا۔"
"یہ... یہ جیلانی ہی ہے جو آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔ بڑے صاحب! اس نے اپنا نام آپ کو صحیح نہیں بتایا۔"
رحمٰن صاحب نے اس بات پر زبردست قہقہہ مارا، بولے۔
"میں پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ آپ دونوں میں سے ایک غلام جیلانی ہے۔ انھوں نے اپنی صورت اتنی بدل لی ہے کہ میں پہچان ہی نہ سکا۔ بہرحال اب بات ہو سکتی ہے آپ بیٹھیں میں ابھی فون پر معلوم کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔ دروازہ وہ اپنے پیچھے بند کرتے گئے۔
"تم نے اچھا نہیں کیا ہے آبی! مجھے یہ آدمی گھن چکر معلوم ہوتا ہے۔"
"کوئی حرج نہیں ہے جیلانی! ہمارا اور ان لوگوں کا راز ایک ہے۔ تم ان کے لیے بڑی زبردست اہمیت کے آدمی بن چکے ہو۔ تم بڑی آسانی سے ان کا بیڑہ غرق کر سکتے ہو۔"
"وہ کس طرح؟"
"ان کی مخالف پارٹی کے کسی لیڈر کو صرف ٹیلیفون پر اصل بات بتا دینے سے ان کو تباہ کیا جا سکتا ہے۔ ہادی علی کا خون انھیں بہت مہنگا پڑے گا۔"
"مگر اسی وجہ سے تو یہ میری جان کے دشمن بن گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اوپر سے انھیں یہی حکم ملا ہے کہ مجھے ختم کر دیا جائے اگر ایسا نہ ہوتا تو آہو مجھ پر اتنے خطرناک وار نہ کرتا۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو یار۔ مگر اب ہم صحیح آدمی کے پاس آ پہنچے ہیں، یہ آدمی ہمارے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں کر سکتا ہے۔"
"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی، اتنے معمولی کام کے لیے ان کا یہ لیت و لعل بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔"
"مایوسی گناہ ہے بچے۔ ویسے لگتا ہے کہ یہ گھی واقعی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ یہ آدمی بہت چالاک نظر آتا ہے۔" آبی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ میں نے بھی سگریٹ سلگا لیا اور ہم دونوں گہری سوچوں میں ڈوب گئے۔
ابھی پانچ منٹ ہی گزرے تھے رحمٰن صاحب کو کمرے سے باہر گئے ہوئے کہ ایک سپاہی قسم کا نوکر اندر داخل ہوا۔ بولا۔
"آپ کو صاحب نے دوسرے کمرے میں بلایا ہے۔"
ہم دونوں اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیے۔ کمرے سے نکل کر ہم ایک راہداری میں سے گزرے جب چوتھے دروازے پر پہنچے تو وہ ملازم رک گیا بولا۔ "ادھر آ جائیے۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور ہمارے آگے آگے چل دیا۔ اس کمرے میں دو پلنگ بچھے تھے۔ وہ شاید رحمٰن صاحب کی خواب گاہ تھی۔ نوکر ہمیں اس کمرے سے گزار کر اگلے کمرے میں لے گیا۔ وہ کمرہ نسبتاً چھوٹا تھا اور قدرے تاریک بھی۔ ایک کمزور سا بلب وہاں جل رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ چار کرسیاں پڑی تھیں جن کے سامنے ایک میز رکھی تھی۔ دائیں ہاتھ ایک الماری تھی جس میں کتابیں بھری ہوئی تھیں سامنے کی دیوار کے ایک کونے میں ایک نل لگا تھا جس کا پانی ایک بیسن میں سے گزرتا تھا۔ کمرے کا آدھا فرش ایک دری سے ڈھنپا ہوا تھا معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ رحمٰن صاحب کا مطالعے کا کمرہ ہے۔ اس کا ایک دروازہ دوسری طرف کھلتا تھا مگر اس وقت وہ بند تھا۔ روشنی اس کمرے میں صرف روشندان کے ذریعے اندر آ رہی تھی۔
"آپ یہاں بیٹھیں جناب! صاحب ابھی ادھر آتے ہیں۔" نوکر نے ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور خود تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ اس نے بڑے ہموارانہ انداز میں اپنے پیچھے بے آواز بند کیا۔ ابھی ہم کرسیوں پر بیٹھے بھی نہیں تھے کہ ہمیں دروازے پر باہر سے چٹخنی گرنے کی آواز سنائی دی۔ میں تیزی سے اس کے پیچھے لپکا مگر اس وقت تک وہ سپاہی نما نوکر باہر سے چٹخنی لگا کر جا چکا تھا۔ آبی نے میرے چہرے پر پھیلتی پریشانی کو بھانپتے ہوئے کہا۔
"یار گھبرایا نہ کر۔ بیٹھ جا ادھر۔ وہ رحمٰن صاحب ابھی آتے ہی ہوں گے۔ ہمیں کھا نہیں جائیں گے وہ۔"
"تو نہیں سمجھ سکا ہے آبی! ہم ان کے نرغے میں آ گئے ہیں آہو کا وار چل گیا ہے۔" میں نے دوسرا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ بھی باہر سے بند تھا۔ کمرے میں ہوا اور روشنی کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا روشندان مگر وہ بہت بلند تھا اور تنگ اتنا تھا کہ اس میں سے کسی آدمی کا گزر جانا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔ آبی ابھی تک بالکل مطمئن تھا اور ایک عجیب سے احساسِ بے نیازی سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سگریٹ پھونکنے لگا تھا۔ میں بھی اس کے قریب بیٹھ گیا مگر اس طرح کہ میرا سارا وجود مضمحل ہوتا جا رہا تھا۔ دم بدم مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ موت اپنا حلقہ ہمارے گرد تنگ کرتی جا رہی ہے۔ وہ چاروں طرف سے ہمیں گھیر چکے تھے اور اس چھوٹے سے کمرے کی دیواریں مجھے قبر کی طرح لمحہ بہ لمحہ سکڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔
میرا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ رحمٰن صاحب کا کہیں کوئی پتہ نہیں تھا۔ میں نے آبی کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ وہ تیزی سے میری طرف جھکا اور بولا۔
"یار کہیں ہم پھنس تو نہیں گئے ہیں! وہ کہتے کی دم واپس

کیوں نہیں آیا ہے ابھی تک۔

آبی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ بریف کیس اس کے ہاتھ میں تھا ابھی وہ دروازے تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ مجھے چٹخنی گرنے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ مگر اس طرح کہ دو سپاہی بندوقیں تانے اندر گھس رہے تھے۔ آبی کا پستول ابھی تک اس کی شیروانی کے نیچے بند تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ رحمٰن صاحب ہمیں یوں بے بس کر دیں گے۔ میں بھی ابھی تک اتنا آمادہ نہیں ہوا تھا کہ گھبرا کر پستول اپنے بریف کیس سے نکال لیتا۔ مگر ان دو سپاہیوں نے ہمیں ایک دم چت کر کے رکھ دیا۔ انھوں نے آتے ہی ہمیں بندوقوں کی زد میں لے لیا۔ ایک نال کا رخ میرے سینے کی طرف تھا اور دوسری کا آبی کی سمت — ہم دونوں سُن ہو کر کرسیوں میں دھنس گئے۔

"یہ ... یہ کیا قصہ ہے؟ کیا چاہتے ہو تم؟"

"میں بتاتا ہوں پترو! کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔" یہ بات کہتے ہوئے رحمٰن صاحب اندر آ گئے۔ اب کی بار اُن کے ہاتھ میں پستول تھا۔ سیدھے ہاتھ میں اور الٹے ہاتھ میں انہوں نے آہو کا وہ رقعہ پکڑ رکھا تھا جو ہم نے انہیں لا کر دیا تھا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا رحمٰن صاحب! مہمانوں سے یہ سلوک کیا جاتا ہے آپ کے ہاں؟"

"جی ہاں آپ نے آہو صاحب سے جو سلوک کیا ہے وہ بھی آپ کو یاد ہو گا۔"

"وہ ہمارے قابلِ احترام دوست ہیں۔ ہم نے ان کے ساتھ ہمیشہ دوستوں کا سا سلوک کیا ہے۔"

"ہوں، دوست ایسے ہی ہوتے ہیں — آپ نے یہ رقعہ اُن سے جس تشدد کے ذریعے ... لکھوایا ہے اس کی ساری روئیداد اس میں آہو صاحب نے درج کر دی تھی۔"

"کیا فرماتے ہیں آپ رحمٰن صاحب! خدا کے لیے یہ مذاق بند کریں ان سپاہیوں کو یہاں سے ہٹا دیں۔"

"ہٹا دیں گے، ان کو بھی ہٹا دیں گے مگر اس وقت جب آپ ہٹ جائیں گے ..." یہ کہہ کر رحمٰن صاحب نے وہ رقعہ میرے منہ کے سامنے کر دیا۔ بولے —

"میں آہو صاحب کے گھر چار بار فون کر چکا ہوں۔ پہلی بار وہاں سے ایک عورت نے ریسیور اٹھایا مگر اپنا نام اور نمبر نہیں بتایا۔ جب میں نے کہا کہ آہو صاحب کا گھر یہی ہے تو اس نے کہا کہ نہیں یہاں کوئی آہو صاحب نہیں رہتے اور فون بند کر دیا پھر اس نے ریسیور کریڈل سے اتار دیا کیونکہ میں اب تک تین بار فون کر چکا ہوں مگر وہ مصروف مل رہا ہے۔ میں نے ایکسچینج سے بھی پوچھا ہے وہ کہتے ہیں کہ ریسیور کریڈل سے اترا ہوا ہے اب میں نے تھانے والوں سے کہا ہے کہ وہ جا کر معلوم کریں کہ آہو صاحب کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ بہتر یہ ہو گا کہ آپ ہمیں ساری بات خود ہی بتا دیں۔"

"میرا خیال درست نکلا۔ آپ کی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے رحمٰن صاحب آپ کو پاگل خانے ضرور جانا چاہیے — آہو صاحب کے صاف ستھرے رقعے میں بھی آپ کو فریب نظر آتا ہے"

"ہاں جی! یہ لفظ یہ الف جیم لام تے "اجلت" کس بات کی خبر دیتے ہیں۔ آہو صاحب جیسا پڑھا لکھا آدمی عجلت کو اجلت کبھی نہیں لکھ سکتا ہے۔ یہ لفظ موت کی سی حالت کی خبر دیتے ہیں۔ الٹ میں آہو صاحب نے میرے نام جو پیغام بھیجا ہے وہ میں نے پڑھ لیا ہے۔ جب تک آہو صاحب مجھے نہیں مل جاتے میں آپ کو یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔" یہ کہہ کر رحمٰن صاحب رقعہ تہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے باہر نکلنے لگے پستول ابھی تک اُن کے سیدھے ہاتھ میں تھا اور دونوں سپاہی سامنے کی دیوار کے ساتھ ہم پر بندوقیں تانے کھڑے تھے۔

وہ رقعہ جو ہم نے آہو صاحب سے اپنی بہتری کے لیے لکھوایا تھا ہمارے لیے موت کا پیغام بن گیا تھا۔ رحمٰن صاحب باہر نکلے تو وہ سپاہی بندوقوں کا رخ ہماری طرف کیے ہوئے الٹے پاؤں دروازے کی طرف بڑھے۔ دونوں کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے تھے۔ ہم ایک ایک کر کے اپنے سارے پتے ہار چکے تھے۔ ایک سپاہی تو ایسا بدصورت تھا کہ اس کے چہرے پر نحوست برستی نظر آتی تھی میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے پیٹ میں گھونسا مار کر اس کا بوٹیا پھاڑ دوں۔ دوسرا مجھے پشاوری پٹھان نظر آتا تھا۔ دونوں بے حد خونخوار نظر آتے تھے۔ رحمٰن صاحب دروازے کے باہر کھڑے تھے تاکہ وہ سپاہی باہر نکلیں تو وہ اپنے سامنے دروازہ بند کروا دیں۔

اچانک آبی نے فلک شگاف چیخ ماری اور کرسی سمیت دھڑام کر کے نیچے گر گیا۔ دونوں سپاہی شدید ذہنی ابتری میں اس کی طرف بڑھے۔ دونوں اپنا فرض ایک لمحے کے لیے بھول گئے تھے۔ میں نے ایک ثانیے کے ہزارویں حصے میں اٹھ کر دونوں کی بندوقیں یکجا کر کے نالیوں کے قریب سے دبا کر بغل میں لیں، اور اس یوسف ثانی کی گردن مسل دی وہ گرنے لگا تو میں نے دوسرے کی گردن دبا دی۔ دونوں کے ہاتھوں سے بندوقیں چھوٹیں تو میں نے سامنے کھڑے رحمٰن صاحب پر انھیں گرا دیا۔ وہ دھڑام سے ان پر جا پڑے تو انھوں نے سراسیمہ ہو کر گولی چلا دی مگر وہ گولی پتہ نہیں کہاں لگی، اس کی سمت کا اندازہ نہیں ہوا کیونکہ وہ اُن

دونوں کے ساتھ ہی زمین پر جا پڑے تھے۔ میں نے انھیں دوسری گولی کی مہلت نہیں دی۔ دروازے سے نکلتے ہی میں نے پاؤں کی ٹھوکر ان کے اٹھتے ہوئے ہاتھ پر ماری تو پستول ان کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ آبی بریف کیس اٹھا کر میرے پاس آ ٹھہرا تھا اور اپنا پستول اس نے سیدھے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ میں نے لپک کر رحمٰن صاحب کا پستول اٹھا لیا۔ اب ہم دونوں مسلح تھے۔

آبی نے رحمٰن صاحب کو ان کے خوبصورت بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور بولا —

"چل باڈ" "مانے" آگے چل بُترا! تیرا حساب تو ہم باہر جا کر کریں گے۔" یہ کہہ کر اس نے رحمٰن صاحب کے پیٹ میں کچھ اتنے زور سے گھٹنا مارا کہ وہ بیچارے دوہرے ہو گئے۔ مگر آبی نے انہیں نیچے نہیں گرنے دیا۔

اچانک سامنے کا دروازہ کھلا اور دو لڑکیاں تنگ پتلونوں میں ملبوس بڑی افراتفری کے عالم میں اندر آئیں ان کے رنگ اُڑے ہوئے تھے مگر اس زردی میں بھی بلا کا حسن تھا۔

"کیا ہوا۔ کیوں پکڑا ہے تم نے ہمارے ڈیڈی کو؟"

ان کا لب و لہجہ خاصا یورپی معلوم ہوتا تھا۔ اردو وہ یوں بولتی تھیں جیسے انگریزی میں گفتگو کر رہی ہوں۔ میں تو اُن کے صحیح تلفظ کو دہرا بھی نہیں سکتا۔

آبی سخت تپا ہوا تھا۔ اس نے ایک موٹی سی گالی ان کے ڈیڈی کو دی۔ یہ موٹی سی گالی دے کر اس نے رحمٰن صاحب کو ان لڑکیوں کی طرف دھکا دیا۔ بچارے ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں نرم گدوں پر بیٹھ کر عوام پر حکومت کرنے والے رحمٰن صاحب سخت نڈھال ہو چکے تھے۔ کٹے درخت کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گئے۔ حالت ان کی یہ تھی کہ آبی کی مار نے ان کا جوڑ جوڑ ہلا دیا تھا لڑکیاں چیختی ہوئی اُن پر جھکیں تو ہم دونوں کمرے سے نکل کر راہداری سے ہوتے ہوئے لان میں جا پہنچے۔ رحمٰن صاحب کی کوٹھی پر دو ہی مسلح سپاہی موجود تھے وہ دونوں انھوں نے ضائع کر دیے تھے، البتہ وہ سپاہی نما نوکر ابھی بچا ہوا تھا اگر وہ ہمیں مل جاتا تو ہم اس کو بھی کدو کش کر دیتے۔ ہم سخت تپے ہوئے تھے مگر وہ شاید کہیں بھاگ چکا تھا۔ ہو سکتا ہے اسے رحمٰن صاحب نے کسی کام سے باہر بھیج دیا ہو۔ لان میں سے گزر کر ہم کوٹھی کے بڑے گیٹ سے باہر نکلے اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اسی وقت راوی روڈ پہنچے۔ آہو کے مکان سے بہت پیچھے ہم نے گاڑی چھوڑ دی اور صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے اس کے مکان کے پچھلے چھوٹے دروازے کی طرف بڑھے جب ہم تنگ سی گلی میں سے گزر کر وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہمارے بدترین خدشے درست ثابت ہو چکے تھے۔ آہو کے مکان کے عقب کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور ایک کھڑکی میں دو سپاہی نظر آئے وہ ارد گرد کے حالات کا اندازہ لگا رہے تھے۔ آبی کو میں نے کھینچ کر پیچھے ہٹایا۔ وہ ایسا ظالم تھا کہ ان سپاہیوں کو دیکھ کر اور تیزی سے آہو کے مکان کی طرف بڑھنے لگا تھا۔

"ابے بھوندو! وہ دیکھ تیرے سالے کھڑے ہیں اُدھر — انھوں نے تجھے پہچان لیا تو ایک ایک لات کے پیسے کھرے کر لیں گے تجھ سے — جوتے کی نوک پر پوچھیں گے کہ "چن کتھے گزاری آئی رات وے ..."

"بہت بُرا ہوا یار۔ وہ تیری گرل فرینڈ تو خواہ مخواہ ماری گئی۔ وہ تو اسے پکڑ چکے ہوں گے۔"

"تو اس کی فکر نہ کر۔ میں اسے سارے داؤ سمجھا آیا تھا۔ چل آ ادھر۔ دیکھتا ہوں وہ کہاں گئی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے موڑ کر دوسری راہ پر لگا دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم اس بستی سے نکل کر کچی آبادی میں جا پہنچے۔ مائی حاجاں کا گھر میری منزل تھا۔

"یار وہ مردری ... وہ بھی تو زندہ ہو گئی تھی سالی — وہ اگر مر گئی ہوتی تو ایک بات تھی۔"

"وہ تو پولیس کو وہاں دیکھ کر پائینچے سے نکل نکل باہر آتی ہو گی بھائی میاں! بڑا تنتنا ہے اس عورت میں۔ وہ تو مجھے بھی لے ڈوبی تھی۔" میں نے آبی کے ساتھ ریلوے لائن عبور کرتے ہوئے کہا۔ آہو کا گھر بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

میں دعا مانگ رہا تھا کہ ماجدہ ان سشتہ ملوں کے ہاتھ سے بچ کر مجیدن کے گھر پہنچ گئی ہو۔ ماجدہ میری زندگی کے تمام دردیلے حصوں پر نقشین بن جاتی تھی۔ اس کی سلامتی میرے لیے بے حد ضروری تھی۔

"یہ تو اب جا کہاں رہا ہے؟"

"بس چلا آ میرے ساتھ آبی! مجھے افسوس ہے میرے ساتھ آج تجھے بھی خواہ مخواہ خوار ہونا پڑ رہا ہے۔"

"بدھیاں نہ ڈال میرے یار! ذلیل نہ کر مجھے، تیرے جیسا جی دار تو میں نے آج تک نہیں دیکھا ہے جیلانی۔ تو کہے تو میں تیری خاطر آگ میں کود جاؤں۔" آبی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم مائی حاجاں کے دروازے پر جا پہنچے۔ وہ نیا دروازہ تھا جس پر اس نے سبز رنگ پھیر رکھا تھا۔ مکان کی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ مائی حاجاں کو زندگی سے محبت ہو گئی تھی۔ اسے پھر سے جینے کا ڈھنگ آ گیا تھا۔ میں نے دستک دی تو آبی بولا۔

"یہاں کون رہتاہے تیرا؟"

میں نے اسے مجیدن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

"یہاں میری بہن رہتی ہے مجیدن۔" میں نے زور دے کر کہا۔

دوسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ سامنے مجیدن کھڑی تھی۔۔۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مسکرا دی۔ بولی۔

"اوہ بھیا آپ! اندر آجائیں، آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔" اتنے میں مائی جاجاں بھی صحن میں آگئی۔ مجیدن نے ہمارے پیچھے فوراً دروازہ بند کیا تو مائی نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"جی صدقے میرا پتر آیا۔ اری ماجداں، لے اب منہ میٹھا کرا میرا۔"

اس کی آواز سنتے ہی ماجدہ کوٹھری کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ وہ ابھی تک برقعے میں لپٹی تھی۔ بولی۔

"اچھا ہوا آپ آگئے۔ میں تو بڑی مشکل سے بچی ہوں ان موذیوں سے۔"

"یہ میری ماں کا گھر ہے ماجدہ! مجھے معلوم تھا یہاں آپ کو پناہ مل جائے گی۔" میں نے آپی کے ساتھ کوٹھری میں گھستے ہوئے کہا۔ کوٹھری میں اب وہ پہلے ایسی اُپلوں، سرسوں کے تیل اور مٹی کے تیل کی بدبو کے بھبکے نہیں اٹھ رہے تھے۔ وہاں کی فضا بہت صاف تھی۔

ہم دونوں ایک چارپائی پر جا بیٹھے تو ماجدہ۔۔۔۔ اور مجیدن اپنی ماں کے ساتھ سامنے کی چارپائی پر جا بیٹھیں۔۔۔ بچے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ ماجدہ کی نظریں مجھ پر جمی تھیں۔

"آپ وہاں سے کس طرح نکلیں؟"

میری یہ بات سن کر وہ مسکرائی۔ کہنے لگی۔ "پہلے تو مجھے ٹیلیفون نے پریشان کر دیا کوئی آدمی بہت رعب سے پوچھ رہا تھا کہ یہ آہو صاحب کا مکان ہے؟ میں نے کہہ دیا کہ یہ ان کا گھر نہیں ہے۔ پھر دوبارہ فون آیا، وہ میں نے نہیں اٹھایا۔ اس کے بعد میں نے ریسیور اٹھا کر الگ رکھ دیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد پولیس کی گاڑی مجھے دروازے کے سامنے آ ٹھہری میں نے نیچے جا کر ان کو دروازے میں لگے شیشے میں سے دیکھ لیا تھا۔

"اچھا! وہ عدسہ بھی لگا ہے وہاں۔"

"ہاں! اس شیشے میں سے انھیں دیکھتے ہی میں نے۔۔۔ سنبھالا اور آپ کے بتائے ہوئے راستے سے ہو کر میں پچھلے دروازے سے نکلی اور ریلوے لائن کراس کر کے ادھر آ نکلی۔ اماں نے آپ کا نام سنتے ہی مجھے یہاں چھپا لیا تھا۔ میں آپ کی چیزیں ساتھ لے آئی ہوں اس اٹیچی کیس میں رکھ کر۔"

"یہ بہت اچھا کیا ہے آپ نے۔ مجھے یہی امید تھی کہ اماں آپ کے لیے سب کچھ کرے گی۔"

"ہائے بچہ میں تو تم پر اپنی جان بھی وار سکتی ہوں۔ میں تو اکیس تاریخ کا انتظار کر رہی تھی کہ تم اس دن ضرور آؤ گے۔ میں نے مجیدن کے بیاہ کی وہی تاریخ مقرر کی ہے جو تم نے تجویز کی تھی۔"

"تم نے بہت اچھا کیا ہے اماں۔۔۔ میں اکیس تاریخ کو ضرور آؤں گا۔"

"اب کیا کرنا ہے مجھے تو سخت خوف محسوس ہو رہا ہے۔" ماجدہ نے کرگک بھرے لہجے میں کہا۔ وہ بیچاری مجھے ملنے آئی تھی۔ ڈری ہوئی فاختہ کی طرح وہ میری جھولی میں اتری تھی مگر اسے آتے ہی ایسے اندوہناک حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ وہ پہلے ہی مرحلے میں لرز کر رہ گئی تھی۔ میرے خلاف تقدیر کی کلوخ اندازی کسی طرح تھمنے میں ہی نہیں آتی تھی۔۔۔ اب وہ بھی اس کی زد میں آگئی تھی۔ یہی حال آپی کا تھا اور سخت پریشان تھا۔

"کیا خیال ہے آپی ہمیں ابھی یہاں سے نکل چلنا چاہیے۔۔۔ وہ آہو ادھر کا راستہ بھی جانتا ہے۔"

"ہاں جلدی نکل چلو۔ یہاں ٹھہرنا کسی طرح بھی ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے بریف کیس میرے ہاتھ میں تھما کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"کہاں چلے ہو؟"

"مجھے غسل خانہ دکھاؤ۔"

"چل بیٹے میں دکھاتی ہوں۔" یہ کہہ کر جاجاں آپی کے ساتھ صحن میں نکل گئی۔ مجیدن کی آنکھیں چمچما رہی تھیں۔ آپی باہر گیا تو وہ بولی۔

"بھیا آپ اکیس تاریخ کو آئیں گے؟"

"ہاں بہنا! میں ضرور آؤں گا اور اگر نہ آ سکا تو یہ پیسے رکھو میری طرف سے اچھے اچھے کپڑے خرید لینا۔ سمجھنا کہ میں خود موجود ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے بریف کیس کھول کر اس میں سے دو ہزار روپے نکالے اور مجیدن کے ہاتھ پر دھر دیئے۔ اتنے میں مائی جاجاں اندر آگئی۔ اس نے وہ نوٹ دیکھے تو بولی۔

"یہ کیا کر رہے ہو بیٹا۔ پہلے تیرے احسان کوئی کم ہیں، ہم پر۔"

"ہاں یونہی ذلیل کرتی رہو اماں اپنے بیٹے کو۔ یہ تو پانچ ہزار روپیہ تم رکھ لو، میں نہ آیا تو یہ تیرے کام آئے گا۔"

یہ کہہ کر میں نے اسے پانچ ہزار روپے تھما دیے۔ اس نے وہ نوٹ تو لے لیے مگر اس کے چہرے پر زردی سی کھنڈ گئی۔ وہ بے جان سی ہو کر زمین پر بیٹھ گئی بولی۔

"میں تیرا کس منہ سے شکریہ ادا کروں بیٹے، تو نے مجھ بیوہ کے بچوں کو مرنے سے بچا لیا ہے۔ میں تیرے یہ احسان کیسے اتار سکوں گی؟"

"مجھے غصہ نہ دلایا کر اماں ایسی باتیں کر کے۔" میں نے طیش

سے کہا اور بریف کیس بند کر کے گود میں رکھ لیا۔ وہ میرے لہجے کی کاٹ کو محسوس کر کے چپ ہو گئی اور مجیدن کے ہاتھ سے نوٹ لے کر اس نے ساری رقم ٹرنک میں رکھ دی۔ بولی۔

"اُٹھ مجیدن ان کے لیے کھانا تیار کر۔"

"بس اماں بس ہم جا ہی رہے ہیں۔ ہم یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔۔۔ چل بھئی آپی، تو ادھر ہی غٹ ہو کر بیٹھ گیا ہے۔" میں نے آپی کو آواز دی۔ وہ جلدی ہی باہر آگیا۔ مجیدن نے اس کے ہاتھ دھلائے تو وہ تولیے سے انھیں خشک کر کے اندر آگیا۔ بولا۔

"چلو بھئی۔ یہ صیبت تو ٹلی، اب بھاگ نکلو یہاں سے۔ اُدھر وہ آہو بیٹک پیا کر رہا ہو گا۔"

"اٹھیں ماجدہ!" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے چارپائی سے اُٹھا دیا۔

"بھیا یہ ہماری بھابی ہیں نا؟" مجیدن نے پوچھا۔

"شٹ اَپ! یہ تو بھابی سے بھی کہیں اونچی ہیں۔ تمہارے لیے۔۔۔ سمجھ لو تمہارے بھیا کی سب سے بڑی ہمدرد یہی ہیں۔" میں نے مجیدن کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود کھل ہی تو اٹھی تھی۔

"انھیں پھر کسی وقت یہاں ضرور لائیے بھیا۔" وہ ماجدہ کے کندھے پر لٹک سی گئی۔

ماجدہ اس کی باتیں سن کر بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس نے مجیدن کے ہاتھ کندھے پر سے ہٹا دیے اور تیز تیز قدم اُٹھاتی صحن میں جا نکلی۔ اٹیچی کیس اس نے ساتھ لے لیا تھا۔

ہم ان لوگوں سے رخصت ہو کر اسی وقت دوسری طرف چل نکلے تھے۔ بڑی سڑک پر پہنچتے ہی ہمیں ٹیکسی مل گئی اور ہم اس میں سوار ہو گئے۔

"چل بھئی ادھر سے چل ہمیں شیخو پورہ۔"

شیخو پورہ کا نام سنتے ہی ڈرائیور بدکا، بولا۔

"سو روپیہ کرایہ لوں گا جناب! اُدھر سے واپسی پر کوئی سواری نہیں ملتی ہے۔"

"سو ہی نے دیں گے میرے یار۔ پیسہ کیا چیز ہے تیری محبت کے سامنے۔ چل میرے ویر۔" آپی نے اسے تسلی دی۔ ڈرائیور راضی ہو گیا اور شیخو پورہ جانے کے لیے راوی کے نئے پل کی طرف چل دیا۔ آپی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور ماجدہ میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

ہمیں اپنے نئے اقدام کے لیے اطمینان سے بیٹھ کر سوچنے کے لیے کسی موزوں جگہ کی تلاش تھی اور آپی نے وہ جگہ سوچ کر ہی ٹیکسی کا رُخ شیخو پورہ کی طرف پھیر دیا تھا۔

ابھی ہم راوی روڈ عبور نہ کر سکے تھے کہ ماجدہ بولی۔ "جس کام کے لیے آپ پریشان ہو رہے ہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ لاہور میں قیام فرمائیں جناب عالی!" اس کے لہجے کی شوخی عود کر آئی تھی۔

"آپ بجا فرماتی ہیں ملکۂ عالیہ مگر کہاں؟" میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"آپ ادھر چوبرجی کی طرف گاڑی موڑ لیں۔"

"مگر کہاں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر بولی۔

"وہاں میری ایک پرانی سہیلی رہتی ہے اسکول میں پڑھایا کرتی تھی وہ۔ بوڑھی عورت ہے اور بال بچے دار ہے مگر بیوہ ہو چکی ہے۔۔۔ وہاں ہم جب تک چاہیں رہ سکتے ہیں۔ بڑی جگہ ہے اس کے پاس۔"

"ٹھیک ہے، ہم ادھر ہی چلتے ہیں۔ شہر سے باہر جا کر تو ہم کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ ارے بھائی پائلٹ صاحب، جہاز کا رُخ چوبرجی کی طرف موڑ لو۔"

"کیوں؟ ادھر کیا ہے؟" آپی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میرا ایک دوست رہتا ہے وہاں۔ ہم اس کے گھر جا ٹھہریں گے باہر جا کر تو ہم کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ چل بھئی ادھر سے چل چوبرجی کی طرف۔"

ڈرائیور نے آپی کا دوسرا حکم سن کر گاڑی کا رخ چوبرجی کی طرف موڑ لیا۔ ماجدہ ہمارے اس فیصلے پر بہت خوش ہوئی۔

آپی بہت الجھا ہوا تھا۔ بولا

"یار یہ پڑھے لکھے لوگ تو بہت ہی خطرناک ہوتے ہیں اس آہو نے تو مروا دیا تھا ہمیں۔"

"اس نے وہ رقعہ نہیں لکھا تھا بلکہ ہماری موت کا پروانہ لکھ دیا تھا۔"

"اس نے وہ کیا لفظ لکھا تھا؟"

"عجلت، مگر عین کے بجائے اس خبیث نے الف لکھ کر ہمارا بیڑہ غرق کر دیا۔ وہ رحمٰن صاحب بھی بہت تیز نکلے۔۔۔ فوراً پہچان گئے۔"

"میرا تو وہیں دم نکل گیا تھا۔ دیکھا نہیں تھا تم نے؟ رقعہ اس نے کوئی چھ بار پڑھا تھا۔ بس اس لفظ نے اسے ساری بات بتا دی۔"

"آج تو کوئی نذر نیاز دینی پڑے گی اُستاد! اس آہو نے ہمیں زبردست مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔"

"مگر ہم اب جا کہاں رہے ہیں۔ کوئی ڈھنگ کی جگہ ملنی چاہیے

"ہمیں۔ میرا تو دماغ خراب ہو رہا ہے۔" آپی نے ماجدہ کو..... غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں بھائی جان! وہاں ہر طرح کا آرام ملے گا۔"

"آپ کی مہربانی ہے ورنہ آرام نام کی تو ہماری زندگی میں کوئی شے باقی نہیں رہی۔"

میں نے آپی کو آنکھ کے اشارے سے خاموش رہنے کے لیے کہا۔ ڈرائیور ہماری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔

ماجدہ کے بتلائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے ہم چوبرجی کے پیچھے شالامار کالونی میں جا پہنچے۔

ڈرائیور کو فارغ کر کے جب ہم گاڑی سے اترے تو ماجدہ نے اٹیچی کیس فوراً اٹھا لیا جس میں اس نے ہماری چیزیں بند کر رکھی تھیں۔ میری اسٹین گن بھی اسی میں تھی۔ میں نے چاہا کہ وہ اٹیچی کیس میں خود اٹھاؤں مگر ماجدہ نے مجھے منع کر دیا۔ دبی زبان میں وہ بولی۔

"یہ بہت اہم اٹیچی کیس ہے جناب! میں اس کے سلسلے میں اس وقت اپنے آپ پر بھی اعتبار نہیں کر سکتی۔"

"اچھا، کوئی ایٹم بم بند کر رکھا ہے تم نے اس میں؟"

"بس یونہی سمجھ لیں۔ گھر جا کر میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی تو آپ بس دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔" وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

ماجدہ کی سہیلی کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ ٹیکسی سے اتر کر ہم ایک گلی میں گھسے تو ماجدہ ایک ایسے مکان کے سامنے رک گئی، جس کی تعمیر مکمل نہ ہو سکی تھی۔

اس کی سہیلی کا نام حمیدہ تھا۔ دستک دینے پر وہ دروازے پر آئی تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے سامنے ایک مکمل منہدم وجود کھڑا ہے۔ کسی زمانے میں وہ بہت ہی خوبصورت عورت ہوگی مگر اب اس کی شکستگی دیدنی تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسا حزن و ملال طاری تھا کہ میں بس اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ماجدہ کو دیکھ کر..... ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری۔ اس نے اپنی عینک کا زاویہ درست کیا اور بولی۔

"بڑے اچھے وقت پر آئی ہو ماجدہ۔ آؤ اندر آ جاؤ۔ یہ کون ہیں تمہارے ساتھ؟"

"میرے بھائی جان ہیں اور یہ ان کے دوست ہیں۔" ماجدہ نے پہلے آپی کا اور پھر میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

حمیدہ ایک طرف ہٹ گئی تو ہم تینوں اندر داخل ہو گئے وہ ہمیں دائیں ہاتھ کے کمرے میں لے گئی۔ اس کمرے کی ویرانی دیکھ کر میرا دل بجھ سا گیا۔ مفلسی نے ہر شے کو اپنے بے رحم پنجوں میں دبوچ رکھا تھا۔ کمرے کے ایک حصے میں دو جھلنگا سی چارپائیاں پڑی تھیں۔ دائیں ہاتھ چار کرسیاں تھیں مگر ان کا بھی یہ عالم تھا کہ ان پر بس کرسی ہونے کا الزام ہی تھا ورنہ ان پر بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ بائیں ہاتھ کونے میں ایک پرانی وضع کی میز رکھی تھی جس پر کچھ پرانی کتابیں کاپیاں، بچوں کے میلے کپڑے، چائے کی پیالیاں اور ایک [illegible] اور ایک بے رنگ سا گلوب اور اسی قسم کی کئی اور چیزیں رکھی تھیں۔

حمیدہ اپنے گھر کی اس ویرانی پر شرمندہ نظر آتی تھی۔ اس نے چارپائیاں گھسیٹ کر کمرے کے وسط میں کر دیں۔

"تشریف رکھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ......" کہہ کر وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں جا گھسی۔ ادھر سے کسی بچے کے رونے کی آواز ابھری تھی۔ ماجدہ نے ہمارے چہروں پر پھیلے تکدر کو دیکھا تو بولی۔

"یہ بیچاری بہت ہی غریب عورت ہے جیلانی صاحب مگر دل کی بری نہیں ہے آپ ادھر بیٹھیں میں چائے کا انتظام کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے برقعہ اتار کر اپنے اٹیچی کیس پر یوں پھیلا دیا کہ وہ اس میں چھپ گیا۔

"کوئی بات نہیں ماجدہ۔ شاید ہم اس عورت کے کچھ کام آ سکیں۔ بیٹھ جاؤ آپی۔" میں نے اپنا بریف کیس چارپائی پر ڈال دیا۔

آغا میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا وہ بہت پریشان دکھائی دیتا تھا۔

"مفلسی آدمی کو کتنا مجبور کر دیتی ہے جیلانی۔ دیکھنے میں یہ عورت کتنی معزز نظر آتی ہے مگر اس کے گھر کی حالت دیکھو۔ میں سخت حیران ہوں یار۔"

"مجھے بھی یہاں آ کر بہت دکھ ہوا ہے آغا۔ پتہ نہیں یہ مفلسی کا کوڑھ کس کس گھر کو تباہ کر رہا ہے۔"

"یہ کوئی ایک آدمی کا قصہ تو نہیں ہے جیلانی میرے بھائی۔ کروڑوں آدمی اس سورج کے نیچے تباہ حال پھرتے ہیں۔ کس کس کا ذکر کرو گے تم۔ اسی لیے تو میں اپنے گھر میں ایک پائی نہیں رکھتا ہوں جو کچھ بھی ملتا ہے میں بانٹ دیتا ہوں۔ میں... میں کسی آدمی کو یوں ذلیل ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میرا باپ ادھر پھیرے کا کام کرتا تھا۔ اسے دق ہو گئی تھی۔ میں نے اسے بے علاج مرتے دیکھا ہے۔ مجھے ابھی بے بسی اور اپنے باپ کی وہ لہو روتی آنکھیں یاد ہیں۔ وہ خون تھوک تھوک کر مر گیا تھا مگر ہمارے پاس اتنا بھی نہیں تھا کہ اسے کوئی ڈھنگ کی دوا ہی لے دیتے۔ وہ وقت مجھے کبھی نہیں بھولتا ہے۔ وہ بے علاج مر گیا تو میرے گاؤں کا ایک آدمی انور علی مجھ پر چڑھ دوڑا۔ اس سے میرے باپ نے بیٹی کی شادی پر دو ہزار روپے قرض لیے تھے جس کا تقاضا کر رہا تھا۔ میری ماں نے اس کی بہت منت سماجت کی مگر وہ ایسا پتھر دل آدمی تھا کہ کسی طرح بھی اس کی کوئی بات نہیں مان رہا تھا۔ کہتا تھا جب تک اس کا قرض ادا نہیں ہو جاتا وہ میت نہیں اٹھنے دے گا۔ ہمیں بہت ذلیل کیا اس نے جیلانی۔ اور میں باپ کی میت کے پاس

بیٹھا اسے ٹک ٹک دیکھ رہا تھا۔ ماں کی منت سماجت حد سے بڑھی تو وہ اور زیادہ شیر ہو گیا۔ مجھ سے وہ سب کچھ برداشت نہ ہوا۔ تو میں نے اور علی کو وہیں صحن میں گرا لیا۔ بہت طیش... آ گیا تھا مجھے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کا وہیں خاتمہ کر دوں مگر پھر لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکوں گا جیلانی۔ میں نے باپ کو لحد میں اتار تو دیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی تمام ایمانداری اور شرافت بھی قبر میں دفن کر دی۔ دوسری صبح جب میں سو کر اٹھا تو میں بالکل ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ دن گیا اور آج کا آیا پھر میں نے کوئی رات واردات کے بغیر نہیں گزاری — میں نے ہزاروں کو لوٹا ہے اور ہزاروں کو مالا مال کر دیا ہے۔ اب یہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ میں کسی کو یوں تباہ حال دیکھتا ہوں تو میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔" آپی کا لہجہ گلوگیر ہوتا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ گیا تھا۔ اس حمیدہ کے گھر کی حالت نے اس کو بری طرح رلا دیا تھا۔ اتنا درد تھا اس کے دل میں کچلے ہوئے بے بس مجبور لوگوں کے لیے۔ آپی مجھے اس گھڑی کوئی اور ہی آدمی نظر آ رہا تھا۔

اچانک ماجدہ دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی اور بولی۔

"وہ... وہ... حمیدہ باجی کی بڑی بیٹی سخت بیمار ہے۔ اسے ٹائیفائڈ نے بے حال کر رکھا ہے اور اس کا چھوٹا بیٹا بھی بیمار ہے اس کے سارے جسم پر آبلے پڑے ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں کیا بیماری ہے اسے۔" یہ کہتی ہوئی وہ اٹیچی کیس کھولنے لگی۔ جب ہی وہ اتنی پریشان نظر آ رہی تھی۔

آپی نے کہا۔

"ہاں بھائی جان اس بیچاری کے پاس تو زہر کھانے کو بھی پیسہ نہیں ہے۔"

میں نے بریف کیس کھول لیا۔

"آپ مجھ سے یہ پیسے لے جائیں ماجدہ۔"

"نہیں میرے پاس بہت پیسے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا اٹیچی کیس الٹ میں لیا اور پھر بند کر دیا۔ جب وہ میرے سامنے آئی تو اس کے ہاتھ میں سو سو روپے کے بہت سے نوٹ تھے۔

"میں ان دونوں بچوں کو ادھر کسی کلینک میں داخل کرواتی ہوں تاکہ ان کا علاج ہو سکے۔ آپ ایک ٹیکسی لا دیں ادھر۔"

"ہسپتال کیوں نہیں لے جاتی ہیں انھیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں! سرکاری ہسپتال بس ایسے ہی ہوتے ہیں اور انھیں فوری علاج کی ضرورت ہے۔" یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

آپی اٹھا اور ٹیکسی لانے کے لیے باہر نکل گیا۔ میں ماجدہ کے پیچھے دوسرے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک گیارہ بارہ سال کی لڑکی چارپائی پر پڑی ہے۔ اس کی آنکھیں اندر دھنس چکی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں بہت نمایاں تھیں۔ گال پچک چکے تھے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ بہت دنوں سے بخار میں مبتلا ہے۔ اس کے ساتھ دوسری چارپائی پر سات آٹھ سال کا ایک بچہ لیٹا تھا۔ اس کے جسم کے آدھے حصے پر آبلے سے ابھرے نظر آتے تھے جن میں سے پانی رس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس عذاب سے بجھی ہوئی تھیں۔ اس کی بھی حالت بہت ہی خراب ہو رہی تھی۔ لڑکی کی پائنتی حمیدہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور غم سے نڈھال ہو رہی تھی۔

"بہن آپ گھبرائیں نہیں۔ اللہ خیر کرے گا ہم ان کا علاج کرائیں گے۔"

باہر ٹیکسی رکنے کی آواز سنائی دی تو ماجدہ بولی۔

"انہیں ٹیکسی میں ڈال دیں باجی۔ آپ اس چھوٹے بیٹے کو اٹھائیں۔" یہ کہہ کر اس نے لڑکی کو خود اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور باہر نکل گئی۔ حمیدہ نے لڑکے کو اٹھایا اور بڑی خجل سی نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہوئی بولی۔

"مجھے افسوس ہے بھائی جان۔ میں... میں آپ کی کوئی بھی خدمت نہ کر سکی۔"

اس کے لہجے میں ایسی یاسیت گھلی تھی کہ میں کانپ اٹھا۔ اس عورت کو غموں نے چور چور کر رکھا تھا۔ اس کی بینائی بہت کمزور ہو چکی تھی کیونکہ اس کی عینک کے وہ موٹے شیشے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ گریۂ یعقوب میں مبتلا رہی ہے۔ میں نے اس کے سر پر دوپٹہ درست کیا اور اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"آپ کے بھائی آپ کی خدمت کے لیے آ گئے ہیں۔ بہن! آپ فکر نہ کریں ہم آپ کا سارا غم بانٹ لیں گے۔ جائیں ان بچوں کا علاج کرائیں... اللہ بہتر کرے گا۔"

وہ میری یہ بات سن کر بلکنے لگی اور لڑکھڑاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی وہ حالت دیکھ کر میری بھی آنکھیں بہہ نکلیں۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اس عورت نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ دائیں ہاتھ کے کھلے دروازے میں سے مجھے اس کا باورچی خانہ نظر آ رہا تھا اور اس کی ویرانی اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ وہاں عرصے سے چولہا بجھا ہوا ہے۔ بدنصیبی نے خدا جانے کب سے اس گھر میں ڈیرہ جما رکھا تھا۔ ایسا حزن برستا تھا اس گھر کی فضا پر کہ میں سمجھا سورج تاریک ہو چکا ہے۔

آپی ان کے ساتھ ہی چلا گیا۔ میں نے تمام گھر گھوم پھر کر

دیکھ لیا۔ باورچی خانے میں کھانے کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ وہ لوگ تیل کا چولہا استعمال کرتے تھے مگر گھر میں تیل کا ایک قطرہ تک موجود نہیں تھا۔ آٹے کا پیپا بھی خالی تھا اور نمک مرچ نام کی بھی کوئی شے وہاں نہیں تھی۔ گھر میں صرف تین لحاف تھے اور وہ بھی اتنے میلے اور پھٹے ہوئے تھے کہ وہ موسم کی بلاخیز سردی کا کسی طرح مداوا نہ کر سکتے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ وہ عورت کب سے حالات کی اس سنگ باری کی زد میں آئی ہوئی تھی۔ مگر اس کا لب و لہجہ بہت شستہ تھا اور اس کی نشست و برخاست اس بات کی گواہی دیتی تھی کہ وہ ہمیشہ سے ایسی تباہ حال ہرگز نہیں تھی۔

آپی اور ماجدہ کوئی دو گھنٹے بعد واپس آ گئے مگر اس حال میں کہ جب وہ صحن میں داخل ہوئے تو چیزوں سے دونوں ہی بری طرح لدے پھندے تھے۔ وہ اپنے ساتھ آٹا گھی گوشت سبزیاں پھل اور اس قسم کی بہت سی چیزیں لے آئے تھے تاکہ حمیدہ کے باورچی خانے کو آباد کر سکیں۔

"اے یار! یہ تمھاری گرل فرینڈ چولہا چوکا سنبھالے گی۔ کس اجاڑ پنڈی میں لا کر بٹھا دیا ہے اس ماجدہ نے۔" آپی نے اپنا بوجھ زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کبھی کبھی تھوڑی بہت غریب پروری بھی کر لیا کریں بھائی جان!" ماجدہ نے باورچی خانے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ باورچی خانے سے پلٹی تو آپی بولا۔

"مگر یہ لڑکی ہے بہت مالدار۔ بڑے پیسے خرچ کر دیئے ہیں اس نے۔ پیچھے ایک ٹرک بھی کھڑا ہے۔"

"اس میں کیا لائی ہیں یہ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

اتنے میں ایک لڑکا چھ لحافوں کا گٹھا سر پر اٹھائے اندر داخل ہوا۔

"ادھر رکھ دو لڑکے اس کمرے میں۔" ماجدہ نے اسے راستہ دکھایا۔

"یہ پوچھو کیا نہیں لائی ہے یہ — لوہے کی نئی چارپائیاں، فوم کے گدے، لحاف، بستر کی چادریں، دریاں، ایک ڈائننگ سیٹ، چھ کرسیاں، کراکری کا سامان، برتن بھانڈے کوئی ایک چیز لائی ہے یہ؟ دولت لٹا دی ہے آج۔" آپی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"انھوں نے تو کمال کر دیا ہے یار! اتنی دولت کہاں سے آئی ہے ان کے پاس؟"

"مجھے کیا پتہ؟" آپی کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

ماجدہ نے تمام چیزیں کمرے میں رکھوا دیں تو بولی۔

"ادھر آئیں جیلانی صاحب، اب یہ سب کچھ ترتیب سے لگوا دیں، کچھ کام بھی کیا کریں خواہ مخواہ موٹے ہوتے جا رہے ہیں آپ۔"

وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

"بہت بہتر جناب عالی۔ بندہ حاضر ہے۔ مگر وہ حمیدہ صاحبہ کہاں ہیں؟"

"ان کو میں ادھر آصف کلینک میں بٹھا آئی ہوں۔ دونوں بچے وہاں داخل کرا دیئے ہیں میں نے۔ بس دو چار دن میں تندرست ہو جائیں گے وہ۔ اچھا ہوا ہم ادھر آ گئے ورنہ یہ تو سارا گھر ہی تباہ ہو گیا تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جناب ماجد علی خاں صاحب۔ مگر یہ اتنی ساری دولت آپ کو کہاں سے مل گئی ہے حضور پرنور، یہ قصہ کیا ہے آخر؟ کچھ پتہ تو چلے؟"

"یہ ساری باتیں میں بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے یہ چیزیں ادھر ڈھنگ سے رکھ لوں۔"

یہ کہہ کر وہ کام میں جت گئی۔ اس نے دونوں کمروں میں چھ نئے پلنگ بچھا دیئے۔ ان پر نئی چادریں ڈالیں پھر اس نے ڈائننگ ٹیبل ایک جگہ سجائی دوسری طرف اس نے کرسیاں رکھیں اور ان کے سامنے میز لگا دی۔ گھر کی تمام پھٹی پرانی چیزیں اٹھا کر اس نے صحن میں ڈال دیں۔ ایک گھنٹے تک وہ ہم دونوں کو ادھر ادھر بھگاتی رہی۔ شام کو آٹھ بجے جب وہ کام سے فارغ ہوئی تو گھر کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔

ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا کر جب وہ ہمیں کھانا کھلا چکی تو بولی۔

"جیلانی صاحب میں آپ کے دوست آپو صاحب کے سیف پر ہاتھ صاف کر آئی ہوں۔ مجھے ذرا یہ نوٹ گن دیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اٹیچی کیس کھولا اور اس میں سے نکال کر اس نے نوٹوں کی گڈیوں کا ڈھیر میز پر ڈال دیا۔

"یہ اتنے سارے نوٹ! بیڑہ غرق، ان کو لانے کے لیے آپ سے کس نے کہا تھا؟ وہ تو جان سے مار ڈالے گا ہمیں وہ آپو۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"ماجدہ نے بالکل ٹھیک کیا ہے جیلانی۔ سیف کھلا پڑا تھا اس میں سے یہ نوٹ نکال لائی ہے تو کیا برا کیا ہے اس نے۔" آپی خوش ہو کر گڈیاں ایک قطار میں لگانے لگا۔

"گنو تو سہی کتنا روپیہ ہے یہ۔" میں نے ایک گڈی ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"یہ... ایک دو تین چار پانچ چھ سات آٹھ نو دس گیارہ بارہ، ارے یہ تو ایک لاکھ بیس ہزار روپے ہیں۔"

"اور چھ ہزار پانچ سو چالیس روپے میں خرچ کر آئی ہوں۔" ماجدہ نے اپنے پرس میں سے کچھ نوٹ میز پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"اور کتنے نوٹ باقی تھے وہاں؟"

"میں نے صرف ایک ہی خانہ خالی کیا تھا۔ اس میں سے یہ شیشی

بھی ملی ہے مجھے۔ یہ ولایتی سینٹ ہے۔" ماجدہ نے اٹیچی کیس میں سے وہ شیشی نکال کر میز پر رکھی جس کے ساتھ رکھی دوسری شیشی سروری خانم نے مجھ پر ہتھیار کے طور پر استعمال کی تھی۔

"یہ خوشبو کی شیشی نہیں ہے ماجدہ۔ بڑی خطرناک گیس بھری ہے اس میں۔ یہ ایسی گیس ہے جو آدمی کو ہلاک کر کے رکھ دیتی ہے۔"

"اچھا! مگر یہ وہاں کیوں رکھی تھی انھوں نے؟"

"یہ اس مال کی حفاظت کے لیے وہاں رکھی تھی انہوں نے۔ سروری خانم نے اسے مجھ پر استعمال بھی کیا تھا مگر اللہ نے مجھے بچا لیا۔"

"ایسی خطرناک شے ہے تو! میں اسے باہر پھینک دیتی ہوں۔"

"نہیں نہیں اسے محفوظ رکھیں شاید یہ کسی دن ہمارے کام آ جائے۔ ادھر سنبھال کر رکھ دیں اسے۔"

ماجدہ نے میرے کہنے پر اس شیشی کو کپڑے میں لپیٹ کر اٹیچی کیس میں رکھ دیا۔

"اس روپے کا کیا کرنا ہے اب؟" آبی نے پوچھا

"آپ بتائیں کیا کرنا چاہیے اس کا۔" ماجدہ نے نوٹ سمیٹ کر سامنے رکھ لیے۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے یار، ماجدہ نے تو ہمیں ایک اور چکر میں ڈال دیا ہے وہ آہو بہت ناراض ہوگا۔"

"ہاں پیسے کا تو پتہ ہے میرا خیال ہے یہ روپیہ ماجدہ کے پاس ہی رہنا چاہیے۔"

"وہ تو رہے گا ہی۔ مگر یہ کریں گی کیا، کہاں رکھیں گی اسے؟"

"میری مانیں تو مجھے ایک مکان خرید دیں اس پیسے سے ادھر حسن آباد میں۔ میں وہاں اپنا ایک اسکول کھول لوں گی۔" ماجدہ نے اپنا منصوبہ ہمیں بتا دیا۔ وہ شاید اس سلسلے میں مسلسل سوچتی رہی تھی اور اس وقت تک وہ ایک قطعی اور قابلِ عمل نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔

"ٹھیک ہے جناب! ہم کل ہی آپ کو ایک مکان خرید دیتے ہیں۔"

"مگر رجسٹری آپ کے نام ہوگی۔" ماجدہ نے کہا۔

"جی نہیں! مکان آپ کے لیے ہوگا تو رجسٹری بھی آپ ہی کے نام لکھی جائے گی۔ اتنی دریا دلی کی ضرورت نہیں ہے ہمیں۔"

"ہاں ہم تو سیلانی آدمی ہیں ہمارا کیا ہے۔ گھر تو عورت کی ضرورت ہے۔" آبی مسکرایا۔

"ہاں! ہم تو پہاڑوں کی چٹانوں پر بھی بسیرا کر سکتے ہیں۔ ہمارا کیا ہے۔"

"بس ٹھیک ہے کل آپ مجھے کوئی ڈھنگ کا مکان لے دیں۔" ماجدہ خوش ہو گئی۔

"مگر وہ آپ کے شوہر صاحب کا کیا بنے گا۔ وہ کل کو ادھر آ گئے تو کیا جواب دیں گی آپ؟"

"اپنے اس شوہر کو تو میں چھٹی کرا دوں گی۔ اس کا حق ہی کیا ہے اب میرے اوپر۔" ماجدہ نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"بس تو پھر بجوا دو اس کا باجا، ختم کرو اس قصے کو، جیلانی سے نکاح پڑھوا لو۔" آبی نے تجویز پیش کی۔

"میرا ان سے نکاح ہو چکا ہے۔ ہمیں اب کسی مولوی کی ضرورت نہیں ہے کیوں جیلانی صاحب؟"

"جی ہاں جی ہاں! بس یہی میں کہنے والا تھا ماجدہ! یہ بوری کو اٹھا کر چلنے والی بات غلط ہے۔ اپنا سر تو ویسے ہی گروی رکھا ہے پتہ نہیں کب پھٹے پر چڑھ جاؤں۔"

"ہاں یہ تو ہے، ویسے ود آؤٹ ٹکٹ سفر کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ کل کیا کرنا ہے ہمیں۔ یہ آہو تو بھٹک گیا ہے ہمیں۔"

"پھٹے پر چڑھیں آپ کے دشمن! میں کل جیل جا کر آسیہ سے ملاقات کروں گی۔ پھر دیکھیں گے ہم کہ اسے رہائی کیسے دلائی جا سکتی ہے۔"

"آسیہ سے مل لینے میں کوئی حرج نہیں ہے مگر اب یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ہمیں اپنا طریقِ کار بدلنا ہوگا۔" آبی نے کہا۔

"تم ہی کوئی تدبیر سوچو، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔"

"عدالت میں جانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہ کیس ہم دوبارہ نہیں کھلوا سکتے۔ آہو بھی ہمارا ساتھ چھوڑ چکا ہے۔ اب ایک ہی راستہ کھلا رہ گیا ہے۔"

"کون سا راستہ کھلا رہ گیا ہے میرے بھائی؟"

"تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں اس وقت؟"

"میرے پاس یہی کوئی اسی نوے ہزار روپیہ ہوگا۔"

"بس ٹھیک ہے تم ابھی اٹھو میرے ساتھ چلو۔"

"ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی ہے۔ بیس تیس ہزار روپیہ اور ساتھ رکھ لو۔" آبی کرسی پر سے اٹھ بیٹھا۔

"مگر جائیں گے کہاں ہم۔ کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے۔"

"بس تم اٹھ جاؤ۔ بی بی تم جیلانی کو بیس ہزار روپیہ اور دے دو۔"

"یہ لیں۔ بیشک سارا ہی رکھ لیں۔" ماجدہ نے بڑی فراخدلی سے سامنے رکھی نوٹوں کی گڈیاں میری طرف سرکا دیں۔

آبی نے دس دس ہزار کی دو گڈیاں اٹھا کر مجھے دے دیں، بولا۔ "یہ بریف کیس میں رکھ لو اور نکل چلو۔"

میں نے اس کے کہنے کے مطابق مزید بیس ہزار روپیہ بریف کیس میں رکھا اور اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

"دیکھ بی بی! میرا خیال ہے کہ ہم بارہ بجے تک واپس آ جائیں گے اگر کسی وجہ سے ہم نہ آ سکے تو تمھیں ہمیں ہمارا انتظار کرنا ہوگا سمجھیں میرے گاؤں کا نام ہر کیپ ہے یہ ادھر ماناواں کے پاس

ہے۔ اگر ہم نہ آ سکے اور ہمیں کسی اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا تو بھی تم ادھر ہی رہو گی۔ یہ بہت ضروری ہے اپنے گاؤں کا نام تمھیں میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ اگر ہماری کئی دنوں تک کوئی خبر نہ ہے تو تم میری ماں کے پاس ضرور چلی جانا اسے پیسے کی ضرورت ہو تو اسے پانچ دس ہزار روپے دے آنا۔ مگر ٹھکانا تمھارا ہماری واپسی تک یہی ہونا چاہیے۔"

"آپ نے تو مجھے پریشان کر دیا ہے، آخر آپ جا کہاں رہے ہیں؟"

"یہ میں واپسی پر آ کر بتاؤں گا۔ چل بھئی۔" یہ کہہ کر آبی مجھے کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ ماجدہ نے جب ہمارے پیچھے دروازہ بند کیا تو اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ غالباً ہماری سلامتی کی دعا مانگ رہی تھی۔

اپنے پستول ہم دونوں نے شیروانیوں کے نیچے باندھ لیے تھے۔ آبی بہت سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس سمندر میں چھلانگ لگانے جا رہا ہے۔ آسیہ کا چہرہ رہ رہ کر میرے تصور میں ابھر رہا تھا۔ میں اس کے لیے اپنے کسی بھی وعدے کو پورا نہ کر سکا تھا اور اس کی آنکھوں میں یہی سوال مجھے منجمد نظر آتا تھا کہ بھیا تم اب تک بھی کچھ نہیں کر سکے ہو۔ میں کب تک ان سلاخوں کے پیچھے برباد ہوتی رہوں گی۔ تم نے میرے لیے کیا سوچا ہے اور میں اس سے نظریں چرا رہا تھا۔ میں اس کا سامنا کرنے سے قاصر تھا۔ مجھے اب تک سب کچھ میسر آ چکا تھا۔ میں چاہتا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر بڑے آرام چین سے زندگی بسر کر سکتا تھا۔ بہت روپیہ تھا میرے پاس مگر میں سکون سے محروم تھا۔ میری ماں کہیں جا بیٹھی اور میں کہیں۔ میرا اپنا کوئی گھر تھا نہ در۔ پاگل کتے کی طرح میں سمت کا تعین کیے بغیر بھاگا چلا جا رہا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔

آبی نے سڑک پر پہنچ کر ایک ٹیکسی پکڑی اور بولا۔

"چل بھئی ہمیں ادھر جیل روڈ لے چل۔"

یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے ساتھ گھسیٹ کر ٹیکسی کے اندر جا بیٹھا۔

"ادھر کس کے پاس جائیں گے۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔"

"ہم ڈاکٹر مس نفیسہ کے پاس جا رہے ہیں۔ زنانہ جیل کی انچارج ہے وہ۔" آبی نے مجھے دبی آواز میں بتایا۔

"ہاں یہ اچھی تجویز سوچی ہے تم نے۔ آہو بھی کسی ایسے ہی منصوبے پر عمل کرنا چاہتا تھا۔"

"اس سے پہلے وہ میرے دو ساتھیوں کو چھڑا چکا ہے۔ وہ سالے سات سات سال کے لیے اندر ہو گئے تھے۔ مگر وہ ڈاکٹر وہاں سے تبدیل ہو چکا ہے اس کی جگہ یہ نئی ڈاکٹر آئی ہے۔"

"اس سے ہم کس طرح بات کر سکیں گے؟"

"روپے میں بڑی طاقت ہے جیلانی۔ تو دیکھتا رہ میں کیا کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ مجھ سے پرے ہٹ کر بیٹھ گیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ایک آہنی عزم اس کی آنکھوں میں جھلکنے لگا تھا اور اسے دیکھ کر میرا سینہ فخر سے تن رہا تھا۔ وہ میدان کا مردِ آزما تھا۔ اور جس کام کو ہاتھ میں لے لیتا تھا اسے مکمل کیے بغیر پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔

جیل روڈ پر پہنچ کر ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ آبی کو جیل کے افسروں کی رہائش گاہوں کا اچھی طرح علم تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا بائیں ہاتھ کی سڑک پر لے گیا۔ کوٹھی کے سامنے پہنچ کر اس نے دروازے پر لگی نام اور نمبر کی تختی دیکھی۔ بالآخر ہم ڈاکٹر نفیسہ کی کوٹھی کے سامنے جا پہنچے۔ ہمیں کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

اپنے لباس کی تراش خراش سے ہم خاصے معزز آدمی نظر آتے تھے۔ ڈرتا میں اس بات سے تھا کہ وہ ڈاکٹر اگر بدک گئی اور ہم سے روپے کی پٹی اس کی آنکھوں پر نہ بندھ سکی تو سارا معاملہ الٹ ہو سکتا تھا۔ آسیہ کے لیے وہ لوگ اور زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے تھے پھر بھی مجھے اتنا اطمینان ضرور تھا کہ ہم ڈاکٹر سے مل کر ایک نئے امکان کو ٹٹول سکتے تھے۔

آبی نے گھنٹی پر انگلی رکھی اور اسے کئی سیکنڈ تک ٹرن ٹرن بجاتا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک آدمی لان میں سے گزرتا ہوا دروازے تک آیا۔ وہ ڈاکٹر کا ملازم نظر آتا تھا۔ عمر اس کی پینتالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے بڑے مودبانہ لہجے میں ہمارے آنے کا مقصد پوچھا تو آبی بولا۔

"ڈاکٹر صاحب سے کہو کہ ہم جھنگ سے آئے ہیں۔ میرا نام چوہدری اصغر علی ترانڈہ ہے۔ ان سے کہو ہمیں ان سے بہت ضروری کام ہے۔"

ملازم واپس چلا گیا تو میں نے کہا۔

"یہ ترانڈہ کیا شے ہے آبی صاحب؟"

"ابے تو نہیں جانتا۔ ترانڈے کے جاگیردار تو مشہور لوگ ہیں بڑی عزت ہے ان کی ادھر جھنگ ضلع میں۔"

"میرا نام کیا تجویز کیا ہے آپ نے؟"

"تمھارا نام اکبر علی ترانڈہ ہے اور تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔"

"بہت بہتر جناب ترانڈہ صاحب۔"

کچھ ہی دیر بعد ملازم نے واپس آ کر دروازہ کھولا۔ اور ہمیں لان میں گزار کر اندر لے گیا۔ ہمیں ڈاکٹر کے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ بولا۔

"ڈاکٹر صاحب کھانا کھا رہی ہیں ابھی دس منٹ تک آپ انتظار

کرنا پڑے گا۔"

"کوئی بات نہیں، ہم انتظار کرتے ہیں۔" آپی نے کہا۔

اس کا لہجہ کبھی کبھی تو اتنا مہذب اور شستہ ہو جاتا تھا کہ میری حیرت بے حد و حساب بڑھ جاتی تھی حالانکہ اس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ اس کا باپ اُدھر بھٹے پر ٹھیکرے کا کام کرتا تھا اور وہ خود بہاول علی کے کھیتوں میں جتا رہتا تھا۔

"آپ کے لیے کافی لاؤں کہ چائے؟"

"کافی لے آؤ۔ ہمیں کافی زیادہ پسند ہے کیوں ترانڈہ صاحب کیا خیال ہے آپ کا؟"

"کافی بہتر رہے گی جناب۔" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

ملازم باہر نکلا تو میں نے کہا۔

"یار آپی، ایک بات بتا، یہ تو کبھی کبھی ایسی خوبصورت باتیں کرتا ہے کہ میں خود کو تیرے سامنے جاہل تصور کرنے لگتا ہوں، حالانکہ تو نے اسکول کالج تک نہیں دیکھا ہے۔"

"یہ بات تو ہے جیلانی میاں مگر یہ زمانہ سب سے بڑا استاد ہے۔ میں نے اس شہر میں بڑی عمر گزاری ہے یہاں میں نے دو سال تک ایک استاد سے انگریزی اُردو اور حساب کی کتابیں پڑھی تھیں۔ اسے میں نے پچاس ہزار روپے دیئے تھے۔ اس بھلے آدمی نے دو ہی سال میں سارا علم دے دیا۔ پھر تو ایسا ہوا کہ میں نے اس کی باتوں پر عمل کرتے ہوئے بے شمار کتابیں پڑھ ڈالیں، یہ اس کی تعلیم کا فیض ہے کہ اب میں موقع محل کے مطابق ہر قسم کی گفتگو کر لیتا ہوں ورنہ میں نے اسکول میں قدم رکھا ہے نہ کالج میں۔"

"یہ بہت اچھا کیا ہے تو نے۔ پیشہ آدمی کا کچھ بھی ہو، تعلیم بہت ضروری ہے آدمی کو بات کرنے کا تو سلیقہ آنا ہی چاہیے۔"

"اگر میں اس پیشے میں نہ آتا اور باقاعدہ پڑھتا رہتا تو مجھے یقین ہے کہ میں آج کسی یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہوتا۔ میرا حافظہ تیری دعا سے بہت تیز ہے۔" آپی نے بڑے پُرجوش لہجے میں کہا اور پھر سامنے سنگ سی شیشے کی میز پر رکھے ڈبے میں سے نکال کر دو سگریٹ سلگا لیے۔ ایک اس نے مجھے دیا اور بولا۔

"میں تیری بات چیت سے ہی تیرا گرویدہ ہوا تھا جیلانی! تیری زبان میں بڑی مٹھاس ہے پیارے۔ تیرا وار عورتوں پر بھی خوب چلتا ہوگا۔"

میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرا مذاق اڑا رہا ہے مگر وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا ہوں آپی۔ میں نے کبھی اپنی اس خوبی کو آزما کر نہیں دیکھا۔"

"اور وہ ماجدہ، یونہی تو تیری کنیز نہیں بن گئی ہے۔"

"وہ تو پاگل ہے شوہر کی بے نیازی نے اسے اس حال تک پہنچا دیا ہے۔"

"یہ تو ہے مگر یار ہے وہ بہت خوبصورت۔" آپی نے مسکراتے ہوئے کہا

"کہیں اُدھر اُنگلی نہ مار دینا۔ بڑی حساس چیز ہے وہ۔ پلٹ کر ڈستی ہے اور ڈس کر پلٹتی ہے۔" میں نے آپی کو خبردار کیا۔

"فکر نہ کر، میں اس گاڑی کا بیل نہیں ہوں۔" وہ میرے ساتھ صوفے میں دھنس کر بیٹھا تھا اور ہم نہایت ہی دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے تاکہ کوئی اور نہ سن لے۔ ڈاکٹر کا نوکر کافی بنانے کے لیے ایسا گیا کہ اس نے ہمیں دوبارہ اپنی صورت ہی نہیں دکھائی۔

ڈاکٹر نفیسہ دس منٹ کے بجائے کوئی پچیس تیس منٹ بعد کمرے میں آئی۔ مگر اس طرح جیسے کوئی بجلی سی لہرا کر گرد و پیش کو منور کر دے۔ وہ چھریرے بدن کی میانہ قد عورت تھی۔ اس کی عمر کوئی چھتیس سینتیس سال ہوگی۔ ہر قسم کی آرائش و زیبائش کی آلائشوں سے پاک ہونے کے باوجود جب وہ اٹھلا کر چلتی تھی تو دلوں کو دھچکا سا لگتا تھا۔ اس کے بدن پر سادگی نے اور قیامت ڈھا رکھی تھی۔ ہم دونوں کی کیفیت رہی ہوئی۔ آپی بھی اسے دیکھ کر اٹھ گیا اور میں بھی۔ وہ اپنی کٹورا ایسی بڑی بڑی آنکھیں جھپکاتی ہوئی بولی۔

"معاف کیجیے گا چوہدری صاحب مجھے کچھ دیر ہو گئی۔"

"کوئی بات نہیں ڈاکٹر صاحب آپ سے ملنے کی امید پر تو ہم دس دن تک ایک ٹانگ پر بھی کھڑے رہ سکتے ہیں۔" آپی نے کہا۔

"ہاں یہی کیا کم نوازش ہے آپ کی کہ آپ نے ہمیں وقت عنایت فرما دیا ہے۔" میں نے گرہ لگائی۔ وہ مسکرائی اور ہمارے قریب ہی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تشریف رکھیں۔ مجھے افسوس ہے آپ کو ابھی تک کافی نہیں مل سکی۔ دراصل وہ اپنا رضو کافی کا ڈبہ کہیں رکھ کر بھول گیا ہے۔ اب میں نے اسے بازار سے نیا ڈبہ لانے کے لیے بھیجا ہے۔"

"اتنے تکلف کی ضرورت نہیں تھی ڈاکٹر صاحب! ہم مہمان نہیں بلکہ سائل ہیں۔ ادنیٰ سائل۔"

"نہیں صاحب! ایسا ہرگز نہ کہیں! آپ حکم کریں۔"

"حکم نہیں ڈاکٹر صاحب! ہم تو صرف عرض ہی کر سکتے ہیں۔ دراصل ہم ایک بہت ہی اہم کام کے سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔"

"فرمائیے۔ شاید میں آپ کے کچھ کام آ سکوں۔"

"آپ بتائیں نہیں چوہدری صاحب آسیہ کے سلسلے میں انہیں ساری بات بتا دیں کہ وہ اس حال کو کیسے پہنچی۔" آپی نے مجھ سے

مخاطب ہو کر کہا۔ اس کے کہنے کے مطابق میں نے وہ تمام حالات ڈاکٹر نفیسہ کو بتا دیئے جن میں سے گزر کر وہ جیل میں بند ہوئی تھی۔ نفیسہ بڑے اطمینان سے میری باتیں سنتی رہی۔ میں نے اسے یقین دلا دیا کہ آسیہ بالکل بے گناہ ہے اور اسے جو سزا ملی ہے، وہ مبنی بر انصاف نہیں ہے۔"

"آپ کی کیا رشتے داری ہے اس سے؟"

"میں نے عرض کیا تو ہے کہ وہ ہماری چچازاد بہن ہے۔ اس کے والد فوت ہو چکے ہیں اور اب اس کی ساری ذمے داری ہمارے کندھوں پر ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر یہ سب کچھ آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔ مجھ سے کیا چاہتے ہیں آپ؟"

"ہم۔۔ ہم دراصل اس کی رہائی کے سلسلے میں آپ سے مدد کے طلبگار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب۔"

"وہ کس طرح؟ میں کیا کر سکتی ہوں اس سلسلے میں۔"

"دیکھیں ڈاکٹر صاحب ہم آپکو منہ مانگی رقم دے سکتے ہیں بیس ہزار، چالیس ہزار، جتنی بھی رقم آپ کہیں۔ آپ صرف اتنا کریں کہ آپ اسے پاگل قرار دے دیں۔" آپی نے بات کھول دی۔

ڈاکٹر نفیسہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں یوں دیکھنے لگی، جیسے اسے اپنی سماعت پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ چند ثانیے اسی طرح گزر گئے۔ اس کی حیرت کسی طرح بھی کم نہیں ہو رہی تھی

"دیکھیں ڈاکٹر صاحب! آدمی آدمی کا دارو ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی بہن کی رہائی اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ آپ ہم پر یہ نوازش کر دیں۔ اس کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے گی۔ ہم آپ کو منہ مانگی رقم دے دیں گے۔" آپی نے اور زیادہ پُرجوش لہجے میں کہا۔ اور پھر بے اختیار اٹھ کر اس نے ڈاکٹر کے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ گڑگڑا کر بولا۔

"ہماری مدد کریں گے ڈاکٹر صاحب آپ کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔ میں ایسے دو تین آدمیوں کو جانتا ہوں جن کو اسی طرح جیل سے رہائی مل گئی تھی۔" یہ کہہ کر اس نے ڈاکٹر کے پاؤں پر سے ہاتھ اٹھا کر اس کے سامنے یوں جوڑ دیئے جیسے وہ کسی مندر میں رکھی مورتی کو پرنام کر رہا ہو۔

"آپ مجھے ان لوگوں کے نام بتا سکتے ہیں جو اس سے پہلے ڈاکٹروں نے رہا کروا دیئے تھے؟"

"ان کے ناموں کی ضرورت نہیں ہے ڈاکٹر صاحب! ہم کسی کا نام نہیں لیتے۔ آپ صرف ہماری بہن پر رحم کریں۔"

"اگر میں اسے پاگل ڈکلیئر کر دوں تو بھی اسے میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔"

"اس کا بھی آپ بندوبست کر سکتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک ایسی دوا موجود ہے جس کا ٹیکہ لگانے سے آدمی عارضی طور پر پاگل ہو جاتا ہے۔"

"آپ بہت چالاک آدمی نظر آتے ہیں ترانڈہ صاحب! مگر اسکو پاگل ثابت۔۔۔۔ کر دینے کے بعد بھی اس کی رہائی ممکن نہ ہوگی اسے ہم پاگل خانے کے خاص وارڈ میں بھیج دیں گے۔"

"آپ آگے کی فکر نہ کریں ڈاکٹر صاحب۔ وہاں سے ہم خود چھڑوا لیں گے۔"

"غائب کریں گے اسے وہاں سے؟"

"ہو سکتا ہے ہم اسے وہاں سے غائب کروا دیں۔ ایسی صورت میں۔۔۔۔"

"ٹھیک ہے میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں مگر مجھے کیا فائدہ ہوگا اس ڈرامے سے؟"

"ہم آپ کو منہ مانگی رقم دے سکتے ہیں ڈاکٹر صاحب!"

"آپ مجھے پچاس ہزار روپیہ دے دیں تو میں یہ رسک لے سکتی ہوں۔"

میں نے بریف کیس اوٹ میں لے کر کھولا اور پچاس ہزار کے نوٹ نکال کر ڈاکٹر نفیسہ کے سامنے میز پر ڈھیر کر دیئے۔ اس نے گرسنگی کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے انداز سے وہ نوٹ چھوئے اور انہیں اپنی طرف گھسیٹ کر بولی۔

"کتنی رقم ہے یہ؟"

"یہ پورے پچاس ہزار ہیں۔"

آپی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ نوٹ کھینچ کر اپنی طرف کیے اور دس دس ہزار کی دو گڈیاں اس کو دے کر بولا۔

"یہ بیس ہزار روپے آپ ابھی رکھ لیں یہ تیس ہزار ہم آپ کو اس روز دیں گے جس روز میڈیکل بورڈ کی طرف سے آسیہ کو پاگل خانے بھیجنے کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے ترانڈہ صاحب! آپ مجھ سے ٹھیک ایک ہفتے بعد ملیں۔ اسی وقت اسی جگہ۔ میں آپ کو میڈیکل بورڈ کے فیصلے کی نقل دے دوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے بیس ہزار روپے کے نوٹ بھی آپی کی طرف دھکیل دیئے۔

اس کا نوکر رضو کافی کے برتن اٹھائے اندر آ رہا تھا۔ اس نے کافی تین نازک اندام پیالیوں میں بھر کر دی تو ڈاکٹر نفیسہ بولی۔ "یہ رقم آپ رضو کو دے دیں۔"

آپی نے دو گڈیاں اٹھا کر رضو کی طرف بڑھا دیں۔

وہ بولی۔ "رضو یہ روپے رکھ لو۔ میں تم سے بعد میں لے لوں گی۔"

"بہت بہتر بیگم صاحب۔" یہ کہہ کر رضو نے دو گڈیاں

میز پر سے اٹھا میں اور تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

"ہم آپ کا یہ احسان عمر بھر نہیں بھولیں گے ڈاکٹر صاحب ہماری بہن کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائیگی یہ آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا ہم پر۔" آپی نے کہا۔ وہ بہت ممنون نظر آرہا تھا۔

"یہ احسان کہاں ہے یہ تو سودے بازی ہے جناب ترانڈہ صاحب۔"

"آپ کی مہربانی ہے کہ آپ ایسا فرماتی ہیں ورنہ ہم تو بہت زیادہ خوفزدہ تھے۔" آپی نے کہا۔

"کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ ہم آسیہ سے آپکی کوٹھی پر ملاقات کر سکیں۔"

"جی نہیں! میں اس بات کا ذمہ نہیں لے سکتی۔ بس ہفتے دس دن کی بات ہے انتظار کریں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ناکامی نہیں ہوگی۔"

"تو پھر ہمیں اجازت دیں جناب ہم آج سے ٹھیک ایک ہفتے بعد آپ سے یہیں مل لیں گے۔"

"بہتر ہے۔ میں کل سے اپنا کام شروع کر دوں گی اس سلسلے میں مجھے آسیہ کو بھی اعتماد میں لینا ہوگا۔"

"ظاہر ہے ڈاکٹر صاحب اسکے بغیر تو کام نہیں چلے گا۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو پھر آپ مجھے اپنی بہن کے نام ایک خط لکھ دیں میں جس کی بنا پر کل اس سے بات کروں گی۔ اسے معلوم تو ہونا چاہیئے کہ یہ سب کچھ آپ کے ایما پر ہو رہا ہے۔"

"یہ بہت عمدہ خیال ہے آپ کا۔ کاغذ منگوا لیجئے میں اس کے نام آپ کو رقعہ لکھ دیتا ہوں۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم کل خود اس سے مل لیں کسی بات کا تحریر میں آنا ہمارے لیے کسی بھی وقت نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔" آپی نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ آپ کل اس سے خود مل لیں یا کسی اور کو اس کے پاس بھیج دیں۔ اسے ذہنی طور پر اس مرحلے کے لیے تیار کرنا بے حد ضروری ہے۔ اگر وہ ابھی اداکاری کر سکے تو اسے ٹیکہ لگانے کی ضرورت بھی نہ ہوگی۔" ڈاکٹر نفیسہ نے اپنی بے لوث رائے ظاہر کی۔ اسے ہم پوری طرح شیشے میں اتار چکے تھے۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! ہم کل اپنی عزیزہ کو اس کے پاس بھیج دیں گے۔"

"جیسے آپ کی مرضی مگر کل اسے ساری بات آپ بتا ضرور دیں ورنہ میں کچھ نہ کر سکوں گی۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر کرسی پر سے اٹھ گئی ہم نے اس سے اجازت لی اور اسی وقت وہاں سے نکل کر باہر آگئے۔

سڑک پر پہنچتے ہی میں خوشی سے پاگل ہوگیا اور آپی کو باہوں میں لے لیا۔

"تو نے میری بہت بڑی مشکل حل کر دی ہے آپی میں تیرا یہ احسان کبھی نہ بھلا سکوں گا۔" احساس تشکر سے میری آنکھیں امڈ آئیں۔

"ابھی نہیں میرے یار! ابھی سے اتنا خوش نہ ہو جا۔ وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں جس کا مطلب یہ ہے کہ ہونٹ اور پیالے کے درمیان بڑے مرحلے ہوتے ہیں تو اس کے مطابق صبر کر۔" وہ اپنے آپ کو مجھ سے چھڑاتے ہوئے بولا۔

بات اس نے بالکل سچی کہی تھی۔ میری قسمت تو بار بار مجھے اوندھا کر کے ڈال دیتی تھی۔ میرا کوئی بھی کام سیدھا نہیں ہوتا تھا زندگی کی تمام لکیریں ایک دوسری میں گڈمڈ رہنے لگی تھیں۔ میں پورب کی سوچتا تو پچھم جا نکلتا تھا۔ ایک اس ماں جائی بہن کے لیے میں نے کتنے کنوئیں جھانک لیے تھے کتنے صحرا عبور کر آیا تھا میں مگر اب تک اس کے صبر و سکون کے لیے میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ اپنی قوت بازو سے میرا اعتماد اٹھتا جا رہا تھا۔ بے بسی کا احساس کبھی کبھی تو میرے دل و دماغ پر اس قدر تند و تیز آندھی کی طرح حاوی ہو جاتا تھا کہ میرا دل چاہتا تھا وہی تیشہ اپنے سر میں مار کر مر جاؤں جس سے میں جا بجا پتھر توڑ کر آسیہ کیلیے راہیں ہموار کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا مگر ایسا حرماں نصیب اور ایسا کم حوصلہ تھا کہ خود پہ بھی وار نہ کر سکتا تھا۔

آپی مجھے ساتھ لے کر سڑک پر نکلا اور پھر ٹیکسی میں بٹھا کر حمیدہ کے گھر لے آیا۔ ہماری غیر حاضری میں ماجدہ نے گھر کی صورت کو نکھارنے سنوارنے میں بڑی محنت کر لی تھی دونوں کمروں میں اس نے اگربتیاں سلگا دی تھیں اور وہاں بچھے ہوئے پلنگ ایک نئی رات کی نئی نویلی خوشیوں کی نوید سناتے تھے۔

ماجدہ ہماری واپسی پر خوش ہو گئی۔ اس نے ہمارے لیے بڑے اہتمام سے قہوہ بنایا اور خوبصورت فرانسیسی پیالوں میں بھر کر ہمیں دیا جو وہ اسی دن خرید کر لائی تھی۔ وہ بہار کے تازہ جھونکے کی طرح اس گھر کے خزاں زدہ ماحول میں پھر گئی تھی اور چند ہی گھنٹوں میں اس نے اس کے کمروں اور صحن کے ہونٹوں پر جمی یاسیت و نحوست اور حزن و یاس کی ساری پیپڑیاں اتار ڈالی تھیں۔ ہر طرف زندگی کا چھلکتا چھلکتا احساس اس نے اجاگر کر دیا تھا۔ اگرچہ وہ سب روشنی وہ ساری چکا چوند اس پیسے کی مرہون منت تھی جو اپنی سہیلی کے لیے ماجدہ نے وہاں بے دریغ خرچ کیا تھا مگر جس دل سے جس گرمجوشی اور جس ایثار و خلوص کے جذبے سے سرشار ہو کر اس نے وہ سب کچھ کیا تھا یہ اسی کا فیض تھا کہ وہ خانہ محزون

جو کرن کرن کو ترستا تھا۔ رات ہونے سے پہلے تک بقعۂ نور بن گیا تھا۔ آدمی کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ مگر آدمی کے آگے پیسہ چلے تو بات بنتی ہے۔ اور یہ پیسہ ماجدہ نے لمحوں کی لہر پر چلتے ہوئے آہو کے گھر سے اڑا لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آہو کی تجوری میں بھی وہ پیسہ اس کی اپنی جگر کاوی کی وجہ سے جمع نہیں ہوا تھا۔ وہ سب کا سب ہیرا پھیری کا ثمر تھا اور اس تجوری کو بھرنے دینے میں آبی جیسے لوگوں کا ہاتھ تھا مگر جس چابکدستی اور خوش اسلوبی سے ماجدہ نے اس پر ہاتھ صاف کیا تھا اس پر مجھے حیرت ہوئی تھی۔

وہ آہو کے گھر میں تنہا تھی اور وہ دونوں کمرے میں پلنگ کے اوپر بندھے پڑے تھے۔ وہ مزاحمت نہیں کر سکتے تھے اور ماجدہ کو جب پہلا ٹیلیفون ملا تو اس کا دل بلّیوں اچھل گیا ہوگا۔ اس کی حیثیت وہاں نہ چاہتے ہوئے بھی مجرم ایسی بن چکی تھی — وہ خوف سے سرتاپیر لبریز گھر تھا کیونکہ وہاں سے ہم ہو کر گزر گئے تھے۔ پھر بھی اس نے اپنے اوسان خطا نہ ہونے دیے اور بڑی دلجمعی سے وہ اپنی پسند کی چیزیں اٹیچی کیس میں ڈالتی رہی تھی۔

جب پولیس نے وہاں دستک دی تو اس نے عقل سے کام لے کر باہر کی ساری صورتِ حال دروازے میں لگے عدسے میں سے دیکھ لی۔ وہ خوف سے لرز رہی ہوگی۔ اس کی وہاں گرفتاری اسے زبردست مصیبت میں مبتلا کر سکتی تھی پھر بھی وہ اپنے حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے دروازے پر سے ہٹی، اوپر جا کر اس نے برقعہ پہنا اور اٹیچی کیس اٹھا کر پچھلے دروازے سے بے آواز نکل کر مجیدن کے گھر جا پہنچی۔

یہ سب کے سب بڑے حوصلہ شکن مرحلے تھے پھر بھی وہ انہیں بخیر و خوبی طے کر گئی۔ اس نے مجھے مجیدن کے گھر میں کچھ بھی تو نہیں بتایا تھا۔ اس رقم کا ذکر تو وہ گول ہی کر گئی۔ اس کے آہنی اعصاب کی میں جتنی بھی تعریف کروں کم ہے وہ اپنے لیے آہو کے گھر سے بہت کچھ سمیٹ لائی تھی اور مطمئن یوں تھی کہ وہ میرے ساتھ تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر کسی مرحلے پر اس سے پوچھ گچھ ہوئی تو کوئی بھی حتیٰ کہ آہو بھی اس کے خلاف کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ گجرات کے ہسپتال میں بڑے چوہدری کرامت اور اس کے نوکر فیروز کے واویلے پر گرفتار ہونے کے باوجود ضمانت پر رہا ہو کر میرے پاس چلی آئی تھی، محض اس لیے کہ اس کے خلاف وہاں بھی کوئی ٹھوس ثبوت کسی کے پاس موجود نہیں تھا۔

ہمیں قہوہ پلانے کے بعد وہ ہمارے لیے طشتری میں رکھ کر ڈھیر سارے خشک میوے لے آئی۔ بادام، چلغوزے، اخروٹ، مونگ پھلی اور الا بلا۔ اس کے وجود سے خوشی کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی تھیں۔ وہ خریداری کے دوران خود کو بھی نہیں بھولی تھی۔ اپنے لیے عمدہ قسم کی تین ساڑھیاں بھی خرید لائی تھی۔ اور وہ اس وقت گلابی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس تھی جس نے اس کے سراپا کو اور زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔ ہم اس وقت ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے۔ ہم دونوں ایک طرف تھے اور ماجدہ ہمارے سامنے میز کی دوسری طرف بیٹھی تھی۔

"وہ حمیدہ واپس نہیں آئے گی آج؟" آبی نے پوچھا —

مسلسل سگریٹ پھونکتا چلا جا رہا تھا اور میرے دل میں یہ خدشہ جنم لے رہا تھا کہ آبی بھی ماجدہ کی طرف ملتفت ہو رہا ہے۔ اس کی نگاہیں عجیب سی تشنگی کا پتہ دیتی تھیں اور میں ڈرتا تھا کہ ماجدہ ہمارے درمیان وجہِ تنازعہ نہ بن جائے کیونکہ ماجدہ کا رویہ اس شمع کا سا تھا جو محفل میں موجود ہر شخص کو روشنی بخشتی ہے پھر بھی میں جب سوچتا تھا تو اس کے دل میں آبی کے لیے بہنوں ایسا جذبہ ضرور موجود ہوگا جب اس نے حمیدہ کے بارے میں پوچھا تو ماجدہ بڑے دلفریب انداز میں بولی۔ "جی نہیں۔ وہ بچوں کے پاس ہی رہے گی۔ آج کی رات اس کے گھر کے آپ مالک ہیں۔"

"جیلانی بھائی۔ میں تو چلا۔ مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔ مجھے کہاں سلائیں گے آپ لوگ؟"

ماجدہ کی آنکھوں میں شرارت ناچ گئی بدن کو لہرا کر بولی۔

"ان سے پوچھیں، بستروں کی الاٹمنٹ یہی کریں گے۔"

"ہاں یہ کمشنر بحالیات لگا ہوا ہے نا ادھر — بتا بھئی کدھر لیٹوں؟"

"میرے پلنگ پر لیٹ رہ میرے یار! تیرے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔" میں نے بانہیں اس کی طرف پھیلا دیں۔

آبی کا چہرہ کھل اٹھا میرا جملہ سن کر۔ وہ مسکراتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

صبح جب ہم سات بجے سو کر اٹھے تو میں نے دیکھا کہ آبی بستر میں موجود نہیں تھا۔ اس کی تمام چیزیں البتہ وہیں تھیں۔ ماجدہ نے پانی گرم کر دیا۔ نہا دھو کر جب میں ناشتے کی میز پر بیٹھا تو آبی واپس آ گیا۔ حمیدہ اس کے ساتھ تھی ان کی زبانی معلوم ہوا کہ حمیدہ کے دونوں بچوں کی حالت بہت بہتر ہے اور ڈاکٹر ان کا علاج بڑی تندہی سے کر رہے تھے۔ بے نوا عورت اس صبح مجھے کل کی راکھ راکھ بیوہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر نظر آئی۔ ماجدہ اس کے لیے بھی چار جوڑے کپڑے خرید لائی تھی۔ اس نے اسی وقت اسے نہلا دھلا کر ایک نیا جوڑا پہنا دیا اور پھر اس نے مجھے الگ لے جا کر کہا کہ میں اسے بیس ہزار روپیہ دے دوں جو کل رات اس نے مجھے دیا تھا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے دوسرے کمرے میں

اسے وہ رقم واپس کر دی۔ ماجدہ نے دس ہزار تو اپنے اٹیچی کیس میں رکھے اور دس ہزار روپے میرے سامنے اس نے حمیدہ کو دے دیے، بولی "یہ لیں باجی یہ دس ہزار روپے ہیں یہ انھوں نے آپ کے لیے دیا ہے اپنے خرچ کے لیے رکھ لیں۔"

"دس ہزار! یہ کیا کہتی ہو ماجدہ میں یہ رقم کیسے اتار سکوں گی؟"

"یہ میں آپ سے واپس لینے کے لیے نہیں دے رہی ہوں۔ یہ آپ کی بہن کے ہاتھ آپ کے بھائی کا ادنیٰ نذرانہ ہے۔" ماجدہ نے کہا۔

"یہ رقم رکھ لیں بہن جی۔ آپ کو ضرورت پڑی تو ہم اور بھی دیں گے۔ یہ سامان بھی ماجدہ نے آپ کو خرید دیا ہے۔ یہ ان کی طرف سے آپ کے لیے حقیر تحفہ ہے۔ ہسپتال میں جتنا روپیہ خرچ ہوگا وہ بھی ہم ادا کریں گے۔ آپ بس خوش خوش رہا کریں۔"

"اللہ آپ کا بھلا کرے بھائی۔ میں تو — میں تو..... بے آسرا ہو کر رہ گئی تھی۔ کئی دنوں سے میرے بچے بیمار ہیں میری آمدنی کا کوئی بھی ذریعہ نہیں۔ آپ تو میرے لیے فرشتۂ رحمت ثابت ہوئے ہیں۔ میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

"آپ نے نوکری کیوں چھوڑ دی بہن جی؟"

"میری نظر کمزور ہو گئی ہے بھائی اور سماعت بھی، اس لیے مجھے نوکری چھوڑنی پڑی۔"

"اللہ کرم کرے گا بہن جی، بس اب آپ بالکل کوئی فکر نہ کریں۔ یہ سامان پسند آیا آپ کو؟"

"میں تو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں اس ماجدہ نے تو میرے گھر کی قسمت بدل دی ہے۔ اللہ اس کے بھاگ اور روشن کرے۔"

"بس بس ساری دعائیں مجھے ہی نہ دے دو باجی! کچھ اپنے لیے بھی رکھ لو۔ یہ ساری چیزیں آبی بھائی نے خود پسند کی تھیں — آپ کے لیے —"

"ہاں میرا نام بھی لکھوا دو شہیدوں میں۔ بہن جی یہ ... جو ہے نا اس کی زبان بہت چلتی ہے بس ذرا بچ کے رہیں اس سے —" آبی نے کہا۔ وہ کرسی پر بیٹھا اطمینان سے سگریٹ پھونک رہا تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ صبح صبح اٹھ کر حمیدہ کی طرف چل دیا تھا۔ اس کے بچوں کی خیریت دریافت کرنے کے لیے۔

ماجدہ نے آبی کے سامنے بھی ناشتہ رکھ دیا۔ حمیدہ نے بھی ناشتہ نہیں کیا تھا۔ وہ بھی وہیں بیٹھ کر کھانے لگی۔ ڈائننگ میز کے فارمیکا پر وہ بار بار ہاتھ پھیر کر اس کی چکناہٹ کو سراہ رہی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے ماجدہ کی خریدی ہوئی ایک ایک چیز دیکھی اور اسے قدم قدم پر ڈھیروں دعائیں دیتی رہی۔ کسی مجبور و بے کس آدمی کو اچانک اتنی ساری خوشیاں دے دینے سے جو خوشی آدمی کو محسوس ہوتی ہے اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ عجیب سا احساسِ ربوبیت دل میں ابھرنے لگتا ہے۔ میں، آبی، اور ماجدہ اس دکھوں کی ماری عورت کو گھر میں ادھر ادھر انبساط کی لہروں پر چلتی دیکھ کر مسرور ہو رہے تھے۔ اسے اپنے گھر سے بے پناہ محبت تھی۔ اس کی ایک ایک اینٹ اس نے سینت سینت کر خود دیواروں میں لگوائی تھی مگر اس گھر میں روشنی نہ ہونے کے سبب وہ خود اندھی ہوئی جاتی تھی۔ غم نے اس کی بینائی چاٹ لی تھی مگر اب جو اتنی بڑی رقم اس نے دیکھی اتنی ساری چیزوں کو گھر میں سجی سنوری صورت میں پایا تو اس پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اسے نہ اپنی سماعت پر اعتبار آ رہا تھا، نہ اپنی بصارت پر۔ بولی۔ "یہ چیزیں تو اپنے لیے لائی ہے نا ماجدہ؟"

"ارے نہیں باجی یہ سب چیزیں تمھاری ہیں، تمھارے لیے ہی خرید کر لائی تھی۔ وہ تمھارا بیٹا ہے نا، وہ دیکھے گا تو خوش ہو جائے گا۔ عذرا بھی یہ چیزیں دیکھے گی تو حیران رہ جائے گی۔ یہ سب تمھاری ہیں باجی ہم تو بس چند دن آپ کے پاس ہیں پھر چل دیں گے۔"

"یہ تمھارا اپنا گھر ہے ماجدہ، جب تک چاہو رہو۔ جانے کا کیوں ذکر کرتی ہو۔ تم تو یہاں روشنی بن کر آئی ہو۔"

"بس اب ان چیزوں کا ذکر ختم کریں۔ بہن جی جائیں ادھر باورچی خانے میں بیٹھیں اور دوپہر کے کھانے کا بندوبست کریں۔ ماجدہ کو ہم ابھی ایک کام سے باہر بھیج رہے ہیں۔" میں نے ان کے سلسلۂ گفتگو کو منقطع کرتے ہوئے کہا۔

حمیدہ فوراً ہی اٹھ کر باورچی خانے میں جا گھسی۔ اس کے اٹھتے ہی میں نے ماجدہ کو ساری صورتِ حال سمجھائی اور اسے اسی وقت آبی کے ساتھ آسیہ سے ملاقات کے لیے زنانہ جیل بھیج دیا۔ وہ گھر سے نکلے تو حمیدہ کے گھر میں سناٹا چھا گیا۔ لگتا تھا وہاں کوئی رہتا ہی نہیں ہے ایسی دلگیر خاموشی میں نے ویرانوں میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ مجھے وہ گھر آسیب زدہ سا نظر آتا تھا کچھ دیر تو میں کمرے میں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا مگر جب وہ سکوت ناقابلِ برداشت ہو گیا تو میں نے کرسی لے جا کر صحن میں رکھ دی اور وہاں بیٹھ کر دھوپ تاپنے لگا مگر وہ دھوپ بھی مجھے گرمانے میں ناکام رہی میرے دل پر تو تہ در تہ جمی یاد کی کسی طرح کم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ رہ رہ کر آسیہ کا چہرہ میرے تصور میں گھومنے لگتا تھا اور اب میں اس سے منہ چھپانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ میں آسیہ کا تصور میں بھی سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ ندامت نے مجھے کچھ اس حد تک کچل کر رکھ دیا تھا اور اپنی لغزشوں پر میں اتنا شرمندہ ہو رہا تھا کہ میں نے آسیہ کا خیال اپنے ذہن سے جھٹک دینے کی سر توڑ کوشش کی مگر وہ ہر سمت تھی ہر طرف موجود تھی اور وہی پرانا سوال دہرا رہی تھی کہ بھیا میرا کیا قصور ہے۔ مجھے میرے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے اور یہی وہ سوال تھا

جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

آسیہ کی اذیتیں بے تحاشا تھیں اس کو زندگی نے جیسے بھیر جلا ڈالا تھا۔ وہ تو حجلۂ عروسی کے خواب دیکھتی تھی مگر ذرا دیر کے لیے اس کی آنکھ جھپک گئی تو اس کو حالات نے بندی خانے میں ڈال دیا۔ کسی جلاد کی سب سے بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی ہے کہ وہ تلوار کے ایک ہی وار میں معتوب کا سر تن سے جدا کردے۔ اور آسیہ پر جو تلوار چلی تھی اس کے چلانے والے کا یہی کمال تھا کہ جب اس کا وجود اس کے اپنوں سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا تو اس ایک لمحے کی مختصر مدت میں اسے احساس تک نہ ہو سکا کہ اس پر کیا کچھ بیت چکی ہے مگر اس نے اپنے سامنے قانون کی سلاخیں تنی دیکھیں تو وہ اپنی بے بسی پر تلملا کر رہ گئی۔

یہی حال میرا تھا۔ مجھے بھی حالات نے گانج کر رکھ دیا تھا اور میری وہ بہن جس کی آنکھوں میں مروارید ناسفتہ کی چمک دیکھنے والے کو مسحور کر دیتی تھی اب بجھ کر رہ گئی تھی۔ اب وہ اپنے سامنے ماجدہ کو دیکھے گی تو خدا جانے دل میں کیا سوچے گی۔ ماجدہ سے میرے تعلق کا وہ کچھ نہ کچھ تو اندازہ کر ہی لے گی جب ہم ایک ہی چھت تلے سوتے تھے۔ تو وہ اس بات کا بہت خیال رکھتی تھی کہ اس کا بھائی غلط راستوں پر نہ چل نکلے۔ وہ اپنی کسی سہیلی کو بھی میری موجودگی میں گھر میں نہیں آنے دیتی تھی۔ وہ اپنے بھائی کو اندر سے بھی اتنا ہی خوبصورت دیکھنا پسند کرتی تھی جتنا وہ باہر سے تھا مگر اب جو اسے ماجدہ کی آنکھوں میں میری تصویر نظر آئے گی تو وہ کس قدر پریشان ہو گی۔ یہ بات ممکن تھی کہ وہ ماجدہ کے لب و لہجے سے اندازہ نہ کر سکے کہ میرا اس سے کیا رشتہ ہے۔

میری سوچ مجھے دور دور لیے پھرتی تھی میرے ذہن میں عجیب وسوسے اور اندیشے جنم لے رہے تھے۔ گرد و پیش مجھے لہو رنگ نظر آتا تھا۔ کوئی شے اچھی نہیں لگتی تھی۔

میں صحن میں بیٹھا سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا جا رہا تھا۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ حالات کی یہ پیچ در پیچ گرہیں میں کس طرح کھول سکوں گا۔ اس وقت صبح کے نو بج چکے تھے۔ دھوپ سارے آنگن میں پھیل چکی تھی۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے ایک خوفناک چیخ ابھرتی سنائی دی۔ میں نے ادھر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ ایک نوجوان عورت چادر میں لپٹی ہوئی دوسرے مکان کے باورچی خانے کی چھت پر سے حمیدہ کے کچے صحن میں گھاس پر کود گئی ہے۔ اس کے پیچھے ہی ایک آدمی بھی پاگلوں کی طرح صحن میں کودا۔ اس کے ہاتھ میں چمکتا ہوا خنجر تھا وہ نیچے گرا تو وہ عورت تیزی سے اٹھی اور پاگلوں کی طرح میری طرف لپکی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے بدن کو بستر کی چادر سے ڈھانپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

"بچاؤ۔ خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔ یہ مجھے قتل کر دے گا۔"

ابھی وہ میرے پاس پہنچی بھی نہیں تھی کہ وہ آدمی گندی گالیاں بکتا ہوا اس کی طرف شکرے ایسی تیزی سے لپکا اور پلک جھپکتے میں اس تک آ پہنچا۔ میرے لیے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ خنجر سے اس کے برہنہ سینے پر وار کرنے ہی کو تھا کہ میں پورے قد سے اس پر جا پڑا۔ اور اسے نیچے گرا کر میں نے وہ کلائی دبوچ لی جس میں اس نے خنجر تھام رکھا تھا۔ اس ظالم نے گرتے گرتے بھی اس عورت کو اپنی ٹانگوں میں یوں دبوچ لیا تھا کہ وہ ہل نہ سکتی تھی۔ وہ عورت بُری طرح چیخ رہی تھی۔ میں نے اس آدمی کی کلائی مروڑ کر اس کے ہاتھ سے خنجر چھین کر پوری قوت سے اس کے منہ پر [illegible] خاصا مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس نے خنجر تو چھوڑ دیا مگر پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے بال پکڑ کر مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ میں نے اپنے بال اس کی گرفت سے چھڑانے کے لیے اس کا نرخرہ دبا دیا۔ یہ حربہ کارگر رہا۔ اس کا دم گھٹنے لگا تو اس نے میرے بال چھوڑ دیئے۔ میں نے اس کی گردن پر سے اپنی گرفت ڈھیلی کی تو وہ منہ کھول کر مجھے کتے کی طرح پھاڑ کھانے کے لیے اوپر اٹھا۔ وہ عورت اب تک اس کی ٹانگوں میں پھنسی ہوئی تھی وہ اپنی بے پناہ قوت کو دو سمتوں میں صرف کر رہا تھا اور یہ اس کی قوتِ ارادی کا کمال تھا کہ وہ نہ مجھ سے ہار مان رہا تھا اور نہ وہ اس عورت کو چھوڑنے پر آمادہ تھا۔ اس نے پاگلوں کی طرح میرے بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں دانتوں میں لے کر دبائیں تو میں ڈرا کہ کہیں وہ میری انگلیاں ہی نہ کاٹ دے۔ میں نے مجبوراً اس کی گدی پر ہاتھ ڈال کر اس کی رگِ احساس پوری قوت سے دبا دی اور وہ فوراً ہی بے سدھ ہو کر جھول گیا۔ میں نے اس عورت کو اس کی ٹانگوں سے نکالا تو وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ یہی کوئی تئیس چوبیس سال کی نازک اندام سی عورت تھی۔ آنکھوں میں اس نے کاجل کے ڈورے سے شام کا سا سماں پیدا کر رکھا تھا اور اس کے رخساروں پہ غازے کی تہہ نے اس کی دلکشی میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ لبوں پر اس نے گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگا رکھی تھی۔ وہ سر جھکائے میری طرف پیٹھ موڑ کر یوں کھڑی تھی کہ نگاہیں اس کی اس آدمی پر جمی تھیں جو اب بالکل بے ہوش ہو چکا تھا۔ حمیدہ کو شاید کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا تھا وہ ابھی تک باورچی خانے سے باہر نہ نکلی تھی جو ان کمروں کی دوسری طرف بنا ہوا تھا۔

"یہ آدمی کون ہے آپ کو کیوں مارنا چاہتا تھا یہ؟"

"یہ.... یہ میرا شوہر ہے۔ یہ.... یہ مر تو نہیں گیا؟" اس نے دبی زبان میں کہا۔ چہرہ اب بھی اس کا میری طرف نہیں تھا۔

"یہ آپ کا شوہر ہے؟ کمال ہے مگر فکر نہ کریں یہ مرا نہیں ہے۔ آئیں ادھر کمرے میں چلیں آئیں۔" میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر

اپنی طرف کھینچا تو وہ میرے سینے میں اپنا منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

میں نے بڑی آہستگی سے اسے اپنے آپ سے الگ کیا اور اسے ساتھ لے کر کمرے میں پہنچا۔ میں نے ماجدہ کے سلیپر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ انہیں پاؤں میں پھنسا کر میرے سامنے ہی بستر پر بیٹھ گئی۔ نگاہیں اس کی جھکی ہوئی تھیں اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی رو دے گی۔

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"میرا نام رُوحی ہے۔"

"یہ کیوں آپ کو مارنا چاہتا تھا۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"اس کا نام اشفاق ہے۔ میرا شوہر ہے یہ۔"

"وہ تو آپ بتا ہی چکی ہیں مگر یہ آپ کے پیچھے خنجر لے کر کیوں دوڑا تھا۔ کیوں مارنا چاہتا تھا یہ آپ کو۔ اگر میں وہاں نہ ہوتا تو اس نے تو ختم کر دیا تھا آپ کو۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ فرش پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہی۔ میں نے اٹھ کر کمرے کے دونوں دروازے بند کر لیے اور پھر اس کے پہلو میں جا بیٹھا۔ وہ سرک کر پرے ہو گئی۔

"مجھے بتائیں روحی کہ یہ معاملہ کیا تھا؟"

"وہ.... وہ.... دراصل میرے ایک کزن ہیں جمال صاحب وہ کوئی ایک گھنٹہ پہلے ہمارے گھر آئے تھے۔ اشفاق سات بجے دفتر کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں مگر وہ آج کچھ ہی دیر بعد واپس آ گئے۔ انہوں نے واپس آ کر مجھے جمال صاحب کے پاس بیٹھے دیکھ لیا۔ اس پر وہ مشتعل ہو گئے۔ جمال صاحب دوسرے دروازے سے بھاگ گئے۔ تو میں اشفاق سے خوفزدہ ہو کر صحن میں نکل گئی مگر یہ خنجر لے کر میرے پیچھے دوڑے۔ میں ان سے اپنی جان بچانے کے لیے چھت کی طرف دوڑی تو یہ اوپر آ گئے۔ میں نے ان کے سر پہ خون سوار دیکھا تو پاگلوں کی طرح ادھر کود گئی۔ اگر آپ وہاں نہ ہوتے تو یہ مجھے جان سے مار دیتے۔ ان کی شکی طبیعت ہمیں ایک نہ ایک دن ضرور تباہ کر دے گی۔"

"اب کہاں ہیں وہ؟"

"وہ بھی کہیں چھپے ہوتے ہوں گے۔"

"ہوں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شوہر جب گھر سے نکل جاتا ہے تو آپ جمال صاحب کے ساتھ ملاقاتیں کرتی ہیں؟"

وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی۔ اپنی سرمہ سا آنکھیں اس نے پوری طرح کھول کر میرے چہرے پر جما دیں یوں جیسے وہ میری تصویر اتار رہی ہو۔

"یہی بات ہے نا؟"

"جی۔ وہ.... وہ.... دراصل مجھے جمال صاحب سے بہت محبت ہے میری منگنی انہی کے ساتھ ہوئی تھی مگر پھر میرے ماں باپ نے میری

شادی اشفاق صاحب سے کر دی۔"

"ہوں! تو یہ محبت کا پرانا زخم ہے جس کی مرہم پٹی کے لیے جمال صاحب آپ کے پاس اُس وقت آتے ہیں جب ڈاکٹر اشفاق وہاں موجود نہیں ہوتے۔"

"وہ ڈاکٹر تو نہیں ہیں۔ اُن کی تو سگریٹ کی ایجنسی ہے۔"

"میرا مطلب یہ تھا کہ جمال صاحب نرس سے دوا لیتے ہیں اور ڈاکٹر سے مُنہ چھپاتے ہیں۔"

"آپ میرے زخموں پر نمک تو نہ چھڑکیں۔" اس نے بڑے جلے کٹے لہجے میں کہا۔ اب وہ اپنے ہونٹوں پر لگی سرخی چادر سے پونچھ رہی تھی۔

"میں نمک تو نہیں چھڑک رہا ہوں رُوحی میں تو حقیقت عرض کر رہا ہوں ویسے میرا خیال ہے جمال صاحب کے انتخاب کی داد نہ دینا زیادتی کی بات ہوگی۔"

"کہیں وہ اشفاق مر تو نہیں گئے ہیں؟" اس نے میری بات اَن سُنی کر دی۔

"ہو سکتا ہے وہ مر گئے ہوں۔ آپ کو بچانے کے لیے میں نے تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔"

"آپ نے کیا کیا ہے ان کے ساتھ۔ ان کو زخم بھی تو کوئی نہیں لگا ہے۔"

"اگر وہ مر گئے تو یہ بات آپ کے لیے اچھی ہی ہو گی۔ اس طرح آپ جمال صاحب سے بڑے آرام سے شادی کر سکیں گی۔"

"نہیں جناب۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ میں جمال صاحب کے لیے اپنی زندگی تباہ نہیں کر سکتی۔"

"وہ تو ہو ہی گئی ہے خانم! کیا خیال ہے آپ کا اشفاق آپ کو معاف کر دے گا۔"

"بس میری آنکھوں پر پٹی بندھ گئی تھی۔ مجھے جمال صاحب نے ۔۔۔ مجبور کر دیا تھا۔"

"آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟"

"میرے ماں باپ ادھر ڈسکہ میں رہتے ہیں۔"

"اور یہ اشفاق صاحب ان کا وطن مالوف کونسا ہے؟"

"وہ کیا ہوتا ہے؟" اب کی بار اس نے پھر اپنی وہ کاجل بھری آنکھیں پوری طرح کھول کر مجھے دیکھا۔ اس کے ہونٹ خون آلود زخم لیے تھے۔ باریک اور تراشے ہوئے۔

"میرا مطلب ہے کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"اوہ میں سمجھی! وہ قلعہ دیدار سنگھ میں رہتے ہیں۔ یہاں کاروبار کے لیے آئے ہوئے ہیں۔"

"کتنا عرصہ ہوا آپ کی شادی کو؟"

"تین سال۔"

"بچے کتنے ہیں آپ کے؟"

"بچہ کوئی نہیں ہے ہمارا۔"

"کیوں؟"

"مجھے کیا پتہ! ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اشفاق میں کوئی نقص ہے۔"

"گڈ! خاصی سمجھدار معلوم ہوتی ہیں آپ۔"

"پلیز! مجھے اس مصیبت سے چھڑا لیں۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے اشفاق مجھے قتل کر دیں گے۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" پہلی بار اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ پہلی بار اس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمودار ہوئے۔ اب تک وہ واقعات کی تیزی میں تنکے کی طرح بہتی رہی تھی مگر اب اس کے شعور کی لہروں پر بجلیاں کوندنے لگی تھیں اور ایک گمبھیر سی سنجیدگی اس کے بشرے سے ہویدا ہونے لگی تھی اور وہ یوں سمجھنے لگی تھی کہ اگر میں نے اسے پناہ نہ دی تو وہ بھسم ہو کر رہ جائے گی۔

اچانک مجھے باورچی خانے کی طرف سے حمیدہ کے سلیپروں کی سڑ پٹر سنائی دی۔ وہ شاید صحن کی طرف جا رہی تھی۔ میں تیزی سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باورچی خانے کی طرف لپکا۔ حمیدہ ابھی تک باورچی خانے سے نکل کر چھوٹے سے برآمدے کو عبور نہ کر پائی تھی کہ میں نے اسے جا لیا۔

"کہاں جا رہی ہیں باجی؟"

"میں ادھر سے کچھ لکڑیاں لے آؤں صحن میں رکھی ہیں۔" وہ بہت سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔

"آپ ادھر باورچی خانے میں بیٹھیں۔ میں لا دیتا ہوں لکڑیاں۔ میرے لیے ذرا جلدی سے ایک پیالی چائے بنا دیں۔" میں نے حمیدہ کو کندھوں سے پکڑ کر باورچی خانے کی طرف موڑ دیا۔ وہ حیرت زدہ سی ہو کر میرے ساتھ چلی اور باورچی خانے میں جا گھسی۔

"صرف ایک پیالی چائے کا سوال ہے باجی جان!" میں نے انگشت شہادت بلند کر کے اسے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"چائے میں ابھی بنا دیتی ہوں۔ یہ لکڑیاں کچھ گیلی تھیں اس لیے میں نے سوچا کچھ اُدھر سے سوکھی لکڑیاں لے آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چولھے کے پاس جا بیٹھی۔

"وہ میں لا دیتا ہوں آپ کیتلی میں پانی بھر کر چولھے پر رکھیں۔" یہ کہہ کر میں صحن کی طرف نکلا اور وہاں کونے میں رکھی صحن میں لگے درخت کی پرانی کٹی ہوئی سوکھی ٹہنیاں اٹھا کر باورچی خانے میں پہنچا دیں۔ اشفاق وہاں ابھی تک بے سُدھ پڑا تھا۔

باورچی خانے میں حمیدہ کو مصروف کر کے میں پھر صحن میں نکلا اور اشفاق کو کندھے پر اٹھا کر کمرے میں لے گیا۔ اسے دیکھتے ہی روحی اپنی جگہ

سے اچھل کر اٹھی اور وحشت زدہ سی ہو کر بولی:

"یہ زندہ تو ہیں نا ابھی تک؟"

"ہاں آپ بالکل بے فکر رہیں یہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔" میں نے اشفاق کو بڑی آہستگی سے پلنگ پر لٹا کر اس پر لحاف ڈال دیا۔

روحی اس کے پاس بیٹھ کر اس کی نبض ٹٹولنے لگی۔ جب اُسے اطمینان ہو گیا کہ وہ ابھی زندہ ہے اور اس کی نبضیں ٹھیک چل رہی ہیں تو اسے اطمینان ہوا۔

اچانک دروازے پر حمیدہ نے دستک دی۔ وہ چائے تیار کر کے لائی تھی۔ میں نے روحی کو لحاف میں لپیٹ کر بند کیا اور دروازے پر جا پہنچا۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں۔ یہ چائے لے لو۔" حمیدہ کی آواز خاصی کرخت تھی۔

"اوہ! میں تو بھول ہی گیا تھا۔ لائیں۔ میں دراصل لحاف میں لیٹ گیا تھا۔ سخت نیند آ رہی تھی۔" یہ کہہ کر میں نے دروازے کا پٹ ذرا سا کھول کر اس کے ہاتھ میں سے چائے کی پیالی لے کر دروازہ بند کر دیا۔

"اب میں ذرا آرام کروں گا باجی! ایک بجے سے پہلے مجھے نہ جگائیں۔"

میری بات کا کوئی جواب دیئے بغیر وہ باورچی خانے کی طرف واپس چلی گئی۔ میں نے چائے کی پیالی لے کر روحی کے لبوں سے لگا دی وہ خوش ہو گئی بولی۔

"یہ بہت اچھا کیا آپ نے۔ مگر آدھی پیالی آپ پئیں۔"

"بس حمیدہ باجی کو جانتی ہیں آپ؟"

"نہیں! ہمیں یہاں اس مکان میں آئے ابھی ایک ہی مہینہ ہوا ہے۔ پہلے ہم اُدھر اسلامیہ پارک میں رہتے تھے۔ اب کیا کریں گے آپ؟ اشفاق تو ابھی تک بے ہوش ہے۔"

"دیکھیں روحی! میرا تو یہ خیال ہے کہ اگر آپ اب اس شخص کے ساتھ رہیں تو یہ کسی بھی وقت آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

"یہی تو میں ڈرتی ہوں جناب۔۔۔ کیا نام ہے آپ کا؟"

"میرا نام خاکوانی ہے۔ رحیم خاکوانی۔"

"اوہ میں سمجھی! آپ خاکوانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ تو بہت بڑے جاگیردار لوگ ہیں۔"

"ہاں! میری بہت بڑی زمینداری ہے اُدھر کوٹ ادو کی طرف یہ حمیدہ میری خالہ زاد بہن ہیں۔ میں بس انہیں ہی دیکھنے آیا تھا۔"

"میں تو سمجھی تھی کہ آپ کوئی نئے نویلے دولہا ہیں۔ یہ سارا سامان بالکل نیا ہے اور کسی کے جہیز میں آیا لگتا ہے۔"

"جی نہیں۔ یہ حمیدہ باجی کا اپنا سامان ہے۔ ایک جگہ بہت عرصے سے محفوظ پڑا تھا۔ کل ہی آیا ہے یہاں۔"

"یہ بہت عرصے کا خریدا ہوا تو ہرگز نہیں لگتا ہے؟"

"ہاں! مگر اسے اب تک کسی نے استعمال نہیں کیا تھا۔"

"وہ تو خیر ٹھیک ہے خاکوانی صاحب! مگر اب مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں۔ میری جان تو سخت خطرے میں ہے۔" وہ اشفاق کے پلنگ کو گہری گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"آپ یوں کریں کہ اپنا ضروری سامان باندھ کر آج ہی ڈسکے چلی جائیں اور اس آدمی سے طلاق لے لیں۔"

"طلاق لے لوں گی مگر۔۔۔ مگر پھر میں کیا کروں گی؟"

"آپ جمال صاحب سے شادی کر لیں۔"

"جی نہیں! میں اس خبیث کے بغیر ہی بھلی۔ اس میں تو اتنی بھی جرأت نہیں تھی کہ وہ مڑ کر یہ ہی دیکھ لیتا کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔"

"جس صورتِ حال سے وہ دو چار تھا۔ اس میں وہ اور کیا کر سکتا تھا؟"

"مقابلہ کرتا! اشفاق سے وہ کم طاقتور تو نہیں ہے۔"

"آپ کے لئے یہی بہتر ہے کہ آپ اس سے شادی کر لیں۔"

"نہیں خاکوانی صاحب میں۔۔۔ میں تو اب۔۔۔ اب۔"

"ہاں ہاں کہیں! رُک کیوں گئی ہیں آپ؟"

"مجھے۔۔۔ مجھے آپ اپنی کنیز بنا لیں۔"

"اجی نہیں! میں اس گاڑی کا بیل نہیں ہوں روحی بانو! یہ دو گھڑی کی ملاقات بہت کافی ہے۔ میں تو پہلے ہی شادی شدہ ہوں تین بیویاں ہیں میری!"

"اچھا! تین بیویاں ہیں آپ کی۔ چلیں ایک کی گنجائش اور نکال لیں۔ میں آپ کی کنیز بن کر رہ لوں گی اور آپ کی بیویوں کی بھی۔"

"پاگل ہیں آپ! اتنی جلدی اتنے بڑے بڑے فیصلے کر لیتی ہیں حد ہو گئی۔ آپ میری بات مانیں اور ابھی واپس جا کر اپنا سامان درست کریں اور آج ہی ڈسکے چلی جائیں۔ جمال صاحب کا پتہ مجھے دیتی جائیں میں انہیں سمجھاؤں گا۔ آپ ان کو نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے شادی کر لیں۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے آپ کا یہ مشورہ منظور ہے۔"

اس نے فرش پر پڑا ہوا سگریٹ کا خالی پیکٹ اٹھا کر اس کے سفید حصے پر مجھ سے پنسل لے کر جمال صاحب کا اور اپنا ڈسکے کا پتہ لکھ دیا۔ وہ کاغذ کا ٹکڑا میں نے جیب میں رکھا اور پھر اسے چپ چاپ بڑے دروازے میں سے گزار کر اس کے گھر بھیج دیا۔

جب میں دروازہ بند کر کے پیچھے مڑا تو میں نے دیکھا کہ حمیدہ باورچی خانے کی کھڑکی میں سے مجھے حیران پریشان نظروں سے دیکھ

رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جمی حیرت نے مجھے پریشان کر دیا میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ رُوحی کے اس راز سے واقف ہو جائے۔ مگر بات کھل کر بکھرتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے چہرے پر پھیلی خفت کو مٹاتے ہوئے اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے کمرے میں واپس جانے کے بجائے حمیدہ سے بات کرنا بہتر سمجھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میں باورچی خانے میں جا گھسا۔ اس نے مجھے یوں اپنے سامنے دیکھا تو.... نظریں جھکا کر چولھے کے سامنے جا بیٹھی۔ اور ہانڈی کا ڈھکنا اٹھا کر اس میں ڈوئی پھیرنے لگی۔

"باجی آپ اس لڑکی کو جانتی ہیں جو ابھی باہر گئی ہے؟"

"ہاں! یہ ہمارے محلے میں رہتی ہے۔ کوئی ایک مہینہ پہلے یہاں آئے تھے یہ لوگ۔"

"آپ کو پتہ ہے یہ یہاں کیوں آئی تھی؟"

"نہیں! یہ پہلے تو کبھی ہمارے گھر نہیں آئی۔"

"پھر آپ یہ ادھر کیا لینے آئی تھی۔ کہتی تھی ادھر اس کی مرغی صحن میں گر گئی ہے۔"

"آپ نے کیا کہا؟"

"میں نے آپ کو زحمت نہیں دی خود اسے صحن دکھا دیا تھا وہ ادھر اُدھر جھانک کر چلی گئی۔ میں نے کہا بھی تھا کہ وہ آپ سے مل لے مگر وہ اِدھر نہیں آئی۔ کہتی تھی میں پہلے مرغی تلاش کر لوں۔ بکواس کرتی ہے وہ! میرا خیال ہے وہ کسی اور ہی کام سے آئی تھی۔" حمیدہ نے ہانڈی پھر سے بند کر دی۔ وہ بہت پریشان نظر آتی تھی اور مجھ سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

"اور کیا کام ہو سکتا ہے اسے؟ میں تو اسے بالکل نہیں.... جانتا تھا۔"

"پتہ نہیں کیا لینے آئی تھی وہ! مجھ سے آپ نے ملوایا ہوتا تو میں پوچھتی۔" دھیان اس کا ابھی تک چولھے کی طرف تھا۔

"بس مجھ سے یہی غلطی ہو گئی۔ ویسے بھی میرا خیال ہے کہ وہ آپ سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔"

"بڑی کم ذات عورت ہے یہ۔ میں نے سنا ہے کہ ایک لڑکا اکثر اس کے گھر آتا ہے مگر اس وقت جب اس کا شوہر گھر میں نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے یہ آپ کو پھانسنے کے لئے ادھر چلی آئی ہو۔ اس نے آپ کو صحن میں بیٹھے دیکھ لیا ہو گا۔"

"اچھا! ایسی بدمعاش عورت ہے یہ۔ مگر مجھ سے اس نے کوئی اِنٹ شنٹ بات نہیں کی۔ ورنہ میں تو اس کی اچھی طرح خبر لیتا۔ ایسا کچا گولا نہیں ہوں میں۔"

"اچھا کیا آپ نے اُسے چلتی کیا۔ بڑی چھنال عورت ہے یہ۔ بُرا اثر ہے اسے اپنے حُسن پر۔" حمیدہ نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ اب وہ زمین پر گری کوئی چیز ٹٹول رہی تھی۔ اس کے لہجے کی سرد مہری مجھے کھٹک رہی تھی۔

"اچھا خیر کر.... ہے اور ہاں اس عورت کے سلسلے میں آپ میرے متعلق کوئی غلط نظریہ قائم نہ کریں۔"

"نہیں! مجھے کیا ضرورت ہے؟ میں تو اپنے گھر کی ذمہ دار ہوں۔"

حمیدہ کی یہ بات سن کر میں کمرے میں جا گھسا۔ اشفاق ابھی تک بے ہوش تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس سے کس طرح چھٹکارا پاؤں۔ میں نے خواہ مخواہ اپنے لئے ایک مصیبت کھڑی کر لی تھی اس رُوحی کی ہمت پر مجھے حیرت تھی۔ وہ آٹھ نو فٹ اونچی چھت سے بے خطر کود کر نیچے آ گئی تھی اور اسے ذرا بھی چوٹ نہیں آئی تھی اشفاق کا حال مجھے البتہ نہیں معلوم تھا۔ عین ممکن ہے اس کی ایک آدھ ہڈی بھی ٹوٹ گئی ہو۔ کیونکہ وہ خاصا تنومند اور بھاری بھر کم آدمی تھا۔ پھر بھی جس انداز سے وہ مجھ سے ٹکرایا تھا اور جس آہنی عزم سے وہ مجھ سے الجھ گیا تھا۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ جب نیچے گرا تھا تو اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔

مگر جو زخم اس کے دل.... لگا تھا اس کا اندازہ میں بخوبی کر سکتا تھا۔ رُوحی نے اس کی غیرت کے دامن کو تار تار کر دیا تھا۔

میں کتنی ہی دیر تک کمرے میں بیٹھا اپنے آپ سے الجھا رہا ــــ میں اس انتظار میں تھا کہ رُوحی گھر سے روانہ ہونے سے پہلے مجھے ضرور خبردار کرے گی۔ اسے میں نے یہی سمجھایا تھا اور اس نے وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ تیار ہو کر کوٹھے پر مجھے خدا حافظ کہنے ضرور آئے گی۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے پچھلے دروازے پر ٹھک کی آواز سنائی دی۔ میں تیزی سے صحن میں نکلا۔ وہ اپنے مکان کی چھت پر کھڑی تھی۔ اس نے برقعہ پہن رکھا تھا اور چہرے کو دھو کر اس نے میک اپ کی آلائش سے پاک کر لیا تھا۔ میں جونہی اس کے سامنے گیا وہ انگلی کے اشارے سے مجھے کچھ بتانے لگی۔ میں نے اس کی انگشتِ شہادت کی سمت میں صحن پر نظر ڈالی تو وہاں مجھے ایک لفافہ نظر آیا۔ وہ میں نے لپک کر اٹھا لیا۔ وہ منڈیر پر جھکی اور دبی زبان میں بولی: "میں جا رہی ہوں خاکوانی صاحب.... خدا حافظ۔" پھر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں نے لفافہ وہیں کھڑے کھڑے کھول کر پڑھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نشے میں ہوں۔ اس نے میری ماں کا واسطہ دیا تھا کہ میں جس طرح بھی ہو سکے اسے ڈسکہ میں اس کے گھر جا کر ملوں۔ اس کا باپ اُدھر کسی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس کا نام نوازش علی تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ میں ہیڈ ماسٹر کی اکلوتی اولاد ہے اور ماں اس کی فوت ہو چکی ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ اُدھر ایک مربع زمین کی مالک ہے۔ جسے وہ میرے نام لکھوا دے گی۔ وہ میری ہو جاتی۔ بیوی بننے کو بھی اپنے لئے بہت بڑا اعزاز قرار دے رہی تھی۔ اشفاق اور جمال دونوں پر اس نے ہزار لعنت بھیجی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ میں اسے ہمیشہ کے لئے اپنا لوں۔ اس نے دبے لفظوں میں اشفاق کی زبردست مذمت کی تھی۔

یہ بہت بڑا المیہ تھا۔ میں نے عورت کا یہ رُخ کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

لفافہ جیب میں ڈال کر میں کمرے میں واپس پہنچا اور دیکھا کہ اشفاق لحاف کے اندر کسمسا رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس بات کا غماز تھا کہ اسے ہوش آ رہا ہے۔ تب مجھے اس کا وہ خنجر یاد آیا جو میں بے خیالی میں وہیں صحن میں بھول آیا تھا۔ حمیدہ اس وقت بھی باورچی خانے میں بیٹھی تھی۔ میں بھاگ کر صحن میں نکلا اور خنجر ہاتھ میں لے کر کمرے میں آ گیا۔ اس وقت تک اشفاق نے آنکھیں کھول دی تھیں اور وہ حیران پریشان ہو کر گردوپیش کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ بدک کر اٹھا اور لحاف الگ پھینک کر سیدھا ہو گیا۔ مگر پھر اچانک اسے گردن کے پٹھوں پر بوجھ سا محسوس ہوا تو وہ اپنی گُدّی سہلانے لگا۔

"اب کیا حال ہے آپ کا؟"

میں نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ خنجر میرے ہاتھ میں تھا۔ جس کی چمک حیرت انگیز تھی۔ ایسا خنجر میں نے بالعموم ایسے لوگوں کے پاس دیکھا تھا جو جنگ و جدل کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ وہ یا تو فوج کے سپاہیوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے یا شاید جیب تراشوں کی بغل میں۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بار بار گردن کو دائیں بائیں ہلا کر پٹھوں کو رواں کرتا رہا۔

"اب طبیعت کیسی ہے آپ کی؟ آپ ادھر صحن میں.... بے ہوش ہو گئے تھے۔"

اب کی بار میں نے ذرا بلند آواز میں کہا۔ اس نے گہری گہری نظروں سے مجھے بڑے نفرت بھرے انداز سے دیکھا اور بولا۔

"میں بے ہوش ہو گیا تھا یا تم نے میری گردن دبا دی تھی؟"

"ایک ہی بات ہے جناب! بہر حال آپ بے ہوش ہو گئے تھے اور اس کے بعد اب ہوش میں آئے ہیں۔"

میں نے خنجر اپنی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا ــــ نظریں میری برابر اس کی حرکتوں پر جمی تھیں۔ مجھے اس سے بہت زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی کیونکہ میں دیکھ چکا تھا کہ وہ داؤ پیچ کا ماہر آدمی ہے۔ اگر میں اس کی رگِ احساس نہ مسل دیتا تو وہ مجھے صحن میں زیر کر چکا تھا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"یہ آپ کے ہمسائے کا گھر ہے۔ یہاں حمیدہ باجی رہتی ہیں۔ انہی کے صحن میں تو آپ کود رہے تھے۔ آپ کو یاد ہو گا۔"

"وہ.... وہ.... وہ حرامزادی کہاں ہے ــــ وہ میری بیوی...."

"وہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔ اسی وقت جب آپ بے ہوش ہوئے تھے۔ آپ نے تو اسے آج مار ہی ڈالا تھا۔"

اس نے تیزی سے اپنے پاؤں پلنگ سے نیچے اتارے۔

"یہ خنجر مجھے دے دیں۔ ابھی مجھے اس سے حساب لینا ہے۔" اس نے بڑے بارعب لہجے میں کہا۔

"جی نہیں! میں آپ کو کسی کی جان لینے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"تم کون ہو ہمارے معاملے میں دخل دینے والے۔ یہ خنجر مجھے دے دو.... یہ میرا ہے۔"

"کیا یہ کافی نہیں کہ یہ آپ کا گھر نہیں ہے اور مجھ پر آپ کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ میری بیوی بدچلن ہے۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے غیر مرد کے ساتھ دیکھا ہے۔ تم مجھے ہو میں اسے معاف کر دوں گا۔ میں.... میں ــــ" وہ مٹھیاں بھینچ کر پلنگ سے اٹھ گیا۔ میں نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ میں اسے کوئی.... موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

"میرا راستہ چھوڑ دو۔ میرے اور اس کے درمیان فیصلہ ہو کر رہے گا۔"

"ایک نہتی کمزور عورت پر ہاتھ اٹھانا مردانگی نہیں ہے، اشفاق صاحب! آپ جوان آدمی ہیں۔ اس کو قتل کر کے آپ خود مصیبت میں پھنس جائیں گے۔"

"مجھے سب کچھ معلوم ہے بیکار نے ساری نصیحتیں بے کار ہیں یہ خنجر ادھر لائیں۔"

"یہ تو میرے پاس رہے گا۔ آپ وہاں سے کوئی اور ہتھیار لے لیں۔ گھر میں اور بھی چھریاں ہوں گی۔ اور اس کام کے لئے تو چمٹا بھی بہت کافی ہے۔ وہ کمزور سی دھان پان عورت کیا کر سکتی ہے بھلا۔ بہتر تو یہ ہو گا کہ آدھ گز رسی لے کر اس کا گلا گھونٹ دیں۔ اسے تو مارنا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔" میں نے دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر کہا۔

میری مسکراہٹ پر وہ جل کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تم سے پھر نپٹوں گا مگر یاد رکھو! میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔ مجھے نہیں جانتے ہو تم۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

"ٹھہرو اشفاق میاں! میری بات غور سے سنو! ایسی لفنگی عورت کے پیچھے تمہیں پاگل ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ گھر جاکر اسے طلاق دے دو ——— یہی تمہارے لئے بہتر ہوگا سمجھے کہ نہیں۔ میری بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔" یہ کہہ کر میں نے اسے ایک طرف دھکیل کر دروازہ کھول دیا۔ خنجر میرے سیدھے ہاتھ میں تھا۔ وہ تلملاتا ہوا دروازے سے نکلا اور باہر چلا گیا۔ اس کے چہرے پر ایسی وحشت طاری تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ اگر اس وقت رُوحی گھر میں موجود ہوتی تو وہ اس کے ٹکڑے کر دیتا مگر اچھا ہوا کہ وہ وہاں سے فرار ہو چکی تھی۔

اشفاق نے گلی کا دروازہ اپنے پیچھے تھرّاپ سے بند کیا تو میں نے دیکھا کہ حمیدہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ باورچی خانے کے باہر کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلا تحیّر مجھے نڈھال کر گیا۔ اس تحیّر میں ایک عجیب سی نفرت گھلی ہوئی تھی۔ جس کا وہ اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے اس نے مڑتے دیکھا تو وہ فوراً ہی باورچی خانے میں جا گھسی۔ میرا جی چاہا کہ میں اس کے پاس جاکر اس سے پوچھوں کہ اس کے چہرے پر اتنا سارا تحیّر اور تکدّر کہاں سے پیدا ہو گیا ہے مگر رُوحی کی وجہ سے میرے دل میں خوف پیدا ہو گیا تھا۔ اب جو حمیدہ نے اشفاق کو برافروختہ حالت میں میرے کمرے سے باہر جاتے دیکھا تھا تو خدا معلوم وہ اپنے دل میں کیسے کیسے وسوسوں کو جگہ دے بیٹھی ہوگی۔ اس کا رویّہ میرے لئے بہرحال خاصا تشویشناک بن گیا تھا۔ وہ بہت بپھری ہوئی نظر آتی تھی ——— اس کا سامنا کرنے کے بجائے میں کمرے میں جا گھسا۔ خنجر میں نے میز کے دوسری طرف ڈال دیا۔

ابھی مجھے وہاں بیٹھے دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ دروازے پر بڑی زوردار دستک ہوئی۔ لگتا تھا کوئی سگ گزیدہ آدمی دروازے سے سر پھوڑ رہا ہے۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو حمیدہ بھی باورچی خانے سے نکلتی ہوئی آگے بڑھی۔

"آپ ٹھہریں میں دیکھتا ہوں باجی یہ کون بدتمیز ہے۔" انہیں راستے میں روکتے ہوئے میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو اشفاق نے اندھے بھینسے کی طرح مجھ سے ٹکرا کر مجھے پیچھے دھکیل دیا۔ میں کی ٹکر سے تیورا کر میں سامنے کی دیوار میں جا لگا۔

وہ گندی گالی بکتا ہوا میری طرف بڑھا۔ ایک چمکتا ہوا خنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ میرے بالکل سامنے آکر رک گیا اور کڑک کر بولا۔

"بتاؤ! مجھے بتاؤ! اس گشتی کو تم نے کہاں بھیجا ہے؟"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اشفاق! مجھے کیا معلوم وہ کہاں گئی؟ میرا کیا واسطہ ہے اس سے؟"

"تم جھوٹ بولتے ہو! بتاؤ وہ کہاں گئی ہے۔ وہ میرے گھر سے سوئی سلائی تک لے گئی ہے۔ سارا سامان وہاں سے غائب ہے۔" وہ بہت زیادہ غضب ناک ہو رہا تھا۔

"مگر مجھے کیا پتہ وہ کہاں گئی ہے؟ میرا کیا واسطہ ہے اس سے؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"تم یوں نہیں بتاؤ گے۔ میں ..... میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک دم آگے بڑھ کر خنجر کی نوک میری گردن پر رکھ دی۔ ٹھیک بائیں ہنسلی سے ذرا اوپر۔ اس سے پہلے کہ میں تیزی سے پیچھے سرکا تو میرے اور اس کے خنجر کی نوک کے درمیان ذرا سا فاصلہ پیدا ہو گیا۔ اس نے پھر خنجر آگے کیا تو میں نے اس کی کلائی دبوچ کر پوری قوت سے مروڑ دی۔ وہ بے بس ہو کر میری گرفت سے نکلنے کے لئے ایڑی پر گھوما تو اس کا بازو میں نے مروڑ کر اس کی کمر سے لگا دیا۔ وہ بہت ہی فحش گالیاں بک رہا تھا غصّے کی شدّت نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ میں نے اس کی کلائی پر ذرا سا دباؤ ڈالا تو خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔

"یوں کام نہیں چلے گا استاد! میرا خیال ہے تو اپنے دل کے ارمان نکال ہی لے۔" میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے خنجر کو دور پھینک کر اس کی کلائی کو ذرا سا جھٹکا دیا اور پھر اس کی کمر پر گھٹنا مار کر میں نے اسے سامنے کی دیوار میں دے مارا۔ اس کا سر دیوار میں اتنے زور سے لگا کہ وہ نڈھال ہو کر اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔

"یہ ..... یہ کیا ہو رہا ہے میرے گھر میں؟" حمیدہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"یہ بات آپ اپنے اس ہمسائے سے پوچھیں۔" یہ کہہ کر میں نے دروازہ اندر سے بند کر کے اشفاق کو اس کے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور پوری قوت سے ایک گھونسا اس کے منہ پر دے مارا۔ اور ——— اور ..... میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا نچلا جبڑا اپنے انداز سے باہر نکل آیا کہ اس کی شکل ہی نہ پہچانی جاتی تھی۔ وہ بالکل بن مانس لگ رہا تھا اس وقت ——— اس کا حال بالکل اس بدبخت ایسا ہو رہا تھا جسے میں نے اس روز گجرات کی طرف سفر کے دوران ٹیکسی میں الٹے ہاتھ کا جھانپڑ دے مارا تھا۔ اشفاق درد سے بلبلا کر زمین پر گرا تو حمیدہ نے واویلا شروع کر دیا۔

"ہائے یہ کیا کر دیا تو نے بھائی! یہ تو مر گیا ہے بیچارہ ——— ہائے میرے گھر میں خون خرابہ ہو گیا۔"

وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگی تھی۔ اشفاق کی آنکھیں مُندنے لگی تھیں۔ درد نے اس کے ہوش و حواس معطّل کر دیئے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کے جبڑے پر باہر کی طرف سے دائیں ہاتھ سے دباؤ ڈالا تو اس کا جبڑا اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ مگر اب اس میں مقابلے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔

"اسے پانی پلائیں باجی۔ معاملہ کچھ زیادہ ہی لگ گیا ہے اسے۔" یہ کہہ کر میں نے اشفاق کو سیدھا کر کے دیوار کے ساتھ بٹھا دیا۔ وہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ سر اس کا دائیں طرف جھول گیا تھا اور سانس اس کا دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

حمیدہ دوڑ کر پانی لائی ——— وہ اس نے غٹاغٹ پی کر بڑی بے چارگی کے انداز سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "تُو ..... تُو کیا چیز ہے میرے یار؟"

"ہاں پہلوان جی! اب کہو کیا حال ہے؟" میری یہ بات سن کر اس کی آنکھیں بہہ نکلیں۔ یہ موٹے موٹے آنسو اس کے رخساروں پر اُتر آئے۔ سانس اس کا ابھی تک قابو میں نہیں آیا تھا۔

"میرے ساتھ آؤ! ذرا میں بھی تو دیکھوں ادھر ہوا کیا ہے تیرے گھر میں؟"

"بھائی جی کیا ہوا ہے اُدھر۔ کیوں حملہ کیا اس نے آپ پر؟"

"اس کی بیوی گھر سے بھاگ گئی ہے باجی! اور یہ کہتا ہے کہ وہ اپنا سارا سامان بھی ساتھ لے گئی ہے۔"

"مگر آپ پر کیوں ہاتھ اٹھایا ہے اس نے؟"

"پتہ نہیں۔ یہ کہتا ہے کہ اس کی بیوی کو بھگانے میں میرا ہاتھ ہے۔ حالانکہ میں اس بے چاری کو جانتا تک نہیں۔ پہلی بار زندگی میں میں نے یہ گلی دیکھی ہے اور اس کی یہ منحوس صورت بھی میں آج ہی دیکھ رہا ہوں۔ اس بے غیرت کی۔"

"ہائے میں مر گئی! کیسے کیسے گل کھلے ہوئے ہیں یہاں؟ وہ تو جی پتہ نہیں کس کے ساتھ بھاگی ہے؟" حمیدہ نے حیرت زدہ ہو کر اور زیادہ تیزی سے اپنے ہاتھ ملے۔

میں نے اشفاق کو کندھوں سے پکڑ کر اس کے پاؤں پر کھڑا کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس کے بدن میں سکت ہی نہیں رہی ہے کچھ تو رُوحی کی اس بے وفائی نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ اس پر میری اس ٹھکائی نے اس کا رہا سہا حوصلہ بھی ختم کر دیا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر پاؤں پاؤں چلاتا ہوا اس کے مکان تک لے گیا ——— گلی اس وقت بالکل سنسان پڑی تھی۔ چاروں طرف سنّاٹا طاری تھا۔ البتہ ایک ریڑھی والے پٹھان کی آواز ذرا فاصلے پر گونج رہی تھی۔ "آلو وا پیاز لے لو، آلو وا پیاز۔"

اشفاق لڑکھڑاتا ہوا اپنے گھر کے کھلے دروازے میں داخل ہوا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ بہتان نہیں باندھ رہا تھا۔ اس کی گھاتیا بیوی ہاتھ دکھا گئی تھی۔ جب میں حمیدہ کے کمرے میں بیٹھا تھا تو مجھے گلی میں سے ٹرک گزرنے کی آواز تو سنائی دی تھی مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا بندوبست رُوحی نے کیا ہے۔ اشفاق کو ساتھ لے کر میں اس کے مکان کے چاروں کمروں میں گھوم گیا۔ ہر طرف بس کاٹھ کباڑ ہی دھرا نظر آتا تھا۔ رُوحی وہاں سے سارا قیمتی سامان ٹرک میں لاد کر لے گئی تھی۔ اشفاق پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے خالی ڈھنڈار گھر کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بھیانک خواب اس کی آنکھوں میں منجمد ہو کر رہ گیا ہو۔ میں نے اسے ایک جھلنگا سی چارپائی پر بٹھایا تو وہ اس پر یوں ڈھے سا گیا جیسے وہ کڑے کوسوں کی مسافت طے کر کے وہاں تک پہنچا ہو۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور صورتِ حال کی سنگینی نے اس کے دل پر ایسی دہشت طاری کر دی تھی کہ اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔

"تمہارا تو حلیہ ہی بگڑ گیا ہے میرے یار۔ ذرا حوصلے سے کام لو۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں پیارے۔ ذرا اپنی ہوا روک۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے کندھے تھپتھپائے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر اپنا جبڑا سہلا رہا تھا جو ایک طرف سے تھوڑا سا سوج گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اندر کچھ توڑ پھوڑ زیادہ ہی ہوگئی تھی۔ وہ سسکتے ہوئے بولا۔

"وہ مجھے تباہ کر گئی ہے۔ وہ خبیث عورت! میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسے جان سے مار دوں گا۔" غصّے کی ایک اور تیز کیسیلی لہر اس کے سر تک پہنچی اور اس کی آنکھیں پھر خون آلود ہونے لگیں۔ مجھے ان حالات کا قطعاً علم نہیں تھا جس نے ان کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ میں تو اب تک اس کی بڑھتی ہوئی دہشت سے اپنا ہی تحفظ کرتا چلا آ رہا تھا۔ وہ مجھے ہی اپنی اس بربادی کا ذمّے دار ٹھہراتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ساتھ ابھی تک اس کا رویّہ نہایت ہی توہین آمیز تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹے! تُو جا اور اس کے پیچھے جاکر اسے قتل کر دے میری بلا سے۔ خدا حافظ۔" یہ کہہ کر اسے اسی منہدم حالت میں چھوڑ کر باہر آگیا۔ اس کے گھر کی وہ اُجڑی صورت میرا دل ہلاتی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو کن اذیتوں سے دوچار کر رکھا تھا جس سے تنگ آکر اس نے ہمیشہ کے لئے اس کے چمن سے اپنا آشیانہ اٹھا لیا تھا۔ خاوند کے ہاتھوں جتنی خوشی ذبح ہو جانے کے لئے تو کوئی ستی ساوتری بھی تیار نہ ہوتی ہوگی اور وہ تو رُوحی تھی۔ جس کے سینے میں چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو نے آگ دہکا رکھی تھی۔ رُوحی کی مایوسی تو اس لمحے انتہا کو جا پہنچی جب اس نے اپنے مجازی خدا کو قصائی کا چھرا ہاتھ میں لئے اپنے پیچھے بھاگتے دیکھا ہوگا تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ میں صحن میں بیٹھا تھا

اورا تھی اونچی چھت سے وہ بے خطر کُود کر میرے سامنے آ گئی تھی ورنہ اب تک تو سارا قصہ ہی ختم ہو چکا ہوتا۔

حمیدہ کے گھر واپس پہنچ کر میں نے اندر سے کُنڈی چڑھائی اور سیدھا باورچی خانے میں جا پہنچا۔ حمیدہ بہت پریشان تھی مجھے اپنے پاس رکھی پیڑھی پر بیٹھتے دیکھ کر بولی۔

"بھائی جی! آپ مجھے صحیح بات کیوں نہیں بتلاتے ہیں۔ آخر یہ آدمی آپ پر کیوں چڑھ دوڑا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم ہے باجی! اس کی بیوی ذرا دیر کے لئے ادھر آئی ضرور تھی مگر وہ تو مرغی کی تلاش میں تھی۔ اس سے زیادہ تو مجھے کسی بات کا علم نہیں ہے۔"

حمیدہ میری یہ بات سن کر چپ ہو رہی مگر اس کے رویئے سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اسے میری بات پر اعتبار نہیں آیا ہے اور وہ میری توقع سے کہیں زیادہ معلومات سینے میں سمیٹے بیٹھی ہے۔

ابھی کھانا تیار ہونے میں شاید کافی دیر تھی اور اس نے جو چائے میرے لئے تیار کی تھی۔ وہ کیتلی میں پڑی ٹھنڈی ہو رہی تھی اس نے ایک بار پھر قہوہ چولھے پر رکھا اور چند ہی منٹ میں ایک پیالی چائے تیار کر کے اس نے میرے سامنے رکھ دی۔ ابھی میں وہیں اس کے پاس ہی بیٹھا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں سمجھا وہ اشفاق پھر آ گیا ہے۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور زمین پر پڑا اس کا خنجر اٹھا کر میں نے سیدھے ہاتھ میں لے لیا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب کی بار اس نے کوئی گڑبڑ کی تو میں اس کی انتڑیاں کاٹ کر رکھ دوں گا۔ اس بدبخت نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔

میں نے بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا تو میرے سارے اندازے غلط ثابت ہو گئے۔ میرے سامنے اشفاق نہیں آپی کھڑا تھا۔ ماجدہ اس کے پہلو سے لگی تھی۔ دونوں کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ مجھے نظر انداز کرتے ہوئے وہ دونوں آگے بڑھے اور چپ چاپ چلتے ہوئے کمرے میں جا گھسے۔ ان کی وہ لٹکی ہوئی صورتیں دیکھ کر میں تلملا کر رہ گیا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ آسیہ کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں لائے ہیں۔ میں بڑی آہستگی سے اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے آپی کے پاس پلنگ پر جا بیٹھا۔ وہ اب تک خاموش تھا۔ ماجدہ دوسرے پلنگ پر مہر بلب بیٹھی تھی۔

"کیا بات ہے تم دونوں کچھ پریشان نظر آتے ہو۔ خیر تو ہے؟"

"خیر نہیں ہے جیلانی! ہم تمہارے لئے کوئی اچھی خبر نہیں لائے ہیں۔" آپی نے بڑے ہی آزردہ لہجے میں کہا۔

"آخر ہوا کیا ہے میرے بھائی! اب تو میرے لئے کوئی بھی خبر بُری نہیں رہی ہے۔ مجھے بتاؤ تم نے وہاں کیا دیکھا ہے؟"

میں نے آپی کے لہجے کی زخم خوردگی پر پیچ و تاب کھاتے ہوئے [illegible] میں ..... میں بے بسی اور بے چارگی برداشت [illegible] مجھے اس لفظ اور کیفیت سے نفرت ہے۔ کوئی شے [illegible] میں اس وقت تو دماغ سے لوٹ جاتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ میری راہ میں کوئی شے حائل ہو گئی ہے۔ انسانی ہمت [illegible] کی حدیں تو زیادہ وسیع نہیں ہیں۔ مگر اس کی سرشت میں فطرت نے لامحدود جذبے بھر دیئے ہیں۔ وہی جذبے کی حرکی اور برقی قوت ہے جو اسے لامکان تک رسائی دلاتی ہے۔ مگر اس گھڑی آپی کے چہرے پر جو دھواں پھیلا تھا اس سے میں چڑ کر رہ گیا۔

"وہ ..... آپ کی بہن آسیہ یہاں سے رات ہی رات کسی اور جگہ بھیج دی گئی ہے۔" ماجدہ نے آپی کی مشکل آسان کرتے ہوئے مجھے صحیح صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

"ہوں! تو یہ بات ہے۔ انہوں نے اس شیر دل کا بھی سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔ وہ ہم سے خوف زدہ ہو گئے ہیں آپی۔ انہیں ہماری قوت کا اندازہ ہو گیا ہے۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے۔ ہم بغل میں ایٹم بم چھپائے پھرتے ہیں۔" آپی نے طنز کیا۔ "جیلانی میاں! انہوں نے آسیہ کو ادھر راولپنڈی جیل میں منتقل کر دیا ہے۔ اور ہمارے وہ بیس ہزار روپے بھی گئے جو ہم ڈاکٹر لطیف کو دے آئے تھے۔"

"وہ روپیہ ہم واپس لے لیں گے مگر سوال یہ ہے کہ اس بار انہوں نے اسے راولپنڈی کیوں بھیج دیا؟"

"یہ سب کچھ آہو کے مشورے پر ہوا ہے۔ ہمیں آہو کو زندہ نہیں چھوڑ دینا چاہئے تھا۔"

"بھئی بڑا ہی عیار آدمی ہے وہ آہو! کیسی پٹخنی دی ہے اس نے ہمیں۔ ع کو الف لکھ کر تو اس نے ہمیں مروا ہی دیا تھا۔"

"تیرا وہ خاص گُر کام آ گیا جیلانی! ورنہ وہاں تو ہم کوئی توپ نہ چلا سکتے تھے۔ بہت بڑا افسر ہے وہ جس کی گردن تم نے مل دی تھی۔"

"ارے نہیں! وہ تو پہلے ہی کانچ کا بنا ہوا آدمی تھا۔ گردن پر ہاتھ پڑتے ہی لٹک گیا۔ خیر مٹی ڈالو اس کے ذکر پر۔ مگر ... یہ بتا .....؟"

"ماجدہ! ادھر آئیو ذرا!" اچانک پیچھے سے حمیدہ کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ اس کے لہجے کی وہ کرختگی میرے لئے بڑی اذیت ناک تھی۔ وہ بہت ناراض دکھائی دیتی تھی۔

"کیا ہے باجی؟" ماجدہ تیزی سے اٹھ کر دروازے کے پاس جا ٹھہری۔

"اندر کیوں نہیں آتی ہو؟ پہلے تو ان سے تم نے پردہ نہیں کیا۔"

"بس میں ... ٹھیک ہوں ماجدہ! کہنا یہیں یہ چاہتی ہوں کہ آپ سب لوگ ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے چلے جائیں اور اپنی یہ سب چیزیں ساتھ لے جائیں اور یہ رقم بھی۔"

یہ کہہ کر اس نے نوٹوں کی گڈی بڑے غصے سے ماجدہ کے قدموں پر پھینک دی۔

"یہ کیا کہتی ہو باجی! کیا قصور کیا ہے ہم نے تمہارا! کوئی غلطی ہو گئی ہے ہم سے!"

"ہاں! میری زبان میں اتنی طاقت نہیں کہ میں وہ سب کچھ تمہیں بتا سکوں جو یہاں آج ہو چکا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم ایسے بے ضمیر اور بدچلن لوگوں کو لے کر یہاں آ جاؤ گی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ آج ہی یہاں سے چلے جائیں۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے سے ہٹ کر دوسری طرف چلی گئی۔ اس کے لہجے کی گھن گرج نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ دبی کچلی درد رسیدہ حمیدہ تو نظر ہی نہیں آتی تھی۔ میرا رنگ اڑنے لگا۔ ماجدہ مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھتی ہوئی میرے سامنے آ ٹھہری۔ بولی۔

"یہ ... یہ ..... یہ میں کیا سُن رہی ہوں جیلانی صاحب! لگتا ہے کوئی نیا گُل کھلایا ہے آپ نے!" وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہی تھی اور اس کے چہرے پر ایسا تحیر تھا کہ جیسے اس نے مجھے فضا میں تحلیل ہوتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔

میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اپنی بات کا کوئی جواب نہ پا کر وہ ایک قدم اور آگے بڑھی اور بولی۔

"جیلانی صاحب! بات کیا ہے آخر؟ حمیدہ باجی کو یہ سب کچھ کہنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

"میں ..... مجھے کیا معلوم۔ اسی سے پوچھو میرا تو خیال ہے وہ پاگل ہو گئی ہے۔" میں نے اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے ذرا دھیمے لہجے میں کہا۔ آپی مسکرا رہا تھا۔ بولا۔

"کوئی مرغی تو ذبح نہیں کر ڈالی تُو نے ادھر۔ آدمی تو بہت لسے دار ہے جیلانی بھائی۔"

"نہیں یار! یہ عورتیں بس ایسی ہی ہوتی ہیں پل میں تولہ پل میں ماشہ۔"

"تو آپ اس سے پوچھیں ماجدہ جی کہ قصہ کیا ہے؟ یہ نادر شاہی حکم کس سلسلے میں صادر فرما رہی ہیں آپ کی یہ حمیدہ باجی!" آپی نے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں اسی سے پوچھتی چلوں۔" یہ کہہ کر ماجدہ باہر نکل گئی۔ آپی بڑے غور سے میرے چہرے کے بدلتے رنگوں کا تماشہ کر رہا تھا۔ میری اس کیفیت سے ایک خاص مفہوم اخذ کر کے بولا۔

"جیلانی میاں! مجھے تو کچھ گڑبڑ گھوٹالا نظر آتا ہے۔ ہماری غیر حاضری میں ہوا کیا تھا آخر؟" وہ میرے پاس آ بیٹھا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

"کچھ بھی نہیں یار! پتہ نہیں یہ عورت کیا چاہتی ہے۔ ویسے بھی میرا خیال ہے کہ ہماری صورتیں اب شریفوں ایسی نہیں رہی ہیں۔"

"خیر نہ بتا! ابھی ماجدہ سے سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ لے اتنے میں سگریٹ پی۔ یہ لے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک سگریٹ میرے لبوں میں رکھ دیا۔

کوئی دس منٹ بعد ماجدہ آئی تو وہ مسکرا .. رہی تھی اور پریشان بھی تھی۔ آتے ہی بولی۔

"تو یہ بات ہے۔ باجی نے آپ کو رضی کے ساتھ دیکھ لیا تھا اور اس کے شوہر کو بھی جو اس وقت یہاں اس پلنگ پر بے ہوش پڑا تھا۔"

"اچھا اچھا! ذرا مجھے بھی بتایئے ماجدہ بیگم! یہ پلنگوں کا کیا قصہ ہے؟" آپی نے چہکتے ہوئے کہا۔

"بس ہاتھ صاف کر گئے ہیں۔ یہ کسی کی بیوی پر۔ وہ بیچاری ہمسائی تھی حمیدہ باجی کی۔ پتہ نہیں وہ ان کے ہتھے کیسے چڑھ گئی۔ بعد میں سنا ہے کہ اس کا خاوند ابھی یہاں بے ہوش ہی تھا کہ وہ اپنے جہیز کا سارا سامان ٹرک میں لاد کر بھاگ گئی اور جب شوہر کو ہوش آیا تو وہ بیچارا ٹاپتا ہی رہ گیا۔ اس نے باجی بتاتی ہے کہ ان پر چھرے سے حملہ بھی کیا تھا۔ بہت واویلا مچاتا رہا ہے وہ۔"

"[illegible] جھٹکے! حد ہو گئی۔ کمال ہے جیلانی بھائی! صد آفرین ہے! مرد ہو تو ایسا ہو۔ مگر وہ کہاں ہے اب؟ وہ اس ہمسائی کا شوہر نامدار ـــــ"

"پتہ نہیں! اس کا گھر سنا ہے بالکل خالی پڑا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تھانے جا پہنچا ہو۔ یا اپنے دوستوں کو لینے گیا ہے آپ کو سبق سکھانے کے لئے۔"

"ارے بیڑہ غرق! یہ تو اچھا نہ ہوگا جیلانی بھائی! جگت گیر کہہ گئے ہیں کہ اگر تو بچنا چاہتا ہے نا تو پولیس سے بچ کہ اس سے زیادہ بے لگام چیز میں نے اور کوئی نہیں دیکھی۔" آپی نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

ماجدہ کے منہ سے تھانے کا نام سن کر میں بدکا۔ اور اٹھ کر لباس تبدیل کرنے لگا۔ ابھی میں بالوں میں کنگھی ہی کر رہا تھا کہ باہر کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

"لو میرا خیال ہے وہ مصیبت آ ہی گئی ہے۔" ماجدہ نے گھبرا کر کہا۔

"اسے تو آجانے دیں نا۔ ہماری بھی ذرا ورزش ہو جائے گی۔ کئی دنوں سے کوئی اٹھک بیٹھک نہیں کر سکے ہیں ہم۔" آبی نے بڑے ڈھنگ لہجے میں کہا۔

"اور اگر وہ پولیس والے ہوئے تو؟"

"تو کیا ہے۔ میں نمٹ لوں گا ان سے۔" یہ کہہ کر آبی تیزی سے صحن میں نکلا اور دروازے کے قریب جا کر جھنجھلاتے لہجے میں بولا۔

"کون ہے؟"

"دروازہ کھول ادئے گشتی کے بچے ہم دیکھتے ہیں تو کتنے پانی میں ہے۔ توڑ دے تختہ پہلوان۔"

دروازے پر کوئی بڑے ہی رذیل قسم کے آدمی کھڑے تھے اور ان کی صحیح تعداد کا اندازہ ہم نہیں لگا سکتے تھے۔ لہٰذا ان کا ایسا بازاری تھا کہ میں صحن میں نکلا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ایک دم دونوں تختے میں نے دائیں بائیں ڈال دیے اور بالکل سامنے کھڑے آدمی کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر اندر گھسیٹ لیا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے پکے غنڈے پہلوان صفت آدمی تھے۔ وہ سب کے سب۔ اس آدمی کی گردن پر میری گرفت سخت ہوئی تو اس نے ڈب سے چاقو نکال لیا مگر پیشتر اس کے کہ وہ چاقو کھول سکتا۔ میں نے اسے آگے گھسیٹ کر اس کا سر سامنے کی دیوار میں دے مارا۔ اور خود پیچھے ہٹ گیا۔ پہلوان کے سر میں ایسی گہری چوٹ آئی کہ وہ وہیں بے ہوش ہو گیا۔ اتنے میں چاروں آدمی جن میں اشفاق بھی موجود تھا۔ مجھ پر پل پڑے مگر دو کو آبی نے الجھا لیا اور دو یوں کہ اس نے پیچھے سے ان کی ٹانگوں میں ہاتھ ڈال کر ان کو کچھ اتنی تیزی سے اوپر اٹھا کر اچھالا کہ وہ دونوں دھڑام سے فرش پر جا گرے۔ اشفاق اور اس کا ایک ساتھی مجھ پر گھونسے برسا رہے تھے اور کچھ اتنی سرعت سے وہ اپنا بدن مجھ سے بچاتے تھے کہ نہ ان کی کلائی میرے ہاتھ آتی تھی نہ گردن۔ اشفاق کو تو میں آزما چکا تھا۔ وہ خاصا مضبوط ہڈی کا آدمی تھا اور اپنی گردن وہ مجھ سے ہر حال میں بچا رہا تھا۔ ان کے تابڑ توڑ حملوں سے بچنے کے لیے میں نے درمیان کا فاصلہ کم کرنا چاہا تو اشفاق ایک دم پیچھے ہٹا اور زمین پر پڑی ہاکی اٹھا کر میری طرف لپکا۔ وہ ہاکی اس آدمی کے ہاتھ سے چھوٹی تھی جسے آبی نے چھاپ لیا تھا۔ اشفاق کا ساتھی اسے موقع دینے کے لیے ایک طرف سرکا تو میں نے کئی فٹ اونچا اچھل کر اشفاق کے سینے کو کچھ اس طرح پا کوب کیا کہ وہ ایک دم زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں اس سے کوئی دو ہاتھ آگے گرا۔ وہ سودا مجھے بہت مہنگا پڑا۔ اینٹوں کے فرش پر گرنے سے میری کمر پر سخت چوٹ آئی۔ ابھی میں سنبھل بھی نہیں سکا تھا کہ اشفاق کا ساتھی مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا۔ یہی میں چاہتا تھا۔ مصیبت یہ آ پڑی کہ اس حرامزادے نے پہلوان کا وہ چاقو اٹھا لیا تھا جو اس نے مجھ پر آزمانے کے لیے کھول لیا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے بائیں ہاتھ سے اس کی گردن کی رگ مسل دی۔ کچھ اتنی سختی سے میں نے اس کی گردن دبائی کہ میرا انگوٹھا خاصا گہرا دھنس گیا۔ وہ اس ہولناک تجربے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ بے ہوش ہو کر میرے اوپر ہی جھول گیا۔ اسے بے کار کر کے میں اٹھا تو دیکھا کہ ہاکی اب آبی کے ہاتھ آ چکی تھی اور اس نے مار مار کر دو آدمیوں کے سر کھول دیے تھے۔ مگر وہ کوئی بڑی ہی ڈھیٹ شے تھے۔ ابھی تک اس سے الجھے ہوئے تھے۔ ان کے سروں سے خون بہہ کر ان کے چہرے تر کر گیا تھا مگر وہ آبی سے ہار نہیں مانتے تھے۔

میں نے آبی کا کام آسان کرنے کے لیے آگے بڑھ کر ایک پہلوان کے منہ پر نچلے جبڑے کو تاک کر مولا علی کے نام کا ایک زوردار مکا جو لگایا تو اس کا جبڑا اپنی جگہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل گیا۔ وہ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ آدمی وہیں ڈھے گیا۔ اس کی شکل اس لمحے ایسی مکروہ ہو گئی کہ اس کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا۔

اپنے چار ساتھیوں کا یہ حال دیکھ کر آبی کا دوسرا مدمقابل پریشان ہو گیا۔ پیچھے ہٹا اور کھلے دروازے میں سے چھلانگ لگا کر گلی میں جا نکلا۔

"پکڑو اس پدی کے بچے کو۔ اس کا تو میں بھرتہ بنا دوں گا۔" آبی چیخا۔ اس کی یہ بات سنتے ہی میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ حالت اس کی ایسی ناگفتہ بہ تھی کہ اس سے بھاگا بھی نہیں جاتا تھا۔

گلی میں کئی آدمی تماشا دیکھنے کے لیے دروازے پر جمع تھے۔ میں ان کی بھیڑ کو چیرتا ہوا نکلا اور اسے سولھویں قدم پر جا پکڑا۔ میری گرفت سے بچ نکلنے کی کوشش میں اس سگ زادے نے میری بائیں کلائی پر اپنے دانت گاڑ دیے۔ یوں کہ میں درد سے بلبلا اٹھا۔ اپنی کلائی چھڑانے کے لیے میں نے پوری قوت سے اس کی گدی پر کھڑے ہاتھ کی چوٹ لگائی تو اس کا منہ کھل گیا۔ اس کی گردن پر چوٹ کچھ ایسی شدید لگی کہ اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ میں اسے دونوں ہاتھوں میں تھام کر گھسیٹتا ہوا واپس لے آیا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ آبی دروازے میں کھڑا تھا اور غصے میں بہت بری طرح پھنک رہا تھا وہ سمجھا کہ شاید ابھی تک اس آدمی کے کس بل نہیں نکلے ہیں۔ اس نے ہمیں گالیاں بھی بہت دی تھیں۔ آبی نے اسے میرے ہاتھوں سے جھپٹ لیا۔ وہ نڈھال تو ہو ہی رہا تھا، آبی کے ہاتھوں میں جاتے ہی وہ دہرا ہو گیا۔ آبی نے بائیں ہاتھ سے اس کے بال پکڑے اور دائیں ہاتھ سے شلوار کے نیفے کو گرفت میں لے کر اسے زمین سے اوپر اٹھا کر ذرا دیر کے لیے آگے پیچھے جھلاتے ہوئے پوری قوت سے دیوار میں دے مارا۔ اس کی تو شاید پسلیاں ہی چٹخ گئیں وہ ایسا گرا کہ پھر دیر تک نہ اٹھ سکا۔

ان پانچوں کو یوں فرش کر کے آبی دروازے میں جا ٹھہرا اور بولا۔

"اب آپ جائیں بھائی جان! تماشا ختم ہو چکا ہے۔ سلام علیکم۔" وہ یوں مسکرا رہا تھا جیسے ان لوگوں کی وہ ساری کیڑ بھیان اسی کو دکھانے کے لیے کی گئی تھی۔ ابھی آبی نے دروازہ بند نہیں کیا تھا کہ مجھے گلی کے موڑ پر پولیس کی ایک جیپ رکتی نظر آئی۔ اس میں سے کئی سپاہی بندوقیں ہاتھوں میں لیے تیزی سے نیچے اترے اور گلی میں داخل ہو گئے۔ ان کا رخ ہماری ہی طرف تھا۔ کسی نے شاید انہیں اس بلوے کی اطلاع دے دی تھی جو ہمارے دروازے پر ہو رہا تھا اور پولیس نے اپنی مستعدی دکھانے کے لیے فوری کارروائی کی تھی۔ ان کی تعداد چھ تھی۔ تھانیدار سب سے آگے تھا۔ ان کی اس دخل اندازی کا یہ انداز ہمیں کسی بھی طرح منظور نہیں تھا۔ پولیس کی تو صورت سے ہم ڈرتے تھے۔ ان کے ہاتھ آجانے کا مطلب یہ تھا کہ غلام جیلانی سیدھا تختۂ دار پر جا چڑھے۔

"اوئے آبی یہ کیا مصیبت ہے بھئی۔ تو ہی ان سے نمٹ لیں تو چلا۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور صحن میں جا نکلا۔ ماجدہ میرے پیچھے لپکتی آئی۔ سپاہیوں کو وہ بھی دیکھ چکی تھی۔ وہ مجھے صحن کے آخری کونے میں لے گئی۔ بولی۔ "آپ ..... آپ ادھر پانی کی ٹنکی میں چھپ جائیں۔" یہ کہہ کر اس نے فرش کے نیچے بنے پانی کے حوض پر سے سیمنٹ کا ڈھکنا اٹھانا چاہا مگر وہ خاصا بھاری تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ حوض کتنا گہرا ہے۔ پھر بھی ڈھکنا اٹھانے میں میں نے ماجدہ کی مدد کی۔ اس حوض کا دہانہ کھلا ضرور تھا کہ آدمی اس کے اندر آسانی سے اتر سکتا تھا۔ تاکہ صفائی میں وقت پیش نہ آئے۔ پولیس کے سپاہی دروازے پر آ پہنچے تھے اور آبی نے ان کا راستہ روک رکھا تھا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ حوض کے اندر میں نے نگاہ ڈالی تو میں نے دیکھا کہ وہاں پانی نام کی کوئی شے نہ تھی۔ سب سے مجھے بہر حال پولیس سے بچنا تھا کیونکہ مجھے یہی ڈر تھا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہو گا جو مجھے پہچان لے گا۔ وہ لمحہ مجھ پر بہت بھاری تھا اور اس وقت مجھے وہ حوض بہت ہی غنیمت معلوم ہوا تھا۔

"اس میں اتر جائیے۔" ماجدہ نے آواز دبا کر کہا۔

اس کی یہ آواز سنتے ہی میں پیر دستگیر کا نام لے کر اس میں اتر گیا۔ ماجدہ نے اپنے وجود کی ساری قوت صرف کر کے اس کے منہ پر ڈھکنا رکھا اور پھر اینٹوں کے فرش پر ٹھک ٹھک چلتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

اس کے قدموں کی چاپ معدوم ہوئی تو پہلی بار مجھے اپنی اس خوفناک حماقت کا احساس ہوا جو مجھ سے سرزد ہو چکی تھی۔ ڈھکنے کو مجھ سے حوض کے اندر گھپ اندھیرا چھا گیا تھا اور میں اس کے فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا اس حال میں کہ تازہ ہوا کا گزر وہاں ہو ہی نہیں سکتا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر میں وہاں پندرہ منٹ بھی بیٹھا رہتا تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ مگر نہیں ماجدہ نے مجھے قبر میں نہیں اتارا تھا۔ اس نے میری زندگی کی پھڑ کتی لرزتی لو کو قانون کی تند و تیز آندھی سے بچانے کے لیے مجھے ایک گوشۂ عافیت مہیا کیا تھا۔ اور اسے معلوم تھا کہ میں حوض میں دم گھٹنے سے نہیں مروں گا۔ اس نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ چند ہی لمحوں میں مجھے معلوم ہو گیا کہ اس حوض کے دائیں بائیں دو نالیاں لگی ہیں جو باہر گلی کی دیوار میں کھلتی ہیں چونکہ ابھی تک اس میں پانی جمع کرنے کے لیے نالیوں کا سلسلہ باہر کی کسی نالی سے منسلک نہیں ہوا تھا اس لیے ان دونوں نالیوں میں سے ہوا اندر آ رہی تھی۔ وہ ہوا اتنی زیادہ تو نہیں تھی۔ پھر بھی ان کے ذریعے سے وہاں جتنی بھی ہوا آتی تھی وہ کسی نہ کسی حد تک میری ضرورت پوری کر سکتی تھی۔ اگر یہ بات مجھے جلدی ہی معلوم نہ ہو جاتی تو شاید میں قبر سے نکلنے کے لیے کسی بڑے ہی خوفناک لمحے میں اس کا ڈھکنا اوپر اٹھا دیتا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ پولیس کے سپاہی آبی کے ساتھیوں کو گھر کے چاروں کونوں میں تلاش کرتے پھر رہے تھے اور پھر وہ سب کے سب صحن میں آ ٹھہرے تھے اور ان کی باتیں مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"آپ سے ڈر کر وہ آدمی بھاگ گیا ہے جناب جو ان سے لڑ رہا تھا۔" یہ آبی کی آواز تھی۔

"مگر وہ تھا کون؟"

"مجھے تو کچھ پتہ نہیں ہے جناب۔ میں بھی آپ کی طرح یہاں اجنبی ہوں۔"

"کیا بکواس ہے یہ! بی بی تم بولتی کیوں نہیں ہو۔ کون لوگ ہیں یہ؟"

"یہ میری اس سہیلی کے خاوند ہیں تھانیدار صاحب!" ماجدہ کے شوہر ہیں یہ۔"

"اور وہ دوسرا آدمی کون ہے؟"

"اس کا مجھے کچھ پتہ نہیں ہے بھائی صاحب۔ یہ لوگ لڑتے بھڑتے میرے گھر میں آ گھسے۔ میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"وہ آدمی ہے کہاں اب؟"

"وہ تو جی ادھر دیوار پھاند کر دوسری طرف نکل گیا تھا۔ میں نے خود دیکھا ہے اسے۔" یہ ماجدہ کی آواز تھی۔ وہ بڑے بے خوف لہجے میں انسپکٹر کو بے وقوف بنا رہی تھی۔ اور انسپکٹر پانی کے اس حوض کے بالکل اوپر کھڑا تھا جس میں میں اس طرح بند تھا کہ جس کی وجہ سے میرا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"جھوٹ بولتی ہے جناب یہ عورت۔ وہ آدمی اس کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ اسے اچھی طرح جانتی ہے۔"

یہ اشفاق کی آواز تھی۔ اس زن گزیدہ بدمعاش کو ہوش آ چکا تھا۔

"وہ جی بھاجی وہ ایسا بدمعاش آدمی تھا جناب کہ ..... کوئی" اٹھا ہی تھا وہ جی میری تو گردن ہی توڑ دی ہے۔ اس نے جناب۔" یہ غالباً اس

آدمی کی فریاد تھی جس کی گدی پر میں نے کھوڑے ہاتھ کی چوٹ لگائی تھی۔

"مونچھیں نیچی کرو بھاجی، اور گردن پر تیل ملواؤ۔ تم پانچ تھے اور وہ اکیلا تمہارے چاول چٹے کر گیا۔" انسپکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ بھی تو اس کے ساتھ ہی تھا بھاجی۔ ہمارا شیر پہلوان جی تو شاید جان بحق ہو گیا ہے بھاجی!"

"تمہارے ساتھ ایسا ہونا ہی چاہیے مگر غصہ تو مجھے اس اشفاق پر آ رہا ہے۔ یہ ہمارا دوست ہے مگر ایسا بے وقوف نکلا کہ چڑھ دوڑا ہے تمہیں ساتھ لے کر ان سے لڑائی لڑنے کے لیے۔ سیدھا تھانے کیوں نہیں آ گیا تو۔"

"آپ کو کس نے اطلاع دی تھی؟" اشفاق نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کوئی حامد علی صاحب ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ادھر ہمارے محلے میں بلوہ ہو گیا۔ بڑا خون خرابہ ہو رہا ہے۔"

"اچھا اچھا۔ وہ حامد علی ریٹائرڈ پرنسپل ہیں۔ ان کے ہاں ٹیلیفون موجود ہے۔ انہوں نے دیکھ لیا ہوگا یہ فساد۔"

"تو چل بھئی — لے چل اسے تھانے کیا نام ہے تیرا پہلوان! تو ابھی تک اصل بات نہیں بتا رہے ہیں۔"

"میرا نام افضل ہے جناب! مگر یہ آپ مجھے کس خوشی میں لیے جا رہے ہیں؟" یہ آبی کی آواز تھی۔

"تیری خوشنودی کے لیے میاں۔ اس خوشی میں کہ تو نے اتنے سارے آدمیوں کو لمبا لٹا دیا ہے۔ تجھے ہم تخت پر بٹھائیں گے تیرے سر پر ہم سہرا باندھیں گے، تمغۂ شجاعت دلائیں گے تجھے۔ سالا پوچھتا ہے کس خوشی میں۔ چلو اوئے باندھ لو اس سور کو۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے جناب مگر میں ذرا کپڑے تبدیل کر لوں اور اپنی بیوی سے ایک بات کہہ دوں۔ اتنی مہلت تو آپ مجھے دے ہی دیں گے جناب!" آبی نے نہایت ہی عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں ہاں جلدی کرو۔ کپڑے بھی بدل لو اور بیوی سے بات بھی کر لو مگر بات لمبی نہ ہو جائے۔ چل اوئے یونس ان زخمیوں کو ادھر گاڑی میں بٹھا۔" انسپکٹر نے کہا۔

"بہت اچھا جناب! تم میرے ساتھ آؤ ارشد۔ اور تم بھی۔" سپاہی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ مجھے پلنے اوپر فرش پر تین چار آدمیوں کے چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔

"تم بھی تھانے چلو بی بی۔ تمہارے بغیر تو یہ فلم مکمل نہ ہوگی۔ اصل ہیروئن تو مجھے تم ہی نظر آتی ہو اس کہانی کی۔ چل ادھر۔"

جب یہ بات انسپکٹر نے کہی تو میں ڈرا کہ کہیں وہ ماجدہ کو تھانے لے جانے کا ارادہ تو نہیں کر رہا ہے۔ مگر جب مجھے حمیدہ کی گھگھیائی آواز سنائی دی تو مجھے اس انسپکٹر پر سخت طیش آیا۔ وہ بدبخت اس بدنصیب کو خواہ مخواہ ان کانٹوں پر گھسیٹ رہا تھا جو ہم نے اس کے آنگن میں بچھا دیے تھے اور پولیس کی وہ مصیبت ہم پر اس لیے آئی تھی کہ کسی حامد علی نے انہیں فون پر اطلاع دے دی تھی اور اب وہ آبی اور حمیدہ کو اپنے ساتھ تھانے اس لیے لے جا رہے تھے کہ اشفاق اس تھانیدار کا دوست تھا اور وہ انسپکٹر اس بات کو فراموش کر بیٹھا تھا کہ اشفاق نے اپنے غنڈوں کی مدد سے حمیدہ کے مہمانوں پر حملہ کیا تھا۔ وہ الٹا گھر والوں کو پا بہ زنجیر کر رہا تھا۔ حمیدہ اب تک خاموش تھی اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر تھانیدار پھر بھونکا۔

"بولتی کیوں نہیں ہو؟ اوپر کوئی چادر شادر لے لو اور تھانے چلو۔ اس افضل سے کہو جلدی باہر آ جائے۔"

"مگر میرا قصور کیا ہے تھانیدار صاحب! میری مدد کرنے کے بجائے آپ مجھے ہی تھانے لے جا رہے ہیں۔"

"تو اور کیا کروں میں میری پیاری پھوپھی جان سلمہ تعالیٰ! اور یہ غنڈے تم نے اندر بٹھا رکھے ہیں۔ کیا لگتے ہیں یہ تمہارے؟"

"میرے؟ یہ میرے کچھ نہیں لگتے ہیں۔"

"ہاں اب تو یہی کہو گی! یہ مجھے کوئی لمبا ہی چکر نظر آ رہا ہے کیوں کریم خان! عورت یہ مجھے پہنچی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس غنڈے کو باہر لاؤ۔ چل اوئے تیری بات ہی ختم نہیں ہوتی۔"

"ابھی آیا چودھری صاحب! بس ابھی آیا۔" یہ آبی کی آواز تھی۔ پتہ نہیں وہ کمرے میں ماجدہ سے کیا کہہ رہا تھا۔

"آپ انصاف نہیں کر رہے ہیں تھانیدار صاحب۔"

"زیادہ ٹرٹر مت کر مائی۔ تجھے تو میں ضرور ساتھ لے کر جاؤں گا۔ ان لوگوں نے مار مار کر گلی کے شریف آدمیوں کا بھرکس نکال دیا ہے۔ آخر یہ ہیں کون؟"

"مجھے نہیں معلوم ہے کہ یہ کون لوگ ہیں۔ میں انہیں بالکل نہیں جانتی یہ کل زبردستی میرے گھر میں گھس آئے تھے۔ اس عورت کے ساتھ جو میرے کمرے میں بیٹھی ہے۔ وہ ادھر کنجاہ میں مستانی ہے وہی انہیں لے آئی ہے مجھے تو یہ لوگ شکل صورت سے جرائم پیشہ نظر آتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بی بی! مگر تمہارا ان سے کیا تعلق ہے؟"

"میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے صرف اس ماجدہ کو جانتی ہوں۔ یہ کچھ عرصہ پہلے ریل گاڑی میں میری واقف بنی تھی۔"

"اچھا! تو اب یہ اپنے خاوند کے ساتھ یہاں آئی ہے؟"

"نہیں ان میں سے کوئی بھی اس کا خاوند نہیں ہے۔"

"کیا؟ کیا کہتی ہو تم۔ یہ افضل اس کا خاوند نہیں ہے؟"

"اس کا نام افضل نہیں ہے۔"

"اچھا! کیا نام ہے پھر اس کا جو اندر جا گھسا ہے؟"

"اس کا نام آبی ہے۔ یہی میں نے سُنا ہے۔ مجھے تو یہ ڈاکو نظر آتا ہے۔ اس کا ساتھی جو ہے اس کا نام جیلانی ہے۔ غلام جیلانی۔"

"غلام جیلانی! او مائی گاڈ۔ یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔ اس کی گرفتاری پر تو پچاس ہزار روپے کا انعام مقرر ہے۔ وہ جیل سے بھاگا ہوا مجرم ہے بی بی۔"

"مجھے کچھ پتہ نہیں ہے جناب۔ مجھے تو ان لوگوں نے خواہ مخواہ ذلیل کر دیا ہے۔ میں نے خود دیکھا۔ اشفاق کو انہوں نے ادھر بے ہوش کر کے ڈال دیا تھا۔ اس کمرے میں۔"

"اوئے کریم خان یہ تو قصہ ہی اور ہو گیا۔ اس جیلانی کو کھو کر تو ہم برباد ہو گئے۔ وہ ہے کہاں بی بی اب؟"

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ اس ماجدہ نے اسے ادھر کونے میں جو پانی کا حوض ہے وہاں چھپا دیا تھا۔ ادھر ہی بیٹھا ہے وہ آپ کے بالکل پیچھے۔"

حمیدہ نے ہماری موت کا سامان پیدا کر دیا۔ تھانے کی بک بک سے بچنے کے لیے اس نے میری اور آبی کی نشاندہی کر دی تھی۔

"اچھا تو یہ بات ہے وہ گیدڑ کا پتر ادھر چھپا بیٹھا ہے۔ بیٹھا خود ہی جال میں پھنس گیا ہے۔ ذرا یہ ڈھکنا اٹھا کریم خان۔" تھانیدار نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

عین اس وقت صحن میں دو گولیاں چلیں اور وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ کسی کی دلدوز چیخ میرے کان سے ٹکرائی۔

"خبردار کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ ورنہ میں سب کو گولی مار دوں گا۔" یہ آبی کی آواز تھی جس کی گھن گرج نے مجھے حیران کر دیا۔

کوئی سپاہی زخمی ہو کر کراہ رہا تھا۔ "ہاتھ اوپر اٹھا کر ادھر دیوار کے ساتھ لگ جاؤ تھانیدار جی! اور تم بھی چلو اوئے۔" آبی نے اپنے وجود کا سارا تحکم ان کی طرف منتقل کرتے ہوئے کہا۔

صحن میں ابھی تک اچھل کود ہو رہی تھی۔

"یہ پستول پھینک دے استاد ورنہ تیرا یہ پیٹ میں پھاڑ دوں گا۔"

آبی کی یہ بات سنتے ہی تھانیدار نے پستول دور پھینک دیا۔ اس طرح کہ ٹھیک میرے سر کے اوپر حوض کے ڈھکنے سے دھم کر کے ٹکرایا۔

"یہ رائفلیں بھی پھینک دو۔ چلو۔" آبی نے سپاہیوں کو للکارا۔ رائفلیں صحن کے فرش پر گرنے سے دھم دھم کی آوازیں پیدا ہوئیں اور پھر سناٹا چھا گیا جس کو کسی زخمی سپاہی کی کراہیں ٹھہر ٹھہر کے درہم برہم کر رہی تھیں۔

"تم ادھر آ جاؤ بی جانو۔ آؤ ادھر ورنہ اچھا نہ ہو گا۔" آبی نے اب کی بار حمیدہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"میں۔۔۔ میں تم سے نمٹ لوں گا بیٹے۔ قبر کی دیواروں تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔"

"اوئے جا! بہت دیکھے ہیں تیرے جیسے [illegible] دیوار کی طرف منہ کر۔ کتنی منحوس شکل ہے تیری [illegible] اور گولی ان کو حواس باختہ کرنے کے لیے چلائی جس کا خاطر خواہ [illegible]

"شاباش! بہت فرمانبردار بچے ہو۔" آبی نے خوش ہو کر [illegible] خیال ہے کہ ان لوگوں نے اس کا حکم مان لیا تھا۔

عین اسی لمحے ڈھکنا اوپر اٹھا کر میں حوض سے باہر نکل آیا۔ تھانیدار نے ڈھکنا ایک طرف گرنے کی آواز سن لی تھی۔ وہ سب لوگ اس وقت دیوار کی طرف منہ کر کے اس طرح کھڑے تھے کہ سب کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ ڈھکنا گرنے کی آواز سن کر تھانیدار نے مجھے گردن گھما کر دیکھا تو اس کی پتلیاں پھیلنے لگیں۔ اس کی آنکھوں میں ایسی حیرت ابھر آئی تھی کہ باید و شاید۔ میرے سیدھے ہاتھ میں سائلنسر لگا پستول دیکھ کر وہ اور زیادہ حواس باختہ ہو گیا۔

"چلو اوئے ادھر شاہی مہمان خانے میں چلو۔"

"چلو ادھر کمرے میں، وہاں بیٹھ کر تم سے بات ہو گی۔" میری بات کا ان پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور وہ سب ہاتھ اوپر اٹھا کر کمرے کی طرف چلنے لگے۔ آبی کی اسٹین گن کی نال کھڑکی کی جالی میں سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ ایک سپاہی صحن کے وسط میں ٹانگ پکڑے بیٹھا تھا۔ گولی اس کی پنڈلی میں لگی تھی۔ اور زخم سے بہتا ہوا خون اس کی پتلون کو رنگین کر رہا تھا۔

میں نے ان تمام سپاہیوں اور تھانیدار کو اسٹور روم میں دھکیل کر باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ وہ ایسا گھپ اندھیرا کمرہ تھا کہ اس میں صرف ایک چھوٹا سا روشندان تھا۔ وہ ان کی ہوا کی ضرورت پوری کر سکتا تھا۔ مگر اس کمرے میں کاٹھ کباڑ اتنا تھا کہ وہ وہاں ٹھیک سے بیٹھ بھی نہ سکتے تھے۔ پھر بھی ان سے جان چھڑانے کے لیے یہی سب کچھ کرنا ہی تھا۔

میں نے ان کی رائفلیں اور تھانیدار کا پستول اٹھا کر حوض کے اندر ڈال کر اوپر ڈھکنا رکھ دیا۔ زخمی سپاہی میری اس کارروائی کو دیکھ رہا تھا۔ ایسے میں ضروری تھا کہ میں اس کی صدق دلی سے مدد کرتا۔ مجھے اس پر بہت ترس آ رہا تھا۔ اسٹین گن کی گولی نے اس کی پنڈلی کا گوشت ادھیڑ ڈالا تھا۔

اس کی یہ دگرگوں حالت دیکھ کر میں نے پیچھے سے ننگے پاؤں جا کر اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اس کی رگ احساس دبا دی۔ وہ فوراً ہی زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اب وہ بہت مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ حمیدہ اس وقت ڈری سہمی صحن کے کونے میں کھڑی تھی۔ اس کا رنگ پیلا ہو رہا تھا اور ایسی نظروں سے مجھے۔۔۔ دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ مجھے معاف کر دو جیلانی۔۔۔ میں۔۔۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔

"ادھر آئیں باجی! میں نے آپ کو بہن کہا ہے تو یہ رشتہ [illegible]

[illegible] دل میں عزیز رہے گا۔"

"اس پر لعنت بھیج یار۔ اور یہاں سے نکل چل۔"

آبی نے تیزی سے باہر نکل کر کہا۔ اسٹین گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اور مجھے یوں نظر آتا تھا کہ اگر کوئی اور مشکل اس کی راہ میں آئی تو وہ پاگل ہو کر اپنے ارد گرد کی ہر شے کو تباہ کر دے گا۔ اس کے چہرے پر جو بربریت پھیلی تھی۔ میں اسے آج تک نہیں بھول سکا ہوں۔ نرغے میں آتے ہوئے وحشی کی ایسی حالت ہو رہی تھی اس کی وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے گیا اور بولا۔

"اپنی چیزیں سمیٹ۔ میں اس جیپ کو خالی کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ میں نے ماجدہ کو ساتھ لے کر اپنی تمام چیزیں دو سوٹ کیسوں میں بھریں اور انہیں اٹھا کر صحن میں جا ٹھہرا۔ آبی نے ایک آدمی کو جیپ سے اتارا اور لا کر صحن میں ڈال دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر آبی حمیدہ کی طرف بڑھا اور کڑک کر بولا

"تیری اس بھول کا تجھے میں پھر مزہ چکھاؤں گا۔ تو نے میرے یار کو تو آج مروا ہی دیا تھا۔ سنبھال اپنا گھر۔ چل ادھر۔"

یہ کہہ کر اس نے نہایت سختی سے حمیدہ کی کلائی پکڑ کر اسے گھسیٹ کر انہی کے کمرے میں دھکیل دیا اور باہر سے کنڈی چڑھا کر بولا۔

"چل یار جلدی نکل چل اس چوہے دان سے ورنہ یہ عورتیں تجھے تباہ کر دیں گی۔" یہ کہہ کر اس نے ایک سوٹ کیس خود اٹھایا اور ایک مجھے دے دیا۔ ماجدہ اپنا صندوق اٹھائے ہوئے تھی۔

ہم تینوں بڑی افراتفری کے عالم میں باہر نکلے تو دیکھا کہ ابھی تک وہاں بہت سے آدمی بھیڑ لگائے کھڑے تھے۔

"تم کیوں کھڑے ہو یہاں۔ دفع ہو جاؤ ادھر سے ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔" آبی ان پر اسٹین گن تانتے ہوئے غرایا۔ وہ سب لوگ لرز کر ادھر ادھر بکھرنے لگے۔ آبی نے ماجدہ کو بڑے دہشت انگیز انداز سے کلائی پکڑ کر جیپ میں ڈال دیا۔

"چل یار چلا اس مصیبت کو اور بھاگ چل یہاں سے۔ یہ سارے تھانے میں فون ضرور کریں گے۔" آبی بہت جھلایا ہوا تھا۔ اس نے جیپ کے پچھلے حصے کے تمام پردے گرا لیے۔ میں نے گردوپیش پر آخری نگاہ ڈالی اور جیپ کو اسٹارٹ کر کے وہاں سے چل دیا۔

جوہر جی کی طرف نکلنے کے بجائے میں جیپ کو نواں کوٹ سے گزار کر یتیم خانے کی طرف لے چلا۔ بند روڈ پر پہنچتے ہی مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آئی۔ اسے رکنے کا اشارہ کر کے جیپ میں نے بند روڈ سے اتار کر ایک زیر تعمیر کوٹھی کے سامنے کھڑی کی پھر ماجدہ اور آبی کے ساتھ ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ جیپ میں بیٹھے رہنا ہمارے لیے کسی طرح بھی سود مند نہ تھا کیونکہ وہ پکار پکار کر کہتی تھی کہ میں پولیس کی ملکیت ہوں اور مجھے اغوا کر لیا گیا ہے۔

آبی نے یوں کیا کہ اسٹین گن جیپ سے اترتے ہی میرے حوالے کر دی۔ میں نے اسے کندھے سے لٹکا کر کمبل کے نیچے چھپا لیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کوئی بڈھا سا آدمی تھا اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ ہم کون ہیں۔ ہمارے حلیے کیا ہیں اور ہماری شکلیں کیا کہتی ہیں۔ جب ہم ٹیکسی کے دروازے بند کر بیٹھے تو وہ بولا۔

"کدھر چلوں میاں جی؟"

"چل ادھر لاہور ہوٹل کی طرف چل مزنگ کے رستے سے مگر جلدی کر بہت ضروری کام ہے۔" اس کا موڈ ابھی تک خراب تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی چھائی تھی کہ وہ مجھے اس روز اسلم آبی تو دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔

سارا رستہ وہ چپ رہا۔ میں اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی پریشانی کو بھی سمجھتا تھا۔ سارا شہر آباد تھا۔ رنگوں اور روشنیوں نے گلی گلی اودھم مچا رکھا تھا۔ ہر شخص کی اپنی ایک چھت تھی۔ ایک اس کا اپنا بستر تھا۔ مگر ہم دونوں بگولوں کی زد میں تھے۔ ہمارا کوئی در تھا نہ دہلیز۔ ہم اپنے ہی سائے سے لرزاں ترساں ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے تھے۔ ہم سے زیادہ بدنصیب بھلا اور کون ہو سکتا تھا۔ میں اپنی گردن پھانسی کے پھندے سے بچاتا پھر رہا تھا اور آبی کو معلوم تھا کہ جس دن اس کا چہرہ ان لٹے پٹے ویران گھروں کے پس منظر میں شناخت کر لیا جائے گا جنہیں وہ برباد کر چکا تھا۔ تو وہ دن اس کی زندگی کے بدترین دور کے آغاز کا دن ہو گا۔ اس نے خود اپنے لیے بڑی ہی سنگلاخ راہ منتخب کی تھی اور میرا یہ حال تھا کہ ایک لمحے کی غلط سوچ نے میری ساری زندگی لہولہان کر دی تھی۔

آبی کے ماتھے کی وہ شکنیں اس کی سوچ میں طلاطم زدگی کی آئینہ دار تھیں اور مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں وہ میرے ساتھ چلتے چلتے تھک کر کسی اور راہ پر نہ چل نکلے۔

لاہور ہوٹل کے سامنے پہنچ کر ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی تو آبی نے بڑی بجھی بجھی نظروں سے اس ہوٹل پر نظر ڈالی اور بولا۔

"ہم یہاں کیا کریں گے جیلانی! وہ لوگ تو ہماری تلاش میں آج زمین و آسمان ایک کر رہے ہوں گے۔"

"تو پھر یہ شہر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر لطیف سے پھر کبھی نمٹ لیں گے۔"

آبی نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ وہ ابھی تک کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس نے جھرجھری سی لی۔ اور ایک ٹیکسی کو روک کر بولا۔

"چلو اس میں بیٹھو۔ آج رات ہم شنگری صاحب کے ہاں

ٹھہر رہی گئے ۔"

"یہ کون صاحب ہیں ؟"

"میرے دوست ہیں ۔ پنکھوں اور سائیکلوں کا کارخانہ ہے ان کا ۔ ان سے میری ملاقات آہو کے ذریعے ہوئی تھی ۔"

یہ کہہ کر وہ ٹیکسی کے اندر جا گھسا ۔ وہ اگلی سیٹ پر بیٹھا تو میں نے ماجدہ کو اپنے ساتھ پچھلی سیٹ پر بٹھا لیا ۔ اس کے چہرے پر بھی سوچ کی لکیروں نے جال سا بن رکھا تھا ۔ وہ بھی غالباً اسی فکر میں ڈوبی تھی کہ اس غلام جیلانی کا ساتھ دے کر کیوں اس نے اپنی زندگی تباہ کر لی ہے ۔ وہ تو نہ ادھر کی رہی نہ اُدھر کی ۔ میں نے اُس کے ذہن سے اس کے شوہر کا ہم کھرچ ڈالا تھا اور مجھ سے اس نے ایسی امیدیں وابستہ کر لی تھیں جو سر تا سر سراب تھیں ، وہ کبھی پوری نہیں ہو سکتی تھیں کیونکہ میں تو گھر بسانے کی صلاحیت ہی کھو چکا تھا ۔ میں اس وہم میں تو ہرگز مبتلا نہیں تھا کہ ماجدہ میری محبت میں گرفتار ہو چکی ہے ۔ ایسی بات ہرگز نہیں تھی ۔ وہ صرف ایک مضبوط پناہ کی متلاشی تھی ۔ اسے ایسی باہوں کی ضرورت تھی ، جو اس کی حفاظت کر سکیں ۔ یہ قوت اس نے میرے بازوؤں میں دیکھی تھی وہ میری طرف کھنچتی چلی آئی مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ میری چار دیواری کے اندر تو جرائم کا دوزخ دہک رہا ہے ۔ مجھے تو کسی بھی معاملے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی ۔ اپنا مطلب نکالنے کیلئے میں انسانی خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کرتا ۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اندر ہی اندر لرز رہی تھی ۔ رہ رہ کر اپنے اس بریف کیس پر اس کی گرفت مضبوط ہو جاتی تھی ۔ جس میں اس نے آہو کی الماری سے نکالا ہوا روپیہ بھر رکھا تھا ۔ وہ ایک مکان خریدنے کا سپنا دیکھ رہی تھی ۔ مگر حمیدہ کے گھر میں اس نے مجھے اور آبی کو جس سفاکی سے پولیس کو زیر کرتے دیکھا تھا اور جن عجیب غریب حالات کا وہ روح کے سلسلے میں مشاہدہ کر چکی تھی ۔ وہ سب ایسی باتیں تھیں جو اسے پریشان کر رہی تھیں ۔ وہ فطری طور پر بہت ذہین عورت تھی ۔ ہر سوال کا جواب وہ تلاش کر لیتی تھی ۔ وہ میری سرشت سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد اب اپنے وجود کو مجھ سے چھپا لینا چاہتی تھی ، کیونکہ جس جنت گم گشتہ کی بازیافت کیلئے وہ کوشاں تھی ۔ وہ اسے نہیں مل رہی تھی اور میرے ساتھ یوں در در پھرنا اسے کسی بھی طرح گوارا نہیں تھا ۔ اس کے رویئے سے بہر طور میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ، کیونکہ وہ ٹیکسی میں جب میرے ساتھ بیٹھی تو درمیان میں اس نے خاصا فاصلہ قائم رکھا ۔ وہ ہر جگہ میرے ساتھ جڑ کر بیٹھتی تھی مگر اس روز وہ مجھ سے دور ہو رہی تھی ۔ میری قربت سے شاید اسے وحشت ہونے لگی تھی ۔ اس کے چہرے پر گھنڈی زردی اس بات کی غماز تھی کہ اپنے مستقبل اور اپنے حال کی بے یقینی نے اسے بہت بُری طرح نڈھال کر رکھا تھا ۔

اور میں ڈرتا تھا کہ میرے یہ دونوں ساتھی کسی بھی وقت مجھ سے دغا کر سکتے ہیں ۔ وہ دونوں ہی تھک چکے تھے اور اب میرے ساتھ اور آگے چلنے سے گریزاں تھے ۔ میرے اور ان کے مقاصد جدا تھے ۔ آبی محض اپنے ایک جذبے کی تسکین کے لیے قزاقی اور رہزنی کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے ۔ وہ پیشہ اس کی ضرورت ہرگز نہیں تھا اگر ایسا ہوتا تو اس کے گھر کی وہ حالت نہ ہوتی جو میں دیکھ کر آیا تھا ۔ اس کی ماں یوں افلاس و نکبت کی زندگی نہ گزارتی ۔ وہ تو ملازمائیں کر کے وہ سکتی تھی ۔ محلوں میں بسیرا کرتی تو بھی وہ اُسے راس آ جاتے کیونکہ اس کے بیٹے نے اپنی قوتِ بازو اور بے مثال ذہانت سے اس وقت تک لاکھوں روپے ادھر سے اُدھر کر دیئے تھے ۔ مگر وہ روپیہ ، وہ محنت اور وہ اس کی شب زندہ داری ، وہ اس کی اندھیروں سے لامتناہی جنگ سب بیکار جا رہی تھی کیونکہ جو کچھ آبی کے ہاتھ آتا تھا تیزی سے دُوسروں کی جیبوں میں چلا جاتا تھا ۔ اس کے دریائے فیض کا ایک قطرہ بھی اس کے گھر نہیں پہنچتا تھا وہ ہوا کے اس عطر بیز جھونکے ایسا تھا جو باغوں سے خوشبو چرا کے جھونپڑوں کے تنگ آنگنوں کو مہکانے کے لیے وجود میں آتا ہے اور یہ احساس دلاتا ہے کہ زندگی ابھی اس قابل ہے کہ اُسے ڈھنگ سے گزار دیا جائے ۔ اس سے محبت کی جائے اور اس کے دامن میں بھرے سکھ ہی پھولوں سے استفادہ کیا جائے ۔ آبی ایسا ہی تھا مگر اب وہ مجھ سے بُری طرح اُکتا چکا تھا ۔ اس کے چہرے سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا کیونکہ اُس کی وہ چپ کسی بھی طرح بے معنی نہیں تھی ۔

ٹیکسی آبی کے اشارے پر ایک جگہ رُکی تو معلوم ہوا کہ وہ ریلوے ورکشاپ کا عقبی علاقہ ہے ۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑا مکان تھا جس کی پیشانی کی آرائش و زیبائش پر مالک نے خاص توجہ دی تھی ۔

آبی نے ٹیکسی ڈرائیور کو دس کے بجائے بڑی فراخدلی سے بیس روپے دیئے ۔ اور ہمیں اپنے ساتھ لے کر دروازے پر جا ٹھہرا ۔ وہ مکان ایسی جگہ بنا تھا کہ اس کے ارد گرد خاصی دُور تک کوئی مکان نہیں تھا اور اس کے عقب میں ریلوے ورکشاپ کا لامتناہی سلسلہ افق تک پھیلتا چلا گیا تھا ۔ وہاں سناٹا ایسا تھا کہ مجھے اپنے دل کی دھڑکن بھی صاف سنائی دیتی تھی ۔ مکان کے دو دروازے تھے ۔ ایک بہت بڑا گیٹ تھا جس میں سے بڑی سے بڑی گاڑی بھی اطمینان سے گزر سکتی تھی ۔ وہ دائیں ہاتھ صحن میں کھلتا تھا ۔ آبی نے جس دروازے پر دستک دی وہ بائیں ہاتھ تھا ۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ اس مکان میں بجلی کا کوئی انتظام نہیں ہے کیونکہ آس پاس مجھے کہیں کوئی تار یا کھمبا نظر نہیں آ رہا تھا ۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے ... ہمیں خاصی دیر ہو گئی ۔ میرا خیال تھا کہ دس منٹ تو گزر ہی گئے تھے ۔ مگر کسی نے دروازہ کھولنے کی زحمت نہیں کی ۔ آبی کا پارہ دم بدم اوپر اُٹھتا جا رہا تھا ۔ جب انتظار زیادہ ہی طویل ہو گیا تو اس نے بڑے زور سے دروازہ پیر پاؤں سے ٹھوکر دی اور بولا ۔ "معلوم ہوتا ہے اندر کے سب آدمی قتل ہو چکے ہیں ۔" دو

بہت سنجیدہ ہو رہا تھا ۔

"ارے نہیں یار ایسا نہ کہو ۔ اتنا بھی اندھیر نہیں مچا ہے ۔"

"اندھیر کی کیا بات ہے ۔ یہ دروازہ کیوں نہیں کھولتے ۔" یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹایا ۔

"کون ہے ؟" ایک غنغنی سی مردانہ آواز سنائی دی ۔

"اوئے دروازہ کھول فیقے ! یہ تو اندر کیا کر رہا تھا ۔ یہاں کھڑے کھڑے ہم تختہ ہو گئے ہیں ۔"

"اوئے بیڑہ غرق ! آبی سائیں آپ ! میں بھی کیسا اُلّو ہوں ۔" اس آدمی نے یہ کہہ کر دروازہ کھول دیا اور باہیں پھیلا کر آبی سے لپٹ گیا ۔

وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا مگر اس کا قد کاٹھ اتنا مضبوط تھا کہ وہ جوانوں کو بھی مات کرتا تھا ۔ اس کے ہاتھ مجھے مٹی میں سنے نظر آئے تھے اور کپڑے بھی گرد آلود تھے ۔ حد یہ تھی کہ اس کے بالوں میں بھی مٹی سی تھی ۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ٹوکری مزدور ہے اور ابھی ابھی کسی مستری کی چاکری سے اُٹھ کر اِدھر آیا ہے ۔

"بس زیادہ چاپلوسی نہ کر فیقے میں تجھے اچھی طرح سمجھتا ہوں ۔ کہاں ہے وہ شنگری ؟"

"وہ تو ادھر سکھر گئے ہوئے ہیں کل سے ۔ بس ایک دو دن میں آ جائیں گے ۔"

"لعنت بھیج اُس پر ۔ تو ہمیں اندر بٹھا بہت تھکے ہوئے ہیں ہم ۔"

"میں حاضر سائیں ۔ گھر آپ کا ۔ گھر والے آپ کے ۔ میں حاضر سائیں ! میرے ماں باپ حاضر ۔"

"ابے ! تیری یہ مجھے دار باتیں ختم ہوتی ہیں کہ نہیں ابھی ـــ کوئی کھانا شانا بھی مل سکے گا کہ نہیں ؟" آبی نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا ۔ اس کا سوٹ کیس فیقے نے اٹھا لیا تھا ۔ ماجدہ اور میں اپنا اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے ان کے پیچھے چل رہے تھے ۔ فیقا ہمیں ساتھ لے کر مکان کے اندر داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ صرف پیشانی ہی سجی ہے باقی سب کچھ کھنڈر ہے وہاں کوئی شے بھی سلیقے سے نہیں رکھی تھی جس کمرے میں فیقے نے ہمیں بٹھایا وہاں ایک نواڑی پلنگ بچھا تھا ۔ نواڑ اس کی اتنی میلی تھی کہ دیکھ کر طبیعت الجھتی تھی اس پر گرد اتنی جمی تھی جیسے اسے کسی نے صدیوں سے استعمال نہیں کیا ۔ یہی حال وہاں رکھی ہوئی کرسیوں کا تھا جو دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ لگی تھیں ۔ ان کے سامنے ایک میز تھی جس پر شیشہ لگا تھا ۔ وہ بھی گرد میں اٹی تھی ۔

فیقے نے جلدی جلدی ان تمام چیزوں کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا تو ان کی اصل صورت نظر آئی ۔ بولا ۔

"آبی سائیں مجھے افسوس ہے مگر یہ گھر تو بس ایسا ہی ہے ۔

شنگری صاحب تو بس اپنے کمرے سے غرض رکھتے ہیں ۔

کسی پوستی کی اولاد ہے تو فیقے ! اسے کبھی صاف تو کر لیا کر ۔ یہ کمرہ کوئی رہنے کے لائق ہے ۔"

"شنگری صاحب کے دونوں کمروں میں تالے پڑے ہیں آبی سائیں ! ورنہ میں آپ کو اُدھر ہی بٹھاتا ۔ بہر حال گزارا کریں ۔ ادھر غسل خانہ ساتھ ہی ہے آرام رہے گا ۔"

"مجھے کیا آرام رہے گا ؟"

"آپ کی عادت ہے نا آبی سائیں بار بار جانے کی ، اس لیے ۔" یہ کہہ کر فیقا مسکرایا تو اس کے نسوار زدہ دانت دیکھ کر مجھے شدید کراہت محسوس ہوئی ۔ وہ خاصا گندہ آدمی تھا ۔

ماجدہ فرش پر اپنا اٹیچی کیس رکھ کر ابھی تک چپ چاپ کھڑی تھی ۔ آبی کی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی تو بولا ۔

"فیقے شنگری کے کمرے کھول دے ہم ادھر نہیں رہیں گے ۔"

"بجا ہے سائیں ! میں اُن کے گھر سے چابی لے آتا ہوں ۔"

"جو مرضی آئے کر مگر یہ جگہ بالکل بیکار ہے ۔ چل ادھر وہ کمرے کھول دے کسی طرح ۔"

"دیکھتا ہوں سائیں ، شاید وہ چابیاں گھر چھوڑ گئے ہوں ۔ ادھر گڑھی شاہو جاتا ہوں میں ۔" یہ کہہ کر فیقا کچھ سوچتا ہوا دوسری طرف نکل گیا ۔

آبی اگرچہ فیقے سے بہت اچھے لہجے میں بات کر تا رہا تھا مگر اس



کے چہرے پر پھیلا ہوا تکدّر ابھی تک دور نہیں ہوا تھا۔ پلنگ کے ایک کونے پر بیٹھتے ہوئے بڑے بھرّے ہوئے لہجے میں بولا۔
"جیلانی بھائی! مجھے نہیں معلوم تھا تو اس قدر من چلا اور لاپروا آدمی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے نکال کر سگریٹ سلگا لیا۔
"تو بھی بیٹھ جا ماجدہ بی بی، کہاں دربدر ہوتی پھر رہی ہے۔ تو بھی ہمارے ساتھ بیٹھ جا۔"
"میں تیرا مطلب نہیں سمجھا ہوں آبی بھائی۔" میں نے حیران ہو کر کہا تھا۔
"میرا مطلب یہ ہے کہ حمیدہ کے گھر میں تجھے مروار کھانے کی کیا ضرورت تھی۔ پتہ نہیں وہ گشتی کون تھی، کیا تھی اور تو نے ڈال دیا اس پر اپنا جال۔"
"مجھے افسوس ہے یار! مگر وہ تو خود ہی مجھ پر جھپٹ پڑی تھی بڑی تیز عورت تھی وہ۔"
"اور خوبصورت بھی؟"
"عورتیں تو سبھی خوبصورت ہوتی ہیں یار! آدمی جوان ہو تو ہر چہرے میں حور نظر آتی ہے۔" میں نے ماجدہ کو ایک کرسی پر دھکیلتے ہوئے کہا۔
"مگر تو جس دھندے میں ہے نا میرے یار اس میں آدمی اگر مار کھاتا ہے تو صرف عورت کے ہاتھوں۔ یہ روپے کا جال آدمی کو کہیں کا نہیں رکھتا ہے۔ دیکھا نہیں تو نے کہ اس حمیدہ پر کتنا روپیہ صرف کیا ہے ہم نے۔ کتنی دل جوئی کرتے رہے ہیں ہم اس کی۔ مگر ذرا سا دباؤ بھی وہ برداشت نہیں کر سکی۔"
"ہاں یہ تو ہے۔"
"یہی نہیں بلکہ اس نے ایک بار پھر سارے شہر کی پولیس کو چونکا دیا ہے۔ آج وہ تمہیں جگہ جگہ تلاش کرتے پھر رہے ہیں گے۔"
"میرا تو خیال ہے کہ ہم آج ہی اس شہر سے نکل جاتے ہیں۔"
"پاگل ہے تو بالکل۔ ارے میں کہتا ہوں انہوں نے آج ساری سڑکوں کی ناکہ بندی کر دی ہوگی۔ وہ تجھے کسی بھی طرح معاف نہیں کریں گے۔ انہوں نے تیرے لیے زبردست مشکلات پیدا کر دی ہیں۔"
"مجھے بھی یہیں ہو گا میرے یار! اگر میں یوں ڈرنے لگا..... تو پھر ہو چکی ڈکیتی داری۔ وہ مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔"
"میری یہی دعا ہے تو محفوظ رہے مگر میں کل یہاں سے نکل جاؤں گا۔"
"تم کیسے نکل سکو گے۔ خود ہی کہتے ہو کہ سڑکوں پر انھوں نے ناکہ بندی کر دی ہوگی۔"
"میرا گھر پہنچنا بہت ضروری ہے میرے یار۔ ادھر برباد ہو رہے ہیں۔ انہیں کسی بدمعاش نے ادھر سخت زخمی کر دیا تھا اور میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا۔"
"مجھے افسوس ہے آبی! کہ وہ سب کچھ میرے....." یہ میں نے فقرہ بالکل چھوڑ دیا۔
"کہو کہو۔ رک کیوں گئے؟"
"وہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا آبی! میں نے ہی انہیں اس رات حبیب شاہ کے مکان پر جا کر زخمی کیا تھا۔"
"اچھا۔ تو وہ تیرا کارنامہ تھا۔ میں بھی سوچتا تھا کہ ایسا کون مائی کا لال ہے جس نے میرے آدمیوں کو یوں چت کر دیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے چیتے ایسی پھرتی سے پستول نکال کر اس کی نال میری طرف کر دی۔ اس کی آنکھوں سے اچانک ہی نفرت کی چنگاریاں پھوٹنے لگی تھیں۔ وہ پورے قد سے اب میرے سامنے تن کر کھڑا تھا اور اس کا چہرہ شدتِ غضب سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ انگلی اس نے لبلبی پر جمائی تھی۔
"تجھے..... تجھے ان سے کیا دشمنی تھی جیلانی! کیوں تو نے ان کا راستہ روکا؟"
"مجھے افسوس ہے آبی مگر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ تابیا اور گوگا اور وہ قطب دین گوہر کے ساتھ زیادتی کر رہے تھے۔ مگر یہ تو اپنا بھڑک کیوں گیا ہے؟"
"یہ میں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تو بیچ میں کیوں کودا؟ تیرا کیا بگاڑا تھا ان لوگوں نے۔ وہ ادھر ابھی تک برباد ہو رہے ہوں گے۔"
"میں نے ادھر اینٹوں کے بھٹے پر ان کی باتیں چھپ کر سن لی تھیں۔ وہاں دو عورتیں بھی موجود تھیں۔ ایک کا نام چینو تھا اور دوسری کا جلتے۔ وہ سب لوگ ان سے چہلیں کر رہے تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ حبیب شاہ کے گھر ڈنگری جا کر ڈاکہ ڈالیں گے۔ گوہر اس بات کا سخت مخالف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ مزدور آدمی ہے محنت سے روپیہ کما کر انگلینڈ سے واپس آیا ہے اسے مت لوٹو مگر تابیے نے اس کو مار کر بے ہوش کر دیا تاکہ وہ ان کا راستہ نہ روک سکے بس اسی بات پر میں نے گوہر کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور پھر جو کچھ ہوا، وہ تمہیں معلوم ہی ہے۔"
آبی بڑے غصے سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس گھڑی وہ مجھے کوئی دوسرا ہی آدمی نظر آ رہا تھا۔ بڑے جمے ہوئے لہجے میں بولا۔
"باہر آ جا جیلانی! تیرے میرے درمیان اب کوئی بات باقی نہیں رہی۔ باہر آ جا۔"
"یہ کیا کہہ رہے ہو آبی۔ مجھ سے لڑو گے تم؟"
"بکواس بند کر جیلانی! میں نے قسم کھائی تھی کہ اپنے ان یاروں کے دشمن سے بدلہ ضرور لوں گا۔ باہر آ جا! میں نے ماں کے دودھ کی قسم کھائی ہے۔ تجھے میرا مقابلہ کرنا ہو گا۔"
"نہیں آبی! میں تیرے مقابلے پر نہیں آ سکتا۔ نہیں نہیں! تو اپنی قسم پوری کر لے۔ یہ لے یہ رہا میرا پستول اور یہ رہی میری اسٹین گن۔ میں..... میں تجھ سے نہیں لڑ سکتا۔"
یہ کہہ کر میں نے اپنے دونوں ہتھیار آبی کے سامنے ڈال دیے۔ مگر ان ہتھیاروں کو بڑے زور سے پاؤں کی ٹھوکر مار کر آبی مجھ پر جھپٹا اور میرے گلے میں لپٹے کمبل کو بائیں ہاتھ سے پکڑ کر وہ مجھے گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف لے چلا۔ میں نے قطعاً کوئی مزاحمت نہیں کی یوں چپ چاپ اپنے سامنے مجھے زیر ہوتے دیکھ کر اس کا غصہ اور بھڑک اٹھا۔ اس نے کمبل چھوڑ دیا۔ اور بائیں ہاتھ سے اس نے پوری قوت سے میرے منہ پر ایسا تھپڑ مارا کہ میری آنکھوں میں تارے سے ناچنے لگے۔ میں نڈھال سا ہو کر دروازے کے ساتھ لگ گیا۔ آبی کی آنکھوں میں کھولتی نفرت کے سوا اس گھڑی مجھے کوئی اور جذبہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔
مجھے بڑی فحش گالی دیتے ہوئے وہ بولا۔
"میں تجھے معاف نہیں کر سکتا جیلانی! ہرگز نہیں۔ میں نے تابیے کے سامنے قسم کھائی تھی۔ ہاں، میں وہ قسم ضرور پوری کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور زمین پر سے پستول اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ لے اسے پکڑ۔ میں اپنی قسم پوری کر کے رہوں گا۔"
اس کی یہ بات سن کر ماجدہ بڑے غصے سے بولی۔
"پاگل ہو گئے ہیں آپ آبی صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں؟ آپ کو شرم آنی چاہیے۔ یہ بھی تو آپ کے دوست ہیں۔"
آبی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور دانت پیستے ہوئے بولا۔
"تو چپ رہ گشتی عورت! تیری قیمت کا بھی مجھے علم ہے۔ چل جیلانی! مجھے کوئی غلط قدم اٹھانے پر مجبور نہ کر۔ یہ لے یہ پستول پکڑ۔" یہ کہہ کر اس نے میرا پستول زبردستی میرے ہاتھ میں تھما دیا اور پھر مجھے وہ گھسیٹتا ہوا صحن میں لے گیا، وہاں فرش کچا تھا جس پر جا بجا باریک بجری نظر آتی تھی۔
"تجھے مجھ پر گولی چلانی ہو گی جیلانی! اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو مجھے مجبوراً تجھے ٹھنڈے پنڈے مارنا پڑے گا مت سمجھ کہ میں تجھے چھوڑ دوں گا۔"
"میں تجھ پر گولی نہیں چلا سکتا ہوں آبی! تو..... تو اپنی قسم پوری کر لے۔ میں تیار ہوں۔ میرا سینہ حاضر ہے۔" یہ کہہ کر میں نے کمبل اتار کر ماجدہ کی طرف پھینک دیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی مجھے دیکھتی کبھی آبی کو۔ اور بدن اس کا بری طرح لرز رہا

تھا۔ اس کے وہم و گمان میں یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ کسی مرحلے پر میرے اور آبی کے درمیان یوں ٹھن جائے گی۔ اس نے کمبل پکڑنے کی کوشش نہ کی اور وہ اس کے سامنے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

آبی اس وقت مجھ سے دس قدم دور کھڑا تھا۔ اور مجھے للکار رہا تھا۔ "جیلانی گولی چلا جیلانی! میں تجھے موقع دیے بغیر نہیں ماروں گا۔"

میں نے اپنا پستول بڑے غصے سے دور پھینک دیا۔

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے آبی! میرا خیال تھا کہ تو مجھ سے محبت کرتا ہے مگر یہ پتہ نہیں تھا کہ تو مجھے غیر سمجھتا ہے اب تک۔" میں نے بڑی گلوگیر آواز میں کہا۔ اس کے رویے سے مجھے جو صدمہ پہنچا تھا، اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ آبی کے اس نئے روپ نے میرے دل میں گہرے زخم ڈال دیے تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنے ان سٹھڑے سور دوستوں کی خاطر مجھ سے یوں پھر جائے گا۔ مگر اس کے چہرے پر ایسی سفاک سردمہری طاری تھی کہ اس کو سمجھ لینا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

میں نے پاگلوں کی طرح اپنا سینہ اس کے سامنے کھول دیا۔

"لے چلا گولی آبی۔ میں اُف بھی نہیں کروں گا۔ تیرے ہاتھوں مرنا مجھے بہت سستا اور آسان نظر آتا ہے۔"

وہ چند قدم دائیں طرف ہٹا۔ اور پھر شست باندھ کر پستول کی نال کا رُخ اس نے میرے سینے کی طرف کر دیا۔ میں اپنی جگہ جم کر کھڑا رہا۔ میں تو زندگی سے ویسے ہی عاجز آیا ہوا تھا۔ میرے بے رنگ اور شب و روز کی گردش نے مجھے ویسے ہی ہر شے سے بیزار کر رکھا تھا۔ اس کے پستول کی نال میں مجھے گلزار کھلتے نظر آ گئے۔ میں نے آبی سے زیادہ کسی کو زندگی بھر اپنے قریب نہیں پایا تھا۔ وہ بن کہے میری باتیں سمجھ جاتا تھا۔ میرے وجود کے سارے تانے بانے سے وہ پہلے ہی دن آگاہ ہو گیا تھا۔ بڑی عزت تھی میرے دل میں اس کی مگر اس روز وہ اچانک زندگی کے منظر سے پرے ٹل گیا تھا۔ ماجدہ دروازے میں کھڑی لرز رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس خونیں ڈرامے کو کس طرح ختم کرا دے، اسے وقوع پذیر ہونے سے روک دے۔

آبی نے ایک بار پھر مجھے فحش گالی دی اور بولا۔

"تیار ہو جا جیلانی! میں تجھے معاف نہیں کروں گا۔ تجھے میں نے بہت موقع دے لیا ہے۔"

"یار اس ڈرامے کو مختصر کر دے میری جان! تیری قسم سے زیادہ قیمتی ہوتی تو میں اسے ضرور بچا لیتا۔ جلدی کر آبی مجھے کوفت ہو رہی ہے۔" میں نے اسے اپنے ارادے کی تکمیل پر اکسایا۔

اس نے پھر مجھے گالی دی اور پھر اس نے شست باندھ کر گولی چلا دی۔ ایک دو نہیں بلکہ تین گولیاں اس نے داغ دیں مگر وہ سب کی سب میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں، وہ میرے سینے کو چھلنی کر دینے کی سکت ہی نہیں رکھتا تھا۔ تیسری گولی پر اس نے پستول زمین پر پھینکا اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

"مجھے ۔۔۔ مجھے معاف کر دے میں اپنی قسم کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا مگر تجھے مار کر تو میں بھی مر جاتا۔" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ وہ مجھے یوں بھینچ رہا تھا جیسے وہ مجھے صدیوں کی فرقت کے بعد ملا ہو۔ اس کی آنکھوں سے یہ بڑے بڑے آنسو ٹپک رہے تھے۔ میں نے اسے سنبھالا اس کی آنکھیں پونچھیں اور پھر اسے ساتھ لے کر اندر پلنگ پر جا بیٹھا۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے کہ دو درندوں کے درمیان صلح ہو گئی۔"

ماجدہ بڑبڑائی وہ بھی اپنی آنکھیں پونچھ کر اب مسکرانے لگی تھی۔ وہ سامنے ہی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ خاصی دہشت زدہ نظر آ رہی تھی ہمارے مزاج کا رُخ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ مجھے تو اس نے پہلے روز سے اب تک ایک محبت کرنے والا اور یاروں کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دینے والا ہی پایا تھا۔ آبی پر بھی اسے بے پناہ اعتماد تھا۔ اور وہ اس کی ہر بات پر عش عش کر اٹھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ آبی سے زیادہ بہادر اور فراخ دل آدمی کوئی اور ہے ہی نہیں مگر اب جو اس نے ہم دونوں کو بدکار کتوں کی طرح ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہوتے دیکھا تو اس کے تصورات کا سارا شیش محل چُور چُور ہو کر اس کے ارد گرد بکھر گیا۔ اس کی خوبصورت سوچ کے سنہرے کلسوں پر گدھ آ بیٹھے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی مگر یوں جیسے کہہ رہی ہو تمہیں شرم آنی چاہیے۔ غیرت ہو تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرو۔ آبی پر اسے بہت طیش آ رہا ہو گا کیونکہ اس نے تو اُسے بُری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ نہ صرف ڈانٹا تھا بلکہ اس کے چال چلن پر بھی اس نے چوٹ کی تھی جسے بڑی سے بڑی فاحشہ عورت بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتی، اور وہ تو پھر ماجدہ تھی جسے میں نے ہمیشہ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ میں تو ایسا تھا کہ اُسے میں نے ایک بار بھی تم ایسی بے تکلفی سے نہیں پکارا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں کوئی اسے اپنی پیر و مرشد تصور کرتا تھا، یا اسے کوئی برگزیدہ ہستی سمجھ کر اس کی تکریم و تعظیم کرتا تھا۔ یہ بات ہرگز نہیں تھی بلکہ میرے اس جذبۂ تکریم کو اکسانے میں اس کی وہ اپنی صاف ستھری نستعلیق گفتگو ممد و معاون ثابت ہوئی تھی۔ اس پر اس کی وہ نکھری نکھری بے عیب شخصیت بھی سونے پر سہاگے کا کام کر جاتی تھی مگر اب جو ماجدہ نے اپنی وہ تصویر دیکھی جو آبی کے دماغ میں محفوظ تھی۔ تو وہ تلملا اٹھی تھی مگر میرے بس میں تو کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ آبی کے الفاظ کا دشنہ ماجدہ

کے دل میں گہرے زخم ڈال گیا تھا جسے میں تو کم از کم کسی بھی طرح مندمل نہ کر سکتا تھا۔

میرا یہ حال تھا میں آبی سے بھی شرمندہ تھا اور ماجدہ سے بھی۔ میری جان ان کے درمیان دو برابر حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ہی مجھے عزیز تھے۔ ماجدہ اگر میرے دل کا سرور تھی تو آبی میری آنکھ کا نور تھا۔ میں ان دونوں کے بغیر کچھ بھی تو نہ تھا۔ میری ذات ان کے بغیر سمٹ کر صفر ہو جاتی تھی۔ کیونکہ جب سے وہ مجھے ملے تھے میری پرواز میں تیزی اور بلندی پیدا ہو گئی تھی مگر اب آبی مجھے بے یار و مددگار چھوڑنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس کے بغیر کیا کر سکوں گا۔ وہ تو میرے راستوں کی روشنی بن گیا تھا اسے کھو دینا مجھے کسی طرح گوارا نہ تھا۔ مگر وہ اپنا ارادہ ظاہر کر چکا تھا۔ اسے نابینا، گونگا اور قطب دین عزیز تھے۔ وہ میرے ساتھ بندھ کر تھک گیا تھا۔ بالکل اس کھلاڑی کی طرح، جس کو اپنی دائیں ٹانگ دوسرے کی بائیں ٹانگ سے باندھ کر دوڑنا پڑتا ہے۔ اور ساتھی کی ذرا سی لاپرواہی سے اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے۔ ہمارا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میرا شعور مجھے ایسی ایسی باتیں سمجھانے لگا تھا کہ میں اپنے گرد و پیش سے خوفزدہ ہو رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ قانون کا ہاتھ میری گردن کی تلاش میں تھا۔ نہیں بلکہ اس لیے کہ اپنے اس ساتھی سے محروم ہو کر میں اپنی منزل کے کھوج میں نابینا ہو جانے کا خدشہ محسوس کر رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟ لو سگریٹ پیو۔" میں نے سگریٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"آں۔ کچھ نہیں جیلانی! میں تم سے بہت شرمندہ ہوں میرے دوست! یہ کیسی حماقت ہو گئی ہے مجھ سے۔"

"لعنت بھیجو۔ مٹی ڈال اس بات پر۔ مجھے کوئی گلہ نہیں ہے تجھ سے۔ اب یہ بتا کھانے کا کیا بندوبست ہو گا۔ اس حمیدہ نے تو صاف ہی ٹرخا دیا ہے ہمیں۔"

"شکر کرو ان کے چکر سے بچ نکلے ہو ورنہ اس نے تو پکڑوا ہی دیا تھا تمہیں۔" آبی نے پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"شطرنج کھیلتی ہے وہ اس ماجدہ کی سہیلی۔ سامان سے اپنا گھر بھروا لیا۔ روپیہ بھی اینٹھا اور پھر ہمیں گھر سے یوں نکال باہر کیا جیسے کوئی مکھن سے بال نکال دیتا ہے۔"

میں نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ حمیدہ کی وہ دبلی پتلی عورت کے رنگ میں رنگی تصویر میرے حافظے پر ابھر آئی تھی۔

"مزے کی بات یہ ہے جیلانی صاحب کہ اس نے خود کو پولیس سے بچا لیا ہے آپ کی نشاندہی کر کے۔" ماجدہ نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔ زبردست پتا پھینکا تھا اس نے۔ حالانکہ اس سارے قصے میں وہ پوری طرح ملوث نظر آتی تھی مگر تھانیدار کو اس نے ایک ہی فقرے میں شکار کر لیا۔"

"یہ عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں جیلانی بادشاہ۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ ان سے اور پیلے رنگ کی چھپکلی سے آدمی کو ہر حال میں بچنا چاہیے۔" آبی نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔

"اور تم جو اس بینو اور جھنتے کو اڈے پہ چڑھائے بیٹھے ہو، وہ کس کھاتے میں جائے گا؟"

"وہ! اسے وہ جھنتے تو تہیے کی جند جان ہے۔ وہ اسے بھگا لایا تھا گھر سے۔ اور بینو اس گونگے کی منظورِ نظر ہے۔ میں تو بس تم جانو بس ایسا ہی مولامست آدمی ہوں۔ ایسے طوطے نہیں پالتا ہوں میں۔"

"اچھا تو یہ بات تھی۔"

"یار یہ فیقا کہاں غرق ہو گیا باہر جا کر۔ سالا ابھی تک واپس نہیں آیا۔" آبی نے موضوع بدل دیا۔ "کہتا تھا چائے لے کر ابھی آتا ہوں۔"

"کہیں کوئی اور ہی چکر تو نہیں چل رہا ہے ہمارے خلاف؟ یہ زمین تو ویسے ہی ہمارے لیے تنگ ہو چکی ہے۔"

اچانک ہمیں مکان کا بڑا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

فیقا باہر سے تالا لگا گیا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندر آیا۔ اور بولا "آپی سائیں! چابیاں میں لے آیا ہوں اور آپ کے لیے کھانا بھی مستری صاحب کی بیگم نے بھیجا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بڑا سا توشہ دان ہمارے آگے رکھ دیا۔

جب وہ شگری صاحب کے دونوں رہائشی کمرے کھول کر ہمیں اُدھر لے گیا تو ان کی آرائش و زیبائش دیکھ کر میرا دل خوش ہو گیا۔ دونوں کمروں میں دو دو پلنگ بچھے تھے۔ جن پر دبیز گدے اور صاف ستھری چادریں آدمی کو اپنے مقدر کی ساری کلفتیں مٹا لینے کی دعوت دے رہی تھیں۔

ہم کھانے سے فارغ ہو کر بستروں پر لیٹ گئے۔ میں اور ماجدہ ایک کمرے میں۔ اور آپی دوسرے کمرے میں۔ ہماری ضرورت کی ہر شے ہمیں فیقے نے مہیا کر دی تھی۔

"یار ہم بہت تھکے ہوئے ہیں فیقے اگر تو اجازت دے تو دو گھڑی نیند لے لیں ہم۔" میں نے اس سے بے تکلف لہجے میں پوچھا۔

"کیوں نہیں سائیں۔ اللہ نے بستر تو بنایا ہی اسی لیے ہے کہ آدمی اس پر لیٹ کر اپنی تھکن مٹائے۔ میں یہ دروازے بند کر دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے دونوں پٹ بھیڑ دیے۔ اور دوسرے کمرے میں جا گھسا۔ اس کے جاتے ہی میں نے اندر سے کنڈی چڑھا لی۔

بستر پر لیٹنے سے پہلے میں نے ماجدہ کے چہرے پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس کے وجود کی ساری بتیاں بجھی ہوئی ہیں۔ وہ مجھ سے بہت ہی کھچی کھچی نظر آتی تھی میرے اور اس کے درمیان شاید طویل فاصلہ حائل ہو گیا۔ ہمارے ربط و ضبط کی درمیانی کڑی ٹوٹ گئی تھی۔ میری ممنونِ احسان ہونے کے بجائے وہ مجھ سے ناراض معلوم ہوتی تھی۔ ڈھیر ساری رقم اس کے اٹیچی کیس میں بند تھی۔ میں چاہتا تو ایک منٹ میں وہ سب کچھ اس سے واپس دھروا لیتا مگر وہ ایسی تھی کہ اس رقم کا ذکر تو کجا اس کی موجودگی کو بھی وہ مجھ سے چھپا لینا چاہتی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط سے اٹیچی کیس کپڑوں کی الماری کے اندر رکھا اور اس کے پٹ بند کر کے اس پر تالہ ٹھونک دیا اور مجھ سے خاصے فاصلے پر دوسرے پلنگ پر جا کر یوں لیٹ گئی جیسے اسے میرے وجود سے گھن آتی ہو۔

اس کا رویہ میرے لیے حیران کن تھا مگر پھر میں نے سوچا کہ یہ اپنے اس دیرینہ بوندی کے حربے سے میری آتشِ شوق کو مہمیز دینے کا سامان پیدا کر رہی ہو۔ میں بھی لحاف میں منہ ڈال کر چپ چاپ لیٹ گیا کچھ ہی دیر بعد مجھے نیند نے آ لیا اور پھر مجھے کسی بھی بات کا ہوش نہیں رہا۔ نہ اس اجنبی گھر کی اجنبی چھت کا احساس باقی رہا، نہ اس بات کی کسک دل میں رہی کہ کچھ ہی دیر پہلے آپی نے مجھ سے ازلی ابدی دشمنوں ایسا سلوک کیا تھا۔ میں نے وہ ساری باتیں ذہن سے جھٹک ڈالی تھیں۔ میں اگر ان کے بارے میں سوچتا اور ان کی تلخی کو اپنے بدن میں پھیلاتا رہتا تو نیند مجھ سے کوسوں دور بھاگ جاتی۔ مگر میں اس حد تک شل ہو چکا تھا کہ سب کچھ بھول کر میں نے دو گھڑی سو لینا غنیمت سمجھا۔

مگر جب میری آنکھ کھلی تو اندر باہر ہر طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں نے کلائی کی گھڑی کے چمکتے ہندسوں پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ رات کے ساڑھے بارہ بج چکے ہیں۔ میں چھ گھنٹے سوتا رہا تھا۔ اس حال میں کہ مجھے اپنے گرد و پیش کا قطعاً کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔ میں نے ماچس جلا کر سگریٹ سلگاتے ہوئے دوسرے پلنگ پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ ماجدہ وہاں سے غائب تھی اور شگری کے کپڑوں کی الماری کے دونوں پٹ کھلے تھے۔ میں نے الماری کے قریب جا کر ایک اور تیلی جلائی تو معلوم ہوا کہ وہاں سے ماجدہ کا وہ نوٹوں اور کپڑوں سے بھرا اٹیچی کیس بھی غائب تھا۔ ماجدہ کی تمام چیزیں وہاں سے جا چکی تھیں۔

مجھے اپنی بصارت پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں مل مل کر اور بار بار دیا سلائیاں جلا جلا کر کمرے کا بغور جائزہ لیا۔ مگر وہاں کچھ ہوتا تو مجھے نظر آتا۔ میرا سوٹ کیس البتہ پلنگ کے نیچے موجود تھا۔

میں تیزی سے برآمدے میں نکل کر اس کمرے کی طرف گیا، جہاں آپی سویا ہوا تھا۔ اس کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے بہت آہستگی سے پیچھے دھکیلا۔ تو اس کے دونوں پٹ کھل گئے۔ وہ کمرہ بالکل خالی تھا۔ آپی بھی وہاں سے غائب تھا۔ اس کا سوٹ کیس بھی کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ لحاف یوں کھلا پڑا تھا جیسے کسی نے نہایت عجلت میں اسے پرے پھینکا اور پھر اپنا سامان اٹھا کر فوراً ہی وہاں سے نکل گیا۔

تو اس کا یہ مطلب تھا کہ وہ ماجدہ آپی کے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔ مجھے نیند کے فریب میں مبتلا کر کے وہ دونوں وہاں سے بھاگ نکلے تھے مگر کیوں؟ کس لیے؟

ان کے دماغوں میں یہ خناس کیسے پیدا ہو گئی۔ انہیں یوں چوروں کی طرح بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے تو ان کے درمیان کوئی دیوار کھڑی نہیں کی تھی۔ اگر اس ماجدہ کی رال آپی پر ٹپکنے لگی تھی تو میں تو اس کی راہ میں ہرگز حائل نہ تھا۔ انہیں یوں منہ چھپا کر رات کے اندھیرے میں میری نیند کا فائدہ اٹھا کر اس طرح چوروں کی مانند بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور وہ آپی تو ہرگز ایسا نہیں تھا۔ اس کی زندگی میں عورت اور روپے کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ان دونوں چیزوں سے اپنا گھر بھر سکتا تھا۔ وہ اپنے دست و بازو میں اتنی سکت رکھتا ہے کہ وہ چاہے تو ایک حرم آباد کرے۔

سیکڑوں عورتیں اس کی غلامی پر فخر کر سکتی ہیں۔ پھر۔۔ پھر کیا وہ اس روپے کے لالچ میں ماجدہ کو اپنے ساتھ لے کر بھاگا ہے جو اس نے اپنے گھر سے اٹھایا تھا۔ نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ روپیہ تو وہ جتنا چاہتا مجھ سے لے سکتا تھا۔ اور اس پر تو اس کا حق بھی تھا میرے صندوق میں جو نوٹ بھرے تھے۔ وہ جب چاہتا مجھ سے طلب کر سکتا تھا۔ ایسا نہ بھی ہوتا، تو بھی روپیہ پیدا کر لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا کوئی بھی شے اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ایسا ڈاکو تھا، ایسا دلیر چور تھا کہ سات پردوں میں چھپی دولت بھی آپ ہی آپ چل کر اس کے سامنے آ جاتی تھی۔ نہیں نہیں آپی ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ اس تھوڑے سے روپے کے لیے ماجدہ جیسی گندی مچھلی پر ہاتھ ڈالنا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بھی حقیقت میرے سامنے کھڑی میرا منہ چڑا رہی تھی۔ وہ دونوں وہاں سے غائب تھے۔ اور تمام شواہد اس بات کی طرف اشارہ کناں تھے کہ باہمی صلاح مشورے سے ہی وہاں سے نکلے ہیں۔ وہ میرا ساتھ چھوڑ دینے پر پہلے ہی سے متفق ہو چکے تھے۔ یہ عین ممکن ہے کہ صبح جب وہ آسیہ سے ملنے کے لیے جیل گئے تو اس وقت ان کے درمیان کوئی ایسی بات ہو گئی ہو جس نے ان کو ایک دوسرے کے بیحد قریب کر دیا۔ آپی ٹھیک کہتا تھا ان عورتوں سے کچھ بھی تو بعید نہیں۔ وہ کیا نہیں کر سکتی ہیں مگر اس آپی نے یہ کیا کر دیا ہے۔ ایسی کمینگی کی تو میں اس سے کبھی بھی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ پھر یہ۔۔۔ یہ سب کچھ کیسے وقوع پذیر ہو گیا۔ آپی پھسلا بھی تو کس پھسلن پر۔ اس سالے کو نہیں معلوم کہ ایسی پھسلن آدمی کا گھٹنا بھی توڑ سکتی ہے۔ اس ماجدہ کی ان جھکی جھکی آنکھوں نے بالآخر وہ کرشمہ دکھا ہی دیا تھا۔ جس کا خدشہ بہت پہلے میرے دل میں ابھرا تھا مگر میں نے اسے کبھی بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ کیونکہ آپی کی فولاد صفت شخصیت پر مجھے مکمل اعتماد تھا۔ مگر ماجدہ کی یہ سیمابی طبیعت یوں مجھے میرے جگری دوست سے محروم کر دے گی۔ یہ تو کبھی میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اپنے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے میں ایک بار پھر دونوں کمروں میں گھوم گیا۔ وہاں سے آپی بھی جا چکا تھا اور ماجدہ بھی، اور اپنے پیچھے وہ کوئی نشان بھی چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔

میں نڈھال ہو کر صحن میں نکلا اور مکان کے دروازے تک جا پہنچا۔ اس کے دونوں پٹ بھڑے ہوئے تھے۔ مگر زنجیر کی قید سے وہ دونوں ہی آزاد تھے جس کا مطلب تھا کہ فیقے کو اس کی روانگی کا قطعاً کوئی علم نہیں تھا پھر بھی میں اس سے کوئی سراغ معلوم ہو جانے کی امید میں اس کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ بڑے گیٹ کے ساتھ بنے چھوٹے سے گیراج نما کمرے میں سوتا تھا۔ اس کا یہ بڑا سا چوبی دروازہ اندر سے بند تھا۔

ابھی میں اس دروازے پر دستک بھی نہ دے پایا تھا کہ اندر کے گھڑی کا الارم بجنے کی آواز گونج اٹھی۔ الارم کو بجتے ہوئے ابھی تین سیکنڈ ہوئے تھے، کہ ٹھک کی آواز پیدا ہوئی فیقے نے شاید ہاتھ مار کر الارم بند کر دیا تھا۔

"اٹھ اوئے کاکا اٹھو۔ وہ ٹرک آنے والا ہو گا۔ اٹھ میرا ویر بارہ بج گئے ہیں۔" فیقے نے کسی کو پکارا۔ اور پھر لمبی جماہی لے کر وہ شاید چارپائی سے اُتر گیا تھا۔ کیونکہ گیراج میں چارپائی کی کرڈ کرڈ گونجنے لگی تھی۔

"اوئے اٹھ جا۔ وہ تیرے گاہک آتے ہی ہوں گے۔" فیقے نے اب کی بار ذرا بلند آواز سے کہا۔

"بارہ بج گئے ہیں چاچا۔"

"ہاں بچے اب تو سوئیاں آگے نکل گئی ہیں۔" فیقے نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے تو چل ذرا پھاٹک کھول دے۔ وہ ہارن بجائیں گے تو مہمان خواہ مخواہ ہی کوئی بھیڑا ڈال دیں گے۔" کاکے نے کہا۔

پتہ نہیں مجھے کیا سوجھی میری چھٹی حس نے مجھے وہاں سے سرک جانے کا اشارہ کیا۔ اور میں دبے پاؤں چلتا ہوا وہاں سے دوسری طرف نکلا اور ایک درخت کی اوٹ میں جا ٹھہرا۔

ابھی مجھے وہاں کھڑے ہوئے دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ فیقے نے بڑی آہستگی سے پھاٹک کھولا اور باہر نکل کر اِدھر اُدھر جھانکنے لگا۔

ہوا اس وقت بہت ٹھہر ٹھہر کے چل رہی تھی مگر فضا میں خنکی اتنی تھی کہ سردی کی شدت کے احساس کو آپ ہی آپ بڑھاتی چلی جاتی تھی۔ مجھ سے حماقت یہ سرزد ہوئی کہ میں صرف ایک قمیص میں باہر نکل آیا تھا۔ اپنے اوپر میں کمبل بھی نہ اوڑھ سکا تھا۔ اس ماجدہ کے فرار نے مجھے کچھ اس طرح حواس باختہ کر دیا تھا کہ میں کچھ بھی نہ سوچ سکا تھا۔

فیقا دور دور تک نظر دوڑا کر پھاٹک کے اندر آیا تو اس کا ساتھی کاکا گیراج میں سے باہر نکلا اور بولا۔ "ادھر سے بھی تو ابھی کوئی گھنٹی نہیں بجی۔"

"یار وہ لوگ بس آتے ہی ہوں گے، تم اُدھر چھپر کے نیچے جا کر سنگل ڈاؤن کر دو۔" فیقے نے کہا۔ اس کی یہ بات سن کر کاکا صحن عبور کر کے پچھلی دیوار کے ساتھ بنے بڑے سے ٹین کے چھپر تک جا ٹھہرا۔ اس نے ٹارچ جلا کر فرش پر سے کچھ اینٹیں اٹھا کر ایک طرف رکھیں اور پھر نیچے بیٹھ کر کوئی چیز اٹھانے لگا۔ میں اندھیرے میں کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کاکے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے چوڑ۔۔۔۔ ایسی احتیاط سے فرش پر پڑے تختے اٹھائے تھے۔ ان میں سے ہر تختہ کم از کم تین فٹ لمبا اور ایک فٹ چوڑا تو ضرور ہی ہو گا۔ ایک ایک کر کے اس نے چھ تختے وہاں سے ہٹائے تو چھپر کے نیچے ایک

عجیب سی پُراسرار آواز پھیل گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے سیٹی بجائی ہے۔ اس سیٹی کی آواز سن کر فیقا تیزی سے چھپر کی طرف لپکا۔ اور اس جگہ جا ٹھہرا جہاں سے کاکے نے تختے ہٹائے تھے۔

ان کی پُراسرار حرکات و سکنات کو ابھی میں سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ ایک درمیانے درجے کا ٹرک پھاٹک میں داخل ہوا۔ اُسکی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔

”لو وہ بھی آگئے۔ میں نہ کہتا تھا کہ وہ لوگ ٹھیک وقت پر پہنچ جائیں گے۔“ فیقے نے خوش ہو کر کہا۔

ٹرک اس مکان کے وسیع و عریض صحن میں گھوم کر مڑا اور اس کا پچھلا حصہ چھپر کے سامنے لے جا کر ڈرائیور نے انجن بند کر دیا۔ ٹرک کے اگلے دروازے کھلے اور اس میں سے دو آدمی برآمد ہوئے۔ دونوں ہی سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ غالباً وہ ملیشیا کے کپڑے تھے۔ جو انھوں نے زیب تن کر رکھے تھے۔ سردی سے بچنے کے لیے انھوں نے اوپر سیاہ رنگ کے کمبل اوڑھ رکھے تھے۔

”ارے بھئی فیقے بس اب جلدی کر لے میرے بھائی۔ مال آ رہا ہے کہ نہیں؟“

”آ رہا ہے گوندل جی، آئیگا کیوں نہیں رقم خرچ کی ہے آپ نے کوئی مخول تو نہیں ہے۔“

”یہ لو یہ بقایا پچاس ہزار روپیہ، یہ بھی رکھ لو شنگری صاحب کو دے دینا۔ کہاں ہیں اس وقت؟“

”وہ تو کہیں باہر گئے ہوئے ہیں یار جی۔ یہ پچاس ہزار ہے نا گن لیا ہے نا تم نے؟“

”ہاں اب تمہیں پورا ڈیڑھ لاکھ مل چکا ہے۔“

”بالکل ٹھیک، آج ہم تمہارا مال پورا کر دیں گے گوندل جی۔ لو وہ پہلی ٹرالی آگئی ہے۔“ فیقے نے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی چھپر کے نیچے ایک لالٹین کی روشنی جھلملانے لگی۔ وہ لالٹین ویسی ہی تھی جیسی ریلوے اسٹیشنوں پر روشنی والے مزدور لیے پھرتے ہیں۔

اس لالٹین کی روشنی میں میں نے دیکھا۔۔۔ کہ ایک ٹرالی اوپر اُبھر رہی ہے۔ وہ جب چھپر کے اندر پہنچ گئی تو اس کے پیچھے ایک آدمی بھی اوپر اٹھ آیا۔ اس نے قلیوں کا سا لباس پہن رکھا تھا۔ مگر وہ سارے کا سارا مٹی میں اٹا ہوا تھا۔ وہ لوگ ٹرالی میں کوئی ٹھوس چیز بھر کر لائے تھے۔

”پیچھے تین ٹرالیاں اور بھی آ رہی ہیں۔“ وہ آدمی بولا۔

”صرف تین؟ بھائی فتے اتنے مال سے ہمارا کیا بنے گا؟“ فیقے نے کہا۔

”چار اور بھر کر لا دیں گے فیقے سیٹھ! ہمارا حصہ ہمیں ملنا چاہیئے۔“ فتے نے کہا۔

”لو یہ پانچ ہزار روپیہ تم رکھ لو۔ اور یہ رہا تمہارے فور مین کا حصہ۔ یہ دس ہزار ہے پورا دس ہزار۔“ یہ کہہ کر فیقے نے نوٹوں کی تین گڈیاں فتے کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

”ہمیں تو انجن کے پرزوں کی زیادہ ضرورت ہے بھائی فتے۔ یہ تانبا تو چلتا ہی رہتا ہے۔“ گوندل نے کہا۔

”دو ٹرالیاں پرزوں سے بھری ہیں گوندل صاحب! آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی اُوپر کھینچتا ہوں انھیں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر اس گڑھے میں اُتر گیا۔ جس کے منہ پر سے کاکے نے تختے ہٹائے تھے۔

میرے لیے وہ سارا منظر بے حد حیرت انگیز تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ان لوگوں نے چھپر کے نیچے کوئی سرنگ کھود رکھی ہے جس کا دوسرا منہ ادھر ریلوے ورکشاپ کے کسی حصے میں نکلتا ہے اور اس سرنگ کے راستے سے یہ لوگ ریلوے کے چند لوگوں سے مل ملا کر تانبا اور دوسری چیزیں وہاں سے چوری کر کے ادھر لے آتے ہیں جہاں سے گوندل انہیں اپنے ٹرک میں بھر کر باہر لے جاتا ہے۔

خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ وہ کب سے یہ دھندا کر رہے تھے۔ اب تک وہ ریلوے کو اندر ہی اندر کتنا نقصان پہنچا چکے تھے۔ ٹرالیاں کشتی نما تھیں اور لبالب بھری تھیں۔ اُن کے اوپر انھوں نے ترپال ڈال رکھا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے دو ٹرالیاں اور باہر آگئی تھیں۔ ان میں سے ایک وہ ٹرک کے قریب لے گئے۔ جب اُس پر سے انھوں نے پردہ ہٹایا تو معلوم ہوا کہ اس میں انھوں نے لبالب تانبا بھرا تھا۔ ان تینوں نے مل کر تانبے کی سلاخیں ٹرک میں رکھیں۔ جب آخری ٹرالی بھی وہ خالی کر چکے تو گوندل ٹارچ کاکے کے ہاتھ سے لے کر ٹرک کے پچھلے حصے میں داخل ہو گیا۔

یونہی بے خیالی میں اس نے ٹارچ کی روشنی صحن کے اس حصے میں ڈالی جہاں میں کھڑا تھا۔ درخت کا تنا زیادہ موٹا نہیں تھا۔ میں ڈرا کہ کہیں میں اس روشنی کی زد میں نہ آجاؤں۔ اسی خیال سے وہاں سے ہٹ کر دوسری طرف نکلنے کی کوشش کی گوندل نے ٹارچ بجھا دی۔ میں وہیں رُک گیا مگر عین اسی وقت تین چار کتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے اندر آگئے۔ وہ اپنے کسی ذاتی تنازعے کو طے کرنے کے لیے ایک دوسرے کو بے نقط سنا رہے تھے۔ ان کا بھونکنا ہی میرے لیے غضب ہو گیا۔ گوندل نے فوراً ہی ٹارچ جلا کر ان کتوں کو دیکھا جو اچانک گتھم گتھا اُدھر لپکے جہاں میں کھڑا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی گوندل کی ٹارچ کا رُخ میری طرف ہو گیا۔ اب میں روشنی کے حلقے میں آچکا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی گوندل نے چھلانگ لگا دی اور گرجتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اوئے فیقے یہ کیا مصیبت ہے ادھر کوئی بندہ کھڑا ابھی سی آئی ڈی کر رہا ہے۔“

”تیرا وہم ہے گوندل! ادھر بھلا کون آسکتا ہے۔“

”میں نے خود دیکھا ہے۔“ اس نے ایک بار پھر روشنی کا نیزہ میری سمت پھینکا مگر میں اس عرصے میں بھاگ کر برآمدے میں جا پہنچا تھا۔ مجھے درختوں کے نیچے نہ پا کر گوندل نے کہا۔

”اوئے کاکا یہ پھاٹک بند کر دے وہ آدمی اُدھر کمروں کی طرف بھاگا ہے۔“

”گولی مار دو اس سور کے پُتر کو بالکل برداشت نہ کرو۔“ فیقے نے پریشان ہو کر کہا۔

اب وہ چاروں آدمی کمروں کی طرف آ رہے تھے۔ میں بھاگ کر اپنے بستر میں جا گھسا۔ فیقے نے ہاتھ میں لالٹین اُٹھا رکھی تھی۔ اور گوندل نے ٹارچ کو بجھایا نہیں تھا۔ وہ چاروں دروازہ کھلا دیکھ کر دندناتے ہوئے اندر گھسے اور میرے پلنگ کے پاس آ ٹھہرے۔ میں نے اپنا منہ لحاف میں چھپا رکھا تھا۔ ظاہر میں یہی کرنا چاہتا تھا کہ میں تو ادھر سویا ہوا ہوں مگر گوندل نے مجھے برآمدے کی طرف جاتے دیکھ لیا تھا۔

”یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔“ فیقے نے ادھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

”یہ کون سویا ہوا ہے یہاں؟“

”یہ شنگری سائیں کے مہمان ہیں۔ آپی سائیں کے ساتھ ادھر آئے تھے یہ۔“

”تم بھی بالکل بھولے بادشاہ ہو۔ فیقے جی!“ یہ کہہ کر گوندل نے انتہائی بدتمیزی سے لحاف میرے منہ پر سے نوچ کر الگ پھینک دیا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دائیں ہاتھ میں پستول۔

”یہی تو ہے جو اُدھر کھڑا تھا۔ میں نے ابھی اسے دیکھا تھا وہاں درخت کے پیچھے۔“ گوندل نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

”کیا بات ہے، کون ہو تم؟“

”زیادہ بھولے نہ بنو مائی ڈیر اس سے پوچھو فیقے جی کہ ادھر یہ کیا کر رہا تھا۔“ اس نے پستول کا رُخ میرے سینے کی طرف کر رکھا تھا۔

”کیا کہہ رہے ہو تم! میں شنگری صاحب کا مہمان ۔۔۔۔۔۔ ہوں۔ یہ کون صاحب ہیں فیقے! یہ کیا بدتمیزی ہے۔“ میں نے پلنگ پر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”آپ ادھر صحن میں کھڑے تھے ابھی؟“ فیقے نے بہت محتاط لہجے میں پوچھا۔

”میں تو ادھر سویا ہوا تھا۔ مجھے کیا معلوم ادھر کون تھا، اور تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں پھر کہتا ہوں اُستاد، جھوٹ نہ بول۔ ورنہ میں تیرا مغز ادھیڑ دوں گا۔ اور کون کون ہے ادھر فیقے جی!“

”وہ۔۔۔ ماجدہ کہاں ہے فیقے؟ ذرا آپی صاحب کو تو جگا دو

میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔" میں نے پلنگ سے اُترتے ہوئے کہا
"مجھے کیا معلوم ہے صاحب! وہ تو ادھر ہی سوئی تھی بیٹا بی بی۔ آپ جائیں اپنے کمرے میں ہوں گے۔"
"نہیں جگا دو ذرا۔ اور یہ آدمی مجھ سے بات کس طرح کرتا ہے، تھوڑی تمیز سکھاؤ اسے۔"
"تمیز تو بیٹے میں تمہیں ایسی سکھاؤں گا کہ عمر بھر یاد رکھو گے۔ گونڈل کو نہیں جانتے ہو تم۔"
"بکواس بند کرو اوئے۔ پتہ نہیں تو کہاں کی جوتی ہے۔ ذرا آپی صاحب کو ادھر بلا فیقے۔ تمہارا لحاظ ہے ورنہ میں اسے ابھی مزہ چکھا دوں۔" میں نے گدّے کے نیچے سے اپنا چپ شاہ نکالتے ہوئے کہا۔ اسے ہاتھ میں پکڑنے کے بجائے میں نے پہلو کی جیب میں ڈال لیا۔
"یہ پستول چھوڑ دے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔"
گونڈل بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔
"میں تجھ پر گولی نہیں چلاؤں گا بے فکر رہ۔ انہیں دیکھ فیقے۔"
فیقا مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھتا ہوا دوسرے کمرے میں گھسا مگر پھر جلدی ہی واپس آگیا۔ بولا۔
"وہ تو وہاں نہیں ہیں بستر خالی پڑا ہے۔"
"وہ دونوں ہی جا چکے ہیں۔ اس ماجدہ کا صندوق بھی یہاں سے غائب ہے۔ تمہیں پتہ ہے وہ کس وقت یہاں سے نکلے ہیں؟"
"مجھے تو کچھ پتہ نہیں ہے بھائی جی۔ کھانا بھی ان لوگوں نے نہیں کھایا۔ بس ایسے رخصت ہو کر سوئے کہ پھر مجھے ملے ہی نہیں۔"
"یہ فضول باتیں ختم کرو۔ مجھے بتاؤ تم ادھر صحن میں کیا دیکھ رہے تھے؟"
"تمہارا کیا خیال ہے وہاں کیا دھرا تھا میرے دیکھنے کے لیے۔ کیوں اتنے خوفزدہ ہو رہے ہو؟"
"اسے پکڑ لے کاکا، اور باندھ دے اس چارپائی سے۔ میں... میں اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتا۔" کاکا میرے دائیں ہاتھ کھڑا تھا اور فیقا بائیں ہاتھ۔ ان دونوں نے گونڈل کا حکم سنتے ہی مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس طرح کہ کاکا میری کمر سے لپٹ گیا، اور فیقے نے میرے بازو جکڑنے کی کوشش کی۔
"اس کی جیب سے پستول نکال لے فیقے۔ یہ خاصی ڈنگدار شے نظر آتا ہے مجھے۔" گونڈل نے کہا۔ مگر جونہی فیقے نے میرے بازوؤں پر ہاتھ ڈالا میں نے پوری قوت سے اپنی دائیں کہنی اس کے سینے پر ماری۔ وہ اس ضرب کی شدت سے گھبرا کر ذرا پیچھے ہٹا تو میں نے کاکے کی گردن مسل دی وہ درد کی شدت سے چیخا اور نیچے جھول گیا۔ فیقا پھر میری طرف بڑھا تو میں نے اس کے نچلے جبڑے پر الٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ مارا۔ وہ ہاتھ بہت کاری لگا۔ نتیجۃً گرنے لگا تو میں نے اسے بازوؤں میں لے کر اپنی ڈھال بنا لیا۔ اس طرح کہ اگر گونڈل مجھ پر گولی چلاتا تو وہ سیدھی فیقے کے بدن میں لگتی۔ میں اسے گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ جا لگا۔
"یہ پستول پھینک دے گونڈل ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے بجلی کی سی سُرعت سے اپنا چپ شاہ جیب سے نکال کر گونڈل پر تان لیا۔ مگر مجھے دیر ہو گئی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ کی حرکت دیکھتے ہی مجھ پر گولی چلا دی لیکن فیقا میری صحیح ڈھال ثابت ہوا گولی سیدھی اس کے پیٹ میں دھنس گئی۔ مگر میں نے گونڈل کو دوسری گولی کی مہلت نہیں دی۔ میں نے اپنے چپ شاہ سے بے آواز گولی چلائی۔ اس طرح کہ اس کی کلائی شل ہو گئی اور گونڈل کا پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔ فیقے کے ہاتھ میں پکڑی لالٹین کی روشنی میرے بہت کام آرہی تھی۔
میں نے فیقے کو زمین پر ڈال دیا۔ اور گونڈل کو پستول کی زد میں لے کر اس کے پاس جا پہنچا۔ وہ بائیں ہاتھ میں اپنی کلائی تھام کر خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔
"کہو بیٹے کیسی رہی۔ تم نے مجھے پہچاننے میں زبردست غلطی کی ہے گونڈل۔ میں نہ کہتا تھا مجھ سے بچ جا۔ میں تو پوری فوج کو تباہ کر سکتا ہوں میرے یار۔"
گونڈل نے کوئی جواب نہ دیا۔ فیقا پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے منہ سے بات ہی نہیں نکلتی تھی۔
"فیقے! یہ سلوک کرتے ہو تم اپنے مہمانوں سے۔ میرا خیال ہے کہ شنگری صاحب یہاں ہوتے تو یہ حال نہ ہوتا۔ نہ تمہارا، نہ میرا۔"
"میں نے تو گونڈل کو سمجھایا تھا سائیں۔ مگر یہ اپنی ضد پہ اَڑا رہا۔"
"خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ اس فیقے کا علاج کراؤ ورنہ یہ مر جائے گا۔ میں جا رہا ہوں، اب میں ایک منٹ یہاں نہیں رہوں گا۔"
"آپ کی مرضی ہے سائیں۔ مگر... مگر آپ ہمارے بارے میں کسی کو کچھ نہیں نہ بتائیں۔ یہ میری آخری درخواست ہے آپ سے۔"
"بے فکر رہو۔ مجھے کسی کو تمہارے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"
یہ کہہ کر میں نے گونڈل کا پستول اور اپنا سوٹ کیس اٹھائے اور کمبل اوڑھ کر اسی وقت کمرے سے باہر نکل آیا۔ ان میں سے دو تو زمین پر ڈھیر ہو چکے تھے اور دو کی حالت ایسی تھی جیسے انھوں نے کوئی بہت ہی بھیانک خواب دیکھا ہو۔ گونڈل کی ساری ٹیں بھی ختم

ہو چکی تھی اور اپنی زخمی کلائی سے بہتے خون کو دیکھ دیکھ کر وہ سہم رہا تھا۔ خاصا لوبے لانڈ قسم کا آدمی تھا وہ۔ اونچا لمبا مضبوط قد تھا اس کا۔ مگر میرے ہاتھوں ذلیل ہو کر وہ بالکل پھسپھسا بن گیا تھا۔
میں صحن میں نکلا اور درختوں کے قریب سے گزر کر پھاٹک کی طرف بڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ اندھیرے میں کوئی آدمی درختوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ بڑی ایسی احتیاط تھی اس کی چال میں۔ اور اس کے پاؤں تلے ٹوٹتی ہوئی خشک ٹہنیاں مجھے یہ احساس دلاتی تھیں کہ وہ بھی گونڈل کا ساتھی ہے۔ در اصل میں اس آدمی کو بھول ہی گیا تھا۔ وہ گونڈل کے ٹرک کا کلینر تھا جو چھپر کے نیچے کھڑا رہ گیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ میرے تعاقب میں آگے نہیں آیا تھا۔
اس نے ساری صورت حال کو یوں بگڑتے دیکھا۔ تو اندھیرے میں چھپ کر مجھ پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنانے لگا تھا۔ اب جو اس نے مجھے یوں باہر نکلتے پایا تو وہ دبے پاؤں میرے پیچھے آگیا تھا۔ میں نے اسے قطعاً محسوس نہ ہونے دیا کہ میں اسے دیکھ چکا ہوں میں جان بوجھ کر دیوار کے اس حصے کی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں وہ درختوں کی آڑ میں چلتا ہوا میرے پیچھے آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کا وہ موٹا سریا تھا جو اس نے ٹرک میں سے اٹھایا تھا۔ میرا چپ شاہ میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔
جب میرے اور اس کے درمیان تین قدم کا فاصلہ رہ گیا تو وہ ایک دم درخت کی اوٹ سے نکل کر مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ مگر میں تو اس کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ جونہی اس نے سریا تول کر میرے سر میں مارنا چاہا۔ میں نے گھوم کر اپنا سوٹ کیس اس کی پسلی میں دے مارا۔ وہ اس جوابی کارروائی کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ سوٹ کیس کی ضرب سے وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور کٹے درخت کی طرح وہ دھڑام سے زمین پر جا گرا۔ سریا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ اسے یوں چت دیکھ کر میں نے پستول کی نال اس کے سینے پر رکھ دی۔
"اٹھ گتے کے بچے میرے ساتھ چل۔ اٹھ ورنہ جان سے مار دوں گا۔" میں نے اپنی آواز دباتے ہوئے اس کی پسلی میں گھٹنا دیتے ہوئے کہا۔ وہ لرزتا ہوا اٹھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔
"مجھے معاف کر دو بھا جی مجھے معاف کر دو۔"
"معاف بھی کر دوں گا بچے مگر تو میرے ساتھ تو چل ذرا، چل ماں صدقے جائے۔"
یہ کہہ کر میں نے اس کی کمر پہ ایک گھٹنا دیا اور اسے آگے لگا لیا۔ وہ بہت ہی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ عمر اس کی بھی کوئی پچیس سال ہو گی۔ بس اکہرے بدن کا جوان تھا وہ اور اس کو قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ کس نے کس اوکھلی میں سر دے دیا ہے۔ وہ پھاٹک سے باہر نکلا تو دھڑام سے منہ کے بل زمین پر گر گیا۔ میرا خیال ہے کہ خوف کی فراوانی میں اسے اپنے سامنے کی بھی کوئی شے نظر نہیں آئی تھی حالانکہ وہ صاف ستھری وصلی دھلائی رات تھی جس کے چہرے پر جس نما کوئی داغ کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ اور تاروں کی روشنی میں راستہ صاف دکھائی دیتا تھا۔
میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور... دھکیلتا ہوا اس مکان سے دور لے گیا۔ دائیں ہاتھ ایک ٹیلہ تھا۔ اس کی اوٹ میں پہنچ کر میں نے اس کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔ شنگری کا مکان وہاں سے صاف دکھائی دیتا تھا۔
"کیا نام ہے تیرا میرے یار! تو تو بڑا جی دار آدمی معلوم پڑتا ہے۔"
"جی بھا جی میرا نام اچھی ہے۔ میں اُدھر راوی روڈ کی کچی آبادی میں رہتا ہوں۔"
"وہ جو بادامی باغ کے پاس ہے؟"
"ہاں بھا جی بالکل وہی۔ وہ جو ریلوے لائن کے پاس ہے۔"
"تمہارا گھر وہاں کس طرف ہے؟"
"میں جی بھا جی اُدھر مائی بھیتی کے گھر کے قریب رہتا ہوں۔"
بھیتی کا نام اس کی زبان پر آیا تو میرے ذہن میں بہت سی یادیں انگڑائیاں لے کر اٹھ بیٹھیں۔
"بھیتی! وہ بڑھیا جسے رنے کا مرض ہے، کچھ جھول کر چلتی ہے وہی نا؟"
"جی بھا جی بالکل وہی، پر آپ اسے کیسے جانتے ہیں بھا جی!"
"بس ایسے ہی یہ میرے ایک دوست کی وہ منہ بولی ماں ہے کیا حال ہے اس کا؟"
"بہت برا حال ہے اس کا تو بھا جی۔ بڑی امیر ہو گئی تھی وہ۔ اس نے وہ مکان بھی خرید لیا تھا۔ پر جی پتہ نہیں کیا ہوا کسی نے اس کی بیٹی مجیدن کو اغوا کر لیا ہے جی۔ چند دن پہلے کی بات ہے۔ وہ رات کو آئے اور گھر والوں کو باندھ کر بھیتی کی بیٹی اٹھا کر لے گئے۔"
"مجیدن کو اٹھا کر لے گئے! یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔"
"میں نے سنا ہے بھا جی کہ ادھر کوئی رئیس رہتا ہے۔ وہ اس کا دشمن ہو گیا تھا۔ مائی بھیتی کا۔ بس اسی نے لڑکی اٹھوا دی ہے اس کی۔ وہ بے چاری تو اس روز سے پاگل ہو رہی ہے ابھی اکیس تاریخ کو اس کی شادی ہونے والی تھی۔" اس کا لہجہ بہت غمناک تھا۔

"یہ تو بہت برا ہوا یار۔ وہ مائی تو بیچاری بہت ہی نیک دل عورت ہے۔ بہت بُری خبر سُنائی ہے تم نے۔"

"وہ جی تھانے والے بھی مائی کو پکڑ کر لے گئے تھے کہتے تھے کہ وہ ڈاکوؤں کو پناہ دیتی ہے۔ کوئی ایسی ہی بات ہوگی جی ورنہ وہ اتنی دیر کیسے ہو سکتی تھی راتوں رات۔"

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر وہ ایسی ہرگز نہیں تھی میرے یار۔ تو یہ بتا کہ یہ فیقا اور یہ گوندل کیا کرتے ہیں۔ یہ ٹرک میں کیا چیز لادے ہوئے تھے۔"

"یہ۔۔۔ یہ بہت لمبی کہانی ہے بھاجی۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا وہ مجھے جان سے مار دیں گے۔"

"وہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں ان کو اچھا سبق سکھا آیا ہوں" میں نے اس کے سامنے پستول کی گولی سامنے کے پتھر پر چلاتے ہوئے کہا۔ ٹھک کی آواز پیدا ہوئی اور پتھر اپنی جگہ سے اُلٹ گیا۔

"یہ کیسا پستول ہے بھاجی، گولی چلی مگر آواز ہی پیدا نہیں ہوئی"

"یہ خاص قسم کا پستول ہے۔ میں نے ولایت سے منگوایا تھا۔ یہ آدمی کو بے آواز مار دیتا ہے۔ ذرا بھی تکلیف نہیں دیتا جب آدمی اس کی گولی سے مرتا ہے نا تو اسے بالکل درد نہیں ہوتا۔ چلا کر دیکھوں تیرے سینے پر اسے؟ قسم اللہ کی تجھے بالکل درد نہیں ہوگا۔ بڑے آرام اور اطمینان سے مر جائے گا تو۔ پڑھ کلمہ شہادت۔" میں نے پستول کی نالی اُس کے سینے سے لگاتے ہوئے کہا وہ پاگلوں کی طرح گھسٹتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ گھگھیانے لگا۔

"نہیں بھاجی۔ خدا کے لیے اسے ادھر کر لو۔ میں ابھی بتاتا ہوں بھاجی!"

"شاباش! اب آیا ہے تو سیدھی راہ پر۔ بتا میرا دیر، کہ یہ معاملہ کیا ہے؟"

"یہ۔۔۔ یہ بڑے پکے چور ہیں بھاجی یہ گوندل یہ فیقا اور یہ شگو۔ یہ سب ملے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ادھر چھپڑ کے نیچے سے ایک سرنگ کھود رکھی ہے جو دوسری طرف ریلوے ورکشاپ میں نکلتی ہے۔ اس سرنگ کے ذریعے یہ لوگ ریلوے کا لوہا تانبہ اور دوسرا سامان نکالتے ہیں اور کارخانوں میں لے جا کر بیچ دیتے ہیں۔ یہ ہزاروں من مال ہر مہینے وہاں سے چُراتے ہیں۔ بڑا پیسہ کماتے ہیں یہ بھاجی۔"

"یہ سرنگ کب کھودی تھی انھوں نے؟"

"یہ تو بھاجی تین سال پہلے کھودی گئی تھی۔ بڑے حساب کتاب سے یہ مال نکالتے ہیں اندر۔۔۔ سرنگ میں سے آدمی لیٹ کر گزر سکتا ہے اور ٹرالی یہ رسّوں سے گھسیٹتے ہیں۔"

"ہوں تو یہ بات ہے کس کس کارخانے میں مال بیچتے ہیں؟"

"یہ کبھی تو اپنا ٹرک گوجرانوالے لے جاتے ہیں اور کبھی ادھر شیخوپورہ روڈ پر۔ برانڈرتھ روڈ پر بھی ان کے گاہک موجود ہیں۔ یہ لوگ کروڑوں کا مال چُرا چکے ہیں اب تک۔"

"تجھے کیا ملتا ہے ان سے؟"

"مجھے یہ ہر مہینہ تین ہزار روپے دیتے ہیں کبھی یہ بہت خوش ہوتے ہیں تو ہزار دو ہزار انعام میں بھی دے دیتے ہیں۔"

"اتنا روپیہ کہاں رکھتا ہے تو؟"

"میں نے بھاجی اُدھر کچھ زمین خریدی ہے ادھر بکرمنڈی کے قریب وہاں میں مکان بناؤں گا۔"

"ہوں، تو یہ ٹھاٹ ہیں تمھارے۔ پلاٹ کے علاوہ بھی تو بہت کچھ ہوگا تمھارے پاس؟"

"نہیں بھاجی! بس اتنی ہزار کا وہ پلاٹ ہی خرید سکا ہوں میں۔ اور کچھ نہیں ہے میرے پاس۔ البتہ ہی گوندل اور فیقے نے بڑی جائیدادیں بنائی ہیں اس کام سے۔"

"وہ تو ظاہر ہے۔ اچھا دیکھ، اب تو جا اور ان کے ساتھ مل جا۔ میں تمھارے پیچھے میں ٹانگ نہیں اڑاؤں گا۔ مزے کرو۔ میں تو بس یونہی پوچھ رہا تھا۔"

"نہیں بھاجی، اب تو میں ان کے پاس نہیں جاؤں گا۔ مجھے پتہ ہے آپ انھیں پکڑوا دیں گے۔ آپ کوئی خفیہ پولیس کے آدمی نظر آتے ہیں مجھے۔"

"نہیں، مجھے بھی تم اپنا بھائی بند ہی سمجھو۔ جاؤ مزے کرو جاؤ۔" یہ کہہ کر میں نے اسے وہاں سے اٹھا دیا۔ مگر ابھی وہ دو قدم ہی چلا تھا کہ ہمیں شگری کے پھاٹک میں سے ٹرک باہر آتا دکھائی دیا۔۔۔ انھوں نے ٹرک کی بتیاں حسب سابق بجھا رکھی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ سارا مال لادنے کے بعد فیقے اور کالے کو بھی اس میں ڈال کر باہر لے آئے تھے۔ ابھی وہیں رُک گیا۔ بولا۔

"دیکھا بھاجی! انھوں نے میرا بھی انتظار نہیں کیا مجھے ساتھ لیے بغیر ہی نکل گئے ہیں۔"

"وہ سمجھے ہوں گے کہ میں تمھیں یرغمال بنا کر ساتھ لے گیا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے وہ یہی سمجھے ہوں بھاجی، پر اب مجھے جانے دیں میرا رکنا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"ہاں تم جاؤ مگر۔۔۔ ٹھیک ہے کھسک جاؤ یہاں سے اور پھر کبھی ان کے سامنے مت جانا ورنہ یہ تمھیں جان سے مار دیں گے۔"

"میں کل ہی کسی اور شہر میں چلا جاؤں گا۔ میں نے بیس ہزار روپیہ بچا کر رکھا ہے اس سے میں کوئی کاروبار کر لوں گا۔ میرا کیا ہے میں قید

نہیں ہونا چاہتا۔ یہ ایک نہ ایک دن ضرور پکڑے جائیں گے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ ٹھیک ہے بچے۔ اب تو جا۔ تیرا اللہ نگہبان۔"

میں نے اس کو وہاں سے بھاگ جانے کا اشارہ کیا۔ ٹرک بائیں ہاتھ مڑا اور پھر ہوا کی رفتار سے آگے نکل گیا۔ رفیقا بھی ان کے ساتھ ہی فرار ہو گیا تھا کیونکہ پھاٹک کی اندر کی کنڈی کھلی پڑی تھی۔ اگر کوئی شخص مکان میں موجود ہوتا تو وہ پھاٹک کو اندر سے بند تو ضرور ہی کر لیتا۔ میں ٹیلے کی اوٹ سے نکلا اور ایک بار پھر شگری کے مکان میں جا گھسا۔ پھاٹک کو بند کر کے میں نے اندر سے کنڈی چڑھائی اور چھپر کے نیچے جا کھڑا۔ ان لوگوں نے سرنگ کے منہ پر تختے رکھ کر اس کے اوپر اینٹوں کو یوں ہموار کر کے جوڑ دیا تھا کہ کسی کے فرشتوں کو بھی یہ خبر نہ ہو سکتی تھی کہ اینٹوں کے اس فرش کے نیچے سرنگ کھدی ہوئی ہے کیونکہ فرش کے اوپر وہ پیال ڈال گئے تھے۔ میں نے پیال ایک جگہ سے ہٹائی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں دو فٹ مربع سوراخ موجود تھا جس کے ذریعے سے ایک آدمی بڑی آسانی سے سرنگ میں اتر سکتا تھا۔ وہ سوراخ میں نے پیال سے ڈھانپ دیا۔ میں اس سرنگ میں اتر کر خواہ مخواہ مصیبت میں نہیں پھنسنا چاہتا تھا۔

چھپر سے ہٹ کر میں ایک بار پھر شگری کے کمرے میں جا بیٹھا۔ وہاں فرش پر رفیقے کا خون پڑا تھا۔ کسی نے کپڑا لگا کر صاف کرنے کی کوشش تو کی تھی۔ مگر داغ دھبے ابھی تک موجود تھے۔ وہ لوگ اُسے اٹھا کر اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے جس بستر پر میں سویا ہوا تھا۔ اس کی سفید چادر بھی خون آلود تھی شاید گوندل نے اپنی زخمی کلائی اسی چادر سے صاف کی تھی۔ میں نے وہ چادر پلنگ سے اتار کر فرش پر پڑے خون کے دھبے اچھی طرح صاف کر کے چادر کو باہر صحن میں لے جا کر آگ دکھا دی۔ جب وہ اچھی طرح جل کر راکھ ہو گئی۔ تو میں نے وہ راکھ ہاتھوں میں بھر کر صحن کے ایک کونے میں ڈھیر کر دی۔ میں اس معرکے کے تمام نشان مٹا دینا چاہتا تھا جو چند لمحے پہلے میرے اور گوندل کے درمیان وہاں ہو چکا تھا۔

جب میں کمرے میں واپس آ کر پلنگ پر بیٹھا تو میرا ذہن بری طرح الجھ چکا تھا۔ مجھے اس بے ضمیر آہو پر طیش آ رہا تھا جس نے مجیدن کی ماں کو سزا دینے کے لیے معصوم اور بے گناہ مجیدن کو اغوا کرا دیا تھا۔ محض اس لیے کہ میں اس بے چاری کے آنگن میں سے گزر کر آگے بڑھا تھا اور اس کی بیٹی کو کبری کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچا لیا تھا۔ اس نے مجھے ذلیل و رسوا کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اس نے حکام سے رابطہ قائم کر کے انھیں یہ باور کرا دیا تھا کہ میں آسیہ کو جیل سے رہا کرانے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا ہوں اس لیے بہتر یہی ہو گا کہ اسے وہ لوگ وہاں سے کسی اور جگہ منتقل کر دیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ذرا سی تاخیر کے بغیر آسیہ کو وہاں سے نکال کر راولپنڈی بھیج دیا تھا۔ اس بدنصیب پر خدا جانے کیا گزری ہو گی۔ وہ آدھی رات کو نیند کی ڈولی سے نکال کر کسی ٹرک کے سنگین فرش پر ڈال دی گئی ہو گی۔ وہ میری بے لوث ہمدرد بہن جس کا گناہ صرف یہ تھا کہ وہ غلام جیلانی کی سگی بہن تھی اور جس کے ہاتھوں میں مہندی کا رنگ رچتا دیکھنے کے لیے اس نے ڈاکہ زنی شروع کر دی تھی۔ آہو نے مجھے اچھی طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ حالت میری یہ ہو گئی تھی کہ اب میں کسی بھی طرف نکل نہیں سکتا تھا۔ میرے تمام راستے اس نے مسدود کر دیے تھے۔

اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح ابھرا اور میں نے سوٹ کیس میں سے تمام روپیہ نکال کر اپنی جیبوں میں ٹھونس لیا۔ اسٹین گن میں نے کندھے پر ڈالی اور پستول کمر سے باندھ کر میں شگری کا مکان اچھی طرح بند کر کے باہر نکل آیا۔

مجھے ہر حال میں اور ہر قیمت پر آہو تک پہنچنا تھا جس نے آسیہ کی مجیدن کی اس کی ماں کی اور خود میری زندگی میں ایسا زہر گھول دیا تھا کہ اب ہم سب کے سب پور پور مر رہے تھے اور ایسا کوئی تریاق ایجاد نہ ہو سکا تھا۔ جو ہمیں بچا سکتا۔

آہو ایسا بھیڑیا ثابت ہوا تھا کہ ہر قسم کے جرائم کا مرتکب ہونے کے باوجود وہ اپنے گھر میں ذی وقار بن کر بیٹھا تھا۔ انتظامیہ کی دیواروں میں اس نے نقب لگا رکھی تھی۔ مگر کوئی ایسا نہیں تھا جو اس پر ہاتھ ڈال سکتا۔ وہ چوروں اور ڈاکوؤں کی پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔ جس سے جو کام چاہتا تھا۔ لے لیتا تھا۔ وہ بنا بھی سکتا تھا اور مسمار بھی کر سکتا تھا۔ اس کی دو پر منی صورت، یعنی وہ مسند آرا کی بہن بھی اس کے ان جرائم میں برابر کی شریک تھی مگر کوئی اس کے اصل چہرے کو پہچان نہ سکتا تھا۔ غصہ مجھے اس بات پر آ رہا تھا کہ میرے اور آپی جیسے لوگوں پر ہی کیوں یہ الزام ہے کہ ہم مجرم ہیں۔ آہو جیسوں کو کوئی کیوں نہیں کچھ پوچھتا۔ جنہوں نے ہر آدمی کو بیدا کر رکھ دیا تھا۔ ایسے بھکال پیٹ لوگوں سے کوئی ان کی گردن پر ہاتھ ڈالے بغیر کیسے نمٹ سکتا ہے اور اب تو مجیدن بھی اس کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ وہ دھان پان سی کمزور بے بس لڑکی۔ اس کو خدا معلوم اس ظالم نے کیسی کڑی آزمائشوں میں ڈال رکھا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس وقت جو آندھی طوفان کی طرح آہو کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا تو اس کی وجہ صرف مجیدن کی وہ بے پناہ مظلومیت تھی جس پر میں تلملا کر رہ گیا تھا۔ میں اس رات اس آہو کے تمام کشتی پشت تباہ کر دینے پر تلا ہوا تھا میرے ذہن کے ایوانوں میں سرخ آندھی اٹھ رہی تھی اور میرے چاروں جانب خون ہی خون بکھرا نظر آ رہا تھا۔

وہ آپی اس رات میرے ساتھ ہوتا تو میری قوت سہ چند ہو جاتی مگر وہ کمینہ کسی اور راہ پر چل نکلا تھا۔ تف ہے اس کی صورت پر۔ کیسا بگلا بھگت بنا رہتا تھا وہ سالا۔ کہتا تھا ان عورتوں سے بچ جیلانی! یہ آدمی کو فرش کر دیتی ہیں۔ رگوں سے خون اور دل سے

ساری جرأتیں نچوڑ لیتی ہیں۔ یہ آدمی کو کہیں کا بھی نہیں رہنے دیتیں۔ اُلّو کا پٹھا۔ کیسی ترانٹ بکواس کرتا رہتا تھا وہ میرے سامنے ——— وہ یہ سارے پینترے دراصل میرے اور ماجدہ کے درمیان دیوار کھڑی کرنے کے لیے بدلتا تھا۔ نیت اس کی اپنی خراب تھی اور اُس ماجدہ کو بھی تو کوئی دیکھے، وہ بھی چپ چاپ اس کے جھکڑ میں آ گئی ——— وہ لفنگی عورت اندر ہی اندر جلتی ہوئی وہ آپی کے دل میں جا اتری تھی۔ اس لمحے مجھے آپی کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اب میں بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ اس پر بھی میں اپنے وجود کی ساری نفرت ایک نکتے پر مرکوز کر کے ادی باغ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کافی پیدل چلنے کے بعد میں جی ٹی روڈ پر جا پہنچا۔ وہ سڑک اسٹیشن سے واہگہ کی طرف جاتی تھی۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا مجھے معلوم تھا کہ اس وقت پولیس کی گشت میں کمی آ جاتی ہے۔ یہ ایسا خطرناک پہر ہوتا ہے کہ چوروں ڈاکوؤں اور اندھیرے کے دوسرے مسافروں کا سفر اس کے تاریک بیز پردوں میں اور زیادہ آسان اور تیز ہو جاتا ہے۔

مجھے کسی سواری کی تلاش تھی مگر دور دور تک مجھے کوئی ٹیکسی تانگہ آتا دکھائی نہیں دیتا تھا اور وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں مجیدن کا وہ بھولا بھالا سا چہرہ بار بار ابھرتا تھا۔ اُسے بھی میری ہی وجہ سے وہ روز بد دیکھنا پڑا تھا۔ اگر اس کی عصمت کا گوہر آبدار کہیں لُٹ گیا تو اس کی بھی تمام تر ذمے داری مجھ پر ہی عائد ہوتی تھی اور میں اس گھڑی جو یوں جنون و وارفتگی کے عالم میں سڑک پر جا نکلا تھا۔ تو میرے پیش نظر یہی مقصد تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے میں اس عفیفہ کو اس آہو کے چنگل سے چھڑاؤں۔ یہی میری آرزو تھی اور خدا کے حضور اس لمحے میرے دل سے یہی دعا نکلتی تھی کہ... جس طرح بھی ہو سکے، اس نحیف و نزار بے بس اور نادار لڑکی کو وہ اپنی امان میں رکھے۔ اور اُسے کسی موری کی اینٹ بننے سے بچا لے، کہ وہاں جو اینٹ لگ جاتی ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غلاظت کی زد میں رہتی ہے۔ پھر اُسے کوئی بھی یاد نہیں رکھتا۔ بستیاں تباہ ہو جائیں، غلاظت... کا گزر اس موری میں سے ناممکن ہو جائے تب جا کر کہیں وہ اینٹ اس ذلت سے محفوظ ہوتی ہے مگر ایسا دن کہاں آتا ہے۔ ایسے شہر کہاں ہوتے ہیں جو اس لیے تباہ ہو جاتے ہیں کہ... وہاں ظلم اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ اب تو ایسی بستیاں اور زیادہ پھیلتی ہیں اور زیادہ برگ و بار لاتی ہیں جہاں کنواریوں کی عصمتوں کا خون بے تحاشہ اور بے دریغ بہایا جاتا ہے۔ ایسے میں فطرت کی قہرمان قوتیں کہاں جا سوتی ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا اور اسباب ان ویرانیوں اور ذلتوں کے آہو جیسوں کے نامۂ اعمال میں ہی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ مگر ایسا کون ہے جو خود آگے بڑھ کر ایسے لوگوں کے قدم کاٹ سکے۔ بے بسی، ذلت اور لاچارگی کے احساس نے انسانوں کو یوں نڈھال کر رکھا ہے کہ وہ ہر ظلم، ہر تعدی پر صبر کر لیتے ہیں۔

میں بڑی سڑک پر کسی سواری کی تلاش میں پاگلوں کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ اور میرے ذہن میں بگولے اُڑ رہے تھے میرا بس نہیں چلتا تھا ورنہ میں سارے شہر کو جلا کر راکھ کر دیتا کہ اس شہر میں ایسی سنگین عمارت تھی۔ ایک محبس تھا جس نے میری زندگی کے چند نہایت ہی خوبصورت دن نگل لیے تھے اور جس نے میری چاندی ایسے بدن والی بہن کو برباد کر دیا تھا اور جس کے کسی خانۂ تاریک میں اس گھڑی مجیدن بھی پور پور کٹ رہی ہو گی۔

کوئی فرلانگ بھر پیدل چلنے کے بعد میں ایک کھمبے کے نیچے رک گیا۔ وہ کھمبا ایک پٹرول پمپ کے بالکل سامنے تھا اور اس گھڑی بالکل ویران پڑا تھا۔ اس کے شیشے کے کیبن میں بتی جل رہی تھی اور ایک نوجوان آدمی سامنے کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میں اس انتظار میں وہاں جا ٹھہرا کہ اگر کوئی گاڑی وہاں پٹرول لینے کے لیے رکی تو میں سوار ہو جاؤں گا۔

میں نے پٹرول پمپ کے احاطے کا اچھی طرح جائزہ لیا تو مجھے کیبن کے دائیں ہاتھ تاریکی میں ایک سکوٹر کھڑا نظر آیا۔ وہ غالباً اس نوجوان کا تھا جو کیبن کے اندر بیٹھا تھا۔ میری تمام تر توجہ اس کی طرف مرکوز ہو کر رہ گئی۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ مگر اُدھر سے کوئی گاڑی نہ گزری۔ سڑک پر ہُو کا سا عالم طاری تھا۔

ہر طرف سے میں مایوس ہو کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کیبن تک جا پہنچا۔ اسکوٹر کو میں اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ وہ بالکل نیا نظر آتا تھا۔ یا تو اس کی دیکھ بھال اچھی طرح کی گئی تھی یا پھر اسے خریدے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اور میرے لیے وہ اس وقت جیٹ طیارے سے بھی زیادہ قیمتی تھا کیونکہ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں اور مجھے بہر حال جلد از جلد آہو کے گھر تک پہنچنا تھا ——— مجیدن پر ہاتھ ڈال کر اس نے میرے سارے زخم ہرے کر دیے تھے اس نے میری بے خبری سے فائدہ اٹھا کر مسند آرا کے باپ کو میرے ہاتھوں سے قتل کروا دیا تھا۔ اور یہی ایک چوٹ ایسی تھی جو رہ رہ کر مجھے خون کے آنسو رلاتی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر کسی دن مسند آرا کو معلوم ہو گیا کہ اس کے باپ کا اصل قاتل میں ہوں تو پھر کیا ہو گا۔ وہ معصوم سی بھولی بھالی لڑکی جس نے میرا بُت تراش کر اس کی دن رات پرستش کی تھی مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے متنفر ہو جائے گی۔ اور یہ سب کچھ محض اس لیے ہوا کہ اس سارے شیطانی منصوبے کا مصنف آہو تھا جس نے ایک تیر سے دو شکار مارے تھے۔

میرے پاؤں کی آہٹ سن کر کیبن کے اندر بیٹھا نوجوان سنبھل کر

کی طرف دھکیل دیا۔ وہ بدک کر یوں دروازے میں گھسا جیسے اس نے اپنے سامنے کوئی آٹھ پاؤں کی چڑیل دیکھ لی ہو۔ حالانکہ میں نہ مونث تھا، نہ مخنث۔ پھر بھی مجھے یہی تشبیہ سوجھ رہی تھی۔

میں نے اسے کمرے میں لے جا کر بائیں ہاتھ سے دروازہ بند کیا اور پھر سوئچ دبا کر بتی جلا دی۔ وہ ادھیڑ عمر کا خاصا صحتمند آدمی تھا۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا البتہ مونچھوں اور سر کے بال کھچڑی ہو رہے تھے۔ وہ مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ اس نے لاشعوری طور پر ہی کہنیوں سے اوپر اٹھا لیے تھے۔ بوسکی کے کرتے کے نیچے اس کی ذرا سی آگے کو بڑھی توند اس کے تمول کی مظہر تھی۔ اس نے کلائی پر خوبصورت سی سنہرے رنگ کی گھڑی باندھ رکھی تھی۔ تہمد بھی اس نے بوسکی کا باندھ رکھا تھا جس میں اس کی بھری بھری تنومند رانیں پھنسی پھنسی سی دکھائی دیتی تھیں۔

"چل ادھر پلنگ پر بیٹھ جا پہلوان کیا نام ہے تیرا؟"

"میرا نام چوہدری منظور حسین ہے مگر..... مگر تم کون ہو؟"

وہ پیچھے ہٹ کر پلنگ پر یوں بیٹھا کہ اس کے دل کا خوف اور نمایاں ہو گیا۔

"وہ کبری کہاں ہے؟"

"وہ اپنے کمرے میں ہو گا۔ کیا کام ہے تمہیں اس سے؟" اب کی بار اس نے ذرا دلجمعی سے بات کی۔

"میرے ساتھ چلو اور اسے جگا دو۔ مگر نہیں، تم ادھر آؤ میرے پاس، اٹھو۔" میں نے پستول اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ وہ کوک بھرے کھلونے کی طرح اٹھا۔ اور دھپ دھپ چلتا ہوا میرے سامنے آ ٹھہرا۔ اس کے چہرے پر زردی غالب آ رہی تھی۔

"ادھر منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ اور آنکھیں بند کر لو۔" اس نے میرے حکم کی تعمیل کی تو میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ کر اس کی رگ مسل دی۔ اس نے گھبرا کر میری گرفت سے نکلنا چاہا تو میں سمجھا کہ وہ خاصا تنومند آدمی ہے مجھے دوہری توانائی صرف کرنی ہو گی۔ میں نے پستول کا دستہ اس کی کھوپڑی میں مارا اور اس کی رگیں اور زور سے دبائیں۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور وہ دھپ کر کے قالین پر گر گیا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں نے بتی بجھائی اور دوسرا دروازہ بے آواز کھول کر صحن میں جا نکلا۔ میں اس مکان میں داخل تو ہو گیا تھا مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں دوسری منزل میں آہو کی خوابگاہ تک کس طرح پہنچوں۔ مجھے اس سے صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ مجیدن کہاں ہے اور کس حال میں ہے، تاکہ میں اس کی مدد کو پہنچوں۔ دوسری منزل کی سیڑھیوں کا دروازہ اندر سے بند تھا اور اس کو کھلوا لینا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ اگر میں پائپ کے ذریعے دوسری منزل پر پہنچتا، تو یہ بات ممکن تو تھی مگر پھر وہی مشکل ستراہ بنتی تھی۔ آہو کبھی بھی میری دستک پر اپنی خوابگاہ کا دروازہ ہرگز نہ کھولتا۔ میں اپنی آواز بدل لینے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو بھی وہ ایسا شاطر آدمی تھا کہ صورت حال کو فوراً سمجھ جاتا۔ اسے رات کے اس سمے میں بھی زیر کر لینا بہت مشکل تھا اور مجھے اپنے مقصد میں کامیابی کی امید معدوم نظر آنے لگی تھی۔

مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے کیسی چوہدری منظور حسین کو بیہوش کر کے سخت غلطی کی ہے اس کے ذریعے میں آہو کا دروازہ کھلوا سکتا تھا۔ یہ بات قطعاً مشکل نہیں تھی۔ آہو اپنی خوابگاہ سے نکل آتا تو پھر سارا معاملہ ہی آسان ہو جاتا۔ میں نے چاہا کہ منظور حسین کو ہوش میں لے آؤں مگر پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ باقی اور کبری مہمان خانے کے ساتھ والے کمروں میں سوتے ہیں مگر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کبری کس کمرے میں ہے اور باقی کس حجرے میں۔ منظور نے بتایا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے۔

میں اس وقت سامنے کے کمرے کی بتی جلی۔ میں دبے پاؤں چلتا ہوا مہمان خانے کے دروازے کی اوٹ میں جا ٹھہرا۔ وہاں سے میں سامنے صحن پر نظر ڈال سکتا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد اس کمرے کا دروازہ کھلا اور کبری کمبل کی بکل مار کر غسل خانے کی طرف بڑھا۔ میری جان میں جان آنے لگی۔ میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ کبری اس وقت پیشاب کے لیے باہر نکلا تھا۔ فارغ ہو کر باہر نکلا تو میں نے اپنے چپ شاہ کی نال اس کی گدی پر رکھ دی۔ وہ ایک دم پلٹا اور مجھے دیکھتے ہی اس کا منہ حیرت کے مارے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور پتلیاں پھیلنے لگیں۔

"کیا کہتے ہو اب! کیا چاہتے ہو مجھ سے؟" اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اپنے کمرے میں چل، وہیں بات ہو گی۔ تجھ سے تو لمبا چوڑا حساب لینا ہے مجھے۔" یہ کہہ کر میں اسے گردن سے پکڑ کر دھکیلتا ہوا اس کے کمرے میں لے گیا۔

"بیٹھ جا ادھر پلنگ پر۔ میں تجھے زیادہ تکلیف نہیں دوں گا۔" یہ کہکر میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے بائیں ہاتھ سے چٹخنی چڑھا دی۔ وہ بڑے محتاط انداز سے مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا تو وہ مسکرا دیا، بولا۔

"یہ اس وقت تمہاری تشریف آوری کیسے ہوئی ہے استاد؟ پھر کوئی مصیبت کھڑی کرے گا تو ادھر۔"

"آہو سے میری ملاقات کرا۔ ابھی اور اسی وقت۔"

"بہت مشکل ہے استاد! صاحب اس وقت میٹنگ میں ہیں۔" اس نے صورت حال کی نزاکت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا پھر میز پر سے گولڈ لیف کا پیکٹ مجھے دیتے ہوئے بولا۔ "لے یہ سگریٹ پی اور اپنے چہرے سے یہ نحوست اتار دے۔ ذرا کھل کر بیٹھ اور ہنس کر

بات کر، تو جو کہے گا، میں کروں گا۔ پہلے ہی مجھ سے فربولت غلطی ہو چکی ہے۔ میں یار مار تو نہیں تھا پر اس ہرن صاحب کے جھانسے میں آ گیا تھا۔ ورنہ تیرا میں اب بھی ہاتھ بندھا غلام ہوں۔ لے سگریٹ پی اور اس غریب خانے کو اپنا ہی گھر سمجھ لے پکڑ۔" یہ کہہ کر اس نے ایک سگریٹ میرے ہونٹوں میں پھنسا کر اسے سلگا دیا۔ اب وہ پہلے ایسا خوفزدہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے چہرے کی بشاشت لوٹ آئی تھی۔ میں نے سگریٹ کا کش لگایا تو اس نے اپنی قمیص دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا کر اپنا سینہ مجھے دکھلایا۔ کوئی ڈھائی انچ لمبا چیرا تھا۔ تیسری اور چوتھی پسلی کے درمیان، بولا۔

"یہ زخم تو دیکھ ہی لینا چاہیے تجھے۔ زندگی تھی تو بچ گیا ورنہ تیرا وار تو کبھی خالی نہیں گیا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی قمیص نیچے ڈال دی۔

"تو اس سے زیادہ بڑے زخم کا مستحق تھا بیٹے! میرا ہاتھ ہل گیا تھا ورنہ تیرے تو باجے بج گئے ہوتے اسی روز۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے استاد! میں بھی کوئی بدنسل قسم کا آدمی ثابت ہوا ہوں۔ اس آہو نے مجھے غلط راستے پر لگا دیا تھا۔ خدا بیڑہ غرق کرے اس کا۔"

"اور تمہارا بھی..... اپنے لیے بھی تو یہی دعا مانگو۔"

"وہ تو میں مانگتا ہی رہتا ہوں پر استاد یہ بتا اس وقت تو نے یہ زحمت کیوں اٹھائی ہے مجھے بلوا لیا ہوتا۔"

"بہت تری..... سالے۔ مجھ سے تو تو یوں بات کرتا ہے جیسے تیری بہن کا خصم سامنے بیٹھا ہے۔ میں تو تجھ سے حساب کتاب کرنے آیا ہوں۔"

"نہیں استاد! میں نہیں مانتا۔ تو اتنا نیچے نہیں گر سکتا۔ بات کوئی اور ہی ہے حساب تو تو نے برابر کر لیا تھا۔ اب بتا تو کس لیے آیا ہے۔ آہو کو مارنا چاہتا ہے؟"

"پتہ نہیں میں کیا کروں! بہتر ہے کہ تو اسے ابھی باہر نکال کر میرے سامنے لے آ۔"

"میں بتا چکا ہوں استاد کہ صاحب اس وقت میٹنگ میں ہے۔" وہ ایک آنکھ دبا کر مسکرایا۔ میرے پستول سے وہ بالکل خوفزدہ نہیں تھا۔

"میٹنگ، میٹنگ! کیا کہہ رہا ہے تو، کوئی دفتر کھول رکھا ہے اس نے اوپر؟"

"بات کچھ ایسی ہی ہے۔ اس کی بیوی اس سے ملنے کے لیے اس کے کمرے میں گئی ہوئی ہے۔"

"اچھا! اب سمجھا! یہ ساتھ کے کمرے میں کون سویا ہوا ہے؟"

"اُسے تو اچھی طرح سُلا دیا ہو گا۔ میں جانتا ہوں تیرے نسخہ نمبر چار سو تیرہ کو۔ وہ ادھر کھرڑیانوالہ سے آیا ہے۔ یار ہے آہو صاحب کا۔"

"اسے کسی کا انتظار تھا، کسی عورت کا؟"

"یہ بھی بتا دیا تجھے اس خرمغز نے۔ بہت ہی پھسڈی نکلا یہ چوہدری بھی۔ کچھ موج میلا چاہتا تھا۔ میں نے بندوبست بھی کر دیا تھا۔ پر وہ سالی پہنچی ہی نہیں۔ رات بارہ بجے کا وعدہ تھا اس کا۔"

"پھر تو کیوں سو گیا اتنا بے فکر ہو کر؟"

"بس ایسے ہی یار۔ میں سمجھا وہ آ ہی جائے گی۔ تو نے تو دیکھا ہو گا اسے؟"

"نہیں۔ وہ اسی کے انتظار میں تھا۔ اور اسی کی امید پر اس نے دروازہ بھی کھول دیا تھا۔"

وہ پھر مسکرایا اور عجیب متردد انداز سے سر کھجانے لگا۔ اس کے چہرے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے مل کر بے حد خوش ہو رہا ہے میری اس بے وقت آمد پر اسے ذرا بھی پریشانی نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ اندر ہی اندر کھلکھلا کر ہنس رہا تھا اور اس کی یہ کیفیت میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا کر رہی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ کہیں اس نے میرے لیے کوئی جال تو نہیں بُن رکھا تھا جس کا حلقہ وہ میرے گرد آہستہ آہستہ غیر مرئی طور پہ تنگ کرتا جا رہا ہو۔

"تو نے بتایا نہیں استاد تو اس وقت آیا کس لیے ہے؟ یہ بڑی اہم بات ہے۔ میں تیرے کام آنا چاہتا ہوں۔"

"تو یہ بتا کبری کہ وہ مجیدن کہاں ہے؟"

"اچھا! تو یہ قصہ ہے۔ دیکھ استاد! میں تجھے ساری بات بتا دوں گا۔ افسوس مجھے بھی بہت ہے مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

"مجھے یہ بتا کہ وہ بدنصیب اس وقت کہاں ہے؟ اس پر کس نے ہاتھ ڈالا تھا؟"

"بات یہ ہوئی تھی استاد کہ جب میرے زخمی ہونے کے بعد پولیس تجھے نہ پکڑ سکی اور تو اس بختی کی چھت پر سے کود کر دوسری طرف نکل گیا تو آہو بہت زیادہ طیش میں آ گیا۔ اس نے پہلے تو مجیدن کی ماں کو ادھر تین دن تک حوالات میں سڑایا مگر جب اس نے کچھ بھی نہ بتایا اور آں ہاں شاں کر کے رہ گئی تو آہو نے اسے وہاں سے رہا کروا دیا۔ بختی بھی ایک مصیبت ہے۔ اس نے یہ کیا کہ وہ سیدھی چوہدری شاکر علی کے پاس جا پہنچی۔ وہ حکومت کی مخالف پارٹی کا آدمی ہے اس نے بختی کی ساری کہانی اگلے روز اخبار میں چھپوا دی۔ بس سارا معاملہ یہیں سے خراب ہوا۔ شاکر علی کو آہو کے کہنے پر تیسرے دن ایک آدمی کے قتل کے الزام میں جیل بھجوا دیا گیا۔ بختی کا کوئی حامی نہیں رہا تھا۔ آہو نے اپنے ایک غنڈے شرفو کے ذریعے اس کی بیٹی مجیدن کو اس کے گھر سے اٹھوا دیا۔ تین دن تک تو وہ مجیدن سے اپنا محنتانہ وصول کرتا رہا۔ پھر اس نے چوتھے روز اسے شاہی محلے کے ایک چوہدری کے ہاتھ سات ہزار روپے میں بیچ دیا۔ وہ بیچاری جب سے اب تک وہیں ہے۔"

"یہ شرفو کون ہے؟"

"یہ ادھر جونا منڈی میں رہتا ہے۔ بہت چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ آہو کا خاص آدمی ہے اور بڑا جتھا بنا رکھا ہے۔ محلے کی پولیس بھی اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی ہے۔"

"اس چوہدری کا کیا نام ہے جس نے مجیدن کو خریدا ہے۔"

"اس کا نام بندو خان ہے۔ کرنال سے آیا ہے یہ۔ بڑی ہی پلید چیز وہ۔" کبری نے مجھے ساری صورت سمجھا دی۔

"تجھے اس کارروائی کا علم کب ہوا؟"

"مجھے یہ ساری باتیں ایک دن آہو نے خود ہی بتا دی تھیں۔ ترنگ میں بیٹھا تھا۔ میں نے کہا جناب! یہاں اپنے غلام جیلانی کی ایک منہ بولی بہن بھی رہتی ہے مجیدن! بس اس کا نام سنتے ہی وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگا اور پھر اس نے وہ سب کچھ مجھے بتا دیا جو اس نے بھتی سے انتقام لینے کے لیے کیا تھا۔ وہ تو بچاری تباہ ہو کر رہ گئی ہے اوستاد! میرا دل بہت کڑھتا ہے اس کی حالت پر۔ مگر میں کچھ بھی تو نہیں کر سکتا۔"

"آہو نے یہ کام تجھ سے کیوں نہیں لیا؟"

"میں.... مجھے دراصل اس نے وہ کیا ہوتا ہے انگریزی میں، ہاں، ڈس کوالیفائیڈ کر دیا ہے۔ ایک دم کنڈم سمجھتا ہے وہ مجھے۔ کیونکہ اس دن میں تیرے معاملے میں ناکام رہ گیا تھا، بس اس دن سے تو وہ مجھے بہت ذلیل کرتا ہے۔ "آپا جی" کہہ کر بلاتا ہے وہ مجھے۔ کبھی وہ سالا کہتا ہے پھوپھی کبریا "ادھر آنا ذرا۔ بڑی گندی چیز ہے اوستاد یہ آہو۔ اسے تو تر نوالہ سمجھتا ہے؟"

"تجھے پتہ ہے میں ایک دن پہلے بھی یہاں آیا تھا۔"

"وہ تو مجھے سب پتہ چل گیا تھا۔ اسی لیے تو میں تجھے اپنا پیر و مرشد سمجھتا ہوں۔ اس روز بڑی ڈانگ ڈھلی بجائی اس آہو نے۔ اس کے بعد سارے شہر کی پولیس تیرے پیچھے لگا دی۔ اس کی قسمت اچھی تھی۔ کہ پولیس کے سپاہی اس سے ملنے آ گئے تھے اس روز۔ ورنہ تو یہ بے موت مر گیا ہوتا۔ اچھی کوچی پھیری تھی تم نے ان دونوں میاں بیوی پر۔"

"بس بچ گیا یہ اس روز میرے ہاتھوں سے۔ ورنہ تو میں انھیں مار ہی دیتا۔"

"پر اوستاد! یہ سالا کہتا ہے کہ تم اس کے سیف سے دو لاکھ روپے بھی لے گئے تھے۔"

"میں تو اپنی ہی رقم لے کر گیا تھا، اس سے۔ باقی روپیہ کسی اور کے ہتھے چڑھ گیا ہوگا۔ پولیس والے بھی تو کچھ حق رکھتے ہیں اس پر۔ انھوں نے بوجھ ہلکا کیا ہوگا اس کا۔"

"تمہارا اپنا کتنا روپیہ تھا اس کے پاس؟"

"یہی کوئی ایک لاکھ کے قریب تھا۔"

"اچھا تو یہ اسٹوری ہے دراصل۔ خدا تجھے حج نصیب کرے اوستاد! تو واقعی اللہ کا خاص بندہ ہے۔ بس افسوس یہ ہے کہ میرے لیے تیری شنی پر کوئی پھل نہیں لگتا۔"

"کبری! یہ پستول دیکھ رہا ہے تو؟ مت سمجھ کہ میں تیری خیر خیریت پوچھنے آیا ہوں۔ مجھے اوپر لے چل۔"

"میں سب سمجھتا ہوں اوستاد! مگر تو اوپر جائیگا تو لفڑا ہو جائے گا بہت بڑا۔ آہو کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

"کون سے مہمان؟"

"اس کا جو سسر تھا نا ہادی علی! اسے تو کسی مزارع نے قتل کر دیا تھا۔ اس کی پہلی بیوی کی بہن آئی ہے اپنے تین بیٹوں کے ساتھ۔ اور مسند آرا بھی تو ادھر ہی ہے۔"

"وہ... وہ بھی ادھر ہی ہے؟ کیا حال ہے اس کا؟ وہ تو باپ کی موت کے بعد بہت پریشان ہو گی۔"

"مت پوچھ اوستاد! وہ تو پہچانی نہیں جاتی۔"

"کیوں کیا ہوا اسے؟"

"پتہ نہیں! بس دن بدن نیچے ہی جا رہی ہے وہ کہتے ہیں وہ ذہنی مریض بن گئی ہے۔ ذرا ہوش میں آتی ہے تو سارا گھر سر پر اٹھا لیتی ہے۔ ڈاکٹر اسے نیند اور سکون کے ٹیکے ہی لگاتا رہتا ہے۔ مجھے تو بہت دکھ ہوتا ہے اسکی حالت دیکھ کر۔"

"مگر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟"

"آہو نے مجھے بتایا تھا کہ باپ کے قتل کا صدمہ اسے لے بیٹھا ہے۔ اس سے آہو کو ہمدردی بھی بہت ہے حالانکہ وہ اسکی سگی سالی بھی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ مسند آرا، ہادی علی کی دوسری بیوی سے ہے اس بدنصیب نے خاوند کے قتل کے بعد ادھر کسی کنوئیں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ بس مسند آرا کو یہ دوہرا صدمہ برباد کر گیا ہے۔"

"ہوں۔ تو یہ بات ہے۔ آہو نے اپنا راستہ صاف کر ہی لیا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں اوستاد! آہو بچارا تو خود پریشان ہے، کئی بار تو بیٹھے بٹھائے رونے لگتا ہے میرے سامنے۔"

"تو نہیں سمجھے گا اس بات کو کبری! تو ابھی بہت پیچھے ہے۔ تیری سمجھ میں یہ گورکھ دھندا نہیں آ سکتا ہے۔ یہ آہو نہیں مگر مچھ ہے مگر مچھ۔ اس کو زندہ چھوڑ کر میں نے اچھا نہیں کیا ہے کبری! مجھے اس کے پاس لے چل۔" وہ اٹھا اور دائیں ہاتھ کی الماری میں سے جزدان اٹھا کر میرے سامنے کرتا ہوا بولا۔

"دیکھ استاد! یہ۔۔۔ یہ قرآن ہے میرے ہاتھ پر ۔۔ مجھے اس کی مار پڑے جو میں پھر کبھی تیرے خلاف کوئی حرکت کروں تو۔ اس پر تو اعتبار ہے نا تجھے۔ اس دو جہانوں کے بادشاہ کے کلام پر۔"

"ہاں کیوں نہیں! مگر۔۔ مگر اسے کیوں اٹھا لیا ہے تو نے؟"

میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا، کیونکہ میں اپنے پلید اور گناہگار ہاتھ اس مقدس کتاب سے مس کر کے بے حرمتی کے خوف سے بری طرح لرز گیا تھا۔ کبری کے اپنے کپڑے اس وقت ناپاک تھے مگر پھر بھی اس نے کلام پاک کو ہاتھ میں تھام لیا تھا اور اس کا رنگ فق ہو گیا تھا لرزتے لہجے میں بولا۔

"میں اس کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں تجھے غلط مشورہ نہیں دوں گا۔ تو آہو کو شاید مجھ سے بہتر جانتا ہے مگر میں یہی کہوں گا کہ اس وقت تو آہو پر ہاتھ ڈال کر پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکے گا۔ اوپر، اس بائیں ہاتھ کے کمرے میں آج اس نے دو ڈاکو بھی سلا رکھے ہیں۔ وہ ادھر انڈیا سے آئے ہیں۔"

"مگر۔۔۔ میں انتظار نہیں کر سکتا ہوں کبری! اگر دیر ہو گئی تو وہ سب کچھ تباہ کر دے گا۔ وہ مسند آرا کو بھی کھا جائے گا، کبری! تو نہیں جانتا ہے مجھے کیا کچھ نظر آرہا ہے۔" میں نے اپنی آواز قدرے بلند کرتے ہوئے کہا۔ اب تک ہم بہت دبے گھٹے لہجے میں بات کرتے رہے تھے کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہماری آواز رات کے اس مہیب سناٹے میں کسی اور کے کان میں پڑے۔

کبری نے قرآن مجید الماری میں رکھ دیا۔ اور پھر میرے سامنے سگریٹ سلگا کر بڑے اطمینان سے بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد وہ آہو کو گندی گالی دیتے ہوئے بولا۔

"اسے کسی اور جگہ کسی اور دن پکڑو۔ آج کی رات تیرے حق میں اچھی نہیں ہو گی۔"

"مسند آرا کا علاج کون کرتا ہے؟"

"ڈاکٹر بخاری ہے ادھر۔ لیڈی ولنگڈن ہسپتال کے سامنے دکان ہے اس کی۔ آہو خود اسے کار میں بٹھا کر وہاں لے جاتا ہے کسی دن طبیعت زیادہ خراب ہوتی ہے تو ڈاکٹر گھر پر آجاتا ہے۔"

"یہ کار کب سے خریدی ہے اس نے؟"

"کار تو بہت دنوں سے ہے اس کے پاس۔ مگر کچھ عرصہ یہ ادھر ورکشاپ میں پڑی رہی جس کی وجہ سے یہ تمہیں نظر نہیں آئی۔"

"کس وقت جاتا ہے یہ ڈاکٹر کے پاس؟"

"دس بجے کے قریب اتارتا ہے یہ مسند آرا کو نیچے، سرور بیگم بھی ساتھ ہی جاتی ہیں۔"

"تجھے پتہ ہے کہ وہ مجیدن کس مکان میں ہے آج کل؟"

"میں ایک دن گیا تھا ادھر۔ ایک دلال نے مجھے بتایا تھا، کہ وہ ابھی ادھر ہی ہے کہیں اور ٹرانسفر نہیں کیا ہے اسے بندو خان نے۔ وہ تو مجھے بتاتا تھا کہ ابھی بقول اس کے مجیدن کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے جا رہے ہیں۔ بندو خان اسے ناچ گانا سکھا رہا ہے۔ اس میں منافع زیادہ ملتا ہے نا۔"

"وہ کس طرح؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"وہ کس طرح! حد کرتے ہو تم بھی استاد۔ گائے کو ایک ہی دن ذبح کر کے اس کا گوشت کھا لو تو قصہ ختم پیسہ ہضم مگر جب کوئی باقاعدہ اس کی کیا کہتے ہیں ۔۔ فیملی پلاننگ کرتا ہے تو وہ اس کا دودھ بھی پیتا ہے اور بچھڑے بھی حاصل کرتا ہے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو کبری! مگر وہ مجھے نہیں جانتا وہ بندو خان۔ میں تو اس کی پیٹھ میں سے گولیاں گزار دوں گا۔ اس کی موت آئی ہے میرے ہاتھوں۔"

"مشکل ہے استاد! بڑے ڈنڈ پھٹوں والے بدمعاش پال رکھے ہیں اس نے، تیری دال نہیں گلے گی وہاں، پولیس کو وہ الگ دیتا رہتا ہے وہ کیا کہتے ہیں ہندی میں 'گھوس'۔ ہاں یہی بات کہی تھی اس سکھ نے۔"

"یہ سکھ کون ہے؟"

"یہ ان ڈاکوؤں میں سے ایک کا نام ہے جو آہو سے ملنے کے لیے آیا ہوا ہے انڈیا سے۔ وہ ادھر چندی گڑھ کا رہنے والا ہے۔ بڑا سوہنا جوان ہے استاد یہ سکھ ہے۔ ایشر سنگھ نام ہے اس کا۔"

"ہوں، تو بار ڈر کے اس پار بھی یاری لگا رکھی ہے اس آہو نے۔ تو ٹھیک کہتا ہے کبری۔ واقعی بڑی پلید شے ہے یہ تیرا ہرن صاحب۔ مگر۔۔۔ خیر۔۔۔ تو چل میرے ساتھ مجھے اس بندو خان سے ملوا ہی دے۔ ابھی اور اسی وقت۔ میں اس مجیدن کے لیے یہاں آیا ہوں۔"

"ذرا اذان ہو لینے دے۔ پھر میں بڑا دروازہ کھول کر نماز کے بہانے باہر نکل جاؤں گا تو ادھر پچھلی طرف سے نکل سکتا ہے نا؟"

"ہاں میرے پاس سکوٹر ہے وہ میں ادھر لان میں چھوڑ آیا ہوں۔"

"گھوڑی نہیں لایا ہے تو اور کوئی؟" یہ کہتے ہوئے وہ ایک آنکھ دبا کر پھر مسکرایا۔

"اس پہلی گھوڑی کا کیا کیا تھا تم لوگوں نے؟"

"وہ بچاری تو اب کسی تانگے کے آگے جتی ہو گی۔ آہو نے مجھے بخش دی تھی وہ۔ سالا کہتا تھا، کبری یہ تجھے کچھ نہیں کہے گی۔ تیری ماں برابر ہے یہ۔ یاد ہے نا تجھے ۔۔ حرام کا تخم بہت ذلیل کرتا ہے مجھے۔ میں نے اسے لے جا کر ایک کوچوان کے ہاتھ بیچ دیا دو ہزار روپوؤں میں۔"

"چل اچھا ہوا مجھ تو فائدہ اٹھایا تُونے۔"

"ہاں، تُونے بھی تو کیس سے وہ راہ چلتے کھول لی ہوگی۔ یہ سگریٹ پی۔ اگر ٹھک ٹھک کا خطرہ نہ ہوتا تو میں تجھے چائے پلاتا ایک دم فسٹ کلاس چائے مگر ڈرتا ہوں گھر والے نہ جاگ اٹھیں۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر سلگا لیا۔ کبری پر مجھے اعتبار آنے لگا تھا۔ اس کی باتوں میں خلوص جھلکتا تھا۔ اس نے نہایت سادگی اور صاف دلی سے مجھے ساری باتیں بتا دی تھیں۔ میری راہ کے سارے کانٹے اس نے مجھے سجھا دیے تھے۔ وہ شاید اس گولی کی ندامت کے بوجھ تلے دبا جاتا تھا جو اس نے مجھ پر آہو کے کہنے سے چلائی تھی۔ اور اب وہ صاف شفاف آئینے کی طرح میرے سامنے یوں بیٹھا تھا کہ مجھے اس کی کسی بھی بات پر کوئی شک نہیں رہا تھا۔

آہو کے بارے میں مجھے اس نے جو کچھ بتایا تھا اس سے یہی معلوم ہوا تھا کہ آہو اب اپنے راستے کی دوسری رکاوٹیں ہٹانے میں مصروف تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مسند آراء کی ماں کو اس نے ہی کنوئیں میں پھنکوا کر مار دیا ہوگا۔ مسند آراء کی دگرگوں ذہنی کیفیت کی ایک وجہ تو مجھے نظر آ گئی تھی۔ اس کو جو صدمہ پہنچا تھا وہ بے حد و حساب تھا۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا یقیناً پاگل ہو جاتا۔ وہ اگر باؤلی ہو گئی جاتی تھی اور اسے اب علاج کی ضرورت تھی تو کوئی انھونی بات نہیں تھی۔ مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آہو کیوں اس پر اس قدر مہربان ہو چکا ہے اور وہ سروری بیگم کو ساتھ لے جا کر اس ڈاکٹر سے مسند آرا کو کس قسم کی ادویات دلا رہا ہے کہ اس کی حالت سنبھلنے کے بجائے اور زیادہ بگڑتی جا رہی ہے۔

میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ اور کبری میرے سامنے بیٹھا میری سوچوں کے تعاقب میں مصروف تھا۔

میرے وجود میں درد کا پیڑ اُگ آیا تھا۔ اور اس کی شاخیں اندر ہی اندر پھیل کر مجھے نڈھال کیے دیتی تھیں۔ میں ابھی تک آسیہ کے لیے ہی کچھ نہ کر سکا تھا۔ اس کے گرد چنے ادبار کے بلند و بالا حلیم و حصار کو ہی میں ابھی سر نہ کر سکا تھا کہ مجھے مجیدن کی دبی کچلی لاش راہ میں مل گئی تھی۔ جن جن لوگوں کو میں عزیز رکھتا ہوں، وہی تقدیر کے ہاتھوں گھائل ہو جاتے ہیں۔ مجھے وہیں وہیں چوٹ لگتی ہے جہاں مجھے سب سے زیادہ درد محسوس ہوتا ہے۔ میں اس مفلسی کی اسیر اس بے نوا اور بے بس لڑکی کو صحیح سالم ان درندوں کے منہ سے کیسے نکال سکتا تھا کیونکہ وہ تو اب تک اس کا سارا تقدس، اس کی ساری معصومیت اور اس کے وجود کے سارے شیشے چکنا چور کر چکے ہوں گے۔ مجھے وہ پہلی سی نرم و نازک سیدھی سادی مجیدن کہاں مل سکے گی۔ سب کچھ ملیامیٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ اور میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں کیس تاریخ کو اس کی شادی میں ضرور شریک ہوں گا۔ مگر

اب تو حالات نے اس بیچاری کو کچھ اس طرح جو کھیکر دیا ہوگا کہ وہ پہچانی نہ جاتی ہوگی۔ اس کی آنکھوں کی ساری چمک دمک ان درندوں نے نوچ کر بھسم کر دی ہوگی۔

زندگی آہستہ آہستہ فنا کے گھاٹ اُترتی جا رہی ہے۔ نہ چاند کو ثبات ہے نہ سورج کو۔ اگر قرار اور دوام کسی شے کو یہاں حاصل ہے تو وہ ہے انسان کے خون میں بہتی ہوئی بہیمیت کو۔ وہ اپنی راہ میں آنے والی ہر کمزور شے کو نگلتی چلی جاتی ہے۔ مجیدن اور مسند آراء کا قصور صرف یہی ہے کہ وہ نحیف و نزار ہیں۔ اپنی حفاظت نہیں کر سکتی ہیں۔ ان کی کمزوری ہی ان کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ٹوٹے ہوئے ریزہ ریزہ لعل و گوہر میں کس کے پاس لے جاؤں گا کہ وہ اپنی مسیحائی سے ان کو پھر ثابت و سالم کر دے۔ یہ ناممکن تھا۔ پھر بھی مجھے مجیدن کے پیچھے ضرور جانا ہوگا۔ کہ میں نے اسے بہن کہا تھا اور بہن ہی سمجھا تھا۔ کبری اسے خانگی بنانے پر تُلا ہوا تھا۔ مگر میں نے اسے ایک نئی زندگی سے روشناس کرانے کی کوشش کی تھی۔ وہ ماں جو اس بیٹی کے چھدرے تھرے کرتی نہ تھکتی تھی اس رات اس قدر سفاک ہو گئی کہ ایک فاقے کو ٹالنے کے لیے اس نے اپنی نرم و نازک بھولی بھالی مجیدن کو کبری کے ساتھ روانہ کر دیا اور اب آہو نے بھی میرے دل کے سب سے نازک مقام پر ضرب پہنچانے کے لیے مجیدن ہی کو منتخب کیا تھا تاکہ میں درد سے بلبلا اٹھوں اور ہمیشہ کے لیے جرمی کے تپ میں مبتلا ہو جاؤں۔ مگر نہیں میں خود کو ایسی پستی میں نہیں گرا سکتا تھا۔ میں اس ریزہ لعلِ بدخشانی کو اس گندی موری سے اٹھا کر سینے پر سجاؤں گا۔ میں تو مجیدن کو یوں زندہ درگور ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے تو وہ اتنی ہی عزیز ہے جتنی آسیہ۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ مجیدن اب تک چاٹنے کی پیالی کی طرح ان گنت لبوں سے لگ چکی ہوگی۔ جس گلی میں وہ بیچ دی گئی تھی وہاں تو ہر شام اس کا نیا ہی کا نکاح پڑھا جاتا ہوگا۔ ہر رات وہ نئے گاہک کا منہ دیکھتی ہوگی۔ اس کے سارے تیج پات پامال ہو چکے ہوں گے مگر پھر بھی مجھے وہ عزیز تھی۔ جان و دل سے زیادہ محترم۔ اور اسی لیے میں چاہتا تھا کہ کبری مجھے وہ مکان دکھا دے جو میری بد نصیب کا محبس بن چکا تھا۔

مجھے آہو سے بھی حساب لینا تھا اور اس کی اس تو وہ بیٹی بیوی سروری بیگم سے بھی جو مسند آرا کی سوتیلی بن گئی تھی۔ اور اپنے طور پر اس کی تباہی کے سارے انتظامات مکمل کیے بیٹھی تھی۔ مسند آرا کے سامنے تقدیر تلوار سونت کر کھڑی تھی اور مجھے اس کو بھی اس اندوہناک انجام سے بچانا تھا کہ ابھی تو وہ تتلی کی زد میں آئی تھی۔ ابھی اسے گھر سے باہر نہیں نکالا تھا۔ ابھی اس کی گردن کے گرد شکنجہ اتنا سخت نہیں ہوا تھا۔ اور ابھی میں اسے آہو کے دندان حرص و آز

سے بچا سکتا تھا۔
کبری متواتر سگریٹ پی رہا تھا۔ مسکراہٹ اس کے لبوں پر منجمد ہو چکی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے دیکھ کر وہ اتنا خوش کیوں ہو رہا ہے۔ پستول ابھی تک میرے سیدھے ہاتھ میں تھا اور اس کی نال کا رخ اس کے سینے کی طرف تھا پھر بھی وہ مجھ سے قطعاً خوفزدہ نہیں تھا۔
اچانک اس نے تکیے کے نیچے بچھے گدے کا ایک سرا اوپر اٹھا دیا، بولا۔
"یہ دیکھ اوستاد میں بھی بھرا ہوا پستول اپنے سرہانے رکھ کر سوتا ہوں یہ مجھے آہو نے دیا تھا۔ مگر میں اس سے کام نہیں لوں گا۔ تیرے سامنے نہیں، بالکل نہیں، پر تجھے مجھ پر اعتبار ہی نہیں آ رہا ہے۔"
میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر وہ پستول اٹھا لیا۔ وہ بھیم کا بنا ہوا ہلکا پھلکا کھلونے ایسا پستول تھا۔ اس کا چیمبر اس نے لبالب بھر رکھا تھا۔
"مجھے تجھ پر اعتبار ہے کبری! ایسا بھی اندھا نہیں ہوں میں۔"
یہ کہہ کر میں نے وہ پستول اپنی بائیں جیب میں رکھ لیا۔
"مجھے واپس نہیں کریگا تو میرے؟"
"ابھی نہیں، پہلے تو مجھے مجیدن تک لے چل۔"
"میرا خیال ہے اذان ہونے ہی والی ہے۔ میں اتنے میں ذرا دوسرے کپڑے پہن لوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اس نے ٹرنک سے نکال کر کارڈرائے کی پتلون پہنی اور پھر ایک موٹی سی جرسی بدن پر سجا کر جرابیں پہن کر فلیٹ بوٹ میں پاؤں ڈال دیے۔ بولا۔
"یہ اوورکوٹ بھی چڑھا ہی لوں، باہر سردی زیادہ ہوگی —"
جب وہ اس کام سے فارغ ہو چکا تو بولا۔
"لا اب یہ پستول مجھے دے دے۔ ادھر پتہ نہیں کیسے حالات پیش آئیں۔"
"نہیں کبری! یہ پستول میرے ہی پاس رہے گا۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی ہتھیار رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"
یہ کہہ کر میں کرسی سے اٹھ گیا۔
اس وقت چار بج رہے تھے۔ گھڑی پر ایک نظر ڈال کر میں نے دروازہ کھول دیا مگر کبری نے پٹ پھر بھیڑ دیے۔ بولا۔
"ذرا رک جا اوستاد۔"
"نہیں تو ابھی چل میرے ساتھ۔ میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔"
یہ کہہ کر میں اسے کھینچتا ہوا صحن میں لے آیا اور اسی کمرے میں سے گزار کر پچھلی طرف لے گیا جہاں میرا سکوٹر کھڑا تھا۔ باہر چاندنی نے کھیت کر رکھا تھا۔ چادر مہتاب یہاں سے وہاں تک یوں بچھی تھی کہ ہر شے صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے سکوٹر بڑی احتیاط سے چھوڑے گیٹ سے باہر نکالا اور کبری کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے نکل گیا۔
اس مکان سے سو گز آگے جا کر میں نے سکوٹر اسٹارٹ کر کے کبری کو پیچھے بٹھایا اور ہیرا منڈی کی طرف چل دیا۔ کبری نے دوبارہ مجھ سے اپنا پستول واپس نہیں مانگا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ وہ سالا کہیں میرے پیچھے بیٹھ کر چپکے سے میری پسلیوں میں چاقو نہ دھنسا دے۔ اس سے تو کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ روپے کے لالچ میں اس روز اس نے مجھے جان سے مار ڈالنے کا انتظام کر دیا تھا اور اب تو صورتحال یہ بھی کہ اس کے سینے پر میری گولی کا نشان صاف نظر آتا تھا۔ بہت دن تک وہ ہسپتال میں پڑا سسکتا رہا تھا۔ اسی خیال سے میں نے راوی روڈ پر چڑھتے ہی اسے متنبہ کر دیا۔ وہ میرے ساتھ چمٹ کر بیٹھا تھا۔
"دیکھ بے! اگر تیرے پاس کوئی چاقو چھری ہے تو وہ نکال کر مجھے دے دے۔ میں تیری زد میں آ گیا ہوں بیٹے۔"
"تجھے ابھی تک مجھ پر اعتبار نہیں آیا ہے اوستاد حالانکہ میں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی ہے۔" وہ ناراض ہونے لگا ——
"اب تو بہتر ہے میں تیرے ساتھ نہ جاؤں۔ تجھے مجھ پر کبھی اعتبار نہیں آئے گا۔" اس کا لہجہ خاصا زخمی معلوم ہوتا تھا۔
"بس پھر بیٹھا رہ اطمینان سے۔ میں نے تجھے صرف یاد دلایا ہے کہ تیرے سامنے غلام جیلانی بیٹھا ہے۔" میں سکوٹر دوڑاتا ہوا میو ہسپتال کے سامنے سے گزر کر بادشاہی مسجد کی طرف چل دیا۔ کبری اب بالکل خاموش تھا۔ سڑکیں اس گھڑی بالکل سنسان ہو رہی تھیں۔ ہیرا منڈی تھک ہار کر سو چکی تھی۔ جسموں کا کاروبار ختم ہو چکا تھا۔ وہ آغوش جو رات کے شباب کے ساتھ ہی وا ہونے لگتے تھے، اب چکنا چور شیشوں کی طرح بستروں پر بکھرے ہوں گے۔ جتی بازار کی جاگتی رات اس گھڑی دم توڑ چکی تھی۔ میں بادشاہی مسجد کے قریب گزر کر کبری کے کہنے کے مطابق حضرت سید قاسم شاہ مشہدی کے مزار کی طرف چل دیا۔ اس مزار کے قریب سے گزر کر آگے بڑھا تو کبری بولا۔
"اوستاد ادھر بائیں ہاتھ چل۔"
میں نے سکوٹر کا رخ بائیں ہاتھ موڑ لیا۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ اگر کہیں گشتی پولیس سے آمنا سامنا ہو گیا تو ہم خواہ مخواہ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ مگر خیریت یہ گزری کہ راستے میں ہمیں کسی بھی جگہ کوئی سپاہی نظر نہیں آیا۔
کبری نے ایک مکان کے سامنے سکوٹر روکنے کا اشارہ کیا اور جونہی میں نے انجن بند کیا وہ سیٹ پر سے اتر کر مکان کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔
"وہ اسی مکان میں رکھی گئی تھی۔"

"تم خود آتے تھے اس کے ساتھ؟"

"نہیں، میں تو نہیں آیا تھا مگر مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ بندو خان کی گشتیاں یہیں رہتی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے دروازے پر بڑے زوردار طریقے سے دستک دی اور بولا۔

"میں تیرے ساتھ اندر نہیں جاؤں گا، وہ مجھے پہچانتا ہے۔ میں اب واپس چلتا ہوں۔ صبح میں تجھے ادھر نو بجے شاہی مسجد کے دروازے پر ملوں گا۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹا تو میں نے اسے روک لیا۔

"تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں خواہ مخواہ آپ کی نظروں میں مشکوک نہیں ہونا چاہتا۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر میں تیرے کسی کام نہ آسکوں گا۔ اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر اس نے مجھ سے ہاتھ چھڑایا اور تیزی سے بائیں ہاتھ کی تنگ گلی میں گھس گیا۔

پہلی کی دستک بے اثر ثابت ہوئی تھی۔ میں نے چند لمحے انتظار کیا۔ اور پھر دروازے کو پوری قوت سے کھٹکھٹا دیا۔ چار سو ہُو کا سا عالم طاری تھا۔ چوتھی دستک پر مجھے دروازے کے پیچھے روشنی کی جھلک دکھائی دی۔ کسی نے اندر کا بلب جلا دیا تھا۔

"کون ہے؟" کسی عورت کی آواز تھی۔ بڑی بیزار، بڑی تھکی ہوئی۔ واماندہ سی۔

"دروازہ کھولو مجھے بندو خان سے ملنا ہے۔"

"مگر تم ہو کون؟"

"میں۔۔۔ تھانے سے آیا ہوں۔ انسپکٹر جمیل میرا نام ہے۔ مجھے بندو خان سے ابھی ملنا ہے اسے فوراً باہر بھیجو۔" میں نے عورت کو خوفزدہ کرنے کے لیے اپنا تعلق پولیس سے ظاہر کر کے اپنے مقصد کے حصول کی راہ آسان کر لی تھی۔ میری بات کا اس عورت پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ وہ کوئی ادھیڑ عمر کی لدھڑ قسم کی عورت تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے بال بے حد لمبے تھے اور چونکہ وہ اپنا جوڑا کھول کر سوئی تھی اور اسی حالت میں اٹھ کر باہر آگئی تھی۔ اس لیے اس کے بال کھل جانے کی وجہ سے گھٹنوں تک لٹکے نظر آتے تھے۔ اس نے دروازہ کھول کر مجھے ڈیوڑھی کے بلب کی روشنی میں گہری گہری نظروں سے دیکھا اور بولی۔

"کس تھانے سے آئے ہیں آپ؟"

"میں کاموکی تھانے سے آیا ہوں۔ وہاں دو عورتیں گرفتار ہو کر آئی ہیں ان کے بارے میں مجھے بندو خان سے کچھ پوچھنا ہے۔ ایک عورت شدید زخمی ہے۔"

"ہائے میں مر گئی۔ وہ کون کلموہنیاں ہیں۔ آپ اندر آجائیں، میں بندو خان کو جگاتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے اندر جا کر دائیں ہاتھ کے ایک صاف ستھرے کمرے میں صوفے پر بٹھا دیا۔ یہ ان کے گانے بجانے کا کمرہ تھا۔ ادھر ادھر کئی ساز دیواروں کے ساتھ بڑے قرینے سے رکھے نظر آتے تھے۔ کمرے میں رات کے پہلے پہر کی سلگائی ہوئی اگربتیوں کی خوشبو ابھی باقی تھی، دم توڑتے قہقہوں۔۔۔ اور جاں بلب تانوں کا پتہ دیتی تھی۔

فرش پر بچھا دبیز قالین اس بات کی شہادت دیتا تھا، کہ اس بیٹھک میں سیم وزر کی بارش خاصی زور سے برستی ہے۔

میں نے سگریٹ سلگا کر اپنے ذہن سے اس مکروہ صورت حال کی ساری تلخی دھو ڈالی۔ مجھے لینا ہی کیا تھا ایسی باتیں سوچ کر۔ میں کون سا مصلح تھا۔ میری اپنی زندگی سرتاسر جرم کے دلدل میں دھنس کر رہ گئی تھی میرے شب و روز تاریکی میں گزر رہے تھے۔ میں نے بھی تو ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اپنا رُواں رُواں گناہ کی گود میں پھینک دیا تھا مجھے کیا حق پہنچتا تھا کہ قائد اعظم کی تصویر کو اس عشرت کدے کی دیوار پر دیکھ کر تاسف اور ملال کے سیلاب کی نذر ہو جاتا، میں زہرخند کر کے چپ ہو رہا۔

کوئی دس منٹ بعد بیٹھک کا دروازہ ایک اونچے لمبے گندمی رنگ کے پہلوان صفت آدمی کے وجود سے لبالب بھر گیا۔ وہ بندو خان تھا۔ اس نے بوسکی کا لاچا اور بوسکی کا کرتا پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں نازک سی سلیم شاہی جوتی پہنے ہوئے تھا۔ بال اس نے بوہڑی خانہ بدوشوں کی طرح اتنے بڑھا رکھے تھے کہ وہ اس کے کاندھوں کو چھو رہے تھے۔ ایک کان میں اس نے طلائی بالی لٹکا رکھی تھی۔ کمر پر اس نے ایک خوبصورت سی اونی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ جس کا ایک سرا اس نے بغل میں سے گزار کر کندھے پر ڈال لیا تھا۔ اس کی آنکھیں نیند سے خمار آلود تھیں۔ ایک لمحے کے لیے وہ دروازے میں رُکا اور چند لمحوں تک مجھے بڑے غور سے دیکھنے کے بعد آگے بڑھ آیا۔ وہ عورت اس کے پیچھے تھی۔

"السلام علیکم جناب! یہ آپ نے ادھر اس بخت آنے کی کیسے زحمت پھرمائی؟"

"بندو خان تمہارا ہی نام ہے؟" میں نے خاصے حاکمانہ لہجے میں پوچھا۔ اس طرح کہ وہ بدکے بھی نہیں اور مجھے آشنا سمجھ کر باتوں میں اڑایا جا سکوں۔

"جی جناب! خادم کو ہی بندو خان کہتے ہیں۔ آپ کا نوکر ہوں۔ جا صابری ان کے لیے چا بنا لا۔" وہ میرے بائیں ہاتھ کی کرسی پر آ بیٹھا۔

"نہیں چائے کی ضرورت نہیں ہے مجھے تم سے کچھ باتیں پوچھنا ہیں۔" میں نے کہا۔

"پھرمائیے سرکار! میں تو نوکر ہی آپ کا ہوں۔ آپ اودھر کاموکی سے آئے ہیں۔ جا صابراں چلئے تو لے ہی آ، اس بنی کو جگئے جرا۔"

صابراں اُلٹے پاؤں باہر نکلی تو میں نے اُٹھ کر دروازہ اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ میری یہ حرکت دیکھ کر بندو خان کرسی پر تن کر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ اُس نے چادر میں چھپا رکھے تھے جیسے وہ سردی سے بچنے کے لیے بغل مار رہا ہو۔ مگر میں نے دیکھ لیا تھا اس نے لاچے کی ڈب میں سے کوئی چیز نکال کر چادر کے نیچے سیدھے ہاتھ میں تھام لی تھی۔ بلاشبہ وہ کوئی ہتھیار تھا مگر اس کی نوعیت کا مجھے اندازہ نہیں ہو سکا۔

دوبارہ صوفے پر بیٹھنے کے بجائے میں نے کوٹ کی جیب سے اپنا چپ شاہ نکال کر ایکدم اس پر تان لیا۔

"یہ پستول دیکھتے ہو بندو خان، یہ بے آواز چلتا ہے اور میرا اشارہ سمجھتا ہے۔ اس نے مجھے کبھی دھوکہ نہیں دیا۔"

وہ ذرا نہیں گھبرایا، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دیا اور بولا

"مجھے پہلے ہی جھی کھدشہ تھا میرے سرکار! تیری صورت تو کچھ اور ہی بتاتی تھی۔ پر میں دھوکا کھا گیا۔ کیر۔۔۔ تو مطلب کی بات کر۔" یہ کہہ کر وہ کھل کر مسکرا دیا۔ اس کے سامنے کے دانتوں میں سونے کی دو کیلیں نمایاں ہو گئیں۔ وہ کیلیں اس کی مسکراہٹ کو جاذب نظر بناتی تھیں۔

"میں مجیدن کو لینے آیا ہوں۔"

"تو یہ بات ہے۔ مجیدن سے تیرا کیا واسطہ ہے؟"

"وہ۔۔۔ وہ میری بہن ہے۔"

میری یہ بات سنتے ہی اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے چادر کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالا اور اس میں پکڑا ہوا، دھاری دار چاقو اس نے میرے قدموں میں پھینک دیا، بولا۔

"یہ پستول پرے ہٹا لے جوان اور مجھے بتا وہ تیری بہن کیسے ہے۔ اس نے تو کہا تھا کہ ادھر اس کا کوئی اگلا پچھلا نہیں ہے جو اسے سنبھال سکے۔"

"وہ مجھے بے عزت کرنا نہیں چاہتی ہو گی اسی لیے اس نے تیرے سامنے میرا نام نہیں لیا۔"

"بیٹھ جا جوان اور دھرج سے کام لے۔ مجھے تیرے ساتھ ہمدردی ہے۔ میرے ڈیرے پر بیٹھا رہا مجیدن کو میں لینے نہیں گیا۔ کوئی خود ہی اسے میرے پاس پہنچ گیا تھا۔"

"کون تھا وہ؟" میں نے اپنا پستول اس پر مسلسل تان رکھا تھا۔

"وہ شرفو کے ذریعے میرے پاس آئی تھی۔ وہ جو نامنٹی معاش۔۔۔ تو نے کبھی کن کٹا تو دیکھا تو ہو گا وہ منڈا۔"

"نہیں، میں نے نہیں دیکھا ہے لیکن اب دیکھنا پڑے گا۔ بیٹھ جا، دیکھتے ہیں تو پھر اٹھتے۔" میں نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"سات ہجار۔ اس سے کم پہ وہ تو ناچتی ہی نہیں تھا اور وہ تھی بھی اس لائق۔ بڑی بے جبان لڑکی ہے وہ۔"

"وہ ہے کہاں۔ اسے ادھر لاؤ۔ میں اسے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔

"وہ ادھر نہیں ہے جوان۔ وہ کل رات سے ادھر نہیں ہے۔"

"کہاں بھیجا ہے تم نے اسے؟"

اس نے سر جھکا لیا۔ وہ مجھ سے آنکھ ملانے سے اب گریزاں نظر آتا تھا۔

"میری بات کا جواب دو بندو خان! مجیدن کو تم نے کہاں بھیجا ہے؟"

"مجھے افسوس ہے میرے ویرا پرسوں آجاتے تو میں تمہاری چیج تمہارے حوالے کر دیتا۔ پر اب نہیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"دیکھو۔ اب کیوں نہیں ہو سکتا۔ میں تمہارے گھر پورے کتنے کے لیے تو نہیں آیا؟"

"بات یہ ہے میرے جوان! وہ ۔۔۔۔ میں نے اسے کل ایک جمیندار کے ساتھ ٹور دیا۔ نتھ کھلائی کے لیے۔"

"بکواس نہ کر بندو خان! میرے سامنے ایسی بات مت کہہ ورنہ میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔"

"مجھے افسوس ہے میرے ویرا تمہارا گصہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ پر یہ میرا دھندا ہے۔ میں نے پندرہ دن کے لیے اسے باہر بھیج دیا ہے۔ وہ ناچ گانا دیکھ سکی تھی اور مجھے پیسے پورے کرنے تھے۔"

"کتنے پیسے لیے ہیں تم نے اس سے؟"

"بیس ہجار روپے میرے ویرا۔ [illegible]

یہ میرا کاروبار ہے۔"

"کون آدمی ہے وہ؟"

"اس کا نام سردار خان ہے وہ ادھر چھانگا مانگا میں رہتا ہے۔ بڑی جمینداری ہے اس کی اور موج میلے کا شوقین آدمی ہے وہ۔"

"تو نے اچھا نہیں کیا بندو خان! مجیدن کو برباد کر دیا تو نے پر تو ٹھیک کہتا ہے تیرا بھی اس میں کیا قصور ہے۔ جو لکھی ہیں جو لکڑی گرے گی، جل کر رہے گی۔" میں نے گویا اپنے آپ سے کہا اور پستول کو جیب میں رکھ لیا۔ میں بندو خان سے کیا کہتا۔ بھی تو وہ اپنی جگہ بالکل بے قصور تھا۔

"مجھے آج جندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کی بربادی پر افسوس ہو رہا ہے میرے ویرا۔ مجھے ماف کر دے سکے تو میں ۔۔۔ پر یہ میں گستہ کھا جائے گا۔"

"کہو کہو رک کیوں گئے ہو؟"

"میں کہے تو میں تمہارے کو وہ سالا بیس ہجار دے سکتا ہوں اپنے سات ہجار کاٹ کر۔" اس کا لہجہ بے حد ناتواں محسوس ہو رہا تھا۔

"مجھے اور ذلیل نہ کر بندو خان! بہت ہو گئی۔ اب کوئی بات نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو میں تجھ پر ہاتھ اٹھا لوں۔"

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔



اس مقبول سلسلے کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ کیجیے۔

جو کہ اس حصے کے ساتھ ہی شائع ہو چکا ہے۔